يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ

تفسیر
بُرہان القرآن

علامہ قاری محمد طیّب نقشبندی

ناظم جامعہ رسولیہ اسلامک سنٹر، مانچسٹر، انگلینڈ

جلد اول

مکتبہ بُرہان القرآن

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء ۱۷۴)

اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے عظیم دلیل آگئی ہے

تفسیر برہان القرآن

جلد اول

سورۂ فاتحہ تا سورۂ بقرہ

مصنف

علامہ قاری محمد طیب نقشبندی

ناظم جامعہ رسولیہ اسلامک سنٹر مانچسٹر یوکے

مکتبہ برہان القرآن

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء ۱۷۴)

اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے عظیم دلیل آگئی ہے

تفسیر برہان القرآن

جلد اول

سورۂ فاتحہ تا سورۂ بقرہ

[مصنف]

علامہ قاری محمد طیب نقشبندی

ناظم جامعہ رسولیہ اسلامک سنٹر مانچسٹر یوکے

مکتبہ برہان القرآن

Name Book : Tafseer Burhan ul Quran	تفسیر برہان القرآن	:	نام کتاب
Author : Qari Muhammad Tayyib Naqshbandi	علامہ قاری محمد طیب نقشبندی	:	مصنف
Book : 1st	اوّل	:	جلد
Year : August 2016	ذوالقعدہ 1437ھ	:	سن اشاعت
Edition : 1st (2 Color)	اوّل (2 کلر)	:	ایڈیشن
Publisher : Maktaba Burhan ul Quran Data Darbar Market Lahore	مکتبہ برہان القرآن داتادربار مارکیٹ لاہور 0321-4298570	:	الناشر

ملنے کے پتے

نظامیہ کتاب گھر (اُردو بازار لاہور)
علامہ فضل حق خیرآبادی (داتادربار مارکیٹ لاہور)
نعیمیہ بک سٹال (اُردو بازار لاہور)
ضیاالقرآن (داتادربار مارکیٹ لاہور)
مکتبہ غوثیہ (کراچی)
دارالنور (داتادربار مارکیٹ لاہور)
اسلامک بک کارپوریشن (راولپنڈی)
مکتبہ قادریہ (داتادربار مارکیٹ لاہور)
فیضان مدینہ (سردارآباد)
مکتبہ اعلیٰ حضرت (داتادربار مارکیٹ لاہور)
مکتبہ والضحیٰ (اُردو بازار لاہور)
کتب خانہ امام احمدرضا (داتادربار مارکیٹ لاہور)

Find us in UK
Jamia Rasoolia Islamic Center
250 Upper Chorlton Road Old Tarfford Manchester M16 0BL
Mob: 07999312666 07450005809

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بلغ العلیٰ بکمالہ
کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ
صلوا علیہ وآلہ
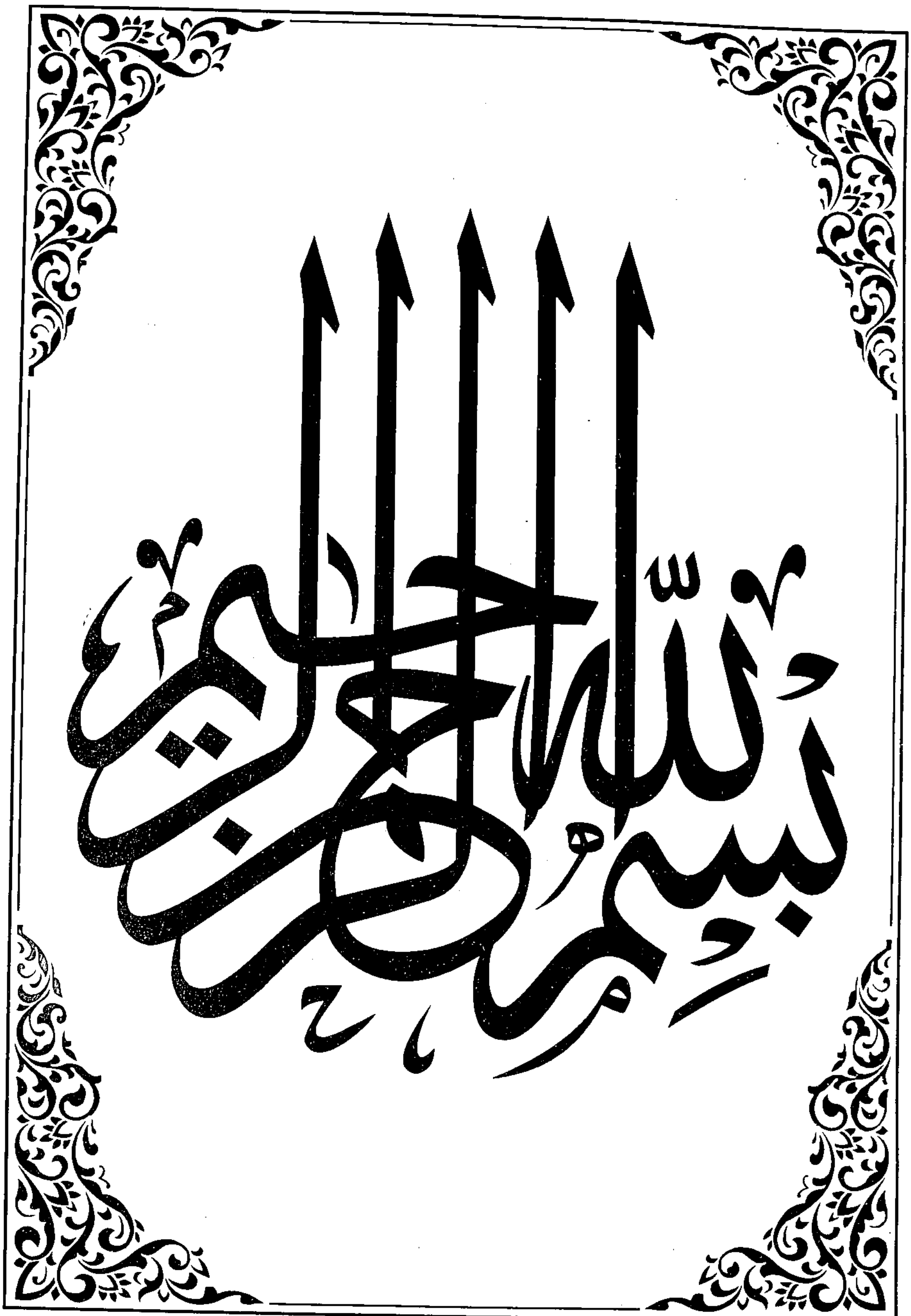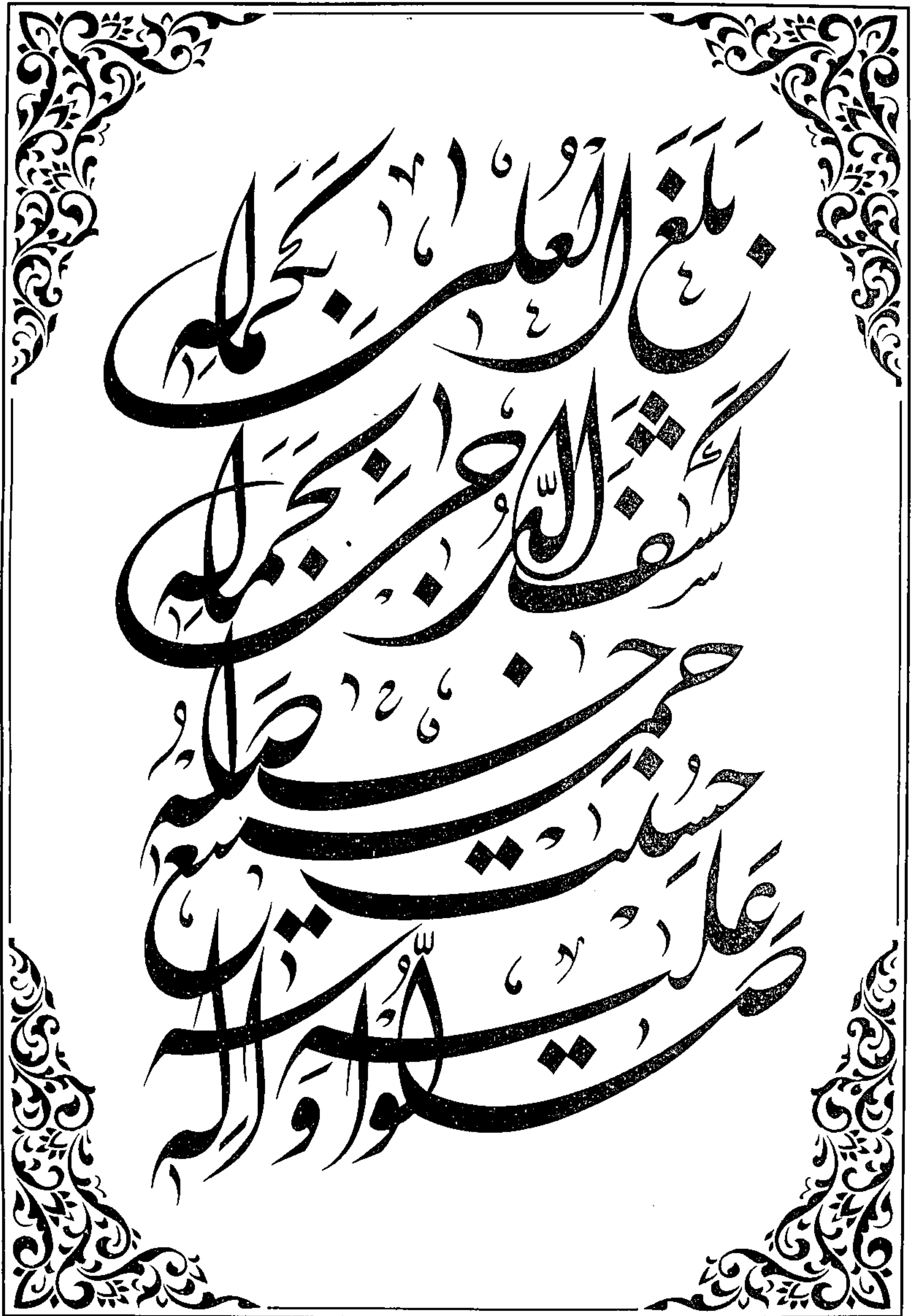
استدعا

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتابت، کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔ اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہِ کرم مطلع فرما دیں کیونکہ بشری تقاضے کے مطابق کسی بھی مرحلے میں غلطی کا رہ جانا ممکن ہے۔ ان شاء اللہ ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کیلئے ادارہ بے حد شکر گزار ہوگا۔

ادارہ برھان القرآن

فہرست

پیش لفظ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ گزشتہ کل شب یکم رمضان المبارک 1427ھ مطابق یکم اکتوبر 2006ء بروز اتوار بعد نماز مغرب میں نے کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر آنسوؤں کی برسات میں تفسیر ''بینات القرآن'' کے اختتامی کلمات لکھ کر اپنے آٹھ سالہ تفسیری سفر کا اختتام کیا۔ یہ تفسیر گوناگوں دینی عصری ضروریات کی تکمیل کرتی ہے۔ مثلاً عقائدِ اسلامی منجملہ توحید ورسالت، قیامت اور احکامِ اسلامی منجملہ عبادات ومعاملات کا نقل وعقل سے استدلال، مذاہب باطلہ کی تردید، شانِ اُلوہیت ورسالت، عدالتِ صحابہ واہل بیت رضی اللہ عنہم اور مقامِ ولایت کا دفاع وتحفظ، فقہ حنفی کی قرآن وحدیث سے تائید اور قرآن کے بیان کردہ حقائق کی جدید سائنس سے تعبیر وتشریح وغیرہ۔

اور آج میں حرم کعبہ شریف ہی میں بیٹھ کر نئے تفسیری سفر کا آغاز کر رہا ہوں یعنی میں نے چاہا کہ تفسیر بینات القرآن کا ایک جامع خلاصہ تیار کروں کہ ہر شخص کے پاس پندرہ سولہ ضخیم جلدوں پر پھیلی ہوئی تفسیر کے پڑھنے کا وقت نہیں، یہ کام علماء کر سکتے ہیں کہ انہوں نے خود کو علومِ قرآن وحدیث کے پڑھنے اور پھیلانے کیلئے وقف کر رکھا ہے، جبکہ عوام المسلمین کی دیگر ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ تاجران، پیشہ ور حضرات اور سرکاری وغیر سرکاری ملازمین سے ایسی طویل تفسیر کے پڑھنے کی توقع کم ہی رکھنا چاہیے۔ ان کے لئے جامع ومختصر تفسیر چاہیے تاکہ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ استفادہ کر سکیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ علماء صرف نفس مسئلہ نہیں جاننا چاہتے وہ اس کے دلائل جاننے کی بھی جستجو رکھتے ہیں۔ جبکہ عوام المسلمین دینِ اسلام کے بنیادی عقائد ومسائل ہی کے جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں، انہیں اختلافی مسائل میں ہر فریق کی تحقیقی والزامی دلائل کی تفصیلات سے زیادہ لگاؤ نہیں وہ To the point بات سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان کیلئے مختصر تفسیر قرآن ہی مفید تر ہے۔

اس لیے آج سے میں مختصر تفسیر قرآن کی تحریر شروع کر رہا ہوں۔ اس کا نام میں نے ''برہان القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اللہ رب العزت مجھے اس مقدس گھر کعبۃ اللہ کے صدقے جس کے سامنے بیٹھ کر میں یہ کام شروع کر رہا ہوں، اس

کے مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اسے لوگوں کیلئے مفیدِ عام بنائے۔

ایک نہایت اہم گزارش:

اس جگہ میں وضاحت کر دوں کہ میرا مسلک اور عقیدہ وہی ہے جو قرآن وسنت، اقوال صحابہ، ائمہ اہل سنت مفسرین، محدثین، متکلمین اور فقہاء بشمولہ امام سیوطی، امام غزالی، امام ربانی امام احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات سے ظاہر ہے۔ لہٰذا اگر اس تفسیر میں کسی قاری کو کوئی لفظ یا عبارت ان اصول سے متصادم لگے تو اسے چاہیے کہ اس کو اچھالنے کی بجائے ضرور ہم سے رابطہ کرے۔ ہم اس کی رائے کو علماء کے پینل کے سامنے پیش کریں گے اگر انہوں نے تبدیلی کی ضرورت محسوس کی تو اگلے ایڈیشن میں ضرور تبدیلی کر دی جائے گی اور اس محترم قاری کا شکریہ ادا کیا جائے گا، بصورت دیگر اس محترم قاری کو ہم اپنی حتمی رائے سے آگاہ کریں گے، ان شاء اللہ۔

یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں خود کو دین کا ادنیٰ طالب علم سمجھتا ہوں، طالب علم سے غلطی ہو سکتی ہے۔ تو جو مجھے میری غلطی سے آگاہ کرے وہ میرا محسن ہے، تاہم غلطی کا تعین ضروری ہے۔

آمین

بجاہ سید المرسلین امام المتقین

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم و آلہ وصحبہ اجمعین

محمد طیب غفرلہ

تقریظ

مناظر اسلام شیخ الحدیث حضرت علامہ مولانا

سید محمد عرفان شاہ مشہدی کاظمی

سرپرست و شیخ الحدیث دار العلوم جامعہ محمدیہ بھکھی شریف، گجرات پاکستان، خلف الرشید حافظ الحدیث
عارف ربانی استاذ العلماء شیخ الحدیث سید محمد جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ، حال مقیم بریڈفورڈ انگلینڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دین اسلام وہ کامل و اکمل دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اپنے آخری رسول سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا اور قیامت تک آنے والی انسانی نسل کے لیے دستور و آئین کے طور پر پسند فرمایا اور اسکی حفاظت اپنے ذمۂ کرم پر لی۔ اللہ جل شانہ کی رضا کے لیے دینِ اسلام کی حفاظت کے تقاضوں کو امتِ محمدیہ کے اولو العزم افراد نے ہمیشہ سب مرغوبات پر فوقیت دی۔ اس مبارک عمل کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جائے کہ چہار دانگ عالم میں پھیلے انسان جتنی زبانیں بولتے ہیں، خدامِ دین نے اتنی زبانوں میں قرآنِ کریم کے تراجم اور تشریحات کے ساتھ چودہ صدیوں میں دعوتِ دین کے مقدس عمل کو جاری رکھا ہے۔

انہی خدام دین کے مبارک منہج پر عصرِ حاضر میں خدمت دین انجام دینے والوں میں حضرت علامہ قاری محمد طیب نقشبندی مجددی مدظلہ العالی ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے علمی استعداد و صلاحیت کے ساتھ ساتھ زندگی کے اوقات میں ایسی برکت عطا فرمائی ہے کہ برطانیہ جیسے ملک میں متنوع مصروفیات کے باوجود انہوں نے قرآن حکیم کی تفسیر ''بینات القرآن'' مکمل فرمائی۔ اب اہلِ اسلام کی مزید رعایت فرماتے ہوئے، مبسوط تفسیر کا خلاصہ ''برہان القرآن'' ترتیب دے رہے ہیں۔

قاری صاحب موصوف عربی کے مروجہ علوم وفنون میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں، راہِ عمل میں تقویٰ اور اسوۂ حسنہ کی اتباع کی روش پر مستقیم ہیں۔ اصول و فروع (عقائد و اعمال) میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت و حضرت امام ابومنصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو ہیں۔ باشعور سنی حنفی ہیں۔ طبیعت میں متانت ہے۔ توازن کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی تفسیر پڑھنے والے ان کی ان صفات کا انعکاس خود محسوس کرلیں گے۔

میں نے برہان القرآن کو چیدہ مقامات سے دیکھا ہے قاری صاحب کے مشرب کو ان کے اسلوب نگارش میں جلوہ گر پایا ہے۔ طریق استدلال اور نتائج فکر کی ترتیب میں قصر عارفاں کی خوشبو اور حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ، میر سید سند شریف نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی ورثہ منتقل ہوتا نظر آئے تو اسے

قبلہ گاہی سید نور الحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا فیضان نظر یقین کریں۔ جو قاری صاحب اور ان کے نامور محقق والد شیخ الحدیث الحاج محمد علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہے۔

مذکورۃ الصدر سلسلۃ الذہب شریعت کی بالا دستی اور مشربی روایات کو قرآن وسنت پر پیش کرتے رہنے کی روش رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علم کے زیر اثر ابن تیمیہ اور شوکانی جیسی یبوست میں مبتلا نہیں ہے۔ بلکہ قاضی عیاض اندلسی اور امام تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہما جیسی تازگی سے معطر ہے۔

مولانا قاری محمد طیب مدظلہ کا اسلوب نگارش واضح سادہ اور دلنشیں ہے۔ جو متلاشیان حق اور طالبانِ ہدایت کے لیے بہت مفید ہے۔ یہی ان کے قلم کی خوبی اور ان کے اندازِ بیاں کا حسن ہے۔ قاری صاحب مدظلہ کے لیے ان کی خدمتِ قرآن کے مبارک ومسعود عمل پہ یہ رباعی موزوں ہوگئی۔

محمد طیب از رجال خوش صفات — کرد اسرار وحکم رابینات
مرداں چنیں کنند اندر حیات — ربنا اجعل لنا دائم البرکات

اللہ تعالیٰ جل شانہ علامہ قاری محمد طیب نقشبندی مجددی مدظلہ کی اس کاوش کو قبول عام عطا فرمائے۔ آمین!

الرجی الی رحمۃ ربہ المنان
السید محمد عرفان غفر لہ
الرحمان الی یوم المیزان
من احفاد موسی الکاظم بن جعفر الصادق رحمہما اللہ

تقریظ

محسن اہل سنت استاذ العلماء والفضلاء حضرت علامہ مولانا

پیرزادہ محمد امداد حسین

بانی و پرنسپل جامعہ الکرم، ناٹنگھم انگلینڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت علامہ قاری محمد طیب صاحب مد اللہ تعالیٰ ظلہ بالصحۃ والسلامہ ایک مشہور و معروف علمی گھرانہ کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار شیخ الحدیث علامہ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ دار العلوم جامعہ رسولیہ شیرازیہ لاہور پاکستان میں درس نظامی اور قراءات سبعہ متواترہ کے علوم حاصل کیے۔ کچھ عرصہ اسی دار العلوم میں پڑھانے کے بعد 1988ء میں انگلستان تشریف لائے۔

پہلے تو خطابت اور امامت کے فرائض سرانجام دیتے رہے، لیکن 1999ء میں مانچسٹر میں اپنا ادارہ جامعہ رسولیہ اسلامک سنٹر مانچسٹر قائم کیا جس میں خطابت وتدریس کے ساتھ ساتھ آپ نے قرآن مجید کی تفسیر ''بینات القرآن'' لکھی۔

اب آپ نے اس تفسیر کا خلاصہ ''برہان القرآن'' کے نام سے لکھنا شروع کیا ہے جو قریب الاختتام ہے، اس میں سے مجھے سورہ یوسف اور سورہ ابراہیم کے چند مقامات کے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ماشاء اللہ، یہ ایک مختصر اور جامع تفسیر ہے اور اس دور کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ کیونکہ آج کل کی مصروف زندگی میں عام لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ تفصیلی تفسیریں پڑھنے کے لیے وقت نکال سکیں۔

مختلف مقامات پر آپ نے عقائد کی تصحیح اور امر و نہی کی تعلیم کے لیے بڑا اچھا استدلال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

① سورہ یوسف کی آیت 2 کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

قرآن کریم کی زبان صرف عربی ہے، یعنی قرآن وہی ہے جو عربی میں ہے۔ فارسی، اردو، انگلش وغیرہ میں قرآن کا ترجمہ ہوسکتا ہے مگر وہ قرآن نہیں ہے۔ اگر قرآن کی ایک زبان نہ رکھی جاتی تو آج قرآن کا حال بھی تورات وانجیل سے مختلف نہ ہوتا۔ لوگوں نے ان کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اور دوسری سے تیسری میں ڈھالا اور ان میں اس قدر تبدیلیاں کردیں کہ اصل عبارت کا ملنا ناممکن ہوگیا ہے۔ مگر قرآن ہر طرح کی تبدیلی سے محفوظ ہے، کیونکہ اس کی زبان صرف عربی ہے، وہ جس زبان میں جن الفاظ کے ساتھ نازل ہوا قیامت تک اسی طرح رہے گا۔

② سورہ یوسف کی آیت 49 کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

علماء دین علوم جدیدہ اور علوم طبعیہ سے عموماً ناواقف ہیں اور علوم جدیدہ کے جاننے والے دین وشریعت سے اکثر بے بہرہ دکھائی دیتے ہیں، اگر یہ دونوں دریا اکٹھے بہتے تو آج زمانے کی زمام اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی۔

④ سورہ ابراہیم کی آیت 36 کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: اے اللہ! میری اولاد میں سے جو میری پیروی کرے یعنی بت پرستی سے دور رہے وہی میری جماعت سے ہے اور جو میری نافرمانی کرتے ہوئے بت پرستی وشرک میں مبتلا ہوجائے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ اس میں دور حاضر کے بدعمل سجادہ نشینوں اور مسند فروشوں کے لیے درسِ عبرت ہے۔ البتہ اللہ تعالی اگر چاہے تو اسے توفیق توبہ عطا فرما کر بخشش ورحمت کا مستحق بنا سکتا ہے۔

فقیر
محمد امداد حسین پیرزادہ
بانی وپرنسپل جامعہ الکرم، انگلینڈ
27راگست 2008ء

اِس تفسیر کی خصوصیات اور کچھ مفسر کے بارے میں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہ تفسیر میرے برادرِ اکبر قاری محمد طیب نقشبندی المال اللہ عمرہ بالصحۃ والعافیۃ کی دس سالہ محنت کا نتیجہ ہے۔ والد گرامی شیخ الحدیث علامہ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ وہ قرآن کریم کی تفسیر لکھیں۔ مگر عمر نے وفا نہ کی، برادر مکرم نے ان کی خواہش کی تکمیل کی ہے۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

برادر مکرم نے اس تفسیر میں جن خطوط پر کام کیا ہے اور وقتِ حاضر کی جن اہم ضروریات کی تکمیل کی ہے وہ ہم ذیل میں لکھتے ہیں۔ اس سے آپ کو اس تفسیر کی اہمیت وافادیت کا صحیح ادراک ہوگا۔

اول: دورِ حاضر کے جدید فقہی مسائل کا حل

یہ تفسیر مختصر ہونے کے باوجود دورِ حاضر میں اُٹھنے والے تمام جدید فقہی وشرعی مسائل پہ سیر حاصل روشنی ڈالتی اور ان کا حل پیش کرتی ہے۔ جیسے ہوائی جہاز اور چلتی ٹرین میں نماز کا حکم۔ روزہ میں انجیکشن لگوانے کا مسئلہ۔ کیا روزہ میں دمہ کا مریض انہیلر استعمال کرسکتا ہے؟ آج کل مشرق سے مغرب کی جانب سفر کرنے والے شخص کے روزے کبھی اٹھائیس ہو جاتے ہیں اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف آنے والوں کے روزے تیس سے بڑھ جاتے ہیں۔ اس کا کیا حل ہے؟

اس طرح پراویڈینٹ فنڈ پر زکوٰۃ لازم آتی ہے یا نہیں۔ دورِ حاضر میں بینکوں کے معیادی قرضے (Mortgages) کیا وجوب زکوٰۃ اور فرضیت حج سے مانع ہیں یا نہیں۔

دورِ حاضر میں حج کا اجتماع کئی (Millions) لاکھوں میں ہو گیا ہے۔ کیا یوم نحر (دس ذی الحجہ) سے متعلق مناسک حج میں ترتیب کا لحاظ ضروری ہے یا نہیں؟ کینیڈا، شمالی یورپ اور ایشیا کے بعض شمالی ممالک میں گرمیوں کی مختصر ترین راتوں میں نماز عشاء کا وقت ہی نہیں آتا۔ اور نمازِ عشاء کیسے پڑھی جائے؟

دورِ حاضر میں مشینی ذبیحہ کا شرعی حکم اور آج کل کے یہود ونصاریٰ کے ذبیحہ کا حکم۔ کیا اعضاء کی پیوندکاری جائز ہے۔ الکوحل والی ادویہ کے استعمال کا حکم۔ بیمہ اور انشورنس کا شرعی حکم۔ جدید پلاسٹک سرجری کا حکم۔ کیا موبائل فون، لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر میں قرآنی تحریر کو بغیر طہارت چھوا جاسکتا ہے؟

ان مسائل کو زیر قلم لاتے ہوئے علماء گھبراتے ہیں، مگر فاضل مفسر نے ان جدید چیلنجز کا کھل کر جواب دیا ہے اور وقت کی اہم ضرورت کی تکمیل ہے۔ مگر اختصار کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔ کئی لکھنے والے بات کو اس قدر لمبا کر دیتے ہیں کہ

قاری بیچارہ بھول بھلیوں میں پڑ جاتا ہے۔ برادر مکرم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ اس تفسیر کی نمایاں خوبی ہے۔ فروعی مسائل میں تحقیق کا دائرہ وسیع ہے صاحب مطالعہ لوگ دلائل کے ساتھ اختلاف کا حق رکھتے ہیں۔

دوم: قرآن کی روشنی میں ردِ رفض اور تحفظِ ناموس رسالت اور تحفظ صحابہ واہل بیت

اہل تشیع قرآن کریم کی جس بھی آیت کو لے کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن وطنز کرتے ہیں برادر مکرم قاری محمد طیب نقشبندی نے خود شیعہ کتب کی روشنی میں اس کا بھرپور جواب دیا ہے اور قاری صاحب کے پاس کتب برطانیہ میں شیعہ کتب کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ وہاں شاید ہی کسی عالم دین کے پاس ہو۔ شاید خود شیعہ علماء کے پاس بھی اتنا ذخیرہ نہ ہو اور قاری صاحب مذاہب باطلہ کی کتب دن رات پڑھتے رہتے ہیں۔

ہم بطور تحدیث نعمت فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ پیشِ نظر تفسیر برہان القرآن میں تحفظِ ناموس رسالت صحابہ واہل بیت اور اہل رفض کے عقائد باطلہ کی تردید قرآن کی روشنی میں جس قدر تفصیلی وتحقیقی کام ہوا ہے وہ اس سے قبل کسی تفسیر میں نہ تھا اور انداز جارحانہ نہیں ناصحانہ ہے۔ مقصد دعوتِ حق ہے۔

سوم: ردقادیانیت اور اثباتِ عقیدۂ ختم نبوت

برادر مکرم علامہ قاری محمد طیب صاحب کے پاس مرزا غلام احمد قادیانی کی تمام تصانیف، مجموعہ اشتہارات اور ملفوظات موجود ہیں اور قاری صاحب بتاتے ہیں کہ انہوں نے مرزا قادیانی کی تمام کتب کو پانچ برس تک مسلسل پڑھا ہے۔ سفر وحضر میں پڑھتے رہے اور مرزا کی کفریات پر نشانات لگاتے رہے، چنانچہ قاری صاحب نے ردمرزائیت اور اثباتِ عقیدۂ ختمِ نبوت پر جس قدر لکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مرزائی علماء (ملکہِ جہلاء) جس بھی آیت سے اجراء نبوت اور اجراء وحی ثابت کرنے کی جسارت کرتے ہیں یہ تفسیر خود مرزائی کتب سے اس کا بھرپور جواب دیتی ہے۔ یہ تحقیق اسی تفسیر کا خاصہ ہے۔

چہارم: حقائق کائنات کا سائنسی انکشاف

برادر مکرم نے یہ کام بھی کیا ہے کہ قرآن کریم جابجا کائنات کے سائنسی حقائق سے پردہ اُٹھاتا ہے، جہاں ایسی آیات ہیں وہاں جدید سائنس کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ سائنس جن حقائق کو آج سمجھ رہی ہے قرآن نے آج سے چودہ صدیاں قبل ان کو منکشف کر دیا تھا جیسے ماں کے رحم میں تخلیق انسانی کے مدارج، منازلِ قمر کی تفصیل، میٹھے اور کھاری سمندروں کا باہمی ملاپ اور عدم اختلاط اور شہد کی مکھی اپنا گھر کیسے بناتی ہے۔

پنجم: ردنجدیت واحقاقِ عقائدِ اہل سنت

برادر مکرم نے قرآن کریم کی روشنی میں ردنجدیت واثباتِ عقائد اہل سنت پر بھی بہت تحقیقی کام کیا ہے جواز توسل، جواز ایصال ثواب، حیاتِ انبیاء وصلحاء، جواز استعانت از مقربین جیسے امور پر قرآن وحدیث کی روشنی محققانہ انداز میں

قلم اُٹھایا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ہر آیت کی تفسیر اپنی عقل سے کرنے کی بجائے خود قرآن و حدیث، اقوال صحابہ و تابعین اور مفسرین معتبرین کی آراء سے کی گئی ہے۔

مفسر کی دیگر تصانیف

جہاں تک برادرِ مکرم علامہ قاری محمد طیب کی علمی استعداد کا تعلق ہے تو اس کا اندازہ ان کی تالیفات و تصانیف سے کیا جاسکتا ہے۔ اب تو اُن کے قلم سے یہ کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔

اسعاف الحاجہ شرح سننِ ابن ماجہ (عربی)

یہ سنن ابن ماجہ کی ساڑھے چار ہزار احادیث کی عربی شرح ہے۔ برادرِ مکرم کو عربی زبان پہ خاص دسترس ہے۔ عربی انشاء کا ملکہ ان میں دورِ طالب علمی ہی میں پیدا ہو گیا تھا پھر ان کو ایک برس سعودی عرب میں ایک علمی ماحول میں رہنے کا موقع ملا جس سے ان کا عربی نطق مزید نمایاں ہوا۔ جس کا اندازہ ان کی اس عربی شرح سے کیا جا سکتا ہے جو چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔

اطیب الحواشی شرح اصول الشاشی

یہ اگرچہ ہمارے والد گرامی محقق اسلام علامہ محمد علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے تاہم برادرِ مکرم نے اسے ترتیب جدید اور اضافات کے ساتھ لکھا ہے اور سلیس ترجمہ کا اضافہ کیا ہے۔

جمال الوردہ شرح قصیدۃ البردہ

برادرِ مکرم نے قصیدہ بردہ کی تحقیقی شرح لکھی ہے ہر شعر کے مطلب کو قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ آپ نے اس کے ساتھ ساتھ ہر شعر کا سادہ اور منظوم ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ جس طرح امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس قصیدہ کے ہر شعر کو میم پر ختم کیا ہے، برادرِ مکرم نے بھی ترجمہ کے ہر شعر کو میم پر ختم کیا ہے۔ یہ کتاب بھی چھپ گئی ہے۔

شرح الشاطبیہ

علامہ قاری محمد طیب صاحب قراءتِ سبعہ کے قاری ہیں۔ آپ نے قرآن کریم کی قراءتِ سبعہ پڑھی اور پڑھائی ہیں۔ اور قراءت کی متداول درسی کتاب ''الشاطبیۃ'' کی شرح بھی لکھی ہے یہ گیارہ سو عربی اشعار پر مشتمل کتاب ہے۔ قاری صاحب نے ہر شعر کا معنیٰ اس کی لغات اور اس شعر میں بیان کی گئی قراءت میں سے ہر قراءت کی صحت قرآن و حدیث سے پیش کی ہے۔ یہ بڑا علمی کام ہے۔ آج علماء میں سے کم ہی اس فن سے شناسا ہیں۔ یہ کتاب ابھی چھپی نہیں۔ عنقریب چھپے گی انشاء اللہ العزیز۔

دلائل ختمِ نبوت مع ردِّ قادیانیت

برادرِ مکرم کو رسول اکرم ﷺ کے مقام ختم نبوت سے والہانہ لگاؤ ہے جس کا اندازہ ان کی تفسیر سے بھی ہوتا ہے۔ بہر حال یہ کتاب اثباتِ ختم نبوت اور ردِ قادیانیت پر بڑے تحقیقی مواد کی حامل ہے۔ اس میں حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام پر بھی مدلل کلام کیا گیا ہے۔ یہ کتاب چھپ گئی ہے۔

جشنِ عید میلاد النبی ﷺ کا جواز

یہ اپنے موضوع پر بہت تحقیقی کتاب ہے۔ جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بھی چھپ گئی ہے۔

عظمتِ اہل بیت رسول ﷺ

یہ بھی چھپ گئی ہے۔ اس میں بہت قیمتی تحقیقی ابحاث ہیں۔ جیسے فضائل اہل بیت عظام بزبان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم از کتب اہل سنت، فضائل صحابہ کرام بزبانِ اہل بیتِ رسول انام از کتب شیعہ، واقعۂ کربلا میں ملائے گئے رطب و یابس کی چھانٹی۔ واقعہ کربلا محقق مؤرخین کے قلم سے جیسے علامہ ابن خلدون، امام ابن جریر طبری، امام ابن اثیر جزری اور امام ابن کثیر رحمہم اللہ ماتم از کتبِ شیعہ و دیگر تحقیقی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

کلامِ طیب

میرے برادر مکرم صاحب تفسیر ہٰذا ایک منجھے ہوئے شاعر بھی ہیں۔ آپ کا نعتیہ مجموعہ کلام ''کلام طیب'' کے نام سے چھپ گیا ہے، جس میں عربی، فارسی، اردو اور پنجابی کلام شامل ہے۔ حمدیں، نعتیں، مناقب، مواعظ اور دیگر موضوعات پر وقیع منظوم کلام پیش کیا گیا ہے۔ بعض قرآنی سورتوں کے مطالب کو لبادۂ نظم اوڑھایا گیا ہے۔ جیسے سورہ فاتحہ، سورہ الم نشرح، سورۃ الضحیٰ سورہ اخلاص اور معوذتین۔ برادر مکرم آج کل شرح سنن ابوداؤد کا کام شروع کیے ہوئے ہیں جو روبہ تکمیل ہے۔ اللہ رب العزت ان کے اشہب قلم کو ہمیشہ دوڑاتا رہے، آمین!

والد گرامی قبلہ شیخ الحدیث علامہ محمد علی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی کارنامے

برادر مکرم قاری محمد طیب صاحب کو یہ علمی ذوق حضور والد گرامی سے ورثہ میں ملا ہے۔ والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ نے سن 1963ء میں لاہور بلال گنج میں حضور داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پُر انوار سے چند قدم دور دار العلوم جامعہ رسولیہ شیرازیہ کی بنیاد رکھی اور بڑی محنت و جانفشانی سے علماء کرام اور مؤرخین کی ایک بڑی جماعت تیار کی۔ یہ لوگ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گئے اور آج جگہ جگہ علم دین کے چشمے اُبل رہے ہیں۔

اس کے علاوہ قبلہ والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ نے تصانیف کی صورت میں اپنا قیمتی علمی ورثہ چھوڑا ہے۔ آپ کی چند تصانیف کا تعارف پیش خدمت ہے۔

شرح موطاء امام محمد

یہ تین جلدوں میں نہایت محققانہ تصنیف ہے۔ جدید فقہی مسائل اور عقائد اہل سنت اور فقہ حنفی کی دیگر مسالک فقہیہ پر بالادستی پر اس کتاب میں جس قدر تحقیقی کام ہوا ہے وہ بے مثال ہے۔ یہ کتاب ہر علمی لائبریری کی ضرورت ہے۔

تحفہ جعفریہ، عقائد جعفریہ، فقہ جعفریہ

یہ تین کتابیں جو مجموعی طور پر تیرہ جلدوں پر مشتمل ہیں ردِ شیعیت پر ایک مکمل علمی سیریز ہے، زمانہ اس کی مثال لانے سے قاصر ہے۔ ردِ شیعیت وتحفظ ناموسِ صحابہ واہل بیت پر یہ شاہکار انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اہلِ سنت واہل تشیع کے مابین کوئی مابہ النزاع مسئلہ نہیں جس پہ اس میں سیر حاصل روشنی نہ ڈالی گئی ہو اور احقاق حق کا حق نہ ادا کیا گیا ہو۔ یہ قبلہ والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کا امتِ مسلمہ اور اہل سنت پہ وہ احسانِ عظیم ہے جس سے وہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ فللہ درُّہٗ

نور العینین فی ایمانِ آباء سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کریمین سے لے کر آدم علیہ السلام تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام آباء واجداد اور امہات کے ایمان وایقان پہ یہ بے مثال مفصل تحقیقی کتاب ہے جس کی قدر وقیمت کو محقق علماء جان سکتے ہیں۔

میزان الکتب

اہل تشیع کی یہ تاریخ رہی ہے کہ انہوں نے خفیہ طریقہ سے کتابیں لکھیں، جن میں صحابہ کرام کی کچھ تعریف بھی کردی اور اس کے ضمن میں ان پر طعن وتشنیع کے نشتر بھی چلا دیے۔ یوں حق کو باطل سے ملتبس کر دیا اور ان کو کسی فرضی مصنف کے نام سے شائع کر دیا اور بتایا کہ یہ اہل سنت کی معتبر کتابیں ہیں۔ آج وہ ان سے حوالہ جات دے کر صحابہ کے خلاف لوگوں کے اذہان کو مسموم کرتے ہیں جیسے ینابیع المودہ، ارجح المطالب، مروج الذہب وغیرہا۔ قبلہ والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عرق ریزی وزہرہ گدازی سے کام لے کر خود کتب شیعہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ کتابیں خود شیعہ علماء کی تحریر کردہ ہیں ان کا اہل سنت سے کوئی تعلق نہیں۔ تحفظِ ناموس صحابہ وصیانتِ عقائد اہل اسلام پر والد گرامی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ گہرا علمی وتحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پہ پہلی اور شائد آخری کتاب ہے۔

فانہ لم یُنسج علی منوالہٖ شئٌ

احقر العباد
رضائے مصطفیٰ نقشبندی عفا اللہ عنہ
ناظم اعلیٰ جامعہ رسولیہ شیرازیہ، لاہور

مقدمہ

قرآن اور تفسیر قرآن کے بارے میں

انشاء اللہ مقدمہ میں قرآن کریم کا تعارف، اس کے فضائل وخصوصیات اور علم تفسیر کی تاریخ وغیرہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ اس میں دو ابواب ہوں گے اور ہر باب میں متعدد فصلیں، پہلا باب قرآن کریم سے متعلق ہے اور دوسرا تفسیر قرآن کے بارے میں، وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

باب اول

قرآن مجید کے بارے میں

فصل اول

فضائل قرآن کریم از قرآن وحدیث:

فصل اول آگے کئی بحثوں میں تقسیم کی گئی ہے اور ہر بحث میں الگ الگ مضامین ہیں۔ تاکہ قارئین کرام کے لیے ہر مضمون کو الگ الگ ذہن نشین کرنے میں آسانی رہے۔

بحث اول

تلاوت قرآن کریم کے فضائل

قرآن کریم اللہ جل مجدہٗ الکریم کا کلام ہے اور اللہ رب العزت اس بات سے خوش ہوتا ہے کہ اس کا کلام پڑھا جائے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی شاعر کی لکھی ہوئی نظم یا نعت کہیں پڑھی جائے تو شاعر خوش ہوتا ہے۔ کسی مصنف کی تصنیف داخل نصاب کی جائے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ یونہی تعالیٰ کا پاک کلام پڑھا جائے تو اللہ خوش ہوتا ہے۔ پھر شاعر ومصنف کی خوشی اس لیے ہے کہ انکی شہرت ہوگی انکی ذات کو فائدہ ہوگا۔ لیکن قرآن پڑھنے سے ان پر رحمتوں کے دروازے کھلیں گے اور انکا دامن امید گوہر مقصود سے بھر دیا جائے گا۔

تلاوت قرآن کریم کے فضائل خود قرآن سے

(۱) اللہ رب العزت نے اپنے پیارے حبیب ﷺ کے فضائل قرآن میں جابجا ارشاد فرمائے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ شریف تعمیر کر کے رسول معظم ﷺ کی آمد کے لئے دعا فرمائی تو آپ کی یہ صفات ذکر فرمائیں۔ ''رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾'' ''اے ہمارے رب! ہماری اولاد میں وہ جلیل القدر رسول بھیج دے جو انہی میں سے ہوگا اور ان پر تیری آیات مقدسہ کی تلاوت فرمائے گا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے گا۔'' (بقرہ:۱۲۹)

(۲) اللہ رب العزت نے امت محمدیہ کو اپنا پیارا رسول ﷺ عطا فرمایا تو سب سے پہلے اس کی یہی صفت بیان فرمائی کہ وہ قرآن کریم کی تلاوت فرمانے والے ہیں فرمایا۔ ''لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ'' ''تحقیق اللہ نے مومنوں پر احسان عظیم فرمایا کہ ان میں عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا جو انہی میں سے ہے ان پر اللہ کی آیات تلاوت فرماتا ہے اور انہیں پاک کرتا اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔'' (آل عمران:۱۶۴)

(۳) اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ نے یوں تعریف فرمائی۔ ''اَلَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُونَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿١٢١﴾'' ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اسکی تلاوت کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کا انکار کرے تو یہی لوگ نقصان میں رہیں گے۔'' (بقرہ:۱۲۱) ان آیات میں جہاں تلاوت قرآن کی فضیلت معلوم ہوتی ہے وہاں تفسیر قرآن کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں بتایا کہ نبی ﷺ اپنی امت کو قرآن پڑھاتے ہی نہیں پڑھاتے بلکہ اس کا علم بھی دیتے ہیں۔ الفاظ سکھانے کے علاوہ معنی بھی سکھاتے ہیں اسی لیے'' يَتْلُوا عَلَيْهِمْ '' کے بعد ''وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ '' فرمایا گیا اور یہی تفسیر قرآن ہے اور آپ ﷺ ہی مخلوق میں قرآن کے سب سے پہلے مفسر ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو جہاں قرآن کی تلاوت کی ترغیب دلائی ہے وہاں اس سے اعراض کرنے والوں کو ڈرایا بھی ہے اور فرمایا ہے کہ اسکی تلاوت کرنے والے ہی اصل میں اس پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ گویا قرآن پر ایمان رکھنے کا اولین تقاضا اس کی تلاوت ہے۔

(۴) ارشاد ربانی ہے۔ ''وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا ﴿٧٨﴾'' ''اور فجر کے وقت قرآن کا پڑھنا معمول بناؤ کہ فجر کے وقت قرآن پڑھنے پر حاضری دی جاتی ہے۔ (یعنی فرشتے سننے کو حاضر ہوتے ہیں۔)''
(بنی اسرائیل:۷۸)

(۵) اللہ تعالیٰ ان مقدس جانوں کی قسم اٹھاتا ہے جو قرآن کی تلاوت کرنے والی ہیں فرمایا۔ ''فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ﴿٣﴾

''اور قسم ہے مجھے ان جانوں کی جو ذکر (قرآن) کی تلاوت کرنے والی ہیں۔'' (صافات:۳) یہاں ذکر سے مراد قرآن کریم ہے۔فرمایا گیا۔''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ۝۹ ''ہم ہی نے ذکر اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ (حجر:۹) یاد رہے اگر تلاوت قرآن کو محض لوگوں کی مرضی پہ چھوڑ دیا جاتا کہ خواہ تلاوت کریں یا نہ کریں تو شائد کئی لوگ زندگی میں کبھی تلاوت کرتے یا بالکل نہ کرتے۔اللہ رب العزت نے اس کام کی اہمیت کے باعث اسے نماز کا حصہ بنا دیا تا کہ ہر مسلمان دن میں پانچ مرتبہ قرآن کریم کی تلاوت کا ضرور ثواب حاصل کرلے ۔پھر جو سورت تمام آیات قرآنیہ کے لیے ماں کے برابر تھی اسے ہر (یعنی سورہ فاتحہ) نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا جاری کر دیا۔

تلاوت قرآن کے فضائل حدیث سے

(1) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''جو صالح آدمی قرآن پڑھتا ہے اس نارنگی کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی عمدہ اور خوشبو بھی عمدہ ہے اور جو قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ تو ہے خوشبو نہیں اور قرآن پڑھنے والے فاجر آدمی کی مثال (جو اس پر عمل نہیں کرتا) گلاب کی طرح ہے جس کی خوشبو عمدہ ہے اور مزہ کڑوا اور قرآن نہ پڑھنے والے فاجر کی مثال اندرائن کی طرح ہے جس کا ذائقہ (سخت) کڑوا ہے اور کوئی خوشبو بھی نہیں۔'' (بخاری شریف کتاب فضائل القرآن صفحہ ۴۳۵ مجموعہ صحاح ستہ مطبوعہ ریاض) یہ حدیث مبارک بتا رہی ہے کہ قرآن کا پڑھنا بہر حال مفید ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کی مثال جو قرآن پڑھتا ہے مگر اس پر عمل نہیں کرتا گلاب کے ساتھ دی ہے کہ جس کی خوشبو ہے مگر ذائقہ نہیں۔

(2) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ ایک رات اپنے گھر کے پچھواڑے میں قرآن کریم پڑھ رہے تھے۔اچانک آپ کا گھوڑا بدکنے لگا آپ رکے تو وہ بھی رک گیا۔پھر آپ پڑھنے لگے تو وہ بدکنے لگا تین بار ایسا ہوا آپ فرماتے ہیں میرا بیٹا یحییٰ قریب ہی سو رہا تھا مجھے ڈر ہوا کہ گھوڑا اسے لتاڑ نہ دے جب میں گھوڑے کی طرف (تلاوت ختم کر کے) اٹھا تو کیا دیکھا جیسے میرے سر کے اوپر (فضا میں) ایک چھتری سی ہے جس میں چراغوں کی طرح انوار چمک رہے ہیں۔وہ آسمان کی طرف چڑھتے گئے تا آنکہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔کہتے ہیں صبح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر سارا ماجرا عرض کیا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تلك الملائكه كانت تسمع لك ولو قرات لاصبحت يراها الناس'' اے اسید! وہ فرشتے تھے جو تیرا قرآن سنتے تھے اگر تو پڑھتا رہتا تو (صبح) لوگ انہیں آنکھوں سے دیکھ لیتے۔(مسلم شریف کتاب فضائل قرآن صفحہ ۸۰۳ مجموعہ صحاح ستہ مطبوعہ ریاض) حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت اسید رضی اللہ عنہ قرآن کریم پڑھتے تھے تو فرشتے قریب آ کر سنتے تھے جنہیں دیکھ کر گھوڑا خوف زدہ ہو کر بدکنے اچھلنے لگتا تھا۔جب آپ تلاوت ختم

کرتے تو وہ اوپر چلے جاتے اور گھوڑا آرام سے کھڑا ہوجاتا اور اگر آپ تلاوت جاری رکھتے تو فرشتے پاس بیٹھے سنتے رہتے تا آنکہ صبح اہل مدینہ ان کی زیارت کر لیتے۔

(3) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قرآن کریم سے ایک حرف پڑھا تو اس کے لیے اس کے عوض ایک نیکی ہے اور ایک نیکی دس کے برابر ہوتی ہے اور میں نہیں کہتا کہ ''الٓمٓ'' ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام علیحدہ حرف ہے اور میم علیحدہ۔''

(ترمذی شریف کتاب فضائل قرآن صفحہ ۱۹۴۴ مجموعہ صحاح ستہ)

(4) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جس شخص کو قرآن (پڑھنے پڑھانے) نے میرے ذکر اور مجھ سے مانگنے میں مصروف رکھا (اور وہ مجھ سے کچھ مانگنے کے بجائے قرآن پڑھتا پڑھاتا رہا) اسے ہر اس چیز سے بہتر دوں گا جو میں مانگنے والوں کو دیتا ہوں اور اللہ کے کلام کی عظمت باقی کلام پر ایسی ہے جیسی خود اللہ تعالیٰ کی عظمت اپنی مخلوق پر ہے۔'' (ترمذی شریف کتاب فضائل القرآن صفحہ ۱۹۴۵ مجموعہ صحاح ستہ)

(5) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سب سے کون یہ چاہتا ہے کہ ہر روز صبح وادی بطمان یا عقیق میں جائے اور وہاں سے دو بلند کوہان والی اونٹنیاں لے آئے چوری سے نہ قطع رحم سے (بلکہ مفت) ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم میں سے ہر کوئی یہ چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا تو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم میں سے کوئی شخص صبح مسجد جائے اور وہاں دو آیتیں سیکھے یا پڑھے تو یہ اسکے لیے دو اونٹنیوں سے بہتر ہے اور تین یا چار آیات پڑھے تو تین یا چار اونٹنیوں سے بہتر ہے۔'' (مسلم شریف کتاب فضائل القرآن جلد ۸۰۴ مجموعہ صحاح ستہ)

بحث دوم

تلاوت قرآن کے آداب

پہلا ادب: قرآن کریم ٹھہر ٹھہر کر صحیح عربی تلفظ سے پڑھنا چاہیے

یاد رہے قرآن کریم اس قدر صحیح تلفظ سے پڑھنا کہ معانی میں خرابی نہ آئے فرض عین ہے اور اس طرح تلفظ سے پڑھنا کہ معانی بدل جائیں، حرام ہے الّا یہ کہ کوئی شخص اُمّی ہو جو صحیح پڑھنا نہیں جانتا اس پر لازم ہے کہ صحیح پڑھنا سیکھے اگر کوشش کے باوجود صحیح نہیں پڑھ سکتا تو عند اللہ معذور ہے۔ تاہم وہ درست پڑھنے والوں کی امامت نہیں کرسکتا کیونکہ اسکی قراءت صرف اس کے لیے بوجہ عذر جائز قرار دی گئی ہے دوسروں کے حق میں اسکی قراءت جائز نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؀'' ''اور تم قرآن کو ترتیل کے ساتھ (خوب ٹھہر ٹھہر کر) پڑھو۔'' (مزمل:۴) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ''الترتيل تجويد الحروف ومعرفة الوقوف'' قرآن کو ترتیل سے پڑھنے

کا معنی یہ ہے کہ حروف قرآن کو عمدہ طریقہ پر ادا کرنا اور جائے وقف کا پہچاننا (کہ کہاں وقف چاہیے کہاں نہیں) (النشر فی القراءات العشر العلامۃ ابن الجزری الدمشقی جلد اول صفحہ ۲۰۹ مطبوعہ مکہ) دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ '' یہ قرآن ایسی عربی زبان میں ہے جس کے اندر کوئی کمی نہیں۔'' (زمر:۲۸) تیسری جگہ اللہ نے فرمایا۔ ''اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ '' جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے یوں پڑھتے ہیں جیسے پڑھنے کا حق ہے۔ (بقرہ:۱۲۱) اور قرآن پڑھنے کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ اسے یوں بگاڑ کر نہ پڑھا جائے کہ معانی بدل جائیں جیسے ''قلب'' کی جگہ ''کلب'' پڑھنا۔ قلب کا معنی دل اور کلب کا معنی کتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ '' ہم نے قرآن آپ کے دل پر اتارا ہے۔'' (بقرہ:۹۷) اگر یہاں ''قَلْبِكَ'' کی جگہ ''كَلْبِكَ'' پڑھا جائے تو معنی یہ بنتا ہے کہ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ہم نے قرآن آپ کے.......... پر اُتارا ہے۔ یہ لفظ اتنا گھناؤنا ہے کہ نوک قلم پر نہیں آ سکتا۔ اسی طرح قرآن کو یوں تیز تیز پڑھنا کہ کئی حروف ضائع ہو جائیں کھڑے پڑے کا امتیاز نہ رہے، بھی حرام ہے۔ رمضان المبارک میں کئی لوگ ایسے حافظ کے پیچھے تراویح پڑھنا پسند رکھتے ہیں جو جلدی جلدی تراویح ختم کرے انہیں اس سے غرض نہیں کہ وہ صحیح پڑھتا ہے یا غلط۔ یہ روش ناپسندیدہ ہے نماز تیز خواں کے بجائے درست خواں کے پیچھے پڑھنی چاہیے۔ حضرت قتادہ (تابعی) فرماتے ہیں میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسے قرآن پڑھتے تھے فرمایا: ''کان یمد صوتہ مدّاً'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آواز کو لمبا لمبا کر کے پڑھتے تھے۔ (نسائی شریف کتاب الصلوٰۃ)

دوسرا ادب: قرآن خشوع خضوع سے پڑھا جائے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ''اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ '' اللہ نے سب سے بہتر کلام اتارا جو ملتی جلتی آیات والی کتاب ہے دہرائی جانے والی جس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں پھر ان کے جسم اور دل ذکر خداوندی کے لیے نرم پڑ جاتے ہیں۔'' (زمر:۲۳) امام قرطبی نے ایک درجہ بندی کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تلاوت میں سب سے اچھی آواز اس کی ہے کہ جب تم سنو تو محسوس کرو کہ وہ اللہ کے خوف کے ساتھ پڑھ رہا ہے۔'' (تفسیر قرطبی جلد اول مقدمہ صفحہ ۱۰) آدمی کو چاہیے کہ جب قرآن میں عذاب الٰہی والی آیات سے گزرے تو دل میں خوف خدا محسوس کرے۔ رحمت والی آیات پڑھے تو دل میں تمنا لائے کہ اللہ اسے بھی رحمت عطا فرمائے۔ جہاں ذوق و سرور حاصل ہو وہ آیت بار بار پڑھی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسا اوقات ایک آیت پڑھتے پڑھتے ساری رات گزار دیتے تھے۔ حضرت غوث اعظم اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما کے متعلق بھی ایسی روایات ہیں۔

تیسرا ادب: قرآن کا معنی سمجھ کر پڑھنا چاہیے

قرآن اگر معنی سمجھے بغیر پڑھا جائے تو بھی برکت ہے مگر سمجھ کر پڑھنا نور علیٰ نور ہو جاتا ہے اور یوں بھی اللہ تعالیٰ نے

اسے کتاب ہدایت بنا کر اُتارا ہے فرمایا۔ ''هُدًى لِّلنَّاسِ'''' یہ تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔'' (بقرہ:۱۸۵) اور ہدایت تب ہی مل سکتی ہے جب ہم اسے سمجھ کر پڑھیں۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی تفسیر سے مدد لی جائے جیسے آپ کے پیش نظر تفسیر ''برھان القرآن'' ہے۔ کیونکہ بعض اوقات صرف لفظی ترجمہ سے بات سمجھ نہیں آتی جب تک تفسیر کی طرف رجوع نہ کیا جائے کیونکہ قرآن سمجھنے کے لیے ساتھ ساتھ حدیث رسول ﷺ سے روشنی حاصل کرنا لازم ہے اگر حدیث کو چھوڑ کر صرف لفظی ترجمہ پر اکتفا کیا جائے تو بسا اوقات گمراہی ہاتھ آئے گی قرآن کریم کی بہت سی آیات منسوخ ہیں اور ان کی ناسخ آیات کونسی ہیں؟ یہ چیز تفسیر ہی بتا سکتی ہے اور تفسیر بھی کسی اہل سنت محقق عالم دین کی تحریر کردہ پڑھنی چاہیے۔

چوتھا ادب: قرآن اچھی آواز کے ساتھ پڑھنا چاہیے

اللہ جل شانہٗ کو یہ پسند ہے کہ اس کا کلام اچھی آواز کے ساتھ خوبصورت لہجے میں پڑھا جائے جسے ہم ترنم کہتے ہیں۔ سادہ اور تحت اللفظ سے پڑھنا بھی درست ہے مگر ترنم میں زیادہ ثواب ہے چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے انہیں فرمایا: ''لقد اوتيت مزماراً من مزامير آل داؤد'' اے ابوموسیٰ! تجھے آل داؤد کے لہجوں میں سے ایک لہجہ دیا گیا ہے۔ (بخاری شریف کتاب فضائل القرآن صفحہ ۷۴۴ مجموعہ صحاح ستہ) مسلم میں یہ حدیث یوں بیان ہے کہ فرمایا: اے ابوموسیٰ! کاش تم مجھے اس وقت دیکھتے جب تم کل رات قرآن پڑھ رہے تھے اور میں سن رہا تھا تجھے آل داؤد کا لہجہ دیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے اپنے نبی کو جن چیزوں کی اجازت دی ان میں سب سے عمدہ یہ ہے کہ اسے ترنم سے قرآن پڑھنے کا ارشاد فرمایا (مسلم شریف کتاب فضائل القرآن صفحہ ۸۰۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ليس منا من لم يتغن بالقرآن'' وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کو ترنم سے نہ پڑھے۔ (یعنی اسے یوں پڑھنا جائز نہ سمجھے) (بخاری کتاب التوحید باب ۴۴ ابوداؤد کتاب الوتر باب ۳۰ مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۲۷۱) بعض احادیث میں قرآن کو تطریب کے ساتھ ممنوع فرمایا گیا ہے اس سے مراد قرآن کو گانوں کی طرز پہ پڑھنا ہے۔

تلاوت کے دیگر احکام

تلاوت کے دیگر احکام میں سے یہ بھی ہے کہ باوضو تلاوت کی جائے زبانی قرآن کریم پڑھنا بغیر قرآن کریم کو ہاتھ لگائے بلاوضو بھی جائز ہے مگر افضل یہی ہے کہ بہر حال باوضو قرآن پڑھا جائے خواہ زبانی ہو یا دیکھ کر قرآن کریم کو بے وضو ہاتھ لگانا گناہ ہے۔

مسئلہ:

منہ میں لہسن، پیاز یا سگریٹ کی بدبو ہو تو قرآن کریم کو پڑھنا مکروہ ہے بلکہ تلاوت کے وقت خوشبو لگانا منہ صاف کرنا

اور ہر طرح کی بد بو دور کرنا چاہیے عورت کو حیض ونفاس کی حالت میں قرآن پڑھنا حرام ہے البتہ جوڑ کیساتھ پڑھ سکتی ہے اور بچوں کو جوڑوں کے ساتھ قرآن پڑھا سکتی ہے مگر ذکر و تسبیح اور درود شریف وغیرہ کا پڑھنا حیض کے دوران بھی جائز ہے۔

مسئلہ:

جب بہت سے لوگ اکٹھے قرآن پڑھیں جیسے قل شریف وغیرہ میں ہوتا ہے تو سب پر لازم ہے کہ آہستہ اور دل میں قرآن پڑھیں البتہ قرآن پڑھنے والے بچوں کی ساری کلاس بلند آواز سے قرآن پڑھ سکتی ہے ورنہ ان کی تعلیم میں حرج آئے گا۔

مسئلہ:

جب کوئی شخص نماز یا ذکر وغیرہ میں مصروف ہو تو اسکے پاس بلند آواز سے قرآن نہیں پڑھنا چاہیے جہاں لوگ سوئے ہوں یا کاروبار میں مصروف ہوں وہاں قرآن اونچی آواز سے نہیں پڑھنا چاہیے اگر کسی نے ایسے پڑھا اور لوگوں نے نہ سنا تو گناہ پڑھنے والے کو ہوگا۔ (ردالمختار)

اونچی آواز میں سپیکر پر شبینۂ قرآن کی رسم

آج کل ہندو پاک میں رسم چل نکلی ہے کہ مسجدوں میں ساری رات بلند آواز سے شبینہ قرآن پڑھا جاتا ہے اور سارے محلے میں آواز گونجتی رہتی ہے یہ بدعتِ سیئہ ہے ہر آدمی کے لیے اللہ تعالیٰ نے رات سکون کے لیے بنائی ہے تا کہ صبح اٹھ کر وہ تلاش معاش کے لیے جائے اور سپیکر میں یوں اونچا قرآن پڑھنا کہ لوگ سو نہ سکیں یہ اذیت المسلمین ہے شبینہ قرآن برطانیہ میں آکر دیکھئے رمضان المبارک میں لیلۃ القدر پر رات بھر مسجدیں مسلمانوں سے بھری رہتی ہیں اور وہ بیٹھ کر یا نوافل میں سارا قرآن سنتے ہیں اور باہر آواز نہیں جاتی پاکستان کے شبینوں میں باہر اذیت دہ شور ہوتا ہے اور اندر کوئی سننے والا نہیں۔

بحث سوم

حاملین قرآن کے فضائل

جو لوگ قرآن کے حفاظ، قراء، مدرسین، مفسرین، ناشرین اور خادمین بن کر محض رضاء الٰہی کے لیے اسکی خدمت کرتے ہیں اسکی تعلیم وتدریس، تفسیر وتوضیح اور نشر واشاعت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی اپنی محنت کے عوض اجر عطا فرماتا ہے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دو آدمیوں کے سوا کسی پر حسد (رشک)

نہیں ہے ایک وہ شخص جسے اللہ نے قرآن (کا علم) دیا اور وہ اسے صبح وشام پھیلاتا ہے اور دوسرا وہ جسے اللہ نے مال دیا اور وہ صبح وشام اس سے صدقہ کرتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔'' (بخاری کتاب فضائل القرآن صفحہ ۴۳۵) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں ماہر ہے وہ اللہ کے مقرب ترین اور معزز ترین بندوں کے ساتھ ہوں گے (مراد انبیاء وشہداء ہیں)'' (ترمذی شریف کتاب فضائل القرآن باب ۱۳ صفحہ ۱۹۴۳) معلوم ہوا جو قرآن کے حافظ وقراء ہیں جو قرآن پڑھنے میں پوری مہارت رکھتے ہیں وہ انبیاء وشہداء کے ساتھ ہوں گے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس آدمی نے قرآن پڑھا اور اسے زبانی یاد کرلیا۔ پھر اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا اسے اللہ جنت میں داخل کرے گا اور اس کے گھر والوں میں سے ایسے دس افراد کے لیے شفاعت قبول کرے گا جن کے لیے دوزخ واجب ہو چکی تھی۔'' (ترمذی شریف کتاب فضائل قرآن باب ۱۳ صفحہ ۱۹۴۳)

فصل دوم

قرآن کریم کی خصوصیات

قرآن کریم میں متعدد ایسی خصوصیات ہیں جو گذشتہ آسمانی کتابوں سمیت دنیا کی کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی نہ پائی جاسکتی ہیں ہم ان میں سے صرف دس خصوصیات کا ذکر یں گے۔

پہلی خصوصیت: دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانیوالی کتاب قرآن ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن دنیا کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں اور ہر نماز قرآن کی تلاوت ہی سے ادا ہوسکتی ہے اور چوبیس گھنٹوں میں سے ہر گھنٹے میں دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف اوقات میں پانچوں نمازیں بیک وقت پڑھی جارہی ہیں مثلاً جس وقت پاکستان میں دوپہر کے دو بجے نماز ظہر پڑھی جاتی ہے اسی وقت ہندوستان کے انتہائی مشرقی علاقوں میں چار بجے عصر ہوتی ہے۔ آگے اسی وقت انڈونیشیا میں مغرب پڑھی جاتی ہے مزید آگے اسی وقت آسٹریلیا وغیرہ میں عشاء کا وقت ہوتا ہے اور اسی وقت سورج پوری زمین کے اوپر سے چکر کاٹ کر امریکہ کی آخری مغربی ریاستوں پر طلوع ہونے والا ہوتا ہے اور لوگ نماز فجر میں مصروف ہوتے ہیں اس طرح چوبیس گھنٹوں میں ہر گھنٹے میں پوری روئے زمین پر ایک ارب سے زائد مسلمانوں کی زبانیں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ③ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ '' کے پڑھنے میں مگن ہوتی ہیں تو بلا مبالغہ دنیا کی کوئی کتاب اس قدر نہیں پڑھی جاسکتی جس قدر قرآن عملاً پڑھا جاتا ہے اسی لیے لفظ قرآن کا مادہ اشتقاق ''قرآءۃ'' بتایا گیا ہے جسکا معنی پڑھنا ہے بمعنی ''مقروئ'' یعنی پڑھی جانے والی کتاب چونکہ یہ سب سے زیادہ پڑھی جانیوالی کتاب ہے اس لیے اس کا نام قرآن رکھا گیا۔

دوسری خصوصیت: قرآن کا یاد کرنا آسان تر ہے

دنیا کی کوئی کتاب زبانی یاد کرنے میں اتنی آسان نہیں جس قدر قرآن ہے آٹھ دس سال کے بچے بھی کثرت سے پورا قرآن با آسانی یاد کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ'' ''اور ہم نے قرآن کا یاد کرنا آسان کر دیا ہے۔'' (القمر:۱۷) چنانچہ آج پوری روئے زمین پر ایک ارب سے زائد مسلمان ہیں اور یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر سو میں سے ایک مسلمان بہرحال حافظ قرآن ہوتا ہے یہ کم از کم کا حساب ہے ممکن ہے تعداد زیادہ ہو تو اگر ہر سو میں ایک مسلمان حافظ ہوتا ہے تو ایک ارب میں سے ایک کروڑ مسلمان کم از کم حافظ قرآن لازماً ہونے چاہیں۔ آج لایئے قرآن کے علاوہ کسی کتاب کا جو حجم میں قرآن کریم کے برابر ہو ایک ہی حافظ دکھایئے مگر آپ نہیں دکھا سکتے اس لیے کہ کسی کتاب کا زبانی یاد کرنا بے حد مشکل ہے۔

تیسری خصوصیت: دنیا کی سب سے پر اثر کتاب قرآن ہے

یہ بھی دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح قرآن دلوں پہ اثر انداز ہوتا ہے کوئی کتاب ایسی تاثیر اپنے اندر نہیں رکھتی۔ اسکی تاثیر سے وہ لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو اسکا مفہوم سمجھتے ہیں اگرچہ نہ سمجھنے والوں پر بھی یہ اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا جب قرآن نازل ہوا تو اہل عرب اس کی مٹھاس، سلامت اور اثر انگیزی سے حیران رہ گئے۔ کٹر سے کٹر دشمنانِ دین بھی اسے سن کر فرماں بردار بن گئے چند واقعات اختصاراً پیش خدمت ہیں۔

(1) حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ

آپ قرآن سن کر مسلمان ہو گئے، وہ خود بیان کرتے ہیں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں ہوتے تھے میں وہاں آیا اہل مکہ کے شرفاء میرے پاس آئے کہنے لگے اس شخص (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے لیے بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے ہماری قومی وحدت کے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ یہ جادوگر لگتا ہے اس نے آدمی کو والدین، بہن بھائیوں اور بیوی بچوں سے جدا کر دیا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے جیسی مصیبت میں تم اور تمہاری قوم بھی کہیں مبتلا نہ ہو جائے اس لیے تم اس کی بات مت سننا اور نہ اس سے کلام کرنا۔ حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں باوجودیکہ میں خود ایک اچھا شاعر تھا مگر میں نے تہیہ

کرلیا کہ نبی اکرم ﷺ سے کچھ کلام کروں گا نہ بات سنوں گا۔ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تاکہ آپ ﷺ کی آواز مجھ تک نہ پہنچے۔ چنانچہ میں حرم شریف میں آیا اور جہاں آپ ﷺ کعبۃ اللہ کے قریب کھڑے تھے میں بھی وہاں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی کچھ آواز مجھ تک پہنچا دی میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت اچھا کلام ہے میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ تو ایک اچھا شاعر ہے جو اچھے اور برے کلام میں امتیاز کر سکتا ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے آپ کا کلام سننا چاہیے اچھا ہو گا تو مان لوں گا برا ہو گا تو چھوڑ دوں گا۔ میں انتظار میں رہا جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر گھر کو چل دیے تو میں آپ ﷺ کے پیچھے گھر جا پہنچا۔ میں نے جا کر عرض کیا: اے محمد ﷺ! آپ کی قوم نے آپ کے متعلق مجھے ایسی ویسی باتیں بتائیں تھیں اور انہوں نے مجھے اتنا ڈرایا کہ میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی مگر اللہ نے مجھے آپ کا کچھ کلام سنا ہی دیا۔ جو مجھے بہت پسند آیا آپ مجھے اپنا کلام مزید سنائیے آپ نے مجھے مزید قرآن کریم سنایا خدا کی قسم! اس سے خوب تر اور عادلانہ کلام میں نے کبھی نہ سنا تھا۔ میں فوراً اسلام لے آیا اور حق کی شہادت دے دی۔

(2) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ چند آیات قرآن سن کر ایمان لے آئے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے قبول اسلام کا واقعہ بتاتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اسلام کا سخت دشمن تھا۔ مجھے ایک شخص نے بتایا کہ تمہارا بہنوئی اور تمہاری بہن دونوں مسلمان ہو چکے ہیں میرے غصہ کی انتہا نہ رہی۔ میں سیدھا ان کے مکان پر پہنچا۔ اندر سے کچھ پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے زور سے دروازہ بجایا دروازہ کھلا میں نے کہا تم کیا پڑھ رہے تھے۔ پھر میری ان سے تکرار شروع ہو گئی اور میں نے اپنے بہنوئی کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ میری بہن نے میرے بال پکڑ کر کھینچے اور کہا تم خود کو کیوں رسوا کرنا چاہتے ہو آخر میں نے خون بہتا دیکھا تو مجھے شرم آئی، میں نے کہا مجھے وہ کلام سناؤ جو تم پڑھ رہے تھے بہن نے کہا وہ پاک کلام ہے اسے پاک ہاتھ ہی چھو سکتے ہیں۔ اگر تمہاری نیت سچی ہے تو پہلے غسل کرو میں نے غسل کیا اور آ کر بیٹھ گیا میری بہن چند اوراق لے آئی جن میں یہ تحریر تھا۔ ''طٰهٰ ۞ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۞ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۞ تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۞ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۞ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۞ ''ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نہ اتارا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں مگر یہ ڈرنے والوں کے لیے نصیحت ہے یہ اس رب کا اتارا ہوا ہے جس نے زمین اور بلند آسمان بنائے اس خدائے رحمان نے عرش پر استواء فرمایا اسی کے لیے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور ان کے درمیان ہے اور جو گیلی مٹی کے نیچے ہے۔'' (طٰہٰ: ۱ تا ۱۵) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس سے آگے بھی چند آیات تھیں۔ اس کلام کی ہیبت میرے دل میں سما گئی میں نے کہا۔ ''امن ھذا فرت قریش'' کیا اس کلام سے قریش دور بھاگتے ہیں؟ ''وشرح اللہ صدری للاسلام'' اور

اللہ نے میرا سینہ اسلام کے لیے کھول دیا۔ (اس کے بعد آپ کے اسلام لانے کا پورا واقعہ مذکور ہے)

(3) نجاشی شاہِ حبشہ قرآن سُن کر مسلمان ہو گیا

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے حبشہ پہنچے تو قریش نے پیچھے عمار بن ولید اور عمرو بن العاص کو بھیجا جنہوں نے جا کر نجاشی سے کہا آپ کے ملک میں کچھ لوگ آئے ہیں جن کا نیا دین ہے اور وہ فساد بپا کرنے والے ہیں وہ آپ کے ملک میں تباہی لے آئیں گے۔ ہم آپ کے خیر خواہ ہیں اور بتانے آئے ہیں کہ وہ عیسیٰ ابن مریم کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے۔ وہ جب آپ کے دربار میں آئیں گے تو آپ کو سجدہ نہیں کریں گے۔ چنانچہ نجاشی نے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو بلایا جب وہ دربار میں آئے تو سجدہ نہ کیا۔ عمرو بن العاص نے نجاشی سے کہا ہم نہ کہتے تھے کہ یہ آپ کو سجدہ نہیں کریں گے۔ نجاشی نے غصہ میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے پوچھا تم لوگ یہاں ہماری سرزمین میں کیوں آئے ہو تم تاجر ہو نہ سائل پھر کیا مقصد ہے اور یہ تمہارا نبی کون ہے؟ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ وہ خطیبِ اہل ایمان تھے، کہنے لگے، اے بادشاہ! ہم پہلے شیطان کے پیروکار ہوتے تھے بتوں کو پوجا کرتے تھے۔ اللہ نے ہم میں اپنا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجا جس نے آ کر ہمیں بت پرستی سے روکا اور ایک خدا کی عبادت کا حکم دیا۔ ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ ہم ایک جاہل قوم تھے بت پرستی، قطع رحمی، مردار خوری اور لوگوں کی حق تلفی ہمارا شیوہ ہوتا تھا اللہ نے ہم میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجے جنہوں نے ہمیں ان باتوں سے منع کیا ہماری قوم ہمارے خلاف ہو گئی نجاشی کہنے لگا۔ تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو کلام اُترا ہے اس کا کچھ حصہ ہمیں سناؤ۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے سورہ مریم پڑھنا شروع کی۔ نجاشی اور اس کے پاس بیٹھے ہوئے پادری پر گریہ طاری ہو گیا وہ اتنا روئے کہ ان کے سامنے پڑی ہوئی کتابیں بھیگ گئیں۔ نجاشی کہنے لگا خدا کی قسم! جو کلام عیسیٰ علیہ السلام پر اترا اس میں اور اس کلام میں ذرہ برابر فرق نہیں۔ حضرت ابو براء رضی اللہ عنہ بھی مہاجرین حبشہ میں شامل تھے وہ فرماتے ہیں کہ نجاشی نے کہا اگر امورِ سلطنت درمیان میں حائل نہ ہوتے تو میں خود چل کر محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جاتا اور ان کی نعلین کے بوسے لیتا یہ سارے واقعات میں نے دلائل النبوۃ مطبوعہ حلب جلد اول کی فصل 15 سے نقل کئے ہیں جو صفحہ 299 سے لے کر 328 تک پھیلے ہوئے ہے میں نے اس پوری کتاب کا ترجمہ کیا ہے جو الحمد اللہ پوری آب و تاب کے ساتھ چھپ چکا ہے۔

چوتھی خصوصیت: قرآن کی تلاوت سے اکتاہٹ نہیں ہوتی

دوسری کتابوں کا حال یہ ہے کہ جو کتاب ایک بار پڑھ لی جائے اسے دوبارہ ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا خواہ وہ کتنی ہی عمدہ و شستہ تحریر پر مشتمل ہوں بلکہ جو کسی کتاب کو بار بار پڑھتا ہے بے وقوفی وحماقت زدہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ محض

ضیاع وقت ہے مگر قرآن کریم میں اللہ جل شانہٗ نے وہ مٹھاس بھر دی ہے کہ جتنی بار پڑھو ہر بار نیا ہی لطف محسوس ہوتا ہے اور دل اسے بار بار پڑھنے کو بے تاب رہتا ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے جس میں گذشتہ وقت کی خبریں اور آئندہ کی پیش گوئیاں ہیں یہ فیصلہ کن کلام ہے اس میں مذاق نہیں ہے جو متکبر اس سے منہ موڑے اللہ اسے تباہ کر دیتا ہے۔ اور جو اسے چھوڑ کر ہدایت ڈھونڈے اسے اللہ گمراہ کرتا ہے یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے اور اسکا نور مبین اور ذکر حکیم وہ صراط مستقیم ہے جسے کسی کی خواہشات ٹیڑھا نہیں کر سکتیں۔ علماء اس سے سیر نہیں ہوتے اور صالحین اس سے تھکتے نہیں اور بار بار پڑھنے سے اس کی تازگی میں فرق نہیں آتا۔ اور نہ اسکے عجائب ختم ہوتے ہیں اسے سن کر جنات بے اختیار پکار اٹھے کہ ہم نے بڑا تعجب انگیز قرآن سنا ہے جس کے پاس قرآن کا علم ہو وہ سب پہ سبقت لے گیا جس نے قرآن کی بنیاد پر بات کی وہ سچا رہا جس نے قرآن پر فیصلہ کیا اس نے عدل کیا جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا اور جس نے قرآن کی طرف دعوت دی اسے سیدھا راستہ مل گیا اے انسان! یہ باتیں یاد رکھ لے۔'' (قرطبی بروایت ترمذی)

پانچویں خصوصیت: قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا

قرآن کریم کی بعض خصوصیات گزشتہ آسمانی کتب کے مقابلہ میں ہیں۔ پہلی کتابیں یکدم نازل ہوئیں۔ اول تا آخر ساری کتاب ایک ہی بار نازل کر دی جاتی تھی مگر قرآن کریم تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا تیئس سالوں میں قرآن کا نزول مکمل ہوا اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سی حکمتیں شامل حال تھیں۔

اول

اس کا یہ مقصد بھی تھا کہ امت محمدیہ کے لیے قرآن پر عمل آسان ہو مثلاً پہلے شراب کی خرابی بیان کی گئی پھر نماز کے اوقات میں شراب پینا حرام کیا گیا آخر میں مکمل حرام قرار دے دی گئی پہلے نماز میں گفتگو جائز تھی پھر ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۝۲۳۸'' (بقرہ:۲۳۸) اتار کر نماز میں بولنا ممنوع کر دیا گیا اس کے برخلاف امتِ موسویہ پر تورات جب یکدم اتاری گئی تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا تب ان پر طور پہاڑ اٹھا کر ان سے تورات منوائی گئی مگر قرآن جوں جوں اترتا گیا مسلمان ساتھ ہی ساتھ عمل پیرا ہوتے گئے۔

دوم

پہلے بعض آیات میں سخت احکام اتارے گئے بعد میں دوسری آیات اتار کر حکم نرم کر دیا گیا تا کہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ممنون ہو اور جذبہ احسان مندی کیساتھ خوش دلی سے احکام بجالائے جیسے پہلے اس عورت پہ جس کا شوہر فوت ہو جائے سال بھر کی عدت لازم کی گئی بعد میں دوسری آیت اتار کر صرف چار مہینے دس دن کی عدت مقرر

کی گئی۔ پہلے روزہ بہت لمبا تھا اگر غروب آفتاب کے بعد آدمی سو گیا تو روزہ شروع ہو گیا پھر حکم نرم کر کے فرمایا گیا۔ اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآٮِٕكُمۡ‌ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّـكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ‌ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّکُمۡ كُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ وَعَفَا عَنۡكُمۡ‌ۚ فَالۡـٰٔنَ بَاشِرُوۡهُنَّ وَابۡتَغُوۡا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَـكُمۡ‌ۚ وَكُلُوۡا وَاشۡرَبُوۡا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَـكُمُ الۡخَـيۡطُ الۡاَبۡيَضُ مِنَ الۡخَـيۡطِ الۡاَسۡوَدِ مِنَ الۡفَجۡرِ‌ یہ فائدہ بھی تب ملا کہ قرآن آہستہ آہستہ اُتارا گیا اگر یکدم اُتار دیا جاتا تو یہ فائدہ نہ ملتا۔

سوم

تھوڑا تھوڑا کلام اُتارنے سے لوگ ساتھ ساتھ حفظ کرتے گئے اور جب قرآن مکمل ہوا تو اسکے ہزاروں حافظ تیار ہو چکے تھے۔ اگر یکدم سارا قرآن اُتارا جاتا تو طبیعتوں پر اسکا یاد کرنا گراں گذرتا، کیونکہ طبیعتیں کسی کتاب کو مکمل یاد کرنیکی پہلے سے عادی نہ تھیں۔ جب عادی ہو گئیں تو اب ہر کوئی سارا قرآن آسانی سے یاد کر رہا ہے۔

چہارم

اس میں اللہ کے محبوب ﷺ کی عظمت کا اظہار بھی ہے آپ جہاں ہوتے تھے قرآن وہیں پہنچا دیا جاتا تھا۔ حضور ﷺ گھر میں ہیں تو قرآن گھر میں آتا ہے، سفر میں ہیں تو سفر میں آتا ہے، مکہ میں ہیں تو مکہ میں اترتا ہے، مدینہ طیبہ میں جلوہ فرما ہیں تو قرآن مدینہ میں نازل ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات آپ اپنے اہل خانہ میں تشریف فرما ہیں تو قرآن وہیں پہ نازل ہوتا ہے جیسا کہ اہل علم سے مخفی نہیں۔ اسکے برخلاف موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کیلئے طور پر چالیس روز چلہ کشی کرتے ہیں تب کتاب ملتی ہیں مگر وہ صرف رسول تھے۔ اور آقائے دو جہاں ﷺ اللہ کے رسول بھی ہیں اور حبیب بھی۔ حبیب کا معاملہ دوسروں سے جدا ہوتا ہے۔

چھٹی خصوصیت: قرآن سارے عالمین کے لیے ہدایت ہے

پہلی کتابیں خاص قوموں کی ہدایت کیلئے اُتریں مگر قرآن ساری انسانیت بلکہ ساری کائنات کے لئے اترا۔ خود قرآن فرماتا ہے۔ ''شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِىۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ'' ''ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔'' (بقرہ ۱۸۵) پھر ایک جگہ فرمایا۔ ''تَبٰرَكَ الَّذِىۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰى عَبۡدِهٖ لِيَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِيۡنَ نَذِيۡرَا ۙ‏ ۱'' ''برکت وہ اللہ ہے جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب اپنے بندے پر اتاری تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے نذیر ہو جائے۔'' (فرقان:۱) دوسری جگہ فرمایا۔ ''اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۲۷'' ''قرآن نہیں ہے مگر تمام جہانوں کے لیے نصیحت۔'' (تکویر: ۲۷) یہی وجہ ہے کہ قرآن کے بعد کوئی

دوسری کتاب نہیں اُترے گی اور قرآن کی موجودگی میں کوئی کلام بصورت وحی نبوت نہیں اتر سکتا اور اسکا دعویٰ کرنے والا کافر و مرتد ہے جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا۔ گویا قرآن کی ہدایت اور برکت نے ساری کائنات کو قیامت تک کے لیے گھیر لیا ہے۔ اب کسی اور نبی کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی۔

ساتویں خصوصیت: اگر قرآن پہاڑوں پر اُترتا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ''لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ'' ''اگر ہم قرآن کسی پہاڑ پہ اتارتے تو تم دیکھتے کہ خوف خدا سے ڈھ جاتا۔'' (حشر:۲۱) یعنی قرآن وہ پُر ہیبت کلام خداوندی ہے کہ پہاڑ بھی اسکے آگے نہیں ٹھہر سکتے رسول کریم ﷺ کے قلب مبارک کو اللہ تعالیٰ نے پہلے اتنی قوت دی کہ اسے پہاڑوں سے بھی مضبوط تر کر دیا۔ تب اس پر قرآن اتارا لہٰذا یہ آپ ﷺ کی نبوت کی اعلیٰ دلیل ہے۔ حدیث میں ہے ایک بار نبی کریم ﷺ کسی اونٹنی پر سوار تھے کہ وحی اترنے لگی۔ وحی کے نزول کی جلالت و بوجھ اتنا تھا کہ قریب تھا کہ اونٹنی کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں۔

آٹھویں خصوصیت: قرآن کی زبان صرف عربی ہے

قرآن کو اللہ تعالیٰ نے محمد عربی ﷺ پر اتارا۔ اور اس کے اول مخاطبین اہل عرب تھے اس لیے اسے عربی زبان میں اتارا گیا۔ اور اس کی زبان صرف عربی قرار دی گئی کسی دوسری زبان میں اگر اس کا ترجمہ کیا جائے تو وہ قرآن نہیں قرآن کا ترجمہ ہے۔ لہٰذا ہم اسے قرآن کا درجہ نہیں دے سکتے کہ اسے نماز میں تلاوت کی جگہ پڑھا جا سکے یا اس کے ہر حرف پر دس نیکیوں کے ثواب کا وہی تصور قائم کیا جائے جو عربی قرآن کی تلاوت سے متعلق ہے البتہ فقہاء نے ترجمہ قرآن کو بے وضو ہاتھ لگانے سے منع کیا ہے کیونکہ اس کی قرآن سے ایک نسبت ہے نہ یہ کہ وہ قرآن ہے۔

اس امر کے دلائل کہ قرآن عربی میں ہے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ''اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝'' ''بے شک قرآن عربی میں اتارا تا کہ تم اسے سمجھو۔'' (یوسف:۲) ایک اور جگہ فرمایا۔ ''كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝'' ''یہ کتاب ہے جس کی آیات بیان کر دی گئی ہیں۔ یہ عربی قرآن ہے سمجھنے والی قوم کے لیے۔'' (حٰم سجدہ:۳) قرآن کریم میں ایسی کثیر آیات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ہم نے عربی قرآن اُتارا ہے اور قرآن وہی ہے جو اللہ کا اتارا ہوا ہے اور عربی ہے غیر عربی میں جو ہے اللہ کا اتارا ہوا نہیں بلکہ اسکا ترجمہ ہے ترجمہ خواہ کتنا عمدہ ہو وہ قرآن کی گہرائی پر حاوی نہیں ہو سکتا نہ ہی انسانی فکر کی آمیزش سے پاک ہو سکتا ہے اس لیے ہم اسے عین قرآن کا درجہ نہیں دے سکتے۔ اسی لیے آئمہ اصول

فقہ فرماتے ہیں۔''القر ان اسم للنظم والمعنی جمعاً'' قرآن لفظ اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے (نور الا نوار بحث اول کتاب اللہ صفحہ ۱۱ مطبوعہ پشاور) گویا اگر صرف معنی ہو الفاظ وہ نہ ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اتارے ہیں تو وہ قرآن نہیں اس بحث کا فائدہ یہ ہے کہ قرآن کو صرف عربی قرار دے کر اس میں تحریف وتغیر کا دروازہ بند کر دیا گیا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو قرآن میں بھی وہی تحریفات وتغیرات کر دی جاتیں جو پہلی کتابوں میں کی گئیں تورات پہلے عبرانی زبان میں اتری پھر اسے سریانی زبان میں ڈھالا گیا اور من پسند معانی بنائے گئے پھر وہاں سے اسے انگلش میں لے جایا گیا اور جو چاہا معنی کیا گیا انگلش سے اسے عربی میں اتارا گیا اور دیگر زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ اور یوں انسانی فکر کی چیرہ دستیوں نے کلام خداوندی کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ مگر قرآن کریم آج بھی اپنی اصلی شکل وصورت میں بعینہ اسی طرح انہی الفاظ کے ساتھ موجود ہے جن میں اسے آسمان سے اُتارا گیا۔ ایک حرف کی تبدیلی نہ ہوسکی۔

نویں خصوصیت: قرآن میں ہر خشک وتر کا بیان ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ہر چیز کا بیان رکھ دیا ہے اس کا ارشاد ہے۔''وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴿۵۹﴾'' ''کوئی خشک اور تر چیز نہیں مگر وہ کتاب مبین میں موجود ہے۔'' (انعام:۵۹) '' لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَلَاۤ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴿۳﴾'' ''اللہ سے ذرہ برابر کوئی چیز پوشیدہ نہیں آسمانوں میں نہ زمین میں، اور کوئی ذرہ سے چھوٹی یا بڑی چیز نہیں مگر وہ کتاب مبین میں موجود ہے۔'' (سبا:۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔''جمیع العلم فی القران لکن تقاصر عنه افهام الرجال'' سارا علم قرآن میں لیکن لوگوں کی عقلیں اس تک رسائی سے قاصر ہیں ہر آدمی قرآن کریم سے اتنا علم لے سکتا ہے جتنی اس کی عقل ہے یا جتنی توفیق الٰہی شامل حال ہے سمندر سے ہر کوئی اتنا پانی لے سکتا ہے جتنا اس کا برتن ہے اگر کسی کا برتن چھوٹا ہو تو وہ سمندر کی وسعت کا انکار نہیں کر سکتا اگر کرے تو وہ احمق ہے۔

دسویں خصوصیت: قرآن تا قیامت زندہ معجزہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے

پہلے انبیاء کو جو معجزات دیے گئے انکا اثر وقتی طور پر ظاہر ہوا انہیں چند لوگوں نے دیکھا بعد میں وہ تاریخ کا حصہ بن گئے مگر اللہ جل وعلا نے اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ابد الآباد رکھنے تک زندہ رہنے والا لازوال معجزہ بصورت قرآن عطا فرمایا جسکی مثال آج تک نہ بن سکی نہ بن سکے گی۔ پہلے انبیاء کو حسی معجزات دیے گئے جو آنکھوں سے دیکھے جاتے اور محسوسات میں تبدیلی لاتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معنوی اور علمی معجزہ عطا فرمایا جسکی فصاحت وبلاغت، ندرت کلام اور سلاست بیان نے سب شعراء، بلغاء وفصحاء کے پتے پانی کر دیے۔ منطقی اس سے اپنے منطقی موتی چن

رہے ہیں۔ صرفی نحوی اس سے عربیت کے میوے ڈھونڈ رہے ہیں علم بلاغت والے اسے اسرار بلاغت کا خزانہ قرار دیتے ہیں صوفیا اسے تصوف کا سمندر کہہ کر پکارتے ہیں ہر مفسر اس سے نئے سے نیا موتی نکالتا ہے۔ الغرض اس محیر العقول معجزے کے سامنے ہر علم والا زبان گنگ لیے پھرتا ہے اور اسکے ماتھے پر بے بسی کا پسینہ ہے۔

فصل سوم

قرآن کے کلام اللہ اور معجزہ ہونے کے دلائل

وجوہِ اعجاز قرآن

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے لاریب کتاب قرار دیا ہے جس کے کلام الٰہی ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔ یہاں ہم اپنی ناقص معلومات کے مطابق اس کے کلام اللہ ہونے پر سردست پانچ دلائل پیش کرتے ہیں جو ہر منصف مزاج شخص کو حق بات ماننے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

دلیل اول: نبی کریم ﷺ کا امی ہونا

نبی اکرم ﷺ اُمِّی تھے، اُمِّی آپ ﷺ کا لقب ہے اللہ فرماتا ہے۔" اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ ""جولوگ اس رسول (ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جو نبی امی ہے جسے اہل کتاب اپنے ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔" (اعراف:۱۵۷) اُمِّی اسے کہتے ہیں جس نے کسی انسان سے تعلیم نہ حاصل کی ہو جس نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا جس کا کوئی استاد نہ ہو اور اہل مکہ و دیگر اہل عرب خوب واقف تھے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی انسان سے تعلیم نہیں لی۔ نہ آپ کو کسی مدرسہ میں داخل کیا گیا آپ جس شہر میں پیدا ہوئے وہاں کی 99 فیصد سے زیادہ آبادی ان پڑھ تھی پورے شہر مکہ میں آٹھ دس سے زیادہ لوگ خط لکھنا نہ جانتے تھے۔ پھر آپ ﷺ یتیم پیدا ہوئے ولادت مبارکہ سے قبل ہی باپ کا سایہ اٹھ گیا والدہ ماجدہ اور دادا جان بھی جلدی داغ مفارقت دے گئے، یتیمی اور غربت میں آپ ﷺ کا بچپن گذرا۔ لہٰذا اول تو مکہ مکرمہ میں کوئی مدرسہ سکول یا دار العلوم تھا ہی نہیں جہاں آپ ﷺ تعلیم پاتے اور اگر ہوتا تو بھی آپ کا اس سے استفادہ کرنا مشکل تھا۔ اسی عالم میں آپ ﷺ نے بچپن اور جوانی گزاری جس کے شب و روز اہل مکہ پر کھلی کتاب کی طرح واضح تھے، لے دے کہ اہل عرب باشندگان مکہ میں جو علم تھا وہ اس دور کی شاعری تھی جوان لوگوں کو فطرتاً حاصل تھی۔ وہ کسی استاد سے سیکھتے نہ تھے وہ جاہل اور امی ہونے کے باوجود اتنے قادر کلام شاعر ہوتے تھے کہ جس کا بیان نہیں مگر قدرتِ الٰہیہ نے آپ ﷺ کو شاعر

ی سے دور رکھا اور سب جانتے تھے کہ آپ ﷺ شاعر نہیں ہیں کیونکہ شعر کہنے والے اکثر مبالغہ آرائی اور رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہوتے ہیں جب کہ آپ کی فطرت میں ازل سے صداقت و امانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور مکہ کا ایک ایک بچہ آپ ﷺ کی امانت و سچائی سے خوب واقف تھا۔ الغرض آپ ﷺ کے پاس اس دور کا مروجہ کوئی ظاہری علم نہ تھا۔ مگر یکا یک آپ ﷺ کی زبان مبارک قرآن کریم کی صورت میں علم و حکمت کے موتی اُگلنے لگی جسے سن کر علم والے دنگ رہ گئے، شعراء کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ لوگ شدید حیرت میں ڈوب گئے کہ آپ ﷺ کو اچانک کیا ہو گیا ہے یہ اس قدر لطیف کلام آپ ﷺ نے کہاں سے حاصل کر لی ہے؟ چنانچہ کسی نے کہا آپ ﷺ پر جنون ہو گیا ہے کوئی کہتا تھا ہمارے لات و ہبل خداؤں نے آپ ﷺ کو برائی پہنچا دی ہے مگر یہ کہنے والے خود ہی اپنے کہنے پر شرمندہ ہو جاتے جب وہ دیکھتے آپ ﷺ پر جنون کا کوئی اثر نہیں اور جو آپ ﷺ کلام بیان فرماتے ہیں وہ مجنونوں والا نہیں بلکہ حکمت کی مئے طہور سے لبالب کلام ہے۔ بعض نے یہ تاویل کی کہ آپ ﷺ شاعر ہو گئے ہیں لیکن فن شاعری سے واقف لوگوں نے کہا: نہیں یہ شعر ہر گز نہیں۔ اس میں وزنِ شاعری والی کوئی بات ہی نہیں جبکہ ایمان والے پہچان گئے کہ یہ کلام جنون ہے نہ شاعری نہ کہانت ہے بلکہ رب العالمین کی سچی وحی ہے۔

ولید بن مغیرہ کا اعتراف حق

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ولید بن مغیرہ کے پاس قریش جمع ہوئے وہ سب میں بوڑھا اور دانا تھا۔ وہ کہنے لگا اے قریش! موسم حج قریب آ گیا ہے عرب کے وفود حج کو آنے والے ہیں تم اپنے صاحب (نبی اکرم ﷺ) کے متعلق کوئی ایک رائے بنا لو اور جو حاجی آپ ﷺ کے متعلق تم سے پوچھے تو اسے ایک جیسا جواب دو۔ چنانچہ وہ اپنی اپنی رائے دینے لگے اور ایک دوسرے کو جھٹلانے لگے انہوں نے کہا ہمارے خیال میں آپ ﷺ کاہن (نجومی) ہیں ولید بن مغیرہ کہنے لگا بخدا وہ کاہن نہیں ہیں ہم نے بڑے کاہن دیکھے ہیں مگر یہ کہانت جیسا منتر نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا پھر ہم اسے مجنون سمجھتے ہیں ولید نے کہا جنون وہ ہے جس میں آدمی کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں مگر یہاں ایسا معاملہ ہر گز نہیں۔ قریش نے کہا پھر ہمارے خیال میں وہ شاعر ہیں ولید نے پھر انہیں سرزنش کی کہ ہوش کی بات کرو وہ شاعر نہیں ہیں ہم شعر کی تمام اقسام سے واقف ہیں جیسے رجز، معزجہ، قریضہ، مقبوضہ، مسبوطہ، مگر انکا کلام اس میں سے کچھ نہیں۔ قریش نے آخر میں کہا تو پھر وہ ساحر ہیں ولید نے پھر کہا نہیں ہم نے جادوگروں کو پھونکیں مارتے اور گرہیں لگاتے دیکھا ہے مگر ان میں ایسی کوئی علامت نہیں۔ قریش نے زچ ہو کر کہا اے ابو عبد شمس (ولید بن مغیرہ) تم ہی بتاؤ پھر کیا کہا جائے کہنے لگا خدا کی قسم! ان کی کلام میں بڑی مٹھاس ہے اسکی جڑ مضبوط اور شاخ بارآور ہے تم جو بھی جھوٹی بات بناؤ گے اسکی حقیقت لوگوں پر کھل جائے گی تمہاری باتوں میں سے آخری بات ہی زیادہ قرین عقل ہے کہ ان کو جادوگر کہا جائے کیونکہ وہ جادو

سے آدمی کو اپنے والدین، بھائیوں اور بیوی بچوں سے جدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ یہی رائے پختہ کر کے اپنی اپنی راہ چل دیے۔ (دلائل النبوۃ جلداول صفحہ ۳۰۲ مطبوعہ عربیہ حلب) خلاصہ یہ کہ نبی کریم ﷺ کا امی ہونے کے باوجود قرآن کریم جیسی عظیم عالمانہ کتاب کا لانا اس کے کلام اللہ ہونیکی روشن ترین دلیل ہے۔

دلیل دوم: قرآن کی نظیر کوئی لا سکا نہ لا سکے گا

جب قرآن کا نزول شروع ہوا تو کفار نے کہا یہ تو پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ایسی کہانیاں ہم بھی بنا سکتے ہیں کہنے لگے۔ "لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۱" "اگر ہم بھی چاہیں تو ایسا کلام کہہ سکتے ہیں یہ تو صرف پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔" (انفال:۳۱) اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس بات پر انہیں چیلنج فرمایا: "قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸" "آپ (ﷺ) فرما دیں اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ اس طرح کا اور قرآن لے آئیں تو کبھی اس کی مثل نہ لا سکیں گے خواہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ (بنی اسرائیل:۸۸) اس چیلنج کے سامنے سارا جہان عاجز آ گیا کہ قرآن جیسی دوسری کتاب لائیں جو علم و حکمت کے ایسے ہی موتی اپنے دامن میں رکھتی ہو جیسے دامن قرآن میں ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے چیلنج کو مزید آسان کرتے ہوئے فرمایا۔ "قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۳" "کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن اس نے (محمد ﷺ) اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے" آپ (ﷺ) فرما دیں تم اس جیسی دس سورتیں لے آؤ جو گھڑی ہوئی ہوں اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو بلا لاؤ اگر تم سچے ہو۔" (ہود:۱۳) مگر عرصہ گزر گیا قرآن جیسی دس سورتیں بھی کسی سے نہ بن سکیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں جو نزول کے اعتبار سے آخری سورتوں میں سے ہے ارشاد فرمایا: "فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳" "تو قرآن جیسی ایک ہی سورت لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگار بھی بلا ؤ اگر تم سچے ہو۔" (بقرہ:۲۳) یہاں اللہ تعالیٰ نے بِسُوْرَةٍ (اسم نکرہ) فرمایا جس کا معنی ہے کوئی بھی سورت لے آؤ خواہ وہ بڑی سورت ہو یا بہت چھوٹی، مگر چودہ صدیوں سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ آج تک انسانی فکر اس بلندی تک نہیں پہنچ سکی کہ قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثل لا سکے۔ اور یہ مانے بغیر کوئی چارہ نہ رہا کہ قرآن رب العالمین کا کلام ہے کیونکہ دنیا کا دستور ہے کہ جو چیز انسان نے بنائی ہو دوسرا انسان اس جیسی بلکہ اس سے بہتر چیز بنا سکتا ہے اور بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ایک فرم جہاز تیار کرتی ہے تو دوسری فرم اس سے بڑا جہاز بنا دیتی ہے، ایک ملک مہلک اسلحہ بناتا ہے تو دوسرا ملک اس سے مہلک تر اسلحہ لے آتا ہے۔ مگر آج تک کوئی انسان مکھی یا اس کا پر نہیں

بنا سکا کیونکہ وہ انسان نے نہیں خدائے ذوالجلال نے بنائی ہے خدا کی بنائی ہوئی چیز کی مثل انسان نہیں بنا سکتا تو قرآن کی مثل کیسے بن سکتی تھی؟ کیونکہ وہ اللہ کا کلام ہے۔

اعجاز قرآن کے حوالے سے لطیف نکتہ

انبیاء سابقین کو جو معجزات دیے گئے وہ انسانی عادت سے کچھ لگاؤ نہ رکھتے تھے جیسے پہاڑ سے اونٹنی پیدا کرنا، لاٹھی کا اژدھا بننا، یا ایک بڑے تخت کا ہوا میں اڑنا وغیرہ اس پر منکرین کہہ دیتے تھے یہ جادوگری ہے مگر قرآن ایک کلامی معجزہ ہے اور اہل عرب اپنی کلام کی باریکیاں خوب سمجھتے تھے اس لیے قرآن کو جادو کہنا آسان نہ تھا اور اسے جادو قرار دینے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور حق ظاہر ہو کر رہا۔

دلیل سوم: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایام گزشتہ کی خبریں دینا

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیاء کے واقعات بصورت قرآن وحدیث بیان فرمائے حالانکہ ان واقعات تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بظاہر کوئی رسائی نہ تھی، نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاریخ کا مطالعہ کیا تھا۔ مکہ میں بظاہر واقعات بتانے والا کوئی نہ تھا نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے اگر کہیں گئے ہیں تو صرف ملک شام کے دو سفر فرمائے، پہلا بچپن میں تھا دوسرا جوانی میں بغرض تجارت تھا جو صرف چند دنوں کے لیے ہوا اس میں اتنی بڑی کتاب کے لیے خاکہ تیار کرنا اور سینکڑوں واقعات کا سیکھنا محال ہے لہٰذا کہنا پڑتا ہے کہ یہ سب کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ جل وعلا نے بصورتِ وحی بتایا جیسے قرآن میں ہے ''ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪'' ''یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف وحی فرماتے ہیں جب کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہاں موجود نہ تھے جب وہ (مجاورینِ بیت المقدس) قلمیں ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی کفالت کرے گا۔'' (آل عمران: ۴۴)

دلیل چہارم: قرآن کی پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئیں

قرآن نے ایسی پیش گوئیاں کیں جنہیں انسانی علم کی طاقت سے نہیں کیا جا سکتا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نجومی تو تھے ہی نہیں اہل مکہ بھی مانتے تھے یہود ونصاریٰ کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ لہٰذا وہ اللہ رب العزت کی دی ہوئی خبریں ہی قرار دی جا سکتی ہیں مثلاً

پہلی پیش گوئی ''رومیوں کا اہل فارس پہ غالب آنا''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکی دور میں روم وفارس کی جنگ ہوئی روم کو شکست فاش ہوئی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ''فِيْ

بِضۡعِ سِنِيۡنَ ؕ لِلّٰهِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَيَوۡمَئِذٍ يَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾ ''''رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہوئے اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب چند ہی سالوں میں غالب آنے والے ہیں۔'' (روم:۴) چنانچہ سن ہجری ۲ میں روم اور فارس کی دوبارہ جنگ ہوئی اور رومی اہل کتاب کو مشرکین فارس پہ عظیم الشان غلبہ حاصل ہوا جسکا پہلے سے تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور کلام خداوندی سچ ثابت ہوا۔

دوسری پیش گوئی ''مسجد حرام میں مسلمانوں کا داخل ہونا''

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا تو بظاہر ناممکن نظر آتا تھا کہ یہ لوگ دوبارہ وہاں جاسکیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ ۙ'''' اے مسلمانو! تم مسجد حرام میں انشاء اللہ ضرور داخل ہو گے امن کے ساتھ۔'' (فتح:۲۷) یعنی فرمایا گیا تم یوں مسجد حرام میں جاؤ گے کہ تمہیں پورا امن ہوگا کوئی تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ پورا کر دکھایا اور فتح مکہ کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مکہ مکرمہ پر پورا قبضہ کرلیا۔

تیسری پیش گوئی ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا '' وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ'' ''اور اللہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو لوگوں سے بچائے گا۔'' (مائدہ ۶۷) دوسری جگہ فرمایا گیا ''فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ'''' عنقریب اللہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان (کفار) کے مقابلہ میں کافی ہوگا۔'' (بقرہ:۱۳۷) چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی بارہا کوشش کی گئی کفار مکہ نے شب ہجرت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا گہرا منصوبہ بنایا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا پھر مدینہ طیبہ میں یہود نے بارہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا منصوبہ بنایا اور ہر بار عین وقت پر اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے ارادوں سے باخبر فرما دیتا اور یوں اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔

چوتھی پیش گوئی ''خلافت راشدہ کا قیام اور دین کا استحکام''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلافتِ اسلامیہ قائم ہوئی جس نے دنیا کے بڑے حصہ پر حکومت کی اور دیکھتے ہی دیکھتے روم وفارس جیسی بڑی بڑی سلطنتوں کو نگل گئی اور دنیا کی سب دوسری قومیں مسلمانوں کی مرضی پر زندہ رہتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: '' وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۖ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمۡ دِيۡنَهُمُ الَّذِى ارۡتَضٰى لَهُمۡ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ'''' اللہ نے مومنوں سے وعدہ فرمایا جو عمل صالح کرنے والے ہیں کہ اللہ انہیں زمین میں خلافت دے گا جیسے اس نے تم سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی اور انکے لیے جو دین اللہ نے پسند فرمایا ہے اسے زمین میں ثابت قدمی

دے گا اور انکے لیے خوف کے بعد امن پیدا فرما دے گا۔ (نور:۵۵)

یہ تمام پیش گوئیاں بتا رہی ہیں کہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں اللہ رب العزت کا کلام ہے اور خلق خدا اس کی مثل لانے سے عاجز ہے۔

دلیل پنجم: قرآن کو اللہ تعالیٰ نے تحریف سے محفوظ رکھا ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ''اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝۹'' ''بے شک ہم ہی نے ذکر نازل فرمایا اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔'' (حجر:۹) چنانچہ قرآن میں کوئی کمی بیشی کی گئی نہ کی جاسکے گی کیونکہ اسکی حفاظت اللہ رب العزت خود فرمانے والا ہے پہلی آسمانی کتب کی حفاظت اللہ نے ان کے ماننے والوں کے سپرد کی جنہوں نے انکا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا مگر قرآن کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے تا قیامت ذریعہء ہدایت بنایا اس لیے اس کی حفاظت بھی خود فرمائی۔ چنانچہ بارہا کوشش کی گئی کہ پہلی کتابوں کی طرح اس میں بھی کمی بیشی کی جائے مگر اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیا اور اسکی اللہ تعالیٰ نے اول تدبیر یہ فرمائی کہ اس کی زبان صرف ایک رکھی یعنی عربی، جیسے پیچھے گزر گیا دوسرا اسے زبانی یاد کرنا آسان کر دیا اور اسکے ہزاروں لاکھوں حافظ تیار ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے سے قبل قرآن کے سینکڑوں ہزاروں حفاظ تیار ہو گئے تھے لہٰذا قرآن میں کوئی تبدیلی کسی کے لیے ممکن نہ رہی۔ تیسرا اہتمام اسکی حفاظت کے لیے یہ کیا گیا کہ سارا قرآن رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھ لیا گیا جو مختلف پتھروں، کپڑوں پہ لکھا گیا بعد میں اسے جمع کر کے کتابی صورت بنالی گئی۔ قرآن کی یہ حفاظت بھی اس کے معجزاتی کلام ہونے کی دلیل ہے۔

فصل چہارم

قرآن کے نزول اور جمع کی تاریخ

قرآن کریم کب نازل ہوا؟ نزول کی کیا کیفیت تھی؟ پھر اسے کس طرح لکھا گیا اور بالآخر کتابی صورت میں لایا گیا؟ اسے ہم الگ الگ بحثوں میں ذکر کرتے ہیں۔

بحث اول: نزول قرآن کی کیفیت

رب العالمین جل جلالہ کا ارشاد ہے ''شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِىۡٓ اُنۡزِلَ فِيۡهِ الۡقُرۡاٰنُ'' ''ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔'' (بقرہ:۱۸۵) دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ ۝۱'' ''بیشک ہم نے قرآن کو ''لَيۡلَةُ الۡقَدۡرِ'' میں نازل فرمایا۔'' (القدر:۱) یہ قرآن کا پہلا نزول ہے جو لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر بیت

العزت میں ہوا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا: ''قرآن آسمان دنیا کی طرف لیلۃ القدر میں یکبارگی اتارا گیا اس کے بعد وہ بیس سالوں میں نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا'' (متدرک للحاکم جلد دوم صفحہ ۲۲۲ کتاب التفسیر) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیس سال ارشاد فرمایا جب کہ جمہور تیئس سال کہتے ہیں اور وہی درست ہے آپ کا بیس سال کہنا اس لیے ہے کہ ابتداء میں تین برس تک وحی کا سلسلہ موقوف رہا تو اگر پہلے تین برس جو توقفِ وحی کے ہیں نکال دیں تو باقی بیس برس ہی رہ جاتے ہیں۔

آسمان دنیا پر قرآن کا پہلا نزول کیوں ہوا؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم سیدھا زمین پر رسول اللہ ﷺ کی طرف کیوں نہ اتارا گیا پہلے اسے آسمان دنیا پر اتارنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ قرآن اللہ کی سب کتابوں سے اہم تر اور مہتم بالشان ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ تمام ملائکہ اور آسمانی مخلوق اس سے آگاہ ہو جائے کہ یہ وہ آخری کتاب ہے جو سب سے عظیم تر ہے اور اسے زمین پر انسان کی ہدایت کے لیے اتارا جا رہا ہے۔ امام زرکشی علیہ الرحمہ نے یہی حکمت بیان فرمائی ہے (دیکھیے البرہان فی علوم القرآن جلد اول صفحہ ۲۲۴) یہ آسمان دنیا پر قرآن کا یکبارگی رمضان المبارک کی لیلۃ القدر میں اتارا جانا کب وقوع پذیر ہوا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا اللہ ہی بہتر جانتا ہے قرین قیاس یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی طرف نزولِ قرآن کے آغاز سے قبل ہی کا واقعہ ہے۔

جب قرآن کا نزول شروع ہوا

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں سب سے اول نبی کریم ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی وہ نیند میں اچھی خوابیں تھی (اسکے وحی نبوت ہونے میں اختلاف ہے) تو آپ ﷺ جو خواب دیکھتے وہ طلوع فجر کی طرح پوری ہو جاتی۔ پھر آپ ﷺ کو تنہائی پسند کرا دی گئی اور آپ ﷺ غار حرا میں جا کر کئی کئی رات مسلسل عبادت فرماتے۔ نہ گھر آتے نہ کھانا کھاتے۔ پھر جب گھر تشریف لاتے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو مزید دنوں کے لیے کھانا بنا دیتیں تا آنکہ آپ ﷺ پر قرآن اتر آیا اور آپ ﷺ حرا میں ہی تھے فرشتہ (جبرائیل علیہ السلام) آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اِقْرَاْ پڑھیں آپ ﷺ نے فرمایا: میں پڑھنے والا نہیں آپ ﷺ فرماتے ہیں: تو فرشتہ نے مجھے پکڑ کر دبایا اور سارا زور لگا دیا پھر مجھے چھوڑا تو کہا اب پڑھیے میں نے کہا: میں پڑھنے والا نہیں پھر اس نے مجھ پکڑ کر دبایا اور سارا زور لگایا پھر چھوڑا تو کہا پڑھیے میں نے کہا میں پڑھنے والا نہیں تو اس نے مجھے تیسری بار پکڑ کر سارے زور سے دبایا اور کہا'' اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ '' ''اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے بنایا پڑھیے آپ (ﷺ) کا رب (آپ ﷺ) پر بہت مہربان ہے۔'' (علق: ۱ تا ۳) نبی کریم ﷺ یہ کلام

لے کر گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے فرمایا ''ذملونی ذملونی'' مجھے کمبل اوڑھا دو مجھے کمبل اوڑھا دو۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کمبل اوڑھا دیا گیا تا آنکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خوف جاتا رہا پھر آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سارا واقعہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے خدیجہ! رضی اللہ عنہا میں اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتا ہوں حضرت خدیجہ عرض کرنے لگیں ہرگز نہیں خدا کی قسم! اللہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی غمزدہ نہیں کرے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلہ رحمی، ناداروں کی کفالت، مجبوروں کی اعانت، مہمان نوازی اور مصیبت میں لوگوں کی مدد فرماتے ہیں۔ چنانچہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس گئیں جو ان کا چچازاد بھائی تھا۔ اور دور جاہلیت میں اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی وہ عبرانی میں کتاب لکھتا تھا اور بڑھاپے کی وجہ سے اس کی بینائی جاتی رہی تھی۔ اسے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں اے میرے چچازاد بھائی! اپنے بھتیجے سے ساری بات سنیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھنے لگا اے بھتیجے! تم نے کیا دیکھا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ساری بات سنائی وہ کہنے لگا خدا کی قسم! یہ وہی وحی ہے جو اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتاری تھی اے کاش! میں تب تک زندہ رہوں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوم نکال دے گی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟ کہنے لگا جب بھی کوئی آدمی ایسی وحی لے کر آیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں تو اس کی ضرور مخالفت کی گئی اور اگر میں اس وقت زندہ ہوا تو ضرور آپ کی بھرپور مدد کروں گا مگر وہ جلدی ہی فوت ہو گیا (بخاری شریف باب بدء الوحی صفحہ اول مجموعہ صحاح ستہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمانا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے پہلی وحی کی ہیبت کی وجہ سے تھا کہ وہ کلام ہے جو کہ پہاڑوں پر اترتا تو وہ پاش پاش ہو جاتے اور ورقہ بن نوفل کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود نہیں گئے نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے متعلق کوئی شک تھا یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنی تسلی و دل جمعی کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے گئیں اور اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکمت پوشیدہ تھی کہ مکہ میں سب سے بڑے عالم ورقہ بن نوفل کی زبانی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق ہو جائے ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی نبوت میں شک نہ تھا۔ اس لیے کہ ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلی وحی کے بعد حرا سے گھر آئے تو ہر پتھر اور درخت سے آواز آ رہی تھی السلام علیك یارسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(دلائل النبوۃ ابو نعیم جلد اول صفحہ ۲۸۰ فصل ۱۴ مطبوعہ حلب) (مسند ابوداؤد طیالسی حدیث ۲۳۱۸ باب بدء الوحی)

نزول وحی کی کیفیت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا نزول متعدد طرح سے ہوتا تھا۔ ابتداء میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچی خوابیں دکھائی گئیں جو طلوع فجر کی طرح درست طور پر ظاہر ہو جاتی تھیں یعنی جو خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا وہ من وعن اسی طرح واقع ہو گیا یہ اعلان نبوت سے پہلے چھ ماہ کیفیت رہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد بھی ہے کہ اچھی خوابیں نبوت کے حصوں میں سے چالیسواں حصہ ہے اور کبھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھنٹی بجنے کی سی آواز سنتے تھے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے سب سے مشکل صورت تھی اور کبھی جبرائیل امین علیہ السلام بصورت انسان آتے اور پیغام خداوندی پہنچا دیتے اور جبرائیل علیہ السلام کا بصورت انسان آنا آسان تر صورت تھی۔

اس کی وجہ علماء نے یہ بیان کی ہے کہ وحی دینے والے فرشتہ اور وحی لینے والے نبی کے درمیان اشتراک حالت کا ہونا ضروری ہے تا کہ پیغام وحی منتقل کیا جا سکے تو کبھی آپ کو صورت ملکی میں لے جایا جاتا اور جب فرشتہ صورتِ بشری میں آ جاتا تو آپ ﷺ کو تھوڑی زحمت اٹھانا پڑتی تھی۔ جب آپ ﷺ پر پہلی صورت میں وحی آتی تھی اسکی کیفیت اس حدیث سے واضح ہوتی ہے حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں خواہش رکھتا تھا کاش میں وہ حالت دیکھوں جب رسول اللہ ﷺ پر وحی آتی ہے چنانچہ آپ ﷺ مقام معرانہ میں تشریف فرما تھے ایک کپڑے سے آپ ﷺ پر سایہ کیا گیا تھا ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا جس نے خوشبو میں تر لباس پہن رکھا تھا کہنے لگا یارسول ﷺ جو آدمی خوشبو سے تر جبہ میں احرام کی نیت کرے اس کا کیا حکم ہے (کیا اس کا احرام درست ہے) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت یعلی رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا (کہ آؤ نزول وحی کی کیفیت دیکھ لو) حضرت یعلی رضی اللہ عنہ آئے اور اپنا سر (پردے میں) داخل کیا تو دیکھا نبی کریم ﷺ کا چہرہ مبارک بہت سرخ ہو گیا ہے یہ کیفیت کچھ دیر رہی پھر آپ ﷺ کو افاقہ ہو گیا اور فرمایا وہ سائل کہاں ہے جو ابھی عمرہ کے احرام کے متعلق مجھ سے پوچھ رہا تھا تو اس شخص کو ڈھونڈ کر آپ ﷺ کے پاس لایا گیا آپ ﷺ نے فرمایا: تم پر جو خوشبو ہے اسے تین بار دھو دے اور جبہ اتار دے پھر عمرہ کے لیے حج کی طرح طریقہ اختیار کر۔ (بخاری شریف کتاب فضائل القرآن صفحہ ۴۳۲ مجموعہ صحاح ستہ) اہل سیر کے نزدیک نزول وحی کی اور بھی صورتیں تھیں مثلاً جبرائیل علیہ السلام کا آپ ﷺ کے قلب مبارک پر کوئی کلام القاء کرنا اور کبھی جبریل کا آپ ﷺ کے سامنے اپنی اصلی ملکی صورت میں آنا اور کبھی اللہ رب العزت کا آپ ﷺ سے بلا واسطہ کلام فرمانا جیسے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔

(مواہب لدنیہ مدارج النبوت، عمدۃ القاری وغیرہ)

بحث دوم: نبی اکرم ﷺ نے آیات اور سورتوں کی ترتیب خود دی

ساری امت کا یہ اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم خداوندی کے مطابق سورتوں کو خود مرتب فرمایا یعنی جس ترتیب پر سورتیں اس وقت موجود ہیں کہ سورہ بقرہ کے بعد آل عمران ہے اس کے بعد سورہ نساء ہے اسی طرح آگے، یہ ترتیب لوح محفوظ والی ہے اور اسی طرح ہر سورت میں اول سے آخر تک تمام آیات کی ترتیب لوح محفوظ والی ہے اور اسی طرح ہر سورت میں اول سے آخر تک تمام آیات کی ترتیب بھی لوح محفوظ کے مطابق ہے اور رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں سینکڑوں حفاظ قرآن اسی ترتیب پر قرآن پڑھتے تھے جو آج قرآن کی ہے اس امر پہ یہ احادیث دلالت کرتی ہیں۔

(۱) حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: ''مجھے سبع طوال (سات لمبی سورتیں) تورات کی جگہ دی گئی ہیں۔ مئین (سو آیات سے اوپر والی آیات) مجھے انجیل کی جگہ عطا کی گئی ہیں۔ مثانی مجھے زبور کی جگہ پر ملی ہیں اور مفصل کے ساتھ مجھے سب پہ بڑھا دیا گیا ہے۔'' (مسند ابوداؤد طیاسی احادیث واثلہ بن اسقع حدیث نمبر ۱۰۱۲)

یاد رہے سورہ بقرہ سے لے کر سورہ انفال تک سورتیں سبع طوال کہلاتی ہیں۔ اس کے بعد والی سورہ انجیل تک مئین

ہیں پھر مثانی ہیں اور سورہ ق سے آخر قرآن تک سب سورتیں مفصل کہلاتی ہیں یہ حدیث بتاتی ہے کہ تمام سورتوں کی ترتیب خود نبی اکرم ﷺ کی عطا کردہ ہے۔

(۲) حضرت اویس بن حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم وفد ثقیف میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ہم چند راتیں حضور ﷺ کے پاس رہے آپ ﷺ روزانہ عشاء کے بعد ہم سے گفتگو فرماتے۔ایک رات آپ ﷺ دیر سے تشریف لائے اور فرمایا میں قرآن سے اپنی منزل کی تلاوت ختم کر رہا تھا اس لیے مجھے دیر ہوگئی میں نے بہتر نہ جانا کہ منزل ختم کرنے سے قبل چلا آؤں حضرت اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول ﷺ کے صحابہ سے پوچھا تم قرآن کی منزلیں کیسے بناتے ہو، کہنے لگے پہلی تین سورتیں، پھر پانچ سورتیں، پھر سات، پھر نو، پھر گیارہ، پھر تیرہ سورتیں اور مفصل والی سورتیں ایک ہی حزب (منزل) بناتے تھے۔

(مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۴۲ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سات دنوں میں پورا قرآن کریم ختم کر لیتے تھے پہلے دن تین سورتیں، دوسرے دن پانچ، تیسرے دن سات، پھر نو، پھر گیارہ اور تیرہ سورتیں اسطرح چھ دن گزر گئے اور کل 48 سورتیں ہوگئیں اس کے بعد 49 ویں سورت قرآن میں سورہ حجرات ہے وہاں سے آخر تک ساری سورتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آخری یعنی ساتویں دن پڑھ کر قرآن مکمل کر لیتے تھے جب کہ سورہ فاتحہ روزانہ پڑھتے تھے۔تو اس حدیث سے بھی صاف معلوم ہو گیا عہد نبوی ﷺ ہی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجودہ ترتیب کیمطابق ہی سارا قرآن پڑھتے تھے اور اسمیں کیا شک ہے کہ انہیں اس کی تعلیم نبی کریم ﷺ نے دی تھی اور آپ کی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے گویا جس ترتیب پر قرآن لوح محفوظ پر تھا پھر آسمان دنیا پر آیا اسی ترتیب کے مطابق نبی کریم ﷺ نے بھی زمین پر اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یاد کروایا۔ تاہم قرآن کریم چونکہ تھوڑا تھوڑا کر کے اتر رہا تھا اس لیے جب بھی کوئی آیت اترتی نبی کریم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے۔اس آیت کو فلاں سورت میں فلاں جگہ رکھ لو یعنی فلاں آیت کے بعد اور فلاں آیت سے پہلے فلاں سورہ میں یہ آیت پڑھا کرو اور اس پر کثیر احادیث کی گواہی موجود ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ پر کوئی آیت اترتی آپ ﷺ قرآن لکھنے والوں کو بلاتے اور فرماتے اس آیت کو فلاں آیت کے ساتھ فلاں سورت میں اس جگہ رکھ لو جہاں فلاں واقعہ بیان ہوا ہے (ترمذی کتاب التفسیر سورہ توبہ صفحہ ۱۹۶۳) یہ حدیث ابوداؤد، نسائی، مستدرک اور تفسیر طبری وغیرہ میں بھی موجود ہے گویا جوں جوں قرآن اترتا گیا سورتیں مکمل ہوتی گئیں اور لوح محفوظ میں کسی سورت کے اندر جتنی آیات تھیں وہ تھوڑی تھوڑی کر کے اترتی آئیں اور حضور ﷺ ان کی ترتیب لگواتے رہے، یوں قرآن کریم مکمل ہوگیا۔

بحث سوم: عہد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں قرآن کا جمع کیا جانا

حضور پر نور ﷺ پر جب کوئی آیہ مبارکہ نازل ہوتی تو آپ ﷺ کسی صحابی سے جو اس وقت موجود ہوتا اور لکھنا جانتا

تھا فرماتے کہ اسے لکھ لو تو اسے لکھ لیا جاتا مگر وہاں کوئی کتاب یا کاپی نہ تھی جس میں اسے لکھا جاتا تھا۔ بلکہ کسی نے اسے کاغذ پر لکھا کسی نے کپڑے پہ لکھا کسی نے اسے پتھر پر لکھ لیا اور اپنے پاس محفوظ کر لیا اور وہ کاغذ، کپڑے اور پتھر کسی ایک جگہ محفوظ نہ تھے۔ کوئی چیز کسی کے پاس تھی تو کوئی کسی کے پاس، کسی صحابی کے پاس دس سورتیں کسی کاغذ پر لکھی پڑی تھیں تو کسی کے پاس چند آیات کسی کپڑے پر تحریر شدہ تھیں۔ دراصل ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی اس لیے کہ ہزاروں لوگ آیات کو زبانی حفظ کرتے جاتے تھے اور اسی ترتیب پر کرتے جاتے تھے جو انہیں اللہ کے برحق رسول ﷺ بتا رہے تھے تا آنکہ پورا قرآن سینکڑوں، ہزاروں سینوں نے اپنے اندر جمع اور زبانوں نے ازبر یاد کر لیا تھا تا آنکہ نبی اکرم ﷺ دنیا سے پردہ فرما گئے۔ آپ ﷺ کے پردہ فرماتے ہی کئی فتنے اکٹھے کھڑے ہو گئے۔ مانعین زکوٰۃ کی الگ شورش تھی تو منکرین ختم نبوت کا الگ فتنہ تھا۔ ادھر سلطان روم شمع اسلام کو بجھانے کے الگ منصوبے کرنے لگا مگر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے تدبر، حوصلہ، قوت فیصلہ، اور توکل علی اللہ نے کشتی امت کو فتنے کی طوفانی لہروں سے نکالا انہی حالات نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کریم تحریری صورت میں اکٹھا کرنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ جنگ یمامہ میں جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کے ساتھ گھمسان کی جنگ ہوئی اور ستر سے زائد قرآن کے حفاظ شہید ہو گئے آگے حدیث سنیے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب جنگ یمامہ ہو رہی تھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے بلایا جب میں گیا تو وہاں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے یہ عمر میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں یمامہ میں کثیر تعداد میں قراء قرآن شہید ہو گئے اور مجھے ڈر ہے اگر اسی طرح دیگر جنگوں میں قراء کا قتل جاری رہا تو قرآن کا کثیر حصہ جاتا رہے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم جمع کیا جانا چاہیے مگر میں نے ان سے کہا کہ آپ (رضی اللہ عنہ) وہ کام کیسے کر سکتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا تو یہ کہنے لگے خدا کی قسم! اسی میں بہتری ہے پھر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مجھ سے اس پر اصرار کرتے رہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے (ابوبکر صدیق کے لیے) بھی سینہ کھول دیا ہے جیسے ان کا کھولا تھا اور اب میری رائے بھی عمر والی ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) فرمانے لگے اے زید! تم نوجوان عقل مند اور معتبر آدمی ہو پھر تم رسول اللہ ﷺ کے پاس وحی لکھا کرتے تھے (اور اکثر وحی انہی نے لکھی تھی) تو تم قرآن کی ساری تحریریں اکٹھی کرو۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ کی قسم! اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو جگہ سے ہٹانے کا حکم دیتے تو وہ میرے لیے آسان تھا کہ قرآن کریم جمع کروں میں نے کہا: آپ لوگ وہ کام کیوں کرنا چاہتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا: ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے مگر اسی میں بھلائی ہے پھر آپ مجھ سے اصرار کرتے رہے تا آنکہ اللہ اللہ نے میرا سینہ بھی اس کام کے لیے کھول دیا جس کے لیے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا کھولا تھا چنانچہ میں قرآن پاک کی تحریریں کھجور کے پتوں اور پتھروں اور لوگوں کے سینوں سے اکٹھا کرنے لگا تا آنکہ سورہ توبہ کی آخری آیات میں نے (لکھی ہوئی) کسی کے پاس نہ پائیں سوائے حضرت حزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے، وہ آیات یہ ہیں: ”لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ

اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ۝ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ۝ "(توبہ:۱۲۸،۱۲۹) تو وہ ساری تحریرات میں نے اکٹھی کر کے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دے دیں جو انکے پاس رہیں پھر وہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو دے گئے اور وہ اپنے وصال کے وقت اپنی بیٹی سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو دے گئے۔ (بخاری شریف کتاب فضائل القرآن باب جمع القرآن صفحہ ۴۳۲)

یاد رہے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ خود قرآن کے قاری اور حافظ اور کاتب وحی تھے وہ اپنی قوتِ حافظہ سے بھی قرآن لکھ سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ تحریرات جمع کیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھی گئیں اور آپ ہر تحریر دو گواہیوں کے ساتھ قبول کرتے تھے صرف سورہ توبہ کی آخری آیات حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس لکھی ہوئی موجود تھیں دوسرا کوئی گواہ نہ تھا جو کہے میرے سامنے یہ لکھوائی گئی تھیں اس کے باوجود ان کی اکیلی گواہی سے وہ آیات لے لی گئیں کیونکہ سنن بیہقی شریف میں اس واقعہ کے ضمن میں حدیث مبارک ہے کہ انکی گواہی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو کے برابر قرار دی تھی اور شائد اس میں یہی راز تھا کہ ایک روز ان کی گواہی سے یہ آیات قبول کر لی جانی تھیں۔ الغرض وہ سارے پتھر، کپڑے، کاغذ اور کھجور کے پتے جمع کر کے ایک تھیلے میں ڈال دیے گئے اور کہا گیا یہ ہے لکھا ہوا قرآن جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا گیا اور اس پر مہر لگا دی گئی۔ یہ تھیلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تحویل میں دے دیا گیا جب ان کا وصال ہوا تو چونکہ ان کی زندگی میں نئے خلیفہ کا تقرر نہ ہوا تھا اس لیے وہ حضرت سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو دے گئے۔

ایک سوال کا جواب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ سارا قرآن کسی کتاب میں کیوں نہ لکھوا دیا یہ مختلف چیزوں پہ لکھنا کس مقصد کے لیے تھا اس سلسلہ میں عرض ہے کہ قرآن کریم چونکہ اکٹھا نازل نہ ہوا تھا تھوڑا تھوڑا کر کے اُترا پھر کئی آیات اُتریں بعد میں منسوخ ہو گئیں لہٰذا ایک جگہ کتابی صورت میں لکھنا دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مشکل تھا اس کے لیے ایسے وقت کا انتظار تھا جب نسخ کا سلسلہ ختم ہو جائے نسخ سے مراد نسخ تلاوت ہے لہٰذا دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی یہ کام آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔

بحث چہارم: عہد عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ میں قرآن کریم کا جمع کیا جانا

قرآن کریم کو عہد عثمانی میں کیسے جمع کیا گیا یہ سمجھنے سے قبل یہ باتیں ذہن میں ہونی چاہیں۔

(۱) قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے سات قراءات پر نازل فرمایا جن میں لہجے کا بھی اختلاف ہے جیسے" وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيۡلِ اِذَا سَجٰى ۝ "میں" والضحے "اور" سجے "پڑھنا اور" لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ "میں" فیہ "پڑھنا وغیرہ اور حروف کے اختلاف کی مثال جیسے" مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ۝ "میں" مالك "اور" وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ "میں" وما یخادعون "پڑھنا وغیرہ اور یہ سب قراءات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پڑھی پڑھائی

جاتی تھیں اور اب بھی پڑھی پڑھائی جاتی ہیں ان سب میں سے کسی کا انکار کفر ہے۔ الحمدللہ خود راقم الحروف گناہ گار نے قرأت سبعہ سبقاً سبقاً پڑھی ہیں بعض لوگوں نے ایک قراءت پڑھی تھی دوسری وہ نہیں جانتے تھے بلکہ دوسری قراءت کا پڑھنا وہ خلاف قرآن سمجھتے تھے اور انہوں نے اُسی قراءت میں قرآن کا کچھ حصہ لکھ رکھا تھا اور یہ نامکمل تحریریں پوری دنیا میں پھیل گئیں اب دنیا کے ایک وسیع رقبہ پر اسلام کے پھیل جانے کی وجہ سے یہ تحریریں الجھاؤ پیدا کر رہی تھیں کیونکہ وہ مختلف قراءت پر لکھی ہوئی تھیں مثلاً کسی میں ''مالك يوم الدين'' (الف کے ساتھ) لکھا تھا اور کسی میں ''ملك'' الف کے بغیر کسی میں '' يَخْدَعُوْنَ '' لکھا تھا تو کسی میں ''يخا دعون'' اور ضرورت تھی کہ یہ الجھاؤ دور کیا جائے تاکہ آگے چل کر یہ اختلاف کہیں بڑا فتنہ نہ بن جائے۔

(۲) ابھی تک کتابی صورت میں قرآن معرضِ وجود نہ میں آیا تھا عہد صدیقی میں اتنا کام ہو گیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے نزول وحی کے وقت جو تحریرات قرآنیہ تیار ہوئی تھیں وہ ایک جگہ اکٹھی کر کے تھیلے میں ڈال دی گئیں جن میں کچھ پتھر تھے کچھ کھجور کے پتے اور کچھ کاغذ اور کپڑے مگر اس امر کی ضرورت باقی تھی کہ قرآن ایک کتاب کی صورت میں لایا جائے۔ چنانچہ یہ عظیم الشان کارنامہ عہد عثمان غنی میں انجام پذیر ہوا۔ مگر اسکا داعیہ کیا ہوا اس پر یہ حدیث بخاری خوب روشنی ڈالتی ہے کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس (ان کے دور خلافت) میں آئے وہ شام میں فتح ارمنیہ اور عراق میں آذر بائی جان کی جنگوں میں شریک ہو چکے تھے انہوں نے دیکھا کہ مختلف علاقوں میں مختلف قراءات پڑھی جا رہی ہیں تو وہ ڈر گئے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے امیر المؤمنین اس امت کو سنبھالیے قبل ازاں کہ یہ بھی قرآن میں ویسے ہی لڑنے لگیں جیسے یہود و نصاریٰ اپنی کتابوں میں جھگڑتے ہیں (ہر فرقے کی اپنی بائبل ہے جو دوسروں سے مختلف ہے) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فوراً حضرت ام المؤمنین سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس جو قرآنی تحریریں جمع کردہ پڑی ہیں وہ مجھے بھیج دیں میں انہیں سے قرآنی نسخے تیار کروانا چاہتا ہوں اس کے بعد میں یہ تحریریں آپ کو واپس کر دوں گا۔ انہوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو وہ بھیج دیں انہوں نے فوراً حضرت زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمان بن حارث بن حشام رضی اللہ عنہم کو مقرر فرمایا تو انہوں نے ان سے قرآن کے سات کتابی نسخے تیار کیے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے تین افراد سے جو سب قریشی تھے یہ کہا کہ اگر کسی لفظ کی کتابت میں تم اور زید بن ثابت اختلاف کریں تو اسے لغت قریش پر لکھنا کیونکہ قرآن انہی کی زبان پر نازل ہوا۔ چنانچہ جب قرآن کے متعدد نسخہ جات تیار ہو گئے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے وہ تحریرات سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیں۔ پھر مملکتِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں میں وہ نسخہ جات پھیلا دیے تاکہ

انہیں دیکھ کر مزید قرآنی نسخے تیار کیے جائیں اور حکم فرمایا کہ اس کے سوا جو بھی قرآنی تحریریں یا کتابیں دنیا میں پھیلی ہیں انہیں جلا کر ختم کر دیا جائے۔ (بخاری شریف فضائل القرآن باب جمع القرآن صفحہ ۴۳۲)

روایات کے مطابق حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے سات نسخے تیار کروائے ایک مدینہ طیبہ میں اپنے پاس رکھا ایک مکہ مکرمہ بھیجا، ایک کوفہ، ایک بصرہ، ایک شام، ایک یمن اور ایک بحرین بھیجا اور آج پوری دنیا میں جو لاکھوں کروڑوں قرآن کریم کے نسخے موجود ہیں یہ سب انہی سات نسخوں سے نقل در نقل ہو کر ہم تک پہنچے ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآنی نسخوں کی کتابت میں ان چیزوں کا خیال رکھا۔

(1) عہد صدیقی میں مختلف تحریریں ایک جگہ جمع کی گئی تھیں ان میں ترتیب نہ تھی سورتوں کی نہ آیات کی، عہد عثمانی میں سورتوں اور آیات کی اس ترتیب کے مطابق قرآن لکھا گیا جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکم الٰہی امت کو عطا فرمائی تھی اور جو آج ہمارے سامنے موجود ہیں۔

(2) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خود بھی حافظ قرآن تھے دیگر کثیر حفاظ قرآن موجود تھے اگر وہ چاہتے تو اپنے حافظے کے مطابق قرآن لکھ لیتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ ان تحریرات کو سامنے رکھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سامنے لکھوائی تھیں اور انہیں بنظر غائر ملاحظہ فرمایا تھا اور جہاں کہیں ضرورت محسوس فرمائی ان میں اصلاح بھی فرمائی تھی اس لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم اسی طرح لکھوایا جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھوایا تھا۔ کتابت کا انداز وہی رکھا جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والی کتابت کا تھا۔

رسم عثمانی کا عام عربی رسم الخط سے اختلاف

اسی لیے ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کا انداز کتابت توفیقی ہے اور عام عربی رسم الخط سے ہٹ کر ہے مثلاً قرآن میں عموماً ''الصالحات'' کو یوں لکھا جاتا ہے'' الصّٰلِحٰتِ''، ''یُحْیِیْ'' کو یوں لکھا جاتا ہے ''یحيٖ'' اور کئی جگہ تاء وحدت کو لمبی صورت میں لکھا گیا ہے جیسے'' فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ'' (آل عمران: ۶۱) میں عام عربی رسم الخط'' لَعْنَةَ اللّٰہِ'' گول تاء کے ساتھ ہے اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ قرآن کو رسم عثمانی سے ہٹ کر عام رسم کے مطابق لکھا جائے کیونکہ رسم عثمانی حقیقتاً رسم محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور رسم عثمانی علوم قرآن میں سے ایک مستقل علم ہے جس میں پورے قرآن کے اندر جہاں جہاں عام عربی رسم الخط سے قرآن کا اختلاف ہے اسے تفصیلاً بتایا جاتا ہے۔ الحمد اللہ اس گناہ گار راقم الحروف نے یہ علم سبقاً پڑھا ہے۔

(3) رسم عثمانی میں نقطے اور حرکات نہیں ڈالی گئی تھیں تا کہ تمام قراءات سبعہ اس میں شامل ہو جائیں اور کوئی قراءت اس سے خارج نہ ہو مثلاً دو قراءت ہیں'' مالك یوم الدین ''اور'' مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' تو اسے یوں لکھا گیا

''ملك'' بعد میں ''مالك'' پڑھنے والوں نے میم پر کھڑی زبر ڈال دی اور ''مَلِكِ'' پڑھنے والوں نے سادہ زبر ایسے ہی ایک جگہ ایک قراء ت سے'' كَيْفَ نُنْشِزُهَا '' (بقرہ: ۲۵۹) دوسری قراء ت'' كيف نَنْشُرُهَا'' ہے نشور سے تو اسے نقطوں کے بغیر یوں لکھا گیا ''سسز ھا'' تا کہ اسے دونوں طرح پڑھا جاسکے۔ اگر عہد عثمانی میں قرآن یوں لکھا جاتا کہ ایک قراءت اس میں پڑھی جاسکتی اور دوسری ساقط ہو جاتی تو یہ بذات خود جائز بھی نہ تھا اور اس سے قرأت کا جھگڑا کبھی ختم نہ ہوتا جس نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو جمع قرآن پر مجبور کیا بلکہ وہ مزید گہرا ہو جاتا۔

قرآن کریم میں اعراب اور نقطے کب ڈالے گئے؟

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم میں نقطے اور زیریں زبریں اس لیے نہیں ڈالی تھیں کہ آپ قراءت سبعہ کو اپنی رسم میں شامل کرنا چاہتے تھے اگر نقطے ڈالے جاتے تو وہ قراءت ساقط ہو جاتیں جن میں نقطوں کا اختلاف ہے جیسے'' نُنْشِزُهَا ''اور''نَنْشُرُهَا''اور'' اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ ''میں دوسری قراءت''تبغون'' ہے اور اگر اعراب ڈالے جاتے تو وہ قراءت رہ جاتیں جن میں اعرابی اختلاف ہے جیسے'' مِّنْ اَنْفُسِكُمْ '' اور'' من انفسكم '' وغیرہ اور یوں بھی اس زمانہ میں اہل عرب کے لیے اعراب اور نقطوں کے بغیر عربی عبارت پڑھنا کچھ مشکل نہ تھا وہ بلا تکلیف پڑھ لیتے تھے۔ البتہ جو نسخے دور عثمانی میں بلاد عجم میں بھیجے گئے ان کے ساتھ قاری بھیجے گئے جو لوگوں کو قرآن پڑھاتے تھے اس طرح اس دور میں مشکل نہ رہی مگر بعد میں بلاد عجم کے لیے نقطوں اور اعراب کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی کیونکہ اتنے قراء دستیاب نہ تھے جو ایک ایک آدمی کو نقطوں کے بغیر پڑھا سکیں ایک اور سبب بھی تھا جس نے نقطے اور اعراب ڈالنا ضروری قرار دیا۔ وہ یہ کہ بعض ملحدین و بے دین لوگوں نے اعراب کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر لفظی معنوی تحریف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی چنانچہ'' اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ'' (بیشک اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہے) میں بعض لوگ یوں پڑھنے لگے''ورسوله''انہوں نے اس کو'' الْمُشْرِكِيْنَ '' پر عطف کیا اس طرح معنی یہ بن گیا اللہ مشرکوں اور اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بیزار ہے۔ (معاذ اللہ) ایسی ہی دیگر تحریفات بھی ہونے لگیں تب نقطے اور اعراب ڈالنے کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا چنانچہ یہ کام کیا گیا مگر سب سے قبل کس نے یہ کام کیا اس بارہ میں شدید اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابو الاسود دؤلی کو ایسا کرنے کا حکم فرمایا (قرطبی مقدمہ جلد اول صفحہ ۶۲) اور ابو اصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں یوں روایت کیا ہے کہ زیاد ابی سفیان نے ابو الاسود کو یہ کام سونپا (الاغانی جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۶ اخبار ابی الاسود) کچھ کہتے ہیں کہ امام ابن سیدین نے اپنے مصحف پر سب سے اول امام یحییٰ بن یعمر رضی اللہ عنہ سے نقطے لگوائے یہ یحییٰ یعمر مشہور تابعی ہیں حضرت علی

رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے احادیث روایت کرتے ہیں۔
(کتاب النقط للامام ابی عمرو الدانی صفحہ ۱۲۵ البرہان فی علوم القرآن جلد اول صفحہ ۳۴۹)

روایت امام حفص کی قبولیت کا سبب

قرآن کریم کی سات قراءات سبعہ متواترہ ہیں اور اس امر کی اجازت ہے کہ قرآن کریم کو کسی بھی قراءت کے مطابق لکھا جائے اور اس قراءت کے مطابق اعراب اور نقطے لگا لیے جائیں۔ مگر یہ خداداد مقبولیت ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں قرآن کریم امام عاصم کوفی علیہ الرحمہ کی اس قراءت کے مطابق جو امام حفص علیہ الرحمہ کی روایت کے ساتھ منقول ہے پڑھا جاتا ہے اور اسی کے مطابق قرآنی حروف پر اعراب اور نقطے لگائے جاتے ہیں شائد اس قبولیت کی وجہ یہ ہے کہ اول جب اعراب ونقاط لگائے گئے تب روایت حفص کو پیش نظر رکھا گیا جس کے سبب یہ روایت چار دانگ عالم میں مشہور ومروج ہوگئی اور باقی قراءات وروایات کا ذکر صرف کتابوں میں رہ گیا جنہیں قراءات سبعہ پڑھنے پڑھانیوالے قراء علماء ہی جانتے ہیں۔ اس سے یہ نظریہ تائید پکڑتا ہے کہ سب سے اول امام ابن سیرین نے اعراب اور نقطے لگوائے ہوں گے کیونکہ امام حفص رضی اللہ عنہ انہی کے زمانہ میں تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں نہیں۔

فصل پنجم

قرآن کریم کا سات حروف پر نازل ہونا

یہ فصل ہم دو بحثوں میں تقسیم کر رہے ہیں پہلی بحث میں بتایا جائیگا کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا دوسری بحث میں اسکا مفہوم اور اس پر احادیث سے دلائل آئیں گے

پہلی بحث: قرآن کا سات حروف پر اترنا حدیث کی روشنی میں

(1) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جبرائیل علیہ السلام نے مجھے ایک حرف پر قرآن پڑھایا۔ پھر میں اس سے بڑھانے کو کہتا رہا تا آنکہ اس نے مجھے سات حروف کی اجازت دے دی۔
(بخاری شریف کتاب برء الخلق باب ذکر الملائکہ صفحہ ۲۶۱)

(2) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جبرائیل علیہ السلام نے مجھے ایک حرف پر پڑھایا جو میں نے انہیں واپس پڑھ کر سنایا پھر میں ان سے اضافہ کا مطالبہ کرتا رہا اور وہ میرے لیے اضافہ کرتے رہے تا آنکہ سات حروف پر بات ختم ہوئی۔ (مسلم شریف کتاب فضائل القرآن باب نزول القرآن علی سبعہ احرف صفحہ ۱۰۶)

(3) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی غفار کے تالاب کے پاس موجود تھے کہ جبرائیل امین

علیہ السلام انکے پاس آئے اور کہا: اللہ آپ ﷺ کو حکم فرماتا ہے کہ اپنی امت پر قرآن ایک حرف پر پڑھیں آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ سے عافیت اور مغفرت چاہتا ہوں اور میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی (کہ ایک حرف پر قرآن پڑھے) پھر جبرائیل علیہ السلام دوبارہ آئے اور کہا: اللہ آپ ﷺ کو حکم فرماتا ہے کہ اپنی امت پر دو حرفوں پہ قرآن پڑھیں آپ ﷺ نے پھر فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے عافیت اور مغفرت چاہتا ہوں اور میری امت اسکی طاقت نہیں رکھتی پھر جبرائیل علیہ السلام تیسری مرتبہ آئے اور کہا اللہ آپ ﷺ کو حکم فرماتا ہے کہ اپنی امت پہ تین حرفوں میں قرآن پڑھیں آپ ﷺ پھر یہی فرمایا: کہ میں اللہ تعالیٰ سے عافیت ومغفرت کا طلبگار ہوں جب کہ میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تو جبرائیل علیہ السلام چوتھی مرتبہ آئے اور فرمایا: اللہ آپ ﷺ کو حکم فرماتا ہے کہ اپنی امت پر سات حرفوں میں قرآن پڑھیں آگے فرمایا۔ ''فایما حرف قرواعلیه فقد اصابو'' جس بھی حرف پر وہ قرآن پڑھیں گے درست پڑھیں گے۔ (مسلم شریف کتاب فضائل القرآن صفحہ ۸۰۲)

(4) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے ابی! مجھے قرآن پڑھایا گیا تو پوچھا گیا آپ نے ایک حرف پہ پڑھنا ہے یا دو حروف پہ؟ مجھے میرے ساتھ والے فرشتے نے کہا، آپ (ﷺ) کہیں دو حروف پر! تو میں نے کہا: دو حرفوں پہ، پھر مجھے کہا گیا دو حروف پہ یا تین حروف پہ؟ تو فرشتے نے مجھے کہا آپ تین حروف پہ کہیں! تو میں نے تین حروف پہ کہہ دیا تا آنکہ سات حروف تک بات چلی گئی۔

(سنن ابی داؤد کتاب الوتر باب انزل القرآن علی سبعہ احرف صفحہ ۱۳۳۲)

(۵) حضرت ابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے دل میں (دین کے متعلق) کبھی کھٹکا پیدا نہ ہوا، سوا اس موقع کے جب میں نے ایک آیت پڑھی اور دوسرے آدمی نے وہی آیت اور قراءت پہ پڑھی میں نے اسے کہا رسول اللہ ﷺ نے مجھے یہ آیت پڑھائی ہے اس نے کہا مجھے بھی آپ ہی نے پڑھائی ہے تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: کیا آپ نے مجھے یہ آیت یوں نہیں پڑھائی تھی؟ آپ نے فرمایا ہاں پڑھائی تھی پھر دوسرے آدمی نے آکر یہی عرض کیا کہ آپ نے مجھے یہ آیت یوں نہیں پڑھائی تھی آپ نے فرمایا ہاں پڑھائی تھی پھر فرمایا جبرائیل ومیکائیل علیہما السلام میرے پاس آئے جبرائیل میرے دائیں بیٹھ گئے اور میکائیل بائیں پھر جبرائیل علیہ السلام نے کہا آپ ﷺ ایک حرف پر قرآن پڑھیں میکائیل نے مجھے کہا آپ ﷺ اضافہ کا مطالبہ کریں تو میں اضافہ مانگتا رہا تا آنکہ سات حروف تک بات جا پہنچی۔ ''فکل حرف شافٍ کافٍ'' تو ہر حرف شافی کافی ہے۔

(نسائی شریف کتاب الافتتاح باب جامع القرآن صفحہ ۲۱۴۸)

دوسری بحث: سات حروف سے قراءات مراد ہیں

کثیر احادیث دلالت کرتی ہیں کہ ان سات حروف سے قرآن کریم کو سات طریقوں پہ پڑھنا مراد ہے چند ایک

احادیث یہاں لکھی جاتی ہیں جو اس مفہوم کو واضح کرتی ہیں اور اس سے ہٹ کر سات حرفوں سے جو چیزیں مراد لی گئی ہیں وہ درست نہیں۔

(1) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات (ظاہرہ) میں سورہ فرقان پڑھتے سنا وہ قرآن کریم میں ایسے بہت سے حروف پہ پڑھ رہے تھے جو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں پڑھائے تھے قریب تھا کہ میں ان پر نماز ہی میں حملہ کر دیتا میں نے بمشکل صبر کیا تا آنکہ انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے ان کی چادر ان کے گلے میں ڈال لی۔ اور کہا بتاؤ یہ قراءت جو میں نے ابھی تمہیں پڑھتے سنا ہے تمہیں کس نے پڑھائی ہے انہوں نے کہا مجھے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھائی ہے میں نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یہ سورت اس سے مختلف طریقہ پر پڑھائی ہے تو میں انہیں کھینچتا ہوا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے آیا اور عرض کیا میں نے اسے سورہ فرقان ایسے طریقہ پر پڑھتے سنا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسے چھوڑ دو پھر فرمایا اے ہشام! سناؤ کیسے پڑھتے ہو انہوں نے سنائی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں یہ اس طرح نازل ہوئی پھر فرمایا اے عمر! تم پڑھو میں نے پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں یہ اس طرح نازل ہوئی ہے پھر فرمایا۔ ''ان هذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرأوا ما تيسّر منه'' بے شک یہ قرآن سات حرفوں پہ نازل ہوا ہے تم ان میں سے جو میسر ہو پڑھ سکتے ہو۔ (بخاری شریف کتاب فضائل القرآن صفحہ ۲۳۳ مجموعہ صحاح ستہ مطبوعہ ریاض) یہ حدیث مسلم، ابو داؤد، ترمذی اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

(2) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں مسجد میں بیٹھا تھا ایک آدمی آیا وہ نماز پڑھنے لگا میں نے سنا وہ ایسی قراءت پڑھ رہا ہے جو میں نہ جانتا تھا پھر دوسرا آدمی آیا اس نے پہلے والے آدمی سے بھی مختلف قراءت کی۔ جب ہم نے نماز ختم کر لی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! پہلے آدمی نے ایسی قراءت کی جو میں نہیں جانتا تھا پھر دوسرے نے اس نے بھی مختلف قراءت کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں پڑھنے کو کہا تو انہوں نے پڑھ کر سنایا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کی قراءت کو خوب قرار دیا میرے دل میں ایسا شک آ گیا کہ دورِ جاہلیت میں بھی ایسا کبھی نہ آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری کیفیت دیکھی تو میرے سینے پر ہاتھ مارا، میں پسینے میں شرابور ہو گیا جیسے میں اللہ عزوجل کو سامنے دیکھ رہا ہوں پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابی! مجھے اللہ نے حکم فرمایا کہ قرآن کو ایک حرف پر پڑھو، میں نے عرض کیا کہ اے اللہ! میری امت پر آسانی فرما تو اللہ تعالیٰ نے مجھے دو حرفوں پر پڑھنے کا اختیار دے دیا میں نے پھر یہی عرض کیا تو مجھے سات حرفوں پر پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا (اے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ نے جو تین بار مجھ سے رجوع کیا ہے اس کے عوض آپ مجھ سے اپنی تین حاجات مانگ سکتے ہیں (تین خصوصی دعائیں مانگ سکتے ہیں) تو میں نے کہا اے اللہ! میری امت

کی بخشش فرما پھر کہا اے اللہ! میری امت کی بخشش فرما اور تیسری دعا میں نے روز قیامت کے لیے رکھ لی ہے جب ساری مخلوق میری طرف رغبت کرے گی حتیٰ کہ ابراہیم علیہ السلام بھی۔

(صحیح مسلم کتاب فضائل القرآن صفحہ ۸۰۶ مجموعہ صحاح ستہ مطبوعہ ریاض)

سات حروف کو غیر قرأت سبعہ پر محمول کرنا درست نہیں

یہ احادیث واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ جن سات حروف پر قرآن اُترا ہے وہ قرآن کریم کی قراءت کے سات مختلف اسالیب اور طریقے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ سات حروف سے مراد وہ سات مضامین ہیں جن پر اکثر آیات قرآنیہ مشتمل ہیں جیسے امر، نہی، طلب، دعا، خبر، استخبار اور زجر بعض نے کہا سات حروف یہ ہیں حلال، حرام، محکم، متشابہ، امثال، انشاء اور اخبار۔ تاہم یہ معانی درست نہیں اسکی کئی وجوہ ہیں۔ اول: اگر سات حروف سے سات مضامین مراد ہوتے کہ قرآن کی بعض آیات امر پر مشتمل ہیں بعض نہی پر اور بعض اخبار وانشاء پر تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی نہ فرماتے کہ اے اللہ! میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی تو اضافہ فرما۔ مسند احمد جلد 5 صفحہ 408 میں حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی، اے اللہ! مجھے ناخواندہ لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے جن میں بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی تو تو انہیں اجازت فرما کہ وہ سات حرفوں پر قرآن پڑھ سکیں۔ معلوم ہوا سات حروف سے قبائل عرب میں الفاظ کے بولنے کے وہ سات مختلف انداز تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا انداز تھا اور دوسرے لوگوں کے لیے اس کا پڑھنا آسان نہ تھا خصوصاً بوڑھوں اور ناخواندہ لوگوں کے لیے۔ جیسے بعض ''یُؤْمِنُوْنَ'' ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں بعض ''یومنون'' واؤ کے ساتھ اب جو واؤ والے ہیں وہ ہمزہ آسانی سے نہیں پڑھ سکتے اور بعض قبائل کا لہجہ یوں پڑھنے کا ہے۔ ''والضحے واللیل اذا سجے ما ودعك ربك وما قلے'' اس کو فنِ قراءت کی اصطلاح میں امالہ کہتے ہیں۔ بعض قبائل کا لہجہ یوں ہے ''والضحے واللیل اذا سجے ، والنجم اذا ھوے وما غوے'' اسے تقلیل یا بین بین کہا جاتا ہے ان لوگوں کے لیے'' وَالضُّحٰی ''الف کے ساتھ پڑھنا سخت دشوار تھا۔

راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ

1983ء میں راقم الحروف گناہ گار سعودی حکومت کے ایک ذیلی اور نیم خود مختار ادارہ تحفیظ القرآن کی طرف سے یمن کے قریب مقام ابہا میں بطورِ مدرس قرآن متعین ہوا وہاں میرے پاس کئی بزرگ بدو عرب قرآن پڑھنے کے لیے آتے تھے قرآن مجید میں ہے'' فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ ''اور'' مِنْۢ بُیُوْتِکُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِکُمْ '' (نور:۳۶،۶۱) اس میں ایک قراءت ''بِیُوْتِ'' باء کی زیر کے ساتھ بھی ہے وہ عرب بدو ''بِیُوْتِ'' زیر کے ساتھ ہی پڑھتے تھے میں نے بطور مدرس ان کو ''بُیُوْتِ'' پیش کے ساتھ پڑھانے کی بہت کوشش کی مگر ان کی زبان پہ ''بِیُوْتِ'' زیر ہی چڑھتی تھی

آخر مجھے یہ حدیث یاد آئی کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ رب العزت سے عرض کیا تھا کہ میری امت میں بوڑھے اور ناخواندہ لوگ ہیں اے اللہ! تو انہیں سات طریقوں پر پڑھنے کی اجازت عطا فرما۔ تو میں نے بدوؤں کو ویسے ہی پڑھنے دیا جیسے وہ پڑھتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کے درمیان کسی امر و نہی حلال و حرام میں اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی نبی کریم ﷺ کے پاس کسی محکم و متشابہ کا اختلاف لے کر نہ آئے تھے وہ قرآن کی قراءت سے اختلاف کر رہے تھے ہر کوئی علیحدہ قراءت کر رہا تھا سب کو حضور سید کائنات ﷺ ہی نے مختلف قراءات سکھائی تھیں اور آپ ﷺ نے فرمایا انہی سات حروف پہ قرآن اُترا ہے تو واضح ہو گیا کہ سات حروف سے قرآن کی سات قراءات ہی مراد ہیں۔

قرآن کی قراءاتِ سبعہ کونسی ہیں؟

امام ابو عبید فرماتے ہیں عرب قبائل سات حصوں میں منقسم تھے قریش، ھذیل، ثقیف، ہوازن، کنانہ، تمیم اور یمن اور سب کے اپنے اپنے لہجات تھے اور کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کا لہجہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ امام ابو الفضل رازی فرماتے ہیں لہجات اور لغات کے اعتبار ان سات امور میں اہل عرب اختلاف کرتے ہیں فتح (یعنی عدم امالہ) و امالہ، ترقیق و تفخیم، تحقیق و تسہیل ادغام و اظہار (راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام رازی کے ذکر کردہ لغات صرف چار بنتی ہیں مزید تین لغات یہ شمار کی جا سکتی ہیں مد و قصر، اسکان و اشمام اور تشدید و تخفیف) (النشر فی القراءات العشر جلد اول صفحہ ۲۷ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت) یاد رہے لہجات کے اختلاف سے معنی میں تبدیلی نہیں آتی مگر جب اعراب لفظوں اور حروف میں قراءات کا اختلاف آتا ہے تو اس سے معنی میں تبدیلی آتی ہے اور تمام معانی درست اور قرآن میں نئی سے نئی معنوی خوبی پیدا کرنے والے ہوتے ہیں اور انہیں قرآن میں اس لیے جاری کیا گیا ہے تا کہ قرآن کا یہ اعجازی پہلو بھی سامنے آئے کہ ایک کلمہ کی حرکات یا اس کے نقطوں یا اسکے حروف بدلنے سے نیا معنی پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ کی شان دیکھیے کہ ایسے اختلافات بھی قرآن میں سات ہی طرح ہیں اور جیسے مذکورہ سات لہجات و لغات قراءات سبعہ کا مصداق ہیں ایسے حرکات و سکنات، نقطوں اور حروف کے اختلافات بھی اسکا مصداق ہیں چنانچہ وہ یہ ہیں۔

(1) واحد و جمع کا اختلاف جیسے ''وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ'' خطیئۃ واحد سے مراد کفر ہے اور جمع سے سارے گناہ

(2) غیب و خطاب کا اختلاف جیسے ''اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ'' اور تبغون

(3) ماضی اور امر کا اختلاف جیسے ''قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ'' اور قل رب احکم بالحق

(4) مجرد و مزید فیہ کا اختلاف جیسے ''وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ''، ''وَمَا يُخٰدِعُوْنَ'' اور ''حَتّٰى يَطْهُرْنَ''، ''حَتّٰى يَطَّهَّرْنَ''

(5) مادہ اشتقاق کا اختلاف جیسے'' كَيْفَ نُنْشِزُهَا ''اور نَنْشُرُهَا

(6) اعراب کا اختلاف'' مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ''،مِنْ أَنْفَسِكُمْ اور'' مِنْ تَحْتِهَا''،من تحتها

(7) اسماء مشتقہ میں اختلاف جیسے ''مَلِكِ النَّاسِ'' اور مالك الناس۔

اختلاف قراءت بھی قرآن کے معجزہ ہونے کی دلیل ہے

رسم عثمانی کی یہ حیرت انگیز جامعیت ہے کہ ایک کلمہ سے کئی قراءات نکلتی ہیں جو لفظ و معنیٰ کے اعتبار سے قطعی مختلف ہیں مگر وہ ایک کلمہ میں چھپی ہوئی ہیں پھر یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ ایک کلمہ کئی مختلف انداز سے پڑھا جاتا ہے جس سے لفظ و معنی میں زمین و آسمان کا فرق آجاتا ہے مگر ہر معنیٰ پر وہ کلام درست رہتی ہے اور نئے سے نیا ذوق پیدا کرتی ہے جیسے'' خَطِيْٓئَتُهٗ''میں اگر ہمزہ پر کھڑی زبر ڈال دی جائے تو صغیۂ جمع بن جاتا ہے جس سے مراد کفر ہے کہ جس آدمی کو اس کے کفر نے گھیر لیا وہ جہنمی ہے اور ہمزہ کی سادہ زبر سے صیغہ واحد ہے اور معنیٰ یہ ہے کہ جس شخص کو اس کے گناہوں نے گھیر لیا وہ دوزخی ہے۔ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ پڑھنے سے معنی یہ بنتا ہے کہ اے مسلمانو! تمہارے پاس وہ رسول آیا ہے جو تمہی میں سے ہے اور مِنْ أَنْفَسِكُمْ پڑھنے سے معنی یہ بن جاتا ہے کہ وہ رسول تم میں سے نفیس تر ہے۔ آیت وضو میں اگر'' وَاَرْجُلَكُمْ ''لام کی زبر سے پڑھا جائے تو معنی ہے اپنے پاؤں کو دھوؤ (اس طرح یہ'' فَاغْسِلُوْا ''کا مفعول ہے) اور أَرْجُلِكُمْ لام کی زیر سے معنی یہ ہے کہ پاؤں کا مسح کرلو (پھر'' وَامْسَحُوْا '' کا مفعول ہے) یعنی اگر تم نے پاؤں پر خفین پہن رکھے ہوں تو پاؤں پر مسح کرلو۔

باب دوم

تفسیر قرآن کے متعلق

قرآن پاک کی تفسیر ایک جامع موضوع ہے جس کی کئی شاخیں متعدد فصلیں اور گونا گوں بحثیں ہیں۔ تفسیر کا معنی، اہمیت تفسیر قرآن، اس کے مآخذ اس کی تاریخ وغیرہ لہٰذا باب اول کی طرح ہم باب دوم کو بھی چند فصلوں میں تقسیم کررہے ہیں۔

فصل اول

بحث اول: تفسیر اور تاویل کا معنی اور باہمی فرق

لفظ تفسیر کا لغوی معنی کسی چیز سے پردہ اٹھانا ہے۔ اسی لیے سواری کا پالان اتارا کہ اسکی پیٹھ ننگی کرنے کو بھی تفسیر کہتے ہیں۔ جب کہ اصطلاحی مفہوم میں تفسیر ایک علم ہے جسکے ذریعے قرآنی الفاظ کے معانی اور اسرار و حکمت سے بحث کی جاتی

ہے بعض نے یوں تعریف کی ہے کہ تفسیر وہ علم ہے جس کی مدد سے آیات قرآنیہ کے اسباب نزول جانے جاتے ہیں اور معلوم کیا جاتا ہے کہ ان میں کون ناسخ ہے کون منسوخ، کون عام ہے کون خاص اور ان سے کیا احکام اور عبرتیں حاصل ہوتی ہیں جبکہ تاویل کا لغوی معنی پھیرنا یا لوٹانا ہے اس کا مادہ اول ہے جو رجوع کے معنی میں ہے اسی سے لفظ مآل بمعنی انجام ہے جبکہ اصطلاحی لحاظ سے تاویل اس چیز کا نام ہے کہ کسی آیت یا حدیث کو اس کے ظاہری معنی سے ہٹا کر غیر ظاہر معنی پر اتارنا جیسے عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث یا نص مؤوّل ہے یعنی ظاہر و متبادر معنی پر محمول نہیں کسی دوسرے معنی پر محمول ہے اور بعض اوقات تفسیر اور تاویل کو ہم معنی بھی سمجھ لیا جاتا ہے اور کچھ فرق نہیں سمجھا جاتا بعض علماء تفسیر فرماتے ہیں تفسیر کا تعلق روایت کیساتھ ہے اور تأویل کا درایت کے ساتھ۔

بحث دوم: علم تفسیر کی اہمیت وعظمت

(1) ہر علم کی خوبی اس کے موضوع کے اعتبار سے ہے کہ وہ علم کس چیز سے بحث کرتا ہے یوں تو ہر کام کرنے والا اپنے کام کے حوالے سے ایک علم رکھتا ہے جو اس کے کام کی باریکیاں اور طریق کار پر حاوی ہوتا ہے خواہ وہ کھال رنگتا ہو یا گوشت بناتا یا صفائی کرتا ہو مگر ہر کوئی جانتا ہے کہ جتنا کام اعلیٰ ہو اس کا علم بھی اتنا ہی اعلیٰ شمار کیا جائے گا چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ کے کلام کی عظمت ہر دوسرے کلام پر ایسے ہی جیسے اللہ کی عظمت اس کی مخلوق پر ہے اس لیے جو علوم قرآن سے تعلق رکھتے ہیں وہ دیگر سب علوم سے افضل ہیں پھر قرآن سے متعلق علوم کچھ وہ ہیں جو صرف الفاظ سے تعلق رکھتے ہیں جیسے علم تجوید جبکہ علم تفسیر الفاظ اور معانی دونوں کی خوبیاں اور باریکیاں بیان کرتا ہے اس لیے علوم سے افضل ہے۔

(2) اس علم کی اہمیت اس لیے بھی واضح ہے کہ انسانیت کی فلاح وصلاح قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔ (مائدہ: ۴۵) اور قرآنی تعلیمات پہ عمل پیرا ہونا تب ہی ممکن ہے جب قرآن کے معانی ومعارف سے آگاہی ہوگی اور تفسیر قرآن کے بغیر یہ آگاہی نامکمل ہے۔

(3) اہل عجم کی عربیت سے ناآشنائی تو فطری ہے خود اہل عرب بھی اپنی زبان اور اپنی زبان کے ادب سے ناآشنا ہوتے جارہے ہیں اور وہ محض عربیت کی بنا پر قرآن نہیں سمجھ سکتے تو ضروری ہے کہ قرآن کی تفسیر عام کی جائے تا کہ لوگ قرآن کو خود قرآن اور حدیث کی روشنی میں سمجھ سکیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی عظمت تھی کہ وہ قرآن کریم کے مفہوم سے باخبر تھے آج مسلمانوں کی غالب اکثریت اس سے بے خبر ہے اور اسی لیے وہ نو مسلم اقوام کے نظریات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس وہ قرآنی علم نہیں جس کے ساتھ وہ اسلامی نظریات کا دفاع کرسکیں۔ آج

مسلمانوں کا قرآن سے تعلق اسی قدر رہ گیا ہے کہ اسے خوش الحانی سے پڑھا سنا جائے یا کسی کے فوت ہونے پر ایصالِ ثواب کیا جائے مگر قرآن کے معنی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں رہا۔ ہمیں یہ سمجھنے میں دلچسپی نہیں کہ قرآن کہتا کیا ہے کیونکہ ہم عمل سے جی چراتے ہیں تو ضروری ہے کہ قرآن کی تفسیر عام کی جائے۔

بحث سوم: تفسیر قرآن کے مآخذ

یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے کیا ذرائع ہیں جن کے بغیر قرآن کی تفسیر کرنا بسا اوقات گمراہی کا سبب بنتا ہے اور آج مسلمانوں میں نئے نئے فرقے اسی لیے جنم لے رہے ہیں کہ تفسیر قرآن کے لیے ان ذرائع پر اعتماد نہیں کیا جاتا جن کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

پہلا ماخذ: قرآن مجید خود اپنی تفسیر بتاتا ہے

قرآن ایسی جامع کتاب ہے کہ خوف خدا اگر شامل ہو تو یہ اپنے پڑھنے والے کو بھٹکنے نہیں دیتی اسی لیے ''هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝'' فرمایا گیا ایک جگہ قرآن کوئی بات اجمالاً بیان کرتا ہے تو دوسری جگہ اسکی تفصیل بتا دیتا ہے گویا قرآن اپنی تفسیر خود بیان کرتا ہے مثلاً:

(1) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے'' قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ط '''' اس سے قبل کہ وہ دن آجائے جس میں کوئی بیع ہے نہ دوستی نہ سفارش۔'' (بقرہ:۲۵۴) اس آیت سے بظاہر معلوم ہوا کہ قیامت میں کوئی سفارش نہ چلے گی مگر دوسری آیت میں فرمایا گیا۔'' مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ط '' کون ہے جو اللہ کے ہاں سفارش کرے اس کی اجازت کے بغیر۔'' (بقرہ:۲۵۵) ثابت ہوا پہلی آیت میں اذن الٰہی کے بغیر سفارش کی نفی کی گئی ہے نہ کہ مطلق سفارش کی۔

(2) ایک جگہ فرمایا گیا'' قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ ط '''' فرمادیں زمین وآسمان میں اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔'' (نمل:۶۵) اس سے لوگ استدلال کرنے لگے کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے غیب کا علم جاننا شرک ہے مگر قرآن ہی دوسری جگہ فرماتا ہے۔'' عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ أَحَدًا ۝ إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُولٍ '''' خدائے غیب داں اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر رسولوں میں سے جس پر وہ راضی ہو۔'' (جن:۲۶) تو اس آیت نے واضح کر دیا کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ اس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا اس معنی میں ہے کہ کسی کے بتائے بغیر از خود غیب جاننے والا صرف خدا ہے اور رسولوں کو غیب کا علم حاصل ہونا اللہ کے بتانے اور مطلع کرنے سے ہے۔

(3) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ''تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی حامی کارو مددگار نہیں۔'' (بقرہ:۱۰۷) اس سے کچھ لوگ استدلال کرنے لگے کہ اللہ کے سوا کسی سے مدد مانگنا شرک ہے کیونکہ مددگار صرف اللہ ہے مگر انہوں نے نہ دیکھا کہ اللہ جل مجدہٗ الکریم قرآن میں دوسری جگہ فرماتا ہے ''وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا'' ''اے اللہ! ہمارے لیے اپنی طرف سے حامی کار بنا اور ہمارے لیے اپنی طرف سے مددگار بنا۔'' (نساء:۷۵) اس آیت نے بتا دیا کہ پہلی آیت میں قرآن کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی قوت وطاقت کے بغیر کوئی کسی کا مددگار نہیں اور جب اللہ کسی کو مدد کرنے کی طاقت دے دے تو اس کو مددگار کہا جا سکتا ہے خواہ وہ مافوق الاسباب میں ہو یا ماتحت الاسباب میں۔ یہ فوق تحت کی قیدیں ہم اپنی طرف سے بڑھاتے ہیں۔

قرآن کی اپنی بیان کردہ تفسیر کو چھوڑ کر قرآن سمجھنے کی کوشش ہی وہ تباہی کا راستہ ہے جو خوارج نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اپنایا جب انہوں نے ''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ'' (انعام:۵۷) پڑھ کر تحکیم کو کفر قرار دیا اور کہا کہ حضرت علی اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں معاذ اللہ کافر ہو گئے ہیں جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا خوارج قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھتے۔'' فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا '' (نساء:۳۵) (البدایہ والنہایہ) الغرض قرآن کا مفسر سب سے اول اللہ رب العزت ہے اللہ وحدہٗ لاشریک اپنے کلام کا مفسر اول ہے اور اسکی تفسیر سے ہٹ کر تفسیر کرنا سراسر گمراہی و بددینی ہے اللہ تعالیٰ اس سے بچائے۔ مفسر کو چاہیے کہ کسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ دیکھے کہ خود قرآن نے دوسرے مقامات پر یہی مفہوم کیسے بیان کیا ہے۔

تفسیر قرآن کا دوسرا ماخذ: حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے افعال واقوال سے قرآن کی بہترین تفسیر فرمائی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ فریضہ سونپا تھا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ''وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ'' ''اور ہم نے اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کی طرف ذکر (قرآن) اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کو بتائیں کہ ان کی طرف کیا نازل کیا گیا ہے۔'' (النحل:۴۴)

اور سچ تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منہ موڑ کر قرآن سمجھنے کی کوشش ایسے ہے جیسے اندھے کا گاڑی چلانا کہ وہ دوسرے ہی قدم پہ کسی چیز سے جا ٹکرائے گا اور اپنی بھی جان لے گا اور کئی دوسروں کی بھی۔ ایسے ہی جو لوگ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روگردانی کر کے قرآن سمجھنے بیٹھتے ہیں وہ اپنا ایمان بھی ضائع کرتے ہیں اور کئی دوسروں کا بھی۔ قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال ایسے ہے جیسے کسی (Constructing company) تعمیراتی ادارے نے کسی عمارت کے لیے

نقشہ تیار کیا اور ساتھ انجینئر بھی بھیجا کہ جیسے یہ کہے اس کے مطابق تعمیر کی جائے۔ اگر انجینئر کی ہدایت پر عمل نہ کیا جائے تو وہ عمارت کسی صورت کھڑی نہیں ہو سکتی۔ قرآن ہدایت انسانی کا نقشہ ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کے انجینئر ہیں۔ میڈیکل سائنس کی کوئی کتاب پڑھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہے جو سمجھائے کہ کتاب کیا کہتی ہے اس کے بغیر کسی صورت میں کتاب سمجھ نہیں آسکتی اسی طرح قولِ رسول کے بغیر قرآن کی سمجھ نہیں آسکتی اب ذیل میں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

(1) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ'' ''نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔'' (بقرہ:۴۳) اب نماز کیسے پڑھی جائے، کتنی بار پڑھی جائے، کہاں پڑھی جائے، کتنی رکعات پڑھی جائیں اور کون پڑھے؟ یہ سب کچھ ہمیں حدیث رسول ﷺ نے بتایا، زکوۃ کیسے دی جائے، کتنے مال پر دی جائے، کتنی دی جائے، کون دے، کسے دے، کسے نہ دے، کب دے؟ یہ ساری باتیں رسول معظم ﷺ نے بتائی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا '' صلوا کما رایتمونی اصلی '' جیسے ''تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو ایسے ہی تم بھی پڑھو۔'' (بخاری کتاب الاذان باب ۲۷)

(2) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا ؕ '' ''اور اللہ کی رضا کے لیے لوگوں پر بیت اللہ کا حج لازم ہے۔'' (آل عمران:۹۷) اب حج کیسے کیا جائے، کب کیا جائے، کس پر حج فرض ہے، کتنی بار فرض ہے، اس کے مناسک وارکان کیا ہیں؟ یہ حدیث رسول ﷺ کی مدد ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا: ''خذوا عنی مناسکم فانی لا ادری لعلی لا حج بعد عامی هذا'' ''مجھ سے مناسک حج سیکھ لو کیونکہ میں نہیں جانتا شائد اس سال کے بعد میں حج نہ کر سکوں (دنیا سے پردہ کر لوں۔)'' (نسائی شریف کتاب المناسک صفحہ ۲۲۸۵ مجموعہ صحاح ستہ مطبوعہ ریاض)

(3) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ '' اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓـئِكَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ '' ''جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ نہ ملایا انہی کے لیے امن ہے۔'' (انعام:۸۲) جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر بہت بھاری گزری تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول ﷺ! ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے اوپر ظلم نہ کیا ہو آپ ﷺ نے فرمایا جو ظلم تم مراد لے رہے ہو وہ یہاں مراد نہیں ''انما هو الشرك'' اس سے تو شرک مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ ۝۱۳'' (لقمان:۱۳) ''بے شک شرک ظلم عظیم ہے۔'' (بخاری شریف، مسلم، ترمذی، احمد، ابن جریر، ابن منذر، دارقطنی)

(4) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ'' (احزاب:۴۰) نبی کریم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اس کی تفسیر حضور سرورِ عالم ﷺ نے بیسوں احادیث میں فرما دی۔ ''انا خاتم النبیین لا نبی بعدی'' ''میں خاتم النبین اس لیے ہوں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔'' (بخاری کتاب مناقب، مسلم کتاب فضائل، ابو داؤد کتاب الفتن وغیرہ) لہٰذا اس کا معنی

خاتمیتِ رُتبی مراد لینا بدترین گمراہی ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے حدیث رسول کا سہارا لینا از حد ضروری ہے جو اس سے ہٹ کر تفسیر کرے گا سخت گمراہی میں پڑیگا گویا قرآن کے دوسرے مفسر سرکار دو عالم ﷺ ہیں۔

تیسرا ماخذ: اقوال صحابہ کرام

چونکہ قرآن کریم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان نازل ہوا وہ ان واقعات واحوال سے واقف اور چشم دید گواہ تھے جن میں قرآن اُترا۔ لہٰذا جب وہ کسی آیت کا شان نزول یا اسکا مفہوم بیان کرتے ہیں تو وہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، خصوصاً جس آیت کی تشریح میں قرآن یا حدیث سے کوئی نص نہ ملے وہاں اقوال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تفسیر کے لیے سب سے اہم تر گرادانا جاتا ہے اگر وہاں کسی تابعی کا قول صحابی کے قول سے متصادم ہو تو صحابی کا قول زیادہ معتبر ہے بشرطیکہ اس کی سند میں ضعف نہ ہو اور اگر صحابہ کے اقوال مختلف ہوں تو تابعین کی آراء کی روشنی میں ان کے مابین ترجیح دی جاسکتی ہے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ امام حاکم کا قول نقل فرماتے ہیں: حدیث کا طالب علم آگاہ رہے کہ جو صحابی نزولِ وحی کے وقت موجود ہو اسکی تفسیر صحیحین بخاری و مسلم کے نزدیک حدیث مرفوع کا درجہ رکھتی ہے۔ (الاتقان جلد دوم صفحہ ۱۷۶)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر کی مثال یوں ہے کہ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ'' ''بلکہ اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا۔'' (النساء: ۱۵۸) اس کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کرام سے عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کی طرف زندہ اٹھایا جانا مروی ہے لہٰذا اس آیت کا معنی روح عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھانے جانے کی صورت میں کرنا محض گمراہی اور بے دینی ہے۔

جبکہ تفسیر تابعین کی مثال یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ'' ''جب اللہ نے فرمایا اے عیسیٰ! علیہ السلام میں آپ کو پوری عمر دوں گا اور اپنی طرف اٹھالوں گا۔'' (آل عمران: ۵۵) اس آیت میں مرزائی فرقہ مرزا قادیانی کی پیروی میں ''مُتَوَفِّيْكَ'' سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کرتا اور حیات سے انکار کرتا ہے حالانکہ جلیل القدر تابعین جیسے حضرت قتادہ، وہب بن مُنَبّہ، ابن زید، ابن جریج رضی اللہ عنہم وغیرہم اس کا انکار کرتے بلکہ اسی آیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان کیطرف زندہ اٹھایا جانا ثابت کرتے ہیں جیسا کہ سورہ آل عمران میں اس آیت کے تحت تحقیق کے ساتھ بیان کیا جائے گا

چوتھا ماخذ: اقوال تابعین

تفسیر ماثور کا بڑا حصہ تابعین پر مشتمل ہے جب قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ سے کسی آیت کی تفسیر میں راہنمائی نہ ملے تو تابعین کے اقوال سے مدد لی جاتی ہے یہاں اس وقت بعض لوگ پریشان ہوجاتے ہیں جب وہ ایک آیت کے تحت تابعین کے مختلف اقوال پاتے ہیں مثلاً عکرمہ نے یہ کہا مقاتل نے یہ کہا مجاہد سے یہ مروی ہوا وغیرہ مگر یہ اختلاف حقیقی نہیں

ہے تابعین ایک آیت کے متعدد معانی بتاتے ہیں اور وہ سبھی اپنی اپنی جگہ درست ہوتے ہیں (الاتقان فی علوم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۷۹) امام سیوطی علیہ الرحمہ ابن تیمیہ کا قول نقل فرماتے ہیں جو شخص صحابہ و تابعین کے مذہب سے انحراف کرے اور انکی تفسیر سے ہٹ کر قول کرے وہ خطا کار بلکہ بدعتی ہے کیونکہ وہ اس سے بہتر تفسیر جانتے تھے۔ (اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۷۸)

پانچواں ماخذ: لغت عرب

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے" وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ" یہ" قرآن کی زبان تو فصیح عربی ہے۔" (نحل: ۱۰۳) دوسری جگہ فرمایا" بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ"" یہ قرآن واضح عربی زبان میں اترا ہے۔" (شعراء: ۱۹۵) لہٰذا کسی آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے لغت عرب بھی بہت مفید اور مددگار ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں تفسیر ماثور دستیاب نہ ہو یعنی قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ و تابعین میں سے کوئی چیز میسر نہ آئے تو لغت عرب کی مدد سے معنیٰ سمجھا جاسکتا ہے اور قرآن کا ایسا معنیٰ کرنا جو لغت عرب سے ہٹ کر ہو، بسا اوقات گمراہی اور فتنے کا سبب ہوتا ہے جیسے قرآن مجید میں ہے" اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ط"" بے شک تم اور جن کی تم پرستش کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں۔" (انبیاء: ۹۸) جب یہ آیت اتری تو کفار مکہ نے شور مچایا اور کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کی بھی عبادت کی جاتی ہے تو کیا وہ بھی جہنم میں جائیں گے تو اس کا جواب محققین نے یہ دیا کہ لفظ ما لغت عرب کے مطابق غیر ذی عقل کے لیے استعمال ہوتا ہے لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام و عزیر علیہ السلام اس میں داخل نہیں ہیں۔

چھٹا مآخذ: استنباط

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و خرد عطا فرمائی ہے اور اسے حکم دیا ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں غور کرے جیسے ارشاد بھی ہے۔" كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ" یہ" وہ کتاب ہے جو ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف اتاری ہے برکت والی ہے تاکہ تم اس کی آیات میں غور و فکر کرو۔" (ص: ۲۹) دوسری جگہ فرمایا گیا۔" اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا"" کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے نہیں بلکہ ان کے دلوں پر تالے لگے ہیں۔" (محمد: ۲۴) اور انسان جوں جوں کلام الٰہی پر غور کرتا ہے اسے حکمت وہدایت کا نئے سے نیا موتی ملتا ہے تاہم یہ ضروری ہے کہ ہمارا غور و فکر قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ و تابعین سے نہ ٹکرائے اور اگر ان سے ٹکرائے بغیر نیا مفہوم حاصل کیا جائے جو ان کی تکذیب نہ کرے تو اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے صوفیاء کرام قرآنی آیات سے باطنی اشارات اپنے تدبر و فکر سے نکالتے ہیں۔

ساتواں مآخذ: اسرائیلیات

مفسرین نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں اسرائیلیات سے بھی کافی مواد لیا ہے اسرائیلیات ان روایات کو کہتے ہیں جو

بنی اسرائیل یہود ونصاریٰ سے مروی ہیں جس کا بڑا حصہ تابعین سے منقول ہے خصوصاً حضرت وہب بن منبہ اور کعب بن احبار رضی اللہ عنہما اور صحابہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسی کثیر روایات مروی ہیں۔ یاد رہے اسرائیلیات کا آیاتِ احکام یا اَوامر ونواہی سے کوئی تعلق نہیں، یہ انبیاء گزشتہ کے احوال سے زیادہ تر متعلق ہیں چونکہ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ واقعات کا صرف اتنا حصہ بیان کرتا ہے جس میں عقیدہ وعمل کے اعتبار سے انسانیت کی ہدایت پوشیدہ ہو مگر یہ انسان کی جبلی فطرت ہے کہ وہ واقعہ کی تفصیل جاننے کے درپے ہوتا ہے اس لیے جب قرآن نے انبیاء گزشتہ کے واقعات کی طرف اشارے کیے تو لوگوں کو ان کی تفصیل جاننے کا تجسس ہوا چنانچہ انہوں نے بنی اسرائیل سے ان کی تفصیلات معلوم کیں اور پھر یہ روایات کتبِ حدیث وتفسیر میں آ گئیں انہیں بلا دھڑک قبول نہیں کرنا چاہیے اگر یہ قرآن وحدیث کی کسی نص سے متصادم ہوں تو انکی کچھ حیثیت نہیں، نہ ہی انہیں عقائد یا احکام کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ البتہ انبیاء گزشتہ کے احوال سے متعلق تفصیل درکار ہو تو ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ابونملہ انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب اہل کتاب تمہیں کوئی بات بتلائیں تو ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب بلکہ کہو ہم اللہ اور اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لائے اس طرح اگر ان کی بات سچی تھی تو تم نے اس کی تکذیب نہ کی اور اگر جھوٹی تھی تو تم نے اس کی تصدیق نہ کی۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ ۱۳۶)

فصل دوم

تفسیر قرآن کی تاریخ عہد بہ عہد

بحث اول: تفسیر قرآن عہدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن نازل ہوتا تھا اور آپ جہاں مناسب سمجھتے اس کی تفسیر فرماتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگرچہ عربی زبان سے خوب واقف تھے، اہل لسان تھے۔ مگر محض اہل لسان ہونا کسی کتاب کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں۔ اگر انگلش میں انجینئرنگ کی کوئی کتاب ہو تو صرف انگلش جاننا اس کتاب کے سمجھنے کے لیے ناکافی ہے جب تک اس علم کا ماہر استاد اس کی تشریح نہ کرے۔ اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قدم قدم پر قرآن کا معنی جاننے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں سمجھاتے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی ''حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ'' ''یہاں تک کہ تمہارے لیے سفید دھاگہ کالے دھاگے سے جدا ہو جائے فجر سے۔'' (بقرہ:۱۸۷) تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے اپنے تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھ لیے ایک سفید ایک سیاہ اور رات کو اٹھ کر دیکھتے رہے کہ دونوں میں فرق کیسے ہوسکتا ہے صبح انہوں نے یہ ماجرا حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا تو آپ نے اس کا مطلب سمجھایا

(بخاری) نبی کریم ﷺ بسا اوقات آیات کا ظاہری معنی سمجھانے کے علاوہ آیات میں پوشیدہ خفیہ اسرار سے بھی پردہ اٹھاتے تھے جیسے جب یہ آیت نازل ہوئی ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴿۱۷۲﴾'' ''اے ایمان والو! ہم نے جو تمہیں پاک چیزیں دی ہیں وہ کھاؤ اور اللہ کا شکر کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔'' (بقرہ: ۱۷۲) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ پاک ہے اور پاک چیزیں ہی قبول فرماتا ہے اور اللہ نے مومنوں کو وہی حکم دیا جو اس نے رسولوں کو دیا چنانچہ اس نے رسولوں سے فرمایا۔'' یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ'' ''اے رسولو! پاک چیزیں کھاؤ۔''

(مومنون: ۵۱) (مسلم، ترمذی، مسند احمد، ابن منذر، ابن ابی حاتم)

حضور سید کائنات ﷺ کو قرآن جتنے علوم مزید دیئے گئے

حضرت مقدام بن معد یکرب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ'' ''خوب یاد رکھو مجھے قرآن بھی دیا گیا اور اس کی مثل اس کے علاوہ بھی دیا گیا۔'' (ابوداؤد شریف کتاب السنۃ باب فرلزو مالسنۃ صفحہ ۱۵۶۱ مجموعہ صحاح ستہ) یہ حدیث مسند احمد بن حنبل میں بھی ہے جس کا معنی یہ ہے کہ قرآن میں جو باتیں اجمالاً موجود ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ کو ان کی تفصیلات سے آگاہ فرمایا۔ گویا تفسیر قرآن ''مِثْلَهٗ مَعَهٗ'' کا مصداق ہے نبی کریم ﷺ نے بعض صحابہ کرام کو اس علم سے وافر حصہ عطا فرمایا۔ چنانچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے جو میرے سینے میں ڈالا میں نے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے سینے میں ڈالا۔ یونہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے بھی فرمایا کہ میں نے اپنا بچا ہوا دودھ خواب میں عمر کو پلایا اور اس کی تاویل علم دین ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے لیے فرمایا میں حکمت کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے اور بعض صحابہ نے بعض سورتیں حضور ﷺ سے کئی کئی برس میں پڑھیں ظاہر ہے۔ اس سے یہی مراد ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ سے تفسیر پڑھی اور عہد نبوی ﷺ میں جس صحابی کے پاس قرآن کا جتنا علم ہوتا وہ اتنا ہی افضل شمار کیا جاتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ دورِ نبوی میں حضور ﷺ ہی قرآن کے واحد مفسر تھے۔

بحث دوم: تفسیر قرآن عہد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اگر ان کے نام ذکر کئے جائیں جن سے قرآن کریم کی کسی نہ کسی آیت کی تفسیر مروی ہے تو وہ بہت طویل فہرست ہے اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کسی نہ کسی آیت کی تفسیر مروی ہوئی ہے درمنثور تفسیر ابن ابی حاتم، تفسیر ابن جریر وغیرہ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قریباً سبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تفسیر قرآن سے شغف تھا۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل، براء بن عازب، عمران بن حصین، مسلمہ بن اکوع، ابو بردہ و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی تفسیری اقوال مروی ہیں

اگرچہ تفسیر کے حوالے سے ان صحابہ کرام کی شہرت نہیں تاہم بعض صحابہ کرام کو تفسیر قرآن سے خصوصی شغف تھا اور وہ قرآن کی تفسیر دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ جانتے تھے امام سیوطی علیہ الرحمہ نے ایسے دس صحابہ کرام کا نام ذکر فرمایا ہے (۱) سیدنا صدیق اکبر (۲) سیدنا عمر فاروق (۳) سیدنا عثمان غنی (۴) سیدنا علی المرتضیٰ (۵) عبداللہ بن مسعود (۶) عبداللہ بن عباس (۷) ابی بن کعب (۸) زید بن ثابت (۹) ابوموسیٰ اشعری (۱۰) عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہم (اتقان فی علوم جلد ۲ صفحہ ۱۹۵ دار الفکر) ان دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتخاب امام سیوطی علیہ الرحمہ نے اپنے نقطہ نظر سے کیا ہے تاہم فن تفسیر سے شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان صحابہ کرام سے بھی تفسیری اقوال بکثرت مروی ہیں (۱) ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ۲ () انس بن مالک (۳) عبداللہ بن عمر (۴) ابوہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم تاہم ان میں تفسیر کے اعتبار سے درجات کا اختلاف ہے بعض سے کم اقوالِ تفسیر قرآن مروی ہیں اور بعض سے زیادہ خصوصاً خلفاء راشدین سے تفسیری اقوال بہت کم مروی ہیں شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں امور خلافت نے زیادہ مصروف رکھا۔ البتہ ان میں سے سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تفسیری روایات باقی تین خلفا راشدین سے زیادہ مروی ہیں اس کی وجہ ہے کہ انہیں اسلام کے اندر زیادہ حصہ عمر گزارنے کو ملا وہ وصال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ایک طویل عرصہ تک امورِ خلافت کی ذمہ داریوں سے فارغ رہے اور علمی مشاغل میں زیادہ حصہ لے سکے بہر حال اس میں شک نہیں کہ حدیث وتفسیر کے علم میں خلفاء راشدین کا مقام تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بلند تر ہے خلفاء راشدین کے بعد باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی تفسیری خدمت کے اعتبار سے فرقِ مراتب ہے سب سے زیادہ تفسیر قرآن پر جس صحابی نے زور دیا اور اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا وہ حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں آپ صحابہ میں امام المفسرین ہیں ہم چند صحابہ کرام کی تفسیر کے حوالے سے خدمات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

چند مشہور مفسرین قرآن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تذکرہ

سردست صرف چار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) باب مدینۃ الحکمت حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

آپ رضی اللہ عنہ پروردہ آغوشِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ کثیر روایات کے مطابق سب سے پہلے اسلام لانے والے آپ ہیں۔ صحابہ میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سب سے قریبی رشتہ آپ کا ہے یعنی چچازاد بھائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علی میرے لیے ایسے ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ فتح خیبر کے موقع پر حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کل میں اس شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے محبت رکھتے ہیں اور اللہ اس کے ہاتھ پر فتح فرمائے گا۔ شب ہجرت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سلایا اپنی امانتیں ان کے سپرد کیں اور حکم فرمایا کہ میری امانتیں سپرد کرکے تم میرے پیچھے مدینہ طیبہ

چلے آنا۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر اگلے سال نبی کریم ﷺ نے ان سے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سیدہ فاطمہ خاتون جنت رضی اللہ عنہا کا نکاح فرما دیا۔ پھر جنگ بدر میں آپ کی تلوار نے جنگ کا پانسہ اسلام کے حق میں پلٹ دیا اور احد میں آپ کی تلوار حضور ﷺ کے لیے ڈھال بنی۔ خندق کے غزوہ میں مشہور جنگجو عمرو بن عبدود آپ کی ذوالفقار حیدری کی خوراک بن کر واصل جہنم ہوا۔ ایسے ہی ہر غزوہ میں آپ کی بہادری اسلام کے کام آئی۔ خیبر آپ ہی کے زور بازو سے فتح ہوا۔ آپ کے دونوں بیٹوں حسنین کریمین رضی اللہ عنہما سے رسول اللہ ﷺ کا سلسلہ نسب چلا۔ آج دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سادات کرام اولاد علی بھی ہیں اور اولاد نبی بھی۔ آپ کو حضور ﷺ نے اپنا بھائی قرار دیا آپ کو اور آپ کے بیٹوں اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی چادر میں لے کر فرمایا اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں انہیں پاک کر دے۔ وفد نجران کے بالمقابل مباہلہ کے لیے نبی کریم ﷺ حضرت علی سیدہ فاطمہ اور حسنین کریمین کو لے کر نکلے اور عیسائی بھاگ گئے وہ کہہ رہے تھے ہم ایسے چہرے دیکھ رہے ہیں اگر وہ دعا کریں تو اللہ انکی دعا سے پہاڑوں کو انکی جگہ سے ہٹا سکتا ہے آپ چوتھے خلیفہ راشد ہیں۔

علم تفسیر میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مقام

ابو طفیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے سنا کہ لوگو! مجھ سے پوچھو خدا کی قسم! تم مجھ سے جو بھی پوچھو گے میں بتاؤں گا تم کتاب اللہ کے متعلق پوچھو خدا کی قسم! قرآن کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ رات کو اتری یا دن کو میدان میں اتری یا پہاڑ پر۔ امام ابونعیم حلیہ میں لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن سات حروف میں اُترا، ہر حرف کا ایک ظاہر ہے ایک باطن اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ہر آیت کا ظاہر بھی ہے باطن بھی۔ سلیمان احمسی روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم! قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو کہ یہ کس موقع پر نازل ہوئی کس کے متعلق نازل ہوئی۔ اللہ نے مجھے سمجھنے والا دل اور بولنے والی زبان عطا کی ہے۔

(الاتقان فی علوم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۸۷ ذکر طبقات مفسرین مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے تفسیری روایات اگرچہ کم ہیں مگر جہاں آپ نے کچھ تفسیر فرمائی ہے وہ حرف آخر ہے آیت میثاق ''وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ '' (آل عمران:۸۱) کی تفسیر میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے عہد لے لیا کہ اگر ان میں سے کسی کی موجودگی میں نبی ﷺ دنیا میں تشریف لے آئیں تو ان پر لازم ہوگا کہ وہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی مدد کریں۔ (تفسیر ابن جریر جلد سوم صفحہ ۲۳۶ مطبوعہ مکہ مکرمہ)

(2) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

قرآن کریم کی شائد کوئی ایسی آیت ہو جس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کوئی قول مروی نہ ہو یوں لگتا

ہے کہ آپ نے ساری زندگی تفسیر قرآن میں صرف کر دی۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جو بذات خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ایک بڑا علمی مقام رکھتے ہیں۔ آپ کو ترجمان القرآن کا لقب دے رکھا تھا۔ اہل سیر کا اس پر اجماع ہے کہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس زمانہ میں پیدا ہوئے جب بنو ہاشم کو شعب ابی طالب میں محصور کیا گیا تھا ایام محصوری میں حضرت عباس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں دیکھتا ہوں کہ (میری بیوی) ام فضل امید سے ہے آپ نے فرمایا: اللہ تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرے گا پھر جب عبداللہ پیدا ہوئے تو ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں لایا گیا آپ نے ان کے منہ میں لعاب دہن ڈالا یہی آپ کی گھٹی تھی (کنز العمال جلد ۱۳ صفحہ ۴۵۹ کتاب الفضائل حرف عین مطبوعہ موسۃ الرسالہ بیروت) گویا آپ کو علم تفسیر حاصل ہونے میں امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لعاب دہن مبارک کی برکت بھی شامل حال ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے علم تفسیر کے لیے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا

بخاری شریف میں ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے سینے سے لگایا اور دعا فرمائی: ''اللھم علمہ الکتاب'' اے اللہ! عبداللہ ابن عباس کو کتاب کا علم عطا فرما۔ دوسری روایت بخاری میں یوں ہے کہ فرمایا: ''اللھم علمہ الحکمۃ'' اے اللہ! اسے حکمت کا علم عطا فرما۔

(بخاری شریف کتاب فضائل ذکر ابن عباس صفحہ ۳۰۶ مجموعہ صحاح ستہ)

گویا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتاب وحکمت دونوں کا علم مانگا جب کہ آپ کے شاگرد حضرت عطا روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے لیے دو مرتبہ یہ دعا فرمائی کہ اللہ مجھے حکمت عطا فرمائے (ترمذی شریف کتاب المناقب عبداللہ بن عباس صفحہ ۲۰۴۴) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اے ابن عباس! میں نے دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آپ کے منہ میں لعاب دہن ڈالا اور فرمایا ''اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل'' ''اے اللہ! اسے دین کی فقاہت اور قرآن کی تاویل (تفسیر) عطا فرما۔''

(الاصابہ بروایت بغوی حرف العین جلد دوم صفحہ ۳۳۱)

الغرض یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کا اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا سینہ تفسیر قرآن کے لیے کھول دیا اور جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان سے علمی فیض حاصل کرنے پر مجبور تھے۔

تفسیر قرآن کے لیے جملہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف رجوع

امام ابن جریر نے عمرو بن حبیش سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر پوچھی ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ '' کہ ''صفا و مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص حج یا عمرہ کرے اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان چکر لگائے۔'' (بقرہ:۱۵۸) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمانے لگے تم ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جاؤ ''فانہ

اعلم من بقی بما انزل علی محمد'' کیونکہ محمد مصطفیٰ ﷺ پر اللہ نے جو اتارا اُس کا بڑا عالم دین دنیا میں اگر کوئی باقی ہے تو وہ ابن عباس ہے تو میں ان کے پاس گیا میں نے اپنا سوال پیش کیا وہ فرمانے لگے صفا و مروہ پر بت نصب کئے گئے تھے جن کی پوجا کی جاتی تھی جب لوگ اسلام لے آئے تو وہ وہاں جانے سے مکمل رک گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ'' کہ تم صفا و مروہ میں سعی کے لیے جاسکتے ہو کوئی گناہ نہیں۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۳۸۵ بروایت ابن جریر) (۲) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ تابعی روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مجھے جلیل القدر بدری صحابہ کرام کے ساتھ جگہ دیتے تھے ان میں سے کسی کے دل میں کوئی بات آئی اور اس نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ اس کو ہمارے ساتھ بٹھاتے ہیں اس کے برابر تو ہمارے بیٹے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کی وجہ تم جانتے ہو پھر ایک دن آپ نے مجھے بلایا اور ان کے ساتھ بٹھایا اور میں سمجھا تھا کہ آپ انہیں کچھ دکھانا چاہتے ہیں آپ نے ان سے پوچھا اس سورت کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ ''اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝'' تو ان میں بعض نے کہا اس سورہ میں اللہ نے ہمیں اپنی حمد اور استغفار کا حکم فرمایا ہے جب ہمیں فتح و نصرت مل جائے تو اور بعض لوگ خاموش رہے کچھ نہ کہا۔ پھر آپ نے مجھے فرمایا کیا تم بھی یہی کہتے ہو اے ابن عباس! میں نے کہا نہیں فرمایا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا: اس میں دراصل رسول اللہ ﷺ کے وصال کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتایا کہ جب اللہ کی طرف سے فتح آجائے تو یہ آپ کے وصال کی علامت ہوگی لہٰذا آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کہیں اور استغفار فرمائیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: میں بھی وہی کچھ جانتا ہوں جو تم نے کہا۔

(بخاری کتاب التفسیر باب ۱۱۰ سورہ 2° ’※※Wx※※※# صفحہ ۴۳۱)

تفسیر قرآن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا مقام

اعمش کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے ''نعم ترجمان القرآن ابن عباس'' حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما قرآن کے کتنے عمدہ ترجمان ہیں۔ اعمش ہی سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عرفات میں خطبہ حج دیا اور اس میں سورہ نور کی تفسیر فرمائی۔ میں دل میں کہنے لگا اگر اہل فارس و روم یہ بیان سن لیں تو اسلام لے آئیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا اور آیت قرآنیہ ''كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ'' (انبیاء: ۳۰) کی تفسیر پوچھی آپ نے فرمایا: اس کی تفسیر جا کر ابن عباس سے پوچھو وہ جو کہیں مجھے آکر بتاؤ وہ گیا۔ اس نے تفسیر پوچھی آپ نے بڑی عمدہ تفسیر بتائی وہ شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور تفسیر بتائی آپ نے فرمایا مجھے اس سے قبل ابن عباس کی تفسیر قرآن پہ یہ جرات پسند نہ تھی مگر اب میں جان گیا ہوں کہ انکے پاس تفسیر کا علم ہے (جو ہمارے پاس نہیں) (الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ حرف العین جلد دوم صفحہ ۳۳۳)

تفسیر قرآن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی برتری کے اسباب

سب سے اہم اور بنیادی سبب ان کے لیے حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ہے جیسے پیچھے گزرا۔ تاہم جب اللہ تعالیٰ کسی کی دعا کے صدقے یا کسی اور وجہ سے کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے تو اس کیلئے اسباب مہیا فرماتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے یہ اسباب مہیا کیے گئے۔ آپ نے شعور کی آنکھ کھولی تو ہر طرف دین کی خوشبو مہک رہی تھی آپ نے بچپن ہی سے اسلامی ماحول اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت کا فیض پایا۔ قرآن کریم کا بڑا حصہ آپ کی موجودگی میں نازل ہوا اور آپ نے اسباب نزول اور احوالِ نزولِ قرآن کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔

آپ میں علم دین جمع کرنے کا بے پناہ شوق تھا۔ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان آیات کے متعلق کثرت سے سوال کرتے رہے جو آپ کی موجودگی میں نہیں اتری تھیں یا سن شعور سے پہلے اتری تھیں۔ اسطرح آپ نے بڑا ذخیرہ تفسیر جمع کر لیا آپ بعض اوقات ایک آیت کی تفسیر اور شان نزول جاننے کے لیے کسی صحابی کے دروازے پر دیر تک بیٹھے رہتے تھے تا آنکہ آپ کا چہرہ غبار سے اَٹ جاتا مگر تب اٹھتے جب اس صحابی سے ملاقات ہو جاتی اور سبب نزول معلوم ہو جاتا (الاصابہ) تو اس بے پناہ شوق نے آپ کو تفسیر کا بہت بڑا عالم بنا دیا۔ آپ کو عربی زبان کی باریکیوں اور اس کے ادب سے گہری شناسائی تھی۔ اور شعراء عرب کے کلام کا بڑا ذخیرہ آپ از بر رکھتے تھے اور حسب موقع عربی اشعار سے استشہاد لاتے تھے۔ تفسیر اتقان جلد اول صفحہ ۱۲۰ میں اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وفات

آپ خلافت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں گورنر بصرہ رہے آخر میں 58ھ عہدِ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخر میں آپ کا وصال ہوا طائف میں آپ کا مزار ہے۔ آپ سے ہزاروں تابعین نے قرآن سیکھا اور اسکے مسائل سمجھے۔ جن میں سے آپ کے جلیل القدر شاگرد تابعین کا ذکر ہم اگلی بحث میں تابعین مفسرین کے زمرے میں کریں گے ان شاء اللہ۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کتاب من گھڑت ہے

تفسیر کی ایک کتاب جس کا نام تنویر المقباس من تفسیر ابن عباس ہے لوگوں کے ہاں معروف ہے اور مصر سے دوبار چھپ چکی ہے اس کے جامع کا نام محمد یعقوب فیروز آبادی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف اسکی نسبت درست نہیں کیونکہ اس کی سند آپ کی طرف آغاز کتاب میں یوں لکھی ہے۔ محمد بن مروان السدی (الصفیہ) عن محمد بن سائب کلبی، عن ابی صالح، عن ابن عباس جب کہ یہ سند نہایت مجروح ہے امام سیوطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں تفسیر ابن عباس کا سب سے باطل طریقہ یہ ہے کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس اور اگر اس کے ساتھ محمد بن مروان سدی صفیہ بھی مل جائے تو یہ ایک مکمل جھوٹی سند کہلاتی ہے (الاتقان فی علوم القران جلد ۲ صفحہ ۱۸۹ ذکر طبقات المفسرین مطبوعہ دار الفکر)

یہ محمد سائب کلبی ایک جھوٹا راوی ہے اور اس کا شاگرد سدی اس سے بڑا جھوٹا ہے امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ لیث بن ابی سلیم نے کہا کوفہ میں دو کذاب رہتے تھے کلبی اور سدی۔ ابوعوانہ کہتے ہیں میں نے خود کلبی سے ایسی باتیں سنیں جن کا کہنے والا صریح کافر ہے۔ یزید بن زریع کہتے ہیں میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا کہ جبرائیل نبی ﷺ کے پاس وحی لائے نبی ﷺ کسی حاجت کے لیے وہاں سے اٹھ گئے اور علی رضی اللہ عنہ انکی جگہ بیٹھ گئے تو جبرائیل نے انہی پر وحی القا کردی۔ یزید کہتے ہیں وہ سینے پر ہاتھ مار مار کر کہتا تھا میں سبائی ہوں میں سبائی ہوں۔ محمد بن سائب کلبی نے جس ابو صالح کے ذریعے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر نقل کرنے کا دعوی کیا ہے، وہ ابو صالح قسم اٹھا کر کہتے تھے کہ میں نے کلبی کو کوئی تفسیر نہیں بتائی ہے۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کلبی نے کہا جو کچھ میں ابو صالح کی روایت سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کروں وہ جھوٹ سمجھو اسے مت روایت کرو۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں کلبی کو جھوٹا بتانے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، وہ ابو صالح سے تفسیر ابن عباس نقل کرتا ہے حالانکہ ابو صالح نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ نہیں سنا۔ امام ساجی فرماتے ہیں یہ غالی شیعہ ہے تمام اہل نقل اس کی مذمت پر متفق ہیں۔

(تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۱۱۷ سلسلہ نمبر ۶۸۵۸ مطبوعہ موسستہ التاریخ العربی بیروت)

اسی طرح محمد بن مروان سدی صغیر کوفی بھی کذاب راوی ہیں جیسا کہ لیث بن سلیم کی زبانی گزرا۔ اس طرح جریر بن عبدالحمید نے بھی فرمایا کہ وہ کذاب ہے۔ امام ابو حاتم اسے ذاھب الحدیث کہتے ہیں (یعنی اس سے مروی حدیث کا کوئی درجہ نہیں) عبداللہ بن نمیر کے نزدیک وہ کذاب ہے۔ الغرض کسی نے اسے اچھا آدمی نہیں کہا۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۲۷۸ سلسلہ نمبر ۱۱۷۳) البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی تفسیری اقوال ہزاروں کی تعداد میں کتب تفسیر میں موجود ہیں اور اکثر کی سند درست ہے اگر ان سب کو یکجا کیا جائے تو یقیناً سارے قرآن کی تفسیر تیار ہو جائے۔

(3) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد جس صحابی سے تفسیری روایات سب سے زیادہ مروی ہیں وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں آپ کی کنیت آپ کی والدہ اُمّ عبد کی طرف ہے وہ بھی اسلام لائیں اور شرف صحابیت حاصل کیا آپ ''وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ'' میں سے ہیں اسلام میں آپ چھٹے نمبر پر داخل ہوئے یعنی آپ سے قبل صرف پانچ افراد مسلمان تھے جب آپ اسلام لائے تو حضور ﷺ نے آپ سے فرمایا ''انك لغلام معلم'' تم سیکھنے والے نوجوان ہو۔ نبی کریم ﷺ کے بعد جس شخص نے اونچی آواز سے قرآن پڑھا اور کفار نے سنا وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہی تھے آپ نے حبشہ اور مدینہ طیبہ دونوں مقامات کی طرف ہجرت کی۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے ابوجہل جیسے دشمن اسلام کا سر قلم کیا اسکے بعد بھی تمام غزوات میں شریک رہے۔ نبی پاک ﷺ کے خصوصی خدام میں سے تھے آپ کو صاحب

النعلین کہا جاتا ہے یعنی آقائے دو جہاں ﷺ کی نعلین اٹھانے والا (کفش بردار) جب حضور ﷺ کسی مجلس میں تشریف لے جاتے تو آپ نعلین پاکِ رسول ﷺ سنبھال لیتے جب آپ مجلس سے اٹھتے تو لپک کر نعلین آپ کے قدموں میں حاضر کرتے۔ نبی پاک ﷺ کی مسواک شریف اور تکیہ مبارک بھی انہی کے سپرد ہوتا تھا جب آقا کریم ﷺ کو ضرورت ہوتی پیش کر دیتے تھے۔ (بخاری شریف کتاب الفضائل)

حضور ﷺ کے گھرانہ میں آتے جاتے تھے اور گھر کا فرد ہی شمار کیے جاتے تھے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اور میرا بھائی ہم دونوں یمن سے حاضر ہوئے ایک عرصہ تک ہم یہی سمجھتے رہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے اہل بیت سے ہیں کیونکہ وہ اور ان کی والدہ حضور ﷺ کے گھر میں ہر وقت آتے جاتے تھے (بخاری شریف کتاب الفضائل مناقب عبداللہ بن مسعود) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ کو کوفہ میں معلم قرآن بنا کر بھیجا اور اہل کوفہ سے فرمایا میں نے انہیں تمہارے پاس بھیج کر تم کو اپنی ذات پر ترجیح دی ہے۔ پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آپ کو کوفہ کا مستقل گورنر بنایا، تاہم بعد میں انہیں معزول کر کے کسی اور صحابی کو وہاں مقرر فرمایا 33ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ آپ وفات سے قبل کوفہ سے مدینہ طیبہ چلے آئے اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔

علم تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مقام

ابوالاحوص کہتے ہیں ہم حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھے قرآن کریم کے ایک نسخہ میں غور کر رہے تھے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ بعد میں ایک آدمی ابومسعود کہنے لگا: میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بعد کوئی ایسا شخص چھوڑا ہو جو اس اٹھ کر جانے والے (عبداللہ بن مسعود) سے بڑھ کر قرآن کا علم رکھنے والا ہو۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرمانے لگے جب تم نے یہ بات کہہ دی ہے تو سنو ابن مسعود بارگاہ رسالت میں اس وقت موجود ہوتے تھے جب ہم غائب ہوتے اور انہیں اس وقت اذنِ حضوری ملتا جب ہمیں روک دیا جاتا تھا۔ شقیق کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے (دور عثمانی میں) فرمایا: یہ لوگ مجھے کس شخص کی قراءت پہ قرآن پڑھنے کا کہہ رہے ہیں جب کہ میں نے ستر سے اوپر سورتیں براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے لبوں سے حاصل کی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ جانتے ہیں کہ میں ان میں کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم رکھتا ہوں اور اگر میں جانتا کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ قرآن کا علم رکھتا ہے تو میں سفر کر کے اس کے پاس جاتا۔ حضرت شقیق کہتے ہیں میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس بات کی صداقت جاننے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کئی مجلسوں میں بیٹھا مگر میں نے نہ دیکھا کہ کسی آدمی نے آپ کی اس بات کا رد کیا ہو یا اس وجہ سے ان پر اعتراض کیا ہو (گویا سب کو یہ حقیقت مسلم تھی) مسروق تابعی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ

بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس رب کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ قرآن میں کوئی ایسی سورت نہیں جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو کہ وہ کہاں نازل ہوئی۔ اور کوئی ایسی آیت نہیں جس کا مجھے علم نہ ہو کہ وہ کس بارہ میں اتری اور اگر میں خود سے بڑھ کر کسی کو کتاب اللہ کا عالم جانتا تو اسے ملنے وہاں تک جاتا جہاں تک اونٹ پہنچ سکتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے پاس جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا گیا تو فرمانے لگے میں اس شخص کو تب سے محبوب رکھتا ہوں جب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا چار آدمیوں سے قرآن سیکھو۔ ابن ام عبد (عبداللہ بن مسعود) معاذ بن جبل، ابی بن کعب اور سالم غلام ابو خذیفہ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا نام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے لیا۔ (مسلم شریف کتاب فضائل الصحابہ باب فضائل عبداللہ بن مسعود صفحہ ۱۱۰۹)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علم تفسیر میں رسوخ کے اسباب

آپ نے نہایت ابتداء میں اسلام قبول کیا جب کہ صرف پانچ آدمی اسلام لائے تھے لہٰذا آپ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفادہ کا بے پناہ موقع ملا۔ آپ سائے کی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعلین مبارک آپ کے پاس ہوتیں، مسواک اور تکیہ بھی انہی کے پاس ہوتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ایک ارشاد غور سے سنا اور ذہن میں بٹھایا۔ آپ کو حضور سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھروں میں بھی جانے کی اجازت تھی لہٰذا آپ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جلوت وخلوت سب کے حاضر باش غلام تھے اور جو بھی آیت نازل ہوتی آپ اس کے سبب نزول کا بچشم خود مشاہدہ فرماتے۔ چنانچہ جب آپ کوفہ میں آئے تو یہاں علم کا دریا بہادیا۔ اور ہزاروں لوگ آپ کے چشمہ علم سے سیراب ہوئے۔ جن میں بعض روایات کے مطابق سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کی ذات مبارکہ بھی ہے آگے بحث تابعین میں ہم آپ سے فیض یاب ہونے والوں کا ذکر لا رہے ہیں۔

(4) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی تفسیری روایات کی ایک تعداد مروی ہے۔ آپ مکی دور کے آخر میں اسلام لائے اور بیعت عقبہ میں شامل ہوئے، آپ جلیل القدر انصار صحابہ میں سے ہیں غزوہ بدر اور دیگر غزوات میں شامل رہے۔ قرآن کریم کے بہترین حافظ تھے جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ نماز تراویح باجماعت ادا کی جائے تو آپ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کو امام بنا دیا اور تمام صحابہ کو آپ کے پیچھے کھڑا کیا۔ آپ نے پہلی مرتبہ تراویح میں سارا قرآن پڑھ کر سنایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آپ کو سید المسلمین کہہ کر پکارتے تھے آپ نہایت صابر و متقی تھے جیسا کہ صحابہ کی شان تھی۔ ایک بار ایک صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تکالیف اور مرضیں ہمیں لاحق ہوتی ہیں کیا ان پر ہمارے لیے ثواب ہے؟ فرمایا یہ گناہوں کا کفارہ ہیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پوچھنے لگے خواہ وہ تکلیف تھوڑی ہو فرمایا ہاں اگر پاؤں میں کانٹا

چھپے اس پر بھی ثواب ہے۔ تب حضرت ابی نے فرمایا کہ انہیں ہمیشہ بخار رہا کرے مگر اتنا نہیں کہ نماز، حج وعمرہ اور جہاد سے روک سکے۔ چنانچہ آپ کو ہلکا بخار رہنے لگا جو بھی آپ کے وجود کو چھوتا اسے حرارت محسوس ہوتی تا آنکہ آپ کا وصال ہوا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ایک ہفتہ قبل آپ نے وصال فرمایا۔

(الاصابہ فی معرفۃ الصحابہ حرف الف جلد اول صفحہ ۲۵)

علم تفسیر میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا مقام

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے سنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چار آدمیوں سے قرآن سیکھو عبداللہ بن مسعود، سالم غلام ابو حذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم۔

(بخاری شریف کتاب مناقب الانصار صفحہ ۳۰۹ مجموعہ صحاح ستہ)

قتادہ کہتے ہیں انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ فرماتے سنا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں چار آدمیوں نے قرآن جمع کیا۔ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید اور یہ چاروں انصار میں سے تھے۔

(مسلم شریف کتاب فضائل الصحابہ فضائل ابی بن کعب صفحہ ۱۱۱۵)

اس حدیث کا یہ معنی تو ہو ہی نہیں سکتا کہ صرف چار آدمی عہدِ رسالت میں قرآن کریم کے حافظ تھے حفاظ کی تعداد تو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ چنانچہ جنگ یمامہ میں جو عہدِ رسالت کے فوراً بعد ہوئی، ستر حفاظ قرآن شہید ہوئے۔ لہٰذا اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم کو اسکی تمام قراءات اور حروف کے ساتھ جن پر وہ نازل ہوا، ان چار آدمیوں نے جمع کیا امام زرکشی نے اسکا یہی معنی لیا ہے (البرہان جلد اول صفحہ ۳۳۵) اس سے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کا مقام ظاہر ہوتا ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: بے شک اللہ نے مجھے حکم دیا کہ میں تجھے قرآن سناؤں آپ عرض کرنے لگے کیا اللہ نے میرا نام لیا ہے فرمایا ہاں نام لیا ہے۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے (بخاری، مسلم، ترمذی، مسند احمد) حضرت ابی رضی اللہ عنہ قبول اسلام سے قبل یہود میں سے تھے۔ آپ کتب سابقہ سے بھی واقف تھے اور آپ کاتبین وحی میں سے بھی ہیں۔ لہٰذا آپ کو قرآن کریم کے معارف جمع کرنے کا وافر موقع مل گیا، اس لیے آپ مفسرین قرآن میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔

بحث سوم: تفسیر قرآن کے سلسلہ میں صحابہ کا طریق کار

اس بارہ میں چند چیزیں یاد رکھنے والی ہیں۔

(1) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تفسیر قرآن پر کوئی تحریری مواد نہیں چھوڑا انکی تفسیر زبانی تھی وہ قرآن کے علوم ومعارف پر درس دیا کرتے تھے۔ سائلین کے پوچھنے پر جواب میں آیات کا معنی بتاتے تھے، جسے لوگ یاد کر لیتے تھے۔ گویا تفسیر کا انداز احادیث وآثار والا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف جو تفسیر منسوب ہے یعنی تنویر المقباس اسکے متعلق

ہم ابھی پیچھے بتا چکے کہ وہ من گھڑت ہے۔

(2) صحابہ کرام آیات کا ظاہری مفہوم بتانے پر ہی اکتفا کرتے تھے گہرے اسرار و رموز کی طرف نہیں جاتے تھے ان کا عمل پر زیادہ زور تھا۔ بعد کے ادوار میں علمی موشگافیاں بڑھ گئیں مگر عمل گھٹ گیا۔

(3) عہد صحابہ کرام میں اعتقادی و فقہی اختلافات نے جنم نہ لیا تھا جیسے بعد میں مختلف مکاتب فقہ پیدا ہوئے اور اعتقادی اختلافات نے سر اٹھایا اس لیے صحابہ کرام آیات سے احکامات فقہیہ کے استنباط کے عادی نہ تھے۔

(4) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تفسیر قرآن کے لیے خود آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے عقل و قیاس سے مدد لیتے تھے اور اسرائیلی روایات کو بھی کام میں نہ لاتے تھے۔

بحث چہارم: تفسیر قرآن عہدِ تابعین میں

دورِ تابعین میں تین شہر علم و حکمت کا مرکز تھے اور وہاں ایسے تابعین کرام رحمہم اللہ کی کثرت تھی جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرآن کے علوم و معارف سیکھے تھے اور آگے وہ لوگوں کو قرآن کے چشمہ ہدایت سے سیراب کر رہے تھے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور کوفہ، حرمین شریفین کی وجہ سے مکہ و مدینہ تو مرکز علم تھے ہی مگر کوفہ بھی علم و حکمت کی روشنی سے اس وقت جگمگایا جب عہد فاروقی میں حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہاں تشریف لائے اور درسِ قرآن کا حلقہ لگایا اور وفات سے کچھ ایام قبل تک کوفہ کے در و دیوار اور کوچہ و بازار آپ کی آواز سے گونجتے رہے۔

دورِ تابعین میں مفسرین مکہ

چونکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے زندگی کے آخری اٹھارہ برس حرم کعبہ میں درس قرآن دیتے ہوئے گزارے اور قرآن کی تفسیر ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ہزاروں لوگ آپ سے مستفیض ہوئے اور ہر کسی نے اپنے ظرف کے مطابق اس چشمہ علم سے فیض لیا، مگر کچھ لوگوں نے سارا قرآن آپ سے پڑھا اور ایک ایک آیت کی تفسیر سمجھی۔ ان لوگوں نے بعد میں قرآن کریم پر بہت کام کیا اور لوگ ان کی طرف قرآن سمجھنے کے لیے ایسے ہی لپکنے لگے جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف لپکتے تھے ان میں چند ایک کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ (1) سعید بن جبیر (2) مجاہد (3) عکرمہ بن غلام ابن عباس (4) طاؤس بن کیسان (5) عطاء بن ابی رباح۔

(1) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ متوفی 95ھ

آپ 38ھ کے لگ بھگ کوفہ میں پیدا ہوئے، ہوش سنبھالا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم سیکھنا شروع کیا۔ زیادہ علم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حاصل کیا انکے علاوہ عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر، عدی بن حاتم، ابوسعید خدری، ابو

ہریرہ اور موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے بھی اکتساب فیض کیا۔ آپ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بڑے شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں (البدایہ والنہایہ جلد ۹ صفحہ ۱۰۳) اس لیے آپ کو علم تفسیر سے زیادہ شغف تھا قرآن کریم کی تمام قراءات سے واقف تھے ہر رات پورا قرآن کریم پڑھ ڈالتے تھے۔ بسا اوقات آپ نے کعبہ شریف کے اندر ایک رکعت میں سارا قرآن پڑھ ڈالا (یہ کرامت ہے) (البدایہ) اسماعیل بن عبدالمالک بتاتے ہیں کہ آپ ایک رات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت پر قرآن پڑھتے دوسری رات زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی قرأت پر۔ اس طرح ہر رات علیحدہ قراءت پر قرآن ختم فرماتے۔ (وضات الامیان جلد ا صفحہ ۳۲۴)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کو کوفہ میں پڑھانے کے لیے بھیجا پھر اگر کوئی شخص کوفہ سے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس مسئلہ دریافت کرنے آتا تو آپ فرماتے کیا تمہارے پاس سعید ابن جبیر نہیں ہے اس کے ہوتے ہوئے میرے پاس آنے کی کیا ضرورت ہے (تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۹۳ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی)

59ھ میں حجاج بن یوسف نے آپ کو ظلماً قتل کیا۔ شہادت سے قبل آپ نے حجاج کے ساتھ جو مکالمہ کیا وہ جراءت ایمانی توکل علی اللہ اور استقامت فی الدین کی زندہ جاوید مثال ہے۔ یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں میرے نزدیک سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی مرسلات مجاہد و عطاء سے بہتر ہے۔ سفیان ثوری آپ کو مجاہد و طاؤس سے زیادہ عالم سمجھتے تھے۔
(تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۲۹۴)

(2) حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ متوفی 104ھ

آپ کا نام مجاہد بن جبیر مخزومی ہے خلافت فاروقی میں 21ھ میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ کثیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا جن میں سب سے زیادہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، انکے علاوہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، رافع بن حزیج، اسید بن ظہیر، ابو ہریرہ، جابر بن عبداللہ، سراقہ بن مالک بن جعشم و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اکتساب فیض کیا۔

علم تفسیر میں حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ کا مقام

آپ نے تین بار سارا قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سنایا اور ہر آیت پر رک کر پوچھا کہ یہ کہاں نازل ہوئی اور کیسے نازل ہوئی؟ ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ نے تیس مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سارا قرآن سنایا۔ آپ فرمایا کرتے تھے اگر میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے علم قرآن حاصل کر لیتا تو مجھے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس پڑھنے کی ضرورت نہ رہتی۔ اسکے علاوہ آپ نے اہل کتاب سے بھی کافی استفادہ کیا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ جو خود ایک جلیل القدر تابعی اور مفسر قرآن ہیں فرماتے تھے آج زمین پر مجاہد سے بڑھ کر تفسیر قرآن کا جاننے والا کوئی شخص نہیں ہے۔
(تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۴۷ ۳ مطبوعہ دار احیاء التراث)

امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جب تمہیں مجاہد سے کسی آیت کی تفسیر میسر آجائے تو اسے کافی سمجھو۔ (ابن جریر جلد ا صفحہ ۳۰)

امام ذہبی حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں: اجمعت الامة علی امامة مجاهد ''ساری امت حضرت مجاہد کی امامت پر متفق ہے'' آپ کی وفات 104ھ میں مکہ مکرمہ میں نماز پڑھتے ہوئے حالت سجدہ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر 83 برس تھی

(3) حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ متوفی 105ھ

آپ کا نام عکرمہ ابوعبداللہ بربری مدنی ہے۔ آپ دیارِ مغرب کے قبیلہ بربر سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ پہلے حصین بن ابی بحرہ عنبری کے غلام تھے جب حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے گورنر بصرہ بنے تو حصین نے عکرمہ کو حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے ہبہ کر دیا اور جب حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما وہاں سے مکہ آئے تو عکرمہ کو ساتھ لے آئے پھر یہ زندگی بھر مکہ ہی رہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بعد مکہ میں تفسیر قرآن کا علم پھیلاتے رہے حضرت عکرمہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، امام حسن بن علی، ابوہریرہ، ابن عمر، بن عمرہ، ابوسعید، عقبہ بن عامر، امیر معاویہ بن ابی سفیان، صفوان بن امیہ ودیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے عکرمہ کو آزاد نہیں کیا تھا جب وہ فوت ہو گئے تو انکے بیٹے علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کو آزاد کر دیا۔

علم تفسیر میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کا مقام

جیسے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو حبر امت کہا جاتا تھا ان کے غلام حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو ان کے بعد حبرِ اُمت کہا گیا۔

فرزدق بن جواس کہتے ہیں ہم شہر جرجان میں ابن حوشب کے پاس حاضر ہوئے عکرمہ وہاں آئے ہم نے ابن حوشب سے کہا ہم حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے پاس نہ جائیں؟ انہوں نے کہا ضرور جاؤ کیونکہ ہر امت کا حبر (سب سے بڑا عالم) ہوتا ہے اور اس امت کا حبر ابن عباس کا غلام (عکرمہ) ہے۔

عباس بن مصعب مروزی کہتے ہیں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگردوں میں سے علم تفسیر میں عکرمہ رضی اللہ عنہ کا مقام سب سے بلند تر ہے، عکرمہ نے اکثر شہروں کا دورہ کیا۔ داؤد بن ابی ھند نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ ایک بار حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت میں فکرمند تھے کہ اللہ فرماتا ہے ''لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ '' ''تم اس قوم کو کیوں وعظ کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے والا ہے۔'' (اعراف: ۱۶۴) آپ فرماتے ہیں تو پتہ نہیں پھر اس قوم

کوعذاب ہوا یانہیں؟ عکرمہ کہتے ہیں میں اس آیت کی تفسیر کرنے لگا تا آنکہ آپ جان گئے کہ انہیں عذاب ہوا تھا تب انہوں نے خوش ہوکر مجھے نیا جوڑا الباس دیا۔ مغیرہ کہتے ہیں کہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کیا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہے فرمایا ہاں عکرمہ ہے حضرت قتادہ فرماتے تھے کہ تابعین میں چار آدمی سب سے بڑے عالم ہیں۔ عطا، سعید بن جبیر، عکرمہ اور حسن بصری اور ان میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم عکرمہ ہیں۔
(تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۱۲۸ مطبوعہ دار احیاء)

(4) حضرت طاؤس رضی اللہ عنہ متوفی 107ھ

آپ کا نام ذکوان بن کیسان یمانی ہے۔ طاؤس لقب ہے آپ نے بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے علم تفسیر لیا۔ اگرچہ آپ نے دیگر صحابہ کرام عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، سیدہ عائشہ، ابو ہریرہ، زید بن ثابت اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہم وغیرہ سے بھی علم لیا۔ حضرت طاؤس فرماتے ہیں میں نے پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی اور ان سے علم سیکھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما خود فرمایا کرتے تھے کہ طاؤس اہل جنت میں سے ہے۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں حضرت طاؤس رضی اللہ عنہ اہل یمن کے عابدین میں سے ہیں آپ نے چالیس مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی آپ بے حد مستجاب الدعوات تھے حضرت عمرو بن دینار فرماتے ہیں میں نے طاؤس سے بڑھ کر کسی شخص کو مال دنیا سے بے رغبت نہیں دیکھا۔ امام ابن عیینہ کا ارشاد ہے تین آدمی اپنے اپنے زمانہ میں بادشاہوں سے کنارہ کش رہے۔ حضرت ابوذر غفاری، طاؤس اور سفیان ثوری رضی اللہ عنہم۔ آپ نے مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور وہیں دفن کیے گئے۔
(تہذیب التہذیب جلد ۳ صفحہ حرف طاء اسمہ طاؤس)

(5) حضرت عطا رضی اللہ عنہ متوفی 114ھ

آپ کا پورا نام عطا بن ابی رباح مکی ہے۔ آپ نجد میں پیدا ہوئے مگر مکہ مکرمہ میں ہوش سنبھالا اور یہیں پلے بڑھے، آپ بھی حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگردوں میں سے تھے۔ تاہم آپ نے کثیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی، آپ فرماتے تھے میں نے دوسو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کی ہے۔ آپ خوش شکل نہ تھے، رنگ کالا، ایک آنکھ خراب، ناک چپٹی، ایک ہاتھ اور پاؤں سے معذور تھے مگر اخلاقی اور علمی خوبیوں سے مرصع تھے فقہ، حدیث اور تفسیر میں امام زمانہ تھے۔ ابوجعفر کہتے ہیں عطاء سے بڑھ کر مناسکِ حج کا عالم زمین پر کوئی نہیں رہا۔ ابن سعد نے انکا تعارف یوں کروایا ہے کہ مکہ میں فتوٰی آپ پر ختم تھا۔ اعلیٰ درجہ کے عابد وزاہد تھے بیس برس تک حرم کعبہ میں فرش پر سوتے رہے ان سے بڑھ کر کوئی شخص خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھتے نہ دیکھا گیا۔ امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں میں نے عطاء سے بڑھ کر کوئی افضل نہیں دیکھا اور جابر جعفی سے بڑھ کر کوئی جھوٹا نہیں پایا۔ جب عطا فوت ہوئے تو امام اوزاعی نے فرمایا روئے

زمین پر لوگوں کے نزدیک عطاسب سے پسندیدہ ترین انسان تھے۔کسی نے آپ سے مسئلہ پوچھا فرمایا میں نہیں جانتا اس نے کہا اپنی رائے سے کچھ بتادیں فرمایا مجھے اللہ سے حیا آتی ہے کہ میری رائے کو دین سمجھ لیا جائے۔امام ابن حبان فرماتے ہیں حضرت عطا رضی اللہ عنہ سادات تابعین میں سے ہیں فقہ،علم،ورع اور فضل میں وہ سردار ہیں۔آپ ماہ رمضان المبارک 114ھ میں مکہ مکرمہ میں واصل بحق ہوئے۔

یہ تھے مفسرین اہل مکہ جو دورِ تابعین میں قرآن کی تفسیر میں اپنی مثال آپ تھے اور آج اگر کتب تفسیر جیسے تفسیر ابن جریر،تفسیر درمنثور،تفسیر قرطبی،تفسیر ابن ابی حاتم وغیرہ کو اٹھائیں تو کوئی صفحہ ایسا نظر نہیں آئے گا جس میں ان تابعین میں سے کسی کا نام نہ ہو۔امام سیوطی فرماتے ہیں دورِ تابعین میں اہل مکہ کا مقام تفسیر میں سب سے بلند ہے کیونکہ وہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسی شخصیت کے پروردہ ہیں۔(الاتقان جلد ۳ صفحہ ۱۸۷)

دورِ تابعین میں مفسرین مدینہ

مدینہ طیبہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے قرآن پڑھانے پر زور دیا۔دور صحابہ میں قرآن کی قراءات سے زیادہ واقف شخص ہی قرآن کا بڑا عالم اور مفسر گردانا جاتا تھا،کیونکہ قراءات کے اختلاف سے معنی میں اختلاف آتا ہے اور ایک آیت کی کئی کئی تفاسیر بنتی ہیں۔حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ پر جیسا کہ پیچھے گزرا علم قراءت ختم تھا۔لہٰذا آپ کے حلقہ درس سے مدینہ طیبہ میں قرآن کی قراءات اور تفسیر کا ایک چشمہ جاری ہوا جس سے فیضیاب ہونے والوں میں ابوالعالیہ،محمد بن کعب القرظی اور زید بن اسلم کے نام زیادہ معروف ہیں جنہوں نے آپ سے پڑھ کر آگے خلق کثیر کو پڑھایا۔ذیل میں ان کا ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) حضرت ابوالعالیہ رضی اللہ عنہ متوفی 93ھ

آپ کا نام رفیع بن مہران ریاحی ہے ابوالعالیہ کنیت ہے انہوں نے زمانہ جاہلیت بھی پایا۔دورِ رسالت بھی پایا مگر اسلام نہ لائے،نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے دو برس بعد مسلمان ہوئے۔آپ نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ،عبداللہ بن مسعود،عبداللہ ابن عباس،عبداللہ ابن عمر،رافع بن خدیج،حذیفہ بن یمان،حضرت انس اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے استفادہ کیا اور علوم قرآن میں بلند درجہ پر پہنچ گئے حتیٰ کہ فرماتے ہیں میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے دس برس بعد قرآن پڑھا۔ابن ابی داؤد فرماتے ہیں صحابہ کرام کے بعد کوئی شخص ابوالعالیہ رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر قرآن کا جاننے والا نہیں۔ان کے بعد حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ ان کے بعد حضرت سدی (تابعی) اور ان کے بعد سفیان ثوری کا مقام ہے آپ نے 93ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔(تہذیب التہذیب جلد ۲ صفحہ ۱۲۷)

(2) محمد بن کعب القرظی رضی اللہ عنہ متوفی 108ھ

آپ کی کنیت ابوحمزہ ہے۔ آپ کے والد یہود کے قبیلہ بنوقریظہ سے تعلق رکھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے ان دو کہانت پسند قبیلوں بنوقریظہ اور بنونضیر میں ایک شخص ظاہر ہوگا جو قرآن کا بے مثال درس دے گا۔ حضرت ربیعہ کہتے ہیں، ہم سمجھتے تھے اس حدیث کا مصداق محمد بن کعب عون رضی اللہ عنہ ہیں، فرماتے ہیں میں نے محمد بن کعب سے بڑھ کر کسی کو تفسیر قرآن کا عالم نہیں دیکھا۔ ابن حبان فرماتے ہیں آپ اہل مدینہ میں علم وفقہ کے اعتبار سے فاضل تر تھے۔ آپ مسجد میں اپنے چند شاگردوں کے ساتھ حلقہ میں بیٹھے تھے کہ چھت گر پڑا جس سے آپ اور آپ کے چند ساتھی شہید ہو گئے، یہ 108ھ کی بات ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ صفحہ ۲۶۹ مطبوعہ دار احیائ)

(3) زید بن اسلم رضی اللہ عنہ متوفی 130ھ

آپ کا نام زید بن اسلم عدوی ابواسامہ ہے۔ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے غلام تھے۔ آپ نے کثیر صحابہ سے استفادہ کیا جیسے حضرت عبداللہ ابن عمر، ابوہریرہ، سیدہ عائشہ، جابر بن عبداللہ، مسلمہ بن رکوع، انس بن مالک، وغیرہ رضی اللہ عنہم یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں کہ زید بن اسلم اہل فقہ سے تھے اور قرآن کی تفسیر میں علامہ تھے۔ سیدنا حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ ان کی مجلس میں جاتے اور حصولِ علم کرتے تھے۔ نافع بن جبیر مطعم ان سے کہنے لگے آپ اپنی قوم کی مجلسیں چھوڑ کر عمر بن خطاب کے غلام کے پاس جاتے ہیں حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا آدمی اسی کی مجلس میں جاتا ہے جہاں اسے اسکے دین میں فائدہ ملے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ جنہوں نے لوگوں کو قرآن پڑھایا، سنت سکھائی اور علم دیا، چھ ہیں۔ جن میں سرفہرست علقمہ ہیں انکے بعد اسود (بن یزید) خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے میں نے جو کچھ سیکھا اور سکھایا ہے علقمہ نے بھی وہ سب کچھ سیکھا اور آگے سکھایا ہے علقمہ 26ھ میں کوفہ میں فوت ہوئے ان کی اولاد نہ ہوئی بوقت وفات انکی عمر 90 برس تھی آپ ایک رات میں سارا قرآن ختم کر لیتے تھے۔

دور تابعین میں مفسرین کوفہ

کوفہ میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے جانے اور اسے اسلامی مملکت کا دارالخلافہ بنانے سے وہاں کثیر صحابہ پہنچے۔ تاہم وہاں جس صحابی نے سب سے زیادہ علوم قرآن پھیلائے، وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ انہیں حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھیجا ہی اس مقصد کے لئے تھا۔ چنانچہ وہاں لوگوں نے زیادہ تر آپ ہی سے استفادہ کیا اور کثیر تابعین ایسے پیدا ہوئے جو حدیث وتفسیر میں یکتائے روزگار تھے اور آگے خلق کثیر نے ان سے علم حاصل کیا۔ یاد رہے کوفہ کے علاوہ بصرہ میں بھی جلیل القدر تابعین نے علم تفسیر میں شہرت پائی جیسے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ تاہم کوفی ان سے آگے ہیں اس لیے کوفہ کو تیسرا مرکز علم تصور کیا جاتا ہے اس زمرہ میں چند جلیل القدر افراد کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) حضرت علقمہ بن قیس رضی اللہ عنہ متوفی 73ھ

آپ کا نام علقمہ بن قیس ابو شبیل نخعی کوفی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات میں پیدا ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیدنا عمر فاروق، عثمان غنی، علی المرتضیٰ، سعد بن ابی وقاص، حذیفہ بن ابو دردا، ابوموسیٰ اشعری و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایات لیں آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یوں علم حاصل کیا کہ ان کے رنگ میں ڈھل گئے ابو المثنی کہتے ہیں اگر تم علقمہ کو دیکھ لو تو تمہیں جناب عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نہ دیکھنے کا کچھ افسوس نہیں ہوگا، کیونکہ وہ اپنے اخلاق اور علم میں انکی مثل ہیں۔ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں آپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ان تلامذہ میں سے ہیں جنہوں نے خلق کثیر کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سکھائی۔ انس بن سیرین حضرت مسروق کی بیوی سے روایت کرتے ہیں کہ آپ اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ قدموں میں ورم آجاتا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں علقمہ کے بعد مسروق کا مقام ہے مسروق نے جنگ قادسیہ میں شرکت کی جہاں ان کا بازو شل ہوگیا۔ (تہذیب)

(2) حضرت اسود بن یزید رضی اللہ عنہ کوفی متوفی 75ھ

آپ بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ نے خلفاء راشدین، سیدہ عائشہ، حضرت بلال اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی روایات لی ہیں۔ ابراہیم نخعی ان کے بھانجے تھے۔ ابن ابی خثیمہ کہتے ہیں انہوں نے ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے ساتھ حج کیا۔ حکم بن عیینہ کہتے ہیں اسود بن یزید کثرت سے روزہ رکھا کرتے تا آنکہ ضعف کے سبب بینائی کمزور ہوگئی، ابراہیم نخعی فرماتے ہیں آپ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تلامذہ میں سے صاحب فتوی تھے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۲۱۷)

(3) حضرت مسروق بن اجدع رضی اللہ عنہ کوفی متوفی 23ھ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر شاگردوں میں سے ہیں جبکہ خلفاء راشدین، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، مغیرہ بن شعبہ اور دیگر کثیر صحابہ سے روایات لیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نمازیں پڑھیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور مولا علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی صحبت اختیار کی۔ آپ سن 23ھ میں فوت ہوئے

(4) حضرت عامر بن شراحیل شعبی رضی اللہ عنہ متوفی 109ھ

آپ بھی اہل کوفہ سے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے نہیں ہیں تاہم ان سے بالواسطہ روایات لی ہیں اور حضرت علی، سعد بن ابی وقاص، سعید بن زید، ابوموسیٰ اشعری، ابو ہریرہ اور دیگر جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم

سے استفادہ کیا۔ بلا کا حافظہ رکھتے تھے، فرماتے تھے میں نے آج تک کچھ نہیں لکھا جو سنتا ہوں از بر ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے چھٹے سال میں پیدا ہوئے۔ ابن حبان فرماتے ہیں شعبی اعلیٰ فقیہ اور شاعر تھے (تہذیب)

(5) حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ متوفی 110ھ

آپ کا مقام حدیث، تفسیر، فقہ اور ولایت میں بلند تر ہے آپ کی والدہ خیرہ، ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی تھیں۔ آپ خلافتِ فاروقی کے آخری زمانہ میں پیدا ہوئے بے شمار صحابہ کی زیارت کی۔ بقول ابن حبان ایک سو بیس صحابہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے حسن سے پوچھا کرو کیونکہ ہم بھول گئے، اس نے یاد رکھا۔ عاصم احول کہتے ہیں شعبی نے مجھے کہا جب تم بصرہ جاؤ تو حسن کو میرا اسلام کہنا میں نے کہا میں انہیں نہیں جانتا۔ فرمانے لگے جب تم بصرہ میں داخل ہو تو جو شخص تمہیں سب سے خوب صورت نظر آئے اور جسے دیکھ کر تیرا سینہ رعب سے بھر جائے اسے میرا اسلام کہنا۔ چنانچہ عاصم بصرہ گئے، جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو دیکھا لوگ ان کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے ہیں تو ان کا دل رعب سے بھر گیا اور بڑھ کر سلام کیا۔ محدث ابوعوانہ کہتے ہیں میں جس بھی فقیہ کے پاس بیٹھا ہوں میں نے حسن کو اس سے افضل پایا۔ امام باقر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے حسن کا کلام انبیاء کے کلام سے مشابہ ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد اول صفحہ ۴۸۲)

(6) حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رضی اللہ عنہ متوفی 117ھ

آپ کی کنیت ابوخطاب ہے، بصرہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت انس بن مالک، ابوسعید خدری، عمران بن حصین اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایات لیں۔ آپ خصوصاً حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ امام محمد بن سیرین فرماتے تھے میں نے قتادہ جیسا حافظہ کسی کا نہیں دیکھا۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ جو سید التابعین کہلاتے ہیں کے پاس حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ آئے، کئی روز ان کے پاس رہے حضرت سعید ان سے مختلف سوال کرتے رہے اور وہ جواب دیتے رہے آخر حضرت سعید نے فرمایا: میں نہیں سمجھتا کہ اللہ نے تمہارے جیسا کوئی اور پیدا کیا۔
(تہذیب التہذیب جلد ۴ صفحہ ۵۴۵)

(7) حضرت اسماعیل سدی رضی اللہ عنہ متوفی 127ھ

آپ بھی مفسرین تابعین میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔ حضرت انس بن مالک، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر، ابوہریرہ، ابوسعید خدری اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت لی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحبت رہی تفسیر کے بیان میں حضرت سدی نے کثرت سے روایت و درایت کا سہارا لیا تا آنکہ ائمہ نے ان پر جرح بھی کی، تاہم اکثریت نے

انہیں ثقہ قرار دیا۔ حضرت یحیی بن سعید فرماتے ہیں میں نے جس بھی شخص کو سنا وہ سدی کے متعلق کلماتِ خیر ہی کہتا تھا۔ امام احمد بن حنبل اور ابن حبان جیسے ائمہ انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد اول صفحہ ۱۹۹)

آخری بات

یہ وہ تابعین ہیں جن کی تفسیری روایات سے کتب تفسیر بھری پڑی ہیں انکے نام کے بغیر تفسیر مکمل نہیں ہوسکتی، اس لیے میں نے اختصاراً ان کا ذکر خیر کردیا۔ تاکہ قاری تفسیر میں داخل ہو اور اسے ان ناموں سے واسطہ پڑے تو وہ جان سکے یہ کون لوگ ہیں اور کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

بحث پنجم

تفسیر قرآن عہدِ تبع تابعین میں

جو لوگ کسی صحابی سے نہ ملے، انہوں نے تابعین سے علم تفسیر اخذ کیا۔ ان کی تفسیری روایات کتب تفسیر میں عموماً ملتی ہیں اور تفسیر پڑھنے والے کو ان سے سابقہ پڑتا ہے، وہ چند اسماء گرامی یہ ہیں:

(1) حضرت ضحاک بن مزاحم ہلالی رضی اللہ عنہ

آپ خراسان سے تعلق رکھتے ہیں کثیر تابعین سے ملاقات کی اور ان سے علم تفسیر حاصل کیا۔ زیادہ علم حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے لیا، جن کا ذکر پیچھے گذر گیا ہے۔ آپ کو تفسیر میں بڑا مقام حاصل ہے تمام ائمہ انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں 106ھ میں وصال کیا۔ (تہذیب التہذیب)

(2) حضرت مقاتل بن سلیمان رضی اللہ عنہ

آپ بھی خراسانی ہیں۔ مجاہد، محمد بن سیرین، زید بن مسلم، عطا بن ابی رباح اور نافع بن مولی ابن عمر جیسے جلیل القدر تابعین سے علم حاصل کیا۔ تفسیر قرآن میں وہ درجہ پایا کہ صاحب تفسیر کہلائے۔ امام شافعی فرماتے ہیں تمام لوگ تفسیر میں مقاتل کے عیال ہیں (یعنی جیسے کسی کے اہل وعیال اسی کے سہارے چلتے ہیں لوگ اسی طرح تفسیر میں مقاتل کے محتاج ہیں) عباد بن کثیر فرماتے ہیں مقاتل کو بُرا مت کہو کیونکہ زمین پر اللہ کی کتاب کو مقاتل سے بڑھ کر سمجھنے والا کوئی نہیں رہا۔

(3) حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ

آپ اہل کوفہ سے ہیں کثیر تابعین سے ملے۔ آپ تقوی، زہد، عبادت اور علم میں یگانہ روزگار تھے۔ اولیاء کاملین اور علماء ربانیین میں سے تھے۔ یحییٰ بن معین، شعبہ اور سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں سفیان ثوری رضی اللہ عنہ حدیث میں امیر

المومنین ہیں 161ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔

(4) حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ

آپ بھی علم وورع میں حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ جیسے تھے۔ پیدائش کوفہ میں ہوئی زندگی مکہ مکرمہ میں گزاری۔ آپ کی ثقاہت، عدالت اور ورع میں کسی کو کلام نہیں 197ھ میں وصال ہوا مکہ مکرمہ میں سپرد خاک کیے گئے۔

(5) حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ

آپ بصری سے تھے۔ حضرت انس بن مالک، ابوالعالیہ، حسن بصری رضی اللہ عنہم ودیگر اہل علم سے روایات لیں کسی صحابی کی زیارت نہیں کی۔ امام نسائی اور ابن حبان اور دیگر ائمہ نے انہیں ثقہ کہا ہے 139ھ میں وصال ہوا۔

(6) حضرت محمد بن جعفر بن زبیر رضی اللہ عنہ

اہل مدینہ میں سے تھے۔ ابن سعد فرماتے ہیں آپ حدیث کے بڑے عالم تھے۔ امام بخاری فرماتے ہیں آپ فقہاء اہل مدینہ میں سے تھے دارقطنی انہیں ثقہ قرار دیتے ہیں۔ 120ھ میں وصال ہوا۔

بحث ششم

تابعین اور تبع تابعین کی تفسیر قرآن کی خصوصیات

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح تابعین، تبع تابعین کے ادوار میں بھی تفسیر کو کتابی شکل نہیں دی گئی تھی، اس کام کا آغاز تیسری صدی میں ہوا۔ جب تفسیر ایک مستقل علم اختیار کر گئی اور پورے قرآن کی آیت بہ آیت تفسیر لکھی جانے لگی۔ تابعین، تبع تابعین اور صحابہ کی تفسیر میں باہم کوئی نمایاں فرق نہیں، اگر ہے تو صرف یہ کہ بعض تابعین اور تبع تابعین ارسال کرتے تھے یعنی براہ راست کہہ دیتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا، یہ نہیں بتایا کرتے تھے کہ کس صحابی کے ذریعے ان تک بات پہنچی۔ اور کچھ تبع تابعین صحابہ سے ارسال کرتے تھے اور کہتے کہ فلاں صحابی نے اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا وہ اس تابعی کا ذکر نہ کرتے جس سے انہوں نے سنا۔ تاہم ثقہ تابعین کا ارسال مقبول ہے اور بعض کے نزدیک ثقہ تبع تابعین کا ارسال بھی مقبول ہے۔ تابعین و تبع تابعین کی تفسیر میں اسرائیلیات کی آمیزش ہوئی کیونکہ بہت سے اہل کتاب اسلام لائے اور مسلمانوں میں وہ اخبار پھیلائیں جو انکے ہاں معروف تھیں اور چونکہ تابعین وتبع تابعین میں قبول روایت کے لیے وہ سختی نہ تھی جو صحابہ میں پائی جاتی تھی اس لیے کئی تابعین نے اسرائیلی روایات بھی قبول کر لیں جو آگے چل کر کتب تفسیر میں بھی آگئیں، جن سے عوام المسلمین کے عقائد میں کمزوری آئی کیونکہ کئی اسرائیلی روایات اسلامی عقائد سے

متصادم ہیں۔

ضمنی بحث

اسرائیلی روایات کی کثرت والے راویان

(1) حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ

آپ پہلے یہود کے معتبر عالم تھے واقعہ ہجرت کے فوراً بعد اسلام میں داخل ہوئے آپ کی تعریف وعظمت میں قرآن کا ایک حصہ نازل ہوا آپ کی ثقاہت وعدالت بیان سے باہر ہے۔آپ جلیل القدر صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں مگر آپ کی طرف واضعین نے جھوٹی روایات منسوب کی ہیں جبکہ آپ کا دامن ان سے مبرا ہے۔

(2) حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ

آپ دورِ صدیقی میں یا دورِ فاروقی کے آغاز میں اسلام لائے، یمن سے تعلق رکھتے تھے۔ دور نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ظہور اسلام سے واقف تھے مگر بوجوہ اسلام نہ لائے۔ بعد میں ایک قرآنی آیت سننے سے دل میں ایسا خوف آیا کہ بھاگ کر اسلام میں داخل ہوئے مگر تب تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وصال ظاہری فرما چکے تھے،اس لیے شرف صحابیت نہ پا سکے۔ تاہم تابعین میں اونچا مقام رکھتے ہیں خلفاء راشدین ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ البتہ آپ نے اسرائیلی روایت بیان کی ہیں اور کچھ آپکی طرف منسوب کی دی گئی ہیں انہیں قرآن وحدیث کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا جو اس سے متصادم ہوں انہیں رد کیا جائے گا۔

(3) حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ

آپ صنعاء یمن سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد حضرت منبہ رضی اللہ عنہ دور رسالت میں اسلام لائے جبکہ وہب کی پیدائش 34ھ میں ہے اور وفات 110ھ ہے آپ نے کثیر صحابہ سے اکتساب کیا۔آپ جلیل القدر تابعی ہیں۔ امام بخاری بھی آپ کو ثقہ قرار دیتے اور آپ سے روایت لیتے ہیں، البتہ آپ نے بکثرت اسرائیلی روایات بیان کی ہیں اور اسرائیلی روایات بیان کرنا ہی بُری چیز نہیں برا یہ ہے کہ از خود باتیں گڑھ کر انہیں پھیلایا جائے اور ان پر اسرائیلیات کا لیبل چڑھا دیا جائے۔ کتب سابقہ کی سچی چیزوں کو نقل کرنا کچھ برا نہیں۔ تاہم فتنہ پردازوں کو موقع مل گیا اور انہوں نے جھوٹی روایات بھی حضرت وہب رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دیں۔ حضرت وہب رضی اللہ عنہ شب زندہ دار تھے بسا اوقات عشاء کے وضو سے نماز فجر پڑھتے۔

(4) حضرت ابن جریج رضی اللہ عنہ

آپ کا پورا نام عبدالمالک بن عبدالعزیز بن جریج ہے۔ آپ نسلاً رومی ہیں۔ مکہ میں پلے بڑھے 85ھ میں پیدا ئش ہوئی، کسی صحابی سے نہیں ملے تاہم عطا بن ابی ریاح، زید بن مسلم اور عکرمہ رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر تابعین کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ حضرت عطاء سے پوچھا گیا: آپ کے بعد ہم کس سے مسائل پوچھا کریں گے فرمایا اگر یہ نوجوان ابن جریج زندہ رہا تو یہ تمہارے لیے کافی ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں جس نے سب سے اول اہل حجاز سے تصنیف کی وہ ابن جریج ہے۔ یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں ابن جریج کی کتابیں امانت ہیں۔ امام احمد ہی نے آپ کو علم کا خزانہ قرار دیا ہے۔ ابن جریج نے اسرائیلی روایات کثرت سے بیان کی ہیں اسی لیے ان کو امام مالک نے حاطب لیل کہا (یعنی رات کو لکڑیاں جمع کرنے والا) جو اندھیرے میں اچھی لکڑیوں کے ساتھ خراب لکڑیاں بھی اٹھا لیتا ہے، مقصد یہ ہے کہ جو روایات وہ لائے ان میں سے بعض تو اہل اسلام کے لیے مفید ثابت ہوئیں اور بعض غیر مفید۔ اسرائیلیات میں یہ عیب کا پہلو بہر حال ہے ہمیں انہیں خوب جھاڑ پھونک لینا چاہیے بایں ہمہ ابن جریج کو ثقہ قرار دیا گیا ہے۔ امام ابوزرعہ انہیں آئمہ میں سے کہتے ہیں ابن خراش نے صدوق کہا عجلی نے ثقہ بتایا۔ ابو عاصم کہتے ہیں کہ وہ ہر مہینے میں صرف تین دن چھوڑ کر باقی سارا مہینہ روزہ رکھتے تھے۔ یعنی صائم الدھر تھے آج ابن جریج کا ذکر کتب تفسیر میں بار بار آتا ہے عموماً اسرائیلیات کے حوالے سے ابن جریر نے آپ سے بکثرت روایات نقل کی ہیں 150ھ میں ستر برس کی عمر میں وصال ہوا۔

بحث ہفتم

تفسیر قرآن کا دورِ تدوین جب کتب تفسیر لکھی گئیں

تیسری صدی ہجری سے ایسے لوگ آئے جنہوں نے آیت بہ آیت پورے قرآن کی تفسیر مرتب کی اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ و تابعین و تبع تابعین کی روشنی میں کتب تفسیر مدون کیں۔ پہلی دو صدیوں میں تفسیر ایک الگ علم نہ تھا تفسیری روایات حدیث کے ذخیرہ میں ملی ہوئی تھیں۔ محدثین ہی دوسرے لفظوں میں مفسرین تھے مگر جب یہ دور تدوین آیا تو علم تفسیر الگ علم کی صورت اختیار کر گیا اور اس علم کی مستقل کتب معرض وجود میں آ گئیں مگر یہ کتب تفسیر ماثور پر مشتمل تھیں، یہ عقلی تفاسیر نہ تھیں بلکہ ہر آیت کے تحت احادیث، اقوال صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کی آراء جمع کی گئی تھیں اس دور میں جن آئمہ تفسیر نے کام کیا ان میں سے بعض یہ ہیں۔

(1) عبد بن حمید سن وفات 249 ہجری

(2) ابو بکر بن منذر سن وفات 318 ہجری

(3) ابن جریر طبری سن وفات 310 ہجری

(4) ابن ابی حاتم سن وفات 327 ہجری

(5) آدم بن ابی ایاس سن وفات 220 ہجری

(6) ابو بکر ابن مردویہ سن وفات 410 ہجری

تفسیر کی تدوین کا تصور کب پیدا ہوا؟

کتب رجال کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر کی تدوین کا سلسلہ پہلی صدی ہجری ہی سے شروع ہو گیا تھا مگر وہ بعض آیات کی تفسیر پر منحصر تھا۔ چنانچہ حضرت مجاہد نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگردوں میں سے ہیں ایک تفسیری مجموعہ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے کہنے پر مرتب کیا تھا اور یہ پہلی صدی ہجری کے اواخر کی بات ہے۔ تاہم آیت بہ آیت سارے قرآن کی تفسیر کی تدوین تیسری صدی ہی سے متعارف ہوئی۔ اور جو اس کے اولین مدونین ہیں جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے منجملہ امام ابن ابی حاتم اور ابن جریر وغیرہ انہوں نے محدثین کی روش پر چلتے ہوئے ہر آیت کے تحت پوری سند کے ساتھ حدیث نقل کی یا صحابہ تابعین کے اقوال راویت کیے مگر آگے چل کر روش بدل گئی اور اسناد حذف کر دی گئیں۔

پھر خلافتِ عباسیہ کے استحکام کے بعد جب اعتقادی اور فقہی اختلافات نے باقاعدہ گروہ بندی کر دی تو پھر تفسیر ماثور کی جگہ عقلی تفسیر نے لے لی یعنی احادیث واقوال صحابہ پر کامل بھروسہ کرنے کی بجائے عقل واستدلال کی روشنی میں قرآن کے معانی اور اسرار ورموز پر مشتمل تفسیریں معرض وجود میں آنا شروع ہوئیں معتزلہ نے اپنے عقیدہ کے مطابق تفسیریں لکھیں جیسے زمخشری کی تفسیر کشاف ہے اور اہلسنت نے اپنے عقیدہ کے مطابق جیسے امام رازی کی تفسیر کبیر اور امام ابوحیان اندلسی کی المحیط۔

اس کے ساتھ جب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مکاتب فقہ اپنی اپنی جگہ متعارف ہو گئے اور امتِ مسلمہ کی اکثریت نے فقہی تشتت وانتشار سے اُکتا کر چوتھی صدی میں انہی چاروں مکاتب فقہ میں سے کسی ایک پر بھروسہ کر لینے میں عافیت سمجھی تو پھر احکام قرآنیہ کی تفسیر پر کتابیں معرض وجود میں آئیں حنفی فقہاء نے اپنے مسلک کے مطابق آیات احکام کی تفسیر کی اور مالکی وشافعی فقہا نے اپنے مسلک کے مطابق جسے امام ابوبکر جصاص حنفی متوفی 370ھ کی احکام القرآن ابو بکر ابن عربی مالکی متوفی 543ھ کی احکام القرآن اور امام قرطبی متوفی کی الجامع حکام القرآن پھر تفسیر میں ایک نیا عنصر

پیدا ہوا صوفیانہ تفسیر کا سلسلہ چل پڑا۔ چنانچہ رائس البیان لعلامۃ الشرازی متوفی 202ھ امام نجم الدین کی تفسیر التاویلات النجمیہ اور محی الدین ابن عربی کی تفسیر القرآن لکھی گئیں، پھر تو ہر اہل فن نے اپنے فن کے مطابق تفسیریں لکھنا شروع کیں۔ اہل بلاغت نے علم بلاغت کی روشنی میں قرآن سے فصاحت و بلاغت کے موتی لانے شروع کیے، اہل عربیت نے صرف ونحو کی روشنی میں تفسیریں لکھیں، مؤرخین نے قرآن کے قصص کو تفصیلات کے ساتھ بیان کیا۔ اور اب جدید سائنس کی روشنی میں قرآن کی تفسیریں آنے لگی ہیں جیسے علامہ طنطاری کی جواہر القرآن اور کائنات کے سائنسی حقائق قرآن سے پیش کیے جارہے ہیں یہ ایک اچھی کوشش ہے اسی طرح دورِ حاضر میں قرآنی حقائق کو اغیار کی زبان سے ثابت کرنے پر بھی تفسیریں آرہی ہیں جیسے علامہ عبدالماجد دریا آبادی کی تفسیر ماجدی اور ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن وغیرہ۔

فصل سوم

چند کتب تفسیر کا تعارف

بحث اول

تفسیر مأثور پر مشتمل تفاسیر

(1) تفسیر ابن ابی حاتم متوفی 327ھ

امام ابن حاتم کا پورا نام ابومحمد عبدالرحمان ابن ابی حاتم محمد بن ادریس رازی ہے۔ آپ اپنے زمانہ کے عابدین اور صاحب کرامت اولیاالله میں سے تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر جلیل القدر تصانیف چھوڑی ہیں جیسے کتاب العلل ،کتاب الجرح والتعدیل اور کتاب التفسیر۔ آپ اپنی تفسیر میں ہر آیت کے تحت مکمل سند کیساتھ احادیث نبویہ ﷺ اور اقوال صحابہ وتابعین نقل کرتے ہیں اپنی طرف سے آیت کے مفہوم پر کچھ بحث نہیں کرتے نہ ہی بیان کردہ روایات کی فنی حیثیت بتاتے ہیں یہ تفسیر حال ہی میں سعودی عرب سے اعلیٰ پیمانہ پر چھپ گئی ہے جو وہاں کے متعدد اشاعتی اداروں نے مل کر چھاپی ہے جن میں کچھ کا مکہ مکرمہ ومدینہ طیبہ سے تعلق ہے اور کچھ کا دمام وریاض سے الحمدالله یہ مخفی خزانہ امت کے ہاتھ میں ہے امام ابن ابی حاتم امام ابن جریر طبری کے ہم عصر ہیں 327ھ میں وصال ہوا۔

(2) تفسیر ابن جریر طبری

امام ابن جریر کا پورا نام محمد بن جریر بن کثیر بن غالب ابوجعفر طبری ہے 224ھ میں طبرستان میں پیدا ہوئے،

بہت سی کتابیں تصنیف کیں، تاہم آپ کی دو شہرہ آفاق کتب آپ کی لازوال شہرت کا سبب ہیں تاریخ الامم والملوک جسے تاریخ طبری کہا جاتا ہے اور جامع البیان فی تفسیر القرآن تاریخ اسلام پر آپ کی مذکورہ کتاب ام التواریخ کا درجہ رکھتی ہے اور تفسیر قرآن پر آپ کی کتاب ام التفاسیر کہلانے کی حقدار ہے۔ اسلامی تاریخ لکھنے والا تاریخ طبری کے بغیر نہیں چل سکتا اسی طرح تفسیر قرآن لکھنے والے کے لیے تفسیر طبری سے استفادہ ضروری ہے۔ مروی ہے کہ آپ نے چالیس برس تصنیف کی اور اوسطاً ہر روز چالیس اوراق لکھے (اللہ اکبر) آپ نے تحصیل علوم کے بعد بغداد میں ڈیرہ لگایا اور بقیہ زندگی یہیں گزاری، یہیں دفن ہوئے، خطیب بغدادی نے جو آپ کا ہم عصر تھا آپ کے متعلق اپنی کتاب تاریخ بغداد میں یوں تعریف کی ہے کہ ابن جریر نے بغداد کو وطن بنایا وہ اکابر آئمہ علماء میں سے تھے۔ انہوں نے وہ علوم جمع کیے جن میں ان کا کوئی ہم عصر شریک نہ تھا۔ وہ حافظ کتاب اللہ عالم قراء ات، عارف معانی، اعلیٰ فقیہ اور سنن نبویہ ﷺ کے شناور تھے۔ اسکے علاوہ زہد وتقوی میں بھی بے مثال تھے حنابلہ کو آپ سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ آپ کو رافضی قرار دیتے تھے۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں آپ کو رافضی قرار دینا آپ پر ظلم ہے، آپ علم وعمل میں امام الاسلام تھے۔ اصل میں محمد بن داؤد فقیہ ظاہری نے آپ کے خلاف زہر پھیلایا اور آپ کو رفض سے متہم کیا اور جب آپ فوت ہوئے تو حنابلہ نے آپ کو قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا تب آپ کو آپ کے گھر دفن کیا گیا آپ کا سن وفات 310ھ ہے۔
(البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۲)

امام ابن جریر طبری کا مسلک

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ امام ابن جریر ائمہ اہل سنت میں سے ہیں البتہ آپ میں بقول امام ذہبی کچھ تشیع تھا مگر ایسا جو ضرر رساں نہیں۔ (لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۱۰۰)

تفسیر ابن جریر کی قدر وقیمت

خطیب بغدادی فرماتے ہیں فقیہ سفرائنی نے کہا اگر کوئی شخص چین کا سفر کرے تا کہ ابن جریر کی تفسیر دیکھ سکے تو یہ کچھ بڑی بات نہ ہوگی۔ امام ابن حزیمہ نے کہا ابن جریر سے بڑا عالم روئے زمین پر نہیں ہے (البدایہ والنہایہ جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۶) امام سیوطی فرماتے ہیں معتبر علماء کا اس پر اجماع ہے کہ تفسیر ابن جریر جیسی کوئی کتاب تفسیر میں کسی سے نہیں لکھی جاسکی۔ امام نووی نے بھی اپنی تہذیب میں فرمایا ہے کہ تفسیر میں ابن جریر جیسی کتاب کوئی نہیں لکھ سکا۔
(اتقان فی علوم القرآن جلد دوم صفحہ ل ۱۹۱ مطبوعہ دار الفکر)

امام ابن جریر کا انداز اپنی تفسیر میں یہ ہے کہ ایک آیت نقل کر کے اسکا مفہوم اپنی زبان میں واضح کرتے ہیں اور اس میں اگر صرفی نحوی دشواری ہو تو اسے حل کرتے ہیں پھر اپنے بیان کردہ مفہوم کی تائید میں اپنی سند کے ساتھ احادیث

نبویہ ﷺ اور اقوال صحابہ وتابعین وارد کرتے ہیں۔ اگر اس آیت کے مفہوم میں ایک سے زائد اقوال ہوں تو پہلے وہ سارے اقوال اپنی اسناد کے ساتھ وارد کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان اقوال میں محاکمہ کر کے ایک قول کی ترجیح بیان کرتے ہیں۔ پھر احادیث وآثار کی روشنی میں وجہ ترجیح پیش کرتے ہیں۔ آپ نے کثرت سے روایات نقل کی ہیں تاہم ہر ایک کی پوری سند ذکر کی ہے۔ اب یہ علماء کا کام ہے کہ سند اور متن کی خرابیوں پر مطلع ہو کر غیر صحیح روایات کی تردید کریں۔ یہ تفسیر تیس جلدوں میں ضخیم تر تفسیر ہے۔

(3) تفسیر بغوی (معالم التنزیل)

یہ امام ابو محمد حسین بن مسعود الضرا البغوی کی تصنیف ہے۔ بغ خراسان کا ایک علاقہ ہے جو مرو اور ہرات کا مابین ہے آپ مسلکاً شافعی ہیں۔ محی السنہ آپ کا لقب ہے، آپ زہد وورع اور پاک بازی میں اپنی مثال آپ ہیں 510ھ میں وفات پائی۔ آپ کی کتاب شرح السنہ شرح حدیث پر سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے المصابیح کے نام سے مجموعہ حدیث تیار کیا جس کا خلاصہ مشکوٰۃ المصابیح کے نام سے برصغیر پاک وہند کے مدارسِ اسلامیہ میں معروف ومتداول ہے اور اسکی معرکۃ الاراء شروح بھی لکھی گئی ہیں جیسے ملا علی قاری کی مرقات شرح مشکوٰۃ، امام الائمہ علامہ طیبی کی شرح الطیبی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی اشعۃ اللمعات۔ الغرض امام بغوی علم وفضل میں نادرِ روزگار تھے۔ آپ کی تفسیر قرآن معالم التنزیل اصل میں بقول ابن تیمیہ امام ثعلبی نیشاپوری کی تفسیر الکشف والبیان عن تفسیر القرآن کا خلاصہ ہے۔ چونکہ امام بغوی کو حدیث سے والہانہ شغف ہے اور اصلاً وہ محدث ہیں اور تفسیر بھی انہوں نے حدیث کی روشنی میں لکھی ہے۔ اس لیے آپ آیات کے تحت اپنی سند کے ساتھ ٹھوس اور صحیح احادیث وارد کر کے آیات کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ اسرائیلیات اور سنداً ضعیف احادیث سے آپ نے اجتناب کیا ہے۔ بلاشبہ یہ حدیث کی روشنی میں قرآن کی معتبر مستند جامع اور مختصر تفسیر ہے۔ بعض احادیث وآثار کی وہ سند بیان نہیں کرتے بلکہ صرف صحابی کا نام ذکر کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں اس کا اصل یہ ہے کہ انہوں نے مقدمہ میں صحابہ وتابعین تک اپنی اسناد لکھ دی ہیں البتہ جہاں کہیں ایسے راوی کا ذکر آتا ہے جس کی سند مقدمہ میں نہیں لکھی گئی اسکی سند ذکر کر دیتے ہیں۔ صرفی نحوی ابحاث بہت کم لاتے ہیں، بعد میں آنے والے مفسرین تفسیر بغوی سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ یہ تفسیر پہلے نایاب تھی اب تفسیر ابن کثیر اور تفسیر خازن کے حاشیہ پر مصر سے چھپ گئی ہے چار جلدوں میں ہے۔

(4) تفسیر ابن کثیر

یہ امام عماد الدین الضرا اسماعیل بن عمر و بن کثیر بصری متوفی 774ھ کی تصنیف ہے۔ نام "تفسیر القرآن العظیم"

ہے۔ امام ابن کثیر حدیث، تفسیر اور تاریخ میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی تصنیف البدایہ والنہایہ تاریخ اسلام پر بہت مستند کتاب ہے، بلکہ محدثانہ انداز کی تاریخ ہے۔ جس طرح تاریخ میں تاریخ طبری کے بعد البدایہ کا مقام ہے۔ اسی طرح تفسیر میں تفسیر طبری کے بعد تفسیر ابن کثیر کو سمجھا جاتا ہے آپ شافعی المسلک تھے۔ آپ بصرہ کے قریب ایک بستی المجیدل میں 700ھ میں پیدا ہوئے۔ دمشق میں پلے بڑھے، وہیں علوم اسلامیہ حاصل کیے۔ اپنے زمانہ کے عظیم علماء سے استفادہ کیا۔ علامہ مزی کے ذیل سے متوسل رہے اور انکے داماد ہوئے، مگر اپنے اساتذہ میں ابن تیمیہ کیساتھ انہیں کچھ زیادہ ہی انس ہو گیا۔ ابن تیمیہ نے علم و فضل میں بلند مقام رکھنے کے باوجود کئی امور میں ٹھوکر کھائی۔ شرک و بدعت کے مفہوم کا صحیح تعین نہ کر سکے توسل اور زیارتِ قبر نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ میں غلط موقف اختیار کیا متشابہات کے بارہ میں بھی مسلک اہل سنت سے ہٹ گئے۔ امام ابن کثیر اگر چہ علامہ ابن تیمیہ کے افکار سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہیں مگر کہیں کہیں ان کا رنگ دکھاتے ہیں۔

جہاں تک ان کی تفسیر قرآن کا تعلق ہے تو یہ بلا شبہ بے مثال تفسیر ہے اور بہت سی خصوصیات کی حامل ہے۔ سب سے اہم یہ ہے کہ لگتا ہے علامہ ابن کثیر کی نظر میں سارا قرآن یکدم موجود تھا۔ ایک آیت کی تفسیر میں اس کے مفہوم سے ملتی جلتی کئی آیات لے آتے ہیں اور عموماً خود قرآن ہی سے قرآن کا مفہوم واضح کر دیتے ہیں۔ تفسیر قرآن بالقرآن میں ابن کثیر کی مثال نہیں پھر احادیث میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کرتے ہیں، کمزور روایات سے دور رہتے ہیں۔ مسند احمد بن حنبل پہ انکی زیادہ عنایت ہے علامہ سیوطی نے تذکرہ الحفاظ کے ذیل میں اور زرقانی نے مواہب لدنیہ کی شرح میں فرمایا ہے کہ تفسیر ابن کثیر جیسی اور تفسیر نہیں لکھی گئی چار جلدوں میں مختصر اور جامع تفسیر ہے۔

(5) الدر المنثور فی التفسیر المأثور للسیوطی

یہ علامہ جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمان بن ابوبکر سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ آپ 849ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ ولادت سے قبل باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، آٹھ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور قریباً تیس برس پڑھتے رہے۔ ہر علم میں یکتائے روزگار ہوئے۔ اسکے بعد تصانیف لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ آخری زندگی مصر میں گزاری۔ آپ انبیاء اولیاء سے استفادہ و توسل اولیاء کے روحانی تصرفات، محافلِ میلاد کے انعقاد اور والدین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نجات و ایمان کے متعلق وہی عقائد و نظریات رکھتے ہیں، جو دورِ حاضر میں اہل سنت و جماعت کے ہاں مقبول ہیں۔ حدیث میں آپ کی الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر یگانہ روزگار تصانیف ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں مجھے دو لاکھ حدیثیں زبانی یاد ہیں۔ آپ عبادت، تقوی اور زہد و ورع میں بھی بے مثال تھے۔ جامع صغیر کے مقدمہ میں آپ نے خود فرمایا ہے کہ

مجھے خواب میں کئی بار رسول اللہ ﷺ کی زیارت حاصل ہوئی (سبحان اللہ) آپ بلاشبہ نویں صدی کے مجدد ہیں۔آپ کی ذات سے ملتِ اسلامیہ کو بے پناہ فائدہ ہوا۔تفسیر درمنثور میں آپ نے ہرآیت کے تحت تمام ذخیرہ حدیث کھنگالا ہے اور بڑی جانفشانی سے احادیث جمع کی ہیں صحاح ستہ،ابن جریر،ابن ابی حاتم ابن منذر،طبرانی،بیہقی،مسند احمد،دلائل النبوۃ،دارمی،حبان،ابن ابی شیبہ ودیگر کثیر کتب حدیث وتفسیر سے احادیث واقوال صحابہ جمع کیے ہیں۔موجودہ درمنثور آٹھ جلدوں میں دارالفکر سے مطبوعہ ہے اور ہرآیت کے تحت روایات کے انبار لگادیے ہیں۔اسرائیلیات اور ضعیف احادیث بھی بکثرت لائے حتیٰ کہ موضوعات کی بھی بھرمار ہے۔آپ کا مقصد تفسیری روایات کا مجموعہ تیار کرنا تھا وہ آپ نے کردیا آگے علماء ان میں سے سلیم وسقیم کے مابین امتیاز کرسکتے ہیں۔

بحث دوم

عقلی استدلال والی چند تفاسیر

(1) التفسیر الکبیر للرازی

امام رازی ﷫ کا پورا نام محمد بن عمر بن حسین فخر الدین رازی ہے۔544ھ میں عراق کے شہر رے میں پیدا ہوئے۔علم کلام،لغت عرب،اصول فقہ اور حدیث وتفسیر میں نہایت گہرا مقام پایا،بے مثال خطیب تھے دورانِ خطاب آپ پر وجد طاری ہوجاتا اور گریہ کناں ہوجاتے۔اہل تشیع،معتزلہ اور دیگر گمراہ فرقوں کے رد میں علم کلام کی طاقت سے ایسا رد کرتے تھے کہ اپنے زمانہ میں انکا ناطقہ بند کردیا تھا،آخرفرقہ کرامیہ نے جوان کی وجہ سے سخت زچ تھا606ھ میں آپ کو زہر دلا کر شہید کردیا (شذرات الذہب جلد ۵ صفحہ ۲۱) آپ کی تفسیر کبیر عقل واستدلال کی روشنی میں لکھی جانے والی پہلی اور سب سے برتر تفسیر ہے اس پر اضافہ نہیں کیا جاسکا۔آپ یہ تفسیر مکمل نہ کرسکے غالب گمان یہ ہے کہ سورہ انبیاء تک آپ پہنچے،اگلا حصہ امام نجم الدین مصری مخزومی متوفی 737ھ نے مکمل کیا (الدرر الکامنہ جلد ا صفحہ ۴۰۴) مگر طرز تحریر ایسا یکساں ہے کہ قاری اندازہ نہیں کرسکتا کہ لکھنے والا بدل گیا ہے آپ نے ساری تفسیر میں معتزلہ کا شدید رد کیا ہے اور علامہ زمخشری،صاحب کشاف کا اتنا رد لکھا ہے کہ آپ کی تفسیر،تفسیر کشاف کا جواب نظر آتی ہے۔آپ نے اہل تشیع کی بھی خبر لی ہے اور علوم طبعیہ کے مسلمات کا رد بھی لکھا ہے۔آپ کے متعلق عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ آپ مخالفین کے اعتراضات تو بڑی طاقت سے لکھتے ہیں مگر جواب اتنی قوت سے نہیں دیتے۔میں اپنے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر عرض کرتا ہوں کہ واقعتاً بعض جگہ ایسا ہے کہ آپ نے ایک لمبا اعتراض نقل کیا پورا صفحہ اس میں گزر گیا مگر جواب چند لفظی جملوں میں دیکر گزر گئے شائد اس لیے

کہ اپنے بلند علمی مرتبہ کے مطابق انہیں وہ اعتراض سطحی محسوس ہوا اور اسکے جواب میں زیادہ وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا مگر یہ چند ہی مقامات پر ہے عموماً نہیں، عموماً یہ ہے کہ آپ کسی آیت کے مفہوم میں ایک شبہ وارد کرتے ہیں پڑھنے والا سوچتا ہے شائد ہی اس کا کوئی جواب ہو مگر امام رازی اسکے آٹھ آٹھ دس دس جوابات لکھتے ہیں اور ہر جواب ایک دوسرے سے بڑھ کر ایمان افروز ہوتا ہے، یوں لگتا ہے کہ آپ پر اللہ نے غیب سے حکمت کے دروازے کھول رکھے ہیں۔ شائد اسی لیے آپ کو رازی کہا گیا کہ آپ مخفی رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں البتہ یہ کمزوری مجھے کئی جگہ محسوس ہوئی ہے کہ اسباب نزول میں بعض ایسے اقوال رُوِیَ اور قِیۡلَ کہہ کر نقل کرتے ہیں جن کا تفسیر ماثور میں کہیں ذکر نہیں اور احادیث واقوال صحابہ بہت کم لاتے ہیں اور اگر لاتے ہیں تو انکا حوالہ کم ہی لکھتے ہیں۔ اصل میں آپکی توجہ علوم نقلیہ کی طرف کم اور فنون عقلیہ کی طرف زیادہ تھی آپ کو اپنی اس کمی پر دیر سے احساس ہوا کیونکہ عقلی جدال سے آدمی کا ذہن بسا اوقات مطمئن ہونے کی بجائے مزید الجھ جاتا ہے۔ آپ کی سیرت میں، میں نے پڑھا ہے کہ آخر عمر میں آپ مطالعہ حدیث کی طرف متوجہ ہو گئے "ومات الرازی والبخاری علی صدرہ" اور جب امام رازی فوت ہوئے تو بخاری شریف ان کے سینے پر پڑی ہوئی تھی۔ الغرض امام رازی علیہ الرحمہ کی تفسیر کبیر جس کا نام مفاتیح الغیب ہے، اپنی مثال آپ تفسیر ہے۔ میرے پاس جو تفسیر کبیر ہے وہ دارالحدیث ملتان سے مطبوعہ ہے گیارہ جلدوں میں ضخیم ہے عبارت باریک ہے۔

(2) انوار التنزیل للقاضی البیضاوی

امام بیضاوی کا پورا نام عبداللہ بن عمر بن محمد ابوالخیر ناصر الدین البیضاوی ہے۔ آذربیجان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیراز کے قاضی مقرر ہوئے، شافعی المشرب تھے۔ عبادت وزہد اور شب زندہ داری میں شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کی تفسیر حقیقت میں علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف کا خلاصہ ہے، البتہ آپ نے اسکی اعتزالی گفتگو نکال دی ہے بلکہ معتزلہ کا رد کیا ہے۔ تاہم علم بدیع ومعانی کی روشنی میں زمخشری نے جو قرآنی خوبیاں بیان کی ہیں انہیں لے لیا ہے۔ الغرض تفسیر بیضاوی علماء کے لیے علمی تحفہ ہے۔ قرآن کریم کے کلماتی حسن اور بیانی خوبیوں اور لسانی لطافتوں پر اطلاع پانے کے لیے اس تفسیر سے کنارہ کشی ممکن نہیں۔

(3) مدارک التنزیل للنسفی

آپ کا پورا نام عبداللہ بن محمود ابوالبرکات النسفی ہے۔ نسف علاقہ ماوراالنہر کا ایک شہر ہے۔ آپ مسلکاً حنفی تھے۔ آپ نے بھی اپنی تفسیر میں بیضاوی کے نقش قدم میں قرآن کی لسانی خوبیاں اور محسناتِ بدیعیہ بکثرت بیان کی ہیں، البتہ

آیات احکام کے تحت فقہ حنفی کی تائید پیش کرتے اور متعلقہ فقہی احکام اختصاراً ذکر کرتے ہیں۔علم قراءت سے شغف ہونے کے سبب قرأت سبعہ اوران کی وجوہ بتاتے ہیں،سن وفات 710ھ ہے۔

(4)لباب التأویل للخازن

آپ کا پورا نام علاء الدین علی بن محمد ابوالحسن الخازن ہے۔آپ بغداد میں پیدا ہوئے۔دمشق کی ایک بڑی لائبریری کے خازن تھے،اس لیے خازن کے نام سے معروف ہوئے۔مسلکاً شافعی تھے۔آپ کی تفسیر امام بغوی کی معالم التنزیل کا خلاصہ ہے بلکہ اکثر تو بغوی کی ساری عبارت لفظ بلفظ نقل کر دیتے ہیں۔میرے پاس تفسیر خازن دار الفکر بیروت کی مطبوعہ ہے،اس کے حاشیہ میں تفسیر بغوی ہے دونوں میں سے ایک کو پڑھ لیں تو دوسری کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔البتہ امام بغوی اسرائیلیات سے دور رہتے ہیں جبکہ خازن نے اسرائیلیات بھی ذکر کی ہیں اور شافعی مسلک کے مطابق آیاتِ احکام کے تحت فقہی احکام لکھے ہیں۔

(5)البحر المحیط لابی حیان الاندلسی

آپ کا پورا نام محمد بن یوسف بن علی ابوحیان الاندلسی الغرناطی ہے۔654ھ میں پیدا ہوئے۔علم قراءت، بدیع ومعانی،لغت اورنحو پر عبور رکھتے تھے، یہی چیز انکی تفسیر میں نمایاں ہے۔علاوہ ازیں آیات کے مختلف مفاہیم،اختلاف قراءت پیدا ہونیوالے معنوی اختلافات اور معتزلہ کے غلط استدلات کے جوابات میں علامہ ابوحیان نے کافی محنت کی ہے آپ کا مصر میں 745ھ میں وصال ہوا۔امام رازی کی طرح انہوں نے بھی زمخشری صاحب کشاف کا خوب رد کیا ہے۔

(6)روح المعانی لآلوسی

آپ کا پورا نام سید محمد محمود آفندی شہاب الدین آلوسی بغدادی ہے۔آپ بغداد میں 1217ھ میں پیدا ہوئے۔علوم نقلیہ وعقلیہ میں مہارت تامہ حاصل کی، پھر نقشبندی سلسلہ کے بزرگ شیخ خالد نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔تیرہ برس کی عمر میں تصنیف شروع کی۔1248ھ میں آپ کو قاضی احناف مقرر کیا گیا 1263ھ میں تفسیر قرآن شروع کی اور مکمل کر کے سلطان ترکی عبد المجید خاں کو دکھائی اس نے بڑی عزت افزائی کی۔ 1270ھ میں آپ کا وصال ہوا اور حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں شہر کرخ میں دفن کیے گئے۔آپ کی تفسیر تیس جلدوں میں ضخیم تر تفسیر ہے۔آپ کی تفسیر روایت ودرایت کا مجموعہ ہے جہاں احادیث لاتے ہیں، وہاں نحو وبلاغت کی روشنی میں عقلی استدلال سے بھی کام لیتے ہیں اور چونکہ بیعت وطریقت کے حامل ہیں اس لیے صوفیانہ رنگ بھی رکھتے ہیں۔معتزلہ اہل تشیع اور مشبہہ کا بھی رد

کرتے ہیں، احکام میں فقہہ حنفی کی پیروی کرتے ہیں مگر کبھی جامد تقلید سے ہٹ کر اپنی الگ رائے بھی پیش کرتے ہیں۔
عقلی استدلال کی روشنی میں لکھی جانے والی تفاسیر اہلسنت میں سے ارشاد العقل السلیم مصنفہ ابو مسعود عمادی متوفی 982ھ السراج المنیر مصنفہ خطیب شربینی بصری متوفی 977ھ تفسیر جلالین اور تفسیر نیشاپوری مصنفہ نظام الدین خراسانی نیشاپوری متوفی 767ھ اور روح البیان مصنفہ علامہ اسماعیل حقی رومی برسوی متوفی 1137ھ اور تفسیر مظہری مصنفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل تفاسیر ہیں روح البیان پر تصوف کا رنگ زیادہ غالب ہے اور تفسیر مظہری پر تفسیر ماثور کا گمان ہوتا ہے۔

بحث سوم

فقہی انداز میں لکھی جانے والی تفاسیر

پیچھے گزر چکا کہ چوتھی صدی میں جب امت مسلمہ نے چار فقہی مسالک پر اتفاق کیا تو ہر مسلک کے فقہا نے اپنے اپنے مسلک کی روشنی میں احکام قرآنیہ کی تفسیر کو لکھنا شروع کیا اور فقہی تفاسیر معرضِ وجود میں آئیں۔ چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) احکام قرآن للجصاص الحنفی

آپ کا پورا نام احمد بن علی ابو بکر الرازی الجصاص الحنفی ہے۔ آپ 305ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ اہواز، نیشاپور اور بغداد کے نامور اساتذہ سے علم پڑھا۔ 344ھ میں بغداد میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا، عہدہ قضا پیش کیا گیا مگر اصرار کے باوجود نہ لیا۔ آپ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ پر سختی سے قائم تھے۔ امام اعظم ابوالحسن کرخی کے شاگرد تھے۔ علم وفضل کے علاوہ زہد وتقویٰ میں بھی گہرا قدم رکھتے تھے، اپنے زمانہ میں فقہ حنفی کی سیادت آپ پر ختم تھی۔ آپ پر اعتزال کی تہمت رکھی گئی ہے مگر آپ کی تفسیر بتاتی ہے کہ آپ کا دامن اس سے پاک ہے۔ آپ عقائد اہل سنت پر سختی سے قائم تھے۔ آپ کی تصانیف میں سے سب سے اہم تفسیر احکام القرآن ہے جس میں زیادہ تر احکام والی آیات پر بحث کی گئی ہے دیگر آیات کو بہت کم لیا گیا ہے۔ امام ابن کثیر کی طرح آپ کو تفسیر قرآن بالقرآن پر بڑا عبور ہے اور آیات قرآن سے فقہ حنفی کے مطابق احکام فقہیہ کا یوں اثبات کرتے ہیں کہ منصف مزاج شخص کو مجالِ انکار نہیں رہتی۔ اپنے موقف کو قرآن ہی کی روشنی میں اس قدر محکم کر دیتے ہیں کہ احادیث سے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تاہم احادیث اور اقوالِ صحابہ بھی تائید میں لاتے ہیں۔

(2) احکام القرآن للکیا ہراسی الشافعی

آپ کا پورا نام عماد الدین ابوالحسن علی بن محمد بن علی طبری ہے۔ 450ھ میں خراسان میں پیدا ہوئے۔ نیشاپور اور بغداد میں پڑھتے پڑھاتے رہے۔ آپ نے بھی صرف آیات احکام کی فقہ شافعی کی روشنی میں تفسیر کی ہے اور امام ابوبکر جصاص کا رد کیا ہے۔ مگر یہ بات مسلم ہے کہ ان میں وہ علمی گہرائی نہیں جو امام جصاص میں ہے۔ 504ھ میں وصال ہوا۔ جہاں امام جصاص نے امام شافعی پہ گرفت کی ہے وہاں انہوں نے امام جصاص کو سخت کوسا ہے جاہل تک کہہ ڈالا ہے یہ تفسیر صرف ایک جلد میں ہے۔

(3) احکام القرآن لابن العربی المالکی

آپ کا نام محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ المعافری الاندلسی ہے۔ 468ھ میں اشبیلہ میں پیدا ہوئے۔ فقہ، اصول، حدیث، قراءات اور دیگر علوم اسلامیہ میں مہارت حاصل کی، متعدد کتب تصنیف کیں۔ جن میں سے مشہور العواصم من القوا صم اور احکام القرآن ہیں، آپ نے بھی صرف احکام والی آیات سے تعرض کیا ہے اور مالکی فقہ پر روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو حدیث پر بڑا عبور ہے اور بڑی برمحل احادیث لاتے ہیں اور غیر مختلف فیہ احکام کے ثبوت میں ان کا قلم بڑے گہرے نقاط لاتا ہے۔

(4) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی

اسم گرامی محمد بن احمد ابوعبداللہ الاندلسی القرطبی ہے اپنے دور کے عظیم اساتذہ سے اکتساب علم کیا اور اپنے دور کی نابغہ شخصیت بن گئے، آپ کے بحر علمی کا آپ کی تفسیر پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے احکام القرآن پر لکھی جانیوالی دیگر کتب کے برعکس پورے قرآن کی تفسیر لکھی ہے اور آیات احکام پر زیادہ زور دیا اور فقہ مالکی کا اثبات کیا آپ قراءت سبعہ، لغت اور علوم بیانیہ پر بڑی دسترس رکھتے ہیں، اس لیے اپنی تفسیر میں قرآن کی لغوی اور ادبی خوبیوں پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ذخیرہ حدیث پر بھی آپ کی گہری نظر ہے بعض آیات کی تفسیر میں وہ احادیث لاتے ہیں کہ جن کی طرف دیگر مفسرین کی نظر نہیں گئی یعنی آپ نے تفسیر ماثور کا بڑا حصہ نقل کیا ہے احناف کا کئی جگہ رد لکھتے ہیں مگر سلجھے انداز میں۔ 671ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

بحث چہارم

تصوف کی روشنی میں لکھی جانے والی تفاسیر

صوفیاء کرام کا ذوق ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر تصوف کے رنگ میں کرتے ہیں وہ آیات کے ایسے معانی بیان کرتے ہیں جنکی مفہوم آیت میں گنجائش ہوتی ہے اور وہ معانی ان مقاصد سے متصادم نہیں ہوتے جن کے لیے آیات اتاری گئیں مثلاً " ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ " تم نے (اے بنی اسرائیل!) اپنی جانوں پر ظلم کیا تم نے بچھڑے کو معبود بنایا۔ تو تم اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو اور خود کو قتل کرو۔ (بقرہ: ۵۴) صوفیاء فرماتے ہیں جس طرح بنی اسرائیل خدا کو چھوڑ کر بچھڑے کی محبت میں گرفتار ہو کر اسکے پجاری ہو گئے ہمارے نفس بھی اللہ کی عبادت سے منہ موڑ کر دنیا کی مال وجاہ کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ دنیا بچھڑے کی مانند ہے اور ہمارے نفس اس کے پجاری۔ اب ضروری ہے کہ توبہ کی جائے اور رضائے خداوندی کی تلوار سے نفس امارہ کو قتل کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ آیت کے مابہ المقصود مفہوم سے متصادم بھی نہیں اور اس میں ایک روحانی ذوق وسرور ہے جو اہل دل پر وجد طاری کرتا ہے اور انہیں رضاء الٰہی کی طرف راغب کرتا ہے۔ صوفیاء کرام کی اس تفسیر کو تفسیر اشاری یا تفسیر صوفیانہ کہتے ہیں اس رنگ میں لکھی جانیوالی چند کتب ملاحظہ ہوں۔

(1) تفسیر القرآن العظیم للتستری

امام سہل بن عبداللہ ابو محمد اللتستری صاحب کرامت بزرگ ہوئے ہیں۔ زہد وعبادت میں مصروف رہتے۔ ان کے پُر از حکمت اقوال صوفیاء کی کتب میں بکھرے پڑے ہوئے ہیں اور ان میں وہ ایمانی حلاوت ہے جو بیان سے باہر ہے آپ نے 606ھ میں وفات پائی۔ آپ کی تفسیر دو جلدوں میں چھپ گئی ہے۔

(2) التاءویلات النجمیہ لنجم الدین

آپ کا نام ابوبکر بن عبداللہ نجم الدین الاسدی ہے۔ دایہ کے لقب سے معروف تھے۔ پہلے خوارزم میں ہوتے تھے جب وہاں چنگیز خان نے ترکتازی شروع کی تو بلد روم کی طرف ہجرت کر گئے، پھر واپس آگئے اور بغداد میں جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ 604ھ میں وفات پائی آپ نے التاویلات النجمیہ کے نام سے تصوف کی چاشنی سے لبریز تفسیر لکھنا شروع کی، سورہ ذاریات پہ پہنچ کر داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ پھر علاء الدین سمنانی متوفی 659ھ نے اسے مکمل کیا یہ تفسیر نایاب ہے۔ البتہ علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر روح البیان میں اسکے اقتباسات بکثرت نقل کیے

ہیں بلکہ یوں کہیے اس کی روح روح البیان میں آگئی ہے۔

(3) تفسیر القرآن الکریم لابن عربی

اسم گرامی محمد بن علی بن محمد (المعروف ابن عربی) ہے لقب محی الدین ہے۔ آپ اندلس میں پیدا ہوئے، پھر ہوش سنبھالنے پر 568ھ میں اشبیلہ گئے اور اپنے دور کے بڑے بڑے شیوخ سے استفادہ کیا۔ 598ھ میں دیار مشرق کا رخ کیا مصر، موصل، عراق، مکہ مکرمہ اور دمشق وغیرہ میں رہے۔ آخر میں یہیں ڈیرہ لگایا اور یہیں 638ھ میں وفات پائی آپ کی طرف منسوب یہ تفسیر دو جلدوں میں ہے۔ میرے پاس یہ دو جلدیں مکتبہ انتشارات ناصر خسرو تہران کی مطبوعہ ہیں۔ سن طباعت 1368ھ ہے یہ پورے قرآن کریم کی نہیں۔ بعض آیات کی تفسیر ہے بعض جگہ عبارت اتنی ادق ہے کہ فہم سے بالاتر ہے دراصل ضروری ہے کہ پہلے اصطلاحات صوفیاء سے شناسائی ہو۔

الحمدللہ! تفسیر قرآن کا یہ مقدمہ اپنے اختتام کو پہنچا جو دو ہفتوں میں تکمیل پذیر ہوا علم تفسیر قرآن کی تاریخ پر اتنی مفصل گفتگو کسی تفسیر کے مقدمہ میں شائد ہی کہیں میسر آئے۔ ابھی میں چاہتا تھا کہ دورِ حاضر کی تفاسیر پر بھی روشنی ڈالی جائے مگر مزید طوالت سے بچنے کے لیے قدیم تفاسیر پر ہی اکتفا کیا جا رہا ہے اللہ جل مجدہٗ الکریم قبول فرمائے اور ذریعۂ نجات بنائے۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

استعاذہ کی اہمیت:

استعاذہ کا معنی ہے اللہ کی پناہ مانگنا، اور اللہ کی پناہ مانگنا وہ وظیفہ ہے جو انبیائے کرام ہمیشہ کرتے تھے، حضرت نوح علیہ السلام نے کہا: رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ''اے میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تجھ سے وہ مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔'' (سورہ ہود، آیت نمبر ۴۷) اور جیسے حضرت یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ یعنی ''میں اپنے نفس کو بری نہیں کہتا، کیونکہ نفس برائی کا حکم دینے والا ہے۔'' (سورہ یوسف، آیت نمبر ۵۳)

اور جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ ''اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔'' (سورہ ابراہیم، آیت نمبر ۳۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوں اللہ کی پناہ مانگی کہ کہا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ ''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔'' (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۶۷)

اور سیدہ مریم کی والدہ نے فرمایا: اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ ''میں اس بچی کو اور اس کی ذریت کو شیطان مردود کے مقابلہ میں تیری پناہ میں دیتی ہوں۔'' (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۳۶) جب انبیاء واولیاء ہر وقت اللہ کی پناہ مانگتے ہیں تو ہمیں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

حتیٰ کہ خود محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا گیا: وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾ ''اور آپ کہیں کہ اے میرے رب میں شیطان کے حملوں کے مقابلہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اور یہ کہ شیاطین میرے قریب آئیں۔'' (سورہ مؤمنون، آیت نمبر ۹۸)

استعاذہ کا فلسفہ:

استعاذہ کا معنیٰ ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا، یوں تو ہر وقت شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے، مگر قرآن کریم کی تلاوت سے قبل استعاذہ کا اللہ تعالیٰ نے خصوصی حکم فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

''جب تم قرآن کریم پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگو'' (سورہ نحل، آیت نمبر ۹۸)

تلاوت سے قبل استعاذہ کیوں کرنا چاہیے، اس کا پہلا فلسفہ یہ ہے کہ جب کوئی سائل کسی بادشاہ کے دروازہ پہ مانگنے جائے تو وہ پہلے دربارِ شاہی کے آداب بجالاتا ہے، اور کہتا ہے کہ میں آپ کے دشمنوں سے براءت اور آپ سے وفاداری کا اعلان کرتا ہوں، تب اسے دربارِ شاہی میں اذن باریابی ملتا ہے، یونہی قرآن کی تلاوت کرنے والا دربارِ خداوندی میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے آداب بجالانا چاہیے اور دشمنِ خدا شیطان سے براءت کا اظہار کرنا چاہیے۔

اس کا دوسرا فلسفہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا مقدس ومطہر کلام ہے اور ہماری زبانیں کذب وغیبت اور دیگر شیطانی باتوں وغیرہ سے آلودہ ہوتی رہتی ہیں، تو ہمیں تلاوت سے پہلے شیطان سے پناہ مانگنی چاہیے تاکہ ہماری زبانیں اس کی برکت سے پاک ہوجائیں، اس کا تیسرا فلسفہ یہ ہے کہ قرآن دل میں نور ایمان پیدا کرتا ہے اور یہ نور اسی دل میں آتا ہے جس میں عجز ہو، تو بندہ اعوذ باللہ کہہ کر اپنے دل کو کبر وغرور سے صاف کرتا ہے کیونکہ اعوذ باللہ دعا ہے اور دعا کا معنی ہی یہ ہے کہ بندہ اللہ کے سامنے گڑگڑائے، اس کا چوتھا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کا مقابلہ انتہائی سخت دشمن کے ساتھ ہے جو ہر وقت انسان کو دیکھ رہا ہے اور انسان اسے نہیں دیکھ سکتا۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط (سورہ اعراف، آیت نمبر ۲۷)

پھر انسان اکیلا ہے اور شیطان کے ساتھ شیاطین کا لشکر جرار ہے، کتنے سخت اور قوی دشمن سے مقابلہ ہے، ایسے میں انسان کو چاہیے کہ اپنے اس دوست کی پناہ لے جو اس کے دشمن سے کہیں زیادہ طاقتور ہے، یعنی اللہ رب العزت، کہ شیاطین اسے نہیں دیکھ سکتے اور وہ شیاطین کو دیکھ رہا ہے، اور جب بندہ اپنے رب کی پناہ میں آجاتا ہے تو شیطان کے سارے داؤ بیکار ہوجاتے ہیں، اسی لیے فرمایا گیا:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ (سورہ حجر، آیت نمبر ۴۲)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے شیطان میرے (خاص) بندوں پہ تیرا کوئی اختیار نہیں ہے۔''

استعاذہ کی تفسیر:

اعوذ باللہ سے استعاذہ کا آغاز کیا گیا، بعض اہل ظاہر اعوذ باللہ کی بجائے اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں فاستعذ باللہ فرمایا ہے، مگر یہ قرآن وسنت کے خلاف ہے، قرآن میں اللہ کی پناہ مانگنے کے لیے لفظ اعوذ ہی سکھایا گیا، جیسے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱ (سورہ الفلق، آیت نمبر ۱) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ (سورہ الناس، آیت نمبر ۱) وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝۹۷ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝۹۸ (سورہ مؤمنون، آیت نمبر ۹۷، ۹۸) قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۶۷ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۶۷) اور حدیث میں ہر جگہ اعوذ کا لفظ ہی آیا ہے، جیسے سلیمان بن صرد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو آدمی جھگڑ پڑے اور دونوں

کے چہرے سرخ ہو گئے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ایک کلمہ (وظیفہ) بتاتا ہوں کہ اگر یہ دونوں اسے کہہ لیں تو ان کا غصہ ختم ہو جائے، اور وہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ہے۔ (بخاری کتاب بدأ الخلق باب ۴۴، مسلم کتاب البر حدیث ۹)

مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ میں لفظ شیطان کا مادہ اشتقاق شَطَنَ ہے، جس کا معنیٰ دور ہونا ہے جیسے کہتے ہیں شطن الرجل عن الحق، ''وہ آدمی حق سے دور ہو گیا'' تو شیطان کا معنیٰ رحمت خداوندی سے دور ہو جانے والا، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ شیطان شاط یشیط سے نکلا ہے جس کا معنی جل جانا ہے جیسے کہتے ہیں شاط الزيت، چراغ میں تیل جل جل کر گاڑھا ہو گیا، اور شیطان بھی دوزخ میں ہمیشہ جلنے والا ہے، اس لیے شیطان کہلایا۔ اور الرجیم کا معنیٰ ہے جسے رجم کیا جائے، یعنی اسے پتھر مارے جائیں، شیطان پہ ہر وقت لعنت کے پتھر برستے ہیں، اس لیے اسے رجیم کہا گیا، اس کے علاوہ شیطان اور اس کے ساتھی آسمان کے قریب جا کر فرشتوں کی باتیں سننا چاہتے ہیں تو ان پر شہاب ثاقب مارے جاتے ہیں جیسے قرآن میں ہے رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (سورہ ملک، آیت نمبر ۵)

استعاذہ کے متعلق فقہی مسائل:

مسئلہ: جمہور فقہاء کے نزدیک تلاوتِ قرآن سے قبل استعاذہ سنت ہے واجب نہیں، البتہ امام رازی نے عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ سے اس کا وجوب نقل کیا ہے، اور خود امام رازی کا اپنا میلان بھی وجوب کی طرف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فاستعذ باللہ کہہ کر حکم فرمایا ہے اور حکم وجوب کے لیے ہے مگر جمہور کہتے ہیں کہ کئی بار حضور ﷺ نے قرآن مجید پڑھا اور استعاذہ نہ فرمایا، لہٰذا یہ واجب نہیں ہے۔

مسئلہ: نماز میں استعاذہ امام ابو یوسف کے نزدیک نماز کی سنت ہے اور باقی ائمہ کے نزدیک تلاوت کی سنت ہے، لہٰذا امام ابو یوسف کے نزدیک امام اور مقتدی دونوں کو استعاذہ کرنا چاہیے اور باقی ائمہ کے نزدیک صرف امام ہی کو استعاذہ کی ضرورت ہے مقتدی کو نہیں۔

مسئلہ: اکثر ائمۂ فقہ کے نزدیک نماز کی پہلی رکعت میں استعاذہ ساری نماز کی قراءت کے لیے کافی ہے لہٰذا باقی رکعات میں تلاوت سے قبل استعاذہ کی ضرورت نہیں، البتہ امام شافعی اور احمد کے بعض اقوال میں ہر رکعت کے آغاز میں قراءت قرآن سے قبل استعاذہ کرنا چاہیے، قاضی ثناء اللہ پانی پتی علیہ الرحمہ نے سورہ نحل آیت ۹۸ کے تحت کثیر احادیث وارد کی ہیں جن کا مفاد یہ ہے کہ پہلی رکعت کا استعاذہ ہی تمام رکعات کے لیے کافی ہے۔

مسئلہ: دورانِ تلاوت اگر پڑھنے والا کسی عارضہ کے سبب تلاوت کو منقطع کر دے اور وہ عارضہ تلاوت سے تعلق نہ رکھتا ہو (جیسے کھانا پینا باتیں کرنا وغیرہ) تو دوبارہ تلاوت شروع کرنے سے قبل پھر سے استعاذہ پڑھنا چاہیے اور اگر وہ عارضہ تلاوت ہی سے متعلق ہو جیسے استاذ سے کچھ پوچھنا یا اس کا کچھ بتانا یا قرآن کی تفسیر کرنا تو دوبارہ تلاوت کے لیے استعاذہ کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰه کے بعض فضائل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو عزت وحرمت والا کام بسم اللہ پڑھے بغیر شروع کیا جائے، وہ بے برکت ہے۔'' (درمنثور بروایت اربعین الحافظ الرہاوی جلد اول صفحہ ۲۶ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس جائے تو (ستر کھولنے سے قبل) یہ کہے:

بِسۡمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبۡنَا الشَّيۡطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيۡطَانَ مَا رَزَقۡتَنَا ''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں، اے اللہ ہمیں شیطان سے دور رکھ اور جو اولاد تو ہمیں عطا کرے اس سے شیطان کو دور رکھ۔'' اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد عطا فرمائی تو شیطان اسے کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ (بخاری کتاب بدأ الخلق باب ۱۱، مسلم کتاب الطلاق حدیث ٦)

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اہم معاملات بسم اللہ سے شروع کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی طوفان میں ڈالی تو کہا

بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۴۱ (سورہ ہود، آیت نمبر ۴۱)

حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس کو خط لکھا تو یوں شروع کیا:

وَاِنَّهٗ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝۳۰ (سورہ النمل، آیت نمبر ۳۰)

بسم اللہ کے طفیل حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کنارے لگ گئی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ملکہ بلقیس عاجزانہ حاضر ہوگئی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بسم اللہ میں انیس حروف ہیں اور جہنم کے داروغے جنہیں ''الزبانیہ'' کہا جاتا ہے، بھی انیس ہیں۔ قرآن میں ہے:

عَلَيۡهَا تِسۡعَةَ عَشَرَ ۝۳۰ (سورہ مدثر، آیت نمبر ۳۰)

''جہنم پر انیس پہرے دار مقرر ہیں۔''

تو جو شخص ان داروغہ ہائے جہنم کے عذابات سے بچنا چاہے اسے بسم اللہ کی کثرت کرنا چاہیے کہ بسم اللہ کا ہر حرف ایک عذاب کے مقابل ڈھال بن جائے گا۔ (تفسیر قرطبی)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں چند راز کی باتیں کہی ہیں۔

وہ فرماتے ہیں کہ فرعون نے دعویٰ الوہیت سے قبل اپنے باہر والے دروازہ پر بسم اللہ لکھوائی تھی۔ جب اس نے

دعویٰ الوہیت کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس دعوتِ توحید لے کر آئے تو عرصہ دراز تبلیغ کے باوجود جب وہ باز نہ آیا تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تم پوچھنا چاہتے ہو کہ اس پر عذاب کیوں نہیں آتا؟ تم اس کا کفر دیکھتے ہو اور میں اس کے دروازے پر لکھی ہوئی بسم اللہ دیکھتا ہوں۔ اسے ہلاک کرنے کیلئے یہاں سے نکالنا ہوگا۔ چنانچہ اسے شہر سے نکال کر سمندر میں ڈبویا گیا۔

اس میں نکتہ یہ ہے کہ جس نے اپنے بیرونی دروازے پر بسم اللہ لکھی ہو وہ دنیوی عذاب سے بچ جاتا ہے، خواہ وہ کافر ہو۔ تو جس نے اپنی لوحِ دل پر زندگی بھر صدق دل سے بسم اللہ لکھی اس کی عظمت کا کیا کہنا۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی پر سوار ہوتے ہوئے نصف بسم اللہ پڑھی! بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖىهَا وَمُرۡسٰىهَا ؕ (سورہ ہود، آیت نمبر ۴۱) تو ان کی کشتی غرق ہونے سے محفوظ ہوگئی۔ پھر جو شخص زندگی بھر پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا کرے کیا وہ عذاب سے محفوظ نہ ہوگا۔ اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے بسم اللہ کی برکت سے مُلکِ بلقیس کو حاصل کرلیا تو امید ہے کہ بسم اللہ پڑھنے والا مومن دنیوی و اُخروی نعمت ہائے خداوندی سے بہرہ ور ہوگا۔

آپ فرماتے ہیں: کسی بادشاہ کے غلام جب اس کے لئے کوئی گھوڑا یا اونٹ وغیرہ خریدیں تو اس کے اوپر کوئی شاہی علامت لگا دیتے ہیں، تاکہ کوئی چور ڈاکو اسے پکڑنے کی کوشش نہ کرے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے میرے بندے! جب تم میرے لیے کوئی عبادت کرو تو اس سے قبل بسم اللہ پڑھ کر اس پر میری نشانی لگا دو تاکہ شیطان اسے برباد کرنے کی کوشش نہ کرے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا اسم اللہ اسم جلالت وعظمت ہے جو عظمت وقدرت وقہر پر دلالت کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ لگا دیا۔ یہ دلالت کرتا ہے کہ اس کی رحمت اس کے قہر سے دوگنا زیادہ ہے۔ اگر اس کا قہر ہمارے گناہوں کے سبب ہمیں ہلاک کرنا چاہتا ہے تو اس کی رحمت ہماری بخشش کا دوبار تقاضا کرتی ہے اسی لیے حدیث قدسی ہے: رَحۡمَتِي سَبَقَتۡ عَلٰى غَضَبِي کہ ''میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی ہے۔''

بسم اللہ کے چند شرعی احکام:

ہر نیک وبامقصد کام سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا چاہیے۔ جیسے کھانا، پینا، لباس پہننا، گاڑی پر سوار ہونا، گھر میں داخل ہونا، خط یا کوئی اچھی تحریر لکھنا وغیرہ۔ کسی برے کام سے قبل بسم اللہ پڑھنا گناہ ہے۔ جیسے چوری، بدکاری وغیرہ بلکہ اندیشۂ کفر ہے۔ فقہ حنفی کے مطابق قرآنی سورتوں سے قبل لکھی ہوئی بسم اللہ قرآن کی جز نہیں، لہٰذا اسے نماز میں آہستہ پڑھنا چاہیے۔ اس پر کثیر احادیث شاہد ہیں اور چونکہ آج سارے عالم میں روایت امامِ حفص رضی اللہ عنہ کے مطابق قرآن پڑھا جاتا ہے اور ان کے نزدیک بسم اللہ ہر سورت کا جزء اور قرآن کی آیت ہے، اس لیے تراویح میں سارا قرآن سنانے والے شخص کو کسی ایک سورت سے قبل بسم اللہ بلند آواز سے پڑھ لینا چاہیے تاکہ امام حفص کے مسلک پر بھی

عمل ہو جائے۔ جانور کے ذبح پر بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے تو جانور حرام ہے اور اگر بھول کر رہ جائے تو حلال ہے۔

بسم اللہ کی تفسیر:

بِسْمِ اللّٰهِ اصل میں بِاِسْمِ اللّٰهِ ہے۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک کے ساتھ شروع کرتا ہوں اور اسم کا ہمزہ وصلی ہے۔ اسے حذف کر دیا گیا تو بِسْمِ اللّٰهِ ہو گیا۔ ایسے بھی ہو سکتا تھا اِسْمُ اللّٰهِ اَبْدَأُ بِهٖ معنی یہی ہے کہ میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ اگر ایسا کیا جاتا تو الف سے ابتداء ہوتی، مگر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ باء سے اس کے کلام کی ابتداء ہو۔ اسی لئے بِسْمِ اللّٰهِ سے اسم کے الف کو تلفظ اور کتابت دونوں سے نکال دیا گیا، حالانکہ عموماً ہمزۂ وصل کو صرف تلفظ سے نکالا جاتا ہے کتابت سے نہیں اور حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ الف کو مکمل مٹا کر باء سے کلام شروع کیا جائے، اس کی چند وجوہ ہیں:

اول: الف میں یک گونہ تَرَفُّعْ ہے کتابت اور آواز دونوں میں۔ جبکہ باء میں عِجْزْ اور پستی ہے اور اللہ تعالیٰ کو بندے میں یہی پسند ہے۔ باء ہمیشہ مکسور آتا ہے خواہ اسم ظاہر پر ہو یا اسم ضمیر پر جیسے بِزَيْدٍ اور بِهٖ اور کسرہ انکسار کی علامت ہے۔ شاید اسی لیے کسرہ کو اردو میں زیر کہتے ہیں کہ زیر کا معنی عاجز و پست ہے۔ اسی لیے حرف مکسور کی آواز پست اور باریک ہوتی ہے۔ جب باء میں اس قدر عجز و انکسار تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسے عظمت بخشی اور اپنے کلام کا نقطۂ آغاز اسے ٹھہرایا نہ کہ الف کو۔ اسی لیے حدیث قدسی ہے کہ اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ ''میں ان لوگوں کے پاس ہوتا ہوں جن کے دلوں میں انکسار ہے۔''

دوم: باء خود بھی ہمیشہ مکسور ہوتی ہے (اس کے نیچے زیر ہوتی ہے) اور جس لفظ پر داخل ہو اسے بھی مکسور کر دیتی ہے یعنی اس کے آخری حرف کو زیر دے دیتی ہے۔ گویا خود باء میں بھی انکسار ہے اور جو اس کی صحبت اختیار کرے وہ بھی اس کی صفات سے متصف ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں باء خود بھی کامل ہے اور دوسروں کو بھی کر دیتی ہے۔ شاید اسی لیے حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اَنَا النُّقْطَةُ تَحْتَ الْبَآءِ یعنی بِسْمِ اللّٰهِ ''میں باء کے نیچے والا نقطہ ہوں۔'' سبحان اللہ! یہ بات مدینۃ العلم کا عجز ہے کہ خود کو مکمل باء نہیں اس کا نقطہ کہہ رہے ہیں اور نقطے سے چھوٹی کوئی چیز نہیں اور نقطہ بھی وہ جو حرف کے اوپر نہیں اس کے نیچے ہے۔

سوم۔ پھر باء وہ حرف ہے جو عالم ازل میں انسانی ارواح کی زبان پر سب سے پہلے آیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ فرمایا تو سب ارواح نے بَلٰى ۚ کہا۔ (اعراف: ۱۷۲) چونکہ انسان کی زبان پر آنے والا پہلا حرف باء تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی سے اپنا کلام شروع فرمایا تا کہ انسان جب بھی بسم اللہ کہے تو اسے میثاق ازلی یاد آ جائے۔ اس جگہ عارفِ ربانی صاحب روح المعانی امام محمود آلوسی بغدادی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے بائے بسم اللہ کے تحت بہت لطیف و عارفانہ کلام فرمایا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

لفظ ''اللہ'':

یہ عظمت و بزرگی والا نام ساری کائنات کی اصل ہے اور یہی وہ اسم اعظم ہے جو تمام صفاتِ الٰہیہ اور اسماء حسنیٰ کا موصوف و متبوع ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ (سورہ حشر، آیت نمبر ۲۳)

اب ساری کائنات اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ کے ظہور کیلئے معرض وجود میں آئی۔ جب اسماءِ حسنیٰ اسم اللہ کیلئے بمنزل صفت ہیں تو اسم اللہ ہی اسم اعظم ٹھہرا۔

اسم اللہ ہمیشہ سے صرف ذات رب العالمین ہی کیلئے مخصوص رہا۔ کسی کافر و مشرک فرقہ نے اپنے کسی معبود باطل کو اس نام سے موسوم نہیں کیا۔ قرآن میں ہے:

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ۝ (سورہ مریم، آیت نمبر ۶۵)

امام شافعی، غزالی، خطابی و دیگر آئمہ رحمہم اللہ لفظ اللہ کو اسم جامد کہتے ہیں جو کسی دوسرے اسم سے مشتق نہیں، لہٰذا وہ اللہ کے الف لام کو عارضی و وصلی نہیں بلکہ نفس کلمہ کا جزء شمار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں یا اللہ کہا جاتا ہے مگر یا الرحمن نہیں کہا جاتا بلکہ ''یا رحمن'' کہا جاتا ہے۔ اگر لفظِ اللہ میں بھی الف لام برائے تعریف ہے تو یا اللہ میں دو حرف ہائے تعریف ہو گئے۔ ایک حرف نداء اور دوسرا لام تعریف، اور یہ جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ لفظِ اللہ کا لام برائے تعریف نہیں ہے، بلکہ نفس کلمہ کا حصہ ہے۔

مگر سیبویہ نے امام خلیل نحوی سے نقل کیا ہے کہ لفظِ اللہ اسم جامد نہیں بلکہ اس کا اصل اِلٰہٌ ہے، پھر ہمزہ حذف کر کے اس کی جگہ الف لام لایا گیا اور اللہ ہو گیا۔ اس کی مثال لفظ الناس ہے۔ جو اصل میں اُناسٌ ہے۔ ہمزہ گرا کے اس کی جگہ الف لام برائے تعریف لائے تو النّاس ہو گیا۔

جب لفظ اللہ کا اصل اِلٰہٌ ٹھہرا تو بعض نے کہا: یہ وَلَهَ يَلِهُ سے نکلا ہے جس کا معنی حیران ہونا ہے، چونکہ اللہ رب العزت کے ادراک سے متعلق بھی انسان کی عقل و فہم حیران و سرگرداں ہے اس لیے وہ اِلٰہ کہلایا۔

بعض نے کہا: اِلٰہٌ اصل میں ولاہٌ ہے، واؤ ہمزہ بن گئی جیسے وِشاحٌ کو اشاحٌ پڑھا جاتا ہے اور وَلَهَ يَلِهُ کا معنی مشتاق ہونا بھی ہے۔ جیسے وَلَهَ الصبیُّ الٰی اُمِّہٖ یعنی بچہ گھبرا کر ماں کی طرف مشتاقانہ گیا۔ اسی سے اردو میں لفظ والہانہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا بھی یہ نام اس لیے ہے کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ ہی کی طرف مشتاقانہ لپکتی اور اس سے فریاد کرتی ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظِ اللہ اَلَهَ، يَألَهُ، اِلٰهَةً سے نکلا ہے جس کا معنی پوجنا اور بندگی کرنا ہے چونکہ ساری کائنات خواہی نہ خواہی اللہ تعالیٰ ہی کو سجدہ کرتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ہی لفظ اللہ کا مصداق بن سکتا ہے۔

امام تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں لوگ لفظ اللہ کی حقیقت جاننے سے قاصر ہیں کوئی اسے جامد کہتا ہے تو کوئی مشتق، پھر

جو مشتق کہتے ہیں وہ اس کے مادہ اشتقاق ڈھونڈنے میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ جب انسان لفظ اللہ کی حقیقت نہیں پاسکتا تو ذاتِ باری تعالیٰ کی حقیقت کیسے پاسکتا ہے؟ (انسان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت پانے کیلئے دامنِ محبوب خدا ﷺ سے لپٹ جائے کہ اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ صرف آپ ہی ہیں۔)

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لفظ اَلرَّحْمٰنِ بھی لفظ اللہ کی طرح ذات باری تعالیٰ ہی کیلئے خاص ہے، نہ یہ کسی اور کیلئے استعمال ہوا نہ ہوسکتا ہے۔ جبکہ لفظ اَلرَّحِیْمِ غیر خدا کیلئے بھی استعمال ہوسکتا ہے، بلکہ قرآن میں متعدد مقامات پر لفظ رحیم غیر خدا کیلئے بولا گیا ہے، جیسے حضور ﷺ کے لئے فرمایا: بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۸) اور صحابہ کرام کیلئے کہا گیا: رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (سورہ فتح، آیت نمبر ۲۹) مگر رحمٰن صرف ذات باری تعالیٰ ہی سے خاص اور اسی کا نام ہے۔

اسی لیے کفار عرب نے جب اللہ کا نام ''الرحمن'' سنا تو انہیں یہ اجنبی لگا۔ قرآن میں ہے: قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا (سورہ فرقان، آیت نمبر ۶۰) کفار نے کہا: ''رحمٰن'' کیا ہے؟ کیا ہم ہر اس چیز کو سجدہ کردیں جس کا تو ہمیں حکم دے؟ یہاں ان مسلمانوں کی جہالت پر رونا آتا ہے جو اپنا نام مسٹر رحمٰن اور مسز رحمٰن لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنا خاندانی نام رحمٰن رکھ لیا ہے، کفار اپنے جھوٹے خداؤں کا نام رحمٰن نہ رکھ سکے۔ افسوس! جو کام ان سے نہ ہوسکا وہ مسلمانوں نے اپنی جہالت سے کر دیا۔

''الرحمٰن'' اور ''الرحیم'' میں یہ فرق بھی ہے کہ ''الرحمٰن'' کا معنی مطلقاً رحم فرمانے والا ہے، خواہ وہ رحم مؤمن کے لئے ہو یا کافر کے لئے، دنیا میں ہو یا آخرت میں مگر ''الرحیم'' کا تعلق صرف مؤمنین سے ہے اور چونکہ آخرت میں صرف مؤمنین پر رحم ہوگا۔ اس لئے ''الرحیم'' کا اصل مظہر روزِ آخرت ہی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ﴿۴۳﴾ (سورہ احزاب، آیت نمبر ۴۳) اللہ تعالیٰ مؤمنوں کے لئے رحیم ہے۔ اور اسی لیے قرآن میں اکثر غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ فرمایا گیا اور مغفرت چونکہ صرف مؤمنین کے لئے ہے لہٰذا غفور کی طرح ''رحیم'' بھی صرف مؤمنین کے لئے ہے۔

سورۃ الفاتحہ کا تعارف

یہ قرآن کریم کی سب سے افضل سورۃ ہے سارے قرآن کے علوم اس میں جمع ہیں۔اسی لئے اسے ام القرآن اور ام الکتاب کہا جاتا ہے۔ذیل میں اس کے چند فضائل احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں لکھے جاتے ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو آواز دی۔اُو اُبی! اور وہ نماز پڑھ رہے تھے انہوں نے جواب نہ دیا اور نماز مختصر کر دی اور جلدی فارغ ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہو گئے۔عرض کیا السلام علیك یا رسول الله! رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب میں نے تمہیں بلایا تو تم نے جواب کیوں نہ دیا؟ عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نماز میں تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا قرآن میں تم نے یہ نہیں پڑھا: اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ''اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو جب بھی (رسول) تمہیں اس کام کو بلائے جو تمہیں زندگی بخشتا ہے۔'' (سورہ انفال، آیت نمبر ۲۴) عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میں تمہیں وہ سورۃ بتاؤں جس جیسی سورۃ نہ توراۃ میں ہے نہ انجیل میں اور نہ زبور میں اور نہ قرآن میں اس کی مثل ہے۔عرض کیا ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم نماز میں قرأت کیسے کرتے ہو؟ انہوں نے ام القرآن (سورہ فاتحہ) پڑھ کر سنائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس رب کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن کسی میں اس جیسی سورۃ نہیں ہے۔یہی سبع مثانی ہے اور یہی قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔(مسند احمد، دارمی، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ وغیرھم)

اس حدیث کے آخری الفاظ میں اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ ہے۔''وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ ''اور بے تحقیق ہم نے آپ کو سات آیتیں بار بار دہرائی جانے والی اور قرآن عظیم عطا فرمایا ہے۔(سورہ حجر، آیت نمبر ۸۷) چونکہ سورۃ فاتحہ میں سات آیات ہیں اور یہ ہر نماز کی ہر رکعت میں بار بار دھرائی جاتی ہیں اس لیے اسے سبع مثانی کا نام بھی دیا گیا ہے۔اس حدیث سے صاحب قرآن سید الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت بھی ظاہر ہوئی کہ اگر آپ کسی صحابی کو آواز دیں اور وہ نماز میں ہو تو اسے اسی وقت بارگاہ رسالت میں حاضر ہو جانا چاہیے اس کی مزید تفصیل سورۃ انفال میں آئے گی انشاء اللہ العزیز۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیس افراد کی جماعت کی صورت میں ایک جنگی مہم پر روانہ فرمایا، ہم نے ایک عرب قوم کے پاس راستے میں پڑاؤ کیا، ہم نے ان سے بطورِ مہمان نوازی کھانے کو کچھ مانگا۔ انہوں نے انکار کیا تو ان کے سردار کو کسی چیز نے ڈس لیا۔وہ ہمارے پاس آئے کہنے لگے کیا تم میں کوئی بچھو کے کاٹے پر

دم کرسکتا ہے؟ میں نے کہا ''ہاں میں ہوں''، لیکن میں اس وقت تک ایسا نہیں کروں گا جب تک تم ہمیں کھانے کو کچھ نہ دو گے، وہ کہنے لگے: ہم تمہیں بتیس بکریاں دیتے ہیں۔ تب میں نے اس پر (بچھو کے کاٹے ہوئے حصۂ جسم پر) سات مرتبہ الحمد شریف پڑھی، تو وہ آدمی شفایاب ہوگیا۔ ہم نے وہ بکریاں لے لیں مگر ہمارے دل میں کھٹکا پیدا ہوا، ہم نے ہاتھ روک لیا۔ جب ہم نبی ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو سارا ماجرہ عرض کیا، آپ نے فرمایا: ''کیا تم نہیں جانتے یہ تو ایک دم ہے، یہ بکریاں تقسیم کرلو اور میرا بھی کچھ حصہ بناؤ''۔ (بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، وغیرہم) اس حدیث سے قرآنی دم اور تعویذ کا جواز بھی ثابت ہوا۔

عبدالملک بن عمیر سے مروی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''سورۃ فاتحہ ہر بیماری کیلئے شفاء ہے''۔
(دارمی، بیہقی فی شعب الایمان)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم بستر پر سونے لگو اور فاتحہ الکتاب (سورۃ فاتحہ) اور ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱'' پڑھ لو تو تم موت کے سوا ہر چیز سے بے خوف ہوگئے''۔ (مسند بزار)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل فرماتا ہے: ''میں نے نماز اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان تقسیم کردی ہے۔ نصف میرے لیے ہے اور نصف میرے بندے کیلئے، پھر نبی ﷺ نے فرمایا: جب بندہ کہتا ہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱'' تو اللہ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری حمد کی ہے''، جب بندہ کہتا ہے ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲'' تو اللہ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری تعریف کی ہے''، پھر بندہ کہتا ہے ''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳'' تو اللہ فرماتا ہے، ''میرے بندے نے میری عظمت بیان کی ہے''، پھر بندہ کہتا ہے ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝۴'' تو اللہ فرماتا ہے، یہ جملہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف ہے۔ پہلا حصہ (اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ) میرے لیے اور دوسرا حصہ (وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ) میرے بندے کیلئے اور میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو اس نے مانگا۔ پھر بندہ کہتا ہے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝۵ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝۷'' تو اللہ فرماتا ہے، ''یہ سارا میرے بندے کیلئے ہے اور میرے بندے کو وہ سب کچھ ملے گا جو اس نے مجھ سے مانگا''۔ (بخاری فی جزء القرآءۃ، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، وغیرہم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: فاتحہ الکتاب، آیت الکرسی، ''شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۱۸'' اور ''قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲۶'' یہ آیات عرش الٰہی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہیں ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ (ابوعمرو دانی فی کتاب الایمان، قرطبی)

قرآن وحدیث میں اس سورۃ مبارکہ کے متعدد نام آئے ہیں چند ایک درج ذیل ہیں:

سورۃ الصلوٰۃ

یعنی نماز والی سورۃ۔ کیونکہ یہ ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے اور حدیث مبارک ہے۔"لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب" سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔ (بخاری ومسلم وغیرھما) اور پیچھے حدیث قدسی گزری ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے۔ میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نماز تقسیم کر دی ہے۔ آگے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ کا کچھ حصہ میرے لیے ہے اور کچھ میرے بندے کیلئے، تو اس حدیث میں سورۃ فاتحہ کو نماز سے تعبیر کیا گیا۔

سورۃ الحمد

چونکہ عموماً سورت کا نام وہی رکھا جاتا ہے جو اس میں خاص مضمون بیان ہوا ہو۔ جیسے سورۃ البقرہ، کہ اس میں ایک مخصوص گائے کا ذکر ہے۔ سورۃ المائدہ اس میں ایک خاص دسترخوان کا ذکر ہے۔ وغیر ذلک اور سورۃ فاتحہ میں حمد باری تعالیٰ سے آغاز ہوا ہے اس لیے سورۃ الحمد کہلائی۔

فاتحۃ الکتاب

اکثر و بیشتر احادیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے اس کا نام فاتحۃ الکتاب ہی لیا ہے۔ فاتحہ کا معنی شروع کرنے والی، چونکہ اسی سے قرآن شروع ہوتا ہے۔ ترتیب میں یہی پہلی سورت ہے اور نماز میں اسی سے قرأت شروع ہوتی ہے اس لیے یہ فاتحۃ الکتاب کہلائی۔

ام الکتاب، ام القرآن

مختلف احادیث میں یہ دونوں نام آئے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝" ام القرآن اور ام الکتاب ہے اور یہی السبع المثانی ہے۔ (بخاری، دارمی، ابوداؤد، ترمذی وغیرھم) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے ام القرآن اور "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝" پڑھ لیا اس نے قرآن کا تیسرا حصہ پڑھ لیا (طبرانی اوسط) عربی میں چونکہ ام بمعنیٰ اصل بھی ہے جیسے قرآن میں مکہ مکرمہ کو ام القریٰ کہا گیا ہے۔ (سورہ الانعام) کیونکہ مکہ مکرمہ ہی پہلی زمین ہے اور قرآن کے سارے علوم سورۃ فاتحہ میں ہیں اس لیے یہ ام القرآن کہلائی۔ یعنی قرآن کی اصل۔

السبع المثانی:

یعنی ایسی سات آیات جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اس کا بیان پیچھے گزر چکا ہے۔ قرآن میں ہے۔ "وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝" (سورہ حجر، آیت نمبر ۸۷)

القرآن العظیم

پیچھے حدیث گزر چکی ہے کہ فرمایا: یہ سورۃ فاتحہ ہی وہ سبع مثانی ہے اور وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا۔ چونکہ اس نے تمام علوم قرآن کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اس لئے اکیلی کو قرآن عظیم قرار دیا گیا اس کا بیان آگے آئے گا انشاء اللہ العزیز۔

سورۃ الشفاء

پیچھے حدیث گزر چکی ہے کہ سورۃ فاتحہ ہر بیماری کی شفاء ہے۔

سورۃ الکافیۃ

یعنی کفایت کرنے والی سورۃ۔ نبی ﷺ نے فرمایا: سورۃ فاتحہ اپنے سوا ہر کسی سے کفایت کرتی ہے اور دوسری کوئی چیز (یا سورت) اس سے کفایت نہیں کرتی۔ (قرطبی عن محمد بن خلاد)

سورۃ فاتحہ کے فقہی مسائل

ان مسائل میں سے معرکۃ الآراء مسئلہ فاتحہ خلف امام ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت سورۃ فاتحہ یا اس کے بعد والی قرأت نہیں کرنی چاہیے اور امام احمد و شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک کرنی چاہیے۔ جب کہ امام مالک کے نزدیک جہری نماز میں نہیں کرنی چاہیے اور سری میں کرنی چاہیے۔ امام اعظم ابوحنیفہ کی دلیل یہ آیت مبارکہ ہے۔ ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝'' اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (سورہ اعراف، آیت نمبر ۲۰۴) اور حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت خصوصاً مقتدی ہی کو امام کے پیچھے قرأت سے منع کرنے کے لئے نازل کی گئی چنانچہ تفسیر خازن میں ہے: ''عن عبداللہ بن مسعود انه سمع ناسا یقرء ون مع الامام فلما النصرف قال اما آن لکم ان تفقهوا واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا کما امر کم اللہ'' عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ آپ نے کچھ لوگوں کو امام کے ساتھ قرأت کرتے دیکھا تو فرمایا: کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم اس حکم خداوندی کو سمجھ سکو کہ فرمایا اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور چپ رہو۔

(تفسیر خازن جلد دوم صفحہ ۱۶۵)

یاد رہے ابتداء میں نماز میں گفتگو بھی جائز تھی جب ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ۝'' (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۳۸) نازل ہوا تو گفتگو ممنوع ہوگئی مگر مقتدی امام کے ساتھ قرأت کرتے تھے پھر جب یہ آیت مذکورہ اتری تو اسے تحت ہے ''و جمهور الصحابة رضی اللہ عنهم علی انه فی استماع المؤتم '' اور جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ آیت مقتدی کے خاموش رہ کر قرآن سننے کے لیے نازل ہوئی۔ (مدارک جلد دوم صفحہ ۱۶۵) تفسیر ابن عباس میں ہے: ''واذا قری القرآن فی الصلوة المکتوبة فاسمعوا الی قرأته'' اور جب فرض نماز میں قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو۔ الحمدللہ! حق خوب واضح ہوگیا۔

حضرت جابر سے یہ حدیث نبویہ مروی ہے۔ ''من صلی رکعة لم یقرأ فیها بام القرآن فلم یصل الا

ان یکونوراء الامام ''جس نے کوئی رکعت ادا کی اور اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے گویا وہ رکعت ادا ہی نہیں کی۔مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔(ترمذی شریف) یعنی اگر وہ امام کے پیچھے ہو تو اسے سورۃ فاتحہ پڑھنے کی ضرورت نہیں اسے خاموش رہنا چاہیے۔

عطاء بن یسار نے حضرت زید بن ثابت (حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بھائی) سے پوچھا: کیا امام کے ساتھ قرآن پڑھا جاسکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا:''لا قراءۃ مع الامام فی شیئ ''امام کے ساتھ کسی چیز کی کوئی قرأت جائز نہیں۔(مسلم شریف جلد اول صفحہ ۲۱۵ باب سجود التلاوۃ) اس جگہ ''لا قراءۃ اور ''فی شیئ '' کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس میں فاتحہ یا کسی دوسری سورۃ کی کوئی تخصیص نہیں۔یہ حکم ہر طرح کی قرأت کیلئے ہے۔

مسئلہ:

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنا واجب ہے فرض نہیں۔دیگر تین آئمہ کے نزدیک فرض ہے اگر سہواً رہ جائے تو نماز نہیں ہوگی۔امام صاحب کے نزدیک سجدۂ سہو سے تکمیل ممکن ہے۔

مسئلہ:

نماز جنازہ میں دعا کی نیت سے سورۃ فاتحہ پڑھی جاسکتی ہے تلاوت کی نیت سے نہیں۔

سورۃ فاتحہ کا شانِ نزول

اس بارہ میں مختلف روایات ہیں۔بعض کے مطابق یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور بعض کے مطابق مدینہ منورہ میں۔ایک غریب روایت ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور امام بیہقی و ابونعیم نے اپنی اپنی دلائل النبوۃ میں ذکر کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: جب میں تنہا ہوتا ہوں، تو ایک آواز سنتا ہوں، واللہ میں ڈرتا ہوں کہ یہ کوئی معاملہ نہ ہو، چنانچہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ورقہ (بن نوفل) کے پاس بھیجا۔آپ نے اسے بتایا کہ میں تنہائی میں سنتا ہوں کوئی مجھے پکارتا ہے یا محمد! یا محمد! تو میں بھاگ جاتا ہوں۔ورقہ نے کہا: آئندہ یہ آواز آئے تو آپ ٹھہرے رہیں اور سنیں وہ آپ کو کیا کہتا ہے۔چنانچہ پھر تنہائی میں آپ کو یہ آواز آئی یا محمد کہو ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ '' آگے اس نے ''وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ '' تک پڑھا۔پھر کہا یہ کہو'' لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ '' آپ نے ورقہ کو آکر یہ بتایا تو اس نے کہا: آپ کو بشارت ہو، پھر بشارت ہو، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ہی وہ رسول ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہم السلام نے دی اور آپ کے پاس بھی ناموس موسیٰ علیہ السلام کی مثل چیز ہے اور آپ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔

(درمنثور جلد اول سورۃ فاتحہ کے تحت صفحہ ۱۰)

اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی وحی یہی سورۃ فاتحہ ہے۔اور اسی سے نزول قرآن کا آغاز ہوا

مگر امام ابن کثیر فرماتے ہیں۔اس کی سند میں ارسال ہے اوراس میں غرابت ہے(البدایہ والنہایہ جلد سوم صفحہ ۱۰ مطبوعہ دارالدیان قاہرہ مصر) یعنی یہ بخاری شریف کی بدء وحی والی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے معارضہ نہیں کرسکتی کیونکہ وہ حدیث مرفوع وصحیح ہے اوراس کے مطابق پہلی وحی قرآنی ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ '' ہے۔اسی طرح مصر کے ایک معاصر مفسر ابن خلیفہ علیوی فاضل جامعہ ازہر کا بھی کہنا ہے کہ اس روایت کی سند سے صحابی کا نام ساقط ہے۔اس لیے حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کا معارضہ نہیں کرسکتی اوراگر اسے صحیح مان لیا جائے تو یہ پہلی قرآنی وحی کے بعد اترنے والی دوسری قرآنی وحی ہے۔(جامع النقول فی اسباب النزول جلد اول صفحہ ۲۷ مطبوعہ ریاض)

بہر حال خود قرآن کریم سے ثابت ہے کہ سورۃ فاتحہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے چنانچہ قرآن میں ہے ''وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ '' اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔(سورہ حجر، آیت نمبر ۸۷) اور حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ''یہی ام القرآن ہے یہی ام الکتاب ہے اور یہی السبع المثانی ہے۔اس حدیث کو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بخاری، دارمی، ابوداؤد، ترمذی وغیرھم نے روایت کیا ہے۔(درمنثور جلد اول صفحہ ۱۳) اب سورۂ حجر مکی سورت ہے۔جس کا یہ مضمون ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سورۃ فاتحہ دی گئی ہے، تو سورۃ فاتحہ کا مکہ میں نازل شدہ ہونا ظاہر ہوگیا، پھر نماز پنجگانہ مکہ مکرمہ میں فرض ہوئی شب معراج نماز فرض کی گئی اوراس امر کی کوئی دلیل نہیں کہ پہلے نماز سورۃ فاتحہ کے بغیر پڑھی جاتی تھی۔یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ فرضیت نماز سے قبل سورۃ فاتحہ نازل ہوچکی تھی۔

لیکن ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور طبرانی نے اوسط میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب سورۃ فاتحہ اتری تو شیطان بہت رویا اور یہ مدینہ میں نازل ہوئی۔اسی طرح وکیع اور فریابی نے اپنی اپنی تفسیر میں۔ابوعبیدہ نے فضائل القرآن میں، ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابن منذر نے اپنی تفسیر میں، ابوبکر بن انباری نے کتاب المصاحف میں اور ابونعیم نے الحلیہ میں متعدد طرق کے ساتھ مجاہد سے روایت کیا ہے کہ سورۃ فاتحہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔(درمنثور جلد اول صفحہ ۱۱) اس لیے ممکن ہے کہ مدینہ طیبہ میں اسے دوبارہ نازل کیا گیا ہو۔بعض دیگر آیات کا بھی متعدد بار نازل ہونا ثابت ہے۔

رکوعاتھا ۱ سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۵ ۱ اٰیاتھا ۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔ [1]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾

ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کے لائق ہے[1] جو سب جہانوں کا پروردگار ہے۔[2] بڑا مہربان نہایت رحم والا[3]

[1] اس جملہ میں اللہ تعالیٰ ہی کو ہر طرح کی تعریف کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ہم تو ہر اس چیز کی تعریف کرتے ہیں جس میں کوئی خوبی ہو۔ پھر صرف اللہ کو حصرِ تعریف کا سزاوار کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ کسی بھی چیز میں جو خوبی وکمال ہے وہ اس کا ذاتی کمال نہیں، عطائی ہے، اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ پھولوں کو حسن، دریاؤں کو روانی، پہاڑوں کو بلندی، ستاروں کو نور، شمس وقمر کو روشنی، انبیاء کو نبوت ورسالت، صدیقین کو صدیقیت، شہداء کو شہادت اور صالحین کو ولایت وقطبیت، علماء کو علم، حکماء کو حکمت، اہل فنون کو علم وفن اور اہل سخا کو سخاوت اللہ تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی۔

لہٰذا جس اچھی چیز کی بھی تعریف کی جائے وہ حقیقت میں اس رب کی تعریف ہے جس نے اس چیز میں وہ خوبی پیدا فرمائی۔ اسی لیے اس کے ساتھ رب العالمین کہہ کر دلیل دی گئی کہ اللہ تعالیٰ اس لئے ہر حمد کا سزاوار ہے کہ وہی ہر ذرے کا پالنے والا ہے۔

حضور ﷺ کی نعت بھی حقیقت میں حمدِ خدا ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ کارخانۂ قدرت میں کارسازِ حقیقی نے اپنے پیارے محبوب، حضور پرنور، شافع یوم النشور ﷺ سے بڑھ کر کسی کو صاحبِ کمال نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر ہر خوبی وکمال کی انتہا فرمادی۔ کوئی خوبی خواہ صورت کی ہو یا سیرت کی، جسمانی ہو یا روحانی، دینی ہو یا دنیوی، وہبی ہو یا کسبی، اخلاقی ہو یا علمی اللہ تعالیٰ نے اسے پورے کمال کے ساتھ اپنے محبوب ﷺ میں جمع فرمادیا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کا سب سے بڑا شاہکار ہیں۔

اس لیے جملہ مسلمانانِ عالم بڑھ چڑھ کر آپ کی خوبیاں، عظمتیں، کمالات، معجزات اور اخلاق کریمانہ بیان کرتے ہیں۔ آپ کی شان میں کروڑوں نعتیں لکھی جاچکی ہیں اور لکھی جارہی ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ان کی تعریف کرکے لوگ دراصل اس رب کی حمد کرتے ہیں جس نے آپ کو سب خوبیوں کا جامع بنایا۔ یعنی آپ کی شان میں لکھی جانے والی

کروڑوں نعتیں بالواسطہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہی میں داخل ہیں۔

بعض لوگ ہم اہل سنت پہ چیں بہ جبیں ہوتے ہیں کہ تم لوگ ہر وقت نعتیں ہی کیوں پڑھتے رہتے ہو؟ ہم عرض کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے کارخانہ قدرت میں اپنے حبیبِ کریم ﷺ سے بڑھ کر کوئی صاحب کمال پیدا ہی نہیں فرمایا تو آپ کی جس قدر نعتیں پڑھی جائیں گی وہ حقیقت میں اللہ ہی کی حمد ہے،

اور یہ مسلم اصول ہے کہ کسی معمار کو خوش کرنا ہو تو اس کی بنائی ہوئی تعمیر کی تعریف کرو، شاعر کو خوش کرنا ہو تو اس کے اشعار کی خوبی بیان کرو، مصنف کو خوش کرنا ہو تو اس کی تصنیف کو سراہو اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو تو اس کے محبوب ﷺ کی خوبیاں بیان کرو، اور ان کی نعتیں پڑھو، کہ وہ بالواسطہ حمدِ خدا ہی ہے، اسی لیے امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا
ہمیں بھیک مانگنے کو تیرا آستاں بتایا تجھے حمد ہے خدایا

یہاں سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہمیں جس بھی انسان سے کوئی نعمت ملے تو اس کا شکریہ ادا کرنے سے قبل اس اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا چاہیے جس نے اسے ہمیں وہ نعمت دینے کی توفیق بخشی۔ وَمَا بِکُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (سورہ نحل، آیت نمبر ۵۴)

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر نعمت پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا چاہیے کہ ہر نعمت اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے پر کوئی نعمت کرے اور وہ اس پر الحمد للہ کہے تو یہ حمد اس نعمت سے بڑھ جاتی ہے۔ خواہ نعمت کتنی بڑی ہو اور ایک روایت میں ہے کہ جب بندہ دنیا میں نعمت ملنے پر الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے آخرت میں اس سے بڑی نعمت تیار فرما دیتا ہے۔

[2] رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں رب کا معنی مالک بھی ہے جیسے رَبُّ الْمَال کہتے ہیں اور پالنے والا بھی۔ اگر مالک معنی کیا جائے تو بلاشبہ درست ہے، کیونکہ ہر چیز پہ حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، اس کے سوا سب کی ملکیت عارضی اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اور اگر پالنے والا معنی کیا جائے تو بھی درست، کہ اللہ ہی وہ پالنہار ہے جو پانی کے بے جان قطرے کو خون کا لوتھڑا، پھر لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بناتا، پھر ٹکڑے میں ہڈیاں پیدا کرتا اور اسے گوشت پوست کا لباس پہنا کر اس پر ہزاروں تصویریں اور شکلیں بناتا ہے۔ وہ ایسا پالنہار ہے کہ بچے کی پیدائش سے قبل ہی اس کی ماں کے سینے میں دودھ کی دو نہریں چلا دیتا ہے، پھر بچے کو ہونٹ دبا کر ماں کی چھاتی سے دودھ چوسنا سکھاتا ہے۔

پھر وہ رب العالمین بھوک لگنے پر بچے کو رونا سکھاتا ہے، وہ ماں باپ کے سینے میں بچے کیلئے بے پناہ محبت پیدا کر دیتا ہے، بچہ خواہ شکل وصورت میں کیسا ہی ہو یہ محبت انہیں اس کی پرورش پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر وہ رب العالمین ماں کے سینے میں اولاد سے محبت کا سمندر موجزن نہ کرتا تو وہ اپنے نرم ونازک ہاتھوں سے بچے کا بدبودار پاخانہ وپیشاب کبھی صاف نہ کرتی۔ اسے سردی گرمی سے بچانے کیلئے ہر وقت بیقرار نہ رہتی۔ یہ سب اسی پالنہارِ کائنات کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ پھر بچے جب بڑے ہو کر ماں باپ کی نافرمانی کریں اور باز نہ آئیں تو وہ ایک دن انہیں گھر سے نکال دیتے ہیں مگر

قربان جائیں اس پالنہار پر کہ ہم اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کا رزق کھا کر، اس کا دیا ہوا لباس پہن کر، اس کی دی ہوئی طاقت وصحت کے ساتھ اس کی نافرمانی کرتے ہیں اور وہ ہمیں برابر رزق دیئے جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے منکروں کو جو اسے گالیاں دیتے ہیں بھی رزق دیتا ہے۔ کیونکہ رب العالمین جو ٹھہرا۔

[3] جب کہا گیا رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہ اللہ سب جہانوں کا پالنہار ہے، تو عقل نے سوال کیا کہ دنیا میں کروڑوں لوگ اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے والے بھی ہیں، پھر وہ اپنے منکروں اور گالیاں بکنے والوں کو کیسے رزق بہم پہنچاتا ہے؟ تو اس کا جواب دیا گیا الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ کہ چونکہ اس کے دریائے رحمت کا کوئی ٹھکانہ نہیں، اس لیے سب دوست دشمن اس کے دریائے رحمت سے یکساں پی کر سیراب ہو رہے ہیں۔ ؎

اے کریمے کہ از خزانہ غیب گبرو ترسا وظیفہ خورداری
دوستاں راکجا کنی محروم تو کہ بادشمناں نظرداری

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱ کے ساتھ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ کہہ کر یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس کا تمام جہانوں کو پالنا کسی مجبوری کے تحت نہیں، محض رحمت کے ساتھ ہے، دیکھو ایک بادشاہ بھی اپنی رعایا کی خوراک وضروریات کا اہتمام کرتا ہے۔ مگر اس کا یہ عمل بامرِ مجبوری ہے اگر نہ کرے تو بادشاہت جاتی ہے مگر اللہ رب العالمین کو کوئی مجبوری یا ڈر نہیں، ہاں وہ رحمن ورحیم ہے اور سب پر اپنے رحم وکرم کی بارش فرما رہا ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم میں فرق:

یاد رہے الرحمان اور الرحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور دونوں کا لفظی معنی بہت رحم کرنے والا ہے، مگر قرآن وحدیث کی روشنی میں الرحمان اور الرحیم کے معنی میں فرق ہے۔ الرحیم کا معنی ہے آخرت میں رحم فرمانے والا اور الرحمان کا معنی ہے دنیا وآخرت میں ہر جگہ رحم فرمانے والا، یا الرحیم کا معنی ہے صرف مومنوں پہ رحم فرمانے والا اور الرحمان کا معنی ہے مومنوں کافروں سب پہ رحم فرمانے والا۔ گویا الرحمان میں معنی کے لحاظ سے الرحیم کی نسبت وسعت اور ہمہ گیری ہے۔

پھر ان دونوں میں یہ فرق بھی ہے کہ الرحیم مخلوق پہ بولا جاتا ہے جیسے رسول اکرم ﷺ کی شان بیان فرمائی گئی: بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۲۸ ''کہ آپ مومنوں کے لیے مہربان اور رحم فرمانے والے ہیں۔'' (سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۸) اور صحابہ کرام کے لیے فرمایا گیا: رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ، مگر الرحمان کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کسی اور کو رحمان نہیں کہا جا سکتا۔

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝۴
یوم انصاف کا مالک [4] (اے اللہ!) تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ [5]

[4] جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ کہا گیا تو اس سے انسان کا دل بخشش ومغفرت کی امیدوں سے بھر گیا۔ اب

حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہوا کہ ساتھ جلال خداوندی کا ذکر بھی ہو تو فرمایا گیا: مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳ کہ اللہ یوم انصاف کا مالک بھی ہے، یعنی وہ روزِ قیامت دربارِ انصاف لگائے گا، جہاں مجرموں کو سزا اور محسنوں کو جزا دی جائے گی۔ لہٰذا محض الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ پڑھ کر کوئی ناسمجھ انسان بازارِ فسق و فجور گرم نہ کرے، گویا الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ کہہ کر بندوں کو امید رحمت دی گئی اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳ کہہ کر خوفِ عذاب دلایا گیا، اور یہی (امید رحمت اور خوفِ عذاب) ایمان کی دو سرحدیں ہیں۔

حدیث میں ہے: اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَا ''ایمان خوف و امید کے درمیان ہے۔'' اسی لیے اہل ایمان کی شان کی گئی: یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ''وہ اپنے رب کو خوف و امید کے ساتھ پکارتے ہیں۔'' (سورہ سجدہ، آیت نمبر ۱۶) دوسرے لفظوں میں الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ کہہ کر بندوں کو نیکی کا شوق اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳ کہہ کر انہیں گناہوں سے خوف دلایا گیا۔

اگر کہا جائے کہ اللہ تو ہر چیز کا مالک ہے پھر صرف روز انصاف کے مالک ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آج دنیا میں لوگ بھی مختلف اشیاء پر دعویٰ ملکیت رکھتے ہیں، مگر روز قیامت صرف اللہ ہی کی ملکیت ہوگی۔ ہر انسان خالی ہاتھ اٹھے گا، اس لیے اللہ کی ملکیت کو یوم انصاف کے حوالے سے خصوصاً یاد کیا گیا۔

قیامت کا آنا تقاضائے عقل بھی ہے:

یاد رہے! قرآن مجید تو قیامت کا آنا بتا ہی رہا ہے، عقل بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ قیامت کا دن ضرور آنا چاہیے۔ اس لئے کہ دنیا میں کچھ لوگ مظلومی کی زندگی گزار کر چلے جاتے ہیں۔ کوئی ان کی فریاد نہیں سنتا اور کچھ لوگ ساری زندگی ظلم و ستم کا بازار گرم رکھتے ہیں کوئی ان کا ہاتھ نہیں روکتا۔ اب ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جب ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا اور مظلوموں کو ان کے صبر کی جزاء دی جائے۔ چنانچہ روز قیامت اللہ تعالیٰ مظلوموں کو ظلم کا بدلہ اور ظالموں کو ان کی سزا دے گا۔ یہی فلسفہ قیامت اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳ کا معنی ہے۔ اگر قیامت پر ایمان نہ ہو تو معنی یہ ہے کہ ظالم اور مظلوم دونوں کا انجام ایک جیسا ہو جائے اور یہ خلاف عقل ہے۔

اسی طرح دنیا میں لوگوں کے مابین ہزارہا اختلافات ہیں۔ کوئی اللہ تعالیٰ کو مانتا ہے کوئی نہیں، کوئی اللہ تعالیٰ کو ایک مانتا ہے کوئی اس کے ساتھ جھوٹے خداؤں کو ملاتا ہے، یہود کثیر انبیاء پر جھوٹی تہمتیں رکھتے ہیں، مومنین ان کا رد کرتے ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا اور خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ مومنین انہیں بطور نبی پیش کرتے ہیں۔ اب ضروری ہے کہ ایک دن آئے جب ان اختلافات کا فیصلہ ہو۔ ہر کسی کو خبر ہو جائے کہ سچ کیا ہے جھوٹ کیا اور قیامت فیصلے ہی کا دن ہے، اسی لیے اسے یوم الفصل بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝۲۵ (سورہ سجدہ: ۲۵)

[5] پہلے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۲ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝۳ کہہ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر

بطور فرد غائب کیا گیا۔ اب اللہ تعالیٰ کو خطاب کے صیغوں سے یاد کر کے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ﴿۴﴾ کہا گیا۔

صوفیاء فرماتے ہیں: بندہ پہلے عالم مجاہدہ میں اس کا ذکر کر کے منازل قرب طے کرتا رہا تا آنکہ وہ بارگاہِ صمدیت میں حاضر ہو گیا اور عالمِ مشاہدہ میں جا کر کہنے لگا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ، اس مقام پر بندے نے بارگاہ صمدیت کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے اپنے معبود کا ذکر لفظ اِیَّاکَ سے کیا اس کے بعد وہ لفظ نَعۡبُدُ سے اپنا اور اپنی عبادت کا ذکر لایا۔ اس میں یہ درس ہے کہ بندے کو عبادت میں اپنی ذات اور اپنی عبادت کی بجائے ذاتِ حق پر نظر رکھنی چاہیے۔ گویا اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کا انداز بتاتا ہے کہ بندے کو یوں عبادت کرنا چاہیے جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور حدیث مبارکہ میں ہے: ''احسان (عبادت میں اخلاص) یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی یوں عبادت کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو یہ گمان رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

نَعۡبُدُ صیغہ جمع لانے میں نماز با جماعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں یہ درس بھی ہے کہ بندہ اپنی عبادت کو کامل نہ سمجھے بلکہ اپنی عبادت کو دوسرے مومنین کی عبادت کے ساتھ ملا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کر کے کہے یا اللہ! ہم سب کی عبادت قبول فرما اور چونکہ مومنین میں اللہ تعالیٰ کے وہ مقبولانِ بارگاہ انبیاء و اولیاء بھی ہیں جن کی عبادت بہر صورت مقبول ہے تو ان کے صدقے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہنے والے کی عبادت بھی مقبول ہو جائے گی۔ لکڑی کے ساتھ لوہا بھی پانی پر تیرتے ہوئے کنارے پہنچ جاتا ہے۔

وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ﴿۴﴾ بندے نے پہلے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ﴿۲﴾ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ﴿۳﴾ کہہ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی تا کہ اس کا مولیٰ خوش ہو کر اس کی جھولی میں رحمت کی بھیک ڈال دے۔ پھر اس نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہہ کر اپنے مولیٰ سے اپنی غلامی و بندگی کا عہد کیا کہ وہ زندگی بھر اس کی بندگی میں رہے گا۔ اس کے بعد وہ اپنا مدعیٰ زبان پر لایا اور وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ﴿۴﴾ کہتے ہوئے دست طلب دراز کر کے اپنے مولیٰ سے مدد کی التجاء کی اور یہی بھکاری کا طریقہ ہے۔ کہ بھکاری جب کسی بادشاہ کے دروازے پر کھڑا ہو تو پہلے بادشاہ کی عظمت و جلالت کی تعریف و توصیف کرتا ہے، پھر اس سے اپنی وفاداری و اخلاص کا عہد و اقرار کرتا ہے اس کے بعد اس سے مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی سورہ فاتحہ میں اس سے مانگنے کا یہی انداز مومنین کو سکھلایا ہے۔ کہ پہلے اس کی حمد کہو پھر اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کہہ کر اس سے عہد بندگی کرو پھر اس سے مانگو۔

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے بعد وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ﴿۴﴾ اس لیے بھی کہا گیا کہ ہماری عبادت فرشتوں جیسی نہیں۔ شیطان ہماری عبادات میں دکھلاوے کے وسوسے ڈال کر اسے خراب کرنے کے درپے ہے۔ اس لیے ہم عبادت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مدد کے خواہاں بھی ہیں کہ وہ شیطان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرمائے اور ہماری عبادت اس کی دست برد سے محفوظ رہے۔

اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ﴿۴﴾ کے تحت یہ سوال ذہن میں اٹھا کہ ایک طرف ہم نماز میں صرف اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا عہد

کرتے ہیں اور نماز سے باہر نکل کر ہم اپنی مشکلات میں غیر خدا سے مدد مانگنے لگ جاتے ہیں۔ پولیس والوں، سرکاری افسران، عدالتوں، دیگر ارباب اختیار اور کنبہ وقبیلہ سے مشکلات میں مدد طلب کرتے ہیں۔ کیا یہ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے خلاف نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل ہر قوت کا مالک اللہ ہے۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا یعنی تمام قوت اللہ ہی کے لیے ہے (سور بقرہ: ۱۶۵) اور دنیا میں جو شخص جس کی مدد کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی طاقت سے کرتا ہے۔ تو اس کا مدد کرنا حقیقت میں اللہ ہی کی مدد کرنا ہے اور اس سے مدد مانگنا بھی اللہ ہی سے مدد مانگنا ہے۔ تو ہر طرح کی مدد کا منبع اللہ ہی کی ذات ہے۔ خواہ وہ مدد ماتحت الاسباب ہو یا مافوق الاسباب، مادی ذرائع کے ساتھ ہو یا روحانی ذرائع کے ساتھ، بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔

مقبولانِ خدا سے ان کے وصال کے بعد مدد مانگنے کا جواز:

یاد رہے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد بھی آپ کی قبرِ انور پر حاضر ہو کر آپ سے مدد کے درخواست گزار ہوتے تھے اور اسے وایاك نستعين کے خلاف نہیں سمجھتے تھے۔ آج بھی اہل اسلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہو کر آپ سے اپنے مسائل ومصائب میں مدد کے طلبگار ہوتے ہیں کہ یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری یہ مشکلات ہیں، آپ ہمارے لیے دعا فرمائیں، اللہ تعالیٰ انہیں حل کردے۔ اسی طرح بزرگانِ دین کی قبور پر جا کر اہلِ اسلام ان سے اسی طرح مدد چاہتے ہیں۔ کچھ انتہاء پسند لوگ اسے کفر وشرک سے تعبیر کرتے اور اسے وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے خلاف قرار دیتے ہیں۔

مگر مسلمانوں کا حق ہے کہ ان سے سوال کریں کہ جب تمہیں کوئی مصیبت آئے تو تم پولیس، عدالتوں، سرکاری افسروں اور قبیلہ وخاندان سے مدد مانگتے ہو کیا یہ کفر وشرک اور وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے خلاف نہیں؟ اللہ کے بندو! اس اُمت پر رحم کرو، یہ پہلے ہی اَغیار کے مظالم کی چکی میں پس رہی ہے، اسے متحد کرو، اس پر کفر وشرک کے فتوؤں کی بمباری کر کے اس میں تفرقہ بازی نہ کرو۔

رہا مقبولانِ خدا کی قبور پر ان سے مدد مانگنا تو یہ حدیث صحیح سے ثابت ہے۔

حضرت مالک الدار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں مشہور قحط پڑا، ایک صحابی (حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور پر حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: یارسول الله: اِسْتَسْقِ لِاُمّتِكَ فَاِنَّهُمْ قَدْ هَلَكُوْا، یعنی ''اے آقا اپنی امت کیلئے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ ہلاک ہو رہے ہیں۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس صحابی کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا:

اِئْتِ عُمَرَ فاقرأهُ السلامَ واَخبِرهُ اَنّهم مُستقون، ''عمر کے پاس جاؤ اس کو میرا اسلام کہو اور خبر دو کہ عنقریب بارش ہوگی۔'' چنانچہ خوب بارش ہوئی۔

(المصنف بن ابی شیبہ جلد ۷ صفحہ ۴۸۲، کتاب الفضائل باب فضائل عمر بن الخطاب مطبوعہ دارالفکر بیروت، سن طباعت ۱۴۰۹ھ)

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہی حدیث بیہقی کی روایت سے نقل کی ہے اور آخر میں کہا:
وھذا اسنادٌ صحیحٌ، یعنی اس حدیث کی سند صحیح ہے۔(البدایہ جلد ۳ صفحہ ۹۲ ذکر سن ۱۴ھ، مطبوعہ بیروت)
امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
روی ابن ابی شیبۃ باسناد صحیح ابن ابی شیبہ نے یہ حدیث روایت کی ہے اور اس کی سند صحیح ہے، اور جس صحابی نے قبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بارش طلب کی وہ حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ تھے۔" (فتح الباری جلد ۲ صفحہ ۴۹۶)
پھر امام ابن عبدالبر قرطبی مالکی نے الاستیعاب جلد ۲ صفحہ ۴۶۴ فضائل عمر فاروق میں یہ حدیث الگ سند کے ساتھ ذکر کی ہے۔

امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن دارمی میں مستقل باب باندھا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد آپ سے استغاثہ کرتے تھے۔ اس میں انہوں نے یہ حدیث بھی نقل کی کہ لوگ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور بارش نہ ہونے کی شکایت کی۔ آپ رضی اللہ عنہا نے انہیں فرمایا:
اُنظُرُوا الی قبرِ النبیِّ ﷺ فاجعَلُوا منه كوًّا الی السماء حتی لا یکونَ بینه وبین السماءِ سَقفٌ،
کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور کے اوپر سے چھت کھول دو کہ اس کے اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو موسلا دھار بارش برسنے لگی اور اس قدر برسی کہ بے پناہ سبزہ اُگا جسے کھا کھا کر جانور موٹے ہو گئے اور ان کی جلدیں پھٹنے لگیں حتیٰ کہ اسے "عام الفتق" کہا گیا (فتق کا معنی پھٹنا ہے)
(سنن دارمی جلد اول صفحہ ۴۳ باب ما اکرم اللہ نبیہ ﷺ بعد موتہ مطبوعہ دار الفکر بیروت)۔

اب ہم ان نجدی علماء سے جو انبیاء و اولیاء کے وصال کے بعد ان سے مدد مانگنے اور ان کا وسیلہ پکڑنے کو کفر و شرک قرار دیتے ہیں اور اسے اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ؀ کی مخالفت سمجھتے ہیں، یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بھی کفر و شرک کا فتویٰ لگائیں گے؟ اور کیا وہ خود کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑا موحد اور دین کا بڑا عالم سمجھتے ہیں کہ جو بات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سمجھ میں نہ آسکی وہ آج یہ لوگ سمجھ گئے ہیں؟ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر مسلمانوں کو اسی راستہ پہ چلنے دیا جائے جس پہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین چلتے رہے۔

مقبولانِ خداوندی کو مدد کے لیے غائبانہ پکارنے کا جواز

اس جگہ وہابی نجدی علماء ان مسلمانوں پر بھی کفر و شرک کے فتوے لگاتے ہیں جو یا رسول اللہ، یا علی، یا غوث وغیرہ کہہ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء اللہ کو غائبانہ پکارتے اور ان کی اَرواح کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ وہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے ان کی مشکلات حل کروائیں۔ حالانکہ حدیث صحیح میں اس کا ثبوت بھی موجود ہے۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَامِنْ اَحَدٍ يُّسَلِّمُ عَلَيَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ فَاَرُدُّهٗ السَّلَامَ، یعنی جب بھی کوئی شخص مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ مجھ پر میری روح کولوٹا تا ہے حتیٰ کہ میں اسے اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔
(سنن ابوداؤد شریف کتاب المناسک باب ۹۶)

امام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ شارح بخاری المواہب میں فرماتے ہیں:

روح کے لوٹائے جانے کا معنی یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشاہدہ الٰہی کی ایک خاص حالت میں ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص آپ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ رب العزت آپ کی توجہ اس کی طرف لوٹا تا ہے اور آپ اسے اس کے سلام کا جواب دیتے ہیں، پھر امام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آن واحد میں دنیا سے لاکھوں لوگ آپ کو (نماز میں اور نماز کے علاوہ) سلام بھیجتے ہیں تو کیا آپ سب کی طرف بیک وقت توجہ فرماتے ہیں؟ امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ کچھ بعید از قیاس نہیں حتیٰ کہ اگر ایک ارب مسلمان بیک وقت آپ پر درود وسلام پڑھیں تو آپ ان کی طرف توجہ بھی فرماتے ہیں اور سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام آن واحد میں دنیا کے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی ارواح قبض کرتے ہیں اور ایک روح کا قبض کرنا انہیں دوسری روح کے قبض کرنے سے مشغول نہیں کرتا اور اس کے ساتھ وہ اللہ کی تسبیح وتقدیس میں بھی مصروف ہیں۔ (المواہب اللدنیہ جلد ۴ صفحہ ۵۸۶ مقصد ۱۰ فصل اول مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت)

اگر فرشتے کی توجہ کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے تو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وسعت نظر کا کیا کہنا۔

لہٰذا جب بھی کوئی امتی اپنے آقا ومولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پکارتا ہے تو آپ اس کی فریاد سنتے اور اس کی طرف نظر رحمت فرماتے ہیں۔ جب آپ سلام سنتے ہیں تو اگر کوئی شخص سلام کے ساتھ فریاد پیش کرے تو وہ کیوں نہ سنی جائے گی؟ اسی لیے امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ اسی حدیث مبارک کی روشنی میں فرماتے ہیں: ؏

فریاد امتی جو کرے حال زار میں
ممکن نہیں کہ خیر بشر کو خبر نہ ہو

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعد وصال غائبانہ مدد کو پکارنا

اس جگہ طبرانی نے حدیث صحیح روایت کی ہے کہ عہد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں ایک شخص حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا کہ وہ اپنی حاجت کے سلسلہ میں کئی بار حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا ہے مگر (کثرت مشاغل کے سبب) انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے اسے کہا تم جا کر وضو کرو مسجد میں دو رکعت پڑھو پھر یوں دعا کرو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم ''اے اللہ! میں اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے تجھ سے مانگتا اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔'' اس کے بعد یہ کہو:

يَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰی رَبِّیْ فَیَقْضِیْ حَاجَتِیْ ''یعنی یا محمد ﷺ! میں آپ کے وسیلہ سے اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں تا کہ وہ میری حاجت پوری کردے۔'' یہ دعا مانگ کر تم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس جانا پھر جو وہ کہیں مجھے آ کر بتلانا۔

وہ شخص یہ دعا مانگ کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا دروازے پر کھڑے شخص نے اسے فوراً امیر المومنین کے پاس پہنچا دیا۔ آپ نے اسے اپنی مسند پر اپنے ساتھ بٹھایا اور فرمایا: مجھے تمہاری بات بھول گئی تھی اب جب بھی تمہیں کوئی ضرورت ہو میرے پاس سیدھے چلے آنا۔ وہ شخص وہاں سے نکل کر حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور شکر یہ ادا کیا کہ ان کی سفارش سے امیر المومنین نے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

وہ کہنے لگے بخدا! میں نے تمہارے لیے کوئی سفارش نہیں کی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار میں رسول اکرم ﷺ کے پاس حاضر تھا۔ اتنے میں ایک نابینا شخص آ گیا اور اپنی نابینائی کی شکایت کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرا بازو پکڑنے والا بھی کوئی نہیں۔ آپ نے فرمایا: تم جا کر وضو کرو پھر دو رکعت پڑھو پھر یہی دعا کرو: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الخ۔ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! ابھی ہم مجلس سے اٹھے نہ تھے اور نہ ہی بات لمبی ہوئی تھی کہ وہ شخص آ گیا اور اس کی آنکھیں یوں درست تھیں جیسے ان میں کوئی مرض نہ تھا۔ (المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۹ صفحہ ۳۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی طباعت ۱۹۸۵ء)

امام طبرانی نے معجم صغیر میں بھی یہ حدیث نقل کی اور اس کے بعد فرمایا

والحدیث صحیح کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ (معجم صغیر للطبرانی جلد اول صفحہ ۱۸۴ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی دلائل النبوۃ جلد ا صفحہ ۱۶۷ مطبوعہ بیروت میں اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

اب اس حدیث میں ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے وصال نبوی کے بعد اس شخص کو وہ دعا سکھلائی جو رسول اللہ ﷺ نے نابینا صحابی کو سکھلائی تھی جس میں یہ الفاظ بھی ہیں یا محمد انی اتوجه بك الی ربك فیقضی لی حاجتی، اے محمد ﷺ میں آپ کے وسیلہ سے آپ کے رب کی طرف توجہ کرتا ہوں تا کہ وہ میری یہ حاجت پوری کردے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو غائبانہ پکارا گیا ہے اور آپ کو بارگاہ الٰہی میں وسیلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، اگر یہ شرک ہے تو کیا نجدی علماء صحابیٔ رسول ﷺ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ پر شرک کا فتویٰ لگائیں گے؟

پھر حضور ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر سب سے مشکل وقت جنگ یمامہ میں آیا جب مسیلمہ کذاب ایک لاکھ کا لشکر لے کر میدان میں اترا۔ اس جنگ میں بارہ سو کے قریب صحابہ کرام اور تابعین شہید ہو گئے جن میں حفاظ و قراء کی کثرت تھی۔ روایات میں ہے وَكَانَ شِعَارُهُمْ یَوْمَئِذٍ یَا مُحَمَّدَاهُ ''وہ اس دن یا محمداہ کا نعرہ لگاتے تھے۔'' (البدایہ والنہایہ جلد ۶ صفحہ ۳۲۹ مطبوعہ دار الریان مصر، تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۲۸۱ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس جنگ میں فتح عطا فرما دی۔ ان تمام احادیث صحیحہ سے معلوم ہوا صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور پر حاضر ہو کر بھی آپ سے مدد مانگتے تھے اور مصائب میں آپ سے غائبانہ فریاد بھی کرتے تھے۔ اگر یہ عمل شرک ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیا فتویٰ لگایا جائے گا؟

نجدی اور دیوبندی علماء کی عبارات سے غائبانہ استغاثہ کا ثبوت:

اس جگہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود وہابی علماء بھی اپنی کتابوں میں اپنے اَسلاف اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غائبانہ استغاثہ کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ غیر مقلدین کے پیشوا وحید الزمان حیدر آبادی لکھتے ہیں کہ

''اگر کسی شخص کا یہ گمان ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی ولی اللہ کی قوتِ سماعت تمام عالم کو محیط ہے تو اس میں کوئی شرک نہیں کیونکہ اللہ نے بعض فرشتوں بلکہ حیوانات کو بھی انسانوں سے بڑھ کر سماعت و بصارت عطا فرمائی ہے، چنانچہ دیلمی نے مسند الفردوس میں اور ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ نے میری قبر پر فرشتہ مقرر کیا ہے۔ (یعنی مقرر کر دے گا) تو جب بھی میرا کوئی امتی مجھ پر درود پڑھے تو وہ فرشتہ مجھے کہتا ہے کہ اے محمد! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فلاں بن فلاں نے اس وقت آپ پر درود پڑھا ہے۔'' (ہدیۃ المہدی ص ۲۷ سن طباعت ۱۳۲۵ھ مطبوعہ امرتسر)

اسی طرح مولانا وحید الزمان حیدر آبادی اس سے دو صفحہ قبل لکھتے ہیں:

الدعاء الشرعی عبادۃ کالصلوٰۃ فلاتجوز من غیر اللہ وھی المراد فی الآیات التی ورد فیھا لفظ الدعاء اما الدعاء اللغوی بمعنی النداء فتجوز لغیر اللہ تعالی مطلقا سواء کان حیاً او میتاً وثبت فی حدیث الاعمیٰ یا محمد انی اتوجہ بك الی ربی وفی حدیث آخر یاعباد اللہ اعینونی، وقال ابن عمر حین زل قدمہ وامحمداہ، ولما دعا ملك الروم الشھداء الی النصرانیة قالوا یا محمداہ رواہ ابن الجوزی من اصحابنا وقال اویس القرنی بعد وفاۃ عمر یا عمراہ یا عمراہ یا عمراہ، رواہ ابن حبان

یعنی دعاء شرعی عبادت ہے جیسے نماز، تو یہ غیر اللہ کے لیے جائز نہیں ہے اور جن آیات میں غیر اللہ سے دعاء سے منع کیا گیا ہے اس میں یہی عبادت کا معنی مراد ہے، رہا لغوی دعاء یعنی پکارنا تو وہ غیر اللہ کے لیے مطلقاً جائز ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ، جیسا کہ نابینا شخص والی حدیث میں ہے: یا محمد انی اتوجہ بك الی ربی، اے محمد میں آپ کے ذریعہ اپنے رب کی طرف توجہ کرتا ہوں، ایک حدیث مبارکہ میں ہے: یا عباد اللہ اعینونی اے اللہ کے بندو میری مدد کرو اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا جب قدم ٹل گیا تو انہوں نے کہا تھا: وامحمداہ، اور جب شاہ روم نے شہداء کو نصرانیت کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: یا محمداہ، اسے ہمارے اصحاب میں سے ابن جوزی نے روایت کیا ہے اور حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کہا تھا: یا عمراہ یا عمراہ یا عمراہ، اسے ابن حبان نے روایت کیا

ہے۔(ھدیۃ المھدی صفحہ ۲۳ مطبوعہ میور پریس امرتسر، سن طباعت ۱۳۲۵ھ)

اسی پر بس نہیں، مولانا وحید الزمان اہل حدیث گھر کی بات بتاتے ہوئے آگے کہتے ہیں کہ علماء اہل حدیث کے پیشوا نواب سید صدیق حسن خاں اپنے مسلک کے پرانے ائمہ علامہ ابن قیم اور قاضی شوکانی کو غائبانہ پکارتے تھے، تو وہ کہتے ہیں:

وقال السید فی بعض توالیفہ:

قبلۂ دیں مددے، کعبۂ ایماں مددے — ابن قیم مددے قاضی شوکاں مددے

یعنی اے قبلۂ دیں مدد کرو، اے کعبہ ایماں مدد کرو، اے ابن قیم مدد کرو اے قاضی شوکانی مدد کرو۔(ہدیۃ المھدی صفحہ ۲۳)

اسی طرح بانی دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی حضور ﷺ سے استغاثہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا — نہیں ہے قاسم بے کس کا کوئی حامی کار

جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا — بنے کون ہمارا تیرے سوا غمخوار

رجاء و خوف کی موجوں میں ہے امید کی نا — جو تو ہی ہاتھ لگائے تو ہووے بیڑا پار

(قصائد قاسمیہ مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ اردو بازار دہلی سن طباعت ۱۳۶۰ھ)

ادھر مولانا اشرف علی تھانوی رسول اکرم ﷺ سے استغاثہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

يا شفيعَ العبادِ خُذْ بِيَدِى — انت فى الاضطرارِ مُعتمدى

ليس لى ملجأً سِواكَ اَغِثْ — مسّنى الضُّرُّ سيّدى سندى

غشّنى الدّهرُ يا بنَ عبد الله — كُنْ مُغيثًا فأنتَ لى مددى

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے اپنے ان عربی اشعار کا خود ہی منظوم اردو ترجمہ کیا ہے، جو ترتیب وار یہ ہے:

دستگیری کیجیے میری نبی — کشمکش میں تم ہی ہو میرے نبی

جز تمہارے ہے کہاں میری پناہ — فوج کلفت مجھ پہ آ غالب ہوئی

ابن عبد اللہ زمانہ ہے خلاف — اے میرے مولا خبر لیجے میری

(نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب ﷺ صفحہ ۱۵۸ مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور)

پھر ایک جگہ مولانا اشرف علی تھانوی مولانا رشید احمد گنگوہی کی روح سے استمداد کرتے ہوئے کہتے ہیں

يا سيدى لله شيئا انه — انتم لى المجدى وانى جادى

یعنی اے میرے سردار! اللہ کے لئے مجھے کچھ دیجئے کہ آپ میرے داتا ہیں اور میں سوالی۔

(تذکرۃ الرشید ص ۱۱۴، مطبوعہ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور)

اب اگر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا قاسم نانوتوی رسول اللہ ﷺ کو مدد کے لیے پکار رہے ہیں اور ان کے ایمان اور ان کی توحید میں کچھ فرق نہیں آتا تو دوسرے مسلمان جب یا رسول اللہ یا علی اور یا غوث کہہ دیں تو وہ کیوں کافر و مشرک ہو جاتے ہیں؟۔ یہی نہیں، اہل حدیث علماء میں سے مولانا سید نواب صدیق حسن خاں اپنے فوت شدہ بزرگوں

ابن قیم اور قاضی شوکانی کو غائبانہ امداد کے لیے پکارتے ہیں اور مولانا اشرف علی تھانوی تو مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب کو انکے وصال کے بعد غائبانہ مدد کے لیے پکارتے ہیں، اس کے باوجود مسلمان ہی رہے ہیں تو دوسرے مسلمانوں پہ حضور پرنور ﷺ کو مدد کے لیے پکارنے پر کفر وشرک کے فتوؤں سے کیوں نوازا جاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرے اور وہ سب قرآن وسنت اور عملِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف لوٹ آئیں۔

اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ‏ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۙ
(اے اللہ) ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔[6] اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا
غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ﴿۷﴾
جن پر نہ تو تیرا غضب کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔[7]

[6] وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ؕ‏ ﴿۴﴾ کی وضاحت کی جارہی ہے کہ اللہ سے ہم کیا مدد چاہتے ہیں؟ تو فرمایا گیا کہ اے بندو! یوں کہو: اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ پر چلا۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''صراطِ مستقیم سے دینِ اسلام مراد ہے۔'' ابن مسعود اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سے قرآن مراد لیتے ہیں، اور طبرانی نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ اس سے وہ طریقہ مراد ہے جس پر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو چھوڑ کر گئے۔

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ اس سے حضور ﷺ اور ابوبکر صدیق وعمر فاروق رضی اللہ عنہما کی سیرت مراد ہے۔ (درمنثور)

الغرض قرآن وحدیث، سیرتِ محمدیہ اور کردارِ صحابہ کرام ہی صراطِ مستقیم ہے، جس پر قائم رہنے کی یہاں ہمیں دعا سکھلائی جارہی ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے: عَلَيۡكُمۡ بِسُنَّتِيۡ وَسُنَّةِ الۡخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيۡنَ الۡمَهۡدِيِّيۡنَ تم پر میرے اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کے راستہ کا اپنانا ضروری ہے۔ (ابوداؤد کتاب السنۃ باب ۵)

یادرہے! سیدھا راستہ کسی سڑک کے درمیان میں ہوتا ہے، دائیں بائیں عموماً پتھر کیچڑ اور گڑھے وغیرہ ہوتے ہیں۔ جو شخص چاہے کہ اس کی گاڑی سیدھی چلے، تو اسے راستہ کے درمیان میں چلنا چاہیے اگر وہ دائیں بائیں چلے گا تو کسی حادثہ کے شکار ہونے کا امکان ہے۔ اسی طرح مومن کو چاہیے کہ افراط وتفریط سے بچ کر درمیانے طریقہ پر چلے اسی لیے فرمایا گیا: وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا کہ ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۴۳) جو افراط وتفریط میں پڑا وہ ہلاک ہوا۔ یہود نے انبیاء کرام علیہم السلام کی گستاخیاں بلکہ انہیں قتل کرنے کا طریقہ اپنایا وَيَقۡتُلُوۡنَ

الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۱۲) یہ تفریط ہے اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اپنے دوسرے مذہبی رہنماؤں کو درجۂ ربوبیت دے دیا۔ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ (سورہ توبہ، آیت نمبر ۳۱) یہ افراط ہے۔

ان دونوں انتہاؤں سے بچ کر انبیاء و اولیاء کی وہ تعظیم و تکریم بجالانا جو ان کا حق ہے صراط مستقیم ہے اور یہی طریقہ اہل سنت و جماعت ہے۔

اسی طرح رافضی لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل بیت رضی اللہ عنہم کو انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی افضل بتا رہے ہیں اور خارجی گروہ ان کی شان میں بے ادبیاں کر رہا ہے جبکہ ان کی وہ فضیلت ماننا جو انہیں قرآن و حدیث نے عطا کی ہے صراط مستقیم ہے اور یہی طریقہ اہل سنت و جماعت ہے۔ سیدھے راستہ کی یہ نشانی بھی ہے کہ اس پر اکثر لوگ چلتے ہیں (اور اکثر لوگ راستہ کے درمیان ہی میں رہتے ہیں) اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّهٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ بڑی جماعت کی پیروی کرو کہ جو اس سے ہٹا وہ جہنم میں جا گرا۔'' (ترمذی کتاب الفتن: باب ۷) الحمدللہ آج بھی مسلمانوں کی اکثریت انہی عقائد و نظریات کی حامل ہے جن پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قائم تھے۔

[7] اے اللہ! ہمیں ان لوگوں کے راستہ پر چلا جن پر تو نے انعام فرمایا، اب اللہ تعالیٰ نے کن پر انعام فرمایا؟ تو اس کا جواب قرآن نے دیا: اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ اللہ تعالیٰ نے جن پر انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین (صدیقین سے عموماً وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جنہوں نے انبیاء کی صحبت حاصل کی اور ان کے ساتھی بن گئے یعنی صحابہ کرام) شہداء اور صالحین (اولیاء کاملین) (سورہ نساء، آیت نمبر ۶۹)

گویا اس جگہ ہمیں تلقین کی گئی کہ ہم سب سے پہلے انبیاء کے راستہ پر چلیں کہ جس طرح انہوں نے وقت کے ہر نمرود و فرعون سے ٹکر لی مگر کلمہ حق بلند کر کے چھوڑا، اسی طرح ہم حق گوئی اور راست بازی کا طریقہ اپنائیں پھر ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر چل کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو جہاد اور عمل صالح کی تلوار کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلائیں اور شہداء کے طریقہ پر چل کر راہ حق پر استقامت کیلئے جان دینے سے بھی دریغ نہ کریں اور اولیاء کاملین کا طریقہ اپنا کر دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت اپنائیں۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جن پر غضب کیا گیا وہ یہود ہیں اور جو گمراہ ہوئے وہ عیسائی۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورہ فاتحہ حدیث ۲۹۵۴، ابن جریر، ابن حبان)

یوں تو یہود و نصاریٰ دونوں اللہ تعالیٰ کے مغضوب بھی ہیں اور گمراہ بھی، مگر یہود کی اسلام سے سرکشی و عناد، نصاریٰ سے بہت زیادہ ہے اس لیے انہیں قرآن میں کئی جگہ لفظ غضب کا مصداق ٹھہرایا گیا جو لفظ گمراہ سے سخت تر ہے جیسے: فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ ؕ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۹۰) مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ (سورہ مائدہ، آیت نمبر ۶۰) جبکہ

نصاریٰ کیلئے کہا گیا: وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (سورہ مائدہ: ۷۷) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہود ونصاریٰ کے راستہ پر نہ چلنے کا درس دیتے ہوئے فرمایا: غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ

مگر افسوس ہم مسلمان آج یہود ونصاریٰ کا سا طرزِ زندگی اپنائے ہوئے ہیں۔ مسلم مردوں نے ان جیسا بے ریش چہرہ، ان جیسی حجامت اور ان جیسا لباس اپنا لیا ہے اور مسلم عورتوں نے ان کی پیروی میں مختصر لباس پہننے اور یہودی عیسائی عورتوں کی طرح بے حیائی کے طریقے اپنا لیے ہیں۔ اے کاش! ہم قرآن کریم کی پہلی سورت جو ہم ہر نماز میں پڑھتے ہیں، کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیں۔ (آمین)

آمین کہنے کی فضیلت:

چونکہ سورہ فاتحہ دعا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ تو جب بھی سورہ فاتحہ پڑھی جائے حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کے ساتھ آمین کہو۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ سے میں نے عرض کیا آمین کا کیا معنی ہے؟ فرمایا: اس کا معنی ہے اے اللہ! ایسے ہی کر دے (جیسے دعا مانگی گئی ہے)۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جبریلِ امین علیہ السلام نے حضور ﷺ کو سورہ فاتحہ سکھلائی، جب وَلَا الضَّآلِّيْنَ پر پہنچے تو کہا آمین کہیں تو آپ نے بھی آمین کہا۔ (ابن ابی شیبہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ (مسلم، ابوداؤد، نسائی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ پڑھ کر سورہ فاتحہ پڑھی پھر آمین کہا تو آسمان کا کوئی فرشتہ ایسا نہیں جو اس کے لیے استغفار نہ کرے۔
(درمنثور جلد اول صفحہ ۴۳)

نماز میں آمین آہستہ کہنے کا حکم

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا امن الامام فامنوا فانه من وافق تأمينه تأمين الملائكة غفر له ما تقدم من ذنبه۔

''جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے موافق ہوئی اس کی بخشش کر دی جائے گی۔''

(بخاری کتاب صفۃ الصلوۃ حدیث ۷۴۹، مسلم کتاب الصلوۃ حدیث ۴۱۰۔ ابوداود کتاب الصلوۃ حدیث ۹۳۵۔ نسائی کتاب الافتتاح حدیث ۹۲۹)

یعنی جب امام آمین کہتا ہے تو فرشتے بھی آمین کہتے ہیں، تو تم بھی آمین کہو، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسی نمازی

کے گناہ بخشے جائیں گے جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مشابہ ہو، اور آج تک کسی نے فرشتوں کی آمین نہیں سنی، ثابت ہوا کہ آمین کا آہستہ کہا جانا ہی مطلوب ہے۔

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، جب آپ نے غیر المغضوب علیھم ولاالضالین پڑھا تو آمین کہا، واخفیٰ بہا صوتہ، اور اس میں آپ نے اپنی آواز کو آہستہ رکھا۔

(حاکم جلد ۲ صفحہ ۲۵۳ حدیث ۲۹۱۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔ طبرانی کبیر جلد ۲۲ صفحہ ۹ حدیث ۳۸)

حضرت وائل رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سنا آپ نے سورہ فاتحہ کے بعد آمین کہا: وخفض بہا صوتہ، آپ نے آواز کو پست رکھا۔ (ترمذی کتاب الصلوٰۃ حدیث ۲۴۸)

سورۃ البقرہ کے فضائل

وجہ تسمیہ

البقرۃ گائے کو کہتے ہیں یعنی وہ سورت جس میں ایک گائے کا تذکرہ ہے، یہ گائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم سے ذبح کی گئی تھی اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا ایک مُردے کو لگایا گیا تو وہ معجزاتی طور پر زندہ ہوگیا اور اس نے اپنے قاتل کا نام بتایا یہ عظیم الشان معجزہ اس سورت میں آیت ٦٧ سے ٧٣ تک مذکور ہوا ہے۔ چونکہ یہ واقعہ آگے پورے قرآن کریم میں کہیں نہیں، یہ اسی سورت کا خاص مضمون ہے، اسی مناسبت سے اسے سورۃ البقرۃ کہا گیا اسی طرح قرآنی سورتوں کے نام مخصوص مناسبتوں کے تحت رکھے گئے ہیں اور یہ نام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود رکھے ہیں۔ اس لئے توقیفی ہیں یعنی ان میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

یہاں یہ اعتراض ہے کہ ابنِ مردویہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ نہ کہ سورۃ البقرۃ یا سورۃ آل عمران یا سورۃ النساء، بلکہ یہ کہو کہ وہ سورت جس میں گائے کا ذکر ہے یا وہ سورت جس میں آل عمران کا ذکر ہے اسی طرح سارا قرآن ہے۔'' اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ سورۃ البقرہ کا لفظ نہیں کہنا چاہئے، مگر شارحین کو اس حدیث کی صحت میں کلام ہے امام ابن کثیر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے کہ اس کا ایک راوی ابوسلمہ خواص ضعیف الحدیث ہے، اس کے مقابلے میں متعدد صحیح احادیث ہیں کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۃ البقرہ کے متعلق فرماتے تھے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہر چیز کی ایک کوہان یعنی بلند مقام ہوتا ہے اور قرآن کی کوہان سورۃ البقرہ ہے۔ (ترمذی شریف)

یونہی دیگر متعدد احادیث ہیں جن میں سے بعض آگے اس سورت کے فضائل میں ہم بیان کریں گیا اس کے علاوہ محققین فرماتے ہیں ممکن ہے ابتداء میں آپ نے سورۃ البقرہ کہنے سے منع کیا ہو جب اسلام کمزور تھا اور مخالفین کی طعنہ زنی شدت پر تھی اور وہ اس لفظ'' گائے والی سورت'' پر طنز کرتے تھے مگر جب اسلام کو شوکت مل گئی تو اب ان کے طنز کی کوئی پرواہ نہیں رہ گئی۔ اگرچہ غیر مسلم معترضین آج بھی اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیا ہوا سورۃ البقرہ گائے والی سورت، سورۃ النمل چیونٹی والی سورت مگر اس کا جواب پیچھے گزر چکا۔

شان نزول:

اس امر پر بلا خلاف سب محدثین کا اتفاق ہے کہ یہ سورت مدنی ہے۔ مدینہ طیبہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری

کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی، چنانچہ اس میں تحویل قبلہ کا ذکر ہے اور یہ تحویل (قبلہ کی سمت کا بدلنا) ہجرت کے سولہ ماہ بعد واقع ہوئی تاہم اس کے کچھ حصے وہ بھی ہیں جو مدنی دور کے آخری زمانہ میں نازل ہوئے، چنانچہ سود سے متعلق آیات کی بابت آئمہ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن کریم کے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر جل اول صفحہ ۴۷) اسی طرح سورت میں ایک وہ آیت بھی ہے جو سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے، آگے اس کا ذکر آ رہا ہے۔

سورۃ البقرہ کے مضامین

چونکہ یہ سورت مدنی ہے اور مکی و مدنی سورتوں کے درمیان یہ فرق ہے کہ مکی سورتوں کے مضامین زیادہ تر توحید باری تعالیٰ، اللہ کی ذات وصفات کے بیان، ذکر رسالت، قیام قیامت، اور ردِ شرک پر مشتمل ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں مشرکین سے مقابلہ تھا۔ جولات ومنات، عزّیٰ وہبل، اور اساف ونائلہ جیسے بتوں کے پجاری تھے۔ اس لئے زیادہ تر انہیں دعوتِ اسلام دی گئی اور یوں بھی حکمت الٰہیہ یہ تھی کہ پہلے مسلمانوں کے عقائد پختہ کئے جائیں کیونکہ عقائد ہی پہ عمارتِ اسلام استوار ہوئی ہے اس لئے مسلسل تیرہ برس تک مکی دور میں توحید، رسالت اور قیام قیامت وغیرہ عقائد پر قرآن اترتا رہا، جبکہ ہجرت کے بعد مدنی سورتوں میں قرآن کا انداز کئی لحاظ سے بدل گیا۔

اول

مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کو یہود سے پالا پڑا جو شہر مدینہ کے آس پاس بستیوں میں آباد تھے۔ چونکہ وہ توحید ورسالت اور قیامت وغیرہ کے پہلے ہی قائل تھے اس لئے ان عقائد پر گفتگو کم ہوئی اور اللہ نے وہ انعامات گنوائے جو یہود پر پچھلے ادوار میں ہو چکے تھے چنانچہ سورہ بقرہ کا طویل ابتدائی حصہ انہی انعامت کے بیان میں ہے۔

دوم

یہود اگرچہ انبیاء کی اولاد تھے اسی لئے انہیں بار بار یا بنی اسرائیل کہہ کر پکارا گیا مگر وہ انبیاء کی تعلیمات فراموش کر چکے تھے، چند رسموں کے پجاری رہ گئے تھے اس لئے انہیں دعوت دی گئی کہ آؤ انبیاء کی حقیقی تعلیمات کو اپناؤ اور انہیں وہ بشارتیں یاد دلائی گئیں جو حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت موسیٰ و دیگر انبیاء علیہم السلام نے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ارشاد فرمائی تھیں۔

سوم

مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کو ایک اور گروہ سے بھی پالا پڑا یعنی منافقین۔ مکی دور میں کوئی منافق نہیں تھا یعنی صرف زبان سے اسلام لانے والا اور اندر سے کافر، اس لئے کہ مکہ مکرمہ میں کلمۂ اسلام پڑھنا خود کو دہکتی آگ میں گرانے کے مترادف تھا جو لوگ اسلام لائے انہیں اذیت ناک سزاؤں اور گوناگوں ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا؛ اس لئے وہی لوگ

اسلام لائے جنہوں نے جان کی بازی لگادی اور وہ اسلام کیلئے مخصوص ترین افراد تھے۔ مگر مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہوئی اس لئے بعض مفاد پرست لوگ بھی لبادۂ اسلام اوڑھ کر مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو گئے کہ شائد اس نئی حکومت سے مستقبل میں ہمیں بھی کچھ مفاد مل جائے۔ چنانچہ سورہ بقرہ و دیگر مدنی سورتوں میں منافقین کی نشانیاں بکثرت بتائی گئی ہیں تا کہ مسلمان ان سے بچ کر رہیں۔

چہارم

چونکہ مدینہ طیبہ اسلام کی پہلی چھوٹی سی ریاست قائم ہو چکی تھی اب اس ریاست کا قانون اور نظام وضع ہوا اور سورہ بقرہ میں تفصیل سے اسلامی زندگی سے متعلق احکام بیان کئے گئے، چنانچہ نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ کی بنیادی تفصیلات بتائی گئیں۔ نکاح وطلاق اور خرید وفروخت، مضاربت اور رہن کے مسائل بیان ہوئے، میاں بیوی کے حقوق اور رضاعت کے احکام سے آگاہ کیا گیا، پھر سود کے متعلق تفصیل بتائی گئی، الغرض معیشت، معاشرت، سیاست، عائلی وانفرادی زندگی کے مسائل بتائے گئے۔

پنجم

مشرکین مکہ کی طرح یہود بھی اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہونے پر نازاں تھے مگر تعلیمات ابراہیمی سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا، اس لئے انہیں ابراہیمی تعلیمات یاد دلائی گئیں، پھر اس دوران قبلہ کی تبدیلی ہوئی تو سورہ بقرہ میں اس واقعہ پر روشنی ڈالی گئی جب ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا تھا اس کے بعد تحویل قبلہ پر یہودی اعتراضات کا جواب دے دیا گیا۔

خصوصیات سورۃ بقرہ:

اس کی آیات کی تعداد ۲۸۷، کلمات ۶۲۲۱ اور اس کے حروف ۲۵۵۰۰ ہیں، امام ابن کثیر فرماتے ہیں یہ سورۃ ایک ہزار خبروں، ایک ہزار اوامر اور ایک ہزار نواہی پر مشتمل ہے۔ (ابن کثیر جلد اول صفحہ ۳۷) اس سورت میں وہ آیت ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی، اس کے بعد قرآن کریم کا نزول ختم ہو گیا اور قرآن کریم کے نزول کی تکمیل ہو گئی، وہ آیت یہ ہے۔ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۸۱) سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف نو رات دنیا میں رہے، پھر آپ کا وصال مبارک ہو گیا۔ (درمنثور، جلد دوم، صفحہ ۱۱۶)

اس سورت میں وہ آیت بھی ہے جو قرآن کریم کی طویل ترین آیت ہے یعنی يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ

كَانَ الَّذِیۡ عَلَیۡهِ الۡحَقُّ سَفِیۡهًا اَوۡ ضَعِیۡفًا اَوۡ لَا یَسۡتَطِیۡعُ اَنۡ یُّمِلَّ هُوَ فَلۡیُمۡلِلۡ وَلِیُّهٗ بِالۡعَدۡلِ ؕ وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِیۡدَیۡنِ مِنۡ رِّجَالِکُمۡ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ یَکُوۡنَا رَجُلَیۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَکِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰی ؕ وَلَا یَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ؕ وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَکۡتُبُوۡهُ صَغِیۡرًا اَوۡ کَبِیۡرًا اِلٰۤی اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِکُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰۤی اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ تَکُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِیۡرُوۡنَهَا بَیۡنَکُمۡ فَلَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَکۡتُبُوۡهَا ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَایَعۡتُمۡ ۪ وَلَا یُضَآرَّ کَاتِبٌ وَّلَا شَهِیۡدٌ ۬ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌۢ بِکُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۸۲﴾ ''(سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۸۲) یہ سورت بذاتِ خود قرآن کریم کی طویل ترین سورت ہے جو قریباً اڑھائی پاروں پر مشتمل ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ''سنام القرآن'' قرآن کی کوہان یعنی بلند مقام قرار دیا ہے۔ غزوۂ حنین میں جب صحابہ کرام علیہم الرضوان میں افراتفری مچی تو رسول کریم ﷺ نے آواز دے کر پکارا۔ ''یا اصحاب سورۃ البقرۃ'' یعنی اے سورہ بقرہ والو! ادھر آؤ۔ (ابن مردویہ) اس سے اس سورت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

فضائل سورۃ البقرۃ

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ، شیطان اس گھر سے دور بھاگتا ہے جہاں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔'' (مسلم، ترمذی، احمد بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہر چیز کی کوہان ہوتی ہے اور قرآن مجید کی کوہان سورہ بقرہ ہے۔'' (ابن حبان، طبرانی بروایت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ) حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک رات سورہ بقرہ پڑھ رہے تھے قریب ہی ان کا گھوڑا بندھا ہوا تھا اچانک گھوڑا گھومنے اور بدکنے لگا، وہ خاموش ہو گئے، گھوڑا بھی ٹھہر گیا، انہوں نے پھر پڑھنا شروع کیا تو گھوڑا پھر بدکنے لگا، وہ خاموش ہوئے تو گھوڑا بھی ٹھہر گیا، وہ اپنے بچے کی طرف متوجہ ہوئے جو قریب ہی (سورہا) تھا اس خوف سے کہ گھوڑا اسے نقصان نہ دے انہوں نے بچے کو اٹھایا تو نگاہ آسمان کی طرف اٹھی، دیکھا تو ایک سائبان سا جس میں قندیلیں روشن تھیں، آسمان کی طرف اٹھا جا رہا تھا، تا آنکہ نظر سے اوجھل ہو گیا، صبح انہوں نے نبی اکرم ﷺ کو ماجریٰ سنایا آپ ﷺ نے فرمایا: ''جانتے ہو وہ کیا تھا؟'' عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ نہیں! آپ نے فرمایا: ''وہ ملائکہ تھے جو تیری آواز پر (قرآن سننے) قریب آئے تھے اور اگر تم پڑھتے رہتے تو انہیں وہیں صبح ہو جاتی اور لوگ انہیں بلا حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔'' (بخاری، مسلم، نسائی وغیرہم بروایت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ) نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''اپنے گھروں میں سورہ بقرہ پڑھا کرو اور انہیں قبرستان نہ بناؤ، جو شخص سورہ بقرہ پڑھتا ہے اسے جنت میں عظیم الشان تاج پہنایا جائے گا۔'' (بیہقی بروایت صلصال بن دلہمس) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''سورہ بقرہ قرآن کی کوہان اور بلند جگہ ہے، اس کی ہر آیت کے ساتھ اسی فرشتے نازل ہوئے اور آیت الکرسی عرش کے نیچے سے نازل ہوئی۔'' (احمد، طبرانی بروایت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ)

ایاتھا ۲۸۶ ۲ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ ۸۷ رکوعاتھا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے۔

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

الف لام میم [1] وہ (عظیم الشان) کتاب جس میں شک کی گنجائش نہیں [2] پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔[3]

[1] یہ حروف مقطعات ہیں۔ یہ قرآن کریم کی ۲۹ سورتوں کے آغاز میں واقع ہوئے ہیں کہیں ایک حرف ہے جیسے ق، ص، ن کہیں دو جیسے حٰمٓ، یٰسٓ، طٰہٰ کہیں تین جیسے الٓمّٓ، الٓرٰ، اور کہیں چار جیسے الٓمّٓرٰ، الٓمّٓصٓ اور کہیں پانچ جیسے حٰمٓ ۝۱ عٓسٓقٓ ۝۲ پانچ سے زیادہ نہیں۔ حذف تکرار کے بعد یہ چودہ حروف ہیں۔ (ا، ح، د، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ہ، ی) ان کا مجموعہ یہ ہے: نَصٌّ حَكِيْمٌ قَاطِعٌ لَّهٗ سِرٌّ یعنی خدائے دانا کی نص قطعی ہے اور اس میں بڑا راز ہے۔ مفسرین نے حروف مقطعات کے بارے میں مختلف اقوال ذکر کیے ہیں۔

حروف مقطعات کی حقیقت کے بارے میں اقوال

اول: یہ اللہ رب العزت کے اسماء ہیں۔ چنانچہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ یوں دعا کرتے تھے: "یَا كٓهٰيٰعٓصٓ اِغْفِرْلِيْ" اے کٓھٰیٰعٓصٓ میری بخشش فرما دے۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا۔ (کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۶۸۰ کتاب الاذکار)

حضرت قتادہ بھی حروف مقطعات کو اسماء الٰہیہ قرار دیتے ہیں۔ (درمنثور جلد ۱ صفحہ ۵۸) امام بیہقی نے سدی رضی اللہ عنہ سے فواتح السور کا اسماء الٰہیہ ہونا روایت کیا ہے۔ (کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۱۲۰)

دوم: یہ حروف اسماء الٰہیہ کے رموز ہیں چنانچہ الٓمّٓ میں الف اللہ سے لام لطیف سے اور میم ملک سے رمز ہے اور کٓھٰیٰعٓصٓ میں کاف کریم سے ھاء ھَادِیْ سے یا حکیم سے، عین علیم سے اور ص صبور سے رمز ہے۔

(بروایت بیہقی عن ابن عباس کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۱۱۹)

سوم: یہ حروف قرآن کریم کے اسماء ہیں یہی سبب ہے کہ اکثر ان کے ساتھ قرآن ہی کا ذکر ہے جیسے الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ، يٰسٓ ۝۱ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲، قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱، تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝۲، الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ وغیر ذالك۔

چہارم: یہ حروفِ مقطعات امتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی مدتِ بقاء بتاتے ہیں۔ یعنی تمام حروف مقطعات کے اعداد کا مجموعہ امتِ محمدیہ کی کل مدتِ بقاء ہے اور ان کا مجموعی عدد ۳۳۸۵ ہے۔ تاہم یہ لوگوں کی اپنی اپنی آراء ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ حروف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مابین اسرار ہیں۔ ان کا حقیقی مفہوم اللہ تعالیٰ کی ذات جانتی ہے یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی۔

حروف مقطعات اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مابین راز کی باتیں ہیں:

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

امام سجاوندی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صدر اول (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین) سے یہی مروی ہے کہ یہ حروف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مابین راز ہیں۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سمیت کوئی انسان ان کا مفہوم نہیں جانتا مگر ان لوگوں کا یہ خیال غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حروف کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خطاب فرمایا جیسے: طٰهٰ ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿۲﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت نمبر۱) يٰسٓ ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿۲﴾ اگر مخاطب ہی خطاب کو نہ سمجھے تو وہ خطاب بیکار ہے جیسے عربی شخص کو ہندی میں پکارنا۔ دوسرا یہ وعدۂ الٰہی کی مخالفت ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ پھر ہم پر ذمہ داری ہے کہ آپ کو قرآن کا بیان سکھلائیں۔
(سورہ القیامہ، آیت نمبر ۱۹) (تفسیر مظہری جلد ۱ صفحہ ۱۴ مطبوعہ کوئٹہ)

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

جہاں تک ان حروف کے مخاطب یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا انہیں سمجھنا ہے تو اس میں کوئی مسلمان شک نہیں رکھتا۔
(روح المعانی جلد ۱ صفحہ ۱۰۰ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

الٓمّٓ اور دیگر حروف مقطعات اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مابین راز کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے وقت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر اتارا کہ کسی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل کو آپ کے پاس بیٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں اس پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام كٓهٰيٰعٓصٓ لے کر نازل ہوئے اور عرض کیا: کاف، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میں جان گیا، انہوں کہا: ھاء حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میں جان گیا۔ انہوں نے کہا یا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میں سمجھ گیا۔ انہوں نے کہا: عین آپ نے فرمایا: مجھے خبر ہوگئی ہے۔ انہوں نے کہا: صاد، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میں جان گیا۔ حضرت جبریل امین علیہ السلام نے حیرت سے کہا کہ میں نے کچھ نہیں جانا اور آپ سب کچھ جان گئے۔ (روح البیان جلد ۱ صفحہ ۲۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی) دراصل پوسٹ مین نہیں جانتا کہ خط میں کیا لکھا ہے:

حضرت ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ مشہور درسی کتاب ''نورالانوار'' میں فرماتے ہیں:

''ان حروف کا معنی معلوم نہ ہونا امت کے حق میں ہے۔رہا حضور ﷺ کا معاملہ تو آپ کو ان کا مفہوم معلوم ہے ورنہ خطاب کا مقصد فوت ہو گیا اور زنجی کے عربی کے ساتھ کلام کرنے کی صورت لازم آئی۔''

(نور الانوار بحث المتشابہ صفحہ ۹۷ مطبوعہ پشاور)

قرآن میں حروف مقطعات کے رکھے جانے کی حکمتیں:

اگر سوال کیا جائے کہ جب یہ حروف ایک راز کی بات ہیں اور امت میں سے کوئی شخص ان کا معنی نہیں جانتا تو انہیں قرآن میں کیوں رکھا ہوا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حروف مقطعات کے قرآن میں رکھے جانے کی حکمتیں یہ ہیں۔

اول: یہ کہ مخلصین اور معترضین کے درمیان فرق واضح کر دیا جائے کہ کون ہے جو معنی سمجھے بغیر ایمان لے آیا اور کون ہے جس نے کہا جب ان کو ہم سمجھتے ہی نہیں تو ان کے نزول کا کیا فائدہ ہے۔

دوم: انسان کو باور کرایا جائے کہ وہ کلام خداوندی کو کما حقہ سمجھنے سے قاصر ہے جب وہ اس کا کلام نہیں سمجھ سکتا تو اس کی ذات کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔

سوم: اللہ رب العزت جانتا تھا کہ قرآن عرب وعجم میں پڑھا جائے گا اہل عجم اکثر قرآن کا مفہوم نہیں سمجھتے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حروف مقطعات رکھ دیئے جنہیں اہل عرب بھی نہیں سمجھ سکتے یوں سب کو یہ درس دیدیا گیا کہ تم قرآن کا مطلب ومعنی سمجھو یا نہ سمجھو بہر حال اس کی تلاوت کے سننے اور پڑھنے کا ثواب ملتا ہی رہتا ہے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ کسی دوائی میں کیا اجزاء ملائے گئے اور ان سے دوائی تیار کی گئی ہے، یہ مریض کو بتانا ضروری نہیں۔ہم ہزاروں کیپسول گولیاں وغیرہ کھاتے ہیں مگر ان کے اجزاء ترکیبی سے ہم آشنا نہیں ہوتے اس کے باوجود ان کا کھانا ہمیں شفا دیتا ہے۔یونہی قرآن کریم کا مفہوم ہم سمجھ سکیں یا نہ،لیکن اس کا پڑھنا سننا یقیناً ہمیں فائدہ دیتا ہے اور ہمیں روحانی بیماریوں سے شفا دیتا ہے۔

[2] یعنی قرآن ایسی کتاب ہے جس کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔اگرچہ اس میں لاکھوں لوگ شک کرتے ہیں اور وہ اسے کلام الٰہی نہیں مانتے لیکن اگر وہ ذرا بھی انصاف سے کام لیں تو ان کا شک ٹھہر نہیں سکتا، چنانچہ اللہ نے فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴿۲۳﴾ اے منکرو! اگر تم اس کتاب میں شک رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندۂ خاص (محمد مصطفیٰ ﷺ) پر اتاری تو اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اپنے سارے مددگاروں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ایسا ہر گز نہیں کر سکتے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔(سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۳)

قرآن کا یہ چیلنج چودہ صدیوں سے زائد عرصہ گزرا آج تک قائم ہے مگر کوئی شخص قرآن جیسی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی کوئی نہ لا سکا۔پھر قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کیا شک کیا جا سکتا ہے۔

پھر جب قرآن اترا تو اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی۔فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴿۹﴾ بے شک ہم نے قرآن اتارا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔(سورہ حجر، آیت نمبر ۹) اس کے برخلاف پہلی آسمانی کتابوں کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ نہ لی لوگوں کے ذمے رکھی۔جیسے فرمایا: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ (سورہ مائدہ، آیت نمبر ۴۴) لہٰذا پہلی کتابوں میں لوگوں نے تحریف کردی اور ان میں ہزار ہا شکوک آ گئے مگر قرآن کا محافظ جب خود اس کا اتارنے والا رب ہے تو اس میں کسی شک کے آنے کی گنجائش ختم کردی گئی۔لَا رَيْبَ فِيْهِ سے تین فوائد حاصل ہوئے۔

ایمان بالقرآن اور عقیدہ عدم تحریف قرآن:

قرآن کریم کی کسی آیت کے منزل من اللہ ہونے میں شک کا اظہار کفر ہے، یہ اس طرح ہے جیسے سارے قرآن کو مشکوک قرار دیا جائے۔ایک آیت سے انکار سارے قرآن سے انکار ہے، ایک آیت کا منکر اسی طرح کافر و مرتد ہے جیسے سارے قرآن کا منکر یہاں سے عدم تحریف قرآن کی بشارت بھی معلوم ہوئی۔یعنی لَا رَيْبَ فِيْهِ کہہ کر گویا پیش گوئی کردی گئی کہ قرآن تا قیامت ہر طرح کی تحریف و تبدیل سے محفوظ رہے گا۔کوئی شخص اس سے کچھ نکال سکے گا نہ کچھ داخل کر سکے گا۔لہٰذا جو لوگ قرآن کو محرف مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قرآن کو جب صحابہ نے جمع کیا تو وہ آیات جن میں بارہ ائمہ اہل بیت کے نام لکھے تھے ان کو انہوں نے قرآن سے نکال دیا ایسے لوگوں کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

عدالتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین:

صداقتِ قرآن سے صداقتِ صحابہ کرام ظاہر ہوئی کہ قرآن مجید سب سے پہلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اللہ کے رسول ﷺ سے حاصل کر کے امت کو دیا۔وہ ہم تک قرآن کے پہنچنے کی سند کے پہلے راوی ہیں، جب قرآن میں شک نہیں تو قرآن کے راویوں کے ایمان اور کردار میں کیسے شک کیا جاسکتا ہے۔بلکہ ان کے ایمان و عمل پر اعتراض لانا قرآن کو ناقابل حجت قرار دینے کے برابر ہے۔جس حدیث کا مرکزی راوی جھوٹا ہو وہ حدیث حجت نہیں بن سکتی تو قرآن کے پہلے راویوں کے ایمان سے انکار حقیقت میں قرآن سے انکار ہے۔

[3] اس جگہ قرآن کریم کو صرف متقین کیلئے ہدایت کہا گیا۔دوسری جگہ ارشاد ہوا: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو سب لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔(سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۸۵) بلکہ اس سے بڑھ کر فرمایا گیا: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا﴿۱﴾ ''برکت والا ہے وہ رب جس نے اپنے بندہ خاص پر فرقان اتارا تا کہ وہ تمام جہانوں کیلئے ڈرانے والا ہو''

(سورہ فرقان آیت نمبر ۱)

اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن تمام لوگوں کے لیے بلکہ تمام جہانوں کے لیے ہدایت ہے تو پھر یہاں صرف هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴿۲﴾ کہنے کا کیا معنی ہے اور یہ سوال بھی ہے کہ متقین تو پہلے ہی ہدایت پر ہوتے ہیں انہیں ہدایت کی کیا

ضرورت، ہدایت تو غیر متقین کیلئے ہونی چاہیے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے اس کتاب کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے والے متقین بن جاتے ہیں۔ جیسے کہا جائے یہ کتاب ایم اے کی ڈگری والوں کیلئے ہے تو معنی یہ ہے کہ اسے پڑھنے والے ایم اے پاس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح قرآن پر عمل کرنے والے متقین بن جاتے ہیں چنانچہ قرآن کے پڑھنے والے سارے عالم کے رہنما بن گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے تو قرآن مجید کی تعلیم سے ''صدیق اکبر'' بن گئے، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ''فاروق اعظم'' ہو گئے، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ''ذوالنورین'' اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ''حیدر کرار'' کا درجہ حاصل کر لیا۔

قرآن مجید کے پڑھنے والے امام اعظم، امام بخاری، امام غزالی، سیدنا غوث اعظم، مجدد الف ثانی، داتا علی ہجویری اور معین الدین چشتی رحمہم اللہ جیسے محدثین، مجتہدین، اولیاء کاملین اور اغواث زمانہ بن گئے۔ دنیا کی کوئی کتاب لاؤ جس کے پڑھنے والوں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جیسے قرآن نے پیدا کیے اور چند نہیں لاکھوں کروڑوں میں پیدا کیے۔ یہ معنی ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ کا، اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید اگرچہ تمام جہانوں کیلیے ہدایت ہے مگر اس سے وہی ہدایت پاتے ہیں جن کے دلوں میں تقویٰ یعنی خوف خدا ہو۔

تقویٰ کے تین درجات

یاد رہے متقین وہ ہیں جو سب سے پہلے ان عقائد سے بچیں جو انسان کو کفر تک لے جائیں۔ یہ تقویٰ کا سب سے پہلا تقاضا ہے جس کے بغیر نجات ممکن نہیں، اسی لیے قرآن پاک میں جنت کے بارہ میں فرمایا گیا:

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ ''جنت کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے، اسے متقین کے لیے تیار کیا گیا ہے۔'' (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۳۳) اب ظاہراً یہاں متقین کا معنیٰ مؤمنین ہے، کیونکہ جنت میں تمام مؤمنین نے جانا ہے اور وہ سب مؤمنین کے لیے تیار کی گئی ہے، گویا یہاں متقین کا معنیٰ ہے کفر و شرک اور عقائد باطلہ سے بچنے والے۔

اس کے بعد تقویٰ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ متقین وہ ہیں جو قطعی حرام چیزوں اور مشتبہ چیزوں سے بچتے ہیں، یہ تقویٰ کا دوسرا درجہ ہے، یہ تقویٰ عمل کے میدان میں درجہ فرض پر ہے اور تقویٰ کا سب سے اعلیٰ درجہ ہر اس چیز سے بچنا ہے جو اللہ اور اس کے نیک بندوں کی ناپسندیدہ ہے خواہ وہ حرام ہو یا مکروہ، اور تقویٰ کا یہ درجہ سنت کے حکم میں ہے۔

تقویٰ کا مقام دل ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہے ورنہ سارا جسم خراب ہے اور وہ دل ہے۔'' (بخاری کتاب العلم)

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ۙ

جو بن دیکھی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں[4] اور نماز قائم کرتے اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔[5]

[4] جب کہا گیا کہ قرآن متقین کیلئے ہدایت ہے تو اب بتایا جارہا ہے کہ متقین کون ہیں۔ تو سب سے پہلے ان کی صفت ایمان بیان کی جارہی ہے۔ کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں تو فرمایا گیا کہ متقین غیب پر ایمان رکھتے ہیں، تو اب یہ بتانا ضروری ہے کہ ایمان کیا ہے اور غیب کیا چیز ہے۔

ایمان کی حقیقت کیا ہے؟

امام ابوحنیفہ اور دیگر آئمہ کا یہی مسلک ہے کہ توحید و رسالت پہ دل کی تصدیق اور زبان کا اقرار ان دونوں کا نام ایمان ہے، یعنی جو شخص لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اس کا اقرار نہ کرلے شرع کے نزدیک مومن نہیں، علامہ عینی فرماتے ہیں زبان کا اقرار بعض فقہاء کے نزدیک ایمان کا رکن نہیں ہے، بلکہ یہ قبول ایمان کی شرط ہے۔ امام نسفی فرماتے ہیں یہی امام ابوحنیفہ سے مروی ہے۔ امام اشعری اور امام ماتریدی کا بھی یہ مسلک ہے اور بعض فقہاء زبان کے اقرار کو ایمان کا رکن اصلی نہیں رکن زائد مانتے ہیں۔ رکن اصلی صرف تصدیق قلبی ہے۔ (میرے خیال میں رکن زائد اور شرط ایک ہی چیز ہیں لفظی اختلاف ہے۔ محمد طیب) اسی لیے حالتِ مجبوری میں زبان کا اقرار ساقط ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ

(سورہ نحل، آیت نمبر ۱۰۶) (عمدۃ القاری شرح جلد اول صفحہ ۱۰۳)

غیب کا معنیٰ اور علم غیب کا مفہوم:

غیب کا لغوی معنی چھپی چیز ہے اور اصطلاح میں غیب وہ ہے جسے ہمارے حواس خمسہ نہ پاسکیں اور نہ وہ عقل میں آئے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں جو چیز حواس میں نہ آئے اور نہ اسے بداہتِ عقل مانے وہ غیب ہے۔

(روح المعانی جلد اول صفحہ ۱۱۴)

اور امام اصفہانی فرماتے ہیں غیب وہ ہے جسے حواس اور عقل قبول نہ کرے اور اسے صرف انبیاء کرام علیہم السلام کی خبر ہی سے جانا جاسکے۔ (مفردات القرآن صفحہ ۳۸۱ مطبوعہ تہران)

گویا اللہ رب العزت انبیاء کو غیب کی باتوں پہ مطلع فرماتا ہے اور وہ اپنی امت کو اس کی خبر دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ "خدائے غیب داں اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا مگر جس رسول پر وہ راضی ہو (اسے غیب پر مطلع کرتا ہے)" (سورہ جن، آیت نمبر ۲۶-۲۷)

اسی لیے نبی کا معنی ہے غیب کی خبریں دینے والا۔ قرآن میں ہے: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ یہ

غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۴۴)

تو یہ کہنا کہ نبی کو غیب کی خبر نہیں ہوتی یہ اس کی نبوت ہی سے انکار ہے۔ پھر جو اولیاء کاملین خود کو اطاعت رسول میں فنا کر دیتے ہیں ان کے قلوب بھی مشکوٰۃِ نبوت سے جگمگانے لگتے اور ان سے غیب کے پردے اٹھنے لگتے ہیں۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بندے کو جب قرب نوافل ملتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی آنکھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے کان بن جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے پھر وہ ترقی کر کے قرب فرائض حاصل کرتا ہے تو غیب اس کیلئے شہود اور مفقود مثل موجود ہو جاتا ہے۔ (روح المعانی جلد اول صفحہ ۱۱۴ زیر آیت الذین یومنون بالغیب)

فضیلتِ آخرین امت:

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ سے ان پچھلے لوگوں کی فضیلت ظاہر ہوئی جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد آئے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بن دیکھے مانا اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مبارک ہے اس شخص کو جو مجھے دیکھے اور مجھ پر ایمان لائے اور سات مرتبہ مبارک ہے اس شخص کو جو بن دیکھے مجھ پر ایمان لائے۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۱۵۵)

صحابی رسول حضرت ابو جمعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایک بار ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی ہمارے ساتھ تھے انہوں نے پوچھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کوئی قوم ہم سے بھی بہتر ہے جبکہ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کے ساتھ مل کر جہاد کیا؟ آپ نے فرمایا ہاں جو لوگ تمہارے بعد آئیں گے اور مجھے دیکھے بغیر مجھ پر ایمان لائیں گے۔
(سنن دارمی جلد ۲ صفحہ ۳۰۸ کتاب الرقائق مطبوعہ دار الفکر)

ان احادیث سے کوئی شخص یہ دلیل نہ پکڑے کہ پھر صحابہ کے بعد والے مومنین صحابہ سے افضل ٹھہرے، اس لیے کہ پچھلے لوگوں کو صرف ایک فضیلت حاصل ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھے بغیر آپ پر ایمان لانا اور اس فضیلت کا ثواب بھی ہم نفس وشیطان کی شرارتوں سے برباد کر لیتے ہیں۔ نفاق، عدم اخلاص اور اخلاقِ ذمیمہ سے ہم اپنا ایمان اس قدر کمزور کر لیتے ہیں کہ ہم سب کا ایمان ایک صحابی کے ایمان کے ہم وزن نہیں ہوسکتا۔

جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اخلاص وللّٰہیت کے سبب ان کی نیکیوں کا اجر اس قدر زیادہ تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو وہ میرے ایک صحابی کے ایک مد یا آدھا مد جو کے خرچ کرنے کے برابر نہیں ہوسکتا۔'' (مسلم کتاب الایمان) پھر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کیلئے قرآن نے وعدۂ جنت فرمایا: وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ (سورہ حدید، آیت نمبر ۱۰)

کون سا ایمان معتبر ہے؟

اَلَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ملک الموت کو دیکھ کر ایمان لانا مفید نہیں کیونکہ وہ ایمان

بالغیب نہیں۔فرعون نے بھی بوقتِ غرق ایمان ظاہر کیا تھا مگر اس کا ایمان قبول نہ کیا گیا۔(سورہ یونس، آیت نمبر ۹۱) کیونکہ بوقتِ موت انسان پر عالم آخرت ظاہر ہوجاتا ہے اور فرشتے اور جنت ونار اسے سب کچھ نظر آجاتا ہے، جبکہ اللہ کے ہاں بن دیکھے غیب پر ایمان لانا معتبر ہے۔جو دیکھ کر ماننے اس نے اللہ اور اس کے رسول پر اعتبار نہیں کیا بلکہ اپنی آنکھوں پر اعتبار کیا ہے۔

[5] ایمان کے بعد متقین کی دوسری صفت اقامت صلوٰۃ بتائی جارہی ہے۔اس سے نماز کی اہمیت معلوم ہوئی کہ ایمان کے بعد مومن کا پہلا فرض اقامت صلوٰۃ ہے۔اقامت صلوٰۃ یہ ہے کہ اس کے پانچ تقاضے پورے کیے جائیں۔

اول: نماز کو اس کے تمام ارکان وواجبات اور سنن کے مطابق ادا کیا جائے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نماز کے رکوع وسجود پورے اور تلاوت درست کرنا اقامت صلوٰۃ ہے۔(درمنثور)

دوم: نماز کے باطنی آداب کا لحاظ رکھنا یعنی خشوع وخضوع اور کامل توجہ سے نماز پڑھنا۔قرآن میں ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ (سورہ مومنون، آیت نمبر ۱) حدیث میں قربِ قیامت کی نشانی بتائی گئی ہے کہ مسجدیں لوگوں سے بھری ہوں گی مگر دل خشوع سے خالی ہوں گے۔

سوم: پابندی کے ساتھ ادا کرنا قرآن میں ہے: الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝۲۳ (سورہ معارج، آیت نمبر ۲۳) حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى (سورہ بقرہ آیت ۲۳۸) کبھی نماز پڑھنا اور کبھی چھوڑ دینا اقامت صلوٰۃ نہیں ہے۔

چہارم: ان محرمات سے بچنا جن سے نماز کا اجر ضائع ہوجاتا ہے، حرام روزی کھا کر اور حرام لباس پہن کر جو نماز پڑھی جائے اس کی قبولیت کی کم ہی توقع ہے۔

پنجم: نماز نہ صرف خود پڑھنا بلکہ بقدر طاقت معاشرے میں نماز قائم کرنا یعنی دوسروں کو نماز کی تلقین کرنا، جیسے اللہ فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (سورہ حج، آیت نمبر ۴۱)

دینِ اسلام میں نماز کی اہمیت وفرضیت:

نماز کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ باقی تمام احکام دین زمین پہ اتارے گئے مگر نماز کی فرضیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرش سے اوپر اپنے حظیرۃ القدس میں بلایا اور نماز کو آپ کی امت کے لیے بطور تحفہ عطا فرمایا۔اب اگر کسی دوست کو آپ پیارا سا تحفہ دیں اور وہ آپ کے تحفہ کو توڑ ڈالے تو آپ کے دل پہ کیا گزرے گی آپ کا دل ٹوٹ جائے گا محبت کا آبگینہ ٹوٹ جائے گا۔یہاں اللہ رب العزت اپنے بندے کو نماز کا تحفہ دے رہا ہے، اگر بندہ اس کی قدر نہ کرے اور اس حکم کو توڑے تو اللہ کی ناراضگی کا کیا عالم ہوگا؟

حدیث میں ہے: اول ما یحاسب به العبد یوم القیامة الصلوٰة، ''روز قیامت بندے سے سب سے

پہلے نماز کے بارہ میں حساب لیا جائے گا۔" (نسائی کتاب الصلوٰۃ، مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۶۵) پوری حدیث یوں ہے کہ اگر بندے کی نماز درست ہوگئی تو اللہ تعالیٰ باقی سوالات میں بھی آسانی کر دے گا اور اگر نماز درست نہ ہوئی تو باقی سوالات بھی سخت ہو جائیں گے۔

روز محشر کہ جان گداز بود　　اولیں پرسش نماز بود

نماز دین کا ستون ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: الصلوٰۃ علی وقتھا ومن ترك الصلوٰۃ فلا دین له والصلوٰۃ عماد الدین، نماز کا وقت پر پڑھنا اللہ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل ہے، اور جس نے نماز ترک کر دی اس کا کوئی دین نہیں اور نماز دین کا ستون ہے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۷۵۸ بروایت بیہقی فی شعب الایمان)

اعمال دین میں سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سب سے زیادہ ذکر نماز کا فرمایا ہے، قریباً ۸۲ بار نماز کا حکم قرآن میں وارد ہوا ہے، کسی اور عمل کے بارہ میں اللہ نے اس قدر تاکید نہ فرمائی، تو ایک نماز جان بوجھ کر ترک کرنا اللہ کے بیاسی احکام کو توڑنا ہے، اور اللہ کے ایک واضح حکم کا توڑنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

نماز قائم کرنے کا اجر و ثواب:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"لوگو مجھے بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پہ نہر بہتی ہو اور وہ اس میں سے روزانہ پانچ بار غسل کرے تو کیا اس کے بدن پر کوئی میل رہ جائے گی؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے جسم پر تو کچھ بھی میل نہیں رہے گی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فذالك مثلُ الصلوٰۃ یمحو اللہُ بھا الخطایا، یہی نماز کی مثال ہے اللہ اس کے ذریعہ خطائیں مٹا دیتا ہے۔" (بخاری باب مواقیت الصلوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الصلواتُ الخمسُ والجمعۃُ الی الجمعۃِ کفارۃٌ لما بینھن مالم تُغشَ الکبائرُ، پانچ نمازیں اور جمعہ کے بعد جمعہ یہ اپنے درمیان والے تمام گناہوں کا کفارہ ہے جب تک کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ (مسلم کتاب الصلوٰۃ)

حضرت ابوعثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا، انہوں نے درخت کی ایک ٹہنی کو پکڑ کر جھنجوڑا تو اس کے سارے پتے گر گئے (موسم خزاں میں ایسا ہوتا ہے) پھر انہوں نے کہا: اسی طرح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسکی ایک شاخ کو پکڑ کر جھنجوڑا تو اس کے سارے پتے جھڑ گئے،

آپ ﷺ نے فرمایا:
''اے سلمان! جو مومن اچھی طرح وضو کرے پھر پانچ نمازیں ادا کرے اسکے گناہ اسی طرح جھڑ جاتے ہیں جیسے یہ پتے جھڑ گئے پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ''دن کی دونوں طرفوں میں نماز قائم کرو اور رات کے پہروں میں، بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۷۰)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا، آپ نے خطبہ میں فرمایا: اس رب کی قسم جس کے قبضہ میری جان ہے، یہ آپ نے تین بار کہا، پھر حضور ﷺ پہ گریہ طاری ہو گیا اور آپ سر جھکا کر رونے لگے، تو ہم میں سے ہر شخص رونے لگا، پھر حضور ﷺ نے سر اٹھایا تو آپ کے چہرے پہ خوشی کے آثار تھے، جس سے ہمیں اس قدر خوشی ہوئی جیسے ہمیں سرخ اونٹ مل گئے ہوں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص پانچ نمازیں ادا کرتا ہے، رمضان کے روزے رکھتا ہے، زکوٰۃ دیتا ہے اور سات بڑے گناہوں سے بچتا ہے اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جائیں گے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا ﴿۳۱﴾ ''اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچو جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت والے مقام میں داخل کریں گے۔''
(سورہ نساء، آیت نمبر ۳۱) (الترغیب جلد اول صفحہ ۲۳۷)

نماز ترک کرنے کا گناہ:

کسی عذر کے بغیر جان بوجھ کر نماز ترک کر دینا گناہ کبیرہ ہے، جس کی سزا بہت سخت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا ﴿۵۹﴾ ''تو انبیاء کے بعد ایسے نالائق لوگ آئے جنہوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے، وہ عنقریب غیّ (جہنم کا طبقہ) میں ڈالے جائیں گے۔'' (سورہ مریم، آیت نمبر ۵۹)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
من حافظ علی الصلوٰۃ کانت لہ نورا و دلیلا و نجاۃ و من لم یحافظ علیها لم یکن لہ نور ولا دلیل ولا نجاۃ و کان مع قارون و فرعون و ھامان و ابی بن خلف. ''جس نے نماز کی حفاظت کی تو نماز اس کیلئے نور اور دلیل اور نجات ہوگی اور جس نے نماز کی حفاظت نہ کی اس کے لیے کوئی نور نہ ہوگا نہ دلیل اور نہ نجات، اور وہ قارون فرعون ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۱۲۹)

شارحین اس حدیث کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ قارون دولت دنیا اکٹھی کرنے میں لگ کر اللہ تعالیٰ سے غافل

ہوگیا، فرعون کونشۂ اقتدار نے اپنے رب سے بیگانہ کر دیا، ہامان فرعون کا وزیر اعظم تھا گویا وہ اچھی ملازمت کے مل جانے کے سبب اللہ سے بے خوف ہوگیا۔ اور ابی بن خلف عرب کا مشہور تاجر تھا اس کی تجارت اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل ہوگئی، تو جو شخص کثرت دولت میں ڈوب کر نماز چھوڑ دے وہ قیامت کو قارون کے ساتھ کھڑا ہوگا۔ بے نماز بادشاہ اور حکمران فرعون کے ساتھ ہونگے، اچھی ملازمت کے خمار میں نماز چھوڑنے والے ہامان کے ساتھی ہونگے اور تجارت کی مصروفیتوں میں کھو کر نماز کو ترک کر دینے والے لوگوں کا انجام ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا، اللہ کی پناہ۔

آگے فرمایا گیا: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

یعنی مومنین اللہ کے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس وسعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کے نزدیک اس سے زکوٰۃ مراد ہے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اس سے تمام مالی فرائض مراد لیتے ہیں۔ (جیسے زکوٰۃ، عشر فطرانہ، نذر واجب، قربانی وغیرہ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے مرد کا اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنا مراد ہے اور بعض مفسرین کے نزدیک اس کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر خرچ کیا جائے خواہ وہ صدقات واجبہ وحقوق مالیہ ہوں یا صدقات نافلہ، اور اس کی ایک تفسیر یہ ہے کہ نہ صرف اللہ کے دیئے ہوئے مال ہی میں سے خرچ کیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جو نعمت بھی عطا فرمائی ہے اس کا کچھ حصہ اللہ کی راہ میں ضرور خرچ کیا جائے مثلاً اللہ نے اولاد دی ہے تو ان میں سے کسی ایک کو دین کیلئے وقف کرنا، اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے تو اس سے دین کی تبلیغ کرنا، بدنی طاقت کو راہ حق میں جہاد پر لگانا بلکہ اللہ کی دی ہوئی جان کو اس کے دین پر قربان کرنا یہ سب وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ میں داخل ہے اور یہ تفسیر بہت وسیع اور جامع ہے کیونکہ رَزَقْنٰهُمْ ہر اس نعمت کو شامل ہے جو اللہ بندے کو دے۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ میں یہ اشارہ ہے کہ بندہ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اللہ پر کوئی احسان نہیں کرتا بلکہ اللہ ہی کے دیئے ہوئے میں سے اسے کچھ لوٹاتا ہے تو احسان کیا ہوا۔ اس کی راہ میں جان بھی دے دی جائے تو کوئی احسان نہیں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ

اور (اے پیارے حبیب! صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کی طرف اور جو آپ سے قبل کلام اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں [6] اور روزِ

هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ [7] وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔ [8]

[6] الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ میں قرآن سے بات چلی تھی اب لوٹ کر قرآن ہی پہ آ گئی ہے۔

تو فرمایا کہ اے پیارے محبوب ﷺ! جو کچھ آپ پر اتارا گیا خواہ وہ قرآن کی صورت میں ہو یا حدیث کی صورت میں اور جو کچھ آپ سے پہلے انبیاء پر اتارا گیا مومنین اس سب پر ایمان رکھتے ہیں۔

حجیتِ حدیث:

بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ میں قرآن کے ساتھ حدیث بھی آ گئی کہ وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے اتاری گئی ہے۔ اس لئے حضور ﷺ کو صرف کتاب کا معلم نہیں بنایا گیا، حکمت کا معلم بھی بنایا گیا۔ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ آپ مومنوں کو کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۲۹)

معلوم ہوا حضور ﷺ کو قرآن کے سوا بھی علوم دیئے گئے جو قرآن ہی کی تشریح میں ہیں۔ اسی لیے آپ نے فرمایا مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل اور دیا گیا۔ (سنن بیہقی جلد ۹ صفحہ ۳۳۲ کتاب الضحایا) تو جو لوگ حدیث کو مطلقاً حجت نہیں مانتے وہ نہ صرف گمراہ ہیں، بلکہ صدہا آیات و احادیث سے انکار کے سبب دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

ایمان بالکتب:

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ سے پتہ چلا پہلے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل شدہ کسی کتاب کے منزل من اللہ ہونے کا انکار بھی قرآن کے انکار کی طرح کفر ہے، یہود نے کہا: نؤمن بما انزل علینا ہم صرف اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اتارا گیا وَیَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ اور اس کے سوا کا وہ انکار کرتے ہیں۔ یہی حال نصاریٰ کا ہے مگر قرآن مجید کہتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا اس پر ایمان لاؤ۔ اس سے قرآن اور اسلام کی صداقت ظاہر ہوئی۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں؟ فرمایا ایک سو چار، شیث علیہ السلام پر چالیس، ادریس علیہ السلام پر تیس، ابراہیم علیہ السلام پر دس، موسیٰ علیہ السلام پر نزولِ تورات سے قبل دس صحائف اور تورات زبور انجیل اور قرآن۔

ختمِ نبوت اور ردِّ قادیانیت:

یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ سے عقیدۂ ختم نبوت بھی ظاہر ہوا کہ اگر حضور ﷺ کے بعد بھی وحیٔ نبوت کا سلسلہ جاری تھا تو اس کے ساتھ یہ بھی ضرور کہا جاتا وَمَا یُنَزَّلُ بَعْدَكَ کہ اے پیارے نبی! جو آپ کے بعد اتارا جائے گا اس پر بھی مومنین ایمان رکھتے ہیں۔ معلوم ہوا آپ کے بعد وحیٔ نبوت کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے۔ جب وحی نہیں اتر سکتی تو نبوت کیسے ہو سکتی ہے؟ لہٰذا آپ کے بعد جو وحی کا دعویٰ کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے

جیسے مرزا قادیانی نے کہا میں جو وحیِ خدا سنتا ہوں اسے بخدا میں ہر خطا سے پاک جانتا ہوں میں اسے قرآن ہی کی طرح ہر خطا سے منزہ مانتا ہوں۔ بخدا یہ بھی کلام مجید ہے جو خدائے پاک و وحید کے منہ سے نکلا ہے، انبیاء کرام علیہم السلام اگرچہ

بہت ہوئے مگر میں بھی عرفان میں کسی سے کم تر نہیں۔ اللہ نے جو جام سب انبیاء کو (تقسیم کر کے) پلایا وہ پورا مجھ کو تنہا پلایا۔ (نزول مسیح مندرجہ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۷۷ مطبوعہ لندن) ایسے دعوؤں کے بعد مرزا قادیانی کا اسلام سے کیا واسطہ ہے؟

انقطاعِ وحی قرآن کی روشنی میں:

قرآن مجید میں مزید کئی مقامات پر یہی مضمون وارد ہوا ہے کہ اہل ایمان رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی پر ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے قبل اترنے والی وحی پر ایمان رکھتے ہیں جیسے فرمایا گیا: وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ اور اہل ایمان اس وحی پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر اتاری گئی اور جو آپ سے قبل اتاری گئی۔ (سورہ نساء، آیت نمبر ۱۶۲)

اور فرمایا گیا: حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ② كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ③ ''اسی طرح آپ کی طرف اور آپ سے پہلے رسولوں کی طرف اللہ ہی وحی نازل فرمانے والا ہے۔'' (سورہ شوریٰ، آیت مبارکہ ۱ تا ۳)

مزید ارشاد ہوا: وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ⑥⑤ اور تحقیق آپ کی طرف اور آپ سے پہلے رسولوں کی طرف وحی کی گئی کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارے اعمال ضبط ہو جائیں گے اور تم نقصان اٹھانے والوں میں ہو جاؤ گے۔ (سورہ زمر، آیت نمبر ۶۵)

معلوم ہوا کہ وحی کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کی طرف جاری ہوا اور آپ سے قبل انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف جاری ہوا، آپ کے بعد وحی کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، جب وحی نہیں ہے تو نبوت کہاں سے آئے گی۔

انقطاعِ وحی احادیث مبارکہ کی روشنی میں:

پھر حدیث میں انقطاعِ وحی پہ صریح ارشادات رسول اللہ ﷺ وارد ہیں، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ذهبت النبوة والرسالة فلا رسول بعدى ولا نبى، نبوت اور رسالت ختم ہوگئی ہیں، اب میرے بعد نہ کوئی نبی ہے نہ کوئی رسول، لوگوں کو یہ بات بھاری محسوس ہوئی، آپ نے فرمایا: ہاں مبشرات باقی ہیں، انہوں نے عرض کیا: وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ سچی خوابیں ہیں جو ایک مومن دیکھتا ہے۔ (ترمذی)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنے حجرے کا پردہ اٹھایا اور فرمایا:

ايها الناس انه لم يبق من مبشرات النبوة الا الرؤيا الصالحة، ''اے لوگو! نبوت کی مبشرات میں سے کچھ باقی نہیں رہا سوا اچھے خواب کے، جسے ایک مسلمان دیکھتا ہے یا اس کے حق میں اسے دیکھا جاتا ہے۔''
(مسلم کتاب الصلوۃ، سنن ابی داود کتاب الصلوۃ، سنن ابن ماجہ کتاب الرؤیا)

اسی طرح ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
لا یبقی بعدی من النبوۃ شیء الا الرؤیا الصالحۃ، ''میرے بعد نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا سوا اچھے خواب کے۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد ۶ صفحہ ۱۲۹)

ان تمام احادیث کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاء و مرسلین کو اللہ کی طرف سے جن ذرائع سے پیغامات ملتے تھے اور وحی حاصل ہوتی تھی وہ سب ذرائع منقطع ہو گئے ہیں، ہاں انبیاء و مرسلین کو اچھے خواب آتے تھے وہ اب بھی جاری ہیں، اور یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے کہ نبی کا خواب وحی الٰہی ہوتا ہے، اور وہ جھوٹا خواب نہیں ہو سکتا، اور غیر نبی کے خواب کی یہ حیثیت نہیں ہے۔

انقطاعِ وحی اقوالِ صحابہ کی روشنی میں

جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منکرین زکوٰۃ و مدعیانِ نبوت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو حالات کی نزاکت کے تحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو اس بارہ میں کچھ توقف کا مشورہ دیا تو وہ کہنے لگے: انہ انقطع الوحی وتم الدین اینقص وانا حی، یعنی وحی منقطع ہو گئی اور دین مکمل ہو گیا تو کیا اب میرے سامنے دین کو ناقص کیا جائے گا؟۔ (مشکوۃ باب مناقب عمر صفحہ ۵۵۶ مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سر منبر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:
ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قد انطلق وقد انقطع الوحی۔ ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے ہیں اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ ۴۱ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

وحی کا انقطاع خود مرزا غلام احمد قادیانی کی زبانی:

مرزا غلام احمد قادیانی بذات خود اپنی کتابوں میں دعویٰ نبوت سے پہلے اس بات پہ زور دیا کرتا تھا کہ وحی کا دروازہ بند ہو گیا ہے، مگر اس کے بعد سن 1908ء میں اس نے اپنی سابقہ تحریروں کو بھلا کر حصولِ وحی و نبوت کا دعویٰ کر دیا، بہر حال اس نے لکھا: میرا یقین ہے کہ وحی رسالت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوئی اور جناب رسول اللہ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ ختم ہو گئی۔ (مجموعہ اشتہارات مرزا غلام احمد قادیانی جلد اول صفحہ ۲۳۱، مطبوعہ لندن) اسی طرح اس نے کہا:
اور کیونکر ممکن تھا کہ خاتم النبیین کے بعد کوئی اور نبی اسی مفہوم تام اور کامل کے ساتھ جو نبوت کی شرائطِ تامہ میں سے ہے آسکتا، لیکن وحی نبوت پہ تو تیرہ سو سال سے مہر لگ گئی ہے، کیا یہ مہر اس وقت ٹوٹ جائیگی۔
(ازالہ اوہام مندرجہ روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۳۸۷ مطبوعہ لندن)

مزید مرزا غلام احمد قادیانی لکھتا ہے:
اور ظاہر ہے کہ یہ بات مستلزم محال ہے کہ خاتم النبیین کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کی وحی رسالت کے ساتھ آمد و رفت شروع ہو جائے۔ (ازالہ اوہام مندرجہ روحانی خزائن جلد ۳ صفحہ ۴۱۴)

مرزا قادیانی کی یہ تحریرات جو 1891ء کے زمانہ میں لکھی گئیں کس قدر واضح کہہ رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد وحی رسالت کا سلسلہ بند کر دیا گیا ہے، مگر بعد میں اسی مرزا قادیانی نے ۱۹۰۱ء میں بابانگِ دہل اعلانِ نبوت کر دیا اور وحی کے آنے کا بھی دعویٰ کر دیا، تو اس سے بڑا دجل اور کیا ہو سکتا ہے۔

مرزا قادیانی کا حصول وحی پہ بلند بانگ کافرانہ دعویٰ:

مرزا قادیانی اپنی کتاب ایک غلطی کا ازالہ میں لکھتا ہے:

''اور میں جیسا کہ قرآن شریف کی آیات پہ ایمان رکھتا ہوں ایسا ہی بغیر فرق ایک ذرہ کے خدا کی اس کھلی کھلی وحی پر ایمان رکھتا ہوں جو مجھ پر ہوئی، جس کی سچائی اس کے متواتر نشانوں سے مجھ پہ کھل گئی ہے، اور میں بیت اللہ میں کھڑے ہو کر قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ پاک وحی جو مجھ پر نازل ہوتی ہے وہ اسی خدا کا کلام ہے جس نے حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اپنا کلام اتارا تھا، میرے لیے زمین نے بھی گواہی دی اور آسمان نے بھی، اسی طرح میرے لیے آسمان بھی بولا اور زمین بھی کہ میں خلیفۃ اللہ ہوں۔''

(ایک غلطی کا ازالہ مندرجہ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۱۰ مطبوعہ لندن)

اسی طرح مرزا قادیانی اپنے فارسی اشعار میں اپنی نام نہاد وحی کے بارہ میں یوں ملحدانہ دعویٰ کرتا ہے:

آنچہ من بشنوم زوحی خدا بخدا پاک دانمش زخطا

ہمچو قرآں منزہ اش دانم از خطایا ہمیں است ایمانم

یعنی میں جو اللہ سے سنتا ہوں اسے اللہ کی قسم میں ہر خطا سے پاک جانتا ہوں، میں اسے قرآن کی طرح ہر غلطی سے پاک جانتا ہوں، وہ سب غلطیوں سے پاک ہے، یہی میرا ایمان ہے۔

(نزول المسیح مندرجہ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۷۷ مطبوعہ لندن)

ایسے کافرانہ وملحدانہ دعوؤں کے بعد مرزا قادیانی کا اسلام اور دین وایمان اور قرآن سے کیا تعلق رہ جاتا ہے۔

[7] آخرت کیلئے یُؤْمِنُوْنَ کی بجائے یُوْقِنُوْنَ فرمایا گیا کیونکہ ایقان، ایمان سے ایک درجہ زائد ہے۔ اس میں درس ہے کہ آخرت کو صرف مانا نہ جائے بلکہ اس کو اچھی طرح یقین کے ساتھ دل میں بٹھایا جائے، کہ یہی فکر آخرت انسان کو گناہوں سے بچا سکتی ہے۔ آخرت میں جنت ونار، میزان، پل صراط، حوض کوثر اور قرآن وحدیث میں بیان کردہ تمام احوال آخرت آ گئے کہ مومنین ان سب پر ایمان وایقان رکھتے ہیں۔

[8] یعنی وہ متقین جنہوں نے قرآن سے ہدایت لی اور بن دیکھی چیزوں پر ایمان لے آئے پھر نماز قائم اور راہ خدا میں مال ومنال خرچ کرتے رہے اور حضور ﷺ پر اور آپ سے پہلے انبیاء پر اترنے والی کتابوں پر ایمان اور آخرت پر یقین والے رہے، تو ایسے ہی لوگ سچی ہدایت پر ہیں اور وہ دنیا وآخرت میں کامیابی پائیں گے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ

بیشک جنھوں نے کفر کی عادت بنا لی ان پر برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں (بہر حال) وہ ایمان

لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِهِمۡ ؕ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِهِمۡ

نہ لائیں گے۔ [9] اللہ نے اُن کے دِلوں اور اُن کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اوران کی آنکھوں پہ

غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۷﴾ ع

پردہ ہےاوراُن کے لیے بڑا عذاب ہے[10]

ع ۱ ۱

معلوم ہوا قرآن پر عمل ہی سے فلاح مل سکتی ہے آج نہ ہمارے دلوں میں قرآن والا تقویٰ ہے نہ نماز وانفاق فی سبیل اللہ ہے اگر ہے تو رسمی اور نہ قیامت پہ یقین کامل پھر ہمیں کامیابی کیسے ملے؟

[9] مومنین کے بعداب کافرین کا بیان لایا گیا ہے۔اس سے ہر کافر مراد نہیں کہ جس نے بھی ایک بار کفر کیا وہ دوبارہ ایمان نہ لائے گا اگر یہ بات ہوتی تو پھر اس آیت کے نزول کے بعد کوئی شخص ایمان ہی نہ لاتا اور نہ دین کی روشنی پھیلتی بلکہ اس کا یہ معنی ہے کہ جن لوگوں پر رسالتِ محمدیہ کی صداقت اور اسلام کی حقانیت روشن ہوگئی اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف اس سے انکار کیا بلکہ رسول خدا ﷺ کا استہزا کیا۔قرآن کا مذاق اڑایا اور اسلام کے خلاف شریک سازش اور اس کے مٹانے کے درپے ہوئے ایسے بدبختوں پر بطورِ سزا ہمیشہ کیلئے باب قبولِ حق بند کردیا گیا اور فرمایا گیا کہ اے پیارے محبوب! آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، بہر حال یہ ایمان نہ لائیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

اس سے علماء یہود مراد ہیں ان کی کتابوں میں حضور ﷺ کی صفات اور نعتیں موجود تھیں مگر انہوں نے جان بوجھ کر انہیں چھپادیا تاکہ انہیں دیکھ کر کوئی یہودی ایمان نہ لے آئے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نبی ﷺ جب یہ اپنی کتابوں کی بات نہیں مانتے تو آپ کا ڈرانا انہیں کیا نفع دے گا؟ (درمنثور جلد اول صفحہ ۷۲)

حضرت ابوالعالیہ رضی اللہ عنہ تابعی کے نزدیک اس سے سرداران مشرکینِ مکہ مراد ہیں ان پر معجزات پیش کیے گئے مگر نہ وہ خود ایمان لائے نہ اپنی قوم کو ایمان لانے دیا۔آخرکار قرآن کی پیش گوئی پوری ہوئی اور یہ لوگ ایمان لائے بغیر بدر میں قتل کردیئے گئے ان میں سے دو آدمیوں ابوسفیان اور حکم بن ابی العاص کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۷۳)

دلائلِ حق واضح ہونے کے باوجود کفر پہ قائم رہنے والے مستشرقین

راقم الحروف محمد طیب غفرلہ عرض کرتا ہے کہ یہ آیت علماء یہود وسرداران قریش سے خاص نہیں بلکہ آج بھی ایسے ہٹ

دھرم کفار موجود ہیں اور قیامت تک موجود رہیں گے جو دلائل حق واضح ہونے کے باوجود باطل کا ساتھ دیتے اور حق کے خلاف برسر پیکار رہتے ہیں جیسے دورِ حاضر کے عیسائی مستشرقین (Orienalists) کا حال ہے۔ انہوں نے حدیث وتفسیر کے تمام ذخیرے کھنگھال مارے ہیں مگر قبول حق کیلئے نہیں بلکہ نکتہ چینی وعیب جوئی اسلام کیلئے۔ انہوں نے علوم قرآن کے سمندر میں غوطے لگائے مگر خشک دامن باہر نکلے۔

ماضی قریب ہی میں ہالینڈ کے چند عیسائی علماء نے ''المعجم المفھرس لالفاظ الحدیث النبوی الشریف'' کے نام سے آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب لکھی ہے جس سے مجھ سمیت دنیا بھر کے مسلمان استفادہ کر رہے ہیں، اگر صحاح ستہ کی چھ کتب، مسند احمد بن حنبل، موطا امام مالک، اور سنن دارمی، ان نو کتب میں سے کوئی بھی حدیث ڈھونڈنی ہو تو آپ کو اس حدیث کا کوئی ایک لفظ یاد ہونا چاہیے، بس اسی لفظ کے ذریعہ آپ کو اس کتاب سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ حدیث ان نوں کتابوں میں کہاں کہاں واقع ہے، مجھے اس تفسیر کے لکھنے میں اس کتاب سے بہت مدد ملی ہے، ان عیسائی علماء نے حدیث پر اتنا بڑا کام کیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی، مگر وہ ایمان نہیں لائے، یہ ختم اللہ علی قلوبھم ہی کی ایک مثال ہے۔

اسی طرح عیسائی مستشرق جول لابوم نے ''تفصیل آیات القرآن'' کتاب لکھی جو فرانسیسی زبان میں ہے، اور قرآن کے ایک ایک لفظ کے بارہ میں بتایا کہ وہ قرآن میں کہاں کہاں واقع ہے۔

پھر مشہور مستشرق فلوجل نے ''نجوم القرآن فی اطراف القرآن'' لکھی ہے اس کتاب میں بھی قرآنی الفاظ کی فہرستیں ہیں، جن کے ذریعے سے کسی قرآنی لفظ کو تلاش کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ تو یہ لوگ قرآن میں غوطے لگاتے رہے ہیں مگر ان بدنصیبوں کے نصیب میں ایمان نہ آیا۔ ایسے سب لوگ اس آیت کا مصداق ہیں۔

اگر کہا جائے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو کیوں حکم دیا کہ ایسے لوگوں کو ڈرایا جائے، جیسا کہ اللہ رب العزت فرماتا ہے۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ (سورہ ابراہیم، آیت نمبر ۴۴) جبکہ خود ہی فرما دیا کہ بہر حال وہ ایمان نہ لائیں گے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا ڈرانا ان پر اتمام حجت کیلئے ہے تاکہ وہ روز قیامت یہ نہ کہیں۔ لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ یعنی اے اللہ تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم ذلیل ورسوا ہونے سے قبل اس کی پیروی کر لیتے۔ (سورہ طٰہٰ، آیت نمبر ۱۳۴)

اسی لیے فرمایا گیا: لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ تاکہ رسولوں کے بھیجے جانے کے بعد لوگوں کیلیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔ (سورہ نساء، آیت نمبر ۱۶۵)

اسی لیے یہاں سواء علیھم فرمایا گیا، سواء علیك نہیں فرمایا گیا، یعنی یہ نہیں فرمایا گیا اے رسول ﷺ آپ

پر برابر ہے کہ کفار کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں بلکہ فرمایا کہ ان پہ برابر ہے کہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ، مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو اپنی تبلیغ کا ثواب مل ہی جائے گا مگر ان کے لیے ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔

بعض دلوں پر قرآن کیوں اثر نہیں کرتا؟

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم بلاشبہ کتاب ہدایت ہے، اسے اللہ نے ھدًی للمتقین فرمایا ہے، مگر اس سے ہدایت وہی لے سکتا ہے جس کے دل میں تقویٰ ہو، یعنی یہ ڈر ہو کہ ایک دن مرنا ہے اور اللہ کے حضور حاضر ہو کر زندگی کے اعمال کے بارہ میں جواب دہ ہونا ہے، یہی وہ خوف ہے جو انسان کو حق بات کے قبول کرنے اور باطل سے منہ موڑنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے، یہی وہ تقویٰ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں پیدا ہوا، اور انہوں نے قرآن کی دعوت حق کو دل وجان سے قبول کر کے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

جیسے حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی غرض سے گھر سے نکلے، مگر جب قرآن کی پکار ان کے کانوں میں پڑی اور انہوں نے اپنی ہمشیرہ کی زبان سے قرآن کریم کی چند آیات سنیں تو چونکہ دل میں تقویٰ کا بیج موجود تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کے کلام مقدس کی چند آیات کی تلاوت نے ان کے دل کی دنیا زیر وزبر کر کے رکھ دی اور ان کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

یونہی جب حبشہ میں شاہ نجاشی کے دربار میں قرآن کریم کی تلاوت کی گئی تو چونکہ ان کے دل میں تقویٰ موجزن تھا اس لیے قرآن نے فوراً اپنا اثر دکھایا اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔

مگر جو لوگ قرآن کو محض اس غرض سے پڑھتے ہیں کہ اس میں سے اعتراض کا موقع نکالیں اور معاذ اللہ اسے جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کریں ان کے دل تقویٰ کے نور سے خالی ہیں ان پر قرآن مجید اثر نہیں کر سکتا خواہ وہ سارا قرآن کئی بار پڑھ لیں بلکہ جیسے جیسے وہ قرآن پڑھیں گے ان کے کفر میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

[10] اگر سوال کیا جائے کہ جب ان کے دلوں پر اللہ ہی نے مہر لگا دی تو پھر ایمان نہ لانے میں ان کا کیا قصور ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی طرف مہر لگانے کی نسبت بیان نتیجہ کے طور پر ہے ورنہ اس مہر کے لگنے کا سبب خود وہ کفار ہیں، جیسے اللہ نے فرمایا: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ یعنی اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگائی۔ (سورہ نساء، آیت نمبر ۱۵۵) یعنی ان کا کفر اور ہٹ دھرمی ہی ان کے دلوں پر مہر لگنے کا سبب ہوئی۔

دلوں پر مہر لگائے جانے کی مثال

اس کی مثال یوں ہے کہ ایک مریض کو ڈاکٹر کسی چیز سے پرہیز اور ایک دوائی کے استعمال کا حکم دیتا ہے۔ مگر وہ مریض ڈاکٹر کے حکم کے برعکس چلتا جاتا ہے تو آخر ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ اس پر کوئی دوا اثر نہیں کرتی بلکہ الٹا اثر کرتی

ہے۔اس میں ڈاکٹر پر کچھ اعتراض نہیں یہی حال ان کفار کا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو حکیم مطلق ہے انہیں قرآن مجید پر عمل کی دوا اور کفر سے بچنے کی پرہیز بتائی مگر انہوں نے اس کے برعکس چلنے کی ضد پکڑ لی تب ان کی یہ حالت ہوئی کہ ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور ان کیلئے پورا قرآن اور تمام معجزات محمدیہ بے اثر ہو گئے۔ یہ ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز لہٰذا اس میں اللہ کی طرف دلوں پر مہر لگانے کی نسبت محض بیان نتیجہ کے طور پر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت کسی پر ظلم نہیں فرماتا کہ وہ تو ہدایت لینا چاہے مگر اسے ہدایت نہ لینے دی جائے، بلکہ بندہ جدھر جانا چاہتا ہے اس کے لیے راستے ہموار ہوتے جاتے ہیں، خواہ وہ ہدایت کی طرف متوجہ ہو یا گمراہی کی طرف، جیسے فرمایا گیا: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝٥ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝٦ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝٧ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝٨ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝٩ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝١٠ (سورہ واللیل، آیت نمبر ۵ تا ۱۰) چنانچہ بندہ جیسے کفر میں بڑھتا جاتا ہے اس کے دل میں کجی آتی جاتی ہے پھر وہ کجی اس قدر زیادہ ہو جاتی کہ پھر اس پہ کوئی آیت اور کوئی حدیث اثر نہیں دکھاتی، جیسے فرمایا گیا:

فلما زاغوا ازاغ الله قلوبهم ''جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔''

(سورہ صف، آیت نمبر ۵)

تو یہ دل کا ٹیڑھا کر دیا جانا ہی وہ قلبی حال ہے جو کو دل پہ مہر لگائے جانے کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔

وَقف لازم

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَمَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ۘ‏ ﴿۸﴾

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے حالانکہ وہ مؤمن نہیں ہیں۔

يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَمَا يَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا

وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں اور

يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ

سمجھتے نہیں۔ [11] ان کے دلوں میں مرض ہے تو اللہ نے ان کی مرض بڑھا دی اور ان کیلئے درد ناک

اَلِيۡمٌ ۙ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۱۰﴾

عذاب ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ [12]

منافقین کی علامات اور ان کے احوال کا بیان

[11] پہلے آیت ۵ تک مومنین کا حال بیان کیا گیا پھر آیت ۶ اور ۷ کفار کے بارہ میں نازل ہوئیں اب آیت ۸ سے ۲۰ تک منافقین کا حال بتایا جا رہا ہے۔

عہدِ رسالت کے مدنی دور میں منافقین کی جماعت کیسے پیدا ہوئی؟

یاد رہے! جب تک نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مکہ مکرمہ میں تھے تو کوئی منافق نہ تھا لوگوں کی دو ہی قسمیں تھیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کھلے مومن تھے اور مشرکین مکہ کھلے کافر، کیونکہ اس وقت اسلام قبول کرنا اپنی جان پر کھیلنے کے برابر تھا اور جو لوگ اس وقت اسلام لائے وہ ایسے مخلص مومنین تھے کہ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور ان کے سردار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

مگر جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے تو یہاں کا ماحول مختلف تھا یہاں مشرکین کے دو قبیلے اوس اور خزرج آباد تھے جو بعد میں اسلام لے آئے اور شرف صحابیت پا کر انصار مدینہ کہلائے اور یہود کے تین قبائل آباد تھے، بنو قینقاع جو انصار کے قبیلہ ''اوس'' کے حلیف تھے اور بنو قریظہ و بنو نضیر جو انصار کے دوسرے قبیلہ ''خزرج'' کے حلیف تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی مدینہ طیبہ میں آمد سے قبل ایک شخص عبداللہ بن ابی بن سلول قبیلہ خزرج کا سردار تھا اور اوس کے لوگ بھی اسے سردار مانتے تھے۔ بلکہ آپ کی آمد سے چند روز قبل دونوں قبیلے اسے اپنی سرداری کا باقاعدہ تاج پہنانے والے تھے اور رسم تاجپوشی ہونے والی تھی مگر آپ کی آمد کی برکت سے اوس وخزرج کے اکثر لوگ اسلام لے آئے اور عبداللہ بن ابی بن سلول کی تاجپوشی دھری کی دھری رہ گئی، وہ انگاروں پہ لوٹنے لگا، اس کے دل میں اسلام اور پیغمبر اسلام کیلئے نارِ حسد بھڑکنے لگی۔

اس کے چند بدفطرت ساتھی تھے ان کا حال بھی اسی جیسا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے دوسرے برس بدر میں مسلمانوں کو عظیم الشان کامیابی دی تو عبداللہ بن ابی نے سمجھا کہ اب مسلمانوں سے اعلانیہ دشمنی نہیں کی جاسکتی ان کے قدم مضبوط ہوگئے ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت فریب دہی کے لئے اسلام کا لبادہ اوڑھ لے اور دیکھے کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ بعدازاں یہود میں سے کچھ لوگ اپنی سازشی فطرت کے تحت ان کے ساتھ شامل ہوگئے جبکہ یہود مدینہ کی اکثریت یہودیت اور اسلام دشمنی پر قائم رہی۔

چنانچہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی منافقین کہلائے۔ ایک طرف یہ منافق لوگ مسلمانوں میں شامل ہوتے دوسری طرف سرداران یہود سے بھی ان کے خفیہ رابطے قائم رہتے۔ ابتداء میں مسلمان ان کی منافقت سے خبردار نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی یہ تیرہ آیات ۸ تا ۲۰ ان کی نشانیاں بتانے میں نازل فرمائیں تاکہ مسلمان ان سے ہوشیار رہیں۔

تو انہی کے بارے میں یہاں فرمایا جارہا ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے مگر وہ مومن نہیں ہیں وہ اللہ اور مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں حالانکہ وہ خود ہی کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ اللہ نے تو مسلمانوں کو ان کے احوال سے باخبر کردیا ہے اور وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ان کا حال مسلمانوں سے مخفی ہے لہٰذا وہ خود دھوکے میں ہیں۔

ایمان کی حقیقت حب اللہ وحب رسول ہے:

وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ سے معلوم ہوا کہ ایمان اللہ اور اس کے رسول کیلئے مخلص ہونے کا نام ہے۔ منافقین اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کے نعرے لگاتے تھے، وہ حضور ﷺ کے پیچھے نماز بھی پڑھ لیتے تھے مگر چونکہ ان کے دل اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے خالی تھے اس لیے وہ کافر ہی رہے، گویا اسی محبت کا نام ایمان ہے اور اسی کا نہ ہونا کفر۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین، تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری کتاب الایمان باب ۸)

محمد کی محبت دین حق کی شرط اول ہے
اسی میں ہو اگر خامی تو سب کچھ نامکمل ہے

[12] یعنی منافقین کے دلوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں حسد وبغض کا مرض ہے اور جیسے جیسے اسلام کو غلبہ ملتا گیا ان کا قلبی مرض بڑھتا گیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ (سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۵) اور چونکہ وہ جھوٹ بول کر اپنا اسلام ظاہر کرتے اور مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اس لیے انہیں دردناک عذاب کیلئے تیار رہنا چاہیے۔ معلوم ہوا جھوٹے شخص کو منافقت کا مرض لاحق ہوتا ہے سچا آدمی ہمیشہ کھرا ہوتا ہے وہ بلاخوف وخطر سچی بات کہہ دیتا ہے۔ یہی مومن کی شان ہے اور جھوٹ منافق کی پہچان۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”منافق کی تین علامتیں ہیں۔ بات کہے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔“ (بخاری کتاب الایمان)

کیا آج اعتقادی منافقین پائے جا سکتے ہیں؟

اس جگہ یہ سوال ہے کہ کیا آج بھی دنیا میں اس طرح کے منافقین پائے جا سکتے ہیں جیسے دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عبداللہ بن ابی اور اس کی جماعت کی صورت میں تھے جو ظاہر سے مومنین اور باطن سے کفار تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں، آج کسی کو اس معنیٰ میں منافق نہیں کہا جا سکتا جس معنی میں دورِ نبوی کے منافقین تھے، کیونکہ ان کے دلوں میں مخفی کفر کو بذریعہ وحی ظاہر کر دیا گیا۔

آج وحی نہیں آ سکتی، لہٰذا جو اسلام ظاہر کرتا ہے وہ قانون شریعت میں مومن ہے خواہ وہ دل سے کافر ہی ہو، اور جو کفر کا اظہار کرتا ہے وہ کافر ہے، اور جو اسلام لا کر اسلام سے پھر جائے وہ مرتد ہے، اور جو کفریہ عقائد رکھنے کے باوجود خود کو مسلمان کہے وہ زندیق وملحد ہے جیسے منکرینِ ختم نبوت، منکرینِ حجیت حدیث، منکرینِ معراج جسمانی از مکہ تا بیت مقدس، قائلینِ تحریف قرآن اور شاتمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

الغرض آج اعتقادی منافق کوئی نہیں ہے، البتہ آج عملی منافقین موجود ہیں یعنی وہ لوگ جن کا کردار عبداللہ بن ابی جیسا ہے، یعنی جھوٹ بولنا، دو چہرے اور دو زبانیں رکھنا، جیسے ابھی حدیث گزری کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں، جھوٹ، وعدہ خلافی اور خیانت۔

بلکہ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ عملی منافقت آج مسلمانوں میں بہت زیادہ ہوگئی ہے، حتیٰ کہ آج دیندار طبقہ میں بھی یہ مرض کثرت سے موجود ہے، اصحاب منبر ومحراب اور اربابِ مسند ارشاد بھی منافقت میں مبتلا ہیں، الا ماشاء اللہ، ہر کوئی اپنے دنیوی مفادات کے لیے دین کا نام استعمال کر رہا ہے، بس اللہ ہمیں ہدایت عطا فرمائے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾
اور جب ان سے کہا جائے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کررہے ہیں۔
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا
یاد رکھو! وہی فساد کرنے والے ہیں مگر سمجھتے نہیں۔[13] اور جب ان (منافقوں) سے کہا جائے کہ (سچے دل سے) ایمان لاؤ
كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ
جیسے لوگ (صحابہ) ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں؟
السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾
یاد رکھو! کہ وہی بیوقوف ہیں مگر جانتے نہیں۔[14]

[13] جب منافقین سے کہا جاتا کہ تم زمین میں فساد کیوں کررہے ہو یعنی تم دروغ گوئی اور مفاد پرستی کو کیوں فروغ دے رہے ہو تو وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کررہے ہیں یعنی مسلمانوں اور یہود کو ایک دوسرے کے قریب لارہے ہیں اور ان کے مابین بھائی چارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ پکے فسادی ہیں مگر جانتے نہیں کہ ان کی حرکتوں کا انہیں کیا انجام دیکھنا پڑے گا اور واقعتاً منافقین فسادی لوگ تھے وہ مسلمانوں کی کمزوریاں یہود کے سامنے بیان کرتے اور یہود سے دین اسلام کے خلاف شبہات سن کر انہیں مسلمانوں میں پھیلانے کی کوشش کرتے تاکہ ان کا ایمان کمزور کرسکیں۔

[14] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں منافقین سے کہا گیا کہ وہ اس طرح مخلصانہ ایمان کیوں نہیں لاتے جس طرح اصحاب محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کی تصدیق کی ہے تو منافقوں نے کہا کیا ہم ان بیوقوف لوگوں کی طرح ایمان لے آئیں؟
(تفسیر ابن جریر طبری جلد اول صفحہ ۲۵، تفسیر ابن ابی حاتم جلد اول صفحہ ۴۶ حدیث ۱۲۹ مطبوعہ مکتبہ نزار مکہ)

یعنی انہوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ترک وطن، مال واسباب اور جائیداد سب کچھ چھوڑ کر مکہ مکرمہ سے فقیرانہ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ چلے آنے کو بیوقوفی سے تعبیر کیا اور کہا کہ یہ سر پھرے لوگ ہیں۔ آنکھیں بند کرکے ایک شخص کے پیچھے چل پڑے ہیں سمجھداری کا تقاضا یہ ہے کہ پھونک پھونک کر قدم اٹھایا جائے اور حالات کا رخ دیکھ کر راستہ متعین کیا جائے، گویا وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایمانی پختگی اور جذبہ جان نثاری کو بیوقوفی قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ منافقین خود بیوقوف ہیں کہ انہوں نے ایمان بیچ کر کفر اور آخرت بیچ کر دنیا خرید لی۔ بھلا فانی چیز کیلئے ابدی نعمتوں سے منہ موڑنے سے بڑی حماقت کیا ہوسکتی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معیار حق ہیں:

اس جگہ بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ یعنی جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان لائے ہیں تم بھی اسی طرح ایمان لاؤ، اس سے اہل تشیع کو سبق لینا چاہیے۔

اور مزے کی بات یہ ہے کہ خود اہل تشیع کے ہاں بہت معتبر مفسر ملا فضل بن حسن طبرسی شیعہ نے بھی اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ کا یہی معنی کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

والمراد بالآية اذا قيل للمنافقين صدقوا بمحمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وما انزل عليه كما صدقه اصحابه،

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب منافقین سے کہا جائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان پر نازل شدہ قرآن کی اسی طرح مخلصانہ تصدیق کرو جیسے ان کے صحابہ نے تصدیق کی ہے (مجمع البیان جلد اول صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ موسسۃ الاعلمی بیروت)

اب تو اہل تشیع کو مان لینا چاہیے کہ واقعی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتہائی مخلصانہ ایمان باقی تمام امت کے لیے معیار حق ہے۔ اس کے باوجود اہل تشیع کا صحابہ کرام وخلفاء راشدین رضی اللہ عنہم پر تبرا کرنا بہت بڑا ظلم ہے

اسی لیے اللہ نے فرمایا: فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ "اے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر وہ اسطرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے۔" (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۳۷) اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر ایمان بھر دیا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ یعنی اے صحابہ اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب قرار دیا اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمہارے لیے کفر، بدعملی اور نافرمانی کو ناپسندیدہ کر دیا ہے۔ (سورہ حجرات، آیت نمبر ۷)

اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے ایک فرقہ ناجی ہوگا باقی سب دوزخی ہونگے، پوچھا گیا وہ ناجی لوگ کون ہیں؟ فرمایا:

ما انا عليه واصحابي، "جس راستہ پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔" (ترمذی کتاب الایمان حدیث ۲۶۴۱)

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار ہمیں نماز فجر کے بعد ایسا بلیغ وعظ فرمایا کہ اس سے آنکھیں بہہ پڑیں اور دل کانپ اٹھے،، ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ایسے لگتا ہے کہ آپ ہمیں الوداعی وعظ فرما رہے ہیں، آپ ہمیں وصیت فرمائیں، آپ نے فرمایا میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو اور امیر کی اطاعت کرو خواہ وہ حبشی غلام ہو، یاد رکھو جو تم میں سے (لمبا) جیے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، تو دین میں نئے کاموں سے بچنا کیونکہ وہ گمراہی ہیں، آگے فرمایا: فمن ادرك ذالك منكم فعليه بسنتي وسنة الخلفاء

الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ، جوشخص تم میں سے ایسا وقت پائے تو اس پہ لازم ہے کہ میری سنت کو پکڑے اور میرے ہدایت یافتہ راہبر خلفاء کی سنت کو پکڑے، ان کی سنت کو خوب مضبوطی سے اپنالو۔

(ترمذی کتاب الایمان حدیث ۲۶۷۶)

توان تمام آیات واحادیث کی روشنی میں خوب واضح ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تا قیامت معیار حق ہیں، ہمارا ایمان بھی ان جیسا ہونا چاہیے اور ہمارے اعمال بھی ان جیسے ہونے چاہئیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گستاخ پر اللہ کی لعنت ہے:

یہ بھی پتہ چلا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گستاخی کرنے والے پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ منافقین نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سُفَهَاء (بیوقوف) کہا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ خبردار منافقین خود بیوقوف ہیں۔

چنانچہ حضرت عویم بن ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان الله اختارنی واختار لی اصحابا فجعل لی بینھم وزراء وانصارا واصھارا فمن سبھم فعلیه لعنة الله والملائكة والناس اجمعین،

"اللہ نے پہلے مجھے چنا، پھر میرے لیے ساتھی چنے اور میرے لیے ان میں وزیر، داماد اور سسر بنائے (یعنی خلفاء راشدین) تو جو انہیں برا کہے اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔"

(طبرانی کبیر جلد ۱۷ صفحہ ۱۴۰ حدیث ۳۴۹ مطبوعہ مکتبہ نزار مکہ مکرمہ)

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اللهَ اللهَ فی اصحابی الله الله فی اصحابی لاتتّخِذوھم غرضاً بعدی فمن احبّھم فبحُبّی احبھم ومن ابغضھم فببُغضی ابغضھم ومن آذاھم فقد آذانی ومن آذانی فقد آذی الله ومن آذی الله فیوشك ان یأخذه،

"میرے صحابہ کے بارہ میں اللہ کا خوف رکھو، میرے صحابہ کے بارہ میں اللہ سے ڈرو، انہیں میرے بعد طعن وتشنیع کا نشانہ نہ بنالینا، جو ان سے محبت رکھے وہ میرا محبوب ہے اور جو ان سے بغض رکھے وہ میرا مبغوض ہے، جس نے انہیں ایذاء دی اس نے مجھے ایذاء دی، جس نے مجھے ایذاء دی اس نے اللہ کو ایذاء دی اور جو اللہ کو ایذاء دے اسے اللہ جلد ہی پکڑ لے گا۔" (ترمذی کتاب المناقب حدیث ۳۸۶۲)

اہل تشیع کا تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر ومرتد قرار دینا (معاذ اللہ):

مگر انتہائی افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ اہل تشیع نے اس کے برخلاف یہ عقیدہ اپنالیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جب صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چھوڑ کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی تو جس جس نے بیعت کی وہ سب

کافر ومرتد ہو گئے معاذ اللہ۔

چنانچہ شیعہ لوگ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف جھوٹی روایت منسوب کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

کان الناس اهل ردة بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا ثلاثة،

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب لوگ مرتد ہو گئے سوا تین افراد کے'' راوی کہتا ہے میں نے پوچھا وہ تین کون ہیں؟ امام جعفر نے کہا مقداد، ابوذر اور سلمان فارسی، پھر کہا:

هولاء الذین دارت علیهم الرحی وابوا ان یبایعوا حتی جاء وا بامیرالمؤمنین علیه السلام مکرهاً فبایع، یہ تین افراد وہ ہیں کہ ان پر ظلم کی چکی چلی، مگر انہوں نے (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی) بیعت سے انکار کر دیا تا آنکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جبراً لایا گیا تو انہوں نے بیعت کی۔ (تفسیر عیاشی جلد اول صفحہ ۱۹۹ مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ تہران)

صاحب اصول کافی کے استاذ شیخ علی بن ابراہیم قمی اس آیت: اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ، جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم انہیں عذاب پہ عذاب دیں گے (سورہ نحل، آیت نمبر ۸۸) کی تفسیر کرتے ہوئے کہتا ہے:

کفروا بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وصدوا عن امیر المؤمنین، یعنی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کافر ہو گئے اور امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رک گئے (تفسیر قمی صفحہ ۳۶۳ مطبوعہ تہران)

اسی طرح اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اللہ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا (سورہ محمد، آیت نمبر ۱) کے تحت کھلے لفظوں میں لکھتا ہے:

نزلت فی اصحاب رسول الله الذین ارتدوا بعد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وغضبوا اهل بیته حقهم وصدوا عن امیر المومنین عن ولایته اضل اعمالهم ای ابطل ما کان تقدم منهم مع رسول الله من الجهاد والنصرة۔

یہ آیت اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں نازل ہوئی جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مرتد ہو گئے، انہوں نے اہلِ بیت کا حق غصب کر لیا اور امیر المؤمنین کی خلافت سے انکار کر دیا، تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے یعنی اس سے قبل انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جو جہاد اور نصرتِ دین کا کام کیا وہ اللہ نے سب برباد کر دیا (معاذ اللہ)۔ (تفسیر قمی صفحہ ۶۲۳)

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معیارِ حق بناؤ، مگر یہ کس قدر گندی، کافرانہ، ملحدانہ اور بدبودار فکر ہے کہ تمام صحابہ کرام کو کافر قرار دیا جائے، ہم اللہ ہی سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معیارِ حق ہونا کتبِ شیعہ سے:

حالانکہ خود ائمہ اہلِ بیت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معیارِ حق سمجھتے تھے، اور یہ باتیں بھی ہمیں کتبِ شیعہ سے مل جاتی ہیں اور

اللہ جب چاہتا ہے تو منکرین کے قلم سے بھی سچی بات لکھوا دیتا ہے

چنانچہ ملا باقر مجلسی لکھتا ہے کہ امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ اپنے والد امام جعفر صادق رحمۃ اللہ سے اور وہ اپنے آباء کرام رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

انا امنة لاصحابي فاذا قُبضت دنا من اصحابي كما يوعدون، واصحابي امنة لامتي فاذا قُبض اصحابي دنا من امتي ما يوعدون،

''میں اپنے صحابہ کے لیے وجہ امن ہوں، جب میرا وصال ہوگیا تو میرے صحابہ کو وہ کچھ پہنچے گا جو ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور میرے صحابہ میری امت کے لیے وجہ امن ہیں، جب ان کا وصال ہوجائے گا تو میری امت کو وہ کچھ پہنچے گا جو ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔'' (ملا مجلسی شدید گستاخ صحابہ ہے مگر اللہ کبھی منکر کے منہ سے سچی بات کہلوا دیتا ہے)

(بحار الانوار جلد ۲۲ صفحہ ۳۰۹ تاریخ النبی ﷺ باب فضل المہاجرین والانصار ملا باقر مجلسی مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

شیعہ فرقہ کا مشہور مجتہد شیخ صدوق حدیث بیان کرتا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

من سبني فاقتلوه ومن سب اصحابي فقد كفر وفي خبر ومن سب اصحابي فاجلدوه،

''جس نے مجھے گالی دی وہ واجب القتل ہے، اور جس نے میرے صحابہ کو گالی دی وہ کافر ہوا اور دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے میرے صحابہ کو گالی دی تم اسے کوڑے لگاؤ۔'' (جامع الاخبار فصل ۱۲۵، صفحہ ۱۸۲ مطبوعہ دار الکتب التجاریہ نجف اشرف)

ملا باقر مجلسی نقل کرتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

طوبیٰ لمن رآني او رآیٰ من رآني او رآیٰ من رآیٰ من رآني،

''مبارک ہو اسے جس نے مجھے دیکھا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھا یا میرے دیکھنے والے کے دیکھنے والے کو دیکھا۔'' (بحار الانوار جلد ۲۲ صفحہ ۳۱۳)

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اہل بدر کی شان سب سے بلند ہے، ان کی عظمت کی گواہی خود رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں، چنانچہ جب بدر میں رسول اللہ ﷺ نے صفوں کو آراستہ کیا تو آپ ﷺ نے بارگاہ خداوندی میں ہاتھ اٹھا لیے، مشہور شیعہ مفسر شیخ علی بن ابراہیم قمی جو صاحب اصول کافی ملا کلینی کا استاذ ہے، لکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا:

یارب ان تهلك هذه العصابة لا تعبد، ''اے میرے پروردگار اگر یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک کر دی گئی تو پھر کبھی تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔'' (تفسیر قمی سورہ انفال صفحہ ۲۴۴ مطبوعہ تہران)

اور یہی وہ بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں کہ جب ان میں سے ایک صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے یہ خطا ہوئی کہ انہوں نے اہل مکہ کو خط لکھ کر انہیں آگاہ کرنا چاہا کہ نبی اکرم ﷺ ان پر حملہ کرنے والے ہیں تو وہ خط پکڑا گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کا سر اڑا دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: عمر جانتے نہیں

ہو کہ یہ بدری صحابی ہے۔ ولعل اللہ اطلع علی اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم،
یعنی ''اللہ نے اہل بدر کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا: تم جو بھی عمل کرو بہر حال میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔''
(بحار الانوار جلد ۲ صفحہ ۱۲۱ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

ان احادیث مبارکہ کو ائمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے، اور ہم انہیں کتب شیعہ سے پیش کر رہے ہیں، معلوم ہوا کہ ائمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں وہی نظریات رکھتے تھے جو ہمیں قرآن وسنت سے ملتے ہیں، اور صحابہ کے بارے میں گالی گلوچ اور لعن طعن کی روایات خود شیعہ راویوں نے گھڑ کر ان کی طرف منسوب کر دی ہیں، اللہ سب کو ہدایت عطا فرمائے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا

اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب وہ اپنے شیطان صفت سرداروں کے پاس تنہا ہوں تو

اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ

(ان سے) کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو (مسلمانوں سے) مذاق کرتے ہیں۔[15] خبردار! اللہ انہیں اس مذاق کا جواب دیتا ہے

طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا

اور انہیں اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہنے کو ڈھیل دیتا ہے۔[16] یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی تو ان کی

رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

تجارت فائدہ مند نہ ہوئی اور وہ (فائدہ کی) راہ ہی نہ جانتے تھے۔[17]

[15] منافقین جب صحابہ کرام کے پاس آتے تو کہتے ہم بھی تمہاری طرح مومن ہیں چنانچہ وہ ان کے ساتھ نماز باجماعت میں بھی شامل ہو جاتے اور جب وہ اپنے شیاطین یعنی شیطان صفت یہودی سرداروں کے پاس جاتے تو کہتے ہم کب مومن ہیں ہم تو تمہارے ساتھ تمہارے دین پر ہیں ہم تو مسلمانوں کے ساتھ مذاق کر کے انہیں بیوقوف بنا رہے تھے (تاکہ ہم ان میں شامل رہ کر ان کے راز حاصل کر سکیں اور اگر مال غنیمت وصدقات وغیرہ تقسیم ہوں تو اس میں سے حصہ بھی لے سکیں)۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ایک بار عبداللہ بن ابی ابن سلول اور اس کے منافق ساتھی کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں چند اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگئی۔ عبداللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: دیکھنا میں ان

بیوقوفوں کو کیسے جھانسہ دیتا ہوں (معاذ اللہ) تو اس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: مرحبا سردار بنی تیم شیخ الاسلام صدیق کا آنا مبارک ہو، آپ ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ ہیں۔

پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا: سردار بنوعدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جان و مال قربان کرنے والے عمر کا آنا مبارک ہو۔ پھر وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھام کر گویا ہوا: ابن عم رسول، داماد نبی، سردار بنی ہاشم، علی کا آنا مبارک ہو (ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے کہا اے عبداللہ! یہ منافقانہ گفتگو نہ کیا کرو)

بعد میں اکیلے ہونے پر وہ ساتھیوں سے کہنے لگا: دیکھا تم نے میں نے ان سے کیا کرتب کیا۔ تم جب بھی انہیں ملو تو ایسے ہی کرو، اس کے ساتھیوں نے اس کی خوب تعریف کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سارا ماجرا سنایا تب یہ آیات نازل ہوئیں۔ (درمنثور عن الواحدی والثعالبی)

دو چہروں والا انسان منافق ہے:

معلوم ہوا کہ ایک مجلس میں کچھ اور دوسری مجلس میں کچھ، یہ مؤمن کی شان نہیں، یہ منافقوں کا طریقہ ہے اور اس کا عذاب بہت سخت ہے۔ افسوس! یہ مرض آج ہم مسلمانوں میں بہت ہی زیادہ ہے۔ ہم کسی شخص کے منہ پر اس کی تعریف اور پیٹھ پیچھے اس کی غیبت اور عیب جوئی کرتے ہیں۔

جبکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

''روزِ قیامت اللہ کے ہاں سب سے رسواتر وہ شخص ہوگا جس کے دو چہرے تھے کچھ لوگوں کے پاس ایک چہرہ لے کر جاتا اور دوسرے لوگوں کے پاس کچھ اور چہرہ۔'' (بخاری کتاب الادب باب ۵۲)

حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کے دنیا میں دو چہرے تھے روزِ قیامت اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔'' (دارمی کتاب الرقاق ص ۳۱۴ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

کفار کا حمایتی کافر و زندیق ہے:

اس جگہ یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے خلاف کفار کا ساتھ دینے والا مسلمان نہیں زندیق ہے۔ دیکھیے دورِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں منافقین خود کو مسلمانوں میں شمار کرتے تھے، اور یہود سے بھی ان کی گٹھ جوڑ تھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ مومن نہیں ہیں وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۸ آج بھی جو شخص دعویٰ اسلام کے باوجود مسلمانوں کے خلاف کفار کا آلہ کار بنے وہ مؤمن نہیں زندیق و ملحد ہے۔ اور جو شخص کھلم کھلا مسلمانوں کی مخالفت اور کفار کا ساتھ دے اور مسلمانوں کو کافر کے ہاتھوں مروائے اسے فقہاء نے کافر قرار دیا ہے اور اس کا دعویٰ اسلام بیکار ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہمارے اکثر نام نہاد مسلم حکمران اسی زمرہ میں شامل ہیں وہ کفار کے آلۂ کار بن کر

مسلم امت کے خلاف ان کی سازشوں میں شریک رہتے ہیں تا کہ اپنے اقتدار کو طول دے سکیں ان کی حالت منافقین مدینہ سے مختلف نہیں۔

آج امت مسلمہ پر ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں، بھارت نے کشمیری مسلمانوں کا ناطقہ بند کررکھا ہے، انڈیا میں آئے دن مسلم کش فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کیا جاتا ہے ،اور یہ سب کچھ بھارتی حکومت کی سرپرستی میں ہوتا ہے،اہل فلسطین نصف صدی سے یہود کے ظلم وتشدد کو برداشت کررہے ہیں مگر کوئی ان کی فریاد سننے والانہیں، اور وہ امریکہ ہی ہے جو یہود وہنود کی پیٹھ ٹھونک رہااور ان کے ہاتھ مضبوط کررہاہے، مگر ہمارے نام نہاد حکمران امریکہ کی غلامی کررہے ہیں۔

آج امریکہ کی آنکھوں پر یہود نے اسلام دشمنی کی پٹی باندھ دی ہے اور وہ اندھے ہاتھی کی طرح مسلم ممالک پر چڑھ دوڑا ہے،اورسب کو روندتا چلا جارہاہے، اس نے افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا، اس نے عراق پر حملہ کیااور شہر انبیاء واولیاء بغداد پر شدید بمباری کی اور ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا،مگر کسی اسلامی ممالک کے نام نہاد حکمرانوں میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ امریکہ سے ذرا پوچھ ہی لیتا کہ آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے، یہ اقوام متحدہ کا ادارہ کس لیے بنایا گیا ہے؟ اسی لیے تا کہ کوئی ملک دوسرے ملک پر زیادتی نہ کرے، جب اقوام متحدہ نے خبر دار کیا ہے کہ عراق پر حملہ سے باز رہاجائے پھر امریکہ کا اندھے ہاتھی کی طرح عراق کو روندنا کیا جواز رکھتا ہے، کسی نام نہاد مسلم حکمران کو جرأت نہ ہوئی کہ امریکہ سے یہ سوال کرے، اور جرأت اس لیے نہیں ہوئی کہ ہمارے موروثی بادشاہوں کی بادشاہت اور فوجی حکمرانوں کی صدارت بلکہ نام نہاد جمہوری حکمرانوں کی حکومت امریکہ ہی کی عطا کردہ ہے، یقیناً یہ برائے نام مسلمان عبداللہ بن ابی بن سلول کی معنوی اولادہیں۔

[16] اللہ تعالیٰ نے فرمایا منافقین اپنے گمان میں مسلمانوں سے مذاق کرتے اور انہیں بیوقوف بناتے ہیں مگر اللہ انہیں ان کے اس استہزاء کا جواب دینے والا ہے وہ انہیں ڈھیل دے رہا ہے کہ جس قدر وہ اپنے داؤ مکر کرسکتے ہیں کرلیں۔ آخر اللہ انہیں پکڑے گا تو سخت پکڑے گا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ، روز قیامت منافقین کے استہزاء کا یوں جواب دے گا کہ ان کیلئے جنت کا دروازہ کھولے گا جب وہ قریب آئیں گے تو دروازہ بند کردیا جائے گا کئی بار ایسا ہوگا جب دروازہ کھلے گا وہ ادھر دوڑیں گے جب قریب پہنچیں گے تو دروازہ بند کردیا جائیگا آخر وہ قریب نہ جائیں گے۔ (خازن، بغوی، مظہری وغیرھم)

پھر قرآن کہتا ہے: يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ یعنی روز قیامت منافق مرد اور عورتیں ایمان والوں سے التجاء کریں گے کہ ذرا ہم پر

نظر ڈالو ہم تمہارے نور سے کچھ حصہ لینا چاہتے ہیں ان سے کہا جائے گا پیچھے ہٹ جاؤ وہیں نور ڈھونڈو تب ان کے (اور مومنین کے) درمیان دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کے اندر رحمت ہے اور باہر عذاب۔ (سورہ حدید، آیت نمبر ۱۳)

[17] منافقین نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی یعنی اگر وہ مخلص مومن بن جاتے تو صحابہ کرام میں شمار ہوتے اور جنت کے اعلیٰ درجات پاتے مگر ان بدترین بدبختوں نے حقیر دنیوی مفادات کے لئے ابدی جنتی نعمتوں سے محرومی کا سودا کر لیا تو ان کی تجارت بہت خسارے میں رہی اور وہ نفع مندی کی راہ ہی نہ جانتے تھے، کیونکہ تجارت میں نفع اسے ملتا ہے جس کے پاس رأس المال ہو اور رأس المال ایمان ہے جب وہی نہیں تو نفع کیا ہوگا۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ
ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اس کا آس پاس روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا
اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ
نور ختم کر دیا اور انہیں تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہ دیکھیں۔ [18] وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں تو وہ
لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾
باز نہیں آئیں گے۔ [19]

[18] منافقوں کے دو گروہ تھے یہاں دونوں کی الگ الگ مثال بیان کی گئی ہے۔ ایک گروہ منافقین کے سرداروں کا تھا جیسے عبداللہ بن ابی اور اس کے قریبی ساتھی، وہ خالص مفاد پرست اور اندر سے پکے کافر تھے۔ اور جھوٹ کے سہارے اپنی منافقت کا بھرم رکھنے میں مصروف تھے، انہوں نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی سچے دل سے ایمان لانے کے بارے میں سوچا نہ تھا، وہ ہمیشہ مخالفت دین ہی پہ کمر بستہ رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ مثال دی کہ ایک شخص تاریک اور ٹھنڈی رات میں کہیں جنگل میں بیٹھا ہوا تھا اس نے روشنی اور گرمی حاصل کرنے کیلئے آگ جلائی، آگ روشن ہوئی تو اسے نظر آیا کہ اس کے دائیں بائیں کہاں صاف جگہ ہے کہاں گندگی ہے کہاں گڑھے ہیں۔ پھر اچانک وہ آگ بجھ گئی اب اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہی اس منافق کی حالت ہے جو پہلے کفر کی تاریکی میں تھا، جب وہ اسلام لایا تو اسے حلال وحرام اور خیر وشر کے مابین فرق معلوم ہوا مگر ساتھ ہی اس نے کفر کر دیا تو وہ پھر تاریکی میں چلا گیا اور اس نے حرام وحلال کی تمیز بھلا دی۔ مفسرین نے اس کا یہ معنی بھی کہا ہے کہ منافقین نے اپنے نفاق سے مفاد پرستی کی آگ جلائی اور سمجھے کہ وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو گئے ہیں مگر اچانک اللہ نے آیات نازل کر کے مسلمانوں کو ان کے نفاق

سے آگاہ کر دیا اور ان کے چہروں سے نفاق کا پردہ اٹھ گیا اب وہ یوں حیران کھڑے ہیں کہ کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی کدھر جائیں۔

[19] اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ منافق بہرے گونگے اور اندھے ہیں کہ مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اس صدائے حق پر کان نہیں دھرتے جسے سن کر صحابہ کرام کے دل روشن ہو گئے، تو یہ حق سننے سے بہرے ہیں ان کی زبانیں حق گوئی سے گونگی اور ان کی آنکھیں راہ حق دیکھنے سے اندھی ہیں، لہٰذا یہ لوگ باز نہ آئیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عبداللہ بن ابی ابن سلول کم وبیش نو (۹) برس حضور ﷺ کی معیت میں رہا آپ کے پیچھے نمازیں بھی پڑھیں آپ کے ساتھ غزوات میں بھی گیا مگر صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ کی مہر نہ ٹوٹی اور فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴿۱۸﴾ کی قرآنی پیش گوئی پوری ہو کر رہی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ (سورہ توبہ، آیت نمبر ۸۴) کے ذریعے عبداللہ بن ابی کیلئے دعا و استغفار سے منع فرما دیا۔ اس کی تفصیل وہیں دسویں پارہ میں آئے گی ان شاء اللہ۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ
یا (ان کی مثال) آسمان سے (برسنے والی) بارش کی طرح ہے جس میں تاریکیاں، کڑک اور بجلی ہے وہ اپنے کانوں میں
فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴿۱۹﴾
انگلیاں ٹھونستے ہیں کڑک سے گھبرا کر موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کا گھیراؤ کئے ہوئے ہے۔
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ
قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اُچک لے، جب ان کے لئے روشنی ہوتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں اور جب
اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ
ان پر اندھیرا چھا جائے تو کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ چاہتا تو انکی سماعت و بصارت چھین لیتا [20]
اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ﴿۲۰﴾ ع
بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ [21]

ع ۲ ۲

[20] اب منافقوں کے دوسرے گروہ کی مثال دی جا رہی ہے یہ لوگ سردارانِ منافقین میں سے نہ تھے بلکہ نسبی وخاندانی تعلقات کی وجہ سے عبداللہ بن ابی کی پیروی کر رہے تھے۔ یہ لوگ ڈانواں ڈول تھے، کبھی اسلام کی برکات دیکھ کر وہ سچے دل سے اسلام لانے کے بارے میں سوچتے پھر ان پر دنیوی خواہشات اور قبیلہ کی محبت غالب آ جاتی اور وہ

اپنے نفاق پر اڑ جاتے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ نے ان کی مثال یوں دی کہ دو منافقین بھاگ کر مشرکین مکہ کے پاس گئے، راستہ میں انہیں تیز بارش نے آلیا، اس بارش میں سخت گرج چمک بھی تھی، انہیں اپنی موت نظر آنے لگی تو انہوں نے موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، جب بجلی چمکتی تو انہیں کچھ راستہ نظر آتا اور وہ چند قدم چل پڑتے جب چمک ختم ہو جاتی اور اندھیرا چھا جاتا تو ٹھہر جاتے۔ آخر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہیں سے پلٹ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سچے مسلمان بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منافقین کے اس دوسرے گروہ کی غیر یقینی اور تذبذب کی حالت ان دو آدمیوں سے مختلف نہیں، کیونکہ قرآن مجید کی آیات ان پر بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ انہیں ہر دم یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی ایسی آیت نہ اتر آئے جو ان کے چہروں سے منافقت کا نقاب کھینچ دے یا ان کے قتال کا حکم دے دے تو قرآن اترنے پر یہ خوف کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھوس لیتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا گیا: يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ وہ ہر چیخ کو اپنے اوپر گرتی محسوس کرتے ہیں۔ (سورہ منافقون، آیت نمبر ۴)

ان کی حالت یہ ہے کہ جب ان کے باغات اچھے پھل دیں اور تجارت میں نفع ہو یا فتوحات میں مال غنیمت آئے تو سوچتے ہیں یہ دین سچا ہے اس میں صدق دل سے داخل ہو جانا چاہیے، لیکن جب باغات اچھے پھل نہ دیں تجارت میں نقصان ہو یا غزوات میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑے جیسے احد میں ہوا تو کہتے ہیں یہ سارا نقصان اسی دین کے اختیار کرنے سے ہوا ہے تب ان کا ارادہ دین سے پھر جاتا ہے۔ اللہ نے فرمایا: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کے وہ کان جن سے یہ حق نہیں سنتے اور وہ آنکھیں جن سے یہ حق نہیں دیکھتے سلب کر لیتا اور انہیں واقعتاً بہرہ اور اندھا کر دیتا، مگر اللہ نے انہیں ڈھیل دی ہے ان سے آخرت ہی میں سارے حساب چکائے گا۔

دنیوی مفادات کے لیے اسلام کا نام لینا منافقین کا کام ہے

معلوم ہوا دنیوی مفادات کیلئے اسلام کا نام لینا منافقین کا کام ہے، منافقین کے دل میں اس وقت ایمان کی محبت انگڑائی لیتی تھی جب انہیں اسلام کی وجہ سے مال غنیمت یا صدقہ وغیرہ ملتا اور اگر اسلام کی وجہ سے انہیں کوئی تکلیف آتی تو ان کی اسلام سے محبت بھی ختم ہو جاتی۔ آج مسلمانوں میں بہت سے مذہبی وسیاسی لیڈر اسی مرض کا شکار ہیں، جب انہیں سیاسی یا مالی مفاد نظر آتا ہو تو اسلام اسلام پکارنے لگتے ہیں، مفاد ختم ہوتے ہی ان کی محبت اسلام کا نشہ بھی اتر جاتا ہے ان کی حالت منافقین مدینہ سے مختلف نہیں، ایسے لوگوں کو جاننا چاہیے کہ دین کیلئے سختیاں تو اٹھانا ہی پڑتی ہیں حدیث مبارکہ میں ہے: ''جنت تکلیفوں میں لپیٹی گئی ہے اور دوزخ لذتوں میں۔'' (مسلم کتاب الجنۃ)

[21] آخر میں فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ ہر اس چیز پہ قادر ہے جو اس کی شان کے لائق ہے، بعض لوگوں نے اس سے استدلال کر کے کہا کہ اللہ تعالیٰ معاذ اللہ جھوٹ پہ بھی قادر ہے کیونکہ اللہ نے

علی کل شیء کہا ہے اور کل شیء میں جھوٹ بھی ہے۔ مگر ان کا یہ استدلال قطعی غلط ہے، کیونکہ شیء عربی لفظ ہے، جو شاء یشی ء کا مصدر ہے، جس کا معنی چاہنا ہے اور مصدر کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے کبھی بمعنی مفعول۔ اس جگہ بالاتفاق یہ بمعنی مفعول ہے، یعنی شیء بمعنی مشیء ہے، مطلب یہ ہے کہ شیء وہ ہے جس کا ہونا اللہ چاہے، اور جس چیز کا ہونا اللہ نہ چاہے وہ شیء ہی نہیں، اور جب اللہ جھوٹ یا کسی اور کام کو جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے، چاہتا ہی نہیں تو وہ شیء ہی نہیں، تو پھر اس پہ اللہ کے قادر ہونے کا کیا معنیٰ؟ اور جو چیز اللہ کی شان کے لائق نہیں اس کا چاہنا اللہ کے حق میں محال ہے، جیسے نیا خدا پیدا کرنا، اپنے لیے اولاد بنانا، بیوی رکھنا، جھوٹ، زنا، ظلم، دھوکہ دہی اور اسی طرح ہر گناہ اللہ کے لیے محال ہے۔ اور اللہ کا اس کو چاہنا بھی محال ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝٢١ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠
تاکہ تم پرہیز گار بنو۔ [22] اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا
وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا
اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس پانی سے تمہارے لئے پھلوں کا رزق پیدا کیا تو
تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝٢٢
اللہ کے لئے شریک نہ بناؤ جبکہ تم جانتے ہو۔ [23]

اللہ کی دنیوی واُخروی نعمتوں اور حقانیتِ قرآن کا بیان

[22] اس سے قبل مومنین کافرین اور منافقین تین گروہوں کا الگ الگ حال بیان ہوا اب ان سب کو مجموعی خطاب کے ذریعے فرمایا جا رہا ہے کہ اے سب انسانو! سنو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا اور تمہیں عبادت کا حکم اس لیے دیا جا رہا ہے کہ عبادت تمہارے اندر تقویٰ پیدا کرتی ہے کیونکہ عبادت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ انسان خود کو اپنے اللہ کے سامنے انتہائی عاجز و متواضع اور پست کردے۔

لہٰذا عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں بلکہ اللہ کے ہر حکم کے آگے بندے کا سر جھکا دینا اور اطاعت بجا لانا

حقیقت عبادت ہے۔ کسی نے خوب کہا کہ بندہ وہ ہے جو اللہ کے حکم میں بندھا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالتِ عامہ اور ختمِ نبوت:

یٰٓاَیُّہَا النَّاسُ کا خطاب تمام نسل انسانی کو گھیرے ہوئے ہے۔ قیامت تک آنے والے تمام انسان اس میں شامل ہیں۔ معلوم ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت و رسالت ساری نسل انسانی کیلئے ہے اس لیے دوسری جگہ واضح کر دیا گیا۔

قُلْ یٰٓاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا "اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں"۔ (سورہ اعراف، آیت نمبر ۱۵۸) جب آپ کی نبوت قیامت تک ہر انسان کیلئے ہے تو پھر آپ کے بعد کسی اور نبی کی کیا گنجائش ہے۔

پہلے انبیاء کسی خاص علاقہ یا قوم یا وقت کے لیے آتے تھے، لہٰذا دوسرے علاقوں دوسری قوموں اور دوسرے اوقات میں دوسرے انبیاء کی ضرورت ہوتی تھی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام زمانوں تمام قوموں اور تمام عالم کے لیے رسول بن کر تشریف لائے لہٰذا اب کسی زمانہ میں کسی قوم یا علاقہ کے لیے کسی رسول کی تا قیامت ضرورت نہیں ہے

دوسرے لفظوں ہم یوں سمجھا سکتے ہیں کہ پہلے انبیائے کرام ہدایت کے ستارے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آفتاب نبوت و ہدایت ہیں، اسی لیے ان کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ﴿۴۶﴾

اے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہم نے آپ کو گواہ بنایا اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنایا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور چمکانے والا آفتاب بنایا۔ (سورہ احزاب، آیت نمبر ۴۵، ۴۶)

ستارے خواہ ہزاروں لاکھوں چمکیں مگر اس سے روشنی نہیں ہوتی، صرف آسمان کی خوبصورتی بنتی ہے، پھر جب آفتاب نکل آتا ہے تو کسی ستارے کی ضرورت نہیں رہتی۔

کفار بھی احکام شرع کے مکلف ہیں:

یٰٓاَیُّہَا النَّاسُ اعْبُدُوْا سے پتہ چلا کفار بھی فروعاتِ دین کے مکلف ہیں کیونکہ یہاں الناس میں وہ بھی شامل ہیں اور انہیں عبادت کا حکم دیا جا رہا ہے اور عبادت میں تمام احکام اسلامی کا بجالانا داخل ہے لہٰذا کفار کو نہ صرف ایمان نہ لانے کا عذاب ہوگا بلکہ نماز روزہ حج وزکوٰۃ اور دیگر احکام شرعی کے بجانہ لانے کا بھی عذاب ہوگا۔

البتہ ایمان کے بغیر کافر کی کوئی عبادت مقبول نہیں کیونکہ ایمان سب عبادات کیلئے شرط ہے۔ جیسے نماز کیلئے وضو شرط ہے تو جیسے مومن سے کہا جاتا ہے کہ وضو کرو اور نماز پڑھو ایسے ہی کفار سے کہا گیا ہے کہ ایمان لاؤ اور اللہ کی ساری عبادات بجالاؤ۔ لہٰذا کفار کو نماز نہ پڑھنے اور زکوٰۃ نہ دینے اور دیگر احکام شرع کے بجانہ لانے کا بھی عذاب بھی ہوگا۔

اس کی دلیل یہ آیت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَتَسَآءَلُوْنَ ۙ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۙ﴿۴۴﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۙ﴿۴۶﴾ اہل جنت مجرموں (کافروں) سے پوچھیں گے تمہیں کس چیز نے جہنم میں پہنچایا؟ وہ کہیں گے ہم نماز نہ پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہ دیتے تھے (زکوٰۃ ادا نہ کرتے تھے) اور ہم (اسلام کے خلاف) باتیں بنانے والوں کے ساتھ باتیں بناتے اور روز قیامت کو جھٹلاتے تھے۔ (سورہ مدثر، آیت نمبر ۴۱۔۴۶)

اس آیت میں کفار اپنے جہنم میں جانے کا سبب جہاں یہ بتارہے ہیں کہ وہ روز قیامت کی تکذیب کرتے تھے، وہاں یہ بھی بتارہے ہیں کہ وہ نماز ادا نہیں کرتے تھے، اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، یعنی فرض زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے، صاف معلوم ہوا کہ کفار کو اپنے کفر کا بھی جہنم میں عذاب ہوگا اور نماز روزہ ترک کرنے کا بھی۔

[23] یعنی اے انسانو! جس رب نے تمہیں اور تمہارے باپ دادا کو پیدا کیا اور اس نے تمہارے لیے زمین کا بچھونا اور آسمان کا سائباں لگایا پھر آسمان سے بارش برسا کر زمین سے تمہارے لیے طرح طرح کے میوے پیدا کیے، اگر تم اس خالق و مالک کے ساتھ جھوٹے خداؤں کو عبادت میں شریک کرو تو یہ کس قدر افسوسناک اور ظالمانہ وغیر منصفانہ طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، یہ کہ تم اللہ کا کوئی مدِّ مقابل ٹھہراؤ جبکہ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا۔ (بخاری کتاب التفسیر سورہ آل عمران)

حقیقتِ شرک کیا ہے؟

یاد رہے! اللہ کیلئے شریک اور مد مقابل بنانا یہ ہے کہ کسی غیر خدا کیلئے اللہ جیسی ذات وصفات اور قدرت واختیار اور درجہ مانا جائے جیسے مشرکین مکہ کا حال تھا کہ اللہ نے فرمایا: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ ''ان کے جھوٹے خداؤں کو گالی نہ دو ورنہ وہ بدلے میں اللہ کو گالی دیں گے۔'' (سورہ انعام، آیت نمبر ۱۰۸)

معلوم ہوا وہ اپنے بتوں کو اللہ کا مد مقابل جانتے تھے بلکہ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر اپنے بتوں کی تعظیم تھی، یہی وہ شرک ہے جس کا سارے قرآن میں رد کیا گیا ہے۔ مگر آج کئی لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسلمانوں کو مشرک اور ابوجہل کا ساتھی بناتے پھرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان انبیاء واولیاء کا وسیلہ پکڑے یا ان کی قبور پر یا ان سے غائبانہ استغاثہ کرے تو وہ اسے مشرک قرار دیتے ہیں۔

حالانکہ مولانا رشید احمد گنگوہی پیشوائے علماءِ دیوبند لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کو متصرف بالذات اور عالم الغیب سمجھ کر یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ پڑھے تو وہ مشرک ہے اور اگر اس عقیدہ سے پڑھے کہ اللہ حضرت شیخ کو مطلع کر دیتا ہے اور وہ باذن اللہ اس کی حاجت برآری کر دیتے ہیں تو یہ شرک نہیں۔ (فتاویٰ رشیدیہ کامل صفحہ ۵۵ مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی)

اسی طرح غیر مقلد علماء کے پیشوا مولانا وحید الزمان حیدر آبادی لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص یہ گمان کرتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ یا اولیاء اللہ میں سے کسی کی سماعت سب لوگوں سے زیادہ ہے بایں حیثیت کہ سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے تو یہ شرک نہیں اللہ نے بعض فرشتوں بلکہ بعض حیوانات کو ایسی سماعت وبصارت دی ہے جو سب انسانوں سے بڑھ کر ہے۔ (ہدیۃ المہدی مشتمل بر عقائد اہل حدیث مطبوعہ امرتسر سن طباعت ۱۳۲۵ھ)

اے کاش! دیوبندی واہل حدیث علماء اپنے اکابر علماء کی تحریرات پڑھ لیں اور شرک بازی کے فتووں سے مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے سے گریز کریں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪
اور اگر تم اس (کتاب) کے بارہ میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے (خاص) بندے پر اتاری ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ
وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ
اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔ [24] پھر اگر تم
تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚۖ
ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز کر بھی نہیں سکتے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں،
اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝
وہ کافروں کے لئے بنائی گئی ہے۔ [25]

[24] گزشتہ دو آیات میں اللہ کی توحید بیان کی گئی اب رسالت محمدیہ کا اثبات کیا جا رہا ہے اور تمام اہل کتاب ومشرکین کو چیلنج دیا جا رہا ہے کہ اگر تم حضور ﷺ پر اترنے والی کتاب کو اللہ کی نازل کردہ کتاب سمجھنے میں شک رکھتے ہو تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ خواہ وہ سب سے چھوٹی سورت ہو۔

تمام جن اور تمام انسان مل کر قرآن جیسی ایک آیت نہیں بنا سکتے:

یاد رہے! اس سے قبل مکی سورتوں میں سے سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۸ میں کہا گیا: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ یعنی اگر تمام جن وانس مل کر قرآن جیسی کتاب لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے۔ چنانچہ کسی کو قرآن جیسی کتاب لانے کی جرأت نہ ہوئی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے سورہ ہود آیت ۱۳ میں فرمایا کہ اے منکرو! فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ، یعنی قرآن جیسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ مگر وہ یہ چیلنج بھی قبول نہ کر سکے۔

آخر ہجرت کے بعد یہاں سورہ بقرہ میں انہیں آخری چیلنج دیا گیا اور کہا گیا کہ اگر تم دس سورتیں بھی نہیں لا سکتے فاتوا بسورۃ، تو قرآن جیسی ایک ہی سورت لے آؤ اور اپنے ساتھیوں کو بھی مدد کیلئے بلا لو اور اگر تم قرآن جیسی ایک چھوٹی سورت بھی نہ لا سکو تو سمجھ لو کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ خدائے رحمٰن کا کلام ہے۔

کیونکہ ایک انسان جو چیز بنائے خواہ وہ کس قدر پیچیدہ ہو دوسرا انسان اس سے بہتر چیز بنا لیتا ہے آج چائنا ایک مشین بناتا ہے تو جاپان اس سے اعلیٰ مشین لے آتا ہے، اسلحہ، جہاز، راکٹ اور میزائل کی تخلیق میں مقابلہ چل رہا ہے۔ مگر آج تک ساری سائنسی قوتیں مل کر ایک مکھی یا مچھر بلکہ مچھر کا پر نہیں بنا سکیں کیونکہ یہ کسی انسان کی نہیں اللہ کی بنائی ہوئی چیز ہے یونہی اگر قرآن حضور ﷺ نے خود بنایا ہوتا تو شعراء عرب اس سے کہیں اعلیٰ کلام لے آتے مگر جب وہ اللہ کا کلام ہے تو اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

ایک انگریز مسٹر وڈ ویل (Wood will) نے قرآن کا ترجمہ کیا وہ لکھتا ہے کہ قرآن کو جیسے جیسے پڑھتے جاؤ پڑھنے والا حیران و مسخر ہوتا جاتا ہے۔ یہ پڑھنے والے سے اپنی تعظیم کروا کر چھوڑتا ہے اور بعض جگہ تو اس کے مضامین سخن کی غایت رفعت کو پہنچ گئے ہیں الغرض یہ کتاب ہمیشہ اپنا زور اثر دکھاتی رہے گی۔ (شہادۃ الاقوام صفحہ ۱۳) فرانس کا مشہور عیسائی محقق مسٹر کونٹ ہنروی کہتا ہے: عقل حیران ہے یہ قرآن ایسے شخص کی زبان سے صادر ہوا جو بالکل امی تھا مگر تمام شرق و غرب نے اقرار کیا کہ نوع انسانی لفظاً و معناً اس کی مثال لانے سے عاجز ہے۔ (شہادۃ الاقوام صفحہ ۱۴)

قرآن لازوال معجزۂ محمدی ہے:

معلوم ہوا حضور ﷺ کو لازوال ابدی معجزہ دیا گیا یعنی معجزۂ قرآن، پہلے انبیاء کے معجزات کی چمک وقتی طور پر نمودار ہوئی جیسے عصاء موسیٰ، دم عیسیٰ اور ناقۂ صالح علیہم السلام وغیرہ مگر قرآن کی چمک تا قیامت اپنی کرنیں بکھیر رہی ہے اور نبوت محمدیہ کی صداقت کے ڈنکے بجا رہی ہے۔ ؎

کیا خبر کتنے تارے کھلے چھپ گئے　　　پر نہ ڈوبے نہ ڈوبا ہمارا نبی

اصل معاملہ یہ ہے کہ دیگر انبیاء کو حسی و جسمانی معجزے دیئے گئے جبکہ سید الانبیاء ﷺ کو علمی و وجدانی معجزہ دیا گیا۔ جسم کو زوال ہے مگر علم کو زوال نہیں۔

عقیدۂ امتناعِ نظیر:

یہ بھی معلوم ہوا کہ جب قرآن کی نظیر ممکن نہیں تو جس رسول پر قرآن اترا اس کی نظیر کیسے ممکن ہے۔ قرآن تو ان کے

اخلاق کا نام ہے، کان خلقه القرآن جب اخلاق کی مثال ممکن نہیں تو صاحب اخلاق کی مثال کہاں سے آئے گی۔
ایک شخص نے بڑ لگائی تھی کہ اگر اللہ چاہے تو آن واحد میں کروڑوں محمد بنا ڈالے مگر علماء نے اس کا شدید رد کیا اور کہا کہ یہ کافرانہ و گستاخانہ کلام ہے۔ محمد مصطفیٰ ﷺ کی مثل دنیا میں نہیں لائی جاسکتی اگر اللہ آپ کے بعد آپ کی مثل دوسرا انسان لائے تو اسے رسول بھی بنایا جائے گا اور اس پر قرآن مجید جیسی کتاب بھی اتاری جائے گی جبکہ آپ پر باب نبوت بند کر دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی نبی آئے تو کذب باری تعالیٰ لازم آتا ہے، جو محال ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ کی نظیر کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

[25] یعنی اے منکرو! اگر تم قرآن جیسی ایک سورت بھی نہ لاسکو تو پھر تمہیں قرآن اور صاحب قرآن رسول کا انکار کرتے ہوئے اس نار جہنم سے ڈرنا چاہیے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور اس سے وہ پتھر مراد ہیں جن کی کفار پرستش کرتے ہیں گویا یہ بت جہنم میں اس لیے جائیں گے تاکہ اپنے پجاریوں کو عذاب دیں۔ اللہ نے فرمایا: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ (سورہ انبیاء، ۹۸) اور وہ نار جہنم کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ دنیا کی آگ نار جہنم کا ۷۰ واں حصہ ہے۔ (بخاری) معلوم ہوا جنت و نار تیار ہو چکی ہیں۔
اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۲۴ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوزخ کفار ہی کیلئے تیار کی گئی ہے۔ مومنوں کیلئے نہیں البتہ بعض مومن اپنے گناہوں کے سبب وہاں عارضی طور پر جائیں گے پھر وہاں سے نکال کر جنت میں بھیج دیئے جائیں گے اور دوزخ میں صرف کفار ہی ہمیشہ کیلئے رہ جائیں گے کیونکہ وہ انہی کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے آپ بشارت دے دیں کہ ان کے لئے جنتی باغات ہوں گے
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ
جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں جب بھی انہیں وہاں کا کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے
رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ
جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا اور انہیں ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے، [26] اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہیں
وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵
اور وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ [27]

[26] اس سے قبل قرآن پر ایمان نہ لانے والوں کیلئے عذاب جہنم بیان ہوا۔ اب قرآن پر ایمان لانے اور اس پر عمل کر کے نیکیاں کمانے والوں کو جنت کی بشارت دی جا رہی ہے کہ وہاں ان کیلئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

جنت کی چند جھلکیاں حدیث کی روشنی میں:

ان باغوں اور نہروں کی کیفیت حدیث میں یوں وارد ہوئی۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جنت کی زمین سفید ہے وہاں کھلے میدانوں میں کافور کے ٹیلے ہیں۔جن کے آس پاس کستوری کی ریت پھیلی ہوئی ہے۔وہاں نہریں بہہ رہی ہیں۔جب آدمی اپنی بیوی کے پاس جائے گا تو اس کا حسن پہلے سے بڑھ چکا ہوگا۔بیوی کہے گی میں آپ سے پہلے بھی محبت کرتی تھی اب پہلے سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔'' (ابن ابی الدنیا)

بروایت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کیا کوئی اس جنت میں جانے کو تیار ہے جس کے حسن کا کوئی تصور نہیں کرسکتا۔وہاں چمکتا نور، لہلہاتے پھول، بلند و بالا محلات، بہتی نہریں، پکے ہوئے پھل اور حسن و جمال کی پیکر بیویاں ہیں۔سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم تیار ہیں۔آپ نے فرمایا: تو پھر کہو ان شاء اللہ تو سب نے کہا ان شاء اللہ۔'' (ابن ماجہ، ابوداؤد وغیرہما)

بروایت حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت کی نہریں زمین میں کھدی ہوئی اور گہری ہوں گی؟ نہیں! وہ سطح زمین کے اوپر (قدرت ربانی سے) چل رہی ہیں ان کے دائیں بائیں موتیوں کے خیمے ہیں جن کی زمین مہکتی کستوری سے ہے۔'' (ابن مردویہ)

آگے فرمایا گیا کہ اہل جنت کو ملتے جلتے پھل دیئے جائیں گے جب ان کو کوئی پھل دیا جائے گا تو وہ کہیں گے ایسا پھل تو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا، اللہ کی طرف سے انہیں جواب دیا جائے گا کہ چکھو تو سہی اب اس کا نیا ذائقہ ہے یعنی وہ ایک بار جنتی سیب کھائیں گے تو اس کا ذائقہ اور ہوگا دوبارہ کھائیں گے تو ذائقہ اور ہوگا یعنی ایک پھل کے کئی ذائقے ہوں گے، وہ ہر پھل کی لذت ہر بار نئی سے نئی پائیں گے۔سبحان اللہ!

[27] یعنی اہل جنت کیلئے وہاں پاک بیویاں ہوں گی، جنہیں کوئی ناپاکی پیش نہ آئے گی یعنی وہ حیض ونفاس، پاخانہ وپیشاب اور بلغم وتھوک وغیرہ سے پاک ہوں گی۔ (بروایت حاکم عن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پوچھا گیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا ہم جنت میں اپنی بیویوں سے صحبت کریں گے۔آپ نے فرمایا ہاں! ایک آدمی ایک دن میں سو کنواری عورتوں سے صحبت کرے گا۔ (درمنثور عن بزار وطبرانی)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اہل جنت جب اپنی بیویوں سے جماع کریں گے تو وہ پھر کنواری ہوجائیں گی۔'' (کیونکہ ہمیشہ جوان رہیں گی) اور حدیث میں ہے کہ جنتی بیوی کے حسن و جمال کا یہ عالم ہوگا کہ اس کی پنڈلی میں سے ہڈی کا گودا نظر آئے گا اور ان کے مابین کبھی جھگڑا نہ ہوگا وہ صبح وشام اللہ کا ذکر کریں گے۔'' (بخاری ومسلم)

اس سے معلوم ہوا نیک بیوی جنتی نعمتوں میں سے ایک ہے، جیسے دنیوی پھل جنتی نعمتوں کا نمونہ ہیں کہ اس طرح کے پھل جنت میں ملیں گے ایسے ہی نیک بیوی بھی جنتی حور عین کے اخلاق اور اس کی راحت کا نمونہ ہے بلکہ دنیا کی وفادار بیویاں جنت میں ساتھ ہوں گی اور وہ ازواج مطہرۃ کا حصہ بنیں گی۔

اُمّ المومنین سیدہ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! بعض عورتیں متعدد شوہروں سے یکے بعد دیگرے نکاح کرتی ہیں وہ جنت میں کس کے ساتھ ہوں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایسی عورت کو اختیار دیا جائے گا اور جس خاوند کا اخلاق دنیا میں سب سے اچھا تھا وہ اسے اختیار کرے گی۔ (طبرانی کبیر)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْیٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا

بے شک اللہ اس سے عار نہیں رکھتا کہ کوئی بھی مثال بیان کرے خواہ مچھر کی یا اس سے بڑی چیز کی، تو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

جو لوگ ایمان لائے وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں

فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِیْ بِهٖ

وقف لازم

اس مثال سے اللہ کا کیا مقصد ہے؟ [28] اللہ اس کے سبب بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا اور بہت سوں کو

كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ۝۲۶ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ

ہدایت دیتا ہے اور وہ اس سے بدکرداروں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔ [29] جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد

بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِی

توڑ دیتے ہیں اور جس چیز کے ملانے کا اللہ نے حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ

الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

نقصان اٹھانے والے ہیں۔ [30]

[28] حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب اللہ نے بتوں کے رد میں یہ آیت اتاری کہ "اگر بتوں سے مکھی کچھ چھین لے تو وہ اس سے چھڑا نہیں سکتے۔" (سورہ حج آیت ۷۳) تو مشرکین مکہ نے کہا دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترنے والے کلام میں اللہ مکھیوں اور مکڑیوں کا ذکر کرتا ہے بھلا اللہ کو ایسی چیزیں بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تب اللہ نے یہ آیت

اتاری اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ط (درمنثور) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب اللہ نے منافقین کی حقیقت واضح کرنے کیلئے (گزشتہ رکوع میں مذکور) دو مثالیں بیان کیں تو منافقین نے کہا اللہ تعالیٰ ایسی مثالیں دینے سے بلند ہے، تو ان کے رد میں یہ آیت اتاری گئی (ابن جریر) ممکن ہے مشرکین مکہ اور منافقین مدینہ دونوں کے رد میں یہ آیت مبارکہ اتاری گئی ہو۔

بہرحال آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ چاہے تو بات سمجھانے کیلئے مچھر یا اس سے کسی بڑی چیز کی مثال بھی دے سکتا ہے اسے اس سے کوئی جھجک یا حیا مانع نہیں۔ کیونکہ ہر چیز اللہ کی مخلوق ہے اور ہر وقت اس کی نگاہ میں ہے اور اس کی پیدا کردہ ہر چیز میں اس کی قدرت کے جلوے موجود ہیں۔ یہ مچھر بظاہر بہت چھوٹا جاندار ہے اس کے مقابلہ میں ہاتھی بہت بڑا ہے مگر مچھر میں ہاتھی کے سارے اعضاء موجود ہیں حتیٰ کہ اس کی سونڈھ بھی بلکہ مچھر کے دو پر ہیں جو ہاتھی کے نہیں تو یوں مچھر کے اعضاء ہاتھی سے زائد ہیں۔ نمرود جیسے بادشاہ کی موت ایک مچھر ہی کے ذریعے ہوئی۔

اللہ کی کسی مخلوق کو حقیر نہ جانا جائے:

منافقین اور مشرکین نے کہا اللہ کو مکھی اور مکڑی کی مثال دینے کی کیا ضرورت ہے گویا انہوں نے ان چیزوں کو حقیر جانا حالانکہ اللہ کی پیدا کردہ ہر چیز میں حکمت اور عبرت ہے خواہ ہم اسے سمجھیں یا نہ، اللہ نے کوئی چیز بے کار نہیں بنائی۔ رہا یہ کہ مکھیوں، مچھروں کے مارنے کا حکم ہے تو اس کا یہ معنیٰ نہیں کہ انہیں بیکار بنایا گیا ہے ان کی تخلیق میں بھی حکمتیں ہیں جو اللہ جانتا ہے۔ خلیفہ مامون الرشید کو دوران خطبہ مکھی نے بار بار تنگ کیا جو اس کی آنکھ پر بیٹھ جاتی تھی۔ نماز کے بعد اس نے امام ابوھذیل سے پوچھا یہ مکھی اللہ نے کیوں بنائی ہے؟ انہوں نے کہا یہ اللہ نے بڑے جابر بادشاہوں کا غرور توڑنے کیلئے بنائی ہے۔

[29] یعنی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو مثالیں بیان کی ہیں ان سے مومن اور کافر کی پہچان ہوتی ہے کافر تو ان پر اعتراض کرنے لگے اور مومنین ان کے اعتراضات کے باوجود متذبذب نہ ہوئے گویا قرآن سن کر کئی لوگ گمراہ ہو گئے اور کئی نے ہدایت پالی اور گمراہ وہی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں جذبہ فسوق ہو کیونکہ قرآن کی مثال بارش کی طرح ہے بارش باغ پر برسے تو خوشبو پھیلتی ہے گندگی پر برسے تو بدبو پھیلتی ہے اس میں بارش کا قصور نہیں بلکہ گندگی کے اپنے مزاج کا قصور ہے۔ یہی قرآن کا حال ہے جو بارش کی طرح قلوب پر برستا ہے تو مومنوں کے قلوب میں نور ایمان پیدا کرتا اور منکروں کے دل میں تاریکی۔ معلوم ہوا وَمَا يُضِلُّ میں اللہ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت مجازی ہے اللہ کسی کو حقیقت میں گمراہ نہیں کرتا لوگ اپنی بدفطرتی کے باعث گمراہ ہوتے ہیں۔

[30] یعنی قرآن مجید سن کر وہی لوگ گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ کے اس وعدہ ازلی کو توڑتے ہیں جو اس نے عالمِ ارواح میں الستُ بربکم کہہ کر سب ارواح سے لیا تھا اور اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ اس کے رسولوں سے رشتۂ محبت

واطاعت جوڑنا اور وہ اس رشتے کو کاٹتے ہیں۔تو یقیناً یہی لوگ نقصان میں رہنے والے ہیں۔

وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ سے معلوم ہوا جو بھی شخص قرآن پڑھ کر وعظ کہتا یا کتابیں لکھتا ہو ضروری نہیں کہ وہ سچا ہی ہو بلکہ قرآن کے بقول کئی لوگ قرآن سے ہدایت کی بجائے اپنی بدفطرتی کے باعث گمراہی بھی حاصل کرتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کے وعدہ کو توڑتے ہیں۔آج مرزائی، چکڑالوی، خارجی، رافضی اور دیگر کئی گمراہ فرقے قرآن ہی سے استدلال لاتے ہیں۔اس لیے صرف کسی کو قرآن پڑھتا دیکھ کر اس کے پیچھے نہیں چل پڑنا چاہیے بلکہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا پس منظر کیا ہے کہیں وہ منکر حدیث، منکر عظمت رسالت، منکر عدالت صحابہ واہل بیت تو نہیں۔ اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ سے نقض عہد اور قطع رحمی کی برائی بھی معلوم ہوئی۔

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ ۚ ثُمَّ یُمِیْتُكُمْ ثُمَّ

تم کس طرح اللہ سے انکار کرتے ہو جبکہ تم بے جان (نطفہ) تھے تو اللہ نے تمہیں زندہ کیا پھر وہ تمہیں مارے گا پھر

یُحْیِیْكُمْ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ

زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔[31] اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾ ع

پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی تو انہیں برابر سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔[32]

[31] یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ سے جو بیان توحید شروع ہوا تھا اب اس کی ایک دلیل پیش کی جارہی ہے۔حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر یوں فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا لوگو! تم اللہ کی عظمت وتوحید سے انکار کیسے کرسکتے ہو جبکہ تم پہلے اپنے آباء کی صلبوں میں بے جان نطفوں کی صورت میں تھے، پھر اللہ تمہیں زندہ کرکے دنیا میں لایا پھر وہ تمہیں موت دے گا پھر روز قیامت تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔(ابن جریر)

حضرت مجاہد کہتے ہیں اس آیت کی تفسیر دوسری آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ اے اللہ! تو نے ہمیں دومرتبہ موت دی اور دومرتبہ زندہ کیا۔(سورہ مومن:۱۱) یعنی روز قیامت کفار کہیں گے اے اللہ! پہلی مرتبہ تو نے ہمیں زندہ کرکے ماں کے بطن سے نکالا اور دوسری مرتبہ زندہ کرکے قبر سے نکال کر حشر میں لایا۔تو جس رب کی یہ شان ہے اس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنا کس قدر حماقت ہے۔

[32] اللہ تعالیٰ کے سوا کون لائق عبادت ہوسکتا ہے جبکہ اللہ نے تمہارے لیے زمین کی ہر چیز پیدا کی پھر سات آسمان بنائے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

اباحتِ اصلیہ :

اس آیت میں هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ سے معلوم ہوا اللہ رب العزت نے زمین سے نکلنے والی ہر چیز انسان ہی کیلئے بنائی ہے تاہم بعض چیزوں کو اللہ نے ہمارے لیے نقصان دہ جانا تو انہیں حرام کر دیا لہٰذا جسے شریعت نے حرام نہیں کیا وہ ہمارے لیے حلال ہے، کیونکہ اسے اللہ نے ہمارے ہی لیے پیدا کیا ہے۔ گویا کسی چیز کے حرام ہونے کیلئے قرآن وحدیث کی نص چاہیے جس چیز پر حرمت کی کوئی نص نہ ہو تو یہی اس کے حلال ہونے کی دلیل ہے کیونکہ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ کی نص اسے حلال قرار دے رہی ہے۔

یہاں سے ان لوگوں کا رد ہوا جو میلا د النبی ﷺ محفل گیارہویں اور ختم شریف کے لیے بنائے کھانوں کو حرام کہتے ہیں، جب ایک مسلمان نے ایک کھانا حلال چیزوں سے تیار کیا ہے تو وہ حرام کیسے ہوگیا، مثلاً چاول پکائے گئے تو ان میں گھی، چاول چینی وغیرہ ڈالی گئیں تو کیا یہ چیزیں اللہ نے حلال نہیں بنائیں؟ جب یہ ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ حلال ہیں تو حلال جمع حلال جمع حلال نتیجہ حلال، ہاں صرف زائد کام یہ ہوا کہ محفل میلا د یا گیارہویں وغیرہ کے کھانے پر قرآن کریم پڑھا گیا ہے تو کیا قرآن کریم کی تلاوت کی وجہ سے یہ کھانا حرام ہوگیا ہے؟ **لا حول ولا قوۃ الا باللہ**

تلاوت کی وجہ سے تو کھانا بابرکت ہوجاتا ہے، صرف بسم اللہ پڑھنے سے اس قدر برکت ہوتی ہے کہ شیطان اس کے قریب نہیں آتا تو جہاں الحمد اللہ اور قل ھو اللہ بھی پڑھا جائے وہاں شیطان اس کھانے کے قریب کیسے آئے گا۔

مقصد خلقت انسانی :

خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر چیز انسان کی خدمت کیلئے بنائی گئی ہے انسان مخدوم ہے پھر انسان کس کیلئے بنایا گیا تو اللہ نے فرمایا: ہم نے انسان کو اپنی عبادت کیلئے بنایا۔ فرمایا **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون**، ''ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت ہی کے لیے بنایا ہے۔'' (سورہ ذاریات:۵۶) ؎

جانور پیدا ہوئے تیری رضا کے واسطے
کھیتیاں سرسبز ہیں تیری غذا کے واسطے
چاند سورج اور ستارے تیری ضیاء کے واسطے
سب جہاں تیرے لیے اور تو خدا کے واسطے

آسمان موجود ہے :

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ سے پتہ چلا آسمان موجود ہے۔ جدید سائنس آسمان کا وجود نہیں مانتی، مگر قرآن جو سائنسی علوم سے بھرپور کتاب ہے آسمان کا موجود ہونا بتا رہا ہے اس کے ہوتے ہوئے جدید

سائنس کا اس سے انکار بے معنی ہے۔ دراصل سائنس دان صرف چاند تک پہنچے ہیں اور چاند سورج اور دیگر ستارے سیارے خلاء (Space) میں ہیں اور آسمان خلاء سے بہت بلند ہے سائنس کی ابھی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا

اور (اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم) یاد فرمائیں جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، [33] فرشتوں نے کہا:

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

کیا تو زمین میں اسے بنائے گا جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کہتے

وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں؟ اللہ نے فرمایا: بیشک جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ [34]

قصہ تخلیق آدم علیہ السلام

[33] اس سے قبل والی آیت میں بیان ہوا کہ آسمان و زمین کی تخلیق انسان کیلئے ہوئی ہے تو اب کائنات ارضی و سماوی کے مقصود یعنی خود انسان کی تخلیق پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ تو اللہ نے فرمایا: "اے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! وہ وقت یاد فرمائیں جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔"

حضرت آدم علیہ السلام کس معنیٰ میں اللہ کے خلیفہ ٹھہرے؟

یہاں خلیفہ سے صرف آدم علیہ السلام مراد ہیں نہ کہ تمام انسان، امام ابن جریر فرماتے ہیں یہاں خلیفہ سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں اور یا ہر وہ شخص مراد ہے جو مخلوق میں قیام عدل واطاعت خداوندی کا جذبہ پیدا کرنے کیلئے حضرت آدم علیہ السلام والا فریضہ ادا کرے، اکثر مفسرین نے امام ابن جریر کی یہ رائے پسند کی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ زمین پر ایسی ہستی پیدا کرے جس کی اولاد زمین میں پھیلے اور وہ ان تک اللہ کے نائب کی حیثیت سے اللہ کا پیغام پہنچائے تاکہ وہ اس کے مطابق زندگی گزاریں اگر ان میں جھگڑا ہو تو اللہ کا نائب ان میں حکم خداوندی کے مطابق فیصلہ کرے۔ اگر ان میں سے کوئی قتل، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعے دوسرے لوگوں پر زیادتی کرے تو اللہ کا نائب اس پر اللہ کی مقرر کردہ سزا جاری کرے اور وہ اللہ کے حکم پر سر تسلیم خم کرنے والوں کو اللہ کی طرف سے مژدہ رضا سنائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے نائب کے طور پر پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی

ہے کہ جب اللہ عالی نے فرشتوں سے فرمایا:اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ توفرشتوں نے کہا وہ کس معنی میں خلیفہ ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کی زمین میں اولاد پھیلے گی پھر وہ زمین میں فساد کریں گے اور باہمی حسد میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کو قتل کریں گے (اور وہ ان کے درمیان بطور خلیفہ خدا عدل قائم کرے گا۔) (ابن جریر)

چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پہلے خلیفہ ٹھہرے پھر ہر نبی اللہ کا خلیفہ بن کر زمین میں خلافت الٰہیہ قائم کرتا رہا البتہ بعض انبیاء کرام نے اپنے پیروکاروں میں سے کسی کو اپنی مدد کیلئے حکومت وخلافت سپرد کی جیسے سورہ بقرہ میں قصہ طالوت مذکور ہے۔خلافتِ الٰہیہ کا یہ سلسلہ نبوت ورسالت کی صورت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا اور آپ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم ٹھہرے۔کیونکہ آپ سے پہلے خلفاء کی خلافت کسی خاص علاقہ،قوم اور زمانہ تک محدود تھی مگر خلیفہ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت تمام اقوام اور تمام زمانوں پر محیط ہے اور آپ تا قیامت اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں۔پھر چونکہ آپ پر سلسلہ نبوت ختم ہوگیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے بطور خلیفہ جو احکام قرآن وسنت کی صورت میں حاصل کیے وہ امت کو عطاء فرما دیئے اور حکم فرمایا کہ آپ کی امت اپنے میں سے مشاورت کے ساتھ بہتر شخص کو منتخب کر کے خلافت سونپتی رہے تا کہ وہ اللہ کے احکام لوگوں پر نافذ کرے۔اب آپ کی امت میں جو امراء آئیں گے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء ہیں اللہ کے خلفاء نہیں،اللہ کا خلیفہ صرف آپ ہیں کیونکہ اللہ کا خلیفہ وہ ہے جسے اللہ خود منتخب کرے اور یہ منصبِ نبوت ہے جو آپ پر ختم ہوگیا۔اسی لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''بنی اسرائیل میں جب ایک نبی فوت ہوجاتا تو اسکی جگہ دوسرا نبی آجاتا تھا،اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے البتہ میرے بعد خلفاء آئیں گے اور بکثرت آئیں گے۔''
(بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث ۳۴۵۵،مسلم کتاب الامارۃ حدیث ۴۴)

نظامِ خلافت کا قیام فرض ہے:

اس سے معلوم ہوا زمین میں نظامِ خلافت کا قیام مسلمانوں کا فریضہ ہے ایسا خلیفہ ہونا چاہیے جو اللہ کی شریعت اللہ کی زمین پر نافذ کرے۔کیونکہ اگر خلیفہ نہ ہو تو احکامِ الٰہیہ کا نفاذ کیسے ہوگا،چنانچہ مسلمانوں میں جب تک نظام خلافت رہا وہ دنیا میں غالب رہے سب سے قبل خلافت راشدہ قائم ہوئی جو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی۔اس کے بعد خلافتِ امویہ و خلافتِ عباسیہ کے ادوار چلے اگرچہ ان خلافتوں کے حامل خلفاء اکثر بدعمل تھے مگر بہر حال نظام خلافت کی برکت سے مسلمان دنیا میں سب سے غالب قوم تھے پھر آخر میں خلافتِ عثمانیہ قائم ہوئی اور اس کی وجہ سے مسلمان قوم تیرھویں صدی تک دنیا پہ سب سے غالب قوم بن کر رہی،پھر برطانیہ،امریکہ اور دیگر غیر مسلم طاقتوں نے مل کر خلافت عثمانیہ کے ٹکڑے کئے اور خود مسلمانوں میں سے غداروں نے یہود ونصاریٰ کی مدد کر کے ان کا کام آسان کیا اور یوں مسلمان 85 سے زائد ممالک میں بٹ کر بے قوت قوم بن گئے آج پھر ضرورت ہے کہ تمام مسلمان اکٹھے ہوں اور اپنا ایک خلیفہ قائم کریں اور تمام امتِ مسلمہ کی ایک متحدہ خلافت ہو تو آج بھی وہ دوبارہ دنیا کی غالب قوم بن سکتے ہیں۔نہیں تو اللہ آخر

زمانہ میں امام مہدی کو بھیجے گا اور ان کی خلافت میں تمام دنیا پر اسلام غالب ہوگا۔

یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں پر خلافت کا قیام لازم ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اس حالت میں مرا کہ اس کی گردن میں (کسی خلیفہ کی) بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرا۔''
(مسلم کتاب الامارۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ربوبیت الٰہیہ کا مظہر اتم ہیں:

اس جگہ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ میں اللہ کا اپنی ربوبیت کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے بیان کرنا اس لئے ہے کہ آپ اللہ کی ربوبیت الٰہیہ کا مظہر اتم اور قدرت خداوندی کا شاہکار اعظم ہیں کیونکہ آپ سے بہتر کوئی فرد خلق اللہ نے ساری کائنات میں نہیں بنایا بلکہ آپ پر اللہ نے اپنے پیدا کردہ ہر جمال و کمال کی انتہاء فرمادی اس لئے اپنی ربوبیت کو آپ کی طرف منسوب کرتے ہوئے رَبُّكَ فرمایا، اور قرآن میں قریباً دوسو سے زائد مرتبہ لفظ رَبُّكَ آیا ہے، اللہ نے خود کو رب السماوات یا رب العالمین چند ہی بار کہا ہے، مگر رَبُّكَ دوسو سے زائد بار کہا ہے، اسکی وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بتائی۔

[34] چونکہ فرشتوں کو اللہ نے خود فرمایا کہ جو وہ زمین میں خلیفہ بنانے والا ہے اس کی ذریت وہاں فساد کرے گی اور خون بہائے گی اور وہ ان کے مابین عدل قائم کرے گا تو فرشتوں نے کہا یا اللہ پھر ایسے خون ریز اور خوگر قتل و غارت لوگوں کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یعنی اے اللہ اگر مقصود یہ ہے کہ وہ تیری عبادت کریں گے تو تیری تسبیح و تقدیس اور حمد و عبادت جس قدر ہم کرتے ہیں وہ ہرگز نہ کرسکیں گے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پہلے آسمان کے فرشتے قیامت تک سجدے میں پڑے سبحان ذی الملك والملكوت پڑھ رہے ہیں دوسرے آسمان کے فرشتے تاقیامت رکوع میں جھکے سبحان ذی العزة والجبروت پکار رہے ہیں اور تیسرے آسمان کے فرشتے تاحشر قیام میں کھڑے سبحان الملك الحی الذی لا ینام ولا یموت کہہ رہے ہیں۔ (ابن جریر بروایت سعید بن جبیر)

مگر اللہ رب العزت نے ملائکہ کے اس قول کے جواب میں فرمایا اے فرشتو! جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے فرشتو! بیشک تم میری بہت تسبیح و تقدیس کہتے ہو مگر تمہاری سب تسبیح و عبادت اضطراری ہے اختیاری نہیں، تم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے کیونکہ یہ تمہاری غذا ہے اور کوئی چیز اپنی غذا کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ پھر تمہیں تسبیح و عبادت سے کوئی چیز مانع نہیں مگر انسان کی عبادت کی راہ میں ہزار ہا رکاوٹیں ہوں گی اسے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کیلئے محنت مزدوری کرنا پڑے گی۔ شیطان اسے عبادت سے روکنے پر زور لگائے گا پھر بھی ساری رکاوٹیں عبور کرکے تمام مصروفیات سے منہ موڑ کر انسان جب میرے حضور ایک سجدہ کرے گا تو اس کا وہ سجدہ تمہاری ہزار ہا سالہ عبادت پر بھاری ہوجائے گا۔

پھر تم نے صرف یہ سنا کہ وہ فساد کرے گا مگر جب اسی ہاتھ سے وہ تلوار اٹھا کر میری راہ میں جہاد کرے گا تو وہ میری رحمتوں کا سزاوار ٹھہرے گا۔ وہ جن ہاتھوں سے گناہ کرے گا وہی ہاتھ جب میری بارگاہ میں توبہ کیلئے اٹھائے گا تو اس کے لئے میرا دریائے رحمت جوش میں آ جائے گا۔ لہٰذا جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

پھر جو عبادات وہ کرے گا تم کر ہی نہیں سکتے۔ مثلاً بھوکا پیاسا رہ کر روزہ رکھنا، میٹھی نیند سے بیدار ہو کر نماز پڑھنا، راہ خدا میں مال لٹانا، خواہش کے باوجود بے حیائی کی طرف نگاہ نہ اٹھانا، جان ہتھیلی پہ رکھ کر میدان جہاد میں اترنا۔ نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھ کر گناہوں سے بچنا اور گناہ ہو جانے کی صورت میں رو رو کر معافی مانگنا یہ ساری عبادات انسان ہی کرے گا تم نہیں کر سکتے کیونکہ تم بھوک، پیاس، نیند اور نفسانی خواہشات سے خالی ہو۔

بندۂ مومن کی عبادت کی عظمت:

معلوم ہوا انسانی عبادت ملکوتی عبادت سے کہیں اعلیٰ ہے بلکہ انسان کی عبادت پر اللہ فرشتوں کے سامنے اظہار فخر فرماتا ہے۔ ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مغرب کے بعد نماز عشاء کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تمہیں مبارک ہو اللہ نے آسمان کا ایک دروازہ کھولا اور فرشتوں کے سامنے مباہات (فخر) کرتے ہوئے فرمایا دیکھو میرے بندے (دن بھر کی تھکن کے باوجود نیند سے منہ موڑ کر) ایک فریضہ کے بعد دوسرے فریضہ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

(ابن ماجہ ابواب المساجد)

مومن کا فرشتوں سے افضل ہونا

یہیں سے معلوم ہوا کہ عوام بشر، عوام ملائکہ سے افضل ہیں، اور خواص بشر، خواص ملائکہ سے افضل ہیں یعنی عام مؤمنین عام فرشتوں سے افضل ہیں اور خاص بشر جیسے انبیاء اولیاء خاص ملائکہ سے افضل ہیں (سوائے رسل ملائکہ کے، کہ وہ غیر رسل بشر سے افضل ہیں) اسی لیے اللہ نے فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ یعنی ایمان اور عمل صالح والے لوگ ساری مخلوق سے افضل ہیں۔ (سورۃ البینہ، آیت نمبر ۷)

مشاورت کی اہمیت:

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں مشاورت کی کیا اہمیت ہے۔ اللہ عالم الغیب ہے وہ جانتا ہے فرشتے اس کے سوال میں کیا جواب دیں گے پھر بھی وہ فرشتوں سے تخلیق انسانی کے بارے میں ان کی رائے لیتا ہے تا کہ اہم امور میں مشاورت کی اہمیت واضح ہو۔ تو ہم نادان انسانوں کو لازماً ہر اہم کام مشورہ ہی سے کرنا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مشاورت کا حکم دیا گیا حالانکہ آپ صاحب وحی ہیں، چنانچہ فرمایا گیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝ ''اے نبی اکرم

آپ اپنے ساتھیوں سے کارِ حکومت میں مشورہ لیں پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پہ بھروسہ کریں (کام میں لگ جائیں) بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو پسند رکھتا ہے۔'' (آل عمران،۱۵۹)

چنانچہ نبی اکرم ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہر اہم معاملہ میں مشاورت فرماتے تھے، مشاورت کا یہ فائدہ ہے کہ اس سے کسی معاملہ کے تمام اچھے برے پہلو کھل کر سامنے آجاتے ہیں، اور انسان کسی اندھیرے میں نہیں رہتا، مشورہ میں دیکھا گیا ہے کہ کبھی ایک بچہ بھی ایسی بات کہہ دیتا ہے جو تیر بہ ہدف ہوتی ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِیْ

اور اللہ نے آدم علیہ السلام کو (سب چیزوں) کے نام سکھلائے [35] پھر وہ چیزیں فرشتوں پر پیش کیں تو فرمایا مجھے ان چیزوں کے

بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا

نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ فرشتوں نے کہا: اے اللہ! تو پاک ہے ہمارے پاس کچھ علم نہیں مگر وہی جو تو نے

عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ

ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔ [36] اللہ نے فرمایا: اے آدم! فرشتوں کو ان چیزوں کے

بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ

نام بتاؤ جب آپ نے انہیں ان کے نام بتائے تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں

غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور زمین کی سب چھپی چیزیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو چھپاتے ہو وہ (بھی) جانتا ہوں؟۔ [37]

[35] بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مشاورت کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرما دیا۔ ان کی پیدائش کن مراحل سے گزر کر ہوئی وہ ایک طویل مضمون ہے۔ اس کی تفصیل کیلئے تفسیر ''درمنثور'' میں یہی مقام دیکھیں۔ تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو علم الاسماء سکھایا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہیں ہر چیز کا نام بتایا گیا حتیٰ کہ جنگلی چوہوں کی سوراخوں اور چھوٹی بڑی پھسکیوں (ہوا خارج ہونے کی آوازوں) کے نام بھی بتا دیئے گئے (ابن جریر)۔ امام ابن کثیر فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ اللہ نے انہیں تمام اشیاء کے اجزاء اور ان کی صفات و افعال اور ناموں سے آگاہ فرمایا (تفسیر ابن کثیر) اب ایک چیز کا نام مختلف زبانوں میں مختلف ہے جیسے ایک ہی چیز کو اردو

میں پانی، فارسی میں آب، عربی میں ماء، انگلش میں water، اور ہندی میں جل وغیرہ کہتے ہیں، اس سے اشارہ ملتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سب زبانیں بھی سکھائی گئیں۔

الغرض آپ کو تمام انسانی حالتوں اور تمام ارضی مخلوق کے مختلف عوارض، حالات اور افعال بتائے گئے۔ یہ علم ایسا تھا جو صرف انسان ہی جان سکتا تھا مثلاً بھوک پیاس، نیند، جاگنا، شکم سیری، غصہ، شہوت، حرص، لالچ، درد، پریشانی، گرمی، سردی وغیرہ، فرشتے نہ ایسا مزاج رکھتے ہیں نہ ان الفاظ کا معنی سمجھ سکتے ہیں۔ تو انسان ہی یہ علم الاسماء جان سکتا تھا۔ اگر کہا جائے کہ فرشتوں میں ایسا مزاج پیدا کر کے انہیں بھی یہ علم دیا جا سکتا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب فرشتوں کو انسان بنا دیا جاتا، تو پھر انسان اور فرشتے میں کیا فرق رہ جاتا۔ یاد رہے! آدم علیہ السلام کو ارضی خلیفہ بنایا گیا تھا لہٰذا انہیں ارضی اشیاء میں سے ہر چیز کا علم دیا جانا ضروری تھا۔

خلافت کا حقدار عالم ہی ہو سکتا ہے:

جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین کا خلیفہ بنایا گیا تو انہیں زمین سے متعلقہ ہر ہر چیز کا علم دیا گیا، دوسرے لفظوں میں جس کو جو ذمہ داری سونپی جائے اسے اس کی تفصیلات سے آگاہ ہونا ضروری ہے اور جس کا علم اس بارے میں جتنا زیادہ ہو وہ اس ذمہ داری کا اتنا ہی زیادہ اہل ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ علم میں سب صحابہ سے ممتاز تھے اس لیے وہی خلافت کے مستحق ٹھہرے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''جو اللہ نے میرے سینے میں ڈالا میں نے ابوبکر کے سینے میں ڈالا۔'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ ''میں نے خواب میں دودھ پیا اور بچا ہوا عمر کو دیا اور اس کی تعبیر علم ہے۔'' (بخاری کتاب العلم) دور خلفاء راشدین میں اسی شخص کو امارت (کسی علاقہ کی گورنری) سونپی جاتی تھی جس کے پاس قرآن کا علم زیادہ ہوتا۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے ''جب نااہلوں کو معاملات سونپے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو۔'' (بخاری کتاب العلم) خلافت راشدہ کے بعد امتِ مسلمہ کی یہی بدقسمتی رہی ہے کہ اس کی زمامِ اقتدار اکثر جاہل خلفاء، نااہل ملوک اور ظالم سلاطین کے ہاتھ میں رہی، اور آج امت مسلمہ اٹھاون ممالک میں بٹ گئی ہے اور ان کے حکمران قریباً سبھی علم دین سے بے بہرہ ہیں، بلکہ ان میں سے کئی تو دین سے بیزار بلکہ دین دشمن ہیں، تو پھر ہمارے حال پہ اللہ ہی رحم فرمائے۔

سائنسی علوم کی افادیت اور اہمیت:

حضرت آدم علیہ السلام کو تمام سائنسی علوم بھی سکھائے گئے اور یہ چیز علم الاسماء میں شامل ہے کیونکہ صرف نام کا بتا دینا بے کار ہے جب تک نام کا معنی و مفہوم نہ بتایا جائے، مثلاً کسی کو ایک مشین کے اجزاء کے نام بتا دیے جائیں مگر یہ نہ بتایا جائے کہ ان اجزء کا کام کیا ہے تو صرف نام بتا دینا بیکار ہے، آپ کو ہر چیز کے اجزاء اور ان اجزاء کے افعال اور نام بتایے گئے، مثلاً آپ کو حیوانات کے مختلف احوال اور افعال بتائے گئے، اور ہر حال اور فعل کا نام بتایا گیا، یہ حال یہ علم

الحیوانات ہے۔ ستاروں کے نام خواص احوال اور عوامل بتائے گئے یہ علم فلکیات ہے زمین سے اگنے والے ہر پودے اور اس کے احوال وخواص بتائے گئے یہ علم نباتات ہے۔ یعنی انسان اول آدم علیہ السلام کو تمام سائنسی علوم سے آگاہ کر کے بتایا گیا کہ انسانی ترقی کا راز ان علوم میں مضمر ہے۔

افسوس! مسلمانوں کے اسلاف نے ہر دور میں ہر علم میں کمال حاصل کیا اور وہ دنیا پر چھائے رہے پھر مسلمانوں نے سائنسی علوم سے منہ موڑ لیا اور دوسری قومیں مسلمانوں کی تحقیقات سے استفادہ کر کے ترقی کر گئیں اور مسلمانوں کو دبا لیا۔ علامہ ابوریحان البیرونی کی کتاب ''القانون'' آج بھی لندن کی کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے اسے وہ The book of Kenon کہتے ہیں وہ علامہ بیرونی کو علم فلکیات کا موجد تصور کرتے ہیں۔ علامہ بیرونی نے آج سے آٹھ سو برس پہلے منازل شمس وقمر کی جو تفصیلات لکھیں جدید سائنس تمام تر ترقی وتحقیقاتِ جدیدہ کے باوجود علامہ بیرونی کے مرتب کردہ ان قوانین فلکیات میں سے کسی قانون کا انکار نہیں کر سکی، انکار تو کجا اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکی۔ افسوس آج ہم غیروں کے دست نگر اور ان کے غلام ہو کر رہ گئے۔ آج غلبہ اسلامی کیلئے مسلمانوں کا سائنسی علوم میں ترقی کرنا بے حد ضروری ہے البتہ اس کے ساتھ جذبہ ایمانی وحرارت دینی بھی لازم ہے بلکہ اس کے تحت علوم پڑھنا چاہیے۔

[36] جب آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام بتا دیا گیا تو اللہ نے وہ چیزیں فرشتوں کے سامنے پیش کیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ نے فرشتوں پر مخلوق پیش کی۔ حضرت مجاہد کہتے ہیں: **عرض اصحاب الاسماء علی الملائکۃ** یعنی اللہ نے نام والی چیزیں فرشتوں پہ پیش کیں اور پھر فرشتوں سے ان چیزوں کے نام پوچھے گئے انہوں نے اپنے عجز کا اعتراف کرنے میں دیر نہ لگائی اور کہا اے اللہ! ہمیں اسی قدر علم ہے جتنا تو نے ہمیں دیا۔ تب حضرت آدم علیہ السلام سے اللہ نے فرمایا کہ وہ ان چیزوں کے نام بتائیں۔ انہوں نے سب نام بتا دیئے حضرت زید بن اسلم تابعی فرماتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام بتانے لگے تم جبریل ہو، تم میکائیل ہو، تم اسرافیل ہو حتیٰ کہ کوے اور کبوتری کے نام بھی بتا دیئے۔
(تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۷۸)

[37] جب فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کے علم کے سامنے بے بس ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے فرشتو! کیا میں نے تمہیں کہا نہ تھا کہ میں آسمان وزمین کے سب راز جانتا ہوں یعنی مجھے معلوم ہے کہ میں زمین میں جو اپنا نائب بنانے والا ہوں اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور اس کیلئے اسے کن علوم کی ضرورت ہے اور تم وہ علوم حاصل کر ہی نہیں سکتے اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں فرشتوں نے ظاہر تو صرف یہی کیا کہ انسان زمین میں خون ریزی کرے گا اور دل میں یہ چھپایا تھا کہ ہم سے بہتر کوئی مخلوق نہیں جو اللہ کو ہم سے زیادہ پیاری ہو تب وہ خلق آدم کی آزمائش میں پڑے۔ (ابن جریر)

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى

اور یاد کرو! جب ہم نے فرشتوں سے کہا: کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا ابلیس کے سوا، اس نے انکار کیا

وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور خود کو بڑا سمجھا اور کافروں میں سے ہوگیا۔[38]

[38] جب فرشتے علم آدم علیہ السلام کے سامنے عاجز آ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تا کہ اس بات کی معذرت ہو جائے جو تم نے کہا تھا کہ اس انسان کو بنانے کی کیا ضرورت ہے یہ تو خون ریزی وفساد کرے گا اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام نے تمہیں یہ معلومات دیں اور چیزوں کے نام بتائے تو وہ تمہارے معلم ٹھہرے اور استاذ کا ادب بجالانا چاہیے لہٰذا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو اور انسانوں کو یہ بات اس لیے یاد دلائی گئی ہے کہ تا کہ وہ اپنے جداعلیٰ پہ ہونے والے اس احسان عظیم پر خوش ہوں اور اللہ کے حضور سجدہ شکر بجالائیں، چنانچہ سب فرشتے حضرت آدم کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجود ملائکہ، اور اس بارہ میں بعض شبہات کا ازالہ:

حدیث میں ہے حضرت اسرافیل علیہ السلام نے سب سے پہلے سجدہ کیا تو ان کی پیشانی پر سارا قرآن لکھا گیا۔(تفسیر ابن ابی حاتم، ابن عساکر) معلوم ہوا یہ مکمل سجدہ تھا جس میں پیشانی زمین پر رکھنا شامل تھا، بعض لوگوں نے فرشتوں کے سجدے کو محض زبانی اظہار تعظیم پر محمول کیا ہے مگر یہ غلط ہے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب ابن آدم آیت سجدہ پر سجدہ کرتا ہے تو شیطان ایک طرف ہٹ کر رونے لگتا ہے، کہتا ہے صد افسوس! ابن آدم کو حکم ہوا تو اس نے سجدہ کر دیا اسے جنت ملے گی مجھے حکم ہوا تو میں نے سجدے سے انکار کیا مجھے دوزخ ملے گی۔'' (مسلم کتاب الایمان حدیث ۱۳۳) معلوم ہوا فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو اسی طرح سجدہ کیا جیسے آیت سجدہ پر سجدہ کیا جاتا ہے۔

بعض لوگوں نے کہا فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تھا بلکہ سجدہ اللہ کو تھا اور حضرت آدم مثل قبلہ تھے یعنی وہ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ کو الی اٰدم کے معنی میں لیتے ہیں مگر یہ رائے بھی غلط ہے۔ امام رازی علیہ الرحمہ نے اس کا سخت رد فرمایا ہے۔ ان کے بقول لِاٰدَمَ کو الی اٰدم کے معنی میں لینا دور از کار تکلف ہے۔ کیونکہ پہلی امتوں میں غیر خدا کو سجدہ تعظیمی ویسے ہی جائز تھا جیسے برادران یوسف علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ تعظیمی کیا۔ (تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۶۰)

میں کہتا ہوں حضرت آدم علیہ السلام کو سجود ملائکہ میں مثل کعبہ قرار دینے میں ان کی فرشتوں پر برتری ثابت نہیں ہوتی۔ کیونکہ حدیث میں ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''بندہ مومن کی حرمت اللہ تعالیٰ کے ہاں کعبہ سے زیادہ

ہے۔'' (ترمذی کتاب البر حدیث ۲۰۳۲، ابن ماجہ کتاب الفتن حدیث ۳۹۳۲)

تو جیسے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والوں پر قبلہ کی کوئی برتری نہیں اسی طرح اگر آدم علیہ السلام بھی سجودِ ملائکہ میں مثل قبلہ ہی تھے تو فرشتوں پر حضرت آدم علیہ السلام کی کیا برتری ثابت ہوئی۔ حالانکہ یہ سجدہ برتری ہی کے لئے تھا اسی لئے اس سے انکار کرتے ہوئے شیطان نے کہا اَنَا خَیْرٌ منه بلکہ یہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا واضح قول ہے کہ فرمایا: کانت السجدة لآدم والطاعة لله ''فرشتوں کا سجدہ تو آدم علیہ السلام کیلئے تھا اور فرمانبرداری اللہ تعالیٰ کیلئے''۔
(ابن ابی حاتم جلد اول صفحہ ۸۴ حدیث ۳۶۱، ابن جریر)

شیطان جنات میں سے تھا، نہ کہ فرشتوں میں سے:

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ کہ ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ اس آیت سے استدلال کر کے بعض علماء نے کہا کہ شیطان فرشتوں میں سے تھا، اگر وہ فرشتوں میں سے نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اِلَّا ابلیس کہہ کر اس کا فرشتوں میں سے استثناء کیوں فرماتا، مگر یہ دلیل بہت کمزور ہے، استثناء منقطع بھی ہوتا ہے، جیسے جاء القوم الا عبیدھم، قوم آئی مگر ان کے غلام نہ آئے، ابلیس کا سجدہ کرنے والوں میں سے استثناء اس لیے نہیں کہ وہ فرشتوں میں سے تھا۔ صحیح یہ ہے کہ وہ جنات میں سے تھا، قرآن میں ہے: كَانَ مِنَ الْجِنِّ وہ جنوں میں سے تھا۔ (سورہ کہف: ۵۰) اور ابلیس نے کہا تھا: خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۶۱﴾ اے اللہ مجھے تو نے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے۔ (سورہ اعراف: ۱۲)

معلوم ہوا شیطان فرشتوں میں سے نہ تھا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فرشتے نور سے پیدا کیے گئے اور جن بھڑکتی آگ سے۔ (مسلم عن عائشہ رضی اللہ عنہا کتاب الزہد حدیث ۶۰) پھر اگر شیطان فرشتوں میں سے ہوتا تو اللہ کی نافرمانی نہ کر سکتا کیونکہ اللہ فرماتا ہے: لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾ فرشتے اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جاتا ہے اسی کو بجالاتے ہیں۔ (تحریم، ۶)

بلکہ اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ صرف اس لیے فرمایا گیا کہ ابلیس کثرت عبادت کے سبب فرشتوں میں رہائش پذیر ہو گیا تھا، اس لیے حکم سجدہ میں اسے بھی شامل رکھا گیا تھا۔ اس پر ابن جریر اور درمنثور میں متعدد روایات ہیں۔ گویا الا ابلیس استثناء منقطع ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے جاء القوم الا فرسھم، یعنی قوم آئی مگر انکا گھوڑا نہ آیا تو جیسے گھوڑا قوم میں سے نہیں ہے اسی طرح ابلیس بھی فرشتوں میں سے نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ابلیس کو یہ نام اس لیے دیا گیا کہ ابلسه الله من الخیر یعنی اللہ نے اسے بھلائی سے مایوس کر دیا۔ قرآن میں ہے: فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ تو جب وہ مایوس ہیں۔ (انعام آیت ۴۴) تو ابلیس ابلس یبلس سے مشتق ہے جس کا معنی مایوس ہونا یا کرنا ہے، ورنہ اس کا اصل نام ''عزازیل'' کتابوں میں مشہور ہے۔ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو نہ صرف سجدہ کرنے سے انکار کیا بلکہ ان کی گستاخی کی کہ خود کو ان سے افضل قرار

دیا اور کہا: میں ان سے بہتر ہوں مجھے آگ سے بنایا گیا ہے اور آدم کو مٹی سے، اس تکبر نے اسے ذلیل و رسوا کر دیا۔

استاذ کی تکریم:

فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام نے چیزوں کے نام بتائے تو وہ ان کے استاذ ٹھہرے تب فرشتوں کو اپنے استاذ کی تعظیم بجالانے کیلئے انہیں سجدہ کا حکم دیا گیا یہاں سے استاذ کی تعظیم وتکریم کا درس ملتا ہے۔ استاذ کی تکریم والد کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ والد انسان کی جسمانی تربیت کرتا ہے اور استاذ علمی و روحانی تربیت کرتا ہے۔

تکبر کی مذمت اور تواضع کی فضیلت:

ابلیس تکبر کے سبب کافر اور راندۂ درگاہ ہو گیا بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ تاریخ عالم میں پہلا گناہ تکبر ہوا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا یہ گناہ جنت سے دور کرنے والا ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے جس کے دل میں رائی کے دانہ برابر تکبر ہو وہ جنت میں نہ جائے گا۔ (ابوداؤد کتاب اللباس) اور یہاں سے تواضع کی فضیلت بھی معلوم ہوئی، فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے سجود سے عار نہ کی، بلکہ فوراً سجدے میں گر گئے سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام نے سجدہ کیا تو ان کی پیشانی پر قرآن آ گیا۔

نص صریح کے مقابلے میں قیاس پیش کرنا کار شیطان ہے:

شیطان کو سجدہ کا صریح حکم ہوا۔ ابلیس نے کہا میں آدم سے بہتر ہوں آگ سے بنی چیز مٹی سے بنی چیز کے آگے جھک جائے یہ میرے قیاس و عقل کے خلاف ہے، تو نص کے مقابلہ میں شیطان کا قیاس اس کے منہ پر مار کر اسے جنت سے دھکا دے دیا گیا۔ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں غلط مشہور کر دیا گیا ہے کہ آپ قرآن وحدیث کے مقابلہ میں اپنے قیاس کو ترجیح دیتے ہیں، اور احناف کو اہل رائے کہہ کر طعنہ دیا جاتا ہے، حالانکہ جس طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وسنت سے تمسک اور ان کے مقابلہ میں قیاس کی تردید کی ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

چنانچہ جب امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ سے پوچھا: سنا ہے آپ قرآن وسنت کے مقابلہ میں اپنے قیاس کو ترجیح دیتے ہیں، امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ قطعی غلط ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میراث میں بیٹے کے لیے بیٹی سے دوگنا حصہ ہے اور میں بھی یہی کہتا ہوں اگر میں اپنے قیاس کو ترجیح دیتا تو بیٹی کو دوگنا حصہ دیتا اور بیٹے کو ایک کیونکہ عورت کمزور ہے اور مدد کی زیادہ حقدار ہے، پھر فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موزوں کے اوپر مسح کیا ہے اور میں بھی ایسے کرتا ہوں اگر میں اپنے قیاس کو ترجیح دیتا تو موزوں کے نیچے مسح کرتا کیونکہ زمین پہ چلتے ہوئے پاؤں یا موزوں کے نیچے گندگی لگتی ہے نہ کہ اوپر، اور جب کسی کی ہوا خارج ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے لیے وضو لازم کیا ہے استنجاء لازم نہیں اور میں بھی ایسے ہی کہتا ہوں اگر میں اپنے قیاس کو ترجیح دیتا تو وضو کی بجائے استنجاء کا حکم دیتا کیونکہ ہوا کا مقام خروج ہاتھ پاؤں نہیں ہیں، امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کو سینے سے لگایا، ماتھا چوما اور دعاء

خیر فرمائی۔(مناقب الامام ابی حنیفہ)

انبیاء سے گستاخی کرنا کفر ہے:

شیطان اگر آدم علیہ السلام کو صرف سجدہ نہ کرتا تو شاید اسے معاف کر دیا جاتا کیونکہ سجدہ نہ کرنا ایک گناہ ہے کفر نہیں، آج مسلمان ہزاروں نمازیں ترک کرتے ہیں مگر کافر نہیں ٹھہرتے۔ مگر جب اس نے خود کو ان سے بہتر قرار دے کر ان کی شان میں گستاخی کی تو اسے کافر قرار دیا گیا۔ معلوم ہوا انبیاء کی توہین کفر ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا: لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۰۴) گویا نہی کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رَاعِنَا کہنا کافروں کا طریقہ بتایا گیا کیونکہ اس میں سوئے ادب کا پہلو تھا۔

کوئی غیر نبی کسی نبی سے افضل نہیں ہوسکتا:

شیطان بہت عابد وزاہد اور اپنی عبادت کے سبب فرشتوں میں رہائش پذیر تھا وہ اپنی عبادت کے سبب ملکوتی صفات کا حامل بن کر فرشتوں میں رہتا تھا مگر جب اس نے خود کو ایک پیغمبر سے افضل کہا تو کافر ہو گیا۔ لہٰذا کسی غیر نبی کو کسی نبی سے افضل ماننا کفر ہے۔ امام شاہ فضل الرسول فرماتے ہیں: و کذالك نقطع بتكفير غلاة الرافضة فى قولهم ان الائمة افضل من الانبياء، ہم غالی شیعوں کے کافر ہونے میں شک نہیں رکھتے کہ انہوں نے آئمہ اہل بیت کو انبیاء سے افضل مانا۔(المعتقد المنتقد صفحہ ۱۳۰ مطبوعہ استنبول ترکی)

حضرت ملا علی القاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: فما نُقل عن بعض الكرامية من جواز كون الولى افضل من النبى كفر وضلالة والحاد وجهالة، ”تو فرقہ کرامیہ سے جو منقول ہوا ہے کہ ولی نبی سے افضل ہوسکتا ہے تو یہ کفر وضلالت اور الحاد وجہالت ہے۔“(شرح فقہ اکبر صفحہ ۲۱۰ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

بارہ اماموں کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل کہنا کفر ہے

اور یہاں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اہلِ تشیع واقعتاً بارہ ائمہ اہل بیت کو تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے اسقدر افضل مانتے ہیں کہ ان کے بقول سب انبیاء کو انکے صدقہ میں نبوت ملی ہے، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جس نبی نے مقام اہل بیت سے حسد کیا اللہ نے اسے کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو جنت میں حکم ہوا تھا کہ مقام پنج تن پاک کو بنظر حسد نہ دیکھنا ورنہ تمہیں جنت سے نکال دیا جائے گا، مگر جب ان کے دل میں پنج تن پاک کا حسد آیا تو انکو جنت سے نکال دیا گیا۔(تفسیر عیاشی جلد اول صفحہ ۴۱ مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ تہران) یقیناً یہ کفریہ عقائد ہیں۔

مرزا قادیانی کا خود کو تمام انبیاء ورسل سے افضل قرار دینا

اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی کا کفر بھی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس نے بھی خود کو تمام انبیاء سے افضل قرار دیا ہے، وہ اپنے فارسی اشعار میں کہتا ہے۔

آدم نیز احمد مختار در برم جامۂ ہمہ ابرار
آنچہ داد است ہر نبی را جام داد آں جام را مرا بتمام
انبیاء گرچہ بودہ اند بسے من بعرفاں نہ کم ترم ز کسے
زندہ شد ہر نبی بآمدنم ہر رسولے نہاں بپیر ہنم

ترجمہ: ۱- یعنی میں آدم ہوں نیز میں ہی احمد مختار ﷺ ہوں (معاذ اللہ) میں نے تمام ابرار کا لباس پہن لیا ہے۔
۲- ہر نبی کو جو جام اللہ نے (تھوڑا تھوڑا) دیا وہ مجھے مکمل دیا ہے۔
۳- انبیاء اگرچہ بہت ہوئے ہیں مگر میں بھی عرفان میں کسی سے کم تر نہیں ہوں۔
۴- میرے آنے سے ہر نبی زندہ ہو گیا ہے، اور ہر رسول میرے لباس میں چھپا ہوا ہے۔

(نزول المسیح مندرجہ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۷۷ مطبوعہ لندن)

اسی طرح مرزا قادیانی (معاذ اللہ) اپنے معجزات کو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات سے زیادہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے

اس جگہ اکثر گزشتہ نبیوں کی نسبت بہت زیادہ معجزات اور پیش گوئیاں موجود ہیں، بلکہ بعض انبیاء علیہم السلام کے معجزات اور پیشگوئیوں کو ان معجزات اور پیش گوئیوں سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ دنیا میں ہزار ہا انسان ان کے (میری پیشگوئیوں اور معجزات کے) گواہ موجود ہیں، مگر گزشتہ انبیاء کے معجزات کا ایک بھی زندہ گواہ پیدا نہیں ہو سکتا۔

(نزول المسیح مندرجہ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۴۶۰ مطبوعہ لندن)

اور مرزا قادیانی کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے خاص عداوت تھی، وہ آپ کی شانِ اقدس میں اکثر بدزبانی کرتا ہی رہتا تھا اور خود کو ان سے بدرجہا افضل کہتا تھا، چنانچہ وہ کہتا ہے۔

باغِ احمد سے ہم نے پھل کھایا میرا بستاں کلام احمد ہے
ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو اس سے بہتر غلام احمد ہے

(ایک غلطی ازالہ مندرجہ روحانی خزائن جلد ۱۸ صفحہ ۲۴۰ مطبوعہ لندن)

کیا ایسے صریح کفریہ اشعار کہنے کے باوجود کوئی شخص مرزا قادیانی کو مسلمان تسلیم کر سکتا ہے؟ شیطان نے خود کو صرف ایک نبی حضرت آدم علیہ السلام سے افضل کہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے کافر قرار دے کر جنت سے نکال دیا اور یہاں مرزا قادیانی خود کو تمام انبیاء سے افضل کہہ رہا ہے تو کیا یہ اب بھی مسلمان ہی ہے؟

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ

اور ہم نے کہا: اے آدم! آپ خود اور آپ کی بیوی دونوں جنت میں ٹھہریں اور اس میں بلا روک ٹوک جہاں سے تمہارا جی چاہے کھائیں اور اس

شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا

درخت کے قریب نہ جائیں ورنہ آپ دونوں زیادتی کرنیوالوں میں سے ہو جائیں گے۔ [39] تو اسی درخت کے

الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ

سبب شیطان نے ان دونوں کو پھسلایا اور جہاں وہ رہتے تھے وہاں سے انہیں نکال دیا اور ہم نے کہا: تم (جنت سے) اتر جاؤ

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہیں زمین میں ٹھہرنا ہوگا اور ایک مدت تک بود و باش رکھنا ہو گی۔ [40]

[39] حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کر دیا اب وہ جنت میں اکیلے رہتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہیں وہاں اکیلے پن سے وحشت ہونے لگی ایک روز وہ سو کر اٹھے تو ان کے پاس ایک عورت بیٹھی تھی اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی بائیں پسلی سے پیدا کیا تھا۔ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کا علم جانچنے کیلئے کہا اے آدم! اس کا نام کیا ہے؟ کہا: حوا، انہوں نے پوچھا اسے حوا کیوں کہتے ہیں؟ کہا اس لیے کہ اسے حی (زندہ) سے پیدا کیا گیا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! آپ اور آپ کی بیوی تم دونوں جنت میں رہو۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عساکر، بیہقی فی الاسماء والصفات)

اسی لیے حدیث میں ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے اگر تم اسے طاقت سے سیدھی کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی اگر چھوڑ دو گے تو ٹیڑھا پن برقرار رہے گا اس لیے عورتوں سے بھلائی کرو۔ (بخاری ومسلم عن ابی ہریرہ)

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم و حوا سے فرمایا کہ تم دونوں جنت میں رہو یہاں کی جو نعمت چاہو کھاؤ مگر اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم خود پر زیادتی کرنے والے بن جاؤ گے۔ وہ درخت کون سا تھا مختلف روایات میں کھجور، انجیر، انگور وغیرہ آئے ہیں مگر مشہور روایت گندم کی ہے۔ ممکن ہے جنت میں گندم درخت کی صورت میں ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کو کچھ عرصہ جنت میں کیوں رکھا گیا

حضرت آدم و حوا کو چند روز جنت میں اس لیے رکھا گیا تھا تا کہ وہ یہاں کی بہاریں دیکھ لیں پھر جب دنیا میں جائیں تو اپنی اولاد کو یہاں کی باتیں بتائیں تا کہ ان کی اولاد جنت میں جانے کیلئے نیک اعمال کرے اور چونکہ دنیا میں آ کر انسان کو اللہ کے اوامر و نواہی کا مکلف ہونا تھا اس لیے جنت میں آدم و حوا کو اس کی تربیت دی گئی۔ چنانچہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا ان

کیلئے امر تھا اور وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ ان کے لیے نہی، یہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل کی پہلی تربیت تھی۔

کیا آدم علیہ السلام کو دنیا کے کسی باغ میں ٹھہرایا گیا تھا؟

اس جگہ کچھ آزاد خیال لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ آدم علیہ السلام کو اس جنت میں نہیں ٹھہرایا گیا تھا جہاں لوگ مرنے کے بعد داخل ہوتے ہیں، بلکہ انہیں دنیا میں زمین پر کسی باغ میں ٹھہرایا گیا تھا، کیونکہ اگر انہیں معروف جنت میں ٹھہرایا جاتا تو وہاں سے کبھی نہ نکلتے، کیونکہ جو وہاں جائے وہ وہاں سے واپس نہیں نکلتا، پرانے زمانہ میں معتزلہ نے یہ بات کہی تھی اور نئے زمانہ میں سرسید احمد خان نے، مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ آدم علیہ السلام اسی معروف جنت میں داخل ہوئے تھے۔

کیونکہ یہاں اسکن انت وزوجك الجنة فرمایا گیا، اور الجنة معرف باللام ہے جو کسی خاص جنت پہ دلالت کرتا ہے، اور قرآن میں جنت معروفہ کو جہاں اہل ایمان مرنے کے بعد داخل ہونگے ہمیشہ الجنۃ ہی کہا گیا، جیسے فرمایا گیا:

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۹۰﴾ (سورہ شعراء، آیت نمبر ۹۰) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ (سورہ نازعات، آیت نمبر ۴۱)

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ (سورہ یونس، آیت نمبر ۲۶) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۱۴)

اور حدیث میں بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ آپ نے لوگوں کو اپنی خطاء کی وجہ سے جنت سے نکالا (مسلم) معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو جنت معروفہ ہی میں رکھا گیا تھا، رہا یہ کہنا کہ جو جنت میں جائے وہ وہاں سے نکالا نہیں جاتا تو یاد رہے جو شخص اپنے اعمال کی جزا کے لیے جنت میں داخل ہوا اسے وہاں سے نہیں نکالا جاتا۔ جبکہ آدم علیہ السلام کا معاملہ اس سے مختلف تھا وہ صرف جنت کی سیر کے لیے گئے، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شبِ معراج جنت کی سیر فرمائی۔

شان حضرت آدم علیہ السلام میں اہل تشیع کی گستاخی

شیعہ مفسر ملا ابونصر محمد بن حسن نے ایک جھوٹی روایت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پنجتن پاک کی زیارت کروائی تو فرمایا: یا آدم اياك ان تنظر اليهم بحسد أهبطك عن جواري۔ ''اے آدم خبردار ان کی طرف نظر حسد سے مت دیکھنا ورنہ میں تمہیں اپنے قرب سے نیچے گرادوں گا۔'' مگر جب وہ جنت میں ٹھہرے تو وہاں ان کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی، سیدہ فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کی پھر زیارت کروائی گئی۔

فنظر اليهم بحسد ثم عرضت عليه الولاية فانكرها فرمته الجنة باوراقها. فلما تاب الى الله من حسده واقر بالولاية ودعا بحق الخمسة محمد وعلي والحسن والحسين غفر الله له وذالك قوله فتلقى آدم من ربه كلمات۔

یعنی جب آدم علیہ السلام نے ان کی طرف حسد سے دیکھا پھر ان پر (بارہ اماموں کی) امامت پیش کی گئی اور انہوں نے اس سے انکار کیا تو جنت نے (غصہ سے) ان پر اپنے پتے پھینکے، پھر جب انہوں نے اللہ سے توبہ کی اور ولایت کا اقرار

کیا اور پنج تن محمد علی فاطمہ اور حسنین کے وسیلہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی خطا بخشی اسی بارہ میں اللہ فرماتا ہے فتلقیٰ آدم من ربه کلمات (تفسیر عیاشی جلد اول صفحہ ۴۱ مطبوعہ المکتبۃ العلمیہ تہران) معلوم ہوا اہل تشیع صرف بارہ اماموں کو معصوم مانتے ہیں، جبکہ انبیاء توان کے نزدیک حسد اور کفر میں مبتلا ہونے والے ہیں۔

[40] جب شیطان حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے سبب جنت سے نکال دیا گیا اور حضرت آدم اپنی زوجہ کے ساتھ وہاں کی بہاریں لوٹ رہے تھے تو شیطان حسد کی آگ میں جلنے لگا، اس نے انہیں جنت سے نکالنے کا منصوبہ بنایا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ و دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ وہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں گیا تا کہ جنتی محافظین کی نظروں میں نہ آئے وہاں وہ آدم علیہ السلام کے پاس پہنچ کر کہنے لگا۔ اے آدم وحوا تمہیں تمہارے رب نے یہ گندم سے دور رہنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اگر تم نے اسے کھالیا تو تم فرشتے یا ہمیشہ جنت میں رہنے والے بن جاؤ گے اس پر اس نے جھوٹی قسم اٹھائی کہ ایسا ہی ہے۔ (سورہ اعراف، آیت نمبر ۲۲)

اگر سوال کیا جائے کہ شیطان تو جنت سے نکال دیا گیا تھا پھر وہاں کیسے داخل ہوا؟ امام ابن کثیر فرماتے ہیں اسے عزت وتکریم کے ساتھ جنت میں داخل ہونے سے روکا گیا تھا رہا چوری چھپے ذلت آمیز طریقے سے جانا تو یہ ممتنع نہیں۔ کئی لوگوں کا داخلہ کسی جگہ ممنوع ہوتا ہے مگر وہ چوری چھپے داخل ہو جاتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ جنت پہ تو فرشتوں کے پہرے ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ شیطان اس میں چوری چھپے داخل ہو جائے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر کام میں اللہ کی حکمت ہے ، اگر اللہ نہ چاہتا تو شیطان جنت میں داخل نہ ہوسکتا، مگر چونکہ آدم علیہ السلام کا زمین پر بھیجا جانا مقدر تھا اس لیے اس کے اسباب پیدا کیے گئے اور شیطان کا چوری چھپے جنت میں داخل ہو کر حضرت آدم علیہ السلام سے کلام کرنا بھی انہی اسباب میں سے تھا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شیطان کو دیکھا ہوا تھا جب وہ ان کے سامنے گیا تو انہوں نے اسے پہچان کیوں نہ لیا اور اس کی باتوں میں کیوں آئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ جنات میں سے تھا اور جنات مختلف صورتیں اپنا لیتے ہیں ممکن ہے ابلیس اس وقت کسی دوسری صورت میں گیا ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کی خطاء اور مسئلہ عصمتِ انبیاء کرام علیہم السلام:

یہاں سوال ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام تو معصوم ہیں شیطان ان پر داؤ نہیں چلا سکتا، کیونکہ شیطان نے جنت سے نکلتے ہوئے خود کہا تھا: وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٣٩ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝٤٠ اے اللہ! میں سب انسانوں کو گمراہ کرلوں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے۔ (سورہ حجر، آیت نمبر ۴۰) اور انبیاء کرام علیہم السلام تو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہی ہیں جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا: اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝٢٤ بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔ (سورہ یوسف، آیت نمبر ۲۴)

انبیاء کرام علیہم السلام کے معصوم ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مطلقاً اطاعت کا حکم دیتا ہے، وہ فرماتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ اور ہم کوئی رسول نہیں بھیجتے مگر اسی لیے کہ حکم الٰہی سے ان کی اطاعت کی جائے۔(سورہ نساء، آیت نمبر ۶۴)

اور ان کی مطلقاً اطاعت اسی لیے لازم ہے کہ ان سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ صادر نہیں ہوسکتا، اگر وہ کوئی گناہ کر سکتے ہوتے تو یوں ان کی ہر بات کی اطاعت لازم نہ کی جاتی، بلکہ پھر یوں کہا جاتا کہ صرف جائز کام میں رسول کی اطاعت کرو، گناہ میں اس کی اطاعت مت کرو، مگر ایسا نہیں کہا گیا بلکہ اطاعت رسول کو مطلقاً لازم کیا گیا اور یہ عصمت رسول کے بغیر نہیں ہوسکتا، جب انبیاء کی عصمت کا یہ عالم ہے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام پر ابلیس کا داؤ کیسے چل گیا کہ اللہ نے فرمایا:

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ انبیاء کرام علیہم السلام پر شیطان اپنا داؤ نہیں چلا سکتا اور نہ وہ شیطانی انگیخت پر کوئی گناہ کر سکتے ہیں کیونکہ وہ معصوم ہیں مگر وہ سہو ونسیان سے معصوم نہیں ہیں اور گناہ اسے کہتے ہیں جو کام عمداً مرضی مولا کے خلاف کیا جائے اور جان بوجھ کر حکم الٰہی توڑا جائے۔ جبکہ آدم علیہ السلام کے بارے میں اللہ نے خود فرمایا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ یعنی ہم نے آدم علیہ السلام سے عہد لیا (کہ گندم کے قریب نہیں جانا) مگر وہ بھول گئے اور ہم نے انکا ارادہ نہ پایا۔(سورہ طٰہٰ، آیت نمبر ۱۱۵)

دراصل جب شیطان نے انہیں کہا کہ یہ گندم کا پھل کھا کر وہ جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہو جائیں گے۔(سورہ اعراف، آیت نمبر ۲۰) تو ان کے دل میں اس کے کھانے کی خواہش پیدا ہوگئی اور وہ خواہش ایک دن غالب آ گئی اور وہ بھول گئے کہ اس درخت کا پھل کھانے سے اللہ نے انہیں روک رکھا ہے۔ تو انہوں نے بھول کر کھالیا۔

جس طرح روزہ دار پر کھانے پینے کی خواہش غالب آ جاتی ہے اور وہ بھول کر کھا پی لیتا ہے اور بھول کر اس کا کھانا روزہ نہیں توڑتا بلکہ بھول کر کھانے والے روزہ دار کو حدیث کے مطابق خود اللہ کھلاتا ہے اس طرح آدم علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے خود کھلایا کیونکہ اللہ نے انہیں زمین کا خلفیہ بنایا تھا اور وہیں انہوں نے جا کر رہنا تھا لہٰذا آدم علیہ السلام کے دانہ گندم کھانے سے ان کی عصمت میں فرق نہیں آتا۔

البتہ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ میں پھسلانے کی نسبت شیطان کی طرف نسبت مجازی ہے، یہ نسبت اس لیے کی گئی کہ شیطان ہی نے انہیں قسم دلائی تھی کہ اس کے کھانے سے وہ ہمیشہ جنت میں رہنے والے بن جائیں گے جس سے ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اور اس خواہش نے غلبہ کیا اور ان پر نسیان طاری ہوگیا۔

یہ اسی طرح ہے جیسے کہتے ہیں بہار نے پھول کھلائے حالانکہ بہار کوئی ذی روح وذی عقل وارادہ چیز نہیں کہ کوئی کام اپنی مرضی سے کرے بلکہ یہ نسبت مجازی ہے، اس کا معنی ہے کہ بہار کے آنے سے پھول کھلا، اسی طرح فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ کا معنی ہے کہ اس کی وجہ سے آدم علیہ السلام بھولے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر آدم علیہ السلام سے گناہ نہیں ہوا تھا تو وہ روتے کیوں رہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مقربین بارگاہ خداوندی میں اپنی بھول پر بھی اس قدر روتے ہیں جیسے ہم اپنے گناہوں پر روتے ہیں حتیٰ کہ اگر ان کے نوافل ومستحبات رہ جائیں تو بھی ان پر گریہ طاری ہو جاتا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ یعنی جب آدم علیہ السلام سے سہو ہو گیا اور انہوں نے اس درخت سے بھول کر کھا لیا جس سے اللہ نے روکا تھا تو اللہ نے فرمایا اے وہ لوگو جو آدم وحوا کی پشت میں ہو اور اے ابلیس! تم زمین پر اتر جاؤ وہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے یعنی انسان اور شیطان کے مابین ہمیشہ دشمنی رہے گی۔ شیطان انہیں گمراہ کرے گا اور وہ شیطان پر لعنت کیا کریں گے۔

یا یہ معنی ہے کہ اے انسانو! تم وہاں ایک دوسرے کے دشمن ہو گے یعنی تمہیں وہاں جنت والا سکون حاصل نہ ہو گا اور تمہیں وہاں زمین پہ ایک مدت تک رہنا ہو گا یعنی پھر قیامت بپا ہو گی اور دنیوی زندگی کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔

چنانچہ حضرت علی، ابن عباس اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ آدم علیہ السلام کو ہندوستان میں اتارا گیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ زمین پر آ کر بہت متوحش تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو بھیجا انہوں نے اذان دی جب وہ اشهدان محمداً رسول الله پر پہنچے تو آدم علیہ السلام نے ان سے پوچھا یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون ہیں؟ کہا یہ آپ کی اولاد میں سے آخری نبی ہیں۔ (طبرانی عن ابی ہریرہ)

شیطان کے مکر وفریب سے ہر وقت ڈرنا چاہیے

حضرت آدم علیہ السلام سے جو خطا ہوئی وہ اگرچہ گناہ کے زمرہ میں نہیں ہے، کیونکہ اس میں ان کی بھول کا دخل ہے تاہم اس میں شیطان کی جھوٹی قسموں کا دخل بھی تھا جب وہ جنت میں اللہ کے پیغمبر پہ یوں کسی حد تک اثر انداز ہو سکتا ہے تو ہماری کیا حیثیت ہے، ہم پہ اس کے اختیار کا یہ عالم ہے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان الشيطان يجري في الانسان مجرى الدم۔ ''بیشک شیطان انسان کے اندر یوں چلتا ہے جیسے خون۔''

(بخاری کتاب باب بدأ الخلق)

اللہ کو بندے کا توبہ کرنا پسند ہے

حضرت آدم علیہ السلام سے خطا کے صدور میں یہ حکمت بھی تھی کہ اولاد آدم کو توبہ کا طریقہ بتایا جائے، اور انہیں سکھایا جائے کہ اگر انسان سے غلطی ہو جائے تو اسے رو رو کر اللہ کو منانا چاہیے، جیسے آدم علیہ السلام نے کیا، حدیث میں ہے کہ آپ دو سو برس تک روتے رہے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۱۴۵)

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۳۷﴾

تب آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔[41]

[41] جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اترے تو عرصہ دراز تک روتے رہے، جس بارہ میں مختلف روایات ہیں اور توبہ ہی وہ افضل تر عبادت ہے جو انسان ہی کرسکتا ہے، نہ کہ فرشتے، اسی عبادت کے لیے انسان بنایا گیا، اگر یہ نہ ہوتی تو اللہ کی کئی صفات کا ظہور نہ ہوتا، جیسے توّاب، غفور، عفوّ وغیرہ۔ آخر اللہ نے بوسیلہ محمد مصطفیٰ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی توبہ قبول فرمائی۔

آدم علیہ السلام کی قبولیتِ توبہ بوسیلہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا: اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اِلَّا غَفَرْتَ لِیْ ''اے اللہ! میں تجھ سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں کہ میری خطا بخش دے۔'' اللہ نے فرمایا: اے آدم تو نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیسے جانا؟ کہا جب تو نے مجھے پیدا کیا تو میں نے ساقِ عرش پر لکھا دیکھا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ میں نے جان لیا کہ یہ ذات اللہ کو سب سے پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یا آدم انّه آخرُ النبیّین من ذریتك وان اُمّتَه آخرُ الامم من ذریّتك ولولاہ یا آدم ما خلقتُك، ''اے آدم! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہاری اولاد میں سے آخری نبی ہیں، اور ان کی امت تمہاری اولاد میں سے آخری امت ہے، اور اگر وہ نہ ہوتے تو میں تمہیں بھی پیدا نہ کرتا۔''

(طبرانی صغیر جلد دوم صفحہ ۸۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، بیہقی فی دلائل النبوۃ، درمنثور جلد اول صفحہ ۱۴۲، مواہب اللدنیہ جلد اول صفحہ ۱۲)

اس جگہ دیگر احادیث بھی ہیں جو توبہ آدم علیہ السلام کے بوسیلہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبول ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

کیا حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ پنجتن پاک کے وسیلہ سے قبول ہوئی؟

اہل تشیع اس جگہ تفسیر درمنثور جلد اول صفحہ ۱۴۷ سے دو روایات پیش کرتے ہیں جن میں لکھا ہے کہ آدم علیہ السلام کی توبہ بوسیلہ پنجتن پاک قبول ہوئی، اور وہ کہتے ہیں کہ پتہ چلا پنجتن پاک انبیاء کرام علیہم السلام سے افضل ہیں، اور جب وہ انبیاء سے افضل ہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہوتے ہوئے دوسرے لوگوں کا خلیفہ بننا کیسے جائز تھا؟

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں روایات من گھڑت اور جعلی ہیں، پہلی روایت امام سیوطی نے مسند الفردوس سے لی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فتلقیٰ آدم من ربه کلمات کے بارہ میں پوچھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آدم علیہ السلام نے یوں دعاء کی: اللھم انی اسئلك بحق محمد وآل محمد رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی، یعنی ''اے اللہ میں تجھ سے محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دعاء کرتا ہوں میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، اے اللہ مجھے بخش دے۔''

اس روایت کی ابتداء میں امام سیوطی فرماتے ہیں: واخرج الدیلمی فی مسند الفردوس بسند واہ، یعنی دیلمی نے مسند الفردوس میں یہ روایت ایک بے بنیاد سند کے ساتھ لکھی ہے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ مطبوعہ ۱۴۷ دار الفکر بیروت)

اور اسی روایت کو علامہ ہندی نے کنز العمال میں درج کیا ہے اور اس کے ساتھ یہ فرمایا: اخرجه الدیلمی وسنده واه وفیه حماد بن عمر النصیبی عن السری عن خالد وهیان، یعنی اس حدیث کو دیلمی نے روایت کیا ہے، اور اس کی سند بے بنیاد ہے، کیونکہ اس میں حماد بن عمر نصیبی اور خلاد ہیں اور وہ دونوں نا قابل حجت ہیں۔

(کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۳۵۹ مطبوعہ موسسۃ الرسالۃ بیروت)

جبکہ دوسری روایت یوں ہے کہ ابن نجار نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کلمات کے بارہ میں پوچھا جو آدم علیہ السلام نے اللہ سے حاصل کیے اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، آپ نے فرمایا: سأل بحق محمد وعلی وفاطمة والحسن والحسین، الا تبت علی فتاب علیه، یعنی آدم علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی، فاطمہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کے وسیلہ سے دعاء کی کہ اے اللہ میری توبہ قبول کر، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی۔

(درمنثور جلد ۲ صفحہ مطبوعہ موسسۃ الرسالہ بیروت)

اب ہم نے ابن نجار کے بارہ میں تحقیق کی کہ وہ کون ہے؟ تو وہ شیعہ مصنفین میں سے نکل آیا، چنانچہ آقا بزرگ تہرانی شیعہ نے اپنی مشہور کتاب ''الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ'' میں شیعہ کتب کا احاطہ کیا ہے، اس میں اس نے ابن نجار کے بارہ میں تفصیل بتائی ہے کہ اس کا نام محمد بن جعفر بن ھارون تمیمی نحوی المعروف بابن نجار ہے یہ اہل کوفہ میں سے ہے سن وفات ۴۰۲ھ ہے، اس کی کتاب ''تاریخ الکوفہ'' بہت مشہور ہے، علامہ سیوطی نے ''بغیۃ الوعاۃ'' میں اس کی تصانیف میں سے تاریخ الکوفہ لکھی ہے، یہ مشہور شیعہ مصنف شیخ مفید کے اساتذہ میں سے ہے۔

(الذریعہ الی تصانیف الشیعہ جلد ۳ صفحہ ۱۵۵ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

یادرہے کہ شیخ مفید اہل تشیع کا نہایت مرکزی آدمی ہے، ''نہج البلاغہ'' کا مولف شیخ رضی اور اس کا بھائی شیخ مرتضیٰ دونوں علماء شیعہ میں بہت اونچا نام رکھتے ہیں اور وہ دونوں شیخ مفید کے شاگرد ہیں، اور یہ ابن نجار بقول آقا بزرگ تہرانی شیعہ شیخ مفید کا استاذ ہے، گویا ابن نجار کا شمار چوٹی کے علماء شیعہ میں سے ہے، ایسے شخص نے اگر نصوص قرآن سے متصادم یہ روایت گھڑ کر اپنی کتاب میں درج کر دی ہے تو اس سے یہی متوقع ہے۔

رہا یہ کہ امام سیوطی نے ایسی روایات کو درمنثور میں کیوں درج کیا، تو اس کو جواب یہ ہے کہ اس سے قبل والی روایت میں امام سیوطی نے وضاحت کردی کہ یہ روایت بے بنیاد ہے، جس میں یہ واضح اشارہ ہے کہ اس مفہوم کی جملہ روایات ایسی ہی من گھڑت ہیں، اور امام سیوطی نے ''درمنثور'' میں تفسیر قرآن سے متعلق سب روایت جمع کی ہیں، یہی ان کا مقصد تھا خواہ ان میں کوئی صحیح ہو یا موضوع و من گھڑت ہو تو ایسی بے بنیاد اور من گھڑت روایات کو لے کر اہل تشیع کا پنجتن پاک کو انبیاء سے افضل کہنا کتنی بڑی جسارت ہے، حالانکہ انبیاء کا تمام جہان سے افضل ہونا قرآن میں منصوص ہے اور اس

سے انکار کفر ہے، اللہ فرماتا ہے: وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ ہم نے تمام انبیاء کو تمام جہانوں پہ فضیلت عطا فرمائی ہے۔ (سورہ انعام، آیت نمبر ۸۶)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا گیا: اِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ ''اے موسیٰ ہم نے آپ کو اپنی رسالت کی وجہ سے تمام انسانوں پر بزرگی دیدی ہے۔'' (سورہ اعراف، آیت نمبر ۱۴۴) اور انسان تمام مخلوق سے افضل ہے، تو جو انسانوں میں سے افضل ہے وہ ساری خدائی سے افضل ہے۔ معلوم ہوا کہ نصوص قرآنیہ کے مطابق مرسلین عظام تمام مخلوق خداوندی سے افضل ہیں، لہٰذا اہل تشیع کو نہیں چاہیے کہ قرآن کے مقابلہ میں ایسی من گھڑت خانہ ساز روایات کا سہارا لیکر عقائد اسلامیہ میں فساد پیدا کریں۔

مکرِ شیطان کی خطرناکی:

شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھوٹی قسمیں اٹھائیں جو بعد میں ان کے ذھول ونسیان کا سبب بنیں اور اس وقت حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے۔ جب وہ جنت میں آدم علیہ السلام سے یہ معاملہ کرسکتا ہے تو ہم زمین پر رہنے والے غیر معصوم لوگ اس کی دست برد سے خود کو کیسے محفوظ تصور کرسکتے ہیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ کی اہمیت:

یعنی پہلے انسان کی پہلی دعا بوسیلہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبول ہوئی۔ تو بعد والے انسانوں کو بھی آپ کے وسیلہ سے دعا کرنی چاہیے، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نابینا صحابی کو سکھایا تھا کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وسیلہ سے دعا کرے کہ اللہ اسے آنکھیں عطا کردے۔ (سنن ابن ماجہ کتاب الاقامۃ باب ۱۷۹، ترمذی کتاب الدعوات باب ۱۱۷، مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۳۸)

یہاں سے افضلیت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی معلوم ہوئی، امام صاوی علیہ الرحمہ اس جگہ صاوی شرح جلالین میں فرماتے ہیں: فالانبیاء وسائط لِاُمَمِهِمْ وَوَاسِطَتُهُمْ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی امتوں کیلئے وسیلہ ہیں اور انبیاء کا وسیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ (صاوی جلد اول صفحہ ۱۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ

ہم نے کہا: تم سب جنت سے اتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو جس نے میری

هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۸ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا

ہدایت کی پیروی کی تو ایسے لوگوں پر کوئی خوف نہیں نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری

بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹

آیات کو جھٹلایا تو وہ دوزخ والے ہیں وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے۔ [42]

[42] پہلے آیت ۳۸ میں اِھْبِطُوْا فرمایا گیا وہاں بتایا گیا کہ اے انسانو! زمین پر اتر جاؤ وہاں تم ایک دوسرے سے دشمنی کرو گے اب دوبارہ اِھْبِطُوْا کہہ کر بتایا جا رہا ہے کہ جہاں تمہارے باہمی جھگڑے ہوں گے وہاں تمہاری ہدایت کا سامان بھی ہوگا۔ تمہارے پاس اللہ کی ہدایت بذریعہ انبیاء پہنچے گی۔ اگر تمہیں وہ ہدایت ملے (یہ اس لیے کہا کیونکہ بعض لوگوں کو بوجہ فاتر العقل یا زمانہ فترت میں ہونے کے یا بچپن میں فوت ہو جانے کے سبب ہدایت نہیں پہنچتی)

تو جس نے اس ہدایت پر عمل کیا تو ایسے لوگوں کو دنیا میں کوئی خوف نہ ہوگا یعنی وہ اللہ کے سوا کسی کا خوف دل میں نہ رکھیں گے بلکہ وہ ہمیشہ جابر ظالم طاقتوں کے سامنے کلمہ حق کہیں گے جیسے انبیاء کرام علیہم السلام نے ہمیشہ ایسے ہی کیا اور ان کے پیروکار بھی ایسا ہی کرتے رہے۔

پہلی امتوں میں اصحاب کہف کا واقعہ اس کی مثال ہے اور امت محمدیہ کی چودہ سو سالہ تاریخ ہی انہیں جاں فروشیوں سے عبارت ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا یزید کے آگے نہ جھکنا، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا خلیفہ منصور کے تکبر سے ٹکرا جانا، امام احمد بن حنبل کا مامون کے سامنے ڈٹ جانا، مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کا جلال الدین اکبر کے غرور کو خاک میں ملا دینا یہ سب لا خوف علیہم کی تابندہ مثالیں ہیں اور ایسے لوگوں کو آخرت میں کوئی حزن نہ ہوگا جبکہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرکے اس کی ہدایت پر نہ چلنے والوں کیلئے قیامت میں حزن ہی حزن ہے کیونکہ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ

اے یعقوب علیہ السلام کی اولاد! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پہ کی اور تم میرا وعدہ پورا کرو تو میں تمہارا وعدہ

اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

پورا کروں گا، اور مجھ ہی سے ڈرو۔[43]

بنی اسرائیل (یہود) کو صراط مستقیم کی نشاندہی

[43] اس سے قبل تمام بنی نوع انسان پہ ہونے والی عمومی اور اجتماعی نعمتوں کا ذکر ہو رہا تھا اب یہود پر ہونے والی خصوصی خدائی نعمتیں انہیں یاد دلائی جا رہی ہیں چونکہ سورہ بقرہ مدنی ہے اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے یہی سورہ نازل ہوئی اور مدینہ طیبہ میں یہودی قبائل بکثرت آباد تھے۔ یہ لوگ ظہور اسلام سے کئی برس قبل مدینہ طیبہ میں اسی لیے آ کر آباد ہوئے تھے کہ ان کے پاس موجود آسمانی کتابوں میں لکھا تھا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی شہر میں آ کر قیام فرمائیں گے۔

یہود کو توقع تھی کہ وہ آخری نبی جس کی بشارت پہلے سارے نبی دیتے رہے ہیں یہود ہی میں سے پیدا ہو گا چنانچہ وہ اس کے انتظار میں مدینہ طیبہ میں آ کر آباد ہوئے مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہود سے باہر قریش میں پیدا ہوئے تو یہود نار حسد و بغض میں جلنے لگے، تو ضروری تھا کہ انہیں ہدایت دی جاتی اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی جاتی تو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں یہود سے طویل خطاب فرمایا جو یہاں سے لے کر پہلے پارہ کے آخر تک چلا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کو بار بار یا بنی اسرائیل کہہ کر پکارا اور انہیں یاد دلایا کہ ان پر اللہ نے گزشتہ زمانوں میں کیا کیا انعامات فرمائے تھے اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا کہ کیا اللہ کے انعامات کا یہی بدلہ ہے کہ اس کے سب سے پیارے اور افضل نبی سے انکار اور مقابلہ کیا جائے؟

لفظِ بنی اسرائیل کا معنیٰ

بنی اسرائیل کا معنی اولادِ یعقوب ہے۔ ''بنی'' کا معنی بیٹے اور ''اسرائیل'' حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ مروی ہے کہ ایک بار ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام اپنے حجرے میں عبادت کر رہے تھے انہوں نے اپنے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کو دروازے پر کھڑا کر دیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دیں جب تک وہ عبادت ختم نہ کر لیں۔ اتنے میں حضرت جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں آئے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی آزمائش کیلئے ان سے کہا مجھے اندر جانے دو میں نے تمہارے والد صاحب سے ملنا ہے۔ انہوں نے کہا نہیں ابھی ملاقات کا وقت نہیں، حضرت جبریل علیہ السلام نے آزمانے کیلئے

اصرار کیا مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی ایک نہ مانی۔

آخر جب حضرت اسحاق علیہ السلام نے خود ہی عبادت کے بعد دروازہ کھولا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے انہیں سارا ماجرا سنایا اور کہا آپ کا بیٹا بہت فرمانبردار ہے، میں اس کا نام اسرائیل رکھتا ہوں۔ یہ فرشتوں کے ناموں میں سے ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ کا بندہ، ایل بمعنی اللہ اور اسرا بمعنی بندہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں جبریل، میکائیل، اسرافیل، اسرائیل وغیرہ ایسے ہیں جیسے عبداللہ، عبیداللہ (فضل اللہ، نور اللہ وغیرہ) (ابن جریر)

گویا اللہ تعالیٰ نے یہود کو بنی اسرائیل کہہ کر یاد دلایا کہ تم اللہ کے ایک فرمانبردار بندے اور اس کے نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہو کر اللہ کے سچے اور آخری رسول کی مخالفت میں کیوں کمربستہ ہو گئے ہو، کیا یہ تم پر اللہ کا انعام کم ہے کہ تم یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام جیسے انبیاء کی اولاد ہو؟

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ کہ اے بنی اسرائیل تم مجھ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کرو میں تم سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ یعنی تم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لاؤ تو میں تمہیں دنیا و آخرت میں کامیابی عطا کروں گا۔ ابن زید تابعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس آیت میں اس دوطرفہ وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو سورہ مائدہ میں یوں مذکور ہے:

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

یعنی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے مضبوط عہد لیا اور ان پر بارہ نگران مقرر فرمائے اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نے نماز قائم کی، زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے (جن میں سب سے افضل رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہیں) اور ان کی تعظیم بجالائے اور اللہ کو بہتر قرض دیا تو میں تمہارے گناہ مٹادوں گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں پھر جو اس کے بعد کفر کرے تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ہے

(سورہ مائدہ، آیت نمبر ۱۲) (ابن جریر)

یعنی تورات میں یہود سے یہ وعدہ لیا گیا تھا، تو اس بارہ میں اللہ فرما رہا ہے کہ اے یہود اگر تم اس وعدہ کو پورا کرتے ہوئے سید الرسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ اور ان کی تعظیم بجالاؤ اور نماز و زکوٰۃ ادا کرو تو میں اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے تم پر جنت کے دروازے کھول دوں گا۔

مگر اس بدبخت قوم یہود بے بہود نے اللہ رب العزت کے ان ارشادات سے کوئی اثر نہ لیا، بلکہ جس قدر اللہ نے اسلام کو عزت دی اسی قدر یہود نارِ حسد میں جلنے لگے، حالانکہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوب اچھی طرح جانتے تھے، انہیں حضور

پر نور ﷺ کا حلیہ مبارک اچھی طرح یاد تھا، کیونکہ تورات وانجیل میں آپ کے چہرہ انور کے خدوخال تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے تھے کہ آپ کی زلفیں ایسی ہیں، پیشانی مبارک ایسی ہے، اور یہ کہ آپ کی پشت پہ مہر نبوت کی نشانی ہے، اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ آپ کے اخلاق کریمانہ کیسے ہیں۔

اور جب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے تو یہود نے آپ کی سیرت وصورت کو ان تمام نشانیوں کا حامل دیکھ لیا جو ان کی کتابوں میں آخری نبی میں موجود ہیں، اس کے باوجود انہوں نے آپ سے عداوت کا طریقہ اپنایا، حتی کہ ان بدبختوں نے کئی بار رسول اللہ ﷺ کو زہر کھلا کر شہید کرنے کی سازش کی تو کبھی آپ پہ بھاری پتھر گرا کر آپ کو مارنے کی کوشش کی ۔کتب حدیث وتفسیر ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ
اور اس (قرآن) پہ ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا جو تمہارے پاس موجود کتاب (تورات) کی تصدیق کرتا ہے اور اس کے پہلے منکر نہ بنو،
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾
اور میری آیات کے بدلے معمولی پونجی نہ لو اور مجھ ہی سے ڈرو۔[44]

[44] یعنی اے بنی اسرائیل! میں نے اپنے آخری نبی محمد مصطفیٰ ﷺ پر قرآن کی صورت میں جو وحی اتاری ہے اس پر ایمان لاؤ کیونکہ یہ وحی ان تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہیں یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات، حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل وغیرہ اور قرآن کے پہلے منکر نہ بنو۔ یعنی آج تمہارا انکار کرنا بعد میں آنے والی تمہاری نسلوں سے انکار کی بنیاد بنے گا اور ان کا بوجھ بھی تم پر ہوگا لہٰذا باز آجاؤ۔

اگر کہا جائے کہ یہود سے قبل مشرکین مکہ نے ہجرت سے پہلے قرآن کا انکار کیا تھا۔ تو وہ پہلے منکر ہوئے، یہود قرآن کے پہلے منکر کیسے ہوئے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ اَن پڑھ تھے ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہ تھی اور روایات میں ہے کہ انہوں نے کئی بار یہودِ مدینہ سے حضور ﷺ کے بارے میں پوچھا، یہود نے صریح جھوٹ بول کر انہیں بتایا کہ معاذ اللہ محمد مصطفیٰ ﷺ کا دعویٰ نبوت وکتاب جھوٹا ہے، تو مشرکین مکہ کے انکار کا سبب بھی یہود ہی کا اسلام سے حسد وبغض تھا تو وہی پہلے منکر قرآن واسلام ٹھہرے۔

اس میں یہ درس ہے کہ انسان کو برائی کا جاری کرنے والا نہیں بلکہ بھلائی کا اجراء کرنے والا بننا چاہیے، حدیث میں ہے جس نے اسلام میں کوئی اچھا کام جاری کیا اس کے لئے اپنا بھی اجر ہے اور اپنے پیروکاروں کا بھی، اور جس نے اسلام میں برا کام جاری کیا اسے اپنا گناہ بھی ہے اور اپنے پیروکاروں کا بھی۔ (مسلم کتاب العلم حدیث ۱۰)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا کہ اے یہود میری آیات کو دنیا کے حقیر مال کے بدلے فروخت کرنے کی بدبختی اپنے سر نہ لو۔ حضرت سدی تابعی فرماتے ہیں اس آیت میں علماء یہود سے خطاب ہے وہ حضور ﷺ کے بارے میں تورات میں موجود آیات کو چھپاتے تھے انہیں ڈر تھا کہ اگر یہ آیات ان کے عوام کو معلوم ہوگئیں تو وہ آپ پر ایمان لے آئیں گے اور جو نذرانے انہیں یہودی عوام دیتے ہیں وہ انہیں نہیں ملیں گے اور ان کی مذہبی قیادت ختم ہو جائے گی۔ (ابن جریر ملخصاً)

علماء یہود کی افسوسناک دین فروشی اور کتمانِ حق:

مروی ہے کہ یہودی سردار کعب بن اشرف نے علماء یہود سے تنہائی میں پوچھا: کیا واقعی محمد ﷺ کا ذکر ہماری کتابوں میں ہے؟ انہوں نے کہا ہاں ہے، کہنے لگا اگر تم یہ چیزیں بدل دو تو میں تمہیں بڑا عطیہ دوں گا۔ وہ تو خود یہی چاہتے تھے انہوں نے چند دن کی مہلت مانگی پھر انہوں نے تورات میں دجال کے بارے میں مذکور نشانیوں کو آخری نبی کی نشانیوں کے طور پر لکھ دیا۔ کعب بن اشرف نے ان تمام یہودی علماء میں سے ہر ایک کو قیمتی کپڑے اور دیگر اجناس دیں۔
(روح البیان جلد اول صفحہ ۱۱۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

یہی نہیں یہودی علماء مالدار لوگوں کی رضا جوئی کیلئے شرعی احکام بدل دیتے تھے تا کہ انہیں مال دنیا ملتا رہے چنانچہ سورہ مائدہ رکوع ۷ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ آئے گا جب دور نبوی میں یہود کے بڑے لوگوں میں سے ایک مرد وعورت نے بدکاری کی اور ان کا جرم ثابت ہو گیا تو علماء یہود نے تورات میں رجم والی آیات کو بدل کر ان کی جگہ اپنی طرف سے لکھ دیا کہ زنا کار مرد وعورت کا منہ کالا کر کے انہیں رسوا کیا جائے۔ اس کی تفصیل وہیں آئے گی، الغرض اللہ تعالیٰ نے یہودی علماء کو یہاں سرزنش فرمائی ہے کہ وہ اللہ کی آیات بیچ کر ان کے بدلے دنیا کی حقیر وقلیل پونجی کیوں حاصل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی آیات کو مال دنیا کمانے کا ذریعہ نہ بنایا جائے:

جو لوگ قرآن وحدیث کی تعلیم دیتے ہیں یعنی حفاظ، قراء اور علماء وہ اپنے وقت کا معاوضہ لے سکتے ہیں یعنی جو وقت انہوں نے تعلیمِ دین پر صرف کیا وہ کسی اور کام پر بھی صرف کر سکتے تھے تو وہ اپنے وقت کا معاوضہ وصول کریں۔ رہی تعلیم دین تو اسے وہ رضاء الٰہی کیلئے رکھیں۔ مثلاً ایک عالم دین کسی مسجد میں نماز پڑھاتا یا کہیں قرآن سکھاتا ہے تو وہ یہ حساب نہ کرے کہ اس نے اتنی نمازیں پڑھائیں تو فی نماز اتنے پیسے بنتے ہیں یا اتنی آیات پڑھائیں تو فی آیت اتنے پیسے بنے یہ حساب وکتاب جائز نہیں کیونکہ وہ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا میں داخل ہے۔ البتہ وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے اتنے گھنٹے یا اتنا وقت دیا ہے لہٰذا میری اتنی تنخواہ ہے۔ بلکہ اگر علماء دین اپنی تعلیم وتبلیغ میں للّٰہیت رکھیں اور تنخواہ کی کمی

بیٹی سے صرف نظر کرلیں تو اللہ انہیں مال دنیا بھی زیادہ دے گا، عزت بھی ملے گی اور آخرت بھی سنورے گی اور اگر وہ مالِ دنیا ہی پہ نظر رکھیں تو دنیا بھی تھوڑی آئے گی، لوگ عزت کرنے کے بجائے لالچی کہیں گے اور آخرت کا ثواب بھی ہاتھ سے جائے گا۔

انصاف فروخت کرنے والوں کی برائی:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۫ افسوس ہے کہ آج اسلامی ممالک کی عدالتیں رشوت لے کر فیصلے بدل دیتی ہیں۔ بعض علماء سوء دنیوی مفادات کیلئے فقہی مسائل میں صورت مسئولہ بدل کر من پسند حکم بتا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۫ کی تنبیہ کے مطابق انصاف فروخت کرنے کے مرتکب ہونے کے علاوہ کذب بیانی، دھوکہ دہی اور معاشرے میں جرائم پھیلانے کے ذمہ دار بھی ٹھہرتے ہیں۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۴۲ وَاَقِيْمُوا
اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ، اور جان بوجھ کر حق کو نہ چھپاؤ۔ [45] اور نماز قائم کرو
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳
اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ [46]

[45] ابن زید کہتے ہیں یہودی علماء اپنے ہاتھ سے تحریریں لکھ کر انہیں تورات میں ڈال دیتے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ حق کو باطل کے ساتھ مت ملاؤ۔ اسی لئے آج تورات میں انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں ایسے حیا سوز واقعات درج ہیں جنہیں بیان کرنے سے حیا آتی ہے یقیناً انہیں تورات میں علمائے یہود ہی نے ڈالا ہے اور یہ اللہ کی کتاب، اس کے انبیاء اور تورات پڑھنے والوں پر کس قدر ظلم عظیم ہے۔

اور وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ کا مفہوم حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ارشاد فرمایا کہ "اے یہود تم جانتے ہو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں پھر تم اسے کیوں چھپاتے ہو۔" (تفسیر ابن ابی حاتم جلد اول صفحہ ۹۸ حدیث ۴۵۶ مطبوعہ مکہ مکرمہ)

[46] یہود ہی سے کہا گیا کہ نماز پڑھو زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو یعنی پہلے ایمان لاؤ پھر یہ ساری عبادات ادا کرو۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳ اس لیے فرمایا گیا کہ یہود کی نماز میں رکوع شامل نہیں اللہ نے انہیں فرمایا کہ مسلمانوں کے شامل ہوکر رکوع والی نماز ادا کرو۔

نماز باجماعت کی اہمیت وتاکید:

یہ آیت اگرچہ یہود کیلئے اتری مگر اس کے الفاظ عام ہیں اس میں مسلمانوں کو بھی تعلیم ہے کہ وہ نماز وزکوٰۃ کی پابندی

کریں اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع یعنی نماز با جماعت ادا کریں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی جگہ کسی شخص کو کھڑا کروں جو لوگوں کو نماز پڑھائے اور خود چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر ان لوگوں کے پاس جاؤں جو مسجد میں نہیں آتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اللہ کی قسم اگر ان لوگوں کو علم ہو کہ مسجد میں اونٹ کا گوشت کھانے کو ملے گا تو وہ عشاء کی نماز بھی مسجد میں پڑھیں گے۔'' (بخاری کتاب الصلوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ راوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''نماز با جماعت اکیلے نماز پڑھنے کی نسبت ستائیس درجہ زیادہ ثواب رکھتی ہے۔'' (بخاری کتاب الاذان)

دنیا میں اگر ہمیں کوئی چیز سستی ملے خواہ ایک روپے یا پونڈ کا نفع ہو تو ہم اس کے لئے دور چل کر جانا گوارا کر لیتے ہیں جبکہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے سے ستائیس گنا فائدہ ہے مگر ہم اس کی پرواہ نہیں رکھتے۔

حدیث میں ہے کہ مسجد جانے پر ہر قدم پر ایک نیکی ملتی ایک گناہ مٹتا اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور فرشتے دعا کرتے ہیں اے اللہ! اس شخص پر رحمت کر اس پر درود بھیج۔ (بخاری کتاب الاذان)

نماز با جماعت پڑھنا واجب ہے البتہ نابینا، مریض اور اپاہج کو ترکِ جماعت پر کوئی گناہ نہیں۔ یونہی شدید سردی، تیز بارش اور سخت تاریکی میں بھی ترکِ جماعت جائز ہے، قافلہ کے نکل جانے کے خوف سے بھی جماعت ترک کی جاسکتی ہے، سخت بھوک لاحق ہو یا پاخانہ و پیشاب کی تیز حاجت ہو تو یہ بھی ترک جماعت کا ایک معقول عذر ہے۔
(عالمگیری جلد ۱، ص ۸۳)

امام کے لیے ضروری ہے کہ بد اعتقاد نہ ہو:

نماز با جماعت کی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ امام بدعقیدہ نہ ہو، بدعقیدگی میں ہر وہ چیز شامل ہے جو اہل سنت کے چاروں مکاتب فقہ حنفی مالکی شافعی اور حنبلی کے متفقہ اور اجماعی عقائد و نظریات سے متصادم ہو، جیسے انکارِ توسل یا توسلِ انبیاء و اولیاء کو شرک کہنا، حیات انبیاء سے انکار، زیارتِ قبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سفر کو حرام کہنا اور افضلیت شیخین سے انکار وغیرہ۔

درمختار میں ہے: ویکرہ امامۃ مبتدع ای صاحب بدعۃ وھی اعتقاد خلاف المعروف عن الرسول ﷺ، یعنی بدعتی شخص کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ عقائد سے خلاف عقیدہ اپنائے، اس کی امامت مکروہ ہے، اور اس کی شرح میں امام ابن عابدین ردالمحتار میں کہا ان کراھۃ تقدیمہ کراھۃ تحریم، کہ بدعتی کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ (درمختار مع ردالمحتار جلد اول صفحہ ۵۸۵ مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر)

اسی طرح امام حسن بن عمار شرنبلالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وروی محمد عن ابی حنیفة وابی یوسف رحمهما الله ان الصلوة خلف اهل الاهواء لا تجوز والصحیح انها تصح مع الکراهة خلف من لا تکفر بدعته، امام محمد نے امام ابوحنیفہ وامام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما سے نقل کیا ہے کہ اہل ہواء (بدعقیدہ لوگوں) کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، اور صحیح یہ ہے کہ جس کی بدعت حد کفر تک نہ پہنچی ہو اس کے پیچھے نماز مع الکراہت جائز ہے۔ (مراقی الفلاح شرح نور الایضاح فصل فی الامامۃ صفحہ ۱۶۵ مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی)

اور اگر کسی کی بدعقیدگی حدِ کفر تک پہنچ گئی ہو تو اس کے پیچھے نماز اصلاً واقع ہی نہیں ہوتی، جیسے مکہ سے بیت المقدس تک شبِ معراج کی سیر کا منکر، صحابیتِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا منکر، تحریفِ قرآن کا قائل، حجیتِ حدیث کا منکر، ختم نبوت کا منکر اور کسی بھی قطعی عقیدہ کا منکر کافر ہے، اس کے پیچھے نماز اصلاً منعقد نہیں ہوتی۔

داڑھی منڈانے یا حد شرعی سے کم رکھنے والے کی امامت مکروہ تحریمی ہے:

اسی طرح فاسق معلن جو علانیہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو کے پیچھے بھی نماز مکروہ ہے، اور اسی زمرہ میں داڑھی کا منڈانا یا قدر قبضہ سے کم رکھنا ہے، چنانچہ حدیث میں داڑھی کے بڑھانے کا حکم بار بار وارد ہوا مثلاً:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

خالفوا المشرکین ووفّروا اللحیٰ واحفوا الشوارب، وکان ابن عمر اذا حج او اعتمر قبض علی لحیته فما فضل اخذه "مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھی کو وافر کرو اور مونچھوں کو کم کرو، اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب حج یا عمرہ کرتے تو داڑھی کو مٹھی میں لیتے اور جو اس سے زائد ہوتی اسے کاٹ دیتے۔"
(بخاری کتاب اللباس حدیث ۵۸۹۲، مسلم کتاب الطہارۃ حدیث ۶۰۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سختی سے پابندی کرتے تھے، انہوں نے یہ حدیث روایت کی کہ داڑھی کو وافر کرو اور انہوں نے قبضہ سے زائد داڑھی کو کاٹ کر بتادیا کہ یہی قدر مسنون ہے، اور اسی قدر داڑھی کو وافر کرنے کا حکم ہے، اور حکم وجوب کے لیے ہے جب تک اس کے خلاف قرینہ نہ ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جزوا الشوارب ارخوا اللحیٰ خالفوا الیهود یعنی مونچھیں کٹاؤ اور داڑھی کو لمبا کرو یہود کے خلاف چلو۔ (مسلم کتاب الطہارۃ حدیث ۶۰۳)

اور انہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ طریقہ تھا: کان ابو هریرة یقبض علی لحیته فیأخذ ما فضل یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی داڑھی کو پکڑتے تھے، اور جو قبضہ سے زائد ہوتی اسے کاٹ دیتے۔ (عمدۃ القاری کتاب اللباس جلد ۲۲ صفحہ ۴۷ مطبوعہ دار الفکر بیروت۔ مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۶ صفحہ ۱۰۹ کتاب الادب باب ۲۰ مطبوعہ دار الفکر بیروت) معلوم ہوا کہ قدر قبضہ ہی داڑھی کی وہ شرعی مقدار ہے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم فرما رہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہی چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے سمجھی۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کانوا یرخصون فیما زاد علی القبضة من اللحیة ان یؤخذ منها۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ قدر قبضہ سے زائد کو کاٹنے کی اجازت دے دیتے تھے (اس سے کم کی اجازت نہیں دیتے تھے) (مصنف ابن ابی شیبۃ جلد ۶ صفحہ ۱۰۹ باب ۲۰ مطبوعہ دار الفکر بیروت) گویا کسی صحابی کے نزدیک قبضہ سے کم داڑھی کاٹنا ممنوع ہے۔

اسی طرح مروی ہے کہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کی بے تحاشا لمبی داڑھی دیکھی تو قینچی منگوائی فجز ما تحت یدہ، تو قبضہ سے زائد داڑھی کاٹ دی۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری کتاب اللباس جلد ۲۲ صفحہ ۴۷)

حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من عقد لحیته او تقلد وترا اواستنجیٰ برجیع دابة او عظم فان محمدا منه بریٔ۔ جس نے اپنی داڑھی کو باندھا یا تانت باندھی یا جانور کے گوبر یا ہڈی کے ساتھ استنجاء کیا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس سے بری ہے (بیزار ہے۔) (سنن ابی داود کتاب الطھارۃ باب ۲۰ حدیث ۳۶، نسائی کتاب الزینۃ باب ۱۲، مسند احمد بن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۰۴)

داڑھی کا باندھنا یہ ہے کہ اسے اندر کی طرف دوہرا کر کے اوپر سے باندھ دیا جائے تاکہ وہ لٹکتی نظر نہ آئے، یعنی چھوٹی دکھائی دے، جیسے سکھوں کا طریقہ ہے، یہاں سوچنے کا مقام ہے کہ داڑھی کا باندھنا جب اس قدر برا کام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے بیزاری کا اظہار فرمارہے ہیں تو اس کا کاٹ کر چھوٹا کر دینا اس سے کہیں بڑا گناہ ہے، تو یقیناً داڑھی کٹانے والے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیزاری اس سے کہیں زیادہ ہے، اور جس سے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیزار ہوں اس کا حامی کون ہے۔

امام حسن بن عمار شرنبلالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والاخذ من اللحیة دون ذالك (ای القدر المسنون وهو القبضة) كما يفعله المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه احد۔ یعنی داڑھی کو قدر مسنون سے جو مٹھی برابر ہے، کم کرنا جیسا کہ بعض مغربی لوگ اور خنثیٰ صفت مرد کرتے ہیں تو اسے کسی فقیہ نے حلال نہیں جانا۔

(مراقی الفلاح شرح نور الایضاح فصل فی الامامۃ صفحہ ۲۷۳ مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی)

امام علاء الدین حصکفی حنفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

القدر المسنون هو القبضة واما الاخذ منها وهی دون ذالك كما يفعله بعض المغاربة ومخنثة الرجال فلم يبحه احد، داڑھی کا قدر مسنون ایک قبضہ برابر ہے، رہا اس سے کم کرنا جیسا کہ بعض مغربی اور خنثیٰ قسم کے لوگ کرتے ہیں تو اسے کسی نے جائز نہیں کہا۔ (یہ ناجائز اور حرام ہے)

(درمختار جلد دوم صفحہ ۴۴۵ کتاب الصوم باب ما یفسد الصوم مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر)

اور شیخ محقق شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وحلق لحیہ کردن حرام است، وروش فرنج وہنود وجوالقیان کہ ایشاں را قلندریہ گویند وگزاشتن آں بقدر قبضہ واجب است، وآنکہ آنرا سنت گویند بمعنی طریقہ مسلوکہ در دین است، یعنی داڑھی کا منڈانا یا انگریزوں اور ہندوؤں کا طریقہ اپنانا حرام ہے، اور قدر قبضہ داڑھی کا رکھنا واجب ہے، اور داڑھی کو سنت کہا جاتا ہے تو وہ اس لیے کہ اس کا معنی ہے کہ دین میں جاری شدہ طریقہ۔

(اشعۃ اللمعات کتاب الطہارۃ باب السواک جلد اول صفحہ ۲۱۲ مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر پاکستان)

لہٰذا داڑھی کا منڈانے یا قبضہ سے کم رکھنے والا شخص مرتکب حرام اور فاسق معلن ہے، اور فاسق کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔

''مراقی الفلاح شرح نور الایضاح'' میں ہے کہ فاسق کی امامت اس لیے مکروہ ہے کہ اس نے دین کا اہتمام نہیں کیا، لہٰذا اس کی توہین واجب ہے، اور اس کو امام بنا کر اس کی تعظیم نہیں کی جا سکتی، اور جب اس کو امامت سے ہٹانا مشکل ہو تو نمازی کو چاہیے کہ جمعہ وغیرہ کے لیے کسی دوسری مسجد میں چلا جائے، اور اگر شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ ہوتا ہو تو پھر اس کے ساتھ پڑھ لے۔ (مراقی الفلاح صفحہ ۱۶۵)

کیا بینک اور بلڈنگ سوسائٹی کا طویل المیعاد قرض وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے؟

یہاں اللہ تعالیٰ نے واٰتوا الزکوٰۃ کہہ کر زکوٰۃ کی ادائیگی پر تاکید فرمائی ہے، مگر بہت سے مسلمان حیلے بہانے کر کے زکوٰۃ سے جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً یہاں برطانیہ میں قریبا ۹۹ فیصد لوگوں پر بینکوں کا قرض ہے، کیونکہ ہر کسی نے بینک سے قرض لے کر مکان خرید رکھا ہے جو بیس یا پچیس برس میں واپس کرنا ہوتا ہے۔ تو کیا یہ قرض وجوبِ زکوٰۃ سے مانع ہے؟ تحقیق یہ ہے کہ شرعی طور پر صرف وہ مقروض زکوٰۃ سے مستثنٰی ہوتا ہے جس سے قرض کی فوری ادائیگی کا مطالبہ ہو، اگر فوری ادائیگی مطلوب نہ ہو تو زکوٰۃ ساقط نہیں ہوتی۔ جیسے فقہاء فرماتے ہیں کہ ایک شخص پر بیوی کا مہر مؤجل لازم ہے جس کی فوری ادائیگی کا مطالبہ نہیں ہے تو اس کو زکوٰۃ سے مانع نہیں قرار دیا جائے گا۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ ۱۷۳ کتاب الزکوٰۃ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

اسی طرح کثیر فقہاء دَینِ مؤجّل (جس قرض کی ادیئگی میں مہلت دی گئی ہو، یعنی میعادی قرضہ) کو زکوٰۃ سے مانع نہیں سمجھتے، اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وعن ابی حنیفة لا یمنع، وقال الصدر الشهید لا روایة فیه ولکل من المنع وعدمه وجه، زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ دین موجّل زکوٰۃ سے مانع نہیں ہے، اور صدر شہید نے کہا کہ اس بارہ میں کوئی روایت نہیں ہے، اور اس کے مانع ہونے اور نہ ہونے دونوں کی وجہ بنتی ہے، اور امام قہستانی نے الجواہر سے یہ زائد بات نقل کی ہے کہ صحیح یہی ہے کہ دین موجّل (میعادی قرضہ) زکوٰۃ

سے مانع نہیں ہے۔ (ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۲۷۶ کتاب الزکوۃ مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر)

لہٰذا بینک اور بلڈنگ سوسائٹی کا میعادی قرض جو فوراً ادا کرنا ضروری نہیں ہے زکوٰۃ کو ساقط نہیں کرتا۔ زکوٰۃ صرف اس مقروض سے معاف ہے جو ادائیگی قرض سے معذور ہے بلکہ ایسے شخص کو زکوٰۃ دی بھی جاسکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے مصارف میں مقروض کا بھی ذکر فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالْغٰرِمِیْنَ، اور جو مقروض ہیں وہ بھی زکوٰۃ کے حقدار ہیں۔ (سورہ توبہ، آیت نمبر ۶۰)

اب کیا برطانیہ کے متمول وآسودہ حال لوگ بینکوں کے مقروض ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کے حقدار ٹھہریں گے؟ یونہی پاکستان وانڈیا وغیرہ کے بڑے سرمایہ دار اور بزنس کمیونٹی کے لوگ اکثر بینکوں کے مقروض ہوتے ہیں۔ وہ بینکوں سے ادھار لے کر کاروبار چلاتے ہیں تو کیا ان لوگوں کو زکوٰۃ کا حقدار ٹھہرایا جائے گا حالانکہ وہ خود لاکھوں میں زکوۃ ادا کرتے ہیں؟ اگر یہ لوگ زکوٰۃ کے حقدار ہیں تو پھر دنیا میں زکوٰۃ دینے والا کون ہے؟ معلوم ہوا کہ بنکوں کا میعاد قرض وجوب زکوٰۃ اور وجوب حج سے مانع نہیں ہے۔

حق تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کو حیلے بہانے سے دور کرنا ان لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جو دین کو اپنے لیے بوجھ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بوجھ نہیں ہے بلکہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس قدر مال بخشا کہ ہم اہلِ نصاب بنے۔ اگر وہ چاہتا تو ہمیں زکوۃ لینے والوں میں بنا دیتا مگر اس نے اپنے کرم سے ہمیں مالدار بنایا ہے اور اپنے دیئے ہوئے سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ط

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتاب (تورات) کو پڑھتے ہو،

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى

تو کیا تم عقل نہیں رکھتے۔ [47] اور (مجھ سے) صبر ونماز کے ساتھ مدد مانگو اور نماز بے شک بھاری کام ہے مگر ڈرنے والوں

الْخٰشِعِیْنَ ﴿۴۵﴾ لا الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

پہ (بھاری نہیں) جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور انہوں نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ [48]

[47] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں علماء یہود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل لوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت سناتے اور ان پر ایمان لانے کا حکم دیتے تھے مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو سب سے پہلے علماء یہود ہی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے منہ موڑ لیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے اور خود کو بھلا

دیتے ہو حالانکہ تم کتاب پڑھتے اور سب کچھ جانتے ہو پھر تم عقل کیوں نہیں کرتے۔ (ابن جریر)

واعظ بےعمل کا عذاب:

اس آیت سے واعظ بےعمل کی برائی بھی معلوم ہوئی کہ جو شخص لوگوں کو نیکی کا حکم دے اور خود اس پر عمل نہ کرے۔
ایک جگہ اللہ نے فرمایا: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ یعنی جو کام تم خود نہیں کرتے وہ دوسروں کو کیوں کہتے ہو؟
(سورہ صف، آیت نمبر ۲)

حدیث میں ہے واعظِ بےعمل کو جہنم میں پھینکا جائے گا تو اس کی آنتیں باہر نکل آئیں گی اور وہ ان کے گرد یوں گھومے گا جیسے گدھا اپنی چکی کے گرد، لوگ اس کے گرد جمع ہو جائیں گے اور پوچھیں گے کیا تم وہی شخص نہیں ہو جو ہمیں نیکی کا حکم دیتا اور برائی سے منع کرتا تھا؟ وہ کہے گا ہاں میں وہی ہوں مگر میں خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا۔ (بخاری کتاب الفتن)
شبِ معراج حضور ﷺ نے دیکھا جہنم میں کچھ لوگوں کے ہونٹ کاٹے جا رہے ہیں کٹنے کے بعد ان کے ہونٹ دوبارہ درست ہو جاتے ہیں اور پھر کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ آپ نے پوچھا جبریل یہ کون ہیں۔ انہوں نے کہا یہ آپ کی امت کے وہ خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے اور خود کو بھول جاتے ہیں۔ (مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۱۲۰)

[48] صبر کا لغوی معنی روکنا ہے اور شرعی معنی یہ کہ انسان اپنے نفس کو مرضیٔ خدا کے خلاف چلنے سے روکے۔ مثلاً مصیبت میں چیخنے چلانے اور بےصبری کرنے سے خود کو روکے اور گناہ کی دعوت ملنے پر خود کو اس سے روکے اور نماز کا مفہوم واضح ہے۔ ان دو چیزوں سے اللہ کی رحمت قریب آ جاتی ہے لہٰذا ان کے ذریعے اللہ سے مدد مانگنا چاہیے۔ یعنی جب کوئی مصیبت آ جائے تو صبر اور نماز کے ذریعہ اللہ کی مدد حاصل کرنی چاہیے۔

نماز کو بھاری سمجھنا مومن کا شیوہ نہیں

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نماز کی پابندی نفسِ انسانی پر بہت بھاری ہے کہ پانچ مرتبہ روزانہ اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر پابندی وقت کے ساتھ نماز ادا کی جائے مگر جن لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اپنے رب کے ہاں جانے والے ہیں اور وہاں پہلا سوال ہی نماز کا ہو گا ان پر نماز بھاری نہیں ہے بلکہ وہ اسے محبوب حقیقی سے ملاقات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ معلوم ہوا نماز کو بوجھ سمجھنا مومن کا شیوہ نہیں۔

مومن کو نماز سے کیسی محبت ہونی چاہیے؟

مومن کو تو نماز سے ایسی محبت ہوتی ہے کہ وہ اس کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جعلت قرة عینی فی الصلوة یعنی "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ منافقوں پر نماز کا پڑھنا اس قدر بھاری نہیں جس قدر ان پر نماز کا ترک بھاری ہے۔

بلکہ مومن کی شان تو یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان الذی تفوته العصرُ فکأنما وُتر مالُه واهلُه۔ ''جس شخص کی نماز عصر فوت ہوگئی تو گویا اس کا مال اور اہل خانہ سب ہلاک ہوگئے۔'' (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداود، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، سنن بیہقی)

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ نمازِ عصر کا رہ جانا مومن کے لیے اتنا بڑا صدمہ ہے جیسے اس کے مکان کو آگ لگ گئی جس میں اس کا سارا مال اور سب اہل خانہ جل کر ختم ہوگئے۔ اس لیے اللہ فرما رہا ہے کہ نماز ان لوگوں پر بھاری نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں کیونکہ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ نماز کو اللہ کا عظیم تحفہ سمجھتے ہیں اور بلاشبہ نماز اللہ کی طرف سے مومن کے لیے عظیم تحفہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جب روزہ فرض کیا تو اس لیے زمین پر حکم نازل کیا۔ زکوٰۃ فرض کی تو زمین پر حکم نازل کیا، حج فرض کیا تو اس کا حکم زمین پر اتارا۔ اسی طرح سارا دین اسلام ہے مگر جب نمازِ پنجگانہ کی باری آئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوبِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرش پر بلایا اور نماز کو آپ کی امت کے لیے بطور تحفہ عطا فرمایا۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج سے واپس ہوئے تو راستہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ملے انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ آپ اپنی امت کے لیے کیا لائے ہیں۔ فرمایا: پچاس نمازیں۔ انہوں نے کہا: ان امتك لاتستطيع ذلك ارجع الى ربك فأسئله التخفيف یعنی ''آپ کی امت پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکتی آپ اپنے رب کے پاس واپس جائیں اور اس میں تخفیف کرائیں۔'' تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس جاتے رہے اور اللہ تعالیٰ نمازیں کم کرتا رہا حتی کہ صرف پانچ نمازیں رہ گئیں۔ (بخاری و مسلم عن انس رضی اللہ عنہ)

مگر ثواب پچاس ہی کا رہا کیونکہ فرمایا: من جاء بالحسنة فله عشر امثالها

يٰبَنِيۡٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّيۡ

اے اولادِ یعقوب (علیہ السلام) میری نعمت یاد کرو! جو میں نے تم پر کی اور میں نے

فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِيۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا

تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی [49] اور اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی (کافر) جان سے کوئی بدلہ نہ دے گی

وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾

اور نہ اس کی طرف سے شفاعت قبول ہوگی اور نہ اس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ [50]

بنی اسرائیل پر ہونے والا پہلا انعامِ خداوندی، دولتِ ایمان

[49] اللہ رب العزت بنی اسرائیل کو یاد دلا رہا ہے کہ ایک وقت تھا جب میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی۔ یعنی تمہارے اندر انبیاء بھیجے تم میں کثیر آسمانی کتابیں نازل کیں تاکہ تم دوسری قوموں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دو، اس وقت تمہارے سوا سب قومیں کفر وشرک کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھیں چنانچہ اس وقت میں نے تمہیں دولت ایمان دے کر سب جہانوں پر فضیلت دی۔ یہاں یہ بنی اسرائیل پر ہونے والا پہلا انعام بیان کیا گیا۔ یہاں تمام قوموں کی بجائے تمام جہانوں کا ذکر کیا گیا کیونکہ بندہ مومن تمام جہان سے افضل ہے۔ اللہ فرماتا ہے: وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡٓ اٰدَمَ، یعنی ہم نے بنی آدم کو تمام مخلوق پہ عزت بخشی۔ (سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر ۷۰) لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِيۡٓ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ ﴿۴﴾
(سورہ والتین، آیت نمبر ۴)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ تابعی فرماتے ہیں بنی اسرائیل کو ان کے اپنے زمانہ میں تمام جہانوں پر فضیلت دی گئی تھی۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۱۶۵) مگر جب بنی اسرائیل نے انبیاء کا راستہ ترک کر کے کفر وشرک کی راہ اپنائی تو پھر ان کی وجہ فضیلت ختم ہوگئی پھر اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو اعلان ہوا اب جو لوگ ان کا دامن تھام لیں وہی تمام امتوں سے افضل ہیں۔ كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ "اے امت محمد یہ تم سب امتوں سے افضل ہو۔"
(سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۱۰)

[50] لَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ کے تحت امام ابن جریر فرماتے ہیں یہ اس کیلئے ہے جو کفر پر مر جائے، اور ابن کثیر فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ کافروں کی طرف سے شفاعت قبول نہ ہوگی۔ اسی لیے دوسری جگہ کافروں کے بارے میں فرمایا گیا: فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيۡنَ ﴿۴۸﴾ (سورہ مدثر، آیت نمبر ۴۸)

اسی طرح مشہور تابعی حضرت سدی رضی اللہ عنہ سے لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ کے تحت مروی ہے کہ فرمایا: ای لاتغنی نفس مومنة عن نفس کافرة شیئا ۔یعنی روز قیامت کوئی مومن جان کسی کافر جان کو کوئی فائدہ نہ دے سکے گی (درمنثور بروایت ابن ابی حاتم جلد اول صفحہ ۱۶۶ مطبوعہ دارالفکر بیروت)

روزِ قیامت مومنوں کے لیے شفاعت کا ہونا قرآن وسنت کی روشنی میں

حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن جریر اور ابن کثیر کی یہ آراء بہت قیمتی ہیں کیونکہ گزشتہ رکوع سے یہود ہی سے خطاب چلا آرہا ہے اور اس آیت میں بھی انہی سے خطاب مراد ہے۔رہے مومنین تو ان سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں۔ان کے لئے سب سے اول حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفاعت کریں گے پھر سب صالحین شفاعت کریں گے۔حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے''میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کیلئے ہوگی۔'' (ترمذی، ابوداؤد عن انس)

ایک حدیث ہے''میری امت کے کچھ لوگ ایک جماعت کی سفارش کریں گے کچھ کی شفاعت ایک خاندان کیلئے ہوگی اور کچھ کی شفاعت سے صرف ایک آدمی بخشا جائے گا۔'' (ترمذی عن ابی سعید الخذری)

پھر صحیح بخاری میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''میں اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر طویل سجدہ کروں گا آخر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: آپ اپنا سر اٹھائیں، آپ جو مانگیں گے آپ کو دیا جائے گا، آپ شفاعت کریں آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ چنانچہ میں شفاعت کر کے لوگوں کو دوزخ سے نکالتا رہوں گا حتیٰ کہ صرف وہی لوگ وہاں رہ جائیں گے جن کو قرآن نے روک لیا ہے۔'' (یعنی کہہ دیا ہے کہ کافروں نے ہمیشہ جہنم میں رہنا ہے)'' (بخاری کتاب التوحید)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ﴿۶۷﴾ یعنی روز قیامت گہرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہونگے، سوا متقین کے۔ (سورہ زخرف، آیت نمبر ۶۲)

یعنی قیامت والے دن متقین ایک دوسرے کے دشمن نہیں بلکہ دوست ہونگے اور دوست اسی کو کہتے ہیں جو مشکل میں دوست کے کام آئے تو متقین قیامت میں ایک دوسرے کے کام آئیں گے اور قرآن میں تمام مومنین کو متقین کہا گیا ہے جیسے جنت کے بارہ میں فرمایا گیا: اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴿۱۳۳﴾ وہ متقین کے لیے تیار کی گئی ہے (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۳۳) اور ہر کوئی جانتا ہے کہ جنت تمام اہل ایمان کے لیے ہے تو معنی یہ بنتا ہے کہ اہل ایمان روز قیامت ایک دوسرے کی شفاعت کریں گے۔

بلکہ بعض احادیث کا یہ مفہوم ہے کہ ایک شخص جنت کی طرف جا رہا ہوگا۔ایک شخص اس کا راستہ روک لے گا اور کہے گا کیا تمہیں یاد ہے کہ فلاں موقع پر میں نے تمہارے لیے وضو کا پانی مہیا کیا تھا؟ یعنی تم نے نماز ادا کرنا تھی اور تمہارے پاس پانی نہیں تھا تو میں نے تمہارے لیے نماز کا معاملہ آسان کیا۔آج تم جنت میں جا رہے ہو اور میرے لیے اس سے مختلف حکم ہے تو وہ جنتی اللہ کی بارگاہ میں اس کے لیے شفاعت کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت سے اس وضو کرانے والے کو بھی جنت عطا فرمادے گا۔اس کی تفصیلی بحث اسی آیت اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ کے تحت آئے گی۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ

اور یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون کے پیروکاروں سے نجات دی وہ تمہیں بُرے عذاب میں مبتلا رکھتے تھے تمہارے بچوں کو

اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

ذبح کرتے اور تمہاری بچیوں کو زندہ چھوڑتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے عظیم امتحان تھا۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے سمندر کو پھاڑا تو تمہیں بچالیا اور فرعون کے پیروکاروں کو غرق کر دیا اور تم دیکھ رہے تھے۔[51]

بنی اسرائیل پر ہونے والا دوسرا انعام، ہلاکتِ فرعون

[51] یہاں بنی اسرائیل پر ہونے والا دوسرا انعام خداوندی بیان ہورہا ہے کہ اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہیں فرعون اور اس کے ساتھیوں سے نجات دی وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ چنانچہ ہم نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ تمہارے سامنے سمندر پھاڑ کر تمام فرعونیوں کو اس میں غرق کر دیا اور تمہیں سمندر میں سے صحیح سالم نکال لیا۔

یہاں بچوں کو اَبْنَآءَكُمْ اور بچیوں کو نِسَآءَكُمْ کہنے میں حکمت یہ ہے کہ فرعونی چاہتے تھے کہ بنی اسرائیل کی بچیاں عورتیں بننے کیلئے زندہ رہیں اور ان کیلئے ان میں سے کوئی مرد نہ ہو وہ بچپن ہی میں ذبح ہو جائیں تو یوں ان کی عورتیں فرعونیوں کے قبضے میں آئیں۔ ورنہ عقلاً يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ کے مقابلہ میں وَيَسْتَحْيُوْنَ بَنَاتِكُمْ ؕ چاہیے تھا۔ الغرض الفاظ قرآنی میں گہری حکمتیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نجومیوں نے فرعون کو آگاہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہونے والا ہے جو تمہاری سلطنت کا تختہ الٹ دے گا، فرعون نے ہر دس اسرائیلی عورتوں پر ایک نگران مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ ہر حاملہ عورت پر کڑی نگاہ رکھو اگر وہ لڑکا جنے تو اسے ذبح کر دو لڑکی جنے تو اسے جینے دو۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہی ذبح ہو گئے۔ فرعون نے یہ سارا ظلم اس لیے کیا تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا نہ ہوں مگر وہ نہ صرف پیدا ہوئے بلکہ فرعون کی گود میں پل کر جوان ہوئے اور بالآخر انہی کے ہاتھوں فرعون اپنی ساری قوم سمیت واصل جہنم ہوا اور بنی اسرائیل کو اس کے ظلم سے آزادی ملی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے مفصل حالات سورہ طٰہٰ کے دوسرے اور سورہ قصص کے پہلے رکوع کے تحت بیان ہوں گے۔ ان شاء اللہ!

یاد رہے محققین نے دور موسوی کے فرعون کا نام رعمسیس دوم بتایا ہے اس کا زمانہ قریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح ہے۔

فرعون اس زمانہ میں مصری بادشاہوں کا سرکاری نام تھا۔ ہر بادشاہ فرعون کہلاتا تھا جیسے ظہور اسلام سے قبل ہر ایرانی بادشاہ کسریٰ اور رومی بادشاہ قیصر کہلاتا تھا۔ یا جیسے تاریخ اسلام میں ہر اموی اور عباسی حاکم کو خلیفہ اور ترکی حاکم کو سلطان کہا جاتا تھا۔

بنی اسرائیل کے لیے کونسا سمندر پھاڑا گیا؟

بنی اسرائیل کیلئے کونسا سمندر پھاڑا گیا تھا؟ تو یاد رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو لے کر بحکم الٰہی راتوں رات مصر سے نکل پڑے تو فرعون انہیں پکڑنے کیلئے اپنی قوم سمیت پیچھے نکلا۔ آگے بحرِ قلزم (Read Sea) کی مغربی شاخ سے آگے وہ چھوٹا سمندر آ گیا جو بحرِ قلزم اور بحرِ ابیض کے درمیان واقع ہے، اسی سمندر کو دور حاضر میں نہر سویز کے ذریعہ بحرِ قلزم اور بحرِ ابیض سے ملایا گیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سمندر سے ہٹ کر خشکی کا راستہ ہی لے سکتے تھے مگر آج قدرت کا ارادہ فرعون کو غرق کرنا تھا، یہ بات نقشہ میں دیکھیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ سمندر پر عصا ماریں انہوں نے عصا مارا تو سمندر پھٹ گیا اس سے خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سمیت اس میں سے گزر کر صحیح سالم اگلے کنارے پہنچ گئے۔ پیچھے سے فرعون وہاں پہنچ گیا۔

سمندر کے پھاڑے جانے کا واقعہ

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں فرعون نے سمندر پھٹا ہوا دیکھا تو خوف سے لرزنے لگا اس کے ساتھی بھی دہشت زدہ ہو گئے۔ قریب تھا کہ وہ واپس بھاگ اٹھتا مگر اس کی موت آ گئی تھی۔ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام ایک خوبصورت گھوڑی پہ سوار ہو کر آئے اور فرعون کے گھوڑے کے سامنے اسے چلانے لگے فرعون اپنے گھوڑے کی لگامیں واپس موڑ رہا تھا مگر وہ گھوڑی کے پیچھے بھاگنے لگا۔ گھوڑی سمندر میں بنے ہوئے خشک راستہ میں اتر گئی فرعون کا گھوڑا بھی اس کے پیچھے اس میں داخل ہو گیا اور ساری فرعونی قوم بھی سمندر میں اتر آئی تب اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم فرمایا کہ وہ باہم مل جائے چنانچہ فرعون اپنی قوم سمیت غرق ہو گیا اور بنی اسرائیل کنارے پہ کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ (البدایہ والنہایہ جلد اول صفحہ ۲۵۲ مطبوعہ دار الریان بیروت) یہ واقعہ سورہ یونس رکوع ۹ اور سورہ نمل رکوع ۴ میں مزید تفصیل سے آئے گا وہاں اس پر مزید روشنی ڈالی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

اللہ کی عظیم نعمتوں کو یاد کرتے رہنا چاہیے:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ سے معلوم ہوا اللہ جب کسی قوم پر بڑا انعام کرے تو قوم کو وہ نعمت یاد رکھنی چاہیے اس ضمن میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ امت مسلمہ کے لئے سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ فرمایا گیا: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا (آل عمران: ۱۶۴)

چنانچہ امت مسلمہ مجالس میلاد النبی ﷺ کے ذریعے اس نعمت کے تذکرے کرتی اور شکر الٰہی بجا لاتی ہے۔ یہ بھی وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ پر عمل کا ایک طریقہ ہے اس کا روئے سخن اگرچہ یہود کی طرف ہے مگر اس میں مسلمانوں کیلئے بھی تذکیر نعمت کا درس ہے۔

جشنِ آزادی منانے کا جواز:

یہود کو فرعون سے آزادی کی نعمت کے یاد کرنے کا حکم ہوا کہ اللہ نے انہیں فرعون سے آزادی دے کر ان پہ عظیم انعام فرمایا، چنانچہ قوم یہود یوم عاشورہ (دس محرم) کو عید مناتی ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کر کے انہیں آزادی دی، اور حدیث شریف میں ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہود کو دیکھا کہ وہ دس محرم کو روزہ رکھتے اور اپنے اہل خانہ کو عمدہ کپڑے پہناتے ہیں۔ آپ ﷺ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اس دن اللہ نے ہمیں فرعون سے آزادی دی تھی، گویا یہود نے اس نعمت کو یاد رکھا اور اس کو قومی تہوار کے طور پر منایا۔ اسی طرح پاکستانی قوم ۱۴ اگست کو جشن آزادی مناتی ہے جب انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کے قبضہ سے آزادی ملی۔ اسی طرح ہر قوم اپنا یوم آزادی مناتی ہے، اس کی اصل وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ سے معلوم ہوئی۔

مجھے میزبانِ مہمانانِ رسول ﷺ مولانا فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۹۳ء میں حاضری مدینہ طیبہ کے موقع پر ایک واقعہ سنایا کہ سعودی حکومت ''العید الوطنی'' کے نام سے ہر سال اپنا یوم آزادی مناتی ہے۔ چنانچہ بروایت سید علوی مالکی ایک مرتبہ شاہ فیصل بن عبدالعزیز کے زمانہ میں یوم آزادی منایا جا رہا تھا۔ دارالسلطنت ریاض میں بہت بڑی تقریب منعقد تھی۔ شاہ فیصل موجود تھا اراکین سلطنت اور نجدی علماء بکثرت حاضر تھے۔ بادشاہ نے پوچھا اے علماء کرام سعودی حکومت ہر سال یوم آزادی کی تقریبات پر کروڑوں ریال خرچ کرتی ہے اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

نجدی علماء نے کہا اس کے جواز میں کیا شک ہے اس دن اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک نعمت دی آزاد ملک دیا اس کی خوشی میں یہ جلسے وغیرہ کیے جاتے ہیں۔ شاہ فیصل نے کہا پھر جو لوگ ربیع الاول میں عید میلاد مناتے اور جلسے کرتے ہیں وہ بھی تو یہی دلیل لاتے ہیں کہ اس ماہ میں اللہ نے امت مسلمہ پر عظیم نعمت کی کہ رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں بھیجا۔ پھر آپ لوگ اسے ناجائز کیوں کہتے ہیں؟۔ شاہ فیصل کی زبان سے یہ بات سن کر تمام نجدی علماء سکتے میں آ گئے اور ایسے لگا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا ہے سب خاموش ہو گئے اور کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

جشنِ عیدِ میلاد النبی ﷺ کا جواز

بلکہ اس جگہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بارہ ربیع الاول کا دن یومِ آزادی اہل اسلام بھی ہے چنانچہ غیر مقلدین علماء کے پیشوا علامہ ابن قیم نے اپنی کتاب ''زاد المعاد'' میں تحقیق کی ہے کہ حضور ﷺ بروز پیروار بارہ ربیع الاول کو مدینہ طیبہ میں

پہلی بار داخل ہوئے۔ (زاد المعاد برحاشیہ زرقانی جلد اول، ص ۸۵، مطبوعہ دالمعرفہ بیروت) گویا اس تاریخ کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پہلی آزاد اسلامی ریاست عطا فرمائی جیسے قومِ موسیٰ علیہ السلام کو عاشورہ کے دن آزادی سے ہمکنار کیا گیا تو یہ بارہ ربیع الاول کی تاریخ یوم آزادی اہل اسلام ہے اس دن خوشی کرنا ہر مسلمان کا حق ہے۔

لفظِ ''آل'' پیروکاروں کے لیے بھی بولا جاتا ہے:

وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ سے معلوم ہوا لفظ ''آل'' جیسے کسی کی اولاد اور اعزہ کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے پیروکاروں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے فرعون کے ساتھ جو لوگ غرق ہوئے وہ سب اس کی اولاد یا قریبی عزیز نہ تھے البتہ اس کے پیروکار تھے، اس لیے ان سب کو آل فرعون کہا گیا، اسی طرح جب لفظ آل محمد بولا جاتا ہے تو اس میں رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام پیروکار امت بھی شامل ہوتی ہے، لہٰذا جب ہم اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد کہتے ہیں تو آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ کے اہل بیت وعترت کے علاوہ آپ کی امت بھی شامل ہوتی ہے جو آپ کے پیروکار ہیں پھر جس قدر کسی کی پیروی ہے اسی قدر اسے درود میں سے حصہ ملتا ہے۔

اسی لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا: آل محمد صلی الله علیه وسلم امته، یعنی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی امت ہے۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۲ صفحہ ۱۵۲ کتاب الصلوۃ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے گھر آیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مولا علی المرتضی رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو اپنے رانوں پہ بٹھا لیا اور علی وفاطمہ رضی اللہ عنہما کو قریب کر لیا اور ان پہ چادر ڈال دی، جبکہ میں دور بیٹھا تھا، آپ نے پہلے یہ آیت پڑھی: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ﴿۳۳﴾ (احزاب، ۳۳) اس کے بعد فرمایا: اللھم ھؤلاء اھلی اللھم اھلی احق، اے اللہ یہ میرے اہل ہیں، اے اللہ میرے اہل زیادہ حق والے ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں بھی آپ کے اہل میں سے ہوں؟ فرمایا: وانت من اھلی ہاں تم بھی میرے اہل میں سے ہو۔
(السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۲ صفحہ ۲۵۲ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

اور اہل کے لفظ ہی کو آل بھی پڑھتے ہیں، یعنی ھاء کو الف بنا دیتے ہیں، حدیث کا مفاد یہ ہے کہ علی وفاطمہ اور حسن وحسین رضی اللہ عنہم نسب واتباع دونوں میں آل رسول ہیں اور واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ صرف اتباع میں ہیں۔

تو لفظ آل محمد اگرچہ اپنے عمومی معنیٰ کے اعتبار سے ساری امت مسلمہ کو شامل ہے مگر اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن پر صدقہ حرام ہے وہ لفظ آل محمد کا سب سے بہترین مصداق ہیں بشرطیکہ وہ صحیح العقیدہ ہوں کیونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جسمانی آل بھی ہیں اور ایمانی آل بھی۔ جبکہ باقی ساری امت صرف ایمانی آل ہے جسمانی نہیں۔ گویا اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اللھم صل علی محمد وعلیٰ آل محمد کی دعا میں دوہرا حصہ ہے اور باقی امت کے لئے ایک حصہ ہے۔ واللہ اعلم

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو چالیس راتوں کا وعدہ دیا پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو (معبود) پکڑ لیا

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۵۱ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۵۲

اور تم ظلم کر رہے تھے۔ پھر ہم نے اس کے بعد تمہیں معافی دی تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۵۳

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور (حق و باطل میں) تفریق دی تاکہ تم ہدایت پاؤ۔[52]

بنی اسرائیل پر ہونے والا تیسرا انعامِ خداوندی، تورات کا حصول

[52] جب فرعون اپنی قوم سمیت بحرِ احمر میں غرق ہو کر واصل جہنم ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو فلسطین کی طرف لے چلے۔ اب چونکہ یہ ایک آزاد قوم تھی تو ضرورت ہوئی کہ انہیں اللہ سے ایک کتاب لے کر دی جائے جس میں مکمل نظام شریعت ہو تاکہ یہ اس کے مطابق اپنی زندگی گزاریں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ آپ اپنی جگہ اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو قوم میں چھوڑ کر خود کوہِ طور پر تشریف لائیں یعنی وہ جگہ جہاں انہیں نبوت عطاء کی گئی تھی اور وہاں ایک ماہ عبادت کریں تب انہیں کتاب دی جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پہ تشریف لے گئے وہاں ایک ماہ عبادت فرمائی۔ یہ ماہ ذی قعدہ تھا آپ نے مسلسل روزہ رکھا جس سے منہ میں وہ مہک خوب پیدا ہوئی جو روزے دار کی منہ میں پیدا ہوتی اور اللہ کو کستوری سے زیادہ محبوب ہے، تب آپ نے ایک درخت کی شاخ چکھ لی جس سے وہ مہک کم ہو گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دس دن (یعنی ذی الحجہ کا پہلا عشرہ) مزید وہاں عبادت کا حکم دیا، آپ مزید دس دن وہاں ٹھہرے، مروی ہے کہ ان چالیس دنوں میں آپ کا وضو نہیں ٹوٹا (ابن جریر) تب اللہ تعالیٰ نے آپ کو تورات عطا کی جو آپ پر تختیوں پہ تحریر شدہ صورت میں نازل ہوئی اور اس میں مکمل شریعت تھی یعنی مکمل نظام حیات تھا، آپ اپنی قوم کو تیس دن کے بعد واپس آ جانے کا کہہ کر گئے تھے مگر جب آپ تیس دن تک نہ آئے تو بنی اسرائیل گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔

بنی اسرائیل کا بچھڑا پرستی میں مبتلا ہونا:

ان میں ایک منافق سامری نامی آدمی تھا اس نے دیکھا تھا کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام گھوڑی پر سوار ہو کر آئے تو

جہاں گھوڑی کا قدم پڑتا وہاں سبزہ اگ آتا۔ اس نے وہ سبزے والی مٹی کا کچھ حصہ اٹھا کر محفوظ کرلیا اللہ فرماتا ہے: سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پوچھنے پر کہا: فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ (سورہ طٰہٰ:۹۶) اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی کے عرصہ میں سونے کا ایک جانور بنایا جو گائے کے بچھڑے کی شکل پر تھا۔ پھر حضرت جبریل کی گھوڑی کے قدموں سے لی جانے والی مٹی اس نے بچھڑے کے منہ میں ڈالی تو اس کے اندر سے حقیقی بچھڑے کی سی آواز آنے لگی، بنی اسرائیل چونکہ کئی صدیاں گاؤ پرست فرعونیوں کے محکوم رہے تھے اور غلامانہ ذہنیت کے باعث بنی اسرائیل میں بھی گاؤ پرستی گھر کر گئی تھی۔ اس لیے جب سامری نے کہا: هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۚ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ یہ بچھڑا تمہارا اور موسیٰ کا خدا ہے تو موسیٰ بھول گیا ہے۔ (اور طور پہ خدا سے ملنے گیا ہے) (سورہ طٰہٰ:۸۸) تو اکثر بنی اسرائیل اس بچھڑے کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب کتاب لے کر طور سے واپس آئے تو دیکھا قوم کا اکثر حصہ گمراہ ہو کر اللہ کی بجائے بچھڑے کو معبود پکڑے بیٹھا ہے۔ تو غصہ کے سبب آپ کے ہاتھ سے وہ تختیاں گر گئیں جو آپ پر لکھی ہوئی نازل ہوئی تھیں اور آپ اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے جھگڑنے لگے کہ انہوں نے قوم کو بچھڑا پرستی سے بزور بازو کیوں نہ روکا۔ پھر آپ سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا تیری یہ سزا ہے کہ تو ہمیشہ کہتا رہے گا اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ یعنی "مجھے کوئی نہ چھوئے" (سورہ طٰہٰ، آیت نمبر ۹۷) چنانچہ اس کے جسم میں ایسا بخار آ گیا کہ چیختا چلاتا جنگل کو بھاگا اور جو اسے چھوتا اسے بھی وہ بخار لگ جاتا پھر آپ نے سامری کے بچھڑے کو آگ میں جلوایا اور اسے سمندر میں بہا دیا۔

آگے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی اے بنی اسرائیل! پھر ہم نے تمہیں بچھڑا پرستی کے جرم کی معافی عطا فرمائی تا کہ تم شکر کرو وہ معافی ان کو کیسے ملی اس کا ذکر اگلے حاشیہ میں آرہا ہے بہر حال یہاں جو انعام بتایا جارہا ہے وہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو تورات کی صورت میں کتاب دی گئی جو حق و باطل میں فرق کرنے والی تھی تا کہ وہ ہدایت پر قائم اور گمراہی سے دور رہیں۔

چلّہ کش ہونا سنتِ انبیاء کرام علیہم السلام ہے:

وٰعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً سے پتہ چلا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتیں عبادت میں لگوائیں تب شرفِ ہم کلامی عطا فرمایا۔ اسی طرح صوفیا بھی دنیا سے کٹ کر چالیس دن کی خصوصی عبادات کرتے ہیں تو انہیں بھی قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے اور حدیث میں ہے جس نے چالیس دن نماز باجماعت تکبیرِ اولیٰ فوت کئے بغیر پڑھی اس کیلئے دوزخ اور نفاق سے برأت لکھ دی جاتی ہے۔ (ترمذی) گویا چالیس دن کی عبادت سے قربِ الٰہی میسر آتا ہے یہی چلہ کشی کرنا ہے۔

چالیس کا عدد مبارک ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس روزہ چلّے سے کتاب ملی، ہر نبی کو چالیس برس کی عمر میں مبعوث کیا گیا۔ بچہ ماں کے رحم

میں چالیس دن تک نطفہ پھر اتنے دن خون پھر اتنے دن گوشت کی صورت میں رہتا ہے۔ (بخاری) حدیث شریف ہے ''جس مسلمان کے حق میں چالیس مسلمان دعا کردیں (جنازہ پڑھیں) اس کیلئے بخشش ہے۔'' (ابن ماجہ کتاب الجنائز) وغیرہ۔شائد اسی لئے برصغیر میں کسی شخص کے فوت ہونے کے چالیس روز بعد اس کے لئے ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے اسے چالیسواں کہتے ہیں بلکہ یہ طریقہ راقم الحروف نے مصروشام میں بھی دیکھا ہے اور وہاں کی اخبار الاربعین کے اشتہاروں سے بھری ہوتی ہیں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انبیاء اپنی قبور میں چالیس دن تک اپنی حالت پہ نہیں چھوڑے جاتے حتیٰ کہ وہ اپنے رب کے حضور عبادت کرتے ہیں۔ (کنزالعمال جلد ۱۱، ص ۴۷۴ بروایت حاکم وبیہقی) معلوم ہوا چالیس دن کے بعد عالم برزخ میں انقلاب آتا ہے شائد اسی لئے چالیسواں کیا جاتا ہے۔

امت محمدیہ کی استقامت:

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ سے پتہ چلا امتِ موسوی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صرف چالیس دن غیر حاضر رہنے کے سبب توحید کو چھوڑ کر شرک میں مبتلا ہوگئی مگر امتِ محمدیہ کو یہ استقامت دی گئی کہ ان کے نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا سے پردہ کیے چودہ صدیوں سے زیادہ زمانہ گزر گیا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت آج بھی عقیدۂ توحید پر قائم اور شرک سے دور ہے۔آج کئی نادان لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسلمانوں کو مشرک بناتے ہیں حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کی قسم مجھے یہ ڈر نہیں کہ تم میرے بعد شرک کروگے البتہ تم دنیا میں پڑ جاؤ گے۔'' (بخاری کتاب المغازی باب ۲،۲۷ کتاب الجنائز باب ۷۳، کتاب المناقب باب ۲۵)

ذوالجناح گھوڑے کی تعظیم گاؤ سالہ پرستی سے مشابہ ہے:

بنی اسرائیل نے بچھڑے کی تعظیم کی۔ ہمارے ہاں اہل تشیع ہر سال ماہ محرم میں ذوالجناح گھوڑے کی تعظیم اسی طرح کرتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کی گاؤ سالہ پرستی کی نقل کررہے ہوں بنی اسرائیل بچھڑے کی تعظیم کررہے تھے اور اہل تشیع گھوڑے کی تعظیم بجالاتے ہیں یہ بدعت سیئہ ہے۔شیعہ لوگ اپنے گمان میں کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی یاد میں گھوڑا نکالتے ہیں۔

حالانکہ خود شیعہ کتب کے مطابق کربلا میں امام عالی مقام امام حسین رضی اللہ عنہ کے پاس گھوڑا نہیں اونٹ تھا، شیعہ مؤرخ لوط بن یحییٰ لکھتا ہے: ثم اناخ راحلته ثم امر عقبة بن سمعان ان يعقلها بفاضل زمامها۔یعنی امام حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا میں پہنچ کر اپنی اونٹنی کو بٹھایا اور عقبہ بن سمعان سے کہا کہ اسے اسکی نکیل کے ذریعہ باندھ دے۔
(مقتل ابی مخنف صفحہ ۵۵ مطبوعہ مکتبہ حیدریہ نجف اشرف)

اسی طرح کربلا میں پہنچ کر امام حسین رضی اللہ عنہ نے فرمایا: هذه موضع كرب وبلاء، هذه مناخ ركابنا ومحط رحالنا ومقتل رجالنا، ''یہ ارضِ کرب وبلا ہے اس جگہ ہمارے اونٹ بیٹھیں گے، ہمارے کجاوے اتریں گے اور

ہمارے مرد قتل ہوں گے۔'' (کشف الغمہ جلد دوم صفحہ ۷۴ مطبوعہ تبریز)

تو گھوڑے کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے نہ جانے یہ گھوڑا کہاں سے آگیا؟ اس کی مزید تفصیل کے لیے میرے والد گرامی محققِ اسلام فاتحِ رافضیت شیخ الحدیث علامہ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۴۱۸ھ کی کتاب ''فقہ جعفریہ'' جلد ۲ کا مطالعہ کریں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ

اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا اے میری قوم! تم نے اپنی جان پر ظلم کیا کہ بچھڑے کو

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

معبود پکڑا تو تم اپنے خالق کی بارگاہ میں توبہ کرو اس طرح کہ اپنے لوگوں کو قتل کرو یہ تمہارے خالق کے نزدیک

عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۵۴

تمہارے لئے بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی بیشک وہ توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔[53]

بنی اسرائیل پر چوتھا انعامِ خداوندی، قبولیت توبہ

[53] جب بنی اسرائیل کے بچھڑے کو جلا کر سمندر میں بہا دیا گیا تو اب اللہ کی طرف سے حکم ہوا کہ اے بنی اسرائیل تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے خود پر ظلم عظیم کیا ہے لہٰذا توبہ کرو اور توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جنہوں نے بچھڑے کو معبود نہیں بنایا وہ معبود بنانے والوں کو قتل کریں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حکم ہوا کہ بچھڑے کے پوجنے والے اوندھے ہو جائیں اور پرستش نہ کرنے والے تلواریں اور خنجر لے کر آجائیں اور انہیں قتل کرنا شروع کریں۔ چنانچہ سخت اندھیرا چھا گیا اور بھائی کے ہاتھوں بھائی اور باپ کے ہاتھوں بیٹا قتل ہونے لگا تا آنکہ صبح تک ستر ہزار آدمی قتل ہو گئے (ابن ابی حاتم نے بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مقتولین کی تعداد ستر ہزار ہی نقل کی ہے)۔ تب اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور حکم ہوا کہ اب قتل بند کر دو جو قتل ہو گئے ان کیلئے بھی معافی ہے اور جو رہ گئے ان کیلئے بھی۔ (ابن جریر)

گویا یہ بھی بنی اسرائیل پہ اللہ کا انعام تھا کہ بعض کے قتل سے سب کی معافی ہو گئی۔ امام زہری سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل اس موقع پر اتنی بڑی تعداد کے قتل ہو جانے پر پریشان تھے، اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ جو قتل ہو گئے وہ میرے ہاں زندہ ہیں انہیں رزق دیا جاتا ہے (یعنی وہ شہید ہیں) اور جو قتل سے بچ گئے ان کی توبہ قبول ہو گئی۔ تب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل خوش ہو گئے۔ (در منثور جلد اول ص ۱۶۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت) بنی اسرائیل کے اس قتل کا تذکرہ تورات کتاب خروج باب ۳۲ میں آج بھی موجود ہے۔

امتِ محمدیہ کیلئے توبہ کی آسانی:

دیکھئے بنی اسرائیل نے شرک کیا تو اس سے توبہ کیلئے انہیں قتل کیا گیا۔ ان کی زبانی توبہ نہ مانی گئی۔ قرآن میں ہے:
وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ (سورہ اعراف:۱۴۹) گویا انہوں نے زبانی توبہ بہت کی، اس کے باوجود انہیں قتل کیا گیا۔

مگر امتِ محمدیہ کے لئے اس قدر آسانی کی گئی کہ اگر ایک شخص ساری زندگی شرک کرے اور موت سے قبل توبہ کرلے تو زندگی بھر کا شرک معاف۔ جیسے اللہ فرماتا ہے: قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ آپ کافروں سے فرمادیں اگر وہ (کفر سے) باز آجائیں تو جو پہلے ان سے ہوچکا وہ انہیں معاف کردیا جائے گا۔ (انفال،۳۸)

شریعت کا سخت حکم بھی پورا کرنا چاہیے:

اسی میں ہماری بھلائی اور کامیابی ہے اسی لیے کہا گیا: فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۵۴) اللہ تعالی بندے کو آزماتا ہے کہ وہ میری خوشنودی کے لیے میرے سخت حکم کو پورا کرتا ہے یا نہیں اگر وہ کردے تو اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اسی لیے حدیث میں ہے: حُفَّتِ الجنۃُ بالمَکارہِ کہ جنت کو تکلیفوں میں لپیٹا گیا ہے۔ (مسلم کتاب الجنۃ حدیث ۱) یعنی جنت تک پہنچنے کے لیے تکالیف میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

جو چیز مومن کو اللہ سے دور کردے وہ بنی اسرائیل کے بچھڑے جیسی ہے

بنی اسرائیل نے اللہ سے منہ موڑ کر بچھڑے کی پوجا شروع کردی۔ ہم مسلمانوں نے کسی بچھڑے کو تو نہیں پوجا مگر ہم نے اللہ کا حکم چھوڑ کر دنیا پرستی شروع کردی۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے ہمارے بارے میں فرمایا کہ ''مجھے یہ خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک کروگے مگر یہ خوف ہے کہ تم دنیا میں مبتلا ہوجاؤ گے۔'' گویا شیطان وہ سامری ہے جو دنیا کو ہمارے سامنے یوں لاتا ہے جیسے بنی اسرائیل کے سامنے بچھڑا تھا اور ہم اللہ کو چھوڑ کر دنیا کے پجاری بن جاتے ہیں تو جیسے بنی اسرائیل کو حکم ہوا فاقتلوا انفسکم کہ تلوار سے خود کو قتل کرو۔ ہمیں بھی حکم ہے کہ اطاعت کی تلوار سے اپنے نفس امارہ کو قتل کرو کیونکہ یہ نفس ہی مومن کو دنیا پرست بناتا ہے اور اس کی حالت بچھڑا پرست جیسی بنا دیتا ہے۔

بلکہ دنیا کی حالت تو بچھڑے سے بھی بدتر ہے۔ دنیا کی حالت تو بدبودار مردار جیسی ہے۔ ایک بار نبی اکرم ﷺ اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ کہیں سے گزرے۔ وہاں ایک مردہ بکری پڑی تھی جس سے بدبو آرہی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے چہروں پہ کپڑے رکھ لیے تاکہ اس کی بدبو سے بچ سکیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کون ہے جو اسے ایک درہم سے خریدے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اسے تو کوئی مفت بھی نہیں لے سکتا۔ آپ ﷺ نے نے فرمایا

: دنیا اللہ کے ہاں اس سے بھی ذلیل تر ہے جس قدر یہ مردار تمہارے ہاں ذلیل ہے۔'' (مشکوۃ کتاب الرقاق)

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ
اور جب تم نے کہا اے موسیٰ! ہم ہرگز آپ کی بات نہ مانیں گے جب تک ہم اللہ کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں، تو تمہیں بجلی کی
الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ
کڑک نے آ پکڑا اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد دوبارہ اٹھا دیا تاکہ تم
تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾
شکر بجالاؤ۔[54]

بنی اسرائیل پر ہونے والا پانچواں انعامِ خداوندی

انکی ایک جماعت کے دوبارہ زندہ ہونے کا بیان:

[54] جب بچھڑا پوجنے والوں میں سے ستر ہزار کے قتل کے بعد باقی لاکھوں لوگوں کو معافی دیدی گئی۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحکم الٰہی ان میں سے ستر بڑے لوگوں کو چنا اور انہیں ساتھ لے کر پھر کوہ طور پہ پہنچے تاکہ اس معافی کے ملنے پر وہ اللہ کا شکر بجالائیں۔ آپ نے وہاں پہنچ کر ان سے فرمایا کہ روزہ رکھو، غسل کرو، پاکیزہ کپڑے پہنو اور سجدے میں پڑے رہو اور خود موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے اوپر تشریف لے گئے تاکہ اللہ سے ہم کلام ہوں۔ اللہ کی طرف سے ایک بادل آیا جس نے آپ کو ڈھانپ لیا۔ آپ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے۔ پھر بادل اٹھ گیا آپ نیچے آئے اور ان ستر افراد سے فرمایا کہ اللہ نے تمہاری معذرت قبول فرمالی ہے۔ بس آئندہ بچھڑا پرستی جیسی کوئی حرکت نہ کرنا۔ ان افراد نے اس انعام الٰہی پہ شکر بجالانے اور خوش ہونے کے بجائے انتہائی جہالت و بے ہودگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اے موسیٰ جب تک ہم اللہ کو کھلم کھلا دیکھ نہ لیں آپ کی بات پہ کیسے ایمان لاسکتے ہیں کہ واقعی اللہ نے آپ سے کلام کیا اور ہمیں معاف کردیا ہے؟ ان کی اس بیہودگی پہ شدید زلزلہ آیا آسمان سے سخت کڑک کی آواز آئی جس کی دہشت سے یہ ستر افراد مر گئے۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فریاد کی: رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اے میرے رب اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھے پہلے ہلاک کر دیتا، کیا تو ہمارے نادانوں کی وجہ سے ہمیں ہلاک کرے گا؟ (اعراف: ۱۵۵) یعنی اے اللہ بنی اسرائیل کیا کہیں گے کہ موسیٰ نے پہلے قوم میں ستر ہزار افراد قتل کروائے پھر باقی ماندہ میں سے ستر افراد چن کر ساتھ لے گیا اور انہیں کوہ طور پر موت کے منہ میں دے آیا؟ چنانچہ آپ نے بارگاہ

الٰہی میں مسلسل گریہ زاری کی کہ اے اللہ میں اکیلا اپنی قوم میں کیسے واپس جاؤں گا۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول کرتے ہوئے ان ستر افراد کو زندہ کردیا اس لئے یہاں اللہ نے فرمایا: ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝۵۶ (ابن جریر)

اس جگہ اللہ نے بنی اسرائیل کو اپنا یہ احسان یاددلایا ہے اور اشارۃً بتایا جارہا ہے کہ یہ ایسے ہٹ دھرم، کج بحث اور ٹیڑھی عقل کے لوگ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں عظیم معجزات دیکھنے کے باوجود کبھی اللہ کو چھوڑ کر بچھڑا پوجنے لگتے تھے اور کبھی اللہ کو دیکھے بغیر آپ کی بات پہ ایمان لانے سے انکار کردیتے تھے۔ اگر ایسے لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت سے واقف ہونے کے باوجود آپ پر ایمان نہ لائیں تو کوئی جائے تعجب نہیں اس قوم کا طرزِ عمل شروع ہی سے ایسا ہے۔

جب موت کا وقت مقرر ہے تو بنی اسرائیل کی یہ جماعت دوبارہ کیسے زندہ کی گئی

یہاں تقدیر کے حوالے سے ایک سوال اٹھتا ہے۔ کہ موت وحیات کا وقت مقرر ہے پھر بنی اسرائیل کے وہ افراد دوبارہ کیسے زندہ کئے گئے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک موت وحیات کا وقت مقرر ہے مگر اللہ اپنی قدرت سے وقت مقرر میں جو تبدیلی فرمانا چاہے فرما سکتا ہے وہ مجبور نہیں ہے وہ فرماتا ہے: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ۝۳۹ وہ تقدیر میں سے جو چاہے مٹادے اور جو چاہے قائم رکھے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے۔ (رعد: ۳۹) تو اللہ نے بنی اسرائیل کے ان ستر افراد کی بقیہ زندگی ان سے سلب کرلی تھی پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے انہیں ان کی بقیہ زندگی واپس لوٹادی۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ

اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا (اور کہا) کھاؤ جو پاک چیزیں

طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۵۷

ہم نے تمہیں دیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کر رہے تھے۔ [55]

بنی اسرائیل پر چھٹا اور ساتواں انعام، بادل کا سایہ اور من وسلویٰ کا نزول

[55] بنی اسرائیل نے جب بچھڑا پوجا تھا تو وہ اس وقت کہاں تھے مصر میں یا صحرائے سینا کے کسی مقام پر؟ اس کا تسلی بخش جواب کہیں نہیں البتہ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا (اعراف: ۱۳۷) اور وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ۝۵۹ (شعراء: ۵۹) سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ لوگ ہلاکت فرعون کے بعد اس وقت مصر میں تھے۔ الغرض جب بچھڑا پرستی کا یہ معاملہ رفع ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو جہاد کیلئے تیار فرمایا تا کہ ان

کے آبائی وطن فلسطین کو ایک کافر قوم عمالقہ کے قبضہ سے آزاد کروائیں۔ تو یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا سے ہوتے ہوئے فلسطین کی طرف روانہ ہوئے راستہ میں صحرائے تیہ میں انہیں معلوم ہوا کہ قوم عمالقہ طاقت میں ان سے کہیں زیادہ ہے تو انہوں نے جہاد سے انکار کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا آپ خود جائیں اور آپ کا رب جائے تم دونوں وہاں جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سخت صدمہ ہوا آپ نے بحکمِ الٰہی فرمایا کہ اب ارضِ فلسطین تمہیں چالیس برس تک نہ مل سکے گی۔ چنانچہ یہ لوگ چالیس برس تک صحرائے تیہ میں بھٹکتے رہے۔ (سورہ مائدہ ۲۶) نہ انہیں فلسطین کا راستہ ملا نہ واپس مصر جانے کا، اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں اسی مقام پہ آئے گی۔

جب اس دشتِ تیہ میں انہیں دھوپ نے ستایا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بادل کا سایہ بھیجا جدھر یہ جاتے بادل ساتھ رہتا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو یہ لوگ گرمی سے ہلاک ہو جاتے سچی بات تو یہ ہے کہ ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے جن کی برکت سے انہیں یہ سایہ دیا گیا ورنہ یہ قوم تو ہلاکت ہی کے قابل تھی۔ بقول حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اس بادل میں پانی نہ تھا اور اس کا رنگ سفید تھا (درمنثور) یہ بنی اسرائیل پہ ہونے والا چھٹا انعام بیان کیا گیا ہے۔ پھر ان پہ ساتواں انعام یہ کیا گیا کہ دشتِ تیہ میں ان پر من وسلویٰ اتارا گیا۔ سُدی تابعی فرماتے ہیں من ایک میٹھی رطوبت تھی جو رات کو درختوں پر گرتی اور بنی اسرائیل اسے صبح درختوں سے اتار لیتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے (ابن ابی حاتم)۔

تورات کتاب خروج باب ۱۲۷ آیت ۱۴ کے مطابق یہ اوس کی شکل میں آسمان سے برسنے والی ایک رطوبت تھی جو بعد میں سوکھ کر دانے دار بن جاتی تھی جبکہ سلویٰ سے بعض نے بٹیر مراد لیا ہے۔ تورات کتاب خروج باب ۱۶ آیت ۱۳ میں ہے ”اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانپ لیا، روزانہ کثیر بٹیریں خود ان کے پاس اڑ کر آ جاتیں جنہیں پکڑ کر وہ ذبح کرتے اور پکا کر کھاتے۔“

انبیاءِ کرام علیہم السلام مستجاب الدعوات ہوتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے بنی اسرائیل کے ستر افراد کو مرنے کے بعد زندہ کر دیا گیا اور آپ کی دعا سے ان پر بادل نے سایہ کیا اور آپ کی دعا سے ان پر من وسلویٰ اتارا گیا اور جو بندہ بھی عبادات کے ذریعے اللہ کے قریب ہو جاتا ہے اسے استجابت دعا کا مقام ملتا ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ اللہ فرماتا ہے ”بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب آ جاتا ہے حتیٰ کہ میں اس کے کان، آنکھ اور ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں پھر وہ مجھ سے جو مانگے میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں۔“ (بخاری کتاب الرقاق) اس لیے لوگ مقبولانِ خدا سے دعا کرواتے ہیں، زندہ ہوں تو ان سے بالمشافہ مل کر دعا کرواتے ہیں اور اگر فوت شدہ ہوں تو ان کی قبور پہ حاضر ہو کر ان سے دعا کی درخواست کرتے ہیں، یہ بھی وسیلہ کا ایک طریقہ ہے۔

زندگی اور رزق میں کمی بیشی ہوسکتی ہے:

بنی اسرائیل کے ستر افراد کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا۔ دراصل ان کی بقیہ زندگی بطور عذاب ان سے چھین لی گئی تھی پھر حضرت موسیٰ کی دعا سے واپس دے دی گئی۔ ثابت ہوا زندگی گھٹ بڑھ سکتی ہے، حدیث طیبہ میں ہے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سے حضرت داوٗد علیہ السلام کو چالیس برس دیئے تھے اللہ تعالیٰ نے اس ایثار سے حضرت داوٗد علیہ السلام کیلئے بھی چالیس برس بڑھائے اور حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی بھی پوری رہنے دی۔

یہ دنیا مقام تیہ ہے:

اور دنیوی نعمتیں من وسلویٰ کی طرح ہیں۔ بنی اسرائیل کو دشتِ تیہ میں قیدیوں کی طرح من وسلویٰ کھلایا گیا، کیونکہ انہوں نے جہاد سے اعراض کیا تو انہیں دشتِ تیہ میں چالیس سال تک بھٹکا دیا گیا اور وہ وہاں مقید کر دیئے گئے تب وہاں انہیں زندہ رہنے کے لیے من وسلویٰ دیا گیا۔ مومن کیلئے بھی دنیا قید خانہ ہے اور اس میں اللہ ہمیں اپنی نعمتیں کھلا رہا ہے، ہمارا اصل گھر جنت ہے جو دار القرار ہے، ہمیں نعمائے دنیا میں دل نہیں لگانا چاہیے، بلکہ ہم پہ لازم ہے کہ اپنے گھر جانے کی تیاری میں لگے رہیں، اور ایسے اعمال بجالائیں جن سے ہمارے گھر کا راستہ ہم سے چھوٹ نہ جائے، مگر افسوس ہم بھول گئے ہیں، ہم نے دنیا میں دل لگا لیا ہے۔ بنی اسرائیل نے خدائی نعمتوں کی ناقدری کی تو گرفتار بلا ہوئے، اگر ہم بھی خدائی نعمتوں کی ناشکری کریں تو اسی انجام سے دوچار ہوں گے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ دنیا کو قید خانہ تصور کریں اور اس میں دل نہ لگائیں، کیونکہ ہمارے لیے آخرت میں جو نعمتیں تیار کی گئی ہیں ان کے سامنے دنیوی نعمتوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اگر ہم جھوٹ، فراڈ، رشوت اور ملاوٹ وغیرہ سے دنیا حاصل کرلیں اور ہماری آخرت برباد ہوجائے تو اس سے بڑی بدبختی کوئی نہیں۔

حضرت سھل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

موضع سوط فی الجنۃ خیر من الدنیا ومافیھا۔ جنت میں سے ایک لاٹھی رکھنے کی جگہ دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بہت بہتر ہے۔ (بخاری کتاب الرقاق حدیث ٦٤١٥)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور ارشاد فرمایا:

کن فی الدنیا کأنك غریب او عابر سبیل۔ تم دنیا میں ایسے رہو جیسے تم غریب الوطن ہو یا مسافر۔
(بخاری کتاب الرقاق حدیث ٦٤١٦)

اور دنیا سے کبھی کسی کا پیٹ نہیں بھرا، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

لو کان لابن آدم وادیان من لابتغیٰ ثالثا ولا یملأ جوف ابن آدم الا التراب۔ یعنی اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی کا طلب گار ہوگا اور ابن آدم کے پیٹ کو صرف (قبر کی) مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ (بخاری کتاب الرقاق حدیث ٦٤٣٦)

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

اور (یاد کرو) جب ہم نے کہا: اس شہر میں داخل ہو جاؤ اور وہاں سے جو چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور (شہر کے) دروازہ میں

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور ساتھ کہتے جاؤ معافی ہو تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکو کاروں کو زیادہ دیں گے۔[56]

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ

تو ظالموں نے وہ لفظ جو ان سے کہا گیا تھا کسی دوسرے لفظ سے بدل دیا تو ہم نے ظلم کرنے والوں پہ آسمان سے

ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

عذاب اتارا کیونکہ وہ اللہ کا حکم توڑنے والے لوگ تھے۔[57]

ع ۶

بنی اسرائیل پہ آٹھواں انعام خداوندی ”بیت المقدس کی فتح“

[56] جب بنی اسرائیل کی میدان تیہ میں چالیس سالہ قید ختم ہوئی تو اللہ نے انہیں فلسطین کو چلنے کا حکم دیا اور بتایا کہ اب ان کیلئے ان کے آبائی شہر یروشلم (بیت المقدس) میں داخلہ آسان کر دیا گیا ہے وہاں پر قابض کافر قوم عمالقہ وہاں سے چلی گئی ہے، اور پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے قوم عمالقہ کی طاقت کی وجہ سے ان سے جہاد کرنے سے انکار کیا تو اللہ نے بطور سزا انہیں دشت تیہ میں چالیس برس کے لیے محبوس کر دیا، تو اب انہیں بتایا گیا کہ جہاد کی ضرورت نہیں رہی، لہٰذا وہ آسانی سے اپنے شہر میں داخل ہو سکیں گے اور وہاں جو وہ چاہیں انہیں کھانے کو ملے گا۔ یہ نہیں کہ صرف من وسلویٰ پر اکتفا کرنا پڑے بلکہ اب انہیں دوسرے لوگوں کی طرح ہر طرح کا کھانا میسر ہوگا۔ تو اس انعام الٰہی اور آبائی شہر کے بغیر جنگ فتح ہو جانے پر انہیں چاہیے کہ شہر میں داخل ہوتے ہوئے سجدہ کریں اور ساتھ میں دعا کریں کہ اللہ ان کی سابقہ غلطیاں معاف کرے جن کے سبب وہ چالیس برس تک تیہ میں بھٹکا دیئے گئے تھے۔ (یاد رہے! میدان تیہ ہی میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام فوت ہو گئے۔ اور یوشع بن نون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی قیادت سنبھالی اور وہی بنی اسرائیل کو لے کر بیت المقدس داخل ہوئے۔) لہٰذا وہ حِطَّةٌ یعنی بخشش ہو بخشش ہو کہتے ہوئے داخل ہوں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور جو خلوص والے ہیں انہیں بخشش کے علاوہ بلندی درجات بھی دی جائے گی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنی شر پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر حِطَّةٌ کو حِنْطَةٌ سے بدل دیا اور سجدہ کرنے کے بجائے

سرینوں پر گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل سے کہا گیا کہ شہر میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں تو وہ اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور انہیں حطۃ کہنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اسے حنطۃ فی شعرۃ سے بدل دیا'' (یعنی انہوں کہا یا اللہ جو اور گندم چاہیے۔)

(بخاری کتاب التفسیر سورہ بقرہ حدیث ۴۴۷۹، مسلم کتاب التفسیر حدیث ۱)

[57] جب بنی اسرائیل نے بیت المقدس میں داخلہ کے وقت اللہ کا حکم بدلا بلکہ اس سے استہزاء کیا تو ان پر عذاب الٰہی آیا ان میں طاعون پھیل گیا اور بعض روایات کے مطابق ستر ہزار اسرائیلی لقمہ اجل بن گئے۔ تو ان آیات میں یہود کو یاد دلایا گیا کہ پیغمبرں سے مذاق اور حکمِ خداوندی کا بدلنا انکا قدیم طرزِ عمل ہے، اگر وہ آج نبوتِ محمدیہ کی صداقت سے مطلع ہونے کے باوجود انکار کی راہ پر چل رہے ہیں تو یہ جائے تعجب نہیں، ان کی طبیعت ہی یہی ہے۔

اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے دہشت گردی کا نہیں:

کفار جب ممالک کو فتح کرتے ہیں تو وہاں قتل وغارت اور خونریزی ودہشت گردی کا بازار گرم کردیتے ہیں، مگر اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے، اسکی تعلیم یہ ہے کہ جب تم کسی شہر کو فتح کرو تو استغفار کرتے ہوئے عاجزانہ داخل ہو بنی اسرائیل سے کہا گیا شہر میں عاجزانہ داخل ہوں متکبرانہ نہیں مگر چونکہ انہیں چالیس سالہ قید کے بعد بغیر لڑائی فتح مل گئی تھی اس لیے وہ غرور میں آگئے اور حکم خداوندی بدل دیا۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ فتح کے بعد عاجزانہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے جب مکہ فتح کیا تو داخل ہوتے وقت آپ کا سر جھک کر کجاوے کی لکڑی سے لگ رہا تھا اور آپ استغفار پڑھ رہے تھے کیونکہ آپ کو یہی حکم تھا۔

نصوصِ شرعیہ میں تغیر وتحریف حرام ہے:

جب بنی اسرائیل نے حِطَّةٌ کی جگہ حنطۃ کہا تو ان پر عذاب آیا، معلوم ہوا نصِ شرعی میں تبدیلی حرام بلکہ کفر ہے کیونکہ یہ افتراء علی اللہ ہے۔ یہود نے تورات میں الفاظ اور آیات بدلیں۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (نساء: ۴۶) اللہ نے فرمایا ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت ہے۔ اسی لیے قرآن کے الفاظ میں تبدیلی کفر ہے اور اس کے معنی میں ایسا تغیر کرنا جو نصوص قطعیہ کے خلاف ہو کفر والحاد ہے جیسے قادیانیوں نے خاتم النبین کے معنی میں تبدیلی کی۔ اسی لیے قرآن کے تلفظ میں ایسی غلطی کرنا کہ حروف بدل جائیں حرام ہے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ

اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تو ہم نے کہا آپ اپنا عصا پتھر پہ ماریں چنانچہ اس سے

مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا

بارہ چشمے پھوٹ پڑے، ہر گروہ نے اپنا گھاٹ جان لیا (توہم نے کہا) اللہ کے رزق میں سے کھاؤ پیو

مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۶۰

اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔ [58]

بنی اسرائیل پر نوواں انعامِ خداوندی، پتھر سے بارہ چشمے نکالنا

[58] اسی دشت تیہ میں بنی اسرائیل جب پیاس سے جاں بلب ہوئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس کی فریاد کی اور آپ سے دعا کی التجاء کرنے لگے آپ نے ان کیلئے اللہ سے پانی مانگا اللہ نے فرمایا۔ آپ پتھر پر اپنا عصا ماریں آپ نے عصا مارا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ پتھر چکور (Square) تھا اور حضرت موسیٰ کے عصا مارنے سے اس کے چاروں اطراف تین تین سوراخ ہوگئے اوران سے پانی بہنے لگا تو بارہ چشمے ہوگئے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ قبائل میں بانٹا تھا۔ (سورہ اعراف آیت ۱۶۰) تو ہر قبیلے نے اپنا اپنا چشمہ منتخب کرلیا۔ (ابن جریر)

امام ابن کثیر کے مطابق یہ وہی پتھر تھا جس پر ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کپڑے رکھے تو وہ بھاگ اٹھا تا کہ اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جسم کا بے عیب ہونا بنی اسرائیل پر ظاہر کرے۔ یہ واقعہ سورہ احزاب آیت ۶۹ میں مذکور ہے۔ حضرت قتادہ کے بقول یہ طورانی پتھر تھا کوہ طور سے لایا گیا تھا اور ایک روایت کے مطابق یہ جنت سے آدم علیہ السلام کے ساتھ آیا تھا اور وراثتاً انبیاء کے پاس نسل در نسل رہا اور موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام سے ملا۔ (ابن کثیر جلد اول صفحہ ۱۰۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں مفسر کی لکھی ہوئی ایک منقبت:

میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان عظمتوں کو جو قرآن وحدیث نے بار بار بیان کی ہیں، ایک نظم میں جمع کیا ہے، میں اسے یہاں لکھتا ہوں، یقیناً اس میں تازگی ایمان کا سامان ہے، تو میں نے کہا:

عالم میں کیا بلند ہے رتبہ کلیم کا
قرآں میں سب سے بڑھ کے ہے قصہ کلیم کا
میلاد موسیٰ مولا نے قرآں میں ہے لکھا
میرا خدا ہے چاہنے والا کلیم کا
خوں کے پیاسے دشمن کے گھر میں ہیں وہ پلے
قدرت کا اک نشان ہے جلوہ کلیم کا
اعجاز خوب تر ہے عصائے کلیم میں
ہے خوب معجزہ ید بیضا کلیم کا
حق نے نوازا ان کو شرفِ کلام سے
یوں مرتبہ خدا نے بڑھایا کلیم کا
دیتے تھے وہ بشارتِ سرکارِ کائنات
یہ بھی ہے ایک مرتبہ بالا کلیم کا
اک مکے سے ہی قبطی ٹھکانے لگا دیا
کس قدر خوفناک ہے مُکّا کلیم کا
تھپڑ سے اک نکال دی آنکھ عزرائیل کی
ہے موت کو بھگاتا غصہ کلیم کا
ان کے حضور جھک گئے جادوگروں کے سر
اللہ نے ایسا ڈنکا بجایا کلیم کا
ہے فلکِ بحر مظہرِ اعجاز موسوی
خالق نے یہ مقام بنایا کلیم کا
پتھر سے بارہ چشمے بہائے ہیں آپ نے
طیبؔ یہ حق نے رتبہ دکھایا کلیم کا

مقبولانِ خدا سے توسل جائز ہے:

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی طلب کیا حالانکہ وہاں میدان تیہ میں پانی کے کوئی اسباب موجود نہ تھے گویا مافوق الاسباب امور میں غیر خدا سے مدد لینا جائز ہے۔ اللہ فرماتا ہے: اِذِ اسۡتَسۡقٰهُ قَوۡمُهٗۤ (اعراف:۱۶۰) یعنی ''قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگا''، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ مجھ سے مدد مانگ کر کیوں شرک کے مرتکب ہوتے ہو اللہ سے مانگو میں کیا کرسکتا ہوں۔ نہیں بلکہ آپ نے ان کے لئے اللہ سے مانگا تو اللہ نے انہیں آپ کے وسیلہ سے عطا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کے ذریعے لوگوں کو عطاء فرماتا ہے:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی مانگا تو اللہ اگر چاہتا تو بارش نازل فرما دیتا یا زمین سے چشمہ چلا دیتا مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ آپ پتھر پہ عصا ماریں جس سے چشمے جاری ہوں گے تا کہ لوگوں کو باور ہو کہ انہیں آپ کے عصا مارنے کی برکت سے پانی ملا ہے اور حدیث میں ہے: اللہ ابدالوں کے ذریعے اہل دنیا کو بارش عطا فرماتا اور رزق دیتا ہے۔ یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (مشکوٰۃ صفحہ ۵۸۲)

انگشتانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چشمے ابلنا اعجازِ موسوی سے بڑھ کر ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے ذریعہ پتھر سے چشمے ابلے اور پتھروں سے چشمے ابلنا عموماً ہوتا ہے۔ پہاڑیوں سے

چشمے ابلتے ہیں مگر گوشت پوست سے پانی کبھی نہیں نکلتا یہ اعجاز صرف محمد مصطفیٰ سید الانبیاء ﷺ کا ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سفر میں تھے،وضو کیلئے پانی نہ ملا،حضور ﷺ نے پانی کے برتن میں دست مبارک ڈال دیا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے دیکھا پانی آپ کی انگلیوں کے نیچے سے اُبل رہا تھا اور وہ تین سو آدمیوں کے وضو اور پینے کو کفایت کر گیا۔
(بخاری کتاب المغازی باب ۳۵)

ہاتھ میں عصا رکھنا سنتِ انبیاء ہے

معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام ہاتھ میں عصا رکھتے تھے،اور روایات کے مطابق یہ عصا وہ تھا جو آدم علیہ السلام جنت سے لائے تھے اور وہ انبیائے کرام کے پاس متوارث رہا،تا آنکہ شعیب علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملا۔تو گویا انبیائے کرام علیہم السلام اپنے ہاتھ میں عصا رکھتے تھے۔اور نبی اکرم ﷺ کے پاس بھی عصا ہوتا تھا،اس کے بہت فوائد ہیں۔اس سے آدمی بارعب نظر آتا ہے، کتے بلے قریب نہیں آتے ، یہ نماز کے لیے سترہ کا کام دیتا ہے اگر اسے گاڑا نہ جا سکے تو لٹا کر بطور سترہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے خطبۂ جمعہ میں نبی اکرم ﷺ اپنے دست مباک میں عصا رکھتے تھے۔(سنن ابن ماجہ ابواب الجمعہ)

تاہم عصا ہاتھ میں رکھنا سنت غیر موکدہ ہے،اگر کوئی اسے اپنا لے تو باعث اجر ہے نہ اپنائے تو کوئی سوال نہیں ،اور جو سنتیں لباس ، پوشاک ،خور ونوش وغیرہ امور عادیہ سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب سنن غیر مؤکدہ ہیں سنن مؤکدہ کا تعلق عبادات سے ہے،تاہم اہلِ محبت تو آقائے کریم ﷺ کی ہر ادا کو اپناتے ہیں،خواہ اس کا تعلق عادات سے ہو،عبادات سے ہو یا معاملات سے،اور محبت کا یہی تقاضا ہے کہ محبوب کی ہر ادا سے محبت کی جائے۔

کائنات کا سب سے افضل پانی کونسا ہے

اس بارے میں اختلاف ہے کہ کائنات میں سب سے افضل پانی کونسا ہے،بعض کے نزدیک زمزم سب سے افضل پانی ہے،بعض کے نزدیک آب کوثر سب سے افضل پانی ہے۔مگر محققین کے نزدیک وہ پانی جو رسول اللہ ﷺ کی مبارک انگلیوں سے جاری ہوا وہ تمام کائنات کے ہر پانی سے افضل پانی ہے،کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک سے افضل تر کوئی چیز تمام جہان میں نہیں ہے۔

امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمان نے خوب فرمایا:

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے پیاسے جھوم کر ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ

اور جب تم نے موسیٰ سے کہا ہم ایک کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے تو آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کریں کہ وہ

لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ط

ہمارے لئے وہ چیزیں نکالے جو زمین اگاتی ہے جیسے سبزی، کھیرے، گندم، مسور کی دال اور پیاز،

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ط اِهْبِطُوْا مِصْرًا

حضرت موسیٰ نے کہا کیا تم ایسی چیز کو جو ادنیٰ ہے اس کے بدلے لینا چاہتے ہو جو بہتر ہے؟ تم کسی بھی شہر میں اتر جاؤ

فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ط وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ

تو تمہیں وہ چیز ملے گی جو تم نے مانگی ہے [59] اور ان پر ذلت و محتاجی مسلط کی گئی اور وہ اللہ کے

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ

غضب میں پلٹے کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا کفر کرتے تھے [60] اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے

النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھنے والے تھے۔[61]

بنی اسرائیل کا من وسلویٰ کی جگہ دالیں سبزیاں مانگنا

[59] میدانِ تیہ میں جب بنی اسرائیل کو بیٹھے بٹھائے من وسلویٰ جیسی نعمتیں ملنے لگیں تو انہیں بدبختی نے آلیا اور وہ اپنی شرارت پسند طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہنے لگے اے موسیٰ ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے ہم جب مصر میں تھے تو ہمیں گوشت کے علاوہ سبزیاں دالیں اور تھوم پیاز وغیرہ ملتا تھا ہمیں وہی چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم اعلیٰ نعمتیں چھوڑ کر ادنیٰ نعمتوں کے طلب گار بن گئے ہو یہ ناشکری و ناقدری ہے۔ من وسلویٰ صرف تمہی کو میسر ہے جس کا ذائقہ ساری دنیا سے نرالا ہے اور اس میں حرام کی ذرا آمیزش نہیں۔ یہ سبزیاں اور دالیں وغیرہ تو تم کسی بھی شہر میں چلے جاؤ تو تمہیں مل سکتی ہیں۔ اس کے بعد ان پر من وسلویٰ کا نزول ختم ہو گیا اور میدان تیہ میں ان کیلئے زمین سے سبزیاں اور دالیں وغیرہ اُگنے لگیں اور وہ محنت مزدوری کے مصائب میں ڈال دیئے گئے یہ ناشکری

کی سزا تھی۔

دین کی حقیقی روح احترامِ رسول ﷺ ہے:

بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر کو ہمیشہ یا موسیٰ یا موسیٰ کہہ کر پکارا یہاں بھی ہے یٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ، اس میں بے ادبی کا انداز ہے، کوئی با ادب بیٹا اپنے باپ یا اپنی ماں کو اس کے نام سے نہیں پکارتا اور اگر پکارے تو سخت بے ادب ہے اور ہزاروں ماں باپ رسول کی عزت و ناموس پہ قربان۔ رسول کو اس کا نام لے کر پکارنا کس قدر بے ادبی ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کو کبھی آپ کے نام سے نہ پکارا ہمیشہ یا رسول اللہ یا نبی اللہ کہا۔ بنی اسرائیل کی بے ادبی نے انہیں رسوا کیا اور صحابہ کرام کے ادب نے انہیں دنیا پہ غالب کر دیا۔

خدائی نعمتوں کی ناشکری کی برائی:

بنی اسرائیل نے من و سلویٰ چھوڑ کر سبزیاں یا دالیں پسند کر لیں۔ اللہ ان سے ناراض ہوا۔ یہ دنیا کی نعمتیں ادنیٰ و حقیر ہیں جنت کی نعمتیں من و سلویٰ کی طرح اعلیٰ و عظیم ہیں۔ ہم بھی اللہ کی نافرمانی کر کے جنت کی نعمتیں چھوڑ کر دنیا کی حرام کمائی اکٹھی کرنے لگتے ہیں اور نتیجہ میں بنی اسرائیل کی طرح اللہ کی پکڑ میں آتے ہیں۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی اپنی امتوں کے لیے بے پایاں رحمت

اس جگہ یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاں بنو اسرائیل میدان تیہ میں قید تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، بلکہ میدانِ تیہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ ہی رہے، جو تکالیف بنی اسرائیل اٹھا رہے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی انہیں اٹھایا، اگرچہ میدانِ تیہ میں رہنا بنی اسرائیل کے گناہ کی وجہ سے تھا کہ انہوں نے جہاد سے منہ موڑا تھا، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوئی غلطی شامل نہ تھی، مگر پیغمبر اپنی امت کے لیے بمنزل باپ ہوتا ہے، جب اولاد تکلیف میں ہو خواہ اپنے اعمال کی وجہ سے، تو بھی والدین ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے، بلکہ ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں بلکہ والدین ہمیشہ اولاد کی تکلیف کو اپنی تکلیف بنا لیتے ہیں یہی معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بھی امت کی تکلیف کو اپنی تکلیف بنایا، آپ ﷺ امت کی بخشش کے لیے غاروں میں جا جا کر روتے تھے۔ ساری ساری رات کھڑے ہو کر امت کے لیے دعائیں مانگتے تھے حتیٰ کہ آپ کے قدم ہائے مبارک متورم ہو گئے۔ حتیٰ کہ اللہ نے فرمایا:

عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾ یعنی امت کا تکلیف میں پڑنا رسول اللہ ﷺ کے لیے ناقابل برداشت ہے، وہ مومنوں کی بخشش کے لیے حریص ہیں اور شفیق و رحیم ہیں۔

(سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۸)

اسی طرح روز قیامت بھی آپ ﷺ اپنی امت کا غم برداشت نہیں کریں گے، کبھی پل صراط پہ جائیں گے، کبھی میزان عدل پہ پہنچیں گے اور کبھی حوض کوثر پہ تشریف فرما ہوں گے۔

یہود کا قتلِ انبیاء اور ان پر اللہ کا غضب مسلط ہونا

[60] یعنی اللہ کی اس قدر عظیم نعمتوں کے عوض بنی اسرائیل یعنی یہود نے وہ کام کیے کہ اللہ نے ان پر اپنا غضب اور ذلت ومسکنت مسلط کر دی جو ہمیشہ ان پر قائم رہے گی چنانچہ اس قوم نے انبیاء کرام کو ناحق قتل کرنے کا طریقہ اپنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں بکثرت انبیاء بھیجے چونکہ یہ اپنی شرانگیزی وفتنہ پروری کے باعث جلد گمراہ ہو جاتے تھے تو ان میں بار بار کثیر انبیاء بھیجے گئے جن کی بڑی تعداد ان کے ہاتھوں شہید ہوئی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: بنی اسرائیل دن میں تین تین سو انبیاء کو شہید کر کے پچھلے پہر سبزی بیچنے کا بازار لگایا کرتے (ابوداؤد طیالسی، ابن ابی حاتم) خود بائبل میں ان کا انبیاء کو قتل کرنا جابجا مذکور ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو یہودی حاکم یوآس نے سنگسار کیا۔ (تورات کتاب تواریخ باب ۲۴ آیت ۲۱) یہودی حاکم ہیرودیس نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا۔ (انجیل مرقس باب ۶ صفحہ ۱۷) حضرت الیاس علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو پھٹکار ڈالتے ہوئے کہا یہ لوگ انبیاء کو تلوار سے قتل کر دیتے ہیں۔ (سلاطین)

یہودی قوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے دوڑی تو اللہ نے انہیں آسمان پر زندہ اٹھا لیا اور احادیث کے مطابق خیبر کے یہود نے خود حضور ﷺ کو زہر کھلایا اور آپ کو شہید کرنا چاہا حالانکہ وہ آپ کی صداقت سے باخبر تھے۔ اور مدینہ طیبہ کے یہود نے آپ پر بڑا پتھر گرا کر آپ کو شہید کرنا چاہا مگر اللہ نے آپ کو بروقت مطلع کر دیا اور آپ جہاں بیٹھے تھے وہاں سے اٹھ گئے۔ اس جگہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہی انبیاء کرام علیہم السلام کفار کے ہاتھوں شہید ہوئے جن پر جہاد فرض نہ تھا کوئی نبی جو جہاد پر مامور ہو قتل نہیں ہوا ہمیشہ غالب ہی رہا۔ (قرطبی)

ان کرتوتوں کے باعث یہود پر ذلت سوار کی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں یہود ہمیشہ دوسری قوموں کے باجگذار اور تابع فرمان بن کر رہیں گے۔ (ابن جریر) جب بھی دنیا میں اس قوم کی شر بڑھتی ہے تو اللہ ان پہ کسی نہ کسی قوم کو عذاب کی صورت میں مسلط کر دیتا ہے اور کرتا رہے گا، کیونکہ ان پہ ذلت مسلط کر دی گئی ہے۔ سب سے قبل انہیں فرعون نے تباہ کیا۔ پھر ان میں موسیٰ علیہ السلام بھیجے گئے اس کے بعد پھر یہ گمراہ ہوئے تو ان پر بخت نصر مسلط ہوا جس نے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا پھر حضرت زکریا و حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کرنے پر یہ قوم رومیوں کے ہاتھ تباہ و برباد کی گئی۔ پھر رسول اللہ ﷺ مبعوث کیے گئے۔ اگر یہ لوگ ایمان لے آتے تو سعادت دارین سے سرفراز ہوتے مگر انہوں نے آپ ﷺ کو بھی شہید کرنا چاہا تب ان پر عذاب الٰہی آیا اور ان کے بعض قبائل کو قتل اور بعض کو جلاوطن کیا گیا اور عہد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں انہیں جزیرۃ العرب سے دھتکار کر نکال دیا گیا۔

پھر ماضی قریب ہی میں ان پر اللہ نے جرمن قوم پرست لیڈر ہٹلر کو مسلط کر دیا جس نے انہیں اس قدر قتل کیا کہ ان کی کمر توڑ کر رکھ دی اب یہ قوم امریکہ کی پشت پناہی سے اہل فلسطین ولبنان پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہے۔ افغانستان وعراق پر امریکی مظالم کے پیچھے یہودی قوم ہی کی منصوبہ بندی کارفرما ہے اور ساری دنیا ان پر لعنت و پھٹکار ڈال رہی ہے (یہ بھی ایک ذلت ہے جو ان پہ مسلط ہے) مگر یہ ذلیل قوم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آ رہی جس کے بدلے ایک دن ان پر غضب الٰہی ضرور اترے گا۔ وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ ۚ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ کی تلوار ان کے سروں پہ لٹک رہی ہے جو کسی وقت بھی ان پر گرنے والی ہے۔ اگر آج امریکہ ان کی پشت پناہی سے ہاتھ کھینچ لے تو یہ قوم ایک دن میں صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سچ فرمایا کہ یہ قوم دوسروں کی باجگذار بن کر رہے گی کبھی اپنی مرضی سے جی نہ سکیں گے، یہ چیز بھی اسی ذلت کا حصہ ہے جو اللہ کی طرف سے ان پہ مسلط ہے۔

یہودی قوم ایک دن امریکہ ہی کے ہاتھوں تباہ ہوگی:

اور عالمی حالات بتا رہے ہیں کہ عنقریب امریکہ کے ہاتھوں یہود پر عذاب الٰہی آنے والا ہے۔ کیونکہ اپنے ناجائز اور ظالمانہ مفادات کے لیے جس طرح انہوں نے امریکہ کو مشکلات مین پھنسا دیا ہے اور امریکی معیشت دن بدن رو بزوال ہے اسکی وجہ سے امریکی عوام میں یہود کے خلاف غم وغصہ کی لہر پیدا ہو رہی ہے اور وہ یہ سوچنے لگے ہیں کہ یہود سے جان چھڑائے بغیر ان کی پریشانیاں ختم نہیں ہوسکتیں، گزشتہ پانچ چھ برسوں میں اب تک افغانستان اور عراق وغیرہ میں سات ہزار سے زائد امریکی فوجی مارے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے جس نے امریکی لوگوں میں تشویش کی لہر دوڑا رکھی ہے، اور وہ وقت دور نہیں جب یہ تشویش ایک لاوا بن کر پھٹ پڑے گی اور خود امریکہ میں یہود پر زمین تنگ ہوجائے گی، اور ضربت علیھم الذلۃ کی حقانیت دنیا پہ ایک بار پھر واضح ہو جائے گی، یہود کو جرمن قوم نے اسی طرح پناہ دے رکھی تھی جس طرح آج امریکہ نے دے رکھی ہے، مگر یہ احسان فراموش محسن کش قوم اندر ہی اندر امریکہ سے مل کر جرمن قوم کے خلاف سازشوں میں مصروف تھی، اسوقت اس سازشی قوم کا جو حال ہوا امریکہ کے ہاتھوں ان کا حال اس سے بھی بدتر ہوگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی، عیسائی اور ستارہ پرست ہوئے (ان میں سے)

بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا

جو بھی اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائے اور اچھے عمل کرے تو ان کیلئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور ان پر (دنیا میں)

خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

کوئی خوف نہیں اور وہ (آخرت میں) غمزدہ نہ ہوں گے۔[62]

[62] بنی اسرائیل پہ ہونے والے انعامات خداوندی کے ذکر کے دوران اللہ رب العزت نجات اخروی کا قانون بیان فرما رہا ہے جو صرف مسلمانوں کیلئے نہیں تمام اقوام عالم کیلئے ہے اس میں یہود کو دراصل دعوت حق ہے کہ ان پر جو ذلت وغضب مسلط ہے اس سے گلوخلاصی کا یہی طریقہ ہے کہ ایمان لے آؤ۔

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی شخص خواہ مومن ہونے کا دعویدار ہے یا خود کو یہود، عیسائی اور صابی کہلاتا ہے اگر وہ نجات چاہتا ہے تو اسے اللہ اور قیامت پر ایمان لانا اور عمل صالح کرنا چاہیے اور جو ایسا کرے اسے دنیا میں اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں رہتا اور آخرت میں وہ غمزدہ نہ ہوگا یعنی غمزدہ وہ ہوں گے جو ایمان کی جگہ کفر یا عمل صالح کی جگہ بدعملی کے سبب جہنم کو جائیں گے۔ جنت کو جانے والا تو ہر غم سے آزاد ہو جائے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو یا تو صرف زبانی ایمان لائے اور دل سے کافر رہے یعنی منافقین یا وہ جو مومن تو ہیں مگر بدعمل ہیں۔ انہیں پرخلوص ایمان اور عمل صالح کی دعوت دی گئی ہے۔

اور هَادُوْا سے یہود مراد ہیں۔ انہیں یہود اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ هَادَ یَهُوْدُ سے ہے جس کا معنی توبہ کرنا ہے۔ ان لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کے بعد توبہ کی اور خود کو قتل کیلئے پیش کیا اور کئی ہزار قتل بھی ہوئے، چونکہ تاریخ یہود میں صرف ایک یہی وہ اچھا عمل ہے جس پر وہ ناز کر سکتے ہیں انکی باقی تاریخ تو بدعہدیوں اور شرانگیزیوں سے عبارت ہے تو اس توبہ کی طرف منسوب کر کے وہ خود کو یہود کہتے ہیں یعنی توبہ کرنے والے، یا یہود کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا کی اولاد ہیں مگر پہلی وجہ قوی تر ہے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد کو یہود کہتے ہیں، صرف ایک بیٹے ہی کی اولاد کو نہیں کہتے۔

جبکہ نصاریٰ عیسائیوں کو کہا جاتا ہے، یا تو اس لیے کہ یہ نَصَرَ بمعنی مدد کرنا سے نکلا ہے کیونکہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے ان حواریوں سے شروع ہوئے جن سے عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: من انصاری الی اللہ یعنی دین خداوندی کیلئے میرا مددگار کون

ہے تو انہوں نے کہا: نحن انصار الله ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ تو اس سے وہ نصاریٰ کہلائے البتہ بعد میں پھر کسی شخص نے نصاریٰ کے عقائد میں شرک داخل کر دیا، اور یا اس لیے ان کو نصاریٰ کہا جاتا ہے کہ وہ خود کو بستی ناصرہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی۔

اور صابئین کون ہیں تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ ایک فرقہ ہے جو یہود و نصاریٰ کے مابین ایک لادین گروہ ہے۔ (ابن جریر) نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے نہ ان سے نکاح جائز ہے۔

تفسیر ماجدی کے بقول یہ لوگ عراق میں پائے جاتے تھے اور آج بھی ان کی باقیات عراق میں موجود ہیں جنہیں صابیون کہتے ہیں۔ عراقی لوگ انہیں امت یحییٰ علیہ السلام سمجھتے ہیں جبکہ وہ کسی نبی کے متبع نہیں ہیں۔ البتہ عموماً صابئین کا معنی ستارہ پرست کہا جاتا ہے دراصل اس گروہ کا ذکر یہاں بطور مثال ہے ورنہ اس سے ہر وہ غیر اسلامی گروہ ہے جو خود کو کسی نبی یا آسمانی کتاب کا متبع نہ سمجھے جیسے ہندو، سکھ، بدھ مت، یا کوئی اور۔

عقیدہ جڑ ہے اور عمل اس کا پھل:

یہاں پہلے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کہا گیا اس کے بعد وَعَمِلَ صَالِحًا لایا گیا گویا عمل صالح کی قبولیت ایمان کی درستگی پر موقوف ہے، یعنی ایمان جڑ کی طرح ہے اور عمل صالح اس کا پھل، اسی لیے ایمان کے بغیر سارا عمل صالح ضائع ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا: ومن یکفر بالایمان فقد حبط عمله وهو فی الاخرة من الخاسرین۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عمل کے بغیر زبانی ایمان پر بھروسہ شیطانی دھوکہ ہے۔ کیونکہ کے مَنْ اٰمَنَ ساتھ وَعَمِلَ صَالِحًا کہنا اپنے اندر یہ درس رکھتا ہے کہ ایمان والوں کو محض اپنے مومن ہونے پر قناعت نہیں کرنا چاہیے بلکہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی بھی ضرورت ہے۔ ایمان ایک پودا ہے اور عمل صالح پانی، پانی ملے تو یہ پودا ہرا بھرا رہتا ہے اور اس پر نجات کا پھول کھلتا اور آخرت کا میوہ لگتا ہے۔ ورنہ پودا سوکھ کر بیکار ہو جاتا ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

اور جب ہم نے تم سے مضبوط وعدہ لیا اور تمہارے اوپر طور پہاڑ کو بلند کیا (اور کہا) جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑو

وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا

اور جو اس میں (نصیحت) ہے اسے یاد کرو تاکہ تم پرہیز گار بنو۔ پھر اس کے بعد تم پھر گئے

فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۴﴾

چنانچہ اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ۔[63]

بنی اسرائیل پر دسواں انعام خداوندی، تورات پہ سختی سے عمل کروایا جانا

[63] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بچھڑے کو جلا کر سمندر میں بہا دیا تو آپ نے وہ کتاب تورات جو آپ طور پر اللہ سے حاصل کر کے لائے تھے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کر دی۔ انہوں نے کتاب کے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ اس میں بہت سخت احکام تھے مثلاً دو ماہ کے روزے، پچیس فیصد زکوٰۃ، کپڑے کو نجاست لگ جائے تو نجاست آلود حصہ کے کاٹ دینے کا حکم وغیرہ۔ تب اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ طور پہاڑ اٹھا کر ان پر لایا جائے اور ان پر ہوا میں معلق کر دیا جائے اور حکم دیا گیا کہ تورات کو مضبوطی سے پکڑنے یعنی ایمان لانے کا اور تورات میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر عمل کا عہد کرو (یہی ان کا میثاق تھا)۔ اگر تم نے یہ عہد نہ کیا تو پہاڑ تم پر گر جائے گا۔

جدید دور کے بعض آزاد منش مفسرین کے نزدیک پہاڑ کو زمین سے اٹھایا نہ گیا تھا بلکہ ایسا زلزلہ لایا گیا کہ بنی اسرائیل کو یوں لگا جیسے پہاڑ ان پہ گر جائے گا (تفہیم القرآن از مولانا مودودی) مگر یہ غلط تفسیر ہے۔

خود قرآن میں ہے: وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ ''اور جب ہم پہاڑ کو اکھاڑ کر انکے اوپر لے آئے گویا وہ چھتری ہو اور انہیں یقین ہوا کہ وہ ان پر گرنے والا ہے۔'' (سورہ اعراف آیت ۱۷۱)

حضرت سدی تابعی کہتے ہیں بنی اسرائیل یہ دیکھ کر سجدے میں گر گئے اور کتاب پر ایمان لائے مگر انہوں نے آدھی پیشانی پہ سجدہ کیا اور ایک آنکھ سے اوپر دیکھتے رہے کہ کہیں پہاڑ ان پر گر نہ رہا ہو۔ چنانچہ یہودی آج تک آدھی پیشانی ہی پہ سجدہ کرتے ہیں۔ (ابن کثیر جلد اول صفحہ ۱۰۸)

امتِ محمدیہ پہ رحم کرتے ہوئے قرآن یک بارگی نہ اتارا گیا:

خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ سے پتہ چلا کہ بنی اسرائیل کو ساری تورات یکدم دے دی گئی کیونکہ وہ یکبارگی ہی اتری تھی مگر اس کے سخت احکام دیکھ کر وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئے کہ ہم اتنے سخت احکام پر عمل نہیں کر سکتے تب وہ گناہگار ہوئے مگر امتِ محمدیہ پہ کرم کرتے ہوئے قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے ۲۳ برسوں میں اتارا گیا ہے پہلے ایک حکم اترا جب اس پہ لوگوں نے عمل کرلیا تو دوسرا حکم اتارا گیا۔

شراب تین مراحل میں حرام کی گئی۔ یہ اس لیے کیا گیا تاکہ سارا قرآن اکٹھا اتارنے سے کہیں کوئی شخص بنی اسرائیل کی طرح قرآن کے قبول کرنے سے انکار نہ کردے یہ امت محمدیہ پہ خصوصی رحم کیا گیا اللہ کو اپنے حبیب کی امت میں سے کسی کا شریعت سے انکار کرنا پسند نہ تھا۔

یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امت محمدیہ کو متوسط احکام دیئے گئے۔ بنی اسرائیل کیلئے سخت احکام اتارے گئے اور ان کے انکار کا سبب احکام کی سختی بھی تھی، جو حقیقت میں ان کے لیے رحمت تھی اگر وہ اس کو سمجھ جاتے، مگر وہ سمجھ نہ سکے۔ مگر شریعت محمدیہ میں احکام بہت سخت رکھے گئے نہ بہت نرم، بلکہ میانہ ومعتدل احکام جاری کیے گئے۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کہ اسی طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا۔ (بقرہ، ۱۴۳)

اللہ تعالیٰ اس لیے کتاب دیتا ہے تاکہ اس پہ عمل کیا جائے

بنی اسرائیل کو کتاب دی گئی اور فرمایا گیا وَّاذْكُرُوْا مَا فِیْهِ یعنی جو کچھ کتاب میں اسے خوب یاد کرلو، مگر جب انہوں نے اپنی کتاب سے اعراض برتا تو وہ مبتلائے عذاب ہوئے، اسی طرح اللہ نے ہمیں قرآن عطا فرمایا، اور ارشاد ربانی ہوا:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴿۱۵۵﴾ ''یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، یہ برکت والی ہے تو اس کی پیروی کرو تاکہ تم پہ رحم کیا جائے۔'' (سورہ انعام، آیت نمبر ۱۵۵)

مگر افسوس ہم نے بھی قرآن سے منہ موڑ لیا ہے، آج ہر گھر میں قرآن موجود ہے مگر لاکھوں گھر وہ ہیں جن میں قرآن کو کبھی کھولا نہیں گیا۔ قرآن الماری میں پڑا ہے اس پہ گرد جم گئی ہے، اسے تب وہاں سے نکالا جاتا ہے جب کوئی عزیز مرجاتا ہے، تب قرآن کو الماری سے نکالتے ہیں، تھوڑا پڑھ کر اسی جگہ رکھ دیتے ہیں اور کسی دوسرے عزیز کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک قرآن صرف مردوں کے لیے اتارا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن کتاب حیات ہے۔ یہ پوری زندگی کا دستور العمل ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے اسی لیے فرمایا:

درس قرآن گر ہم نے نہ بھلایا ہوتا ۔۔۔ یہ زمانہ نہ زمانے نے دکھایا ہوتا

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِیۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡکُمۡ فِی السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَہُمۡ کُوۡنُوۡا قِرَدَةً
اور تم اُن لوگوں کو جانتے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن حد سے تجاوز کیا تو ہم نے ان سے کہا ذلیل
خٰسِئِیۡنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلۡنٰہَا نَکَالًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہَا وَمَا خَلۡفَہَا وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۶﴾
بندر بن جاؤ۔ پھر ہم نے یہ واقعہ اس وقت اور پچھلے وقت (کے لوگوں) کے لئے عبرت اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت بنا دیا۔[64]

بنی اسرائیل میں سے ایک قوم کا بندر بنایا جانا

[64] بنی اسرائیل کو ان کی ماضی کا ایک واقعہ بتایا جا رہا ہے جس میں ان کی نافرمانی کے سبب ان پر عذاب آیا اور وہ بندر بنا دیئے گئے۔ مقصد یہ ہے کہ اس قوم پر جب بھی انعامات الٰہیہ ہوئے اس نے بدلے میں نافرمانی اور شر انگیزی سے کام لیا ان کے بندر بننے کا واقعہ حضرت قتادہ وسدی کے مطابق بستی ایلات میں ہوا، تورات میں اسے (Elath) کہتے ہیں۔ یہ بستی بحر احمر کی مشرقی شاخ (خلیج عقبہ) کے سرے پر واقع ہے۔

یہ لوگ ساحلِ سمندر پہ رہتے تھے ان کی گزر اوقات مچھلی کے کاروبار سے وابستہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں حضرت داؤد علیہ السلام کو بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ ہفتے کے دن مچھلی پکڑنے کے بجائے کاروبار چھوڑ کر صرف عبادت کیا کریں۔ یعنی باقی چھ دن خوب رزق کمائیں مگر ایک دن اللہ کیلئے چھوڑ دیں کچھ عرصہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر وہ آزمائش میں ڈالے گئے، ہوا یہ کہ ہفتے والے دن کثرت سے سمندر میں مچھلیاں آنے لگیں باقی دنوں میں کم آتیں، یہ آزمائش تھی۔ بنی اسرائیل کیلئے صبر مشکل ہو گیا ان کے تین گروہ ہو گئے ایک گروہ نے حکم خداوندی کو بالائے طاق رکھ کر ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑنے کا کام بلا روک ٹوک شروع کر دیا۔ دوسرے گروہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا اور خود بھی اس سے باز رہے۔ تیسرے گروہ نے خود تو شکار نہ کیا مگر شکار کرنے والوں کو روکا بھی نہیں بلکہ وہ روکنے والوں پہ تنقید بھی کرتے تھے۔ آخر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف وہی گروہ بچا جو خود بھی ہفتے کے دن شکار سے بچے اور شکار کرنے والوں کو روکتے بھی تھے۔ باقی دونوں گروہ مبتلائے عذاب ہو گئے۔ قرآن میں ہے: اَنۡجَیۡنَا الَّذِیۡنَ یَنۡہَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ ''ہم نے ان کو نجات دی جو برائی سے روکتے تھے۔'' (سورہ اعراف، آیت نمبر ۱۶۵)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے سمندر سے نالیاں نکالیں اور ان کے آگے گڑھے بنا دیئے، جمعہ کی شام ان نالیوں کے منہ کھول دیئے جاتے اور ہفتے کا سارا دن مچھلیاں ان نالیوں کے ذریعے گڑھوں میں گرتی رہتیں، ہفتے کی رات نالیاں بند کر دی جاتیں اور اتوار کو گڑھوں سے مچھلیاں نکال لی جاتیں۔ اس حیلے سے وہ کہتے کہ ہم نے تو اتوار کو مچھلیاں پکڑی ہیں حالانکہ ان کے وہ گڑھے جال کی بمنزل تھے جب مچھلیاں جال میں ہفتے کو پھنسی

ہیں تو ہفتے ہی کو شکار کرنا شمار ہوا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ بات انہیں بہت سمجھائی مگر وہ اپنی ضد پہ اڑے رہے حتیٰ کہ ستر برس گزر گئے۔ وہ کہتے تھے اگر ہم پہ عذاب آنا ہوتا تو کب کا آچکا ہوتا۔ شہر میں رہنے والے سارے لوگ ستر ہزار تھے ان میں صرف بارہ ہزار شکار سے منع کرنے والے تھے، جب منع کرنے والوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اپنی روش نہیں چھوڑنے والے تو انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے اور دوسرے لوگوں کے درمیان دیوار کھینچ لی۔ جب وہ عرصہ دراز تک اپنی سرکشی پہ اڑے رہے اور انہیں بھول گیا کہ وہ حرام کمائی کھا رہے ہیں تو ایک روز انہیں اللہ نے یک لخت پکڑا اور وہ رات کو سوتے میں بندر بن گئے۔ مرد بندر بن گئے اور عورتیں بندریاں اور ان کے بچے بندروں کے بچوں جیسے بن گئے جب صبح ہوئی اور دیوار کے پار والے لوگوں کو احساس ہوا کہ کافی دیر ہوگئی ہے دیوار کی دوسری طرف والے لوگ اٹھے نہیں تو وہ دیوار پھلانگ کر اس طرف گئے دروازے بند تھے دروازے کھٹکھٹائے گئے کسی نے دروازہ نہ کھولا، دروازے توڑے گئے تو اندر سے بندر نکلے اور لوگوں کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگے مگر بات نہ کر سکتے تھے تین دن تک وہ بندر رہے پھر سب کے سب مر گئے۔ (بغوی، خازن، ابن کثیر، مظہری وغیرہ)

کیا آج کے بندر بنی اسرائیل کے مسخ شدہ بندروں کی اولاد ہیں؟

بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ دور حاضر کے بندر انہی بندروں کی اولاد ہیں جو بنی اسرائیل میں سے مسخ ہو کر بندر بنے تھے، اور انہوں نے اس کی دلیل یہ دی کہ بخاری میں ہے عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رأیت فی الجاهلية قردة اجمع عليها قردة قد زنت فرجموها فرجمتها معهم، میں نے جاہلیت میں ایک بندر دیکھا جس کے گرد دوسرے بندر جمع تھے اس نے زنا کیا تھا تو انہوں نے اسے رجم کیا تو میں نے بھی ان کے ساتھ اس کو رجم کیا۔

(بخاری کتاب مناقب الانصار حدیث ۳۸۴۹)

امام ابن عربی نے اس سے استدلال کیا کہ موجودہ بندر بنی اسرائیل کے مسخ شدہ بندروں کی نسل سے ہیں، کیونکہ بنی اسرائیل میں رجم کی حد ثابت ہے تو مسخ کے بعد بھی ان میں یہ حد رائج رہی، اور جب دور نبوی میں بنی اسرائیل نے رجم کا اجراء موقوف کیا تو اللہ نے عمرو بن میمون کے ذریعہ انہیں یاد دلایا کہ تم میں سے مسخ شدہ بندروں نے آج تک اس حد کو قائم رکھا ہے تو تم اسے کیسے موقوف کر سکتے ہو؟ (احکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۳۲) مگر دیگر تمام محدثین شارحین اور مفسرین کے نزدیک کسی مسخ شدہ قوم کی نسل نہیں چلائی گئی۔

جہاں تک ابن عربی کے اس استدلال کا تعلق ہے تو بعض مفسرین و شارحین نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ حدیث بخاری کے تمام نسخوں میں نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ بعد میں کسی نے اس کو بخاری میں ملا دیا ہو، مگر امام شہاب الدین قسطلانی ارشاد الساری میں اس نظریہ کا رد کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے بخاری کے جتنے اصل نسخے دیکھے ہیں ان میں یہ حدیث موجود ہے، اور فتح الباری میں اسی لیے فرمایا گیا کہ حافظ ابو ذر نے اس حدیث کو اپنے تینوں ثقہ اساتذہ سے وارد

کیا ہے، لہٰذا صرف نسفی کی روایت سے اس کا ساقط ہو جانا کچھ ضرر نہیں دیتا۔ اور اسماعیلی نے اسے ایک اور طریقہ سے بھی عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: میں یمن میں تھا میں ایک بلند چوٹی پہ اپنی بکریاں چرا رہا تھا میں نے دیکھا کہ ایک بندر آیا اس کے ساتھ بندریا تھی، اسنے بندریا کے بازو پہ سر رکھا اور سو گیا، پھر ایک اور بندر آیا اس نے بندریا کو اشارہ کیا، بندریا نے اپنے ساتھی بندر کے سر کے نیچے سے اپنے بازو کو آہستہ سے نکالا اور دوسرے بندر کے پیچھے چل پڑی، پھر اس بندر نے بندریا سے جنسی عمل کیا، پھر وہ بندری واپس آ کر اپنے ساتھی بندر کے رخسار کے نیچے اپنا ہاتھ ڈالنے لگی (تا کہ وہ یہی سمجھے کہ بندریا اس کے ساتھ ہی رہی ہے) تو وہ جاگ اٹھا، اس نے بندریا کو سونگھا تو معاملہ سمجھ گیا، اس نے چیخنا شروع کر دیا، بہت سے بندر جمع ہو گئے، بندر بار بار بندریا کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر رہا تھا گویا بندروں کو معاملہ بتا رہا تھا، تب بندر اس بندر کو لے آئے، پھر انہوں نے گڑھا کھودا اور دونوں کو اس میں کھڑا کر کے انہیں رجم کر دیا، تو میں نے غیر بنی آدم میں یہ رجم دیکھا تھا، امام بخاری نے اسے اپنی تاریخ میں بھی روایت کیا ہے۔ (ارشاد الساری کتاب مناقب الانصار جلد ۸ صفحہ ۳۱۸ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

تو یہ حدیث صحیح ہے، مگر اس سے یہ استدلال صحیح نہیں کہ موجودہ بندر بنی اسرائیل کے مسخ شدہ بندروں کی نسل سے ہیں، کیونکہ جانوروں اور دواب الارض میں کئی عادات انسانوں سے مشابہت رکھتی ہیں، جیسے چیونٹیاں اپنی ملکہ کی اطاعت کرتی ہیں، قرآن میں ہے کہ چیونٹیوں کی ملکہ نے کہا: يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾ اے چیونٹیو! اپنی اپنی سوراخوں میں داخل ہو جاؤ کہیں تمہیں سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر بے خبری میں روند نہ ڈالے (نمل، ۱۸) اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ چیونٹیاں لائن بنا کر چلتی ہیں، ایسے لگتا ہے کہ وہ کسی کی اطاعت میں چل رہی ہیں، اور روایات میں ہے کہ چیونٹیاں زیر زمین اپنا محل بناتی ہیں اس کی متعدد منزلیں ہوتی ہیں، سب سے اوپر ان کی ملکہ کا کمرہ ہوتا ہے اور اس کے نیچے دوسری منزلوں میں دیگر چیونٹیاں رہتی ہیں، ''حیات الحیوان'' میں علامہ دمیری نے ایسی بہت سی باتیں لکھی ہیں، تو کیا اس سے یہ دلیل پکڑی جائے کہ چونٹیاں بھی انسانوں سے بگڑی ہوئی مخلوق ہے؟ تو بندروں میں محض رجم کا پایا جانا ان کے انسانوں سے بگڑے ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا اور یہاں نص صریح موجود ہے کہ کسی مسخ شدہ قوم کی نسل نہیں چلائی جاتی تھی۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا موجودہ بندر اور خنزیر انہی لوگوں میں سے ہیں جن کے چہرے مسخ کیے گئے تھے؟ آپ نے فرمایا:

ان اللہ عزوجل لم یھلك قوما او یعذب قوما فیجعل لھم نسلا وان القردۃ والخنازیر کانوا قبل ذالك۔ اللہ نے جس بھی قوم کو ہلاک کیا یا عذاب دیا تو ان کی نسل باقی نہیں چھوڑی اور یہ بندر و خنزیر تو پہلے بھی موجود تھے۔ (مسلم کتاب القدر حدیث ۳۳)

مچھلی کا شکار کرنے والوں کے بندر بننے کا واقعہ سورہ اعراف آیت ۱۶۳ تا ۱۶۶ میں بھی آرہا ہے وہاں اس کی مزید تفصیل مذکور ہے۔

حضرت مجاہد (تابعی) کا ایک قول یہ ہے کہ اس قوم کو بندر نہیں بنایا گیا تھا بلکہ ان کے دل بندروں جیسے کر دیئے گئے تھے۔ مگر یہ حضرت مجاہد کی ذاتی رائے ہے قرآن کریم اس کی حمایت نہیں کرتا۔ دیکھئے قرآن میں فرمایا گیا: وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ ؕ ''ہم نے بنی اسرائیل میں سے بندر اور خنزیر بنائے اور شیطان کے پجاری بنائے۔'' (مائدہ، ۶۰) تو شیطان کے پجاری وہی ہوتے ہیں جن کے دل مسخ کر دیئے جائیں۔ اب اگر بنی اسرائیل میں صرف مسخ قلوب ہی ہوا ہے صورتوں کا مسخ نہیں ہوا تو پھر بندر اور خنزیر کو الگ اور عبدالطاغوت کو الگ ذکر کرنے کا کیا معنیٰ ہے؟ پھر اللہ فرماتا ہے: فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا کہ ہم نے اس واقعہ کو اگلے پچھلے لوگوں کے لئے نشانِ عبرت بنا دیا۔ اس سے بھی صاف پتہ چل رہا ہے کہ یہ دلوں کا مسخ نہیں تھا بلکہ صورتوں کا مسخ تھا۔

عبادت کا وقت کاروبار میں لگانا عذابِ الٰہی کو دعوت دینا ہے:

بنی اسرائیل کو ہفتے کا دن عبادت کیلئے مختص کرنے کا حکم دیا گیا مگر انہوں نے یہ دن بھی کاروبار میں لگا دیا تو وہ مبتلائے عذاب ہوئے۔ امت محمدیہ کیلئے اللہ نے کسی دن کو عبادت کیلئے مخصوص کرنے کے بجائے روزانہ پانچ مرتبہ عبادت کیلئے وقت نکالنے کا حکم دیا۔ افسوس ہے کہ ہماری اکثریت بھی عبادت کا وقت اپنی دنیا کمانے میں صرف کر رہی ہے۔ ہم بھی بنی اسرائیل کی طرح مستحق عذاب ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ کے صدقے میں آپ کی امت کو بنی اسرائیل والے عذابات سے محفوظ رکھا ہے۔ ہماری پکڑ آخرت میں ہوگی ہاں توبہ کرنے سے معافی مل سکتی ہے۔ تو ہم پر لازم ہے کہ کام کے وقت کام کریں اور نماز کے وقت نماز پڑھیں۔

ناجائز حیلوں سے شرعی احکام بدل نہیں سکتے:

بنی اسرائیل نے ناجائز حیلہ کر کے حرام کو حلال بنانا چاہا تو مستحق عذاب ہوئے آج ہمارا ایک طبقہ ناچ گانے کو ثقافت کا نام دے کر جائز بنا رہا ہے اور کاروبار کے نام سے سود کھا رہا ہے۔ شراب کو مشروب کہہ کر پی رہا ہے یہ سب شیطانی حیلے ہیں۔ حدیث میں ہے میری امت میں کچھ لوگ شراب پئیں گے اور نام دوسرا رکھیں گے وہ زنا، ریشم اور گانوں کو حلال بنائیں گے اللہ انہیں قربِ قیامت میں بندر و خنزیر بنا دے گا۔ (بخاری کتاب الاشربہ)

رزقِ حرام کی فراوانی امتحان ہے:

بنی اسرائیل کے امتحان کیلئے ہفتہ کے دن سمندر میں کثرت سے مچھلیاں آتی تھیں۔ اِذۡ تَاۡتِيۡهِمۡ حِيۡتَانُهُمۡ يَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا (اعراف آیت ۱۶۳) یہ امتحان تھا کہ آیا وہ صبر کرتے ہیں یا نہیں۔ وہ صبر نہ کر سکے اور عذاب کا شکار ہوئے

آج ہمارا بھی امتحان ہے۔سرکاری افسروں کو حرام مال کثرت سے ملتا ہے کاروباری لوگوں کو ملاوٹ،جعل سازی اور کذب بیانی سے کثیر مال حرام ہاتھ آتا ہے ایسے میں حلال پہ صبر کرنے والے ہی کامیاب ہیں اور دوسرے مستحق عذاب ،بنی اسرائیل کا یہ واقعہ ان کیلئے درس عبرت ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا

اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا بیشک اللہ تمہیں حکم فرماتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو،وہ کہنے لگے:

اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞

کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں اس سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔[65]

جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا

[65] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم اس لیے دیا کہ ان کے ہاں ایک شخص نے اپنے قبیلے کا ایک آدمی قتل کر کے اس کی لاش کو دوسرے قبیلے کے علاقہ میں پھینک دیا۔دونوں قبیلے ایک دوسرے پر اس قتل کا الزام رکھنے لگے اگلے رکوع میں وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۞ (بقرہ آیت ۷۲) میں اس قتل کا ذکر آرہا ہے۔یہ جھگڑا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لایا گیا۔آپ نے فرمایا اللہ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم فرماتا ہے۔بنی اسرائیل نے تعجب سے کہا ہم آپ کے پاس قتل کا جھگڑا لائے ہیں کہ دو قبیلے ایک دوسرے پر ایک شخص کے قتل کا الزام رکھ رہے ہیں اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں کیا آپ ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے بنوں یعنی مذاق کرنے کا طریقہ اپناؤں۔بنی اسرائیل گائے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا پوچھنے لگے کہ اس گائے کی عمر کیا ہو، رنگ کیا ہو وغیرہ آخر ایک گائے ذبح کی گئی اور اس کا ایک جز مقتول کی لاش کو لگایا گیا تو وہ زندہ ہو گیا اور اس نے بتایا کہ اس کا قاتل کون ہے جیسا کے اگلے رکوع میں آرہا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام استہزاء و مذاق جیسی صفات سے پاک ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جواب اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞ سے معلوم ہوا ایسا مذاق جو کسی کی دل آزاری، اس کی تذلیل، جھوٹ اور فحش گوئی پر مشتمل ہو حرام ہے اور انبیاء کی شان اس سے بہت بلند ہے۔کیونکہ یہ جاہلوں کا کام ہے البتہ انبیاء خوش طبعی فرماتے ہیں جو کسی کی دل آزاری و تذلیل پہ مشتمل نہ ہو۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بعض مواقع پر خوش طبعی فرمائی ہے۔اس جگہ ایک ایمان افروز واقعہ ملاحظہ ہو:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: زاہر نامی ایک دیہاتی شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتا اور دیہاتی قسم کی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بطورِ ہدیہ لایا کرتا تھا اور آپ بھی اسے کچھ تحفہ عطا فرماتے، آپ کو اس سے بہت محبت تھی اور وہ آپ سے محبت رکھتا تھا، اس کا رنگ کالا تھا۔ ایک دن وہ بازار میں اپنا سامان (دیہاتی سبزی) بیچ رہا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے پہلے اس نے کہا کون ہے؟ مجھے چھوڑو، پھر جب اس کے دماغ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کی خوشبو پہنچی تو اس نے اپنے آپ کو پیچھے سے پکڑ لیا اور برکت کے لئے اپنا جسم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم سے رگڑنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس غلام کو کون خریدے گا؟ وہ کہنے لگا حضور میں تو کھوٹا ہوں (سیاہ رنگ ہوں) آپ نے فرمایا مگر تم اللہ کے ہاں بہت قیمتی ہو۔ (شمائل ترمذی ص ۱۷) معلوم ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم دل لگی فرماتے تھے جو کمزور لوگوں کے لیے باعث حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ یونہی ایک شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا مجھے سواری چاہیے آپ نے فرمایا میں تجھے اونٹنی کے بچے پر بٹھاؤں گا، وہ کہنے لگا بچے کا میں کیا کروں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ (شمائل ترمذی)

مذاق اڑانے کی برائی:

مذاق اڑانے کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بجا طور پر جاہلوں کا کام قرار دیا۔ حضرت حسن سے مرسلاً مروی ہے کہ مذاق اڑانے والوں میں سے کسی کیلئے روز قیامت جنت کا دروازہ کھولا جائے گا جب وہ قریب آئے گا تو دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ پھر دوسرا دروازہ کھولا جائے گا وہ ادھر لپکے گا قریب جانے پر وہ بھی بند ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ اسی طرح ہوتا رہے گا تا آنکہ دروازہ کھلے گا اور وہ نہیں جائے گا۔ (کنز العمال) یعنی وہ شخص دنیا میں اسی طرح لوگوں کا استہزاء کرتا تھا اللہ نے اسے اس کا مزہ چکھایا۔ عموماً دولت والے غریبوں کا، صحیح اعضاء والے ناقص اعضاء والوں کا اور اچھی شکل والے ادنیٰ شکل والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ انسانیت نہیں۔

اللہ کا حکم پورا کرو خواہ حکمت سمجھ میں نہ آئے:

بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ سن کر کہ اللہ انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم فرماتا ہے تعجب ہوا اور وہ آپ پر اعتراض کرنے لگے کیونکہ انہیں اس حکم کی حکمت سمجھ میں نہ آئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے اس اعتراض پہ اظہار ناراضگی فرمایا۔ معلوم ہوا شریعت کا حکم پورا کرنا چاہیے خواہ اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے کیونکہ ہم نے اپنی عقل کا نہیں اللہ اور اس کے رسول کا کلمہ پڑھا ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ط قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا

کہنے لگے: آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کریں وہ ہمیں بتائے وہ گائے کیسی ہو، آپ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے

فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ط عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ط فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا

وہ گائے نہ بڑی عمر کی ہے نہ چھوٹی عمر کی (بلکہ) اس کے درمیان ہے، تو تمہیں جو حکم دیا گیا ہے وہ کرو۔ کہنے لگے:

ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ط قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ لا

آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کریں وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا اللہ فرماتا ہے وہ زرد رنگ کی گائے ہے

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ لا اِنَّ

اس کا رنگ چمکدار ہے جو دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے۔ کہنے لگے: آپ ہمارے لئے اپنے رب سے دعا کریں وہ ہمیں بتائے

الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ط وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٧٠﴾

وہ گائے کیسی ہو؟ ہم پر گائے مشتبہ ہوگئی ہے اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم (گائے تک) راہ پالیں گے۔[66]

[66] جب بنی اسرائیل کو حکم ہوا کہ گائے ذبح کرو تو ان پر یہ حکم گراں گزرا وہ ٹال مٹول سے کام لینے لگے۔ پہلے انہوں نے پوچھا کس طرح کی گائے ذبح کی جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی اللہ نے فرمایا کہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچی بلکہ درمیانی عمر کی ہو۔ اور یہ کہ تمہیں جو حکم دیا گیا ہے وہ پورا کرو اور بیکار سوالات نہ کرو۔ مگر انہوں نے پھر سوال کر دیا کہ اس گائے کا رنگ کیسا ہو تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا رنگ زرد اور چمکدار ہو جیسا بچھڑے کا رنگ تھا جس کی بنی اسرائیل نے پوجا کی تھی یعنی سنہری رنگ کی ہو۔

دراصل بنی اسرائیل کے ذہنوں سے ابھی بچھڑے کی محبت نہ گئی تھی اور وہ ابھی گاؤ پرستی کے تصورات سے آزاد نہ ہوئے تھے اس لیے ان کے ہاتھوں ویسی ہی گائے ذبح کروائی گئی تا کہ گائے کے خدا ہونے کا جو خیال گاؤ پرست فرعونیوں کی صدہا سالہ صحبت وغلامی کے سبب ان کے دلوں میں بیٹھا تھا اسے نکالا جائے۔ بنی اسرائیل نے تیسرا سوال جڑ دیا کہ وہ گائے کیسی ہو یعنی گھر میں کھڑی ہو یا کھیتوں میں کام کرتی ہو یا اس پر پانی لاد کر گھروں میں لایا جاتا ہو؟ بنی اسرائیل کہنے لگے اے موسیٰ علیہ السلام ہم پر گائے کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہے اور ان شاء اللہ ہم گائے ضرور تلاش کر لیں گے۔

حالانکہ بنی اسرائیل کو ایسے سوالات کی ضرورت نہ تھی جب انہیں حکم ہوا کہ گائے ذبح کرو تو وہ کوئی گائے پکڑ کر ذبح

کر دیتے تو حکم پورا ہو جاتا مگر وہ خود ہی سوالات کرتے گئے۔ دراصل ان کے دلوں میں ابھی گائے پرستی جاگزیں تھیں۔ وہ گائے ذبح نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے ٹال مٹول کر رہے تھے۔

ان شاء اللہ کہنے کی فضیلت

حدیث میں ہے اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی اپنے مقصد کو نہ پا سکتے۔ اگر وہ کوئی گائے ذبح کر دیتے تو کافی تھا مگر انہوں نے سوالات کر کے خود پر سختی کر لی۔ (ابن مردویہ وابن ابی حاتم بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اس سے ان شاء اللہ کہنے کی فضیلت بھی معلوم ہوئی، کہ بنی اسرائیل نے ان شاء اللہ کہا تو ان کو گائے مل گئی، ہمیں بھی چاہیے کہ مستقبل میں کسی کام کا ارادہ کرتے ہوئے ان شاء اللہ کہیں۔

شریعت کے مطلق احکام میں اپنی طرف سے پابندیاں نہیں لگانی چاہئیں

بنی اسرائیل کو حکم ہوا اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ط کہ وہ کوئی گائے ذبح کریں، اگر وہ کوئی سی گائے پکڑ کر ذبح کر دیتے تو ان کی خلاصی ہو جاتی مگر انہوں نے سوالات شروع کر دیے تو اللہ نے بھی ان پہ سختی کر دی، معلوم ہوا کہ دین کو آسان رکھنا چاہیے، اور اللہ نے جن کاموں میں گنجائش رکھی ہے ان کو سخت نہیں بنانا چاہیے، اسی لیے فقہاء نے قاعدہ بنایا ہے **المطلق یجری علی اطلاقہ**، مطلق حکم اپنے اطلاق پہ جاری رہتا ہے۔

اسی لیے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وضو میں توالی شرط نہیں ہے یعنی لگاتار وضو کرنا، بسم اللہ پڑھنا وضو میں صرف سنت ہے، اسے فرض نہ بنایا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وضو کے لیے صرف اعضاء کا دھونا ذکر کیا ہے ،بسم اللہ یا توالی کا ذکر نہیں کیا۔

بلکہ آج ہم نے کئی چیزیں خود لازم بنا لی ہیں شریعت نے ان کو لازم نہیں کیا، جیسے کسی کے مرنے پر اس کے لیے تیجا ساتواں دسواں اور چالیسواں وغیرہ کرنا، یہ چیزیں صرف جائز ہیں، یا مستحب ہیں فرض یا واجب نہیں ہیں، کئی نادار لوگ ان کے لیے قرض اٹھاتے ہیں جو غلط ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ

آپ نے فرمایا: اللہ فرماتا ہے، وہ ایسی گائے ہے کہ اس سے کام کاج نہیں لیا جاتا کہ زمین میں جتے اور نہ وہ کھیت کو پانی دیتی ہے،

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا

بے عیب ہے اس میں کوئی داغ نہیں، کہنے لگے: اب آپ نے ٹھیک بات کہی تو انہوں نے گائے ذبح تو کی مگر وہ ایسا کرتے

كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ۧ

نظر نہ آتے تھے۔[67]

ع ۸

[67] بنی اسرائیل کے تیسرے اور آخری سوال پر کہ گائے کیسی ہو اللہ نے جواب فرمایا کہ وہ کام کاج کیلئے استعمال نہ ہوتی ہو نہ وہ کھیت میں جوتی جائے نہ اس سے پانی کھینچا جائے اور اس کے تمام اعضاء سالم ہوں اس میں کوئی عیب نہ ہو یعنی اندھی لنگڑی کان کٹی دم کٹی وغیرہ نہ ہو بنی اسرائیل نے کہا اے موسیٰ علیہ السلام اب آپ نے پوری بات کہہ دی ہے چنانچہ وہ ایسی گائے ڈھونڈنے نکلے جس میں وہ ساری صفات ہوں جو انہوں نے پوچھی تھیں مگر ایسی گائے کہاں ملے،

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بنی اسرائیل چالیس برس ایسی گائے ڈھونڈتے رہے آخر ایک شخص کے پاس ایسی گائے ملی اس نے بہت بڑی قیمت مانگی اس نے کہا اس کو ذبح کرنے کے بعد اس کی کھال میں جتنا سونا بھرا جاسکتا ہو اتنا سونا ہی اس کی قیمت ہے۔ چنانچہ انہیں یہ قیمت دینا پڑی۔

(تفسیر ابن ابی حاتم جلد اول صفحہ ۱۴۵ حدیث ۷۵۰ مطبوعہ مکتبہ نزار مکہ مکرمہ)

بنی اسرائیل کو ذبح گائے کے حکم کے پیچھے اللہ کو ایک صالح نوجوان کی مدد منظور تھی:

اس گائے کو ذبح کر کے اس کے ایک جزء سے مقتول کی لاش کو مس کرنے اور یوں مقتول کو زندہ کر کے اس سے قاتل کا نام پوچھنے کا انداز کیوں اپنایا گیا اس کے پس پردہ ایک واقعہ ہے۔

حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں بنی اسرائیل میں ایک نوجوان اپنی والدہ کا بے حد فرمانبردار تھا۔ رات بھر عبادت کرتا اور دن کو لکڑیاں بیچ کر رزق حلال کماتا۔ ایک دن اس کی والدہ نے کہا تمہارے باپ نے فوت ہونے سے قبل گائے کی ایک بچی (بچھیا) چھوڑی تھی میں نے اس پر نشان لگایا اور حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے خدا کا نام لے کر اسے جنگل میں چھوڑ دیا۔ میں تجھے اس کا رنگ اور اس کی دوسری نشانیاں بتاتی ہوں تم جنگل میں جا کر ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے رب کا نام لے کر آواز دو گے تو وہ تمہارے پاس دوڑتی ہوئی آجائے گی۔ وہ نہ بوڑھی ہے نہ بچی بلکہ درمیانی عمر کی ہے، اس کا رنگ زرد اور چمکدار ہے جو دیکھنے والوں کو خوش کرتا ہے۔

اس سے کبھی کوئی خدمت نہیں لی گئی اور وہ ہر جسمانی عیب سے پاک ہے۔ یہ ساری صفات وہی ہیں جو بنی اسرائیل کے سوالات پہ اللہ نے بیان فرمائی تھیں۔

وہ نوجوان جنگل میں گیا اور حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے رب کا نام لے کر پکارا تو وہ گائے دوڑی چلی آئی وہ اسے لے کر گھر آیا۔ ماں نے اسے بازار لے جا کر بیچنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ اس کی قیمت تین دینار ہے مگر میری اجازت کے بغیر نہ بیچنا، وہ بازار گیا اللہ نے ایک فرشتہ بصورت انسانی بھیجا وہ نوجوان سے کہنے لگا یہ گائے کتنے میں بیچو گے؟ اس نے کہا تین دینار پر مگر پہلے ماں سے اجازت لوں گا۔ فرشتے نے کہا یہ چھ دینار لے لو اور والدہ سے نہ پوچھو۔ اس نے کہا نہیں میں ضرور پوچھوں گا اس نے جا کر والدہ سے پوچھا کہ چھ دینار میں بیچ دوں؟ ماں نے کہا بیچ دو۔ تب فرشتے نے اسے کہا کہ میں تمہیں بارہ دینار دیتا ہوں مگر والدہ کو نہ بتاؤ۔ نوجوان نے کہا ہرگز نہیں وہ والدہ کے پاس آیا اور ساری بات سنائی والدہ نے کہا وہ انسان نہیں فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پوچھو ہم یہ گائے بیچیں یا نہیں یا کتنے پر بیچیں؟ فرشتے نے کہا اے نوجوان اس گائے کو سنبھال لو۔ بنی اسرائیل کو ایک گائے خریدنے کی ضرورت پڑے گی اور جیسی گائے وہ خریدنا چاہیں گے وہ صفات صرف اسی گائے میں ہیں۔ (قرطبی، ابن جریر، مظہر، خازن، درمنثور وغیرہ الک)

گویا اللہ تعالیٰ اس صالح نوجوان کو جو ایک صالح باپ کا بیٹا تھا، اپنی والدہ کی خدمت کا حصہ دینا چاہتا تھا۔ اس لیے یہ سارا واقعہ پیش آیا۔ اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے ذہنوں سے گاؤ پرستی کے تصورات کا ازالہ بھی مقصد تھا۔

اگر سوال کیا جائے کہ ایک آدمی کو نوازنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمام بنی اسرائیل کو اتنے بڑے امتحان میں کیوں ڈالا، ایک پہ احسان اور دوسروں کا نقصان، یہ کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے ایک کام میں بیک وقت کئی حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، اس واقعہ میں جہاں اس صالح نوجوان کو نوازنا مقصود تھا وہاں بنی اسرائیل کو ان کے گستاخانہ لہجے، حجت بازی اور احکام الٰہی سے پہلو تہی کرنے کی سزا دینا بھی مقصد تھا۔

گائے کی قربانی اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے:

بنی اسرائیل کے لیے جانور ذبح کر کے اس کے ذریعے مقتول کو زندہ کرنا مقصود تھا مگر اس کے لیے گائے کا انتخاب کیا گیا۔ اس کے بعض مقاصد گزشتہ سطور میں مذکور ہوئے ہیں۔ جن میں سب سے اہم تر بنی اسرائیل کی گائے پرستی کا رد تھا۔ آج بھی اگر گائے پرستوں کے رد کیلئے گائے کی قربانی کی جائے تو زیادہ ثواب ہے۔ ہندو گائے کو خدا مانتے ہیں۔ مسلمان اسے ذبح کر کے بتاتے ہیں کہ ہم ان کے خدا کو کھا جاتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ قربانی کا جانور ہر عیب سے پاک ہونا چاہیے۔ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا میں یہ اشارہ ہے کہ ایسا جانور اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہیے جس میں عیب نہ ہو۔ اسی لیے شریعت میں بھی اندھے، اپاہج، سینگ کٹے، کان کٹے جانور کی قربانی جائز نہیں۔ تفصیلی احکام کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

حضرت انبیاء کرام علیہم السلام خالق ومخلوق کے مابین وسیلہ ہیں:

بنی اسرائیل بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گائے کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ آپ ان کا سوال اللہ تعالیٰ تک پہنچاتے تھے۔ اللہ جو جواب دیتا وہ آپ قوم کو بتاتے اس سے انبیاء کا خالق ومخلوق کے مابین رابطہ و وسیلہ ہونا معلوم ہوا۔ انبیاء کرام نبی اللہ مخلوق کی فریادیں اللہ تک پہنچاتے اور خدا کی عنایت بندوں پر لٹاتے ہیں۔ اولیاء اللہ بھی جب انبیاء کی اطاعت میں خود کو فنا کر کے ان کے رنگ میں ڈھل جاتے ہیں تو وہ بھی بندوں تک فیض الٰہی کے پہنچنے کا واسطہ بن جاتے ہیں، اگر ان سے دعا کی درخواست کی جائے اور وہ دعا کریں تو اللہ کی رحمت جلد جوش میں آجاتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے: وسنزید المحسنین۔

ہر اچھے کام کے ارادہ پر ان شاء اللہ کہنا چاہیے:

بنی اسرائیل نے وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ کہا، حدیث میں ہے کہ اگر وہ یہ نہ کہتے تو انہیں کبھی اپنا مقصد نہ ملتا۔ قرآن میں ہے: وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝۲۳ تم ہرگز یہ نہ کہو کہ میں کل یہ کام کروں گا مگر یہ کہ ان شاء اللہ ضرور کہو۔ (سورہ کہف آیت ۲۳)

بزرگوں سے بحث مباحثہ سوءِ ادب ہے:

بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نیا سے نیا سوال کرنا خود انہی کے لیے مصیبت کا باعث بنا۔ اس میں یہ درس ہے کہ بزرگوں سے تکرار کرنا خلاف ادب ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں نے ایسے ہی سوالات کیے تو اللہ نے فرمایا: اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ ''کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح (بے مقصد) سوالات کرو جیسے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے قبل سوالات ہوئے۔'' (سورہ بقرہ:۱۰۸)

سنن ابن ماجہ میں دوسری حدیث یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ذرونی ما ترکتم فانما هلك من كان قبلكم بسوالهم واختلافهم على انبيائهم فاذا امرتكم بشيئ فخذوا منه مااستطعتم واذا نهيتكم عن شيئ فانتهوا ۔ ''جو بات میں تمہارے لئے کھلی چھوڑ دوں اس بارہ میں مجھ سے سوال نہ کیا کرو، تم سے پہلے لوگ اسی لیے ہلاک ہوئے کہ وہ انبیاء پہ زیادہ سوالات کرتے تھے (جیسے بنی اسرائیل نے گائے کے بارہ میں سوالات کیے) جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو اسے بجالاؤ جس قدر تم میں طاقت ہے اور جس بات سے روکوں اس سے رک جاؤ'' (سنن ابن ماجہ کتاب السنہ حدیث ۲)

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾
اور جب تم نے ایک جان مار ڈالی پھر تم ایک دوسرے کو الزام دینے لگے اور جو تم چھپاتے تھے اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا۔
فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ
تو ہم نے کہا: اس مقتول کو اس گائے کا کچھ حصہ مارو اس طرح اللہ مردے زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾
تاکہ تم عقل کرو۔[68]

بنی اسرائیل پر گیارھواں انعام خداوندی، ایک مقتول کا زندہ کیا جانا

[68] گزشتہ رکوع میں بتایا گیا کہ بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ اب اس کا پس منظر بتایا جا رہا ہے۔ حضرت عبیدہ سلیمان (تابعی) فرماتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے ہاں ایک شخص کی اولاد نہ تھی۔ وہ بہت مالدار تھا اس کا ایک بھتیجا اس کا تنہا وارث تھا۔ اس نے اپنے چچا کو قتل کیا اور لاش اٹھا کر دوسرے قبیلہ والوں کے دروازے پر ڈال دی اور صبح خود ہی اس کے خون کا مطالبہ لے کر ان سے جھگڑنے لگا۔ دونوں طرف سے تلواریں نکل آئیں۔

تب یہ جھگڑا موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ چنانچہ گائے ذبح کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس کے گوشت کا کوئی حصہ مقتول کو مارو حضرت عکرمہ تابعی کے بقول گائے کی ران اسے ماری گئی تو وہ زندہ ہو گیا اور بتایا کہ یہی شخص جو میرے خون کا بدلہ لینا چاہتا ہے میرا قاتل ہے یہ کہہ کر وہ پھر مر گیا۔

تب قاتل نے اعتراف جرم کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے قرار واقعی سزا دی اور اسے مقتول کی میراث سے محروم کر دیا۔ تب سے یہ قانون چلا آ رہا ہے کہ قاتل مقتول کی میراث سے محروم رہتا ہے۔ (بیہقی، ابن جریر)

وَاِذْ قَتَلْتُمْ اور كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کے الفاظ میں یہ معنی مخفی ہے کہ قاتل کے قبیلہ والوں نے یہ جان کر بھی کہ قاتل وہی ہے اس کا ساتھ دیا اور دوسرے قبیلہ والوں پر الزام رکھا۔ اس لیے اللہ نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے کہا: وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ ''کہ جان بوجھ کر حق کا چھپانا اور باطل پر اصرار کرنا تمہارا پرانا طریقہ ہے''، (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۴۲) یعنی اگر آج تم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے باخبر ہو کر اس کی تکذیب کرتے ہو تو یہ تمہاری پرانی روش ہے۔ تم نے اس قتل کے واقعہ میں حق چھپایا مگر اللہ سے ظاہر کرنے والا تھا۔ یونہی تم نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت چھپا رہے ہو اور اللہ اسے ظاہر کر کے چھوڑے گا۔

کَذٰلِكَ یُحۡیِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰی ' کا یہ مفہوم ہے کہ جیسے گائے کا ٹکڑا مقتول کو لگانے سے ہم نے مقتول کو زندہ کیا، یہ نشانی ہے کہ اللہ جب چاہے گا مردے زندہ کر کے قیامت قائم فرما دے گا۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے بنی اسرائیل کے ستر افراد مرنے کے بعد زندہ کر دیئے تھے۔ اللہ فرماتا ہے: ثُمَّ بَعَثۡنٰکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِکُمۡ ہم نے تمہیں تمہاری موت کے بعد زندہ کر دیا۔ (بقرہ:۵۶)

لالچ بُری بلا ہے:

بنی اسرائیل کے اس قاتل شخص نے لالچ میں یہ گناہ کیے ناحق قتل، دھوکہ دہی، پیغمبر خدا کے سامنے کذب بیانی اور بے قصور لوگوں پر بہتان بازی۔ پھر بھی اسے کامیابی نہ ملی، بلکہ وہ جس میراث پر قبل از وقت قبضہ کرنا چاہتا تھا اس سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ لالچ کی برائی کے حوالے سے عبرت ناک حکایت ملاحظہ ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی جگہ سے گزرے آپ نے وہاں سونے کی ایک ڈلی دیکھی اور قریب ہی تین آدمی مرے پڑے دیکھے۔ آپ حیران ہوئے اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! یہ تین مسافر تھے ان کو راستہ میں یہ ڈلی ملی۔ ان میں سے دو نے اپنے تیسرے ساتھی سے کہا بازار سے کھانا لاؤ۔ وہ کھانا لینے گیا تو انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ جب وہ کھانا لے کر آئے تو اسے قتل کر کے یہ سونے کی ڈلی ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔ ادھر اس نے کھانے میں زہر ملا دیا تاکہ دونوں کھانا کھا کر مر جائیں اور ڈلی اس کو مل جائے، جب وہ کھانا لے کر آیا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور بعد میں کھانا کھانے سے دونوں مر گئے اور ڈلی وہیں پڑی رہی۔ یہی دنیا کے لالچی انسانوں کا حال ہے۔ وہ دنیا کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے مر جاتے ہیں اور دنیا وہیں پڑی رہتی ہے۔

ظلم ضرور ظاہر ہو جاتا ہے خواہ ستر کمروں میں چھپ کر کیا جائے

بنی اسرائیل کے ایک شخص نے قتل کیا اور دوسرے لوگوں پہ اس کا دعویٰ کر دیا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا قتل ظاہر کر دیا اس میں یہ درس ہے کہ ظلم چھپتا نہیں، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر تم میں سے کوئی شخص مضبوط پہاڑ میں چھپ کر گناہ کرے جس میں کوئی دروازہ نہ ہو تو اسکا عمل لوگوں تک ضرور پہنچے گا جب بھی پہنچے۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۸ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ

پھر تمہارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی طرح ہیں یا ان سے بھی سخت تر،

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ

اور بعض پتھر وہ ہیں جن سے نہریں بہہ پڑتی ہیں اور بعض وہ ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے

فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ

اور بعض وہ ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے

بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

بے خبر نہیں۔[69]

یہود کی سنگدلی، تحریف کتاب اور اخفاء حق

[69] یعنی اے یہود تم پر اللہ نے اس قدر انعامات فرمائے تا کہ تم اس کی اطاعت کرو مگر تمہارے دل پتھروں سے بھی سخت ہو گئے ہیں کیونکہ تم نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ ﷺ کی صداقت سے خوب واقف ہو کر بھی ان پر ایمان لانے کی بجائے ان کے خلاف سازشیں کرنے اور مسلمانوں کو ہر نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ حالانکہ پتھروں میں بھی اللہ کا خوف ہوتا ہے۔ بعض پتھروں سے نہریں یعنی چشمے ابل پڑتے ہیں۔ بعض پتھروں میں سوراخ ہو جاتے اور ان سے پانی نکلنے لگتا ہے یعنی چشمہ تو نہیں ابلتا مگر کچھ پانی نکلنے لگتا ہے اور بعض پتھر اللہ کے خوف سے صرف گر پڑتے ہیں البتہ ان سے پانی نہیں نکلتا۔ مگر اے یہود تمہارے دلوں میں کچھ بھی خوف خدا نہیں تم انبیاء کی صداقت سے واقف ہونے کے باوجود انہیں قتل کرتے رہے ہو تم سے بڑا سنگدل کون ہو سکتا ہے۔

پتھروں میں بھی شعور ہے:

پتھروں کا خوف خدا سے گر جانا کسی شعور کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہ شعور اس قدر نہیں کہ انہیں مکلف کیا جائے کیونکہ پتھروں میں حرکت و ارادہ نہیں اور ان کے اسی شعور کی بنیاد پر وہ اللہ کی تسبیح کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ ''کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کہتی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔'' (بنی اسرائیل آیت نمبر ۴۴) اگر سائنس کے کان پتھروں کی تسبیح نہ سنیں تو یہ

سائنس کا قصور ہے۔آج سائنس کے کمال سے ٹیپ ریکارڈ کا فیتہ بول رہا ہے۔لکڑی و پلاسٹک کا بنا ہوا ریڈیو ٹی وی باتیں کرتا اور سارے جہان کی خبریں دیتا ہے تو پتھر اللہ کے حکم سے تسبیح کیوں نہیں کر سکتے۔

یہود سے خیر کی توقع نہیں:

قرآن کے بقول ان کے دل پتھروں سے سخت ہیں لہٰذا ان سے کسی بھی ظلم کی توقع ہے۔آج جس طرح وہ اہل فلسطین ولبنان پر ظلم ڈھا رہے ہیں۔ان سے یہی توقع ہے اور ان کی یہی سنگدلی وخونریزی اور شر انگیزی انہیں بار بار عذاب الٰہی کا شکار کرتی ہے۔جلد یا بدیر وہ پھر عذابِ الٰہی کی زد میں آنے والے ہیں۔

خشیتِ الٰہی کی فضیلت:

جب پتھروں میں خوفِ خدا ہے اور ان سے پانی بہہ پڑتا ہے تو انسان کا دل تو گوشت کا لوتھڑا ہے اسے جلدی نرم ہونا اور خوف خدا سے کانپنا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا پانی بہنا چاہیے۔حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والا شخص جہنم میں نہیں جا سکتا تا آنکہ دودھ تھن میں واپس جائے۔(ترمذی کتاب الجہاد) یاد رہے پتھروں کا خوف خدا یہ ہے کہ اللہ انہیں کہیں جہنم میں نہ ڈال دے اور وہ جہنم میں عذاب لینے کے لیے نہیں عذاب دینے کے لیے جائیں گے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ''جہنم کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔'' (بقرہ آیت ۲۴) اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ''تم اور جن پتھروں کو تم پوجتے ہو وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔'' (سورہ انبیاء آیت ۹۸)

پتھروں کے شعور اور ان میں پائی جانے والی محبت خدا اور رسول ﷺ کا حال یہ ہے کہ جس پتھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم اتر گئے (کیونکہ وہ آپ کی محبت میں موم ہو گیا تھا) اللہ تعالیٰ نے اس پتھر کے پاس نماز پڑھنے کا حکم دیا اللہ فرماتا ہے: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى مقام ابراہیم کے پاس جائے نماز پکڑو۔ (بقرہ:۱۲۵) حضور ﷺ اُحد پہاڑ پر کھڑے ہوئے تو وہ آپ کی محبت میں وجد میں آ گیا حتیٰ کہ آپ نے اُسے ٹھوکر لگا کر فرمایا اے اُحد! ٹھہر جا! تجھ پر اللہ کا نبی ﷺ، ایک صدیق (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) اور دو شہید (عمر و عثمان رضی اللہ عنہما) کھڑے ہیں۔ (بخاری، مسلم) معلوم ہوا پتھروں میں بھی شعور ہے۔

دلوں اور پتھروں کی چار اقسام:

یہاں پتھروں کی چار اقسام بتائی گئیں۔جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں، جن سے پانی نکل آتا ہے۔، جو خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں اور جن میں کچھ تبدیلی نہیں آتی۔دلوں کی بھی یہی چار اقسام ہیں۔انبیاء کرام علیہم السلام کے دلوں سے ہدایت کے چشمے ابلتے اور معرفت کی نہریں بہتی ہیں۔علماء و اولیاء کے قلوب سے ہدایت کا پانی نکلتا اور خلق خدا کو سیراب کرتا

ہے۔عام مومنین کے قلوب خود خوف خدا میں گرتے ہیں البتہ دوسروں کو نفع نہیں دیتے اور کفار کے دلوں میں کچھ بھی تبدیلی نہیں آتی۔ان میں ہدایت کا مادہ ہی نہیں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ

(اے مسلمانو!) کیا تم امید رکھتے ہو کہ (یہود) تمہاری بات مانیں گے جبکہ ان میں سے بعض لوگ اللہ کا کلام سنتے ہیں

ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ۝۷۵

پھر اسے سمجھ لینے کے بعد بدل دیتے ہیں اور وہ جانتے ہیں (کہ اس کا عذاب کیا ہے)[70]

[70] نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہود کے ایمان کی شدید تمنا رکھتے تھے تاکہ ان کی اگلی نسلیں بھی ایمان والی آئیں اور اسلام کو قوت ملے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی سنگدلی کا یہ عالم ہے کہ ان میں سے ایک گروہ یعنی ان کے علماء اللہ کا کلام سن اور سمجھ کر اس کے بعد اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں۔

جیسے پیچھے وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۴۲ (بقرہ، ۴۲) کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ یہودی علماء نے اپنی کتاب میں نبی آخر الزمان ﷺ کی صفات کو دجال کی صفات سے بدل دیا۔

حضرت مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور سدی رضی اللہ عنہم کہتے ہیں یہود نبی اکرم ﷺ کی تعریف والی آیات کو تورات سے نکال دیتے تھے۔(درمنثور، ابن جریر) عیسائیوں کا معاملہ بھی انہی جیسا ہے۔آج Church of England کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بائبل کے جس حصہ کو چاہے اس سے نکال سکتا ہے اور وہ بائبل کے ہر نئے ایڈیشن میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ

اور جب وہ ایمان والوں سے ملیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب وہ ایک دوسرے کے پاس تنہائی میں ہوں

قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

تو کہتے ہیں کیا تم (مسلمانوں کو) وہ کچھ بتاتے ہو جو اللہ نے تم پر (تورات میں) کھولا ہے تاکہ وہ تمہارے رب کے ہاں تم پر اس سے دلیل

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝۷۶ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ۝۷۷

پکڑیں کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ خوب جانتا ہے جو وہ چھپاتے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں؟۔[71]

[71] یہود میں سے کچھ لوگ منافقت سے ایمان لائے تھے۔وہ مسلمانوں میں شامل ہو کر ان کے راز لینا چاہتے تھے۔وہ بسا اوقات مسلمانوں کا اعتماد لینے کے لیے کہہ دیتے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی بشارات تو تورات میں مذکور ہیں۔

جب یہ منافقین اپنی یہودی قوم کے سرداروں کے پاس جاتے تو وہ ان سے کہتے کہ اے نامرادو! تمہیں مسلمانوں کی صفوں میں اس لیے بھیجا گیا ہے تا کہ تم ان کے راز حاصل کرو، اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ اپنے راز ان پر کھولو، تم انہیں دلیلیں مہیا کر رہے ہو تا کہ روز قیامت وہ اللہ کے ہاں تمہارے ہی منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سے تم پر حجت پکڑیں۔ کیا تمہارے پاس عقل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تم جو کچھ زبان سے کہتے اور جو دلوں میں چھپاتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ ضروری نہیں کہ روز قیامت مسلمان اللہ کو بتائیں کہ یہود نے ہمیں یہ باتیں بتائی تھیں تب اللہ کو پتہ چلے اللہ کو پہلے ہی سب معلوم ہے۔ گویا یہود کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اللہ کو حقیقت سے بے خبر رکھا جائے کیسے احمق تھے وہ یہود بے بہود۔

درسِ نصیحت وعبرت

اس میں ہر انسان اور ہر مسلمان کے لیے درس عبرت ونصیحت ہے کہ اللہ ہمارے ہر خفیہ وعلانیہ عمل کو جانتا ہے، ہم لوگوں سے چھپ کر گناہ کرتے، افسوس! ہمیں لوگوں سے شرم آتی ہے مگر اللہ سے شرم نہیں آتی، امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمہ اللہ بڑی دلسوزی کے ساتھ ہمیں جھنجھوڑتے ہوئے فرماتے ہیں۔

چھپ کے لوگوں سے کیے جس کے گناہ وہ خبر دار ہے کیا ہونا ہے

اللہ سے حیا رکھنے والے صالح نوجوان کی حکایت

یہ انسان کی نادانی وجہالت ہے کہ وہ لوگوں سے حیا کرتا ہے اور اللہ سے حیا نہیں کرتا، ایک نوجوان کو کوئی عورت بہکانا اور گناہ میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ نوجوان نے اس سے جان چھڑانے کی کوشش کی وہ باز نہ آئی۔ ایک دن وہ نوجوان اسے کہنے لگا چلو میرے پیچھے آؤ، وہ خوش ہوگئی کہ چلو آج اس نے میری بات مان لی ہے۔ وہ نوجوان اسے بازار میں لے آیا اور اسے کہنے لگا اچھا اب بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ کہنے لگی جو کچھ میں چاہتی ہوں اسے یہاں پورا نہیں کیا جا سکتا، کہنے لگا کیوں، عورت نے کہا یہاں لوگ دیکھ رہے ہیں لوگوں سے شرم کرنی چاہیے۔

نوجوان نے کہا: پھر تم کو اللہ سے شرم کیوں نہیں آتی، کیا وہ ہر جگہ نہیں دیکھ رہا؟ نوجوان کی اس بات نے عورت پہ ایسا اثر کیا کہ اس نے اِس غلط ارادہ سے توبہ کر لی۔ نیک زندگی اپنالی۔ اے کاش! ہمیں بھی اس نوجوان والی حیا مل جائے اور ہم بھی ہر خفیہ وعلانیہ کام میں اللہ رب العزت کا خوف اور اس سے شرم کو دل میں بٹھالیں۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝۷۸

اور ان میں سے کچھ اَن پڑھ ہیں جو کتاب کا علم نہیں رکھتے سوا چند تمناؤں کے اور وہ صرف وہم وگمان رکھتے ہیں۔[72]

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۙ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ

تو ہلاکت ہے ان کے لئے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے

عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ

تاکہ اس کے ساتھ تھوڑی سے پونجی کما لیں تو ان کیلئے ہلاکت ہے اس تحریر کے سبب جو ان کے ہاتھوں نے لکھی

وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝۷۹

اور ان کیلئے ہلاکت ہے ان کی (حرام) کمائی کے سبب۔[73]

[72] مجاہد کہتے ہیں: یہود میں کچھ لوگ محض اَن پڑھ تھے جنہیں اپنی کتاب تورات کا کچھ علم نہ تھا۔ وہ صرف چند وہم وگمان کے پیچھے چل رہے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن جریر) دراصل یہود کے علماء نے انہیں چند امیدوں پہ لگا رکھا تھا کہ تم انبیاء کی اولاد ہو تمہاری بخشش پکی ہے اگر تم جہنم گئے بھی تو صرف چالیس دن کے لئے جاؤ گے، پھر تمہارے لئے ابدی جنت ہے۔

[73] گزشتہ آیت میں یہود کے جاہل لوگوں کا حال بیان کیا گیا۔ اب ان کے علماء کی حالت بتائی جارہی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں تورات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف وکمالات اور خدوخال بیان کیے گئے تھے۔ جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کے اوصاف اور خدوخال تورات میں بدل دیئے۔ انہیں ڈر تھا کہ یہودی عوام آپ کے اوصاف اور حلیہ دیکھ کر آپ کو پہچان لیں گے اور ایمان لے آئیں گے اور انہیں جو مال ان سے ملتا ہے وہ جاتا رہے گا۔ (بیہقی فی الدلائل)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ تورات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیہ یوں لکھا تھا: ''سرمگیں وکشادہ چشم، میانہ قد، گھنگھریالے بالوں والا، حسین چہرے والا'' اور آپ کا حلیہ مبارک واقعتاً ایسا ہی تھا۔ یہودی علماء نے اسے بدل کر یوں لکھ دیا: ''لمبے قد والا، نیلی آنکھوں والا، سیدھے بالوں والا'' اس طرح لوگ دھوکے میں پڑ گئے۔

(ابن ابی حاتم جلد اول ص ۱۵۴ حدیث ۸۰۵ مطبوعہ مکتبہ الباز مکہ مکرمہ)

تو یہودی علماء کی اس خباثت پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دنیا کا حقیر مال حاصل کرنے کیلئے وہ اپنے ہاتھوں سے تحریر

لکھ کر اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کے لیے ہلاکت ہے اور ان کی اس حرام کمائی پر ہلاکت ہے۔
یہود ونصاریٰ آج بھی تورات وانجیل میں مسلسل تبدیلیاں کررہے ہیں۔

امتِ مسلمہ کے لیے تعلیمِ قرآن کی اہمیت:

یہود کے عوام اپنی کتاب سے جاہل و بے خبر تھے تو ان کے علماء کو اپنی کتاب میں تبدیلی کا موقع مل گیا۔ اگر یہودی عوام کی اپنی کتاب تک رسائی ہوتی تو ان کے علماء کو کتاب میں تحریف کا موقع نہ ملتا یا ایسا کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ کا قرآن مجید سے وابستہ ہونا کس قدر ضروری ہے، یہ امت کی قرآن سے وابستگی کا نتیجہ ہے کہ آج تک کسی کو قرآن میں کسی تبدیلی کی جرأت نہیں ہوسکی، ضروری ہے کہ یہ وابستگی برقرار رہے۔

قرآن مجید محفوظ ترین کتاب ہے:

ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ اور يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۙ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے مقابلہ میں قرآن کی یہ عظمت ہے کہ اس کی زیر وزبر کو بدلا نہیں جاسکا اور جس نے ایسی کوشش کی وہ خود زیر وزبر ہوگیا۔ اور قرآن کی پیش کے آگے کسی کی پیش نہیں چلی، کیونکہ وعدہ الٰہی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾ ''بے شک ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' (سورہ حجر، آیت نمبر ۹)

جبکہ پہلی کتابوں کی حفاظت لوگوں کے ذمہ کی گئی تھی، ارشاد ہوا: بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ، ''ان سے کتاب اللہ کی حفاظت کا مطالبہ کیا گیا۔'' (سورہ مائدہ، آیت نمبر ۴۴)

قرآن میں تحریف ماننے والوں کا رد

اس سے ان لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہیے جو سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم میں سے بہت سا حصہ نکالدیا گیا، قرآن میں بارہ اماموں کے نام لکھے ہوئے تھے، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد قرآن کو مرتب ویکجا کیا تو ان تمام آیات اور سورتوں کو نکال دیا جن میں بارہ اماموں کی امامت کا ذکر تھا، وہ کہتے ہیں کہ سورہ بینہ سورہ بقرہ کے برابر بڑی تھی، مگر آج وہ صرف ایک صفحہ کی سورت رہ گئی ہے، ان کے بقول اصلی قرآن میں اٹھارہ ہزار آیات تھیں مگر آج صرف چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ہیں۔ لیکن یہ سب ملحدانہ وکافرانہ خیالات ہیں، قرآن میں سے کچھ نہیں نکالا گیا، اگر قرآن میں بھی تحریف کردی گئی ہے تو پھر اس میں اور پہلی کتابوں میں کیا فرق رہا، پھر قرآن کو کتاب ہدایت کیسے مانا جائے، جب اس میں سے ہدایت چوری ہوگئی ہے تو پھر اس کا کتاب ھدایت ہونا کیسے باقی رہا؟

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

اور وہ کہتے ہیں ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن، آپ فرمائیں کیا تم نے اللہ کے ہاں کوئی عہد لے رکھا ہے کہ اللہ اپنے عہد کی

عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

مخالفت نہیں کرے گا ؟یا تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو جس کی تمہیں تحقیق نہیں ؟۔ [74]

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

کیوں نہیں ،جس نے بھی برائی کا پیشہ اپنایا پھر اس کے گناہ نے اسے گھیر لیا تو وہی لوگ دوزخی ہیں

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے اعمال کرتے رہے وہی

الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

جنت والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔[75]

ع ۹ ۱۱ ۹

[74] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے یہود کہتے تھے ہم نے چالیس دن بچھڑے کی پوجا کی تھی۔لہٰذا ہمیں صرف اتنے دن ہی جہنم میں رکھا جائے گا۔(ابن جریر) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیبر کے یہود سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا۔ بتاؤ اہل جہنم کون ہیں؟ کہنے لگے ہم کچھ عرصہ وہاں رہیں گے۔ پھر ہماری جگہ تم لوگ لے لو گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تمہارا برا ہو تمہاری جگہ کوئی نہ لے گا تم ہی رہو گے۔(بخاری، داری، نسائی)

[75] اللہ نے یہود کے باطل خیالات کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ جنت وجہنم کا کسی خاص قوم سے تعلق نہیں بلکہ جو شخص بھی برائی کمائے یعنی کفر کرے اور اس کے گناہ اسے گھیر لیں وہ دوزخی ہے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہے گا اور جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کرے وہ اہل جنت میں سے ہے وہ جنت میں ہمیشہ رہے گا۔لہٰذا یہود کا کہنا کہ ہم صرف چالیس دن کے لیے جہنم میں جائیں گے غلط ہے اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو ان کے لیے دائمی جہنم ہے۔

دخولِ جنت کے حوالہ سے ایک اعتراض کا جواب

اگر کہا جائے کہ مسلمان بھی جنت کو صرف اپنے آپ سے مختص کہتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا یہ معنٰی نہیں ہے کہ مومن جہنم میں جا ہی نہیں سکتا۔اور اگر جائے تو وہ صرف اتنے دن وہاں رہے گا اس سے زیادہ رہ نہیں سکتا، جیسا کہ

یہود نے کہا، بلکہ اللہ جب تک چاہے کسی مومن کو اس کے گناہوں کے سبب جہنم میں رکھے گا، البتہ اس کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان کی وجہ سے بالآخر اس کی بخشش کردے گا، اور یہی انصاف کا تقاضا ہے، اگر مومن کی بخشش بھی کبھی نہ ہوسکے تو پھر مومن اور کافر میں کیا فرق رہا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۡ وَبِالْوَالِدَيْنِ

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے مضبوط عہد لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے [76] اور والدین اور رشتہ داروں

اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا

اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ احسان کرو گے اور لوگوں سے اچھی بات کہو [78] اور نماز قائم کرو

الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور زکوٰۃ دو پھر تم (اس عہد سے) پھر گئے سوا تم میں سے چند ایک کے، اور تم پھر ہی جانے والے لوگ ہو۔ [79]

بنی اسرائیل پر بارہواں انعامِ خداوندی، ضابطۂ اخلاق کی عطاء

[76] اس سے مراد وہی عہد ہے جو بنی اسرائیل کو کتاب تورات کے دیئے جانے کی صورت میں ان سے لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے عمل کریں۔ جیسے پیچھے کہا گیا۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ بنی اسرائیل پر اللہ کا عظیم احسان تھا کہ انہیں کتابِ تورات کی صورت میں ضابطۂ اخلاق دیا گیا جس میں عبادات معاملات اور انسانی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مگر انہوں نے اپنی کتاب کا جو حشر کیا وہ گزشتہ رکوع میں بتادیا گیا ہے، چنانچہ تورات میں سب سے اول ان سے عہد لیا گیا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں گے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ اللہ کی عبادت سے مراد تمام حقوق اللہ کی بجا آوری اور اس کے تمام احکام کی اطاعت ہے۔ اگرچہ یہاں یہی بتایا جارہا ہے کہ یہ عہد بنی اسرائیل سے لیا گیا مگر اسمیں ہم امت مسلمہ کو بھی بتانا مقصود ہے کہ ہمیں بھی اس عہد کا لحاظ رکھنا ہوگا، جب قرآن یا حدیث میں بتایا جائے کہ پہلی امتوں پہ یہ حکم نافذ کیا گیا اور ساتھ میں ہمارے لیے اس کی تردید نہ ہو تو وہ ہم پہ بھی نافذ ہوجاتا ہے۔

[77] عبادت خداوندی کے بعد بنی اسرائیل سے حقوق العباد کی ادائیگی کا عہد لیا گیا چنانچہ کہا گیا کہ والدین سے احسان کرو۔

والدین سے حسن سلوک کا مفہوم

اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا جائے۔ان کے سامنے عاجزی وتواضع سے بات کی جائے۔ان کے شریعت کے مطابق ہر حکم کی بجا آوری کی جائے اور ان کے وصال کے بعد ان کے لیے ایصال ثواب اور دعائے مغفرت جاری رکھی جائے۔

چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا، پوچھا گیا اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: والدین سے حسن سلوک، پوچھا گیا پھر کونسا عمل ہے؟ فرمایا: راہِ خدا میں جہاد۔
(بخاری ومسلم عن ابی ہریرہ)

رشتہ داروں سے حسن سلوک کا مفہوم

پھر کہا گیا کہ رشتہ داروں سے احسان کرو۔اس کا یہ معنی ہے کہ ان سے محبت رکھی جائے، اگر وہ محتاج ہوں تو ان کی مدد کی جائے اور کبھی اس پر احسان نہ جتلایا جائے، اگر وہ غلطی کریں تو حتی الوسع درگزر کی جائے اور ان سے قطع تعلق نہ کیا جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''جو شخص اپنے رزق اور عمر میں وسعت کروانا چاہتا ہے وہ رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرے۔'' (بخاری ومسلم عن انس رضی اللہ عنہ) نبی پاک ﷺ کا ارشاد ہے ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق پیدا کی تو رحم (رشتہ داری) نے رحمان کا دامن تھام لیا اور عرض کیا اے اللہ! میں اپنی حق تلفی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو تجھے کاٹے گا میں اسے (اپنی رحمت سے) کاٹ دوں گا جو تجھے ملائے گا، میں اسے ملاؤں گا۔'' (بخاری ومسلم عن ابی ہریرہ) ایک آدمی نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میرے کچھ رشتہ دار ہیں میں ان سے جوڑتا ہوں وہ مجھ سے توڑتے ہیں، میں ان سے اچھا سلوک کرتا ہوں، وہ برائی سے پیش آتے ہیں، میں ان سے عفو ودرگزر کا معاملہ کرتا ہوں وہ مجھے دباتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم ایسا ہی کرتے ہو جیسا کہہ رہے ہو تو تم اپنا فرض پورا کر رہے ہو، اور جب تک تم ایسا کرتے ہو اللہ کی طرف سے ایک مددگار تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ (مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

یتیموں اور مسکینوں سے حسنِ سلوک کا مفہوم

پھر کہا گیا: یتیموں اور مسکینوں سے احسان کرو۔یتیم وہ ہے جس کا باپ بچپن میں فوت ہو جائے۔مسکین وہ حاجت مند ہے جس کے پاس صبح کا کھانا ہے تو شام کا نہ ہو۔شام کا ہو تو صبح کا نہ ہو۔

یتیم سے حسن سلوک یہ ہے کہ اس کی کفالت کی جائے۔اسے بہتر تربیت دی جائے۔اس کا مال ضائع ہونے سے بچایا جائے اور مساکین کی مطلقاً حاجات برلانا ان سے حسن سلوک ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا ہم دونوں جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھے ہوں گے۔'' (بخاری عن سہل بن سعد رضی اللہ عنہ) آپ ﷺ کا فرمان

ہے۔ ”سب سے بہتر گھروہ ہے جس میں کسی یتیم سے حسنِ سلوک ہو اور سب سے بُرا گھر وہ جس میں یتیم سے بدسلوکی ہو۔“ (ابن ماجہ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیواؤں اور یتیموں سے بھلائی کرنے والا راہِ خدا میں جہاد کرنے والا ہے اور اس کا درجہ رات بھر عبادت اور ہمیشہ روزہ دار رہنے والے کی طرح ہے۔ (بخاری و مسلم عن ابی ہریرہ)

[78] تورات میں بنی اسرائیل سے یہ عہد بھی لیا گیا کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ یعنی والدین رشتہ داروں اور یتامیٰ و مساکین کے خصوصی حقوق کے بعد عوام المسلمین کا عمومی حق بیان کیا گیا کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ یعنی ان سے خیر خواہی کرو، نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو۔ کسی پر ظلم نہ کرو نہ دھوکہ دو، یہ سب قولوا للناس حسنا میں داخل ہے۔ حدیث میں ہے مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر خود ظلم کرتا ہے نہ دوسروں کو کرنے دیتا ہے اور جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہو اللہ اس کی مدد میں ہوتا ہے۔ جس نے کسی مسلمان سے دنیا میں کوئی تکلیف دور کی اللہ اس کی آخرت کی تکالیف میں سے کوئی تکلیف دور کر دے گا اور جس نے مسلمان کی پردہ پوشی کی اللہ آخرت میں اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ (بخاری و مسلم عن ابن عمر رضی اللہ عنہما) آپ کا فرمان ہے جو چھوٹوں پر رحم، بڑوں کی عزت، نیکی کا حکم اور برائی سے منع نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ (ترمذی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

سب سے اول حقوق اللہ پھر حقوق العباد:

یہاں سب سے اول لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ کہا گیا پھر حقوق العباد بیان ہوئے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کا حق بندوں کے حق سے اہم تر ہے، کیونکہ جس رب نے ہمیں پیدا کیا، ہمیں ایمان دیا، ہمیں رزق دیا اور آخرت میں ہماری بخشش فرمائے گا کیا اس سے بڑھ کر ہم پر کسی کا احسان ہوسکتا ہے؟ آج بعض لوگ بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کو ترک نماز و ترک حج و ترک روزہ کے لیے بہانہ بناتے ہیں، یہ شیطانی وسوسہ ہے، یہ بندوں کو خدا سے افضل کہنے کے معنی میں ہے۔ مومن پہ لازم ہے کہ پہلے اپنے رب کی عبادت کے حقوق جو اس نے ہم پہ لازم فرمائے ہیں بجالائے۔

والدین کا حق تمام حقوق العباد سے بڑا ہے:

یہاں حقوق العباد میں سے سب سے پہلے والدین کا حق بتایا گیا پھر ساری مخلوق کا بلکہ اللہ نے اپنی عبادت کے بعد والدین ہی کا حق بیان کیا، کیونکہ فرمایا: لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا دوسری جگہ ارشاد ہوا: اَنِ اشۡكُرۡ لِلّٰهِ ؕ وَمَنۡ يَّشۡكُرۡ فَاِنَّمَا يَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ ۚ ”میرا شکر کرو اور اپنے والدین کا۔“ (سورہ لقمان، آیت نمبر ۱۲) ایک اور جگہ فرمایا گیا: وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ ”اور تمہارے رب نے فیصلہ کیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین سے احسان کرو۔“ (بنی اسرائیل، آیت نمبر ۲۳) دراصل اللہ انسان کا حقیقی خالق و رازق ہے اور والدین مجازی خالق و رازق ہیں، اس لیے اللہ اپنی عبادت کے بعد ان سے حسن سلوک کا حکم فرماتا

ہے۔ یاد رہے! شادی کے بعد عورت پر اس کے شوہر کا حق والدین سے بڑھ جاتا ہے، شادی سے قبل اس کا الٹ ہے۔

غریب رشتہ داروں کا حق دیگر یتامیٰ ومساکین سے زیادہ ہے:

وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ میں رشتہ داروں کو یتامیٰ و مساکین سے مقدم رکھا گیا، گویا اگر رشتہ دار حاجت مند ہوں تو سب سے قبل ان کی مدد کرنی چاہیے پھر دوسرے حاجت مندوں کی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے سارا مال صدقہ کرنا چاہا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر تم اپنے رشتہ داروں کو مال دار چھوڑو (اس طرح کہ تمہاری میراث ان میں تقسیم ہو، یا تم خود ان کی مدد کرو) یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ تمہارے بعد لوگوں سے مانگتے پھریں۔

(بخاری عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ)

[79] ابتداء میں عبادتِ الٰہی کا حکم ہوا پھر حقوق العباد کی تفصیل لائی گئی۔ آخر میں پھر اقامت صلوٰۃ واداء زکوٰۃ کا حکم دے کر بات کو عبادتِ الٰہی پر ختم کیا گیا اور ساتھ کہا گیا کہ اے بنی اسرائیل تم میں سے اکثر اس عہد سے پھر گئے ہیں کہ اللہ کی توحید کی جگہ تم نے شرک کی راہ اپنالی۔ پہلے بچھڑے کو پوجا پھر حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دیا۔ پھر قتل انبیاء کا طریقہ اپنایا آخر میں جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کر کے اقامت صلوٰۃ وادا زکوٰۃ کا راستہ مسدود کر دیا۔ البتہ تم میں سے کچھ لوگ آپ پر ایمان لا کر اپنے عہد کے پاسدار نکلے جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے کچھ ساتھی۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ

اور جب ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا کہ اپنے لوگوں کے خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے لوگوں کو اپنے علاقوں سے

مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

نہیں نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم اس کی گواہی دیتے ہو۔ [80] پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے لوگوں کو

اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ

قتل کرتے ہو اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے علاقوں سے نکالتے ہو، ان پر گناہ و سرکشی کے ساتھ

بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ

حملہ کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آئیں تو ان کا فدیہ دیتے ہو حالانکہ تم پر انہیں (ان کے شہروں سے)

عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج

نکالنا ہی حرام ہے تو کیا تم کتاب کے بعض حصہ پر ایمان لاتے اور بعض سے انکار کرتے ہو؟

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ

تو جو شخص تم میں سے یہ عمل کرے اس کی سزا ذلت کے سوا کیا ہے دنیوی زندگی میں، اور روز قیامت

الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

وہ لوگ شدید عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔ [81]

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیوی زندگی خرید لی تو ان سے عذاب ہلکا

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔ [82]

ع ۱۰

بنی اسرائیل پہ تیرہواں انعام خداوندی، قومی سلامتی کا میثاق

[80] عبادت الٰہی اور حقوق العباد کی ادائیگی کے علاوہ تورات میں بنی اسرائیل سے قومی سلامتی کا عہد بھی لیا گیا اور کہا گیا کہ تم بنی اسرائیل آپس میں ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے ہی لوگوں پر حملہ کر کے انہیں ان کے گھروں سے بے گھر نہیں کرو گے۔ تم سے یہ اقرار لیا گیا اور اے دور نبی ﷺ کے یہود! تم اس کے گواہ ہو کہ تمہارے آباء واجداد سے یہ عہد و میثاق لیا گیا۔ یعنی ان سے عہد لیا گیا کہ اے یہود اگر تم آپس میں لڑنے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگو گے تو دوسری قومیں تم پر غالب آ جائیں گی۔ اور جب تم میں کتابیں اور ہزاروں رسول اتار کر تمہیں دوسری قوموں کی رہنمائی کا فریضہ سونپا گیا ہے تو تمہارا اپنا کردار ساری قوموں سے اعلیٰ ہونا چاہیے۔ اس میں امت مسلمہ کے لیے بھی باہمی اتحاد و یکجہتی کا پیغام ہے، یعنی اگرچہ یہاں بنی اسرائیل سے لیا جانے والا میثاق بیان کیا جا رہا ہے مگر بالواسطہ امت مسلمہ کو ان چیزوں کی اہمیت سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔

[81] مگر اے یہود تم نے اس عہد کی پاسداری کرنے کی بجائے ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور اپنے ہی لوگوں پر حملہ آور ہو کر انہیں ان کے علاقوں سے نکالنے کا طریقہ اپنالیا۔ تم اپنے ایمانی بھائیوں کے خلاف کفار ومشرکین کی مدد کرنے لگے۔ پھر جب تمہارے اپنے مومن بھائی تمہاری ہی کوششوں کی وجہ سے کفار ومشرکین کے قیدی بن جاتے ہیں تو تم دنیا کو اپنی ایمانداری دکھانے کے لیے انہیں فدیہ دے کر چھڑانے آ جاتے ہو۔ یہ نیکی کس کام کی، پہلے خود ان کو قیدی بنوایا پھر انہیں چھڑانے کا کیا ثواب ہے۔

تم اپنی کتاب کا یہ حصہ مانتے ہو کہ اگر تمہارا ایمانی بھائی کفار کی قید میں چلا جائے تو اسے فدیہ دے کر آزاد کراؤ، مگر یہ حصہ نہیں مانتے کہ آپس میں تمہارا کشت وخون کرنا اور اپنے ایمانی بھائیوں کو ان کے علاقوں سے نکالنا حرام ہے۔ تمہارے ان کرتوتوں کی سزا دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں سخت عذاب۔ چنانچہ یہود پہ ذلت پڑی اور آخرت کا عذاب الگ ہے۔

یہود کے داغدار ماضی کا ایک منظر

حضرت سدی تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان آیات کا پس منظر یہ بیان کیا ہے کہ اوس وخزرج مدینہ میں مشرکین کے دو قبیلے تھے۔ ان کے مابین جنگ رہتی تھی۔ یہود مدینہ میں سے بنو قریظہ اوس کے ساتھی تھے اور بنو نضیر خزرج کے ساتھی، بنو قریظہ اوس کے ساتھ مل کر بنو نضیر سے لڑتے اور وہ خزرج کے ساتھ مل کر بنو قریظہ سے معرکہ آراء ہوتے اور ایک دوسرے پر حملہ آور ہو کر انہیں ان کے علاقوں سے نکال دیتے، جب جنگ ختم ہو جاتی تو بنو نضیر کے جو قیدی اوس کے مشرکین کی قید میں چلے جاتے انہیں بنو قریظہ فدیہ دے کر چھڑواتے اور بنو قریظہ کے جو لوگ خزرج کے ہاں قیدی بن جاتے۔ انہیں بنو نضیر

چھڑانے آجاتے۔ اس عمل پر اللہ نے انہیں اس آیت میں شرم دلائی۔ (ابن کثیر جلد اول صفحہ ۱۲۵)

یہود کی بدکرداری اور مسلمانوں کو لاحق بیماری

یہود کی بدکرداریاں قرآن میں اس لیے بیان کی گئی ہیں تاکہ امت مسلمہ کو بتایا جائے کہ جو قوم اس طرح کی بد عملیوں کا شکار ہو جائے وہ اللہ کی رحمت سے دور اور مردود و مقہور ہو جاتی ہے، اگر مسلمان قوم چاہتے ہے کہ وہ دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہے تو اسے ان یہودی خصلتوں سے دور رہنا چاہیے۔

مگر افسوس صد افسوس آج مسلمانوں میں وہی یہود والی اکثر صفات عام ہیں، وہی منافقت، وہی دورخی، وہی طریقہ کہ کتاب کے اس حصہ پہ عمل کرنا جو اپنے مفاد کے مطابق ہو، اور جو حصہ مفاد کے خلاف ہو اسے ترک کر دینا۔ ہمارے مذہبی اور سیاسی لیڈروں کا رویہ دیکھ لو، جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس جگہ اسلام کا نام لینے سے ان کے مذہبی و سیاسی قد کاٹھ میں اضافہ ہو جائے گا، وہاں وہ کمر کس کر میدان میں اتر آتے ہیں، اور جہاں ان کا یہ مقصد حاصل نہ ہو وہاں وہ خواب خرگوش کے مزے لے کر سوتے ہیں خواہ مسلمانوں اور اسلام پہ کوئی بھی قیامت گزر رہی ہو انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔

یعنی جس طرح یہود اپنے مذہب اور اپنے دین سے مخلص نہیں تھے ہم بھی مخلص نہیں ہیں۔۔ وہ بھی اپنے آپ سے مخلص تھے ہم بھی اپنے آپ سے مخلص ہیں۔ اس لیے ہماری حالت وہ ہے جو کبھی ان کی ہوتی تھی، اور ان کو ہم پہ اس لیے عارضی غلبہ دیدیا گیا ہے تاکہ ہم اپنے گناہوں کی سزا بھگتیں۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے اجتماعی گناہوں کی اجتماعی معافی مانگیں، اور اپنے دین اور اپنی قوم و ملت کے لیے مخلص ہو جائیں۔

[82] یعنی جو لوگ ایسا کردار رکھیں جو یہود نے اپنایا کہ اپنے ایمانی بھائیوں کا گلا کاٹیں، ان پر حملہ آور ہونے والی غیر مسلم طاقتوں کا ساتھ دیں اور یوں انہیں ان کے علاقوں سے نکالیں ایسے لوگوں نے آخرت برباد کر کے اپنی دنیا آراستہ کر لی۔ لہٰذا ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا کیونکہ ایمان والوں کے مقابلہ میں کفار کی مدد کرنا کفر ہے اور کافر سے کبھی عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا۔ اور نہ ہی روزِ قیامت ایسے لوگوں کی بصورت شفاعت کوئی مدد کی جائے گی۔ اور عذاب میں تخفیف اور مدد کا ملنا روز قیامت اہل ایمان کے لیے ہے، کفار کے لیے نہیں۔

دورِ حاضر کے نام نہاد مسلم حکمرانوں کی منافقت اور یہودیت سے مشابہت

افسوس! آج دور حاضر کے مسلمان حکمران اسی یہودی خصلت کے حامل نظر آتے ہیں۔ آج یہود و نصارٰی جا بجا مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں اور مسلم حکمران اپنی کرسیاں بچانے کے لیے یہود و نصارٰی کے ساتھی بنے ہوئے ہیں اس جگہ ایسے ہی مسلم کش ملت فروشوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ حقیر دنیوی مفادات کے لیے اپنی آخرت کا سودا نہ کریں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کا اپنے مسلمان بھائی کا خون کرنا خود اپنا گلا کاٹنا ہے۔ کیونکہ لَا تَسْفِكُوْنَ

دِمَآءَكُمْ اور تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ سے ثابت ہوا کہ اپنے مسلمان بھائی کا قتل خود اپنا قتل ہے کیونکہ حدیث ہے۔ مومن مومن کے لیے ایسے ہے جیسے دیوار کہ اس کا ہر حصہ دوسرے حصوں کی مضبوطی کا باعث ہے۔ (بخاری و مسلم)

گناہ کی بنیاد پہ کی جانے والی نیکی بھی گناہ ہے

یہ بھی معلوم ہوا کہ گناہ کی بنیاد پر کی جانے والی نیکی بھی گناہ ہے۔ یہود مدینہ اپنے دینی بھائیوں کو پہلے کفار کے ہاتھوں قیدی بناتے پھر خود ہی ان کی جگہ فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے۔ اللہ نے ان پر پھٹکار ڈالی کہ یہ نیکی اپنے پاس ہی رکھو۔ اور فرمایا: فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

شریعت کے ایک حصہ کو لینا دوسرے کو چھوڑنا یہودی خصلت ہے

اس جگہ یہ بات بھی سامنے آرہی ہے کہ کتاب کا ایک حصہ ماننا دوسرا چھوڑنا کارِ یہود ہے۔ یہود نے فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑانے کا حکم تورات مان لیا اور باہمی کشت و خون کی حرمت والا حکم چھوڑ دیا۔ آج ہماری بھی یہی حالت ہے کہ ہم مطلب کے احکام پورے کرتے ہیں دوسرے چھوڑتے ہیں۔ جہاں ہمارا مفاد وابستہ ہو وہاں ہم اقامت دین کا بہانہ لے کر اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے میدان میں آجاتے ہیں، اور جہاں ہمارا مفاد نہ ہو وہاں خواہ دین پہ قیامت گزر رہی ہو ہم اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ مومن کو اسلام میں پورا داخل ہونے کا حکم ہے۔ ادخلوا فی السلم کافۃ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى

اور بالتحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور ان کے پیچھے لگاتار رسول بھیجے [83] اور ہم نے حضرت عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ

ابن مریم کو واضح نشانیاں دیں اور انہیں مقدس روح کے ساتھ مدد دی [84] تو (یہ کتنا غلط طریقہ ہے کہ) جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول

بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

وہ (ہدایت) لایا جسے تمہارے دل نہیں چاہتے تھے تو تم نے تکبر کیا پھر کچھ رسولوں کو تم نے جھٹلایا اور کچھ کو تم قتل کرتے تھے۔ [85]

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور یہود کہنے لگے: ہمارے دل پردوں میں لپٹے ہیں، نہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت فرمائی تو ان میں سے کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ [86]

بنی اسرائیل پر چودھواں انعامِ خداوندی، بعثت انبیاء کرام علیہم السلام

[83] جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی تو اس کتاب کی تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں لگاتار انبیاء ورسل مبعوث فرمائے۔ بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما ان میں سے بعض انبیاء یہ ہیں۔ حضرت شمویل علیہ السلام، مشائیل، شعیا بن امعیاء، حزقیل، ارمیاء بن حلقیا، داؤد، سلیمان، یوشع بن نون، الیاس، زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام۔

جاننا چاہیے کہ تورات کی تبلیغ کے لیے انبیاء کے علاوہ علماء وصوفیاء بھی بنی اسرائیل میں کام کرتے تھے، جیسے اللہ فرماتا ہے: يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ، یعنی تورات کے مطابق یہود کے لیے انبیاء فیصلے کرتے تھے جو ہر حال میں اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور صوفیاء وعلماء بھی۔ (مائدہ، ۴۴)

البتہ فرق یہ تھا کہ انبیاء بحکمِ الٰہی تورات کے بعض احکام میں تبدیلی بھی کردیتے تھے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ "اور میں تم پہ بعض وہ چیزیں حلال کرتا ہوں جو تم پہ (تورات میں) حرام کی گئی تھیں۔" (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۵۰) مگر علماء وصوفیاء کو کتاب اللہ کے حکم میں تبدیلی کا اختیار نہ تھا۔ وہ صرف تبلیغ کا کام کرتے تھے۔

[84] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں مبعوث ہونے والے انبیاء میں سے اہم ترین اور سب سے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی نشانیاں یعنی معجزات دیئے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: وَاُبْرِئُ

الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ میں مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں (آل عمران:۴۹) اور اللہ نے روح القدس یعنی جبریل امین علیہ السلام کے ذریعے ان کی مدد فرمائی بلکہ وہ حضرت جبریل ہی کی پھونک سے پیدا ہوئے، پھر وقت ولادت وہ جبریل علیہ السلام کی معیت کے سبب مس شیطان سے محفوظ رہے۔ پھر حضرت جبریل نے انہیں ۳۳ برس تک یہود کی سازشوں سے بچایا پھر انہیں بحکم الٰہی آسمان پہ لے گئے اور قرب قیامت میں وہاں سے واپس زمین پر لائیں گے گویا اگر حضرت جبریل امین کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصی مددنہ کی جاتی تو یہود انہیں بھی دیگر بہت سے انبیاء کی طرح قتل کر کے دم لیتے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام کے ساتھ اکثر قرآن میں ابن مریم کہا گیا اس میں ایک تو انہیں خدا ماننے والوں کا رد ہے کہ جو کسی ماں کے پیٹ سے جنم لے وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے دوسرا اس میں اللہ کی قدرت کا اظہار ہے کہ وہ بن باپ صرف ماں سے بھی انسان پیدا کر سکتا ہے۔

علماء امت محمدیہ سے انبیاء والا کام لیا گیا:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی گئی تو اس کی تبلیغ کے لیے انبیاء کرام بھیجے گئے۔ جیسے کہ اللہ نے فرمایا: وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی تبلیغ کے لیے کوئی نبی نہیں آئے گا، اب انبیاء کی بجائے علماء و مشائخ کو یہ ذمہ داری سونپی گئی۔

اس لیے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

العلماء ورثة الانبياء ''کہ علماء دین وارثان انبیاء ہیں، آگے فرمایا: انبیاء اپنے بعد درہم و دینار نہیں بلکہ علم چھوڑ کر جاتے ہیں، جس نے ان سے علم لے لیا اس نے بڑی دولت پالی۔''

(ترمذی کتاب العلم باب ۱۰ حدیث ۲۶۸۲، ابن ماجہ مقدمہ باب ۱۷)

دلیلِ ختم نبوت:

یہاں سے ختم نبوت کا نقطہ بھی ہاتھ آیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے گئے اور ان کا اختتام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا اسی لیے وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ کے بعد وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ فرمایا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کے لیے یہ نہ فرمایا گیا کہ اس کی تبلیغ کے لیے انبیاء بھیجے گئے، اگر قرآن کی تبلیغ کے لیے بھی انبیاء نے آنا تھا جیسا کہ مرزائی سمجھتے ہیں تو اللہ انکا بھی ذکر فرماتا، مگر تبلیغ قرآن کے لیے انبیاء نہ بھیجے گئے بلکہ فرمایا گیا: وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کہ آپ آخری نبی ہیں۔ (سورہ احزاب:۴۰)

اور انبیاء والا کام علماء سے لیا گیا اور انہیں وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاء کہا گیا۔ یہ لفظ بھی ختم نبوت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ وارث تب ہی میراث پاتا ہے جب مالک روئے زمین پہ نہ رہے جب تک مالک خود موجود ہو۔ وارث میراث نہیں پاتا

اگر اب بھی انبیاء آتے ہوں تو علماء کو وارث کہنے کا کیا معنی۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اور شریعت کی بقاء کے لیے انبیاء درکار تھے تو آپ اسوقت دنیا سے نہ اٹھائے گئے جب تک حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو نبوت نہ دے دی گئی تاکہ وہ آپ کی جگہ سنبھالیں۔

اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ کی کتاب کے لیے انبیاء درکار ہوتے تو آپ کے وصال سے قبل آپ کے صحابہ میں سے کسی کو نبی بنایا جانا ضروری ٹھہرتا، تاکہ وہ آپ کی جگہ سنبھال لے، مگر آپ نے اپنی جگہ کسی نبی کا اعلان نہیں کیا، بلکہ نبی کے اعلان کی بجائے یہ فرمایا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ممکن ہوتا تو عمر بن خطاب نبی ہوتے۔

(ترمذی کتاب المناقب باب مناقب عمر بن الخطاب)

''اور یہ کہ اے علی تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لیے ان کے بھائی ہارون علیہ السلام مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔'' (بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی باب ۹، ابن ماجہ مقدمہ باب ۱۱، ترمذی کتاب المناقب باب ۲۰) اس کی تفصیل میری کتاب ''دلائل ختم نبوت اور رد قادیانیت'' میں دیکھیں۔

اسی طرح حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابو بکر خیر الناس الا ان یکون نبیا۔ ''ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام انسانوں سے بہتر ہیں مگر وہ نبی نہیں بن سکتے۔''

(کنز العمال بحوالہ طبرانی وابن عدی جلد ۴ صفحہ ۲۴۴ کتاب الفضائل)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے کوئی شخص نبی نہیں بن سکتا، یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص خود کو امتی بھی کہے اور دعویٰ نبوت بھی کرے، جیسا کہ مرزا قادیانی نے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔

[85] اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سامانِ تسلی ہے۔ آپ یہود کے ایمان نہ لانے اور ان کی اسلام دشمن کارروائیوں پر حیران و پریشان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے یہود تمہارا وطیرہ ہی یہ ہے کہ تمہاری طرف بھیجے جانے والے انبیاء و رسل جب بھی تمہاری خواہش کے برعکس کوئی بات لائے تو تم نے انہیں جھٹلانے بلکہ قتل کرنے میں بھی باک نہ رکھا۔ اب اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری خواہش کے برعکس بنی اسرائیل کی بجائے قریش میں سے آئے ہیں اور تم اس حسد کے باعث ان کی تکذیب کے درپے ہو تو تم سے یہی کچھ متوقع ہے، تم ایسا ہی کرتے آئے ہو

اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کفر پہ راضی ہونا بھی کفر ہے۔ کیونکہ دور نبوی کے یہود سے کہا گیا فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۝۸۷ حالانکہ یہ کام تو ان کے آباء و اجداد کا تھا کہ وہ انبیاء کو قتل کرتے یا جھٹلاتے تھے مگر چونکہ دور نبوی کے یہود کو اپنے ایسے ہی آباء پر فخر تھا بلکہ وہ فخر سے کہتے تھے۔ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ ہم ہیں جنہوں نے مسیح عیسیٰ بن مریم کو قتل کیا ہے جو (لوگوں کے بقول) اللہ کا رسول ہے۔ اللہ نے اس کا رد فرمایا

کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو ہرگز قتل نہیں کیا نہ سولی دی ہے بلکہ انہیں اللہ نے (زندہ) اپنی طرف اٹھالیا ہے۔ (سورہ نساء آیت ۱۵۷) معلوم ہوا ایک شخص کفر کرے دوسرا اس پر خوش ہو تو وہ بھی کافر ہے۔

[86] غُلْفٌ اغلف کی جمع ہے جس کا معنی ہے غلاف میں لپٹا ہوا۔ یہود فخریہ کہتے تھے ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہیں یعنی ہم اپنے عقیدہ پر اس قدر مضبوط ہیں کہ اے مسلمانو! تمہاری تبلیغ ہمارے دلوں پر کبھی اثر انداز نہ ہوگی۔ ایک جگہ قرآن میں ہے کہ یہود نے کہا: وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ تم ہمیں جو دعوت دیتے ہو ہمارے قلوب اس سے پردوں میں ہیں۔ (سورہ حم سجدہ:۵) اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہود جس چیز کو عقیدے کی پختگی قرار دے کر اس پر فخر کر رہے ہیں یہ ان پر اللہ کی لعنت ہے کہ حق کو پہچان کر بھی اس کے منکر ہیں۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آئی جو ان کے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرتی ہے (تو وہ اس سے انکار کرنے لگے)

قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا

حالانکہ وہ اس سے قبل (اسی نبی کے وسیلہ سے) کافروں کے مقابلہ میں فتح مانگتے تھے، پھر جب ان کے پاس وہ (نبی) آ گیا جسے وہ

بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۹ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا

پہچانتے تھے تو اس کا انکار کرنے لگے تو منکروں پہ اللہ کی لعنت ہے۔[87] کیا ہی بری چیز ہے وہ جس کے عوض انہوں نے خود کو

بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ

بیچ ڈالا کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے انکار کریں، اس حسد سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے

عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

کتاب اتارتا ہے تو وہ غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے، اور کافروں کے لئے ذلت والا عذاب ہے۔ [88]

یہود کا حضور ﷺ سے حسد اور ان کی دیگر اعتقادی خرابیاں:

[87] یعنی یہود حضور ﷺ کی آمد سے قبل آپ کے وسیلہ کے ساتھ کفار کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ سے فتح طلب کرتے تھے مگر جب آپ بنی اسرائیل سے باہر پیدا ہوئے تو وہ آپ کو پہچان لینے کے باوجود آپ کا انکار کرنے لگے تو ایسے منکروں پر اللہ کی لعنت ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے تحت مروی ہے کہ بنو قریظہ و بنو نضیر کے یہود حضور ﷺ کی آمد سے

قبل یوں دعا کرتے تھے: اللھم انّا نستنصرك بحقّ النبیّ الاُمّیّ الّا نصرتنا علیھم فینصرون اے اللہ! ہم نبی امی کے حق (مقام) کے صدقے میں تجھ سے مدد چاہتے ہیں کہ تو ہمیں کفار پر فتح دے تو اللہ انہیں فتح دیتا تھا۔
(دلائل النبوۃ امام ابونعیم جلد اول صفحہ ۹۷ فصل ۵ مطبوعہ حلب)

یہاں اگر سوال ہو کہ پیچھے کہا گیا۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا لوگوں سے اچھی بات کہو۔ اب کہا گیا: فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝۸۹ تو کیا کسی پر لعنت کرنا اچھی بات ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ حق کو حق جان کر اس سے انکار کریں وہ واقعتاً اللہ کی لعنت کے مستحق ہیں۔ ان پر لعنت کرنا بھی اچھی بات ہے تاکہ دوسرے لوگ عبرت پکڑ کر ان سے دور رہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے مجرموں کو سزا دینا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں کسی شخص یا قوم کا نام لے کر اس پر لعنت نہیں کی گئی بلکہ اصول کی بات کی گئی کہ منکرین حق اللہ کی لعنت کے مستحق ہیں۔ ایسا کہنے میں کیا قباحت ہے، ہاں اگر کسی کا نام لے کر اس پہ لعنت کی جائے تو یہ قباحت کی بات ہے۔

وسیلۂ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذریعہ رحمت خدا ہے:

یہود وسیلہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فتح مانگتے تھے۔ انہیں فتح ملتی تھی۔ پیچھے فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ (بقرہ:۳۷) کے تحت گزر چکا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ وسیلہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے قبول ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ایک نابینا شخص کو یہ دعا سکھلائی تاکہ اس کی بینائی لوٹ آئے۔ اللّٰھم انی اسئلك واتوجّهُ الیك بنبیّك محمدٍ ﷺ نبیّ الرحمۃ یا محمدُ انی توجّھتُ بك الی ربّی فی حاجتی ھذہ لتُقضیٰ لی اے اللہ! میں تجھ سے تیرے رحمت والے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے دعا کرتا ہوں، اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے آپ کے وسیلہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں التجاء کی ہے کہ میری یہ حاجت پوری ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے اس نابینا شخص کی بینائی لوٹا دی۔ (طبرانی معجم صغیر صفحہ ۱۸۳ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت) امام طبرانی نے آخر میں فرمایا والحدیث صحیح یہ صحیح حدیث ہے۔ معلوم ہوا وسیلہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعا قبول ہوتی ہے۔ یہی مسلک حق اہل سنت و جماعت ہے۔ ؎

جو بھی مانگو تو وسیلے سے نبی کے مانگو — اس وسیلے سے کرم اور دوبالا ہوگا

وسیلۂ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جواز پہ مفسر کی لکھی ہوئی ایک نعت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذات مبارکہ سے توسل کے جواز پر میں نے ایک نعت شریف قلم بند کی ہے، جو اہلِ ایمان کے لیے تازگی ایمان کا سبب ہے، اس کا یہاں لکھنا خالی از فائدہ نہیں، تو میں نے عرض کیا ہے۔ ؎

سارے جہاں سے مرتبہ بالا رسول کا — اللہ بھی ہے چاہنے والا رسول کا
وجہ قبول توبۂ آدم حضور ہیں — ملتا ہے انبیاء کو بھی صدقہ رسول کا

ان کے طفیل کشتی نوح کو ملی نجات — ہر اک کے کام آیا وسیلہ رسول کا
یستفتحون نص کلام خدا کو پڑھ — ہر دور میں بٹتا تھا باڑا رسول کا
اک کور کو سکھایا توسل رسول نے — یہ بھی ہے ایک سبق پڑھایا رسول کا
ان کے طفیل آنکھوں کو اس کی ضیاء ملی — کام آگیا تھا اس کو سہارا رسول کا
عثمان بن حنیف صحابیؓ مصطفیٰ — لوگوں کو تھے بتاتے وسیلہ رسول کا
طیبؔ کرو توسلِ نام حبیب رب — بھاتا ہے رب کو نام پیارا رسول کا

مطلقاً کافروں فاسقوں پر لعنت جائز ہے اور کسی کا نام لے کر لعنت جائز نہیں:

یہاں کہا گیا: دوسری جگہ ہے۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝۸۹ (سورہ آل عمران:۶۱) حدیث میں ہے چہرہ گودنے اور گدوانے والی عورتوں پر لعنت ہے۔ حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت ہے وغیرہ معلوم ہوا کہ کسی خاص شخص یا قوم کا نام لیے بغیر مطلقا کافروں یا بدکاروں پہ لعنت کرنا جائز ہے، البتہ کسی شخص یا قوم کا نام لے کر اس پر لعنت نہیں کرنا چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے حضور ﷺ نے حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو اور صفوان بن امیہ پر نام لے کر لعنت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ (بخاری، کتاب المغازی باب ۲۱)

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا
اور جب ان سے کہا جائے کہ اس پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتارا تو کہتے ہیں ہم تو اسی پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اتارا گیا
وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ
اور اس کے سوا جو بھی ہو اس سے وہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے، جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے، آپ فرمائیں
تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝۹۱
پھر تم اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے تھے اگر تم مؤمن ہو؟[89]

[88] یہود کو حسد ہے کہ اللہ جسے چاہے نبی بنا کر اس پر اپنی وحی اتارتا ہے۔ گویا وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کو کسی کو نبی بنانے سے قبل یہود سے پوچھنا چاہیے کہ وہ کس کو اپنے فضل سے نوازے؟ تو وہ اسی ملحدانہ و حاسدانہ سوچ کے باعث اللہ کے غضب پہ غضب کے سزاوار ہوئے یعنی ان پر بار بار غضب ہوا جب بھی انہوں نے کسی نبی کو جھٹلایا یا شہید کیا تو اللہ نے ان پر غضب اتارا۔

[89] یہود کا نظریہ تھا کہ ہماری نسل میں جو انبیاء آئے اور ان پر جو کتابیں اتریں ہم صرف انہیں مانیں گے۔ تورات ہم میں اتری اسے ہم مانیں گے قرآن ہم سے باہر اترا اسے نہیں مانیں گے۔ حالانکہ قرآن تورات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور تورات قرآن اور صاحب قرآن محمد مصطفیٰ ﷺ کی آمد کی بشارت دیتی ہے۔ اللہ نے فرمایا اے یہود اگر یہی بات ہے کہ تم صرف انہی انبیاء اور ان کی کتب پر ایمان لاؤ گے جو تمہاری نسل سے ہوں تو بتاؤ جو انبیاء تمہاری ہی نسل میں آئے تم نے انہیں قتل کیوں کیا جیسے زکریا و یحییٰ علیہما السلام وغیرہما۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کو بھی یہودی دوڑے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان پر اُٹھا لیا حالانکہ وہ بھی بنی اسرائیل ہی میں سے تھے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ
اور بالتحقیق تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام واضح نشانیاں لے کر آئے پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو خدا پکڑ لیا
وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ
اور تم (خود پر) ظلم کر رہے تھے۔ [90] اور جب ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا اور تمہارے اوپر طور پہاڑ اٹھایا
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا
(اور کہا) جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور سنو! کہنے لگے ہم نے سنا اور نہیں مانا اور ان کے دل
فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ
بچھڑے کی محبت سے سیراب کئے گئے، ان کے کفر کے سبب، آپ فرمائیں تمہارا ایمان تمہیں جو کہتا ہے وہ کیا ہی بُرا ہے، اگر
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾
تم ایمان والے ہو۔ [91]

[90] یعنی اے یہود! تمہاری یہ عادت ہے کہ ان گنت نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود بہت جلد گمراہ ہو جاتے ہو تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں عصا کا سانپ بننا، فرعونیوں پر ٹڈیوں، مینڈکوں، جوؤں اور خون وغیرہ کے عذابات کا آنا۔ اور فرعون کا غرق سمندر ہونا وغیرہ دیکھا پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صرف چالیس روزہ غیر حاضری کے دوران تم نے اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اگر تم حضور ﷺ کے دست مبارک پر کثیر معجزات دیکھ کر اور آپ کی نشانیاں پہچان کر بھی ایمان نہ لاؤ تو تم سے یہی توقع ہے۔

چنانچہ ذخیرہ حدیث بتاتا ہے کہ یہود نے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک میں بیسیوں معجزات دیکھے مگر ان کے دل

پتھروں سے بھی سخت تر ہیں کہ ذرا نرم نہیں ہوئے، آگے سورہ کہف کے سبب نزول میں آئے گا کہ یہود نے نبی اکرم ﷺ سے تین سوالات کیے، اور کہا کہ اگر آپ ان تین سوالوں کے درست جوبات دیدیں تو ہم آپ پہ ایمان لے آئیں گے، ایک سوال یہ ہے کہ ذوالقرنین بادشاہ کون تھا، غار والے ساتھی کون تھے، اور روح کی حقیقت کیا ہے، اور وہ انہوں نے پڑھ رکھا تھا کہ آخری نبی سے یہ تین سوالات کیے جائیں گے وہ ان میں سے روح کے بارہ میں کچھ نہیں بتائے گا، چنانچہ اسی طرح ہوا، اللہ تعالیٰ نے سورہ کہف اتارا کر غار والے ساتھیوں کا سارا قصہ بتادیا اور ذوالقرنین باشاہ کا سارا واقعہ بھی سنادیا مگر روح کے بارہ میں کچھ نہ بتایا گیا۔ اگر یہود کے نصیب میں ایمان ہوتا تو ان کے ایمان لانے میں کوئی عذر باقی نہیں رہ گیا تھا، مگر ان بدبختوں کے نصیب میں یہی تھا کہ وہ تمام نشانیاں دیکھ کر بھی گمراہی ہی کو گلے لگائیں۔

[91] اے یہود! تمہارا کہنا ہے کہ تم صرف وہی کتاب مانو گے جو تم میں اتاری گئی یعنی تورات مگر تم نے تورات کو کب مانا تھا؟ جب تمہیں تورات دی گئی تو تم نے انکار کردیا پھر ہم طور پہاڑ اٹھا کر تم پر لے آئے اور کہا کہ جو کتاب تمہیں دی جارہی ہے اسے مضبوطی سے پکڑلو۔ تب تم نے زبان سے کہا کہ ہم نے مانا مگر تمہارے دل کہتے تھے کہ ہم نے نہیں مانا۔ وجہ یہ تھی کہ تمہارے دل سے بچھڑے کی محبت نہ نکلتی تھی۔ وہ تمہیں کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے روکتی تھی۔ تم نے تورات کو بامر مجبوری مانا ورنہ تم پر پہاڑ گرادیا جاتا۔ اب چونکہ تم پر کوئی پہاڑ نہیں گرایا جارہا۔ اس لیے تم قرآن کو نہیں مانو گے۔

قبیلہ پرستی کا رد

معلوم ہوا کہ قبیلہ پرستی کفر تک بھی پہنچادیتی ہے۔ بنی اسرائیل یعنی یہود قبیلہ پرستی میں یہاں تک چلے گئے کہ کہا ہم صرف وہی کتاب مانیں گے جو بس ہم میں اتری، گویا قبیلہ پرستی نے انہیں کفر تک پہنچادیا۔ اسی لیے حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کسی گورے کو کسی کالے پر یا کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔

یہ بھی پتہ چلا کہ رحمتِ الٰہی کسی قبیلہ سے خاص نہیں۔ بنی اسرائیل نے نبوت ورسالت کو بنی اسرائیل ہی سے خاص سمجھ لیا کہ یہی خاندان نبوت ہے اس سے باہر کوئی نبوت نہیں ہے، اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ بنی اسرائیل سے باہر قریش میں سے آئے تو انہوں نے آپ کا انکار کردیا حالانکہ اللہ کی رحمت عام ہے۔ وہ جسے چاہے اپنی رحمت سے نواز دے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ

آپ فرمائیں اگر آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تمہارے ہی لئے خاص ہے سب لوگوں کو چھوڑ کر،

النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا

توتم موت کی تمنا کرو اگرتم سچے ہو۔ اور وہ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اس (برائی) کے سبب جو ان کے ہاتھ

قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ

پہلے کر چکے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ [92] اور آپ انہیں سب لوگوں سے بڑھ کر زندگی پر

النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ

حریص پائیں گے جبکہ مشرکوں میں سے بعض وہ ہیں جن میں سے ہر کوئی تمنا کرتا ہے کہ کاش وہ

اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ

ہزار برس جیے، حالانکہ اسے اس قدر جینا عذاب سے نہیں بچا سکتا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں

بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع

اللہ دیکھتا ہے۔[93]

[92] یہود کا عقیدہ ہے کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔(مائدہ:۱۸) لہٰذا یہود کے سوا کوئی جنت میں نہیں جا سکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر یہی بات ہے تو تم موت کی تمنا کرو، پھر تمہیں دنیا میں رہ کر اس کی تکالیف سہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی مرو اور جنت میں پہنچو۔ کیونکہ دنیا کی نعمتیں خواہ کتنی ہی اعلیٰ ہوں جنتی نعمتوں کے مقابلہ میں ان کی کچھ حیثیت نہیں، دنیا کی زندگی تکالیف، بیماریوں، صدموں اور پریشانیوں سے عبارت ہے۔ جنت میں نہ بیماری ہے نہ صدمہ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا مگر یہود کبھی موت کی تمنا نہ کریں گے کیونکہ اس سے قبل وہ قتل انبیاء جیسے گھناؤنے کرتوت کر چکے ہیں۔ اندر سے انہیں معلوم ہے کہ جنت ان کے نصیب میں نہیں، پھر حضور ﷺ کی صداقت سے مطلع ہونے کے باوجود اس سے انکار کے باعث انہیں اپنے انجام بد کا پورا یقین ہے اس لیے وہ کبھی موت کی تمنا نہ کریں گے۔ چنانچہ قرآن کی پیش گوئی سچی نکلی اور وہ موت کی تمنا نہ کر سکے ورنہ کیا مشکل تھا کہ وہ سچا بننے کے لیے کہہ دیتے کہ لو ہم موت کی تمنا کرتے ہیں۔

یہود موت کی تمنا کیوں نہ کر سکے

یہود بے بہبود کو رسول اللہ ﷺ کی نبوت ورسالت کی حقانیت کا قطعی وحتمی علم تھا، پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، پھر بھی ان میں سے کچھ لوگ حق کو جان بوجھ کر چھپاتے ہیں۔ (بقرہ، ۱۴۶)

یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل۔ وہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے ہاں تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ (اعراف، ۱۵۷)

اس کے باوجود ایمان نہ لا کر وہ خوب جانتے تھے کہ ان کے نصیب میں نار جہنم کے سوا کچھ نہیں، اس لیے وہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب یہود سے کہا گیا کہ موت کی تمنا کرو۔ اگر وہ موت کی تمنا کرتے تو ان میں سے کوئی زندہ نہ بچتا۔ (درمنثور)

''روح البیان'' میں ہے حضرت نافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی ہمارے ساتھ جھگڑتا رہتا تھا، کہتا تھا قرآن میں ہے اے یہود! موت کی تمنا کرو۔ میں موت کی تمنا کرتا ہوں، پھر میں مرتا کیوں نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے سنا تو تلوار لے آئے اور یہودی پہ سونتی، وہ بھاگ اٹھا، آپ نے فرمایا۔ اگر میں اسے پالیتا تو بخدا ضرور اس کی گردن اڑا دیتا۔ یہ جاہل سمجھتا ہے کہ یہ مباہلہ (چیلنج) ہمیشہ کے لیے ہے حالانکہ یہ صرف ان یہودیوں کے لیے تھا جو نبی ﷺ کے زمانہ میں آپ سے دشمنی کرتے اور پہچاننے کے باوجود انکار کرتے تھے۔ (روح البیان جلد اول صفحہ ۱۸۳)

[93] یعنی یہود موت کی تمنا کیسے کریں گے وہ تو سب لوگوں سے بڑھ کر دنیوی زندگی کے حریص ہیں کیونکہ انہوں نے ایسے کام ہی نہیں کیے جو انہیں آخرت کا شوق دلائیں اور ان کی حرصِ دنیا، مشرکین سے بھی زیادہ ہے جبکہ بعض مشرکین کی تمنا ہے کہ ان میں سے ہر کوئی ہزار برس جیئے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ اہل فارس (آتش پرستوں) کی طرف اشارہ ہے ان میں سے اگر کسی کو چھینک آئے تو اسے کہا جاتا ہے ''زہ ہزار سال'' ہزار سال جیو، مگر یہود کی حرصِ حیاتِ دنیا ان سے بھی زیادہ ہے اور یہ ان کے لیے باعث شرم بات ہے۔ مشرکین تو آخرت اور جنت ونار اور حیات بعد الممات کے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ اگر ایسی سوچ رکھیں تو ان سے یہی متوقع ہے مگر یہود تو آخرت کے قائل ہیں بلکہ خود کو جنت کے اکلوتے وارث گردانتے ہیں پھر ان کا دنیوی زندگی سے اس قدر پیار قابل شرم ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کافر اگر ہزار برس دنیا میں جی لے یا تا قیامت زندہ رہ لے پھر بھی دوزخ سے بچنے والا نہیں۔ اس کا آخری دائمی ٹھکانہ جہنم ہی ہے۔

موت کی تمنا کس صورت میں جائز ہے اور کس صورت میں نا جائز:

یاد رہے یہاں موت کی تمنا کی چار صورتیں ہیں: بعض جائز بعض نا جائز مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ (۱) شہادت کی تمنا ثواب ہے۔ (۲) جب ایمان کو خطرہ ہو تو موت کی تمنا جائز ہے۔ نبی اکرم ﷺ دعا فرماتے تھے اے اللہ! جب تو لوگوں کو فتنہ میں ڈالے تو مجھے فتنہ سے پہلے اٹھا لینا۔ (موطا امام مالک کتاب القرآن باب ۴۰) (۳) جب موت آجائے تو موت سے گھبرانے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق ہونا چاہئے اور یہ توفیق الٰہی سے ملتا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو اللہ سے ملنا چاہے اللہ اس سے ملنا چاہتا ہے جو اللہ سے نہ ملنا چاہے اللہ اس سے نہیں ملنا چاہتا، تو ازواج رسول ﷺ میں سے کسی نے پوچھا یا رسول اللہ موت تو ہم میں سے ہر کسی کو ناپسند ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ بات نہیں، بلکہ جب مومن کو موت آتی ہے تو اسے اللہ کی رضا اور اس کے فضل کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تب اسے اللہ کی ملاقات سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں رہتی، تب وہ اللہ سے ملنا چاہتا ہے اور اللہ اسے ملنا چاہتا ہے اور کافر کو جب موت آتی ہے تو اسے عذاب الٰہی کی خبر سنائی جاتی ہے تب اسے اگلے جہان سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں رہتی، تب وہ اللہ سے نہیں ملنا چاہتا تو اللہ اس سے نہیں ملنا چاہتا (مسلم کتاب الذکر حدیث ۱۴) (۴) مصائب سے گھبرا کر موت کی تمنا کرنا گناہ ہے۔

معلوم ہوا کہ کافر موت سے ڈرتا ہے مومن نہیں۔ یہود مرنے سے گھبراتے تھے اور یہی ہر کافر کا حال ہے اور وہ مومن بھی موت سے گھبراتا ہے جو کافرانہ طرز زندگی اپنائے مگر ایمانی حلاوتوں سے آشنا مومن موت سے نہیں گھبراتا۔ اسی لیے وہ میدان جہاد میں جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلتا ہے جب تک مومنوں میں یہ شان تھی کافر اُن سے ڈرتے تھے جب یہ بات ختم ہوئی تو وہ کافروں سے ڈرنے لگے۔ حدیث ہے: **الموت ریحانۃ المومن**، موت مومن کے لیے پھول ہے۔ (تحفہ ہے) (مظہری عن دیلمی راویا عن الامام حسین بن علی رضی اللہ عنہما)

موت کو یاد رکھنے کی اہمیت وضرورت

یہ بھی معلوم ہوا کہ موت اٹل ہے، اس کی تیاری لازم ہے۔ جب ہزار برس جی لینے کے بعد بھی موت نے آکر ہی رہنا ہے تو پھر موت کی تیاری کرنی چاہیے، اور اس کی تیاری یہ ہے کہ وہ اعمال کیے جائیں جو ہماری قبر اور آخرت کو سنواریں اور وہ کام چھوڑ دینے چاہئیں جو ہماری قبر وحشر کو خراب کریں۔

موت کی تیاری کا سب سے اہم اور پہلا تقاضا یہ ہے کہ مومن اپنی آخرت کو ہمیشہ یاد رکھے، کبھی نہ بھولے، اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: **کن فی الدنیا کأنك غریب او عابر سبیل**۔ ''اے مومن تم دنیا میں ایسے رہو جیسے تم غریب الوطن یا مسافر ہو۔'' (بخاری کتاب الرقاق)

دنیا کی مثال ایک اسٹیشن کی طرح ہے

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان پہلے عالم ارواح میں تھا، پھر عالم ارحام میں آیا، پھر عالم دنیا میں آ گیا، پھر وہ عالم برزخ میں پہنچ جائے گا، اور وہاں سے عالم آخرت کی طرف منتقل ہو جائے گا، گویا اس کے سفر کے دوران دنیا ایک منزل آئی ہے، جس سے وہ جلدی نکل کر اگلی منزل کی طرف کوچ کر جائے گا، تو دنیا میں انسان کی مثال ایسے ہے جیسے وہ ٹرین میں سوار ہے راستہ میں اسٹیشن آیا جس کا نام دنیا ہے، وہاں وہ اگلی منزل کے لیے کچھ زاد سفر لینے کے لیے اترا، مگر افسوس کہ اسے یاد ہی نہ رہا کہ یہاں تو مسافر ہے، اور اس کی آخری منزل تو آخرت ہے ۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا

آپ فرما دیں جو جبریل کا دشمن ہے (وہ جان لے کہ) اس نے اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر قرآن اتارا ہے جو اپنے سے

لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ

قبل والی ہر کتاب کی تصدیق کرتا ہے اور وہ مؤمنوں کیلئے ہدایت اور بشارت ہے [94] جو شخص اللہ اور اس کے

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

فرشتوں اور رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہے تو (وہ جان لے کہ) اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ [95]

یہود کی حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سے دشمنی

[94] جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا تو یہود کو (معاذ اللہ) حضرت جبرائیل علیہ السلام سے نفرت اور دشمنی ہو گئی کہ یہ فرشتہ بنی اسرائیل سے باہر کسی شخص پر وحی کیوں لانے لگا ہے؟ اس نفرت کا اظہار انہوں نے احمقانہ طریقہ سے کیا۔ تب یہ آیات نازل ہوئیں۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہود کی ایک جماعت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی اور کہا ہم آپ سے چند سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا جواب کوئی نبی ہی دے سکتا ہے۔ اگر آپ درست جوابات دے دیں تو ہم آپ کو اللہ کا نبی مان لیں گے۔ انہوں نے چار سوالات کیے۔ (۱) یعقوب علیہ السلام نے خود پر کیا چیز حرام کی تھی؟ (۲) رحم مادر میں کبھی بچہ بنتا ہے کبھی بچی یہ کیسے ہوتا ہے؟ (۳) اس نبی امی کی جس کا تورات میں ذکر ہے، نیند کیسی ہے؟ ۔ (۴) اور فرشتوں میں سے اس کا مددگار کون ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب یعقوب علیہ السلام بیمار پڑے تو انہوں نے نذر مانی اگر اللہ انہیں صحت دے تو وہ سب سے لذیذ کھانا اور مشروب خود پر حرام کر لیں گے، انہیں صحت ہوئی، انہوں نے اونٹ کا گوشت

اور اسکا دودھ خود پر حرام کیا، رہا یہ کہ رحم مادر میں کبھی بچہ بن جاتا ہے کبھی بچی تو یہ اس لیے ہے کہ اگر شوہر کی منی غالب آ جائے تو بچہ پیدا ہوتا ہے اگر عورت کی غالب آئے تو بچی، اور نبی امی کی نیند یہ ہے کہ اس کی (یعنی رسول اللہ ﷺ کی) آنکھیں سوتی ہیں دل بیدار رہتا ہے اور اس کا مددگار فرشتہ جبریل ہے۔ یہود نے کہا آپ کے پہلے تینوں جوابات درست تھے البتہ جبرائیل سے ہمیں دشمنی ہے۔ وہ ہم پر عذابات اتارتا رہا ہے اگر اس کے سوا کوئی اور فرشتہ آپ کا مددگار ہوتا تو ہم ضرور آپ کی پیروی کر لیتے۔ تب اللہ نے یہ آیات اتاریں۔ (مسند احمد جلد اول صفحہ ۱۲۴، طبرانی، ابونعیم وغیرہ)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیارے نبی ﷺ جبرائیل علیہ السلام از خود نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے آپ کے قلب مبارک پر قرآن اتارتے ہیں اور یہ قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل کی گئیں، (یعنی قرآن یہود کی مسلمہ کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہے) اور جو لوگ قرآن پر ایمان لے آئیں قرآن انہیں ہدایت اور بشارت دیتا ہے پھر یہود اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ اگر قرآن تورات کی تکذیب کرتا تو ان کی مخالفت قرآن کا کوئی معنیٰ ہوتا۔

[95] یعنی جو شخص جبرائیل علیہ السلام سے دشمنی کرے اس نے دراصل اللہ سے دشمنی کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضور ﷺ کی طرف بھیجا ہے تو جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں سے دشمنی رکھے خصوصاً جبرائیل و میکائیل جیسے رسل ملائکہ سے، جیسے یہود نے کیا تو اللہ تعالیٰ ایسے منکروں کا دشمن ہے یعنی ان سے وہ سلوک کرے گا جو ایک دشمن سے کیا جاتا ہے۔

قرآن سے نسبت معیارِ شرافت ہے:

حضرت جبرائیل کی فضیلت یوں بیان کی گئی: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ کہ انہوں نے حضور ﷺ کے قلب پر قرآن اتارا۔ گویا قرآن کا اتارنا ان کے لیے وجہ فضیلت و شرافت ہے، اور کیوں نہ ہو قرآن سے جس چیز کی بھی نسبت ہو وہ عظیم تر ہے، قرآن جس رسول پہ اترا وہ سب رسولوں سے افضل، قرآن جس ماہ میں اترا وہ تمام مہینوں سے افضل، جس رات میں اترا وہ سب راتوں سے افضل، جس امت کے لیے اترا وہ سب امتوں سے افضل، لہٰذا قرآن پڑھنے پڑھانے والے لوگ سب انسانوں سے افضل ہیں۔ اسی لیے حدیث ہے: خیرکم من تعلم القرآن و علمه، تم سے بہترین وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور اس کو سکھائے۔ (بخاری کتاب فضائل القرآن باب ۲۱)

غلط تلفظ سے قرآن پڑھنے کی برائی:

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ میں اگر قاف کو موٹی آواز کے ساتھ نہ پڑھا جائے جیسا کہ یہ غلطی عام لوگ کرتے ہیں تو یہ كَلْبِكَ بن جاتا ہے جس کا معنی یہ ہو جاتا ہے کہ جبرائیل نے قرآن کو (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) آپ کے کتے پر اتارا ہے۔ یہ کفریہ معنیٰ ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو قرآن صحیح تلفظ سے پڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ یعنی کہدو کہ اللہ ایک ہے، اب عمو ما برصغیر کے لوگ كُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ پڑھتے ہیں، جس کا معنی ہے کھا جاؤ اللہ ایک ہے۔ معاذ اللہ!

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَ كُلَّمَا

اور بالتحقیق ہم نے آپ کی طرف واضح آیات اتاری ہیں اور ان سے انکار صرف نافرمان لوگ ہی کرتے ہیں۔ تو کیا

عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا

یہ حقیقت نہیں کہ جب بھی یہود نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے بہر حال توڑ ڈالا بلکہ ان میں سے

جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ

اکثر (وعدہ پہ) ایمان ہی نہیں رکھتے۔ [96] اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول آ گیا جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے جو

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾

ان کے پاس ہے تو اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پس پشت پھینک دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔ [97]

[96] حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) فرماتے ہیں یہود مدینہ اور حضور ﷺ کے مابین معاہدات ہوئے تھے کہ مشرکین کے مقابلہ میں یہود آپ کا ساتھ دیں گے۔ مگر بنو قریظہ نے بار بار عہد شکنی کر کے مشرکین کا ساتھ دیا۔ اللہ فرماتا ہے: اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾ یعنی یہود وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ سے معاہدہ کیا اور وہ ہر بار اپنا عہد توڑ دیتے ہیں اور انہیں کچھ ڈر نہیں۔ (انفال:۵۶) گویا عہد شکنی یہود کی فطرت میں شامل ہے، اگر یہ رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں تورات میں ان سے لیے گئے وعدوں کی پاسداری نہ کریں تو اس میں کوئی تعجب نہیں۔

[97] حضرت سدی تابعی فرماتے ہیں مفہوم آیت یہ ہے کہ یہود نے تورات کے سہارے قرآن کا مقابلہ کرنا چاہا جب انہیں معلوم ہوا کہ تورات تو وہی کچھ کہتی ہے جو قرآن کہتا ہے تو انہوں نے تورات کو بھی پس پشت پھینک دیا اور یوں ظاہر کیا جیسے انہیں نبی ﷺ کے بارے میں کچھ علم نہیں حالانکہ وہ آپ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ (ابن جریر) اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ عہد شکنی اور جان بوجھ کر حق سے اعراض یہودی خصلتیں ہیں اگر مسلمان بھی ایسا ہی کرے تو اس کے اور یہود کے کردار میں کیا فرق رہا۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ

اور وہ اس (جادو) کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین سلیمان علیہ السلام کی حکومت میں پڑھتے تھے اور سلیمان علیہ السلام نے کچھ کفر نہ کیا بلکہ

الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ

شیاطین نے کفر کیا وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے، [98] اور وہ (جادو) جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر

بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا

اتارا گیا اور وہ دونوں کسی کو جادو نہ سکھاتے تا آنکہ کہہ دیتے کہ ہم تو بس ایک آزمائش ہیں

نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ

تو تم کفر نہ کرنا، تو (یہود) ان دونوں سے وہ (جادو) سیکھ لیتے جس کے ساتھ وہ کسی آدمی اور اس کی بیوی کے درمیان

وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ

جدائی ڈال دیں اور وہ اسکے ساتھ کسی کو حکم الٰہی کے بغیر نقصان نہیں دے سکتے، اور وہ (جادو) سیکھتے جو انہیں نقصان تو دیتا

مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ

مگر نفع نہیں۔ [99] حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ جو شخص جادو حاصل کرے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور وہ چیز

مِنْ خَلَاقٍ ؕ قف وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ

کتنی بری ہے جس کے عوض انہوں نے خود کو بیچ ڈالا، اگر وہ یقین لاتے (تو ایسا نہ کرتے)۔ اور اگر

اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع

۱۲ ع ۱۲

وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو تھوڑا ثواب بھی اللہ کے ہاں بہتر ہے اگر وہ یقین لاتے (تو ایسا ہی کرتے)۔ [100]

یہود کی جادوگری سے محبت

[98] یہود کی بُری عادات میں سے اللہ رب العزت ان کی جادوگری بیان فرما رہا ہے کہ وہ کلام اللہ پر ایمان لانے کی

بجائے جادوگری جیسے کفر کے دلدادہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حضور ﷺ کو جادو کے ذریعے معاذ اللہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ لوگ اس جادو کی پیروی کرتے ہیں جو شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں لوگوں کو سکھاتے تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا تھا یعنی وہ جادو کے زور پر حکومت نہیں کرتے تھے البتہ شیاطین لوگوں کو جادو سکھا کر کفر کا ارتکاب کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں

عہد سلمان علیہ السلام میں شیاطین آسمان سے (فرشتوں کی) باتیں سن کر ان میں اپنی طرف سے جھوٹ ملاتے اور انسانوں کو بتلاتے تھے اور وہ ان چیزوں کو اپنی کتابوں میں لکھ لیتے تھے (کیونکہ عہد سلیمانی میں جنات کا انسانوں سے میل ملاپ بہت تھا جیسا کہ سورہ نمل کے تیسرے رکوع سے پتہ چلتا ہے) جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس چیز کا پتہ چلا تو آپ نے وہ کتابیں ضبط کر کے اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیں۔ آپ کے وصال کے بعد شیاطین کی نشاندہی پر لوگوں نے وہ کتابیں نکالیں تو ان میں جادو لکھا ہوا تھا۔ تو لوگوں کا یقین پختہ ہو گیا کہ سلیمان علیہ السلام جادو کے زور پر حکومت کرتے تھے (اسی لیے انکی کرسی کے نیچے سے جادو کی کتابیں نکلی ہیں) اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ الزام دور کرنے کیلئے یہ آیت نازل فرمائی: وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ (حاکم جلد ۲ صفحہ ۲۹۱ کتاب التفسیر مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

جادو کفر ہے اور جادوگر کافر و زندیق:

یہاں وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہ کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ سے صاف معلوم ہوا کہ جادو کفر ہے اور جادو کرنے والا کافر۔ اسی طرح آگے فرمایا جا رہا ہے: وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ اس سے بھی جادو کا کفر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ جادو اس لئے کفر ہے کہ اس میں شیطان کو مؤثر حقیقی مان کر اسے مدد کے لئے پکارنا پڑتا ہے اور شیطان کو خوش کرنے کے کفریہ کلمات بولنا اور کفریہ اعمال کرنا پڑتے ہیں جیسے اللہ عزوجل و رسول ﷺ کی شان میں توہین، قرآن کی بے ادبی وغیرہ۔ جو یہ کام زیادہ کرے اس کا جادو زیادہ تیز ہو جاتا ہے، اور شیطان اسکی زیادہ مدد کرتا ہے۔ اسی لیے جادو کو ان سات بڑے ہلاکت خیز تباہ کن گناہوں میں شمار کیا گیا ہے جو دیگر کبیرہ گناہوں سے بھی بڑے ہیں، اور حضور ﷺ نے فرمایا:

اِجتَنِبوا السبعَ المُوبِقاتِ سات بڑے تباہ کن گناہوں سے بچو، پھر آپ ﷺ نے ان میں سے جادوگری کو بھی بیان فرمایا ہے۔ (بخاری کتاب الوصایا باب ۲۳)

جزیرۂ ابن عمر
جھیل اورمیہ
کردستان
زنجان
دریائے قزل اوزن
تلعفر
نینویٰ
موصل
راوندوز
اربل
دریائے زاب صغیر
سلیمانیہ
کرکوک
ایران (فارس)
الجزیرہ
ہمدان
دریائے عظیم
دریائے دیالی
خانقین
کرمان شاہ
نہاوند
لرستان
ہیت
بین النہرین (میسوپوٹیمیا)
حبانیہ
بغداد
طیسفون
دریائے دجلہ
کربلا
بابل
ہاشمیہ
فارس
دریائے کارون
کوفہ
نجف
نشیب سعدیہ
عمارہ
نشیب سنیہ
سواد
دریائے فرات
سماوہ
اُور
نشیب حمار
بصرہ
عبادان
کاظمہ

بابل کے ہاروت و ماروت

﴿ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ﴾

''اور بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر جو (جادو) اتارا گیا تھا۔'' (البقرة: 102/2)

نبی اکرم ﷺ انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے محسن ہیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام کو دنیا نبی اکرم ﷺ کی آمد سے قبل ایک جادوگر کے طور پر جانتی تھی بلکہ جب حضور ﷺ نے انہیں انبیاء کرام علیہم السلام میں شمار کیا تو یہود نے اعتراض کیا اور کہا دیکھو یہ ایک جادوگر کو نبی کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے رد میں کہا: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (تفسیر قرطبی) گویا اگر آپ ﷺ تشریف نہ لاتے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصل مقام یعنی نبی اللہ ہونا کبھی واضح نہ ہوتا۔

اسی طرح موجودہ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام کو اپنی سگی بیٹیوں سے برائی کرنے والے بتایا گیا ہے (معاذ اللہ) حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک عیاش بادشاہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے (معاذ اللہ) حضرت ہارون علیہ السلام کو بت گر بتایا گیا ہے کہ انہی نے بچھڑا بنا کر بنی اسرائیل کو دیا تو انہوں نے اس کی پرستش شروع کردی (معاذ اللہ)

مگر قرآن مجید نے ان کا اصل مقام واضح کیا تو حضور ﷺ محسنِ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ تشریف نہ لاتے اور قرآن کریم کتاب ہدایت بن کر نازل نہ ہوتا تو دنیا ہمیشہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بارہ میں گمراہی میں مبتلا رہتی۔

اسی طرح دنیا ہمیشہ اسی گمراہی میں رہتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی اور وہ انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بنے جیسا کہ آج عیسائی سمجھے بیٹھے ہیں۔ یہ قرآن نے آکر بتایا کہ یہ غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

ماقتلوہ وماصلبوہ ولکن شبّہ لھم و ماقتلوہ یقینا بل رفعہ اللہ الیہ ، یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ قتل کیا نہ سولی دی بلکہ ان کو شبہ میں ڈال دیا گیا اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یقیناً قتل نہ کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ (سورہ النساء، آیت نمبر ۱۵۷)

گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پہ رسول اللہ ﷺ کا احسان ہے کہ آپ ﷺ نے تشریف لاکر انسانیت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں گمراہی سے بچایا اور ان کے بارہ میں حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

قصہٴ ہاروت وماروت

[99] یعنی یہود نے اس جادو کی بھی میراث پائی ہے جو شہرِ بابل (عراق) میں دو فرشتوں ہارون و ماروت پر اتارا گیا، وہ دونوں لوگوں کو جادو سکھاتے اور ساتھ کہتے تھے ہم تمہارے لیے آزمائش بن کر آئے ہیں کہ آیا تم جادو سیکھ کر اسے اپناتے ہو یا اسے کفر سمجھ کر اس سے دور رہتے ہو، مگر یہود نے ان دو فرشتوں سے جو جادو سیکھا اسے اپنا بھی لیا اور اس کے ذریعے وہ میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں تا کہ ایک دوسرے کی بیوی پر قبضہ کریں، اور یہ سب اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اگر اللہ کا حکم نہ ہو تو کوئی جادو اثر نہ کرے۔ یعنی جادوگر موثر حقیقی نہیں ہیں کہ انہیں خدائی طاقتوں کا مالک سمجھا جائے۔ موثر حقیقی صرف اللہ ہے وہی ہر چیز میں تاثیر پیدا کرتا ہے اور جادو میں اس کا تاثیر پیدا کرنا اسی طرح ہے جیسے

اس نے زہر میں ہلاک کرنے کی تاثیر رکھی ہے۔اب جو زہر کھا کر مرے اس میں اللہ پر کیا اعتراض۔اللہ تو بتلا رہا ہے کہ جادوگروں کو نقصان ہی ہوتا ہے، نفع نہیں ملتا۔

یاد رہے! عراق کے شہر بابل میں ۳۰۰۰ قبل مسیح جادو کا بہت زور تھا۔اس علاقے کا پرانا نام کلدانیہ ہے۔آج کل اسے کالڈیا کہتے ہیں۔چونکہ اس علاقے کے قدیمی لوگ جادوگری میں مشہور رہے اسی لیے انگریزی میں CALDEIN بمعنی جادوگر ہے۔یاد رہے بابل شہر کوفہ و کربلا کے درمیان واقع ہے۔

نقشہ کے مطابق یہ کوفہ سے پچاس کلومیٹر دور ہے۔اس زمانہ میں جادوگران بابل دعویٰ خدائی کرنے لگے تھے۔ (جیسے فرعون نے جادو کے زور پر دعویٰ خدائی کیا) اور لوگ جادوگروں میں خدائی طاقتیں مانتے تھے۔تب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے دو فرشتے انسانی شکل میں اتارے۔ان کا نام ہاروت و ماروت تھا۔وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے تاکہ لوگ جان جائیں کہ جادو بس ایک فن ہے جو بھی یہ فن سیکھ لے وہ جادو کر سکتا ہے۔اسے خدائی طاقت سمجھنا یا کسی جادوگر کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت کرنا کفر ہے۔مگر وہ ساتھ یہ بھی بتاتے تھے کہ جادو کا اپنانا کفر ہے۔جو اسے سیکھے وہ اسے اپنائے نہیں۔ابن جریر نے ایک حدیث روایت کی ہے جس کے مطابق ہاروت و ماروت کا اتارا جانا حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ کی بات ہے۔

ہاروت و ماروت کے بارہ میں اسرائیلی روایات کی تردید:

اس جگہ بعض طویل روایات ہیں کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے جب زمین پر جادو سکھانے کیلئے بشکل انسان آئے تو ان سے گناہ سرزد ہوا۔انہوں نے ایک عورت سے برائی کی تو انہیں آخرت کے عذاب سے بچانے کے لیے دنیا کے عذاب میں ڈالا گیا اور وہ بابل ہی میں ایک کنوئیں میں لٹکے ہوئے ہیں۔قیامت سے قبل ان کی سزا ختم ہو جائے گی اور وہ واپس فرشتوں میں چلے جائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرشتوں نے کہا یا اللہ انسان بہت گناہ کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو شہوتیں ہم نے انسانوں میں رکھی ہیں اگر وہ تم میں پیدا کر دی جائیں تو تم بھی وہی گناہ کرو گے، پھر اللہ نے کہا کہ تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو منتخب کرو انہوں نے ہاروت و ماروت کو منتخب کیا، تو انہیں بصورت انسانی زمین پہ بھیج دیا گیا، ان پہ ایک عورت پیش کی گئی، جس سے انہوں نے بدکاری کر ڈالی، تب اللہ تعالیٰ نے انہیں اختیار دیا کہ دنیا یا آخرت کا کوئی عذاب پسند کر لو انہوں نے باہم مشورہ کر کے دنیا کا عذاب اختیار کر لیا۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ایک عورت ''دومۃ الجندل'' سے میرے پاس آئی۔اس نے بتایا کہ اس کا شوہر غائب ہو گیا تھا، تب وہ ایک بوڑھی عورت کے کہنے پہ اس کے ساتھ بابل شہر میں گئی، وہاں ہم نے ایک کنوئیں میں دو آدمی دیکھے جو الٹے لٹکے ہوئے تھے، وہ عورت کہتی ہے: انہوں نے مجھ سے

پوچھا کہ تم یہاں کیوں آئی ہو؟ میں نے کہا میرا شوہر غائب ہے میں جادو سیکھنے آئی ہوں تا کہ اسے تلاش کروں، انہوں نے کہا تم واپس چلی جاؤ اور کفر نہ کرو، مگر میں نے اصرار کیا، انہوں نے کہا فلاں تنور میں جا کر پیشاب کرو، میں نے جا کر پیشاب کیا تو مجھ میں سے ایک گھڑسوار شمشیر بکف شخص باہر نکلا اور آسمان کی طرف بلند ہوگیا، میں نے جا کر ان دونوں کو ماجرٰی بتایا، انہوں نے کہا وہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے نکل گیا ہے، اب جاؤ تم جو چاہو گی وہ جادو کے ذریعہ تمہیں حاصل ہوگا۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم، سنن بیہقی، حاکم)

مگر یہ روایات نا قابل حجت ہیں، علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ھذہ الحکایۃ لم یصح منھا شیء عن رسول البریۃ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یالیت کتب الاسلام لم تشتمل علی ھذہ الخرفات التی لم یصدقھا العاقل، اس حکایت میں رسول انام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی بات صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، اے کاش کتبِ اسلام ایسی خرافات پہ مشتمل نہ ہوتیں جنہیں کوئی عاقل نہیں مان سکتا۔

(روح المعانی جلد اول صفحہ ۳۴۳ مطبوعہ داراحیاء)

امام ابوعبداللہ محمد بن احمد قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ھذا کلہ ضعیف وبعید عن ابن عمر وغیرہ لایصح منہ شیء یہ سب ضعیف ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے اس کا صدور بعید ہے، اس میں سے کوئی شئ صحیح نہیں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۳ مطبوعہ داراحیاء)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اعلم ان ھذہ الروایۃ فاسدۃ مردودۃ غیر مقبولۃ لانہ لیس فی کتاب اللہ مایدل علی ذالك، جان لو کہ یہ روایت فاسدہ مردودہ غیر مقبولہ ہے، قرآن میں ایسا کوئی لفظ نہیں جو اس کی صحت پہ دلالت کرے۔

(تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۶۳۱ مطبوعہ دارالحدیث ملتان)

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایات اسرائیلی و یہودی خرافات ہیں اور عصمتِ ملائکہ کے اجماعی عقیدۂ اہل اسلام کے خلاف ہیں، فرشتے معصوم ہیں وہ کوئی گناہ نہیں کر سکتے، اللہ فرماتا ہے: لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ''فرشتے اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور انہیں جو حکم دیا جائے وہی کرتے ہیں۔'' (سورہ تحریم، آیت نمبر ۶) مزید اللہ فرماتا ہے: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ ''وہ اللہ کے مکرم بندے ہیں وہ اس کی مرضی کے بغیر بات نہیں کرتے اور اسی کے حکم پہ چلتے ہیں۔'' (سورہ الانبیاء، آیت نمبر ۲۷)

تو جو کچھ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ہاروت و ماروت کے بارہ میں فرمایا ہے وہی صحیح ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے بابل شہر میں دو فرشتے بصورتِ انسان اتارے جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ انہیں پتہ چلے کہ جادوگری کی حقیقت کیا ہے تا کہ جو لوگ جادو کی بنیاد پہ دعوی خدائی یا دعوی نبوت کرتے تھے ان کی اصلیت لوگوں پہ کھل جائے، دوسرا یہ کہ فرشتے لوگوں کو ساتھ یہ بھی بتاتے تھے کہ اس جادو پہ عمل کرنا کفر ہے، لہذا کوئی شخص اپنے دنیوی

مقاصد کے لیے جادوگری میں مبتلا ہو کر اپنا ایمان ضائع نہ کرے، اس میں اللہ کی طرف سے لوگوں کی بڑی آزمائش تھی۔

جادو منتر سے قطع رحمی پیدا کرنا یہودی خصلت ہے:

مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ سے معلوم ہوا جادو کے ذریعے میاں بیوی کے مابین جدائی ڈالنا یہودی خصلت ہے۔ افسوس ہے کہ آج کئی مسلمان جادو کے ذریعے رشتہ داروں خصوصاً میاں بیوی میں جدائیاں ڈال رہے ہیں اور جادوگروں اور جھوٹے عاملوں کی دکانیں چمکا رہے ہیں حالانکہ یہ سخت ترین گناہ ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شیطان اعظم روزانہ اپنا دربار لگاتا ہے جو شیطان جتنا فتنہ پیدا کرے وہ اسی قدر اس کے ہاں مقرب ہوتا ہے اور سب سے مقرب اس کے ہاں وہ ہوتا ہے جو میاں بیوی میں جدائی ڈالے کیونکہ اس سے بڑا فتنہ کوئی نہیں۔ (مسلم شریف)

اگر جادو میں تاثیر ہے تو قرآنی تعویزات میں کیوں نہیں:

یہاں سے جادو کا اثر معلوم ہوا کہ اس سے میاں بیوی میں جدائی ہو جاتی ہے۔ اگر برے کلام میں یہ تاثیر بد ہے تو اللہ تعالیٰ کے کلام میں کس قدر اچھی تاثیر ہے۔ اللہ فرماتا ہے:

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ ''ہم قرآن میں وہ اتارتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔'' (بنی اسرائیل: ۸۲) اور قرآنی تعویزات سے احادیث بھری پڑی ہیں۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک بستی کے قریب سے گزرے۔ بستی والوں نے ان کی ضیافت نہ کی، ان کے سردار کو کسی چیز نے ڈس لیا۔ انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا: کیا تم میں کوئی دم کرنے والا ہے؟ ان میں سے ایک شخص نے کہا: ہاں ہے، مگر جب تک تم ہمیں کوئی معاوضہ نہ دو گے ہم دم نہیں کریں گے، انہوں نے کچھ بکریاں دینے کا وعدہ کیا۔ اس صحابی نے سورہ فاتحہ پڑھ کر اس شخص کے زہر آلود جگہ پہ تھتکارا تو وہ اسی وقت تندرست ہو گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ بکریاں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا پڑے اور فرمایا اس میں میرا بھی حصہ رکھو۔ (بخاری کتاب الطب باب الرقی بفاتحۃ الکتاب حدیث ۵۷۳۶)

ابوداود میں ہے کہ صحابی بن صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے گھر میں اگر کوئی بڑا بیمار ہوتا تو اسے معوذتین پڑھنے کے لیے کہتے تھے اور اگر کوئی چھوٹا بچہ بیمار ہوتا تو یہ سورتیں لکھ کر اس کے گلے میں ڈالتے تھے۔
(سنن ابوداود کتاب الطب حدیث ۳۸۹۳)

معلوم ہوا کہ قرآنی تعوذات کا دم کرنا بھی جائز ہے اور ان کا لکھ کر گلے میں ڈالنا بھی سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہے، اسے بدعت اور شرک کہنا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہ فتوائے کفر لگانے کے برابر ہے۔ معاذ اللہ!

اگر سوال کیا جائے کہ حدیث میں تعویذات کو شرک کہا گیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تعویذات کو شرک کہا گیا ہے جو مشرکین کے ہاں مروج تھے کہ وہ اپنے بتوں کے نام لکھ کر جانوروں اور بچوں وغیرہ کے گلے میں ڈالتے تھے۔ یہی علامہ عینی، ابن حجر مکی، احمد قسطلانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی و دیگر شارحین حدیث کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ سورہ بنی اسرائیل آیت ۸۲ کے تحت اس کی مفصل بحث آئے گی ان شاء اللہ العزیز وہاں ہم اس موضوع کے تمام مالہ وماعلیہ پر بحث کریں گے۔ تعویذات کے جواز کے دلائل اور اس پہ اعتراضات کے جوابات لکھے جائیں گے۔

[100] یہود جانتے ہیں کہ جادو کفر ہے اور اس کا مرتکب کافر ہے۔ لہٰذا آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں پھر بھی جادو سے باز نہیں آتے تو انہوں نے اپنی جانوں کو کیسی بری عادات کے بدلے بیچ ڈالا ہے یعنی خود کو اس کے لیے وقف کرلیا ہے۔ اگر وہ اس پر علم یقین قائم کرلیں تو اس سے باز آجائیں اور اگر یہود کفر چھوڑ کر ایمان اور تقویٰ اختیار کرلیں تو اللہ کے ہاں تھوڑا ثواب بھی بڑا ہے بشرطیکہ ایمان ساتھ ہو اگر یہود آخرت کا ثواب دیکھ لیں تو ضرور اسے حاصل کریں۔ مگر انسان کا یہی امتحان ہے کہ بن دیکھے مانے۔

جادوگر کی سزا شریعت میں قتل ہے:

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: حَدُّ السَّاحِرِ ضَربُه بِالسَّيفِ" جادوگر کی سزا تلوار سے اس کا سر اڑانا ہے۔" (ترمذی کتاب الحدود) جادوگری چونکہ کفر ہے تو جادوگر گویا اپنے دین کو بدل کر مرتد ہو جاتا ہے، اور قرآن وحدیث میں مرتد کی سزا قتل ہی ہے، جیسے مرتدین کے لیے فرمایا: تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ج تم ان سے قتال کرو تا آنکہ وہ اسلام لے آئیں۔ (فتح،۱۶)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَن بَدَّلَ دِينَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" جس نے اپنا دین بدلا اسے قتل کردو۔" (بخاری کتاب الجہاد حدیث ۳۰۱۶، ابوداؤد کتاب الحدود) ابن عیینہ نے روایت کیا ہے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمان جاری کیا: اقتلوا کلّ ساحر وساحرہ ہر جادوگر مرد اور عورت کو قتل کردو۔
(احکام القرآن للجصاص جلد اول صفحہ ۶۱)

البتہ کچھ لوگ شعبدہ بازی اور ہاتھ کی صفائی کا فن جانتے ہیں۔ وہ عجیب وغریب کرتب دکھاتے ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جائیں۔ ان کے فن میں کوئی کفریہ بول بولنا یا شیطان لعین کو مدد کے لیے پکارنا شامل نہیں ہوتا، اس کا جادو سے کوئی تعلق نہیں نہ یہ کفر ہے نہ ہی اس پہ حرمت کا فتویٰ لگایا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ کراہت سے خالی نہیں کیونکہ یہ لہو ولعب اور ضیاع وقت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ

اے ایمان والو! (نبی ﷺ کو) راعنا نہ کہو اور اُنظرنا کہو اور (آپ کی بات) غور سے سنا کرو

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔[101]

یہود کی اسلام دشمن کارروائیاں اور اللہ کی ان پر پھٹکار

[101] يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو!) کا خطاب قرآن میں یہاں پہلی بار وارد ہوا ہے قرآن میں یہ خطاب مومنوں کو ۸۶ مرتبہ فرمایا گیا ہے۔ یہ ایسا خطاب دلنواز ہے جسے سن کر اہل ایمان کی ارواح اور انکے قلوب وجد میں آجاتے ہیں کیونکہ ایمان کائنات کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ دنیا و آخرت کی سب نعمتیں اسی ایک نعمت کے دامن میں چھپی ہیں۔ یہ خطاب صرف امت محمدیہ کو عطا فرمایا حضرت خثیمہ فرماتے ہیں تورات میں بنی اسرائیل کو یایھا المساکین کہا جاتا تھا۔ (درمنثور) چنانچہ بالآخران پر مسکنت مسلط ہوگئی۔

اس کے علاوہ مطالعہ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ ہر نبی لوگوں کو یا قوم اے میری قوم کہہ کر پکارتا تھا اور بنی اسرائیل کے انبیاء لوگوں کو یا بنی اسرائیل کہہ کر پکارتے تھے مگر قرآن میں يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فرمایا گیا چونکہ جناب سید الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کی نبوت و بعثت کسی ایک قوم کیلئے نہیں تمام نسل انسانی کے لیے ہے اس لیے کبھی يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ کہا گیا کبھی يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فرمایا گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو راعنا کہنے سے منع کیا جانا:

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب حضور ﷺ کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو وہ عرض کرتے رَاعِنَا یَا رَسُولَ اللہ یعنی اے اللہ کے رسول ﷺ ہماری رعایت فرمائیں۔ یعنی یہ بات ہمیں پھر سمجھا دیں۔ یہود مردود کی زبان میں لفظ رَاعِنَا ایک گالی کے طور پر مستعمل تھا۔ جب انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور ﷺ کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے دیکھا تو وہ اس لفظ کو حضور ﷺ کے لیے بطور گالی اور گستاخی بولنے اور آپ ﷺ کی توہین کرنے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور اہل ایمان سے فرمایا تم یہ لفظ آپ ﷺ کی بارگاہ میں بولنا چھوڑ دو، اور اس کی بجائے اُنْظُرْنَا کہا کرو جس کا معنی ہے اے اللہ کے رسول ﷺ ہماری طرف نظر کرم فرمائیں اور آپ کی بات پہلے ہی سے غور کے ساتھ سنا کرو تا کہ بار بار پوچھنے اور اُنْظُرْنَا کہنے کی بھی نوبت نہ آئے اور کافروں کے لیے دردناک

عذاب ہے۔یعنی ان لوگوں کے لیے جو حضور ﷺ کی شان میں یہود کی طرح بے ادبی کا ارتکاب کرتے ہیں اللہ کے ہاں ان کے لیے عظیم عذاب ہے۔

مروی ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ یہود کی زبان سے واقف تھے جب انہوں نے یہود کی زبان سے حضور ﷺ کے بارے میں لفظ راعنا سنا تو وہ سخت غصہ میں آئے اور کہا اے خدا کے دشمنو! بخدا اگر میں نے آئندہ یہ لفظ تم میں سے کسی کی زبان سے سنا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔تم اس سے ہمارے آقا محمد رسول اللہ ﷺ کی شان میں بے ادبی کرتے ہو۔(تفسیر روح المعانی)

دوسری جگہ قرآن میں یہود کی اس گستاخی رسول کی یوں نشاندہی کی گئی ہے:

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٤٦﴾ یعنی یہود میں سے کچھ لوگ کتاب اللہ کے کلمات کو ان کے حقیقی مقام سے ہٹاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نے اللہ کا حکم سن لیا مگر مانا نہیں،اے محمد ﷺ آپ سنیں،آپ کی بات نہ سنی جائے اور وہ راعنا کہتے ہیں زبان کو پھیرتے ہوئے اور دین میں طعن کرتے ہوئے اور اگر وہ کہتے کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا اور کہتے کہ آپ سنیں اور یہ نہ کہتے کہ آپ کی بات نہ سنی جائے اور انظرنا کہتے تو یہ ان کے لیے بہتر اور باعث اجر ہوتا،مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب ان پہ لعنت کی ہے،تو وہ کم ہی ایمان لاتے ہیں۔(سورہ نساء،آیت نمبر ۴۶)

بارگاہِ خدا میں مقامِ مصطفیٰ ﷺ:

اس آیت میں اللہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے حبیب کریم ﷺ کی بارگاہ کا ادب اور آپ کے حضور بات کرنے کا طریقہ سکھایا۔قربان جائیں گویا بارگاہ رسول ﷺ ایسی عظیم بارگاہ ہے کہ رب العالمین قرآن میں اس کے آداب سکھاتا ہے کہ آپ کی بارگاہ میں ایسے بولو ایسے مت بولو۔دوسری جگہ فرمایا گیا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿٢﴾ اے ایمان والو! نبی (ﷺ) کی آواز سے اپنی آواز مت اونچی کرو ورنہ تمہارے اعمال حسنہ ضبط ہو جائیں گے اور تمہیں شعور تک نہ ہوگا۔(حجرات:۲) دنیا کے بادشاہوں کے درباروں کے آداب وہاں کے کارندے اور سپاہی سکھاتے ہیں کہ یہ پروٹوکول ہے،یہ احترام ہے،مگر بارگاہ مصطفیٰ ﷺ کا پروٹوکول اللہ تعالیٰ کا قرآن سکھاتا ہے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ مے آید جنیدوبایزید ایں جا

نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں پہلودار لفظ کا بولنا باعثِ کفر ہے:

یہود نے آپ ﷺ کے بارے میں ایک لفظ بولا تھا جو اُن کی لغت کے اعتبار سے باعث گستاخی تھا مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان میں احترام والا معنی رکھتا تھا۔ اللہ رب العزت کے ہاں ان کی یہ حرکت سخت ناپسندیدہ آئی اور انہیں کافر کہہ کر یاد کیا گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس قدر غصہ آیا کہ ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ جو لفظ ایک معنی کے لحاظ سے بے ادبی والا ہو دوسرے معنی کے لحاظ سے نہ ہو تو اسکا استعمال بھی اللہ و رسول کے لیے جائز نہیں ہے، گویا جس لفظ سے گستاخی کا امکان پیدا ہو سکتا ہو وہ بھی یہاں حرام ہے۔

آپ ﷺ کی شان میں گستاخی والا جملہ بلا نیت بھی گستاخی ہے:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کو معاذ اللہ گستاخی کی نیت سے رَاعِنَا نہ کہتے تھے وہ تو ادب کا لفظ بولتے تھے مگر چونکہ اللہ کے ہاں یہ لفظ باعثِ گستاخی قرار پا چکا تھا اس لیے صحابہ کو اس لفظ کے بولنے سے روک دیا گیا۔ اسی لیے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

''جس نے شان رسالت میں بے ادبی کا لفظ بولا اس کی سزا بہر حال قتل ہے۔ خواہ اس کی ظاہری حالت سے یہی معلوم ہو کہ وہ آپ ﷺ کی گستاخی پہ یقین نہیں رکھتا اور نہ اس نے گستاخی کا ارادہ کیا ہے، بلکہ محض جہالت، کسی رنج یا نشہ کے باعث اس کی زبان سے گستاخی کے جملے ادا ہوئے بہر حال وہ اس سزا کا مستحق ہے۔''

(الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ جلد دوم صفحہ ۲۰۳ مطبوعہ ملتان)

کیونکہ اگر یہ گنجائش دیدی جائے تو کوئی بھی شخص گستاخی کرنے کے بعد سزا سے بچنے کے لیے کہہ سکتا ہے کہ میں کسی رنج یا صدمہ میں تھا، میرا ارادہ نہ تھا، اور اس طرح اللہ و رسول کی عزت بازیچۂ اطفال بن جائے گی۔

یاد رہے! گستاخئ رسول کی سزا خود حضور ﷺ نے قتل مقرر کی ہے۔ کعب بن اشرف یہودی حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا اور آپ کی ازواج مطہرات کے بارے میں غلیظ زبان بولتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کون ہے جو ابن اشرف کا کام تمام کرے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتا ہے چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے قتل کر دیا۔

(بخاری کتاب المغازی کتاب ۱۶)

فتاویٰ شامیہ میں ہے

ائمہ اربعہ متفق ہیں کہ شاتم رسول اللہ ﷺ کافر اور واجب القتل ہے۔ (شامیہ جلد ۳ صفحہ ۳۲) امام خیر الدین رملی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ شاتمِ رسول ﷺ مرتد ہے اس کا حکم قتل ہے اور اس کی توبہ قبول نہیں اور اس کے کفر میں شک کرنے والا بھی کافر ہے۔ (درمختار جلد اول صفحہ ۹۵)

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ

کفر کرنے والے نہیں چاہتے نہ اہل کتاب اور نہ مشرکین کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی

عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اتاری جائے اور اللہ اپنی رحمت کے لئے جسے چاہے چن لیتا ہے

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔[102]

[102] اہل کتاب یعنی یہود کو یہ حسد تھا اور اب بھی ہے کہ نبوت ان کے خاندان بنی اسرائیل سے باہر کیوں چلی گئی۔ وہ حضور ﷺ کے دامن سے لپٹنے والے مسلمانوں سے حسد و بغض رکھتے تھے اور مشرکین مکہ کو یہ حسد تھا کہ ان کے اندر پلنے بڑھنے والے ایک شخص کو ان میں سے نبوت کے لیے کیوں چن لیا گیا حالانکہ اس کے پاس سرداری و سرمایہ داری جیسی چیزیں نہیں ہیں وہ کہتے تھے: لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ اس قرآن کو ان دو شہروں (مکہ، طائف) میں سے کسی عظیم شخص پر کیوں نہیں اتارا گیا۔ (زخرف: ۳۲) اس بارہ میں اللہ نے فرمایا کہ اللہ اپنی رحمت یعنی نبوت کے لیے جسے چاہے منتخب کر لیتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ

ہم جو بھی آیت منسوخ کرتے یا اسے (ذہنوں سے) بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی (نئی آیت) لے آتے ہیں، کیا تم نہیں جانتے

اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ [103] کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی

وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

بادشاہی ہے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا نہ کوئی حمایتی ہے نہ مددگار۔

[103] یہود نے اپنی اسلام دشمنی کا ایک اور مظاہرہ کیا۔ جب قرآن کریم کی کوئی آیت منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسری آیت لائی جاتی تو یہود زبان طعن دراز کرنے لگتے کہ دیکھو اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو تو اس میں یہ تبدیلی کیوں آئے، چنانچہ تحویل قبلہ کے موقع پر بھی یہود نے بہت شور مچایا جس کا ذکر دوسرے پارہ کے پہلے رکوع میں آ رہا ہے، اللہ

ان کے رد میں فرما رہا ہے کہ ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے یا اسے لوگوں کے ذہنوں سے بھلا دیتے اور محو کر دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس جیسی یا اس سے بہتر دوسری آیت لے آتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ حکیم مریض کی حالت دیکھ کر اس کے لیے نسخہ (Prescription) تبدیل کر دیتا ہے۔ اللہ بھی حکیم ازلی ہے وہ بندوں کے لئے ایک حکم نازل فرماتا ہے پھر ان کی حالت کے مطابق اس میں تبدیلی فرما دیتا ہے۔ پہلی آیت کی جگہ اس سے بہتر آیت لانے کی مثال یہ ہے کہ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ (بقرہ، ۲۴۰) اس میں بیوہ عورت کی عدت پہلے ایک سال مقرر کی گئی تھی پھر اس کی جگہ يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ (بقرہ: ۲۳۴) نازل کی گئی۔ اس میں بیوہ عورت کے لیے صرف چار ماہ دس دن عدت مقرر کر کے آسانی پیدا کر دی گئی اور پہلی آیت کی جگہ اس جیسی دوسری آیت لانے کی مثال تحویل قبلہ ہے کہ اس میں ایک قبلہ کی جگہ دوسرا قبلہ لایا گیا کوئی تبدیلی نہ لائی گئی۔

نسخ کی تین اقسام ہیں:

اول: کوئی آیت قرآن میں باقی رہے اس کی تلاوت ہمیشہ جاری رہے مگر اس کا حکم منسوخ ہو جائے۔ جیسے آیت: الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۸۰) یعنی "والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے مرنے سے قبل وصیت لازم ہے۔" اور مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ "بیوہ عورت کو سال تک گھر سے نہ نکالا جائے۔" (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۴۰) وغیرہ۔ اب یہ آیات تو قرآن میں موجود ہیں مگر ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

دوم: تلاوت ختم ہو جائے اور آیت قرآن سے نکل جائے مگر اس کا حکم باقی رہے۔ جیسے حضرت عمر فاروق، ابن عباس، زید بن ارقم اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ وہ قرآن میں ایک آیت پڑھتے تھے۔ الشيخ والشيخة اذا زنيا فارجموهما یعنی شادی شدہ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت جب زنا کریں تو انہیں سنگسار کرو۔ (ابن ماجہ کتاب الحدود) اب یہ آیت تو قرآن کی تلاوت سے نکال دی گئی ہے مگر اس کا حکم باقی ہے کہ شادی شدہ زانی یا زانیہ کی سزا رجم ہی ہے، یہاں اس آیت میں مانسخ من آیۃ میں نسخ کی ان دونوں اقسام کی طرف اشارہ ہے۔

سوم: آیت بھی قرآن سے نکل جائے اور اس کا حکم بھی اٹھ جائے۔ اس طرح کہ اسے لوگوں کے ذہنوں ہی سے بھلا دیا جائے اور وہ ان کی یادداشت سے محو ہو جائے۔ اس جگہ اَوْ نُنْسِهَا (یا ہم اسے بھلا دیں) میں اسی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کئی سورتیں اور آیات یاد تھیں مگر وہ ان کے ذہنوں سے محو کر دی گئیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بصرہ میں سو قراء قرآن کے سامنے بتایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک لمبی سورت جو سورہ توبہ کے برابر تھی پڑھتے تھے جو ہمیں بعد میں مکمل بھلا دی گئی۔ (مسلم کتاب الزکوٰۃ)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ایک انصاری صحابی کو ایک سورت یاد تھی وہ رات کو اٹھ کر اسے پڑھنے لگا مگر

بسم اللہ سے آگے کچھ نہ پڑھ سکا۔ یہ واقعہ اس کے کئی ساتھیوں کے ساتھ ہوا۔ صبح اس نے حضور ﷺ سے ماجرا عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا آج رات اللہ نے یہ سورت واپس اٹھالی اور اسے لوگوں کے سینوں سے نکال لیا۔
(تفسیر در منثور نا قلا عن البیہقی فی دلائلہ)

اور اللہ تعالیٰ اس پہ قادر ہے کہ جو چیز چاہے ہماری یادداشت سے نکال دے جیسے آج سب کو معلوم ہے کہ قبر میں کیا سوالات ہونگے مگر قبر میں اسی کو یاد رہیں گے جس پہ اللہ کا فضل ہوگا، آج ہم جانتے ہیں کہ قیامت میں سب لوگ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس جائیں گے مگر کوئی نبی شفاعت کی حامی نہیں بھرے گا پھر لوگ سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس جائیں گے اور آپ ﷺ ہی باب شفاعت کھولیں گے مگر قیامت میں یہ بات کسی کو یاد نہ رہے گی۔

ناسخ کے اعتبار سے نسخ کی چار صورتیں:

اول۔ قرآن کا نسخ قرآن سے، جیسے مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ (بقرہ، ۲۴۰) کا نسخ یَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (بقرہ: ۲۳۴) کے ساتھ، یعنی بیوہ کی عدت پہلے ایک برس تھی پھر چار ماہ دس دن کردی گئی۔

دوم۔ حدیث کا نسخ حدیث سے، جیسے رکوع کے وقت رفع یدین، یہ پہلے حدیث کے ذریعہ جاری کیا گیا پھر حدیث کے ذریعہ منسوخ کردیا گیا یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہیں زیارت قبور سے روکتا تھا اب تمہیں کہتا ہوں کہ قبور کی زیارت کیا کرو۔“ (سنن ابی داود کتاب الاشربہ)

سوم: حدیث کا نسخ قرآن سے۔ جیسے نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم حدیث میں تھا پھر قرآن نے اسے منسوخ کردیا اور فرمایا: وما جعلنا القبلة التی کنت علیہا الا لنعلم من یتبع الرسول الخ

چہارم۔ قرآن کا نسخ حدیث سے۔ جیسے الْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کہ مرنے والا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرے۔ (بقرہ: ۱۸۰) اسے اس حدیث نے منسوخ کردیا کہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ نے ہر حق والے کو حق دیدیا ہے فلا وصیة لوارث تو وارث کے لیے کوئی وصیت جائز نہیں۔“ (ابوداود کتاب الوصایا حدیث ۲۸۷۰)

نسخ کی حکمتیں:

(۱) کئی احکام ابتداء میں سخت جاری کیے گئے پھر ان میں نسخ کے ذریعہ نرمی کردی گئی یعنی سخت حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ نرم حکم جاری کردیا گیا، جیسے ابتداء میں روزۂ رمضان کا آغاز رات کو سوجانے سے ہوجاتا تھا، جیسے ہی کسی کی اونگھ لگی اس کا روزہ شروع ہوگیا، پھر اس میں نرمی کر کے طلوع سحر تک کھانے پینے کی اجازت دیدی گئی، تاکہ امت مسلمہ قیامت تک اللہ کی شکر گزار رہے کہ اس نے سخت حکم کو نرم کردیا اور وہ نرم حکم کو خوشدلی کے ساتھ ادا کیا کریں۔

(۲) ابتداء میں کئی احکام نرم رکھے گئے تھے تا کہ لوگ ان کے عادی ہو جائیں پھر ان کو منسوخ کر کے ان کی جگہ سخت احکام جاری کر دیے گئے، جیسے پہلے شراب حلال تھی، پھر اسے صرف نماز کے وقت میں حرام کیا گیا پھر مکمل حرام قرار دیا گیا، اگر اسے یکدم حرام کیا جاتا تو وہ کئی لوگوں پہ گراں گزرتا کیونکہ لوگ اسے صدیوں سے پی رہے تھے۔

(۳) پہلے ایک حکم بعض حالات کے مطابق جاری کیا گیا پھر حالات بدل گئے تو حکم بھی بدل دیا گیا جیسے مکہ میں کفار سے درگزر کرنے کا حکم دیا گیا، پھر جب مدینہ طیبہ میں مسلمانوں نے قوت پکڑ لی تو درگزر کا حکم منسوخ کر کے جہاد کا حکم جاری کیا گیا۔

نسخ صرف اللہ ورسول کے اختیار میں ہے:

لفظ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ سے معلوم ہوا قرآن کی کسی آیت کے حکم یا اس کی تلاوت کو منسوخ کرنا صرف اللہ ہی کا کام ہے اور رسول اللہ ﷺ کا کسی آیت کو منسوخ کرنا بھی اللہ ہی کے منسوخ کرنے میں شامل ہے۔ کیونکہ ان کی شان یہ ہے: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ ۝۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰىۙ ۝۴ (نجم: ۳،۴) اللہ ورسول کے بعد کسی حاکم یا مجتہد کو قرآن وحدیث کی کسی نص کے منسوخ کرنے کا اختیار نہیں بلکہ اگر وہ ایسا کرے تو کافر ہے۔ جیسے مرزا غلام احمد قادیانی نے جہاد کی آیات کو منسوخ قرار دے کر کفر کا ارتکاب کیا۔

نسخ صرف دور نبوی ﷺ ہی میں ہوسکتا تھا:

قرآن میں جو نسخ اور تبدیلی ہونا تھی وہ حضور ﷺ کے وصال سے قبل ہو گئی تھی۔ آپ کے بعد کوئی تبدیلی نہیں ہوئی نہ ہوسکتی ہے۔ اسی لیے مَا نَنْسَخْ میں اللہ نے نسخ کو اپنی ہی طرف منسوب کیا ہے۔ حضور ﷺ قرآن کو مکمل صورت دے کر گئے۔ اس کے بعد اس کی ایک زبر زیر میں فرق نہیں آیا۔ اہل تشیع کا جو فرقہ سمجھتا ہے کہ قرآن میں بارہ ائمہ اہل بیت کے ناموں کی تصریح تھی مگر خلفاء راشدین نے قرآن لکھتے ہوئے ایسی تمام آیات اور سورتیں نکال دیں۔ جیسا کہ انکی اصول کافی، احتجاج طبرسی، انوار نعمانیہ، کتاب سُلیم بن قیس وغیرہ میں لکھا ہے۔ وہ فرقہ اسلام سے خارج اور مرتد ہے۔ کیونکہ وہ قرآن کو ناقص ومحرف مانتا ہے۔

قرآن میں نسخ کے وجود سے انکار کرنا کفر ہے:

آج مرزائی اور پرویزی فرقوں کے لوگ قرآن میں کسی نسخ کے پائے جانے سے انکار کرتے ہیں، یہ بھی کفر ہے کیونکہ یہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ سے صریح انکار ہے۔ ہم مرزائیوں اور پرویزیوں سے پوچھتے ہیں کہ اسلام میں نسخ کا کوئی تصور نہیں ہے تو وہ کعبۃ اللہ کی طرف رخ کر کے نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ انہیں بیت المقدس ہی کی طرف رخ رکھنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے بیت المقدس کو قبلۂ نماز بنایا، پھر اسے منسوخ کر کے کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا گیا، اور ارشاد ہوا:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ

اے رسول ﷺ آپ جس قبلہ پہ پہلے تھے ہم نے اسے صرف اسی لیے بنایا تھا تاکہ ہم آزمائیں کہ کون رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ (سورہ بقرہ، آیت نمبر ۱۴۳)

اس جگہ اَلْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ کے الفاظ منکرین نسخ کے لیے تازیانہ عبرت ہیں۔ آج مرزائی اور پرویزی فرقے نسخ کے ماننے کی وجہ سے مسلمانوں کا مذاق اڑاتے اور انہیں گمراہ کہتے ہیں، مگر وہ خود مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اور اَلْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ جیسی نصوص صریحہ سے انکار کر کے اپنا منہ کفر و الحاد کی سیاہی سے سیاہ کر رہے ہیں۔

منکرین نسخ کے ایک اعتراض کا جواب:

منکرین نسخ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کئی مفسرین نے قرآن کی بیسیوں آیات کو منسوخ قرار دیا ہے جبکہ دوسرے مفسرین انہیں منسوخ نہیں کہتے اور ایسے لگتا ہے کہ جس مفسر کو کسی آیت کی سمجھ نہیں آئی اس نے اسے منسوخ کہہ دیا ہے مگر یہ اعتراض گمراہ کن ہے، ہم کہتے ہیں کہ یہ بجا ہے کہ بعض مفسرین نے چند آیات کو منسوخ کہنے میں عجلت سے کام لیا ہے۔ ان آیات کو نسخ کے سوا دیگر محامل پہ بھی اتارا جا سکتا تھا، جیسے کفار سے درگزر کا حکم دینے والی آیات ہیں۔ کئی مفسرین نے انہیں آیاتِ جہاد کی وجہ سے منسوخ کہا ہے۔ حالانکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب درگزر مناسب ہو وہاں درگزر کیا جائے جیسے مکی دور میں رسول اللہ ﷺ نے کیا اور جب جہاد ضروری ہو تب جہاد کیا جائے جیسے مدنی دور میں کہا گیا۔

مگر اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ قرآن میں کوئی نسخ موجود ہی نہیں، مثلاً كُتِبَ عَلَیْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَیْرَا ۖۚ اۨلْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ تم پہ فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے اگر وہ مال چھوڑے تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کرے۔ (بقرہ:۱۸۰)

اس آیت کے منسوخ ہونے پہ ساری امت متفق ہے، آیات میراث اور حدیث لا وصیة للوارث اس کی ناسخ ہیں تو نسخ کے بارہ میں بعض مفسرین کی عجلت پسندی سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام میں نسخ کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے، یہ ایسے ہے کہ اگر کسی نے گاڑی تیز یا غلط چلائی ہے تو گاڑی کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے یا اس کا چلانا ہی ممنوع قرار دیا جائے۔

یہ بھی یاد رکھا جائے کہ نسخ کا معنیٰ یہ بھی ہے کہ کسی مبہم حکم کی وضاحت کر دی جائے اور اعتراض کا جواب دیدیا جائے یعنی شبہ دور کر دیا جائے، جیسے اللہ فرماتا ہے

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ اور ہم نے آپ سے قبل جو بھی نبی یا رسول بھیجا اس نے جب کوئی تمنا کی تو شیطان نے اس کی تمنا میں رکاوٹ ڈالی (شبہات ڈالے) چنانچہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو دور کر کے

اپنی آیات کو محکم فرماتا ہے۔ (ج، ۵۲)

جب نسخ کا معنیٰ شبہات کا ازالہ بھی ہے تو کئی مقامات پہ جب مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت کو فلاں آیت نے منسوخ کر دیا ہے تو بسا اوقات اس کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ اس آیت نے فلاں آیت کی وضاحت کر دی ہے، جیسے اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ کی وضاحت فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے ہوگئی، تو جس مفسر نے یہاں نسخ کا لفظ بولا ہے تو اس کا معنیٰ ازالہ شبہ ہے۔ لیکن کچھ مقامات وہ ہیں جہاں ساری امت نسخ کے حقیقی معنی پہ متفق ہے، جیسے والدین اور اقارب کے لیے حکم وصیت کا نسخ، اور بیوہ کے لیے سال بھر کی عدت کا نسخ وغیرہ۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول (ﷺ) سے ایسے ہی سوالات کرو جیسے اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام سے کیے گئے اور جو شخص

يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ

ایمان کے بدلے کفر لے لے تو وہ سیدھے راستہ سے بھٹک گیا۔ [104] بہت سے اہل کتاب چاہتے ہیں

اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ

کہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر کفر کی طرف لوٹا دیں اپنے دلی حسد کی وجہ سے،

عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى

بعد ازاں کہ ان کے لئے حق واضح ہو چکا ہے، تو تم معاف کرو اور درگزر سے کام لو تا آنکہ اللہ اپنا (نیا) حکم

يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

لے آئے بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ [105]

الثلثة

[104] ہجرت سے قبل مشرکین مکہ حضور ﷺ سے بے معنی سوالات کرتے تھے کہ آپ زمین سے چشمے جاری کریں۔ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھیں اور کتاب لے کر آئیں جسے ہم خود پڑھیں وغیرہ۔ جیسے قرآن میں ہے:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ کہنے لگے ہم تجھ پہ ایمان نہ لائیں گے تا آنکہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ نکال لائے۔ (بنی اسرائیل: ۹۱)

پھر ہجرت کے بعد یہود مدینہ نے بھی ایسے ہی بے مقصد سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ابن اسحاق، ابن ابی حاتم وغیرہ

نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہود نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا آپ ہمارے سامنے آسمان سے کتاب لائیں۔ (درمنثور جلد اول ۲۶۰) اسی طرف اللہ تعالیٰ نے یوں اشارہ فرمایا:

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً یعنی اہل کتاب (یہود) آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے کتاب اتاریں۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بڑا سوال کیا تھا اور کہا تھا ہمیں اللہ دکھاؤ کھلم کھلا۔ (نساء: ۱۵۳)

تو اللہ تعالیٰ نے یہود سے خطاب کر کے فرمایا کیا تم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ویسے ہی سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے تم موسیٰ علیہ السلام سے کرتے تھے؟ یاد رکھو جس نے ایمان کی جگہ کفر اختیار کیا وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ بعض اہل ایمان نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دُور ازکار سوالات کیے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بارخاطر ہوئے۔ مثلاً ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لوگو! تم پر حج فرض ہے بعض لوگوں نے کہا کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ سوال اچھا نہ لگا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب کر کے فرمایا کیا تم اپنے رسول سے ویسے سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے کر کے ان کو پریشان کیا تھا جس کی مثال ذبح گائے کا حکم ہے اللہ نے فرمایا گائے ذبح کرو انہوں نے پوچھنا شروع کر دیا کہ گائے کی عمر کیا ہو رنگ کیا ہو وغیرہ وغیرہ۔

اسی بارہ میں دوسری جگہ فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ اے مومنو! ایسی چیزیں نہ پوچھو کہ اگر تمہیں بتائی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر تم پوچھو گے جبکہ قرآن اتر رہا ہے تو وہ تمہیں بتا دی جائیں گی۔ (مائدہ: ۱۰۱)

اسی بارہ میں یہ حدیث ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

ذرونی ما ترکتکم فانما هلك من كان قبلكم بسوالهم واختلافهم علی انبیائهم فاذا امرتكم بشیئ فخذوا منه ما استطعتم واذا نهیتكم عن شیئ فانتهوا ۔ یعنی جو بات میں تمہارے لیے مطلق چھوڑ دوں اس میں مجھ سے سوالات نہ کرو، کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء پہ زیادہ سوالات اور ان سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے، تو جو میں تمہیں حکم دوں اسے بقدر طاقت بجالاؤ اور جس چیز سے تمہیں روکوں اس سے باز آجاؤ (ابن ماجہ کتاب السنہ حدیث ۲)

چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی حکم فرماتے تو وہ آگے سے مختلف سوالات نہیں کرتے تھے کہ یہ کیسے کیا جائے اور کیسے نہ کیا جائے؟

یہاں سے عظمت رسول ﷺ کا پتہ چلا:

اللہ تعالیٰ نے پہلے لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا کہہ کر اپنے محبوب ﷺ کی بارگاہ کا ادب سکھایا اب آپ ﷺ کی بارگاہ میں زبان سنبھال کر رکھنے اور ضرورت سے زائد سوال نہ کرنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔

کیا عظمت ہے ہمارے آقا و مولا ﷺ کی، دنیا کے بادشاہوں کے درباروں میں حاضری کے آداب پر سرکاری حکم نامے چھپائے جاتے ہیں جو لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ایسے حاضر ہو، یوں بات کرو، مگر قربان جائیں بارگاہ مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری اور عرض و معروض کرنے کے آداب خود اللہ رب العزت اپنی مقدس کتاب قرآن مجید میں مسلمانوں کو ارشاد فرماتا ہے۔ ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر نفس گم کردہ مے آید جنید وبایزید اینجا

اسی لیے امام احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ؎

معراج کا سماں ہے کہاں پہنچے زائرو کرسی سے اونچی کرسی اسی پاک در کی ہے

[105] جب غزوہ احد میں مسلمانوں کو وہ کامیابی نہ ملی جو بدر میں ملی تھی اور کثیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تو یہود نے مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں یوں شکست نہ ہوتی۔ تم ہمارے دین پر آجاؤ یہ تمہارے دین سے بہتر ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری اور فرمایا بہت سے اہل کتاب اپنے اندرونی حسد کے سبب تمہیں دولت ایمان سے محروم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان پر حق واضح ہو چکا ہے کہ محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے وہی آخری رسول ہیں جن کی بشارت تورات میں مذکور ہے تو اے مسلمانو! تم ان سے درگزر کرو تا آنکہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔ چنانچہ بعد میں یہود مدینہ پر اللہ کا حکم اترا اور بنو قریظہ کو قتل کیا گیا اور بنی نضیر کو مدینہ سے نکال دیا گیا اور وہ خیبر میں جا ٹھہرے۔

یہاں سے حسد کی برائی معلوم ہوئی:

حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ سے معلوم ہوا کہ یہود کو حسد نے کفر پر مضبوطی سے قائم کر دیا۔ اس میں ہمارے لیے درسِ عبرت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا حسد تمام نیکیوں کو یوں کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑیوں کو (ابن ماجہ کتاب الزھد) آپ ﷺ نے فرمایا ایمان اور حسد دونوں ایک دل میں اکٹھا نہیں رہ سکتے۔ (نسائی کتاب الجہاد) حسد یہ ہے کہ آدمی کسی شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر جل جائے اور تمنا کرے کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے اور اگر یہ تمنا کرے کہ کاش اللہ مجھے بھی یہ نعمت دے تو یہ حسد نہیں رشک ہے، اسے غبطہ کہتے ہیں اور یہ جائز ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور تم اپنے لئے جو نیک عمل آگے بھیجو اسے تم اللہ کے ہاں پالو گے بے شک

عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔[106]

[106] یعنی اے مومنو تم یہود کی اسلام دشمن کارروائیوں پر فی الحال توجہ نہ دو ان سے بعد میں نمٹ لیں گے تم ابھی نماز و زکوٰۃ جیسے ایمانی تقاضے پورے کرو اور تم جو بھی دنیا میں بھلائی کرو اس کا اجر آخرت میں تم اللہ کے ہاں پالو گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: الدنیا مزرع الاخرۃ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، یعنی جو کچھ ہم یہاں بوتے ہیں آخرت میں اس کا پھل پالیں گے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ

اور یہود و نصاریٰ نے کہا: جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی یا عیسائی ہو یہ ان کی (باطل)

اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ

آرزوئیں ہیں آپ فرمائیں! تم اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ہاں کیوں نہیں،

اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

جس نے اپنا چہرہ اللہ کے حضور جھکا دیا اور وہ مخلص ہو تو اس کے لئے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے ان پر کوئی خوف نہیں

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

اور نہ (قیامت میں) وہ غمزدہ ہوں گے۔[107]

۱۳ ع ۹ ۱۳

[107] مدنی دور کے آخر میں نجران کے عیسائی مدینہ طیبہ میں نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور یہود مدینہ سے ملے اور دونوں کے مابین تکرار ہوئی، یہود نے کہا جنت میں صرف یہود جائیں گے۔ وفد نجران نے کہا تم غلط کہتے ہو جنت میں صرف عیسائی جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کے رد میں یہ آیت اتاری اور فرمایا یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جائیں گے مگر یہ ان کے باطل خیالات ہیں اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہے تو لائیں مگر وہ اپنی کتابوں میں سے بھی کوئی ایسی آیت نہ لا سکے جو یہ کہتی ہو کہ جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جا سکتے ہیں اور ان سے

قرآن کے چیلنج کا جواب نہ بن سکا۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سنو جنت میں جانے کے لیے خود پر کسی فرقے کا لیبل لگالینا کافی نہیں بلکہ جو شخص بھی اپنا چہرہ اللہ کے حضور جھکا دے یعنی اپنا عقیدہ و عمل اس کی مرضی کے مطابق بنالے اور مخلص ہو یعنی اس کے عقیدہ اور عمل میں نفاق نہ ہو تو ایسے لوگ دنیا میں اللہ کے خوف کے سوا دنیا کے ہر خوف سے آزاد ہو جاتے ہیں اور آخرت میں انہیں غم نہ ہوگا کیونکہ وہ جنت کی بہاروں میں مزے لیں گے جہاں کسی غم کا گزر نہیں۔

اہل سنت و جماعت میں سے ہونا صحتِ عقیدہ کا معیار ہے:

یاد رہے صحیح عقیدہ کا معیار حضور ﷺ نے یوں بیان فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی ﷺ نے فرمایا:

ان بنی اسرائیل تفرقت علی اثنین وسبعین ملة وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین ملة کلهم فی النار الا واحدة قال ومن هی یا رسول الله قال ما انا علیه واصحابی۔ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ وہ سب جہنم میں جائیں گے سوا ایک کے، پوچھا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون ہیں؟ فرمایا: ما انا علیه واصحابی جس راستہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ (یہی نجات کا راستہ ہے)۔
(ترمذی کتاب الایمان باب ۱۸، حدیث ۲۶۴۱)

دوسری حدیث میں ہے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری امت کے تہتر فرقے ہو جائیں ان میں سے صرف ایک جہنم سے بچے گا باقی سب جہنمی ہیں۔ پوچھا گیا وہ کون ہیں فرمایا: الجماعة وہ جماعت ہے۔'' (ابن ماجہ کتاب الفتن باب ۱۷)

تو اہل سنت و جماعت ہی وہ ناجی فرقہ ہے جو اس معیار نبوی ﷺ پر پورا اترتا ہے کیونکہ ما انا علیه کا معنی سنت رسول ﷺ پر قائم رہنا ہے اور و اصحابی کا معنی جماعت صحابہ کی پیروی ہے۔

اب مقام غور ہے کہ جو لوگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے وہ کس طرح راہ حق پہ قرار دیے جاسکتے ہیں، اور کچھ لوگ ان چیزوں کو شرک سے تعبیر کرتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معمولات میں سے تھیں۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کے توسل سے دعاء کرنا، اسے آج نجدی لوگ شرک قرار دیتے ہیں۔ جبکہ احادیث بھری ہوئی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خود بھی صحابہ کرام کو تعلیم دی کہ آپ کے توسل سے دعاء کی جائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی مشکل میں آپ کے نام نامی اسم گرامی سے توسل کرتے تھے۔

عہد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں ایک شخص کا مسئلہ ان کی طرف سے حل نہیں ہوتا تھا، اسے حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے وہ دعاء سکھلائی جو رسول اللہ ﷺ نے ایک نابینا صحابی کو سکھائی تھی کہ اللهم انی اسئلك واتوجه الیك بنبیك محمد ﷺ نبی الرحمة ان تقضی لی حاجتی، یا محمد انی اتوجه بك الی ربی فی حاجتی هذه۔ یعنی اے اللہ میں تیری بارگاہ میں تیرے رحمت والے نبی محمد ﷺ کے ذریعہ سے دعاء کرتا ہوں کہ تو میری اس حاجت کو پورا

فرمادے، اے محمد ﷺ میں آپ کے وسیلہ سے دعاء کرتا ہوں کہ میری یہ حاجت پوری ہو، جب اس نے یہ دعاء کی تو اس کا مسئلہ فوراً حل ہوگیا۔ امام طبرانی فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔ (طبرانی صغیر جلد اول صفحہ ۸۳ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى
اور یہود کہتے ہیں: عیسائی کچھ نہیں رکھتے اور عیسائیوں نے کہا: یہود کچھ نہیں رکھتے
لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَىْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ
حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کے جیسی بات کہی،
الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا
تو اللہ ان کے مابین روزِ قیامت ان معاملات میں فیصلہ فرمادے گا جن میں
كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾
وہ اختلاف کرتے تھے۔[108]

یہود ونصاریٰ کی اعتقادی خرابیاں

[108] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نجران کے عیسائی جب نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے جیسا کہ ابھی پیچھے آیت ۱۱۱ کے تحت گزرا ہے تو یہودی علماء ان سے ملے اور آپ کی موجودگی میں ان کے مابین جھگڑا ہوا۔ یہودی عالم رافع بن یملہ نے کہا اے عیسائیو! تمہارے پاس کوئی سچی بات نہیں اور میں کسی عیسیٰ یا انجیل کو نہیں مانتا، وفدِ نجران میں سے ایک شخص نے جواب میں کہا۔ اے یہود! تمہارے پاس کوئی سچی بات نہیں اور میں کسی موسیٰ یا تورات کو نہیں مانتا تب اللہ نے یہ آیت اتاری: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَىْءٍ ۙ
(درمنثور نقلاً عن ابن ابی حاتم وابن جریر)

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاری کی اس جاہلانہ گفتگو کے جواب میں فرمایا کہ یہ دونوں گروہ کتاب یعنی تورات وانجیل کے پڑھنے والے ہیں۔ ان دونوں کی تعلیمات یکساں ہیں دونوں میں توحید، رسالت، قیامت، جنت ونار، انبیاء، ملائکہ وغیرہ کا بیان ہے پھر ان کا ایک دوسرے سے کہنا کہ تمہارے پاس کوئی سچی بات نہیں ہے۔ کس قدر جاہلانہ بات ہے۔ اللہ نے انہیں شرم دلاتے ہوئے کہا تم سے پہلے کچھ ان پڑھ لوگوں نے ایسی باتیں کہی تھیں یعنی ہجرت سے قبل مشرکین مکہ نے

جو ان پڑھ تھے کہا تھا کہ محمد ﷺ کے پاس کچھ نہیں ہے مگر وہ تو اَن پڑھ تھے، ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ اگر کتاب والے لوگ بھی ایسی بات کہیں تو ان کے لیے شرم کا مقام ہے۔

یہاں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ عالم کا گناہ جاہل کے گناہ سے بدتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کو یہاں شرم دلائی کہ وہ کتاب کے عالم ہو کر جاہلوں والی بات کہتے ہیں۔ حدیثِ نبوی ﷺ ہے ''سب سے برے لوگ بھی علماء ہیں۔ (اگر وہ اپنے علم پر عمل نہ کریں) اور سب سے اچھے لوگ بھی علماء ہیں۔ (اگر وہ اپنے علم پر عمل کریں)۔'' (دارمی)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ

اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں سے روکے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے اور انہیں خراب

خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى

کرنے کی کوشش کرے؟، ان لوگوں کا حق نہیں کہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر یہ کہ ڈرتے ہوئے آئیں، ان کے لئے

الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ

دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے [109] اور اللہ ہی کے لئے مشرق

وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

و مغرب ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر ہی اللہ کی ذات ہے، بے شک اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ [110]

[109] اس سے کون لوگ مراد ہیں اس بارے میں پہلا قول یہ ہے کہ اس سے نصاریٰ مراد ہیں اور یہ مسجد اقصیٰ کی طرف اشارہ ہے۔ وہ اس طرح کہ جب یہود نے حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کو شہید کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لیے دوڑے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا کر آسمان پہ اٹھا لیا تو یہود پر اللہ کا غضب اترا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مشرک رومی بادشاہ طیطس (Titus) ان پر مسلط کر دیا۔ یہ ۷۰ء کی بات ہے اس نے مسجد اقصیٰ میں یہود کا قتل عام کیا۔ مسجد کو غلاظت سے بھرا۔ اور عیسائیوں کو یہود سے نفرت تھی کہ انہوں نے زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو کیوں شہید کیا ہے، تو انہوں نے طیطس جیسے مشرک بادشاہ کی مدد کی اور مسجد میں اللہ کا ذکر روکنے اور اسے خراب کرنے میں اس کا ساتھ دیا۔ اسے عوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ (ابن کثیر)

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مشرکین مکہ مراد ہیں جنہوں نے واقعہ حدیبیہ میں حضور ﷺ کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکا اور وہاں انہوں نے تین سو ساٹھ بت رکھ کر اسے کفر و شرک کی آماجگاہ بنا دیا۔ یوں اسے خراب و برباد

کرنے کی کوشش کی۔ یہ دونوں اقوال اپنی اپنی جگہ درست ہیں کیونکہ کسی بھی مسجد کا تقدس پامال کرنا اور وہاں سے ذکر الٰہی روکنے کی کوشش کرنا اللہ کے ہاں سب سے بڑا ظلم ہے۔

مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ پیش گوئی کے معنی میں ہے کہ مسجد اقصیٰ یا مسجد حرام کو خراب کرنے والے لوگ عنقریب وہاں داخل ہونے سے روک دیئے جائیں گے اِلّا یہ کہ ڈرتے ہوئے داخل ہوں کہ جو بے اجازت داخل ہونے کی کوشش کرے مارا جائے۔ چنانچہ یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور مسجد حرام ۸ ھ میں مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی اور حکم ہوگیا۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ ''مشرکین نجس ہیں تو اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں۔'' (توبہ:۲۸) اور مسجد اقصیٰ دور فاروقی میں مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئی اور وہاں یہود و نصاریٰ کا داخلہ ممنوع ہوگیا کہ بے اجازت داخل نہیں ہوسکتے، مسلمانوں کا یہ تسلط وہاں تیرہ صدیاں رہا۔ پھر مسلمانوں کی ایمانی کمزوری کے باعث چودھویں صدی میں یہود بیت المقدس پر قابض ہوگئے۔ مگر جلد ہی جلال خداوندی کی تلوار چمکنے والی ہے اور وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ کی وعید پوری ہونے والی ہے۔ نہیں تو ظہور امام مہدی اور نزول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اگر کسی پتھر کے پیچھے یہودی چھپا ہوگا تو وہ پتھر کہے گا، مسلمانو میرے پیچھے یہودی ہے اسے مارو۔ (مسند احمد جلد ا صفحہ ۳۷۵)

مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ میں یہ درس بھی ہے کہ کفار کا حق نہیں کہ مسجدوں میں بے اجازت داخل ہوں۔ یعنی مومنوں میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی حدود ریاست میں کسی غیر مسلم کو بے اجازت گھسنے نہ دیں۔ ورنہ وہ ان کی مسجدوں میں بھی گھس کر انہیں برباد کر ڈالیں گے۔ چنانچہ سپین سے جب مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوا تو وہاں مسجدوں کو اصطبلوں اور اسلحہ خانوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو وہاں اَن گنت مساجد شہید کر دی گئیں۔ چند ہی برس قبل بابری مسجد کو مسمار کیا گیا۔

کافر کا مسجد میں داخلہ جائز ہے:

مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کفار مسجدوں میں آ سکتے ہیں، مگر وہ ڈرتے ہوئے آئیں یعنی اجازت لے کر آئیں دندناتے ہوئے نہ آئیں۔ اس لیے فقہاء نے کفار کے مسجد میں آنے کو جائز رکھا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ پاک ہوں یا ناپاک۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کفار کے وفود آتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں مسجد ہی میں ٹھہراتے تھے، حتیٰ کہ ان میں سے ایک شخص نے ایک بار مسجد ہی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے روکنا چاہا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں منع کر دیا، جب وہ فارغ ہوگیا تو آپ نے اسے بلا کر سمجھایا کہ مساجد اللہ کے گھر ہیں ان میں پیشاب کرنا جائز نہیں ہے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے پیشاب کو صاف کروایا۔ (بخاری کتاب الوضوء باب ۵۸) اور کفار کے مساجد میں داخلہ کے وقت یہ بھی ضروری نہیں کہ انہیں خاص قسم کی موٹی

جرابیں پہنائی جائیں، میں نے ترکی، مصر اور شام میں دیکھا ہے کہ بعض تاریخی مساجد کو دیکھنے کے لیے انگریز آتے ہیں تو انہیں وہاں موٹی جرابیں پہنائی جاتی ہیں، شرعاً یہ غیر ضروری کام ہے۔

آخر میں اللہ نے فرمایا: لهم فی الدنیا خزی الخ کہ جو لوگ مسجدوں کو ویران کریں اور وہاں سے اللہ کا ذکر روکیں ان کے لیے دنیا میں ذلت اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ نے بیت المقدس کی حرمت پامال کی تو ان پر کئی بار ذلت پڑی، مشرکین مکہ نے مسجد حرام کی حرمت مجروح کی تو ذلت کا شکار ہوئے۔ یہی حال ایسی ہر قوم کا ہے اور آخرت کا عذاب الگ ہے۔

مساجد سے عورتوں کو نہیں روکنا چاہیے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ عورتوں کو مسجد میں آنے سے روکنا بھی اس میں شامل ہے۔ حدیث نبوی ہے: لاتمنعوا اماء الله مساجد الله۔ اللہ کی باندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے مت روکو۔ (بخاری کتاب الجمعہ حدیث ۹۰۰) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانا چاہے تو وہ اسے منع مت کرے۔'' (نسائی کتاب المساجد حدیث ۷۰۷) اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ کی باندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے نے سن کر کہا میں تو انہیں ضرور روکوں گا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سخت غضبناک ہو گئے اور فرمایا میں تجھے حدیث سنا رہا ہوں اور تم کہتے ہو میں ضرور روکوں گا۔ (ابن ماجہ کتاب السنہ حدیث ۱۶) اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اس بیٹے سے کلام ترک کر دیا پھر مرتے دم تک اس سے بات نہ کی۔

ان احادیث کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کو مسجد میں آنے سے زبردستی نہیں روکنا چاہئے اور آجکل عورتیں مسجدوں کے علاوہ ہر جگہ جاتی ہیں انہیں کوئی نہیں روکتا تو مسجدوں میں آنے سے روکنا چہ معنی دارد۔ تاہم عورتوں کو بتانا چاہئے کہ ان کی نماز مسجد کی بجائے گھر میں زیادہ افضل ہے۔ اگر وہ مان لیں تو بہتر، ورنہ انہیں روکا نہ جائے کیونکہ روکنا ممنوع ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی مسجد میں نماز با جماعت کے لئے جاتی تھی اسے کہا گیا کہ تم مسجد کیوں آتی ہو جب کہ حضرت عمر کو تمہارا یہ عمل پسند نہیں ہے وہ کہنے لگیں پھر وہ مجھے روکتے کیوں نہیں؟ کہا گیا اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد کہ اللہ کی باندیوں کو اللہ کی مسجدوں سے نہ روکو، حضرت عمر کو روکنے سے منع کرتا ہے۔ (بخاری کتاب الجمعہ حدیث ۹۰۰)

مساجد میں محافلِ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انعقاد:

بعض لوگ مساجد میں محافل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روکتے ہیں حالانکہ یہ محافل اللہ کے ذکر ہی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان محافلِ میلاد میں بکثرت تلاوت قرآن ہوتی ہے پھر قرآن و حدیث کی روشنی میں نظم و نثر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

سیرت مبارکہ اور آپکے مناقب ومحامد بیان کیے جاتے ہیں، تو مسجد میں ان محافل سے روکنا بھی وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ کے زمرہ میں آتا ہے۔

مسجد میں جہری ذکر سے روکنا بھی گناہ ہے:

ذکر اللہ خواہ سری ہو یا جہری بہر حال ذکر اللہ ہے۔ نماز کے بعد ذکر جہری سے بعض لوگ روکتے ہیں، حالانکہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں فرض نمازوں سے سلام پھیرنے کے بعد بلند آواز سے ذکر کرنا معمول تھا۔ (بخاری کتاب مواقیت الصلوۃ حدیث ۸۴۱) تو مسجد میں اس جہری ذکر سے روکنا بھی اس آیت کے تحت سب سے بڑا ظلم ہے۔

[110] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جب ۲ھ میں قبلہ تبدیل ہوا تو یہود بہت سٹپٹائے اور مسلمانوں پر بہت اعتراضات کرنے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرق ومغرب اللہ کا ہے اور تم جدھر رخ کرو ادھر ہی اللہ کی ذات کے جلوے ہیں۔ (ابن کثیر ناقلاً عن الحاکم وابن ابی حاتم والبیہقی) یعنی اللہ نہ بیت المقدس میں ہے نہ کعبہ میں، لہٰذا مشرق ومغرب سمیت ساری جہتیں اللہ کی ہیں۔ جدھر بھی وہ رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے مومنوں پر اس کی اطاعت لازم ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سواری پر نوافل پڑھتے رہتے تھے خواہ سواری کا رخ جدھر بھی ہو۔ اور اسی بارے میں یہ آیت اتری: فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (مسلم کتاب صلوۃ المسافرین)، ایک روایت یہ ہے کہ ایک بار سفر میں اندھیری رات میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی۔ کسی کو معلوم نہ تھا۔ قبلہ کدھر ہے ہر شخص نے اپنے خیال کے مطابق نماز پڑھی تب یہ آیت نازل ہوئی۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (ترمذی کتاب الصلوۃ) یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا گیا کہ جب تمہیں سمت قبلہ معلوم نہ تھی تو جس نے جدھر قبلہ سمجھ کر نماز پڑھی اس کا وہی قبلہ تھا کیونکہ تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی ذات باری تعالیٰ کے جلوے ہیں۔

ان تینوں روایات میں کوئی اختلاف نہیں ممکن ہے یہ تینوں واقعات قریب قریب زمانہ میں وقوع پذیر ہوئے ہوں اور ان تمام کے بعد یہ آیت اتری ہو۔ اس جگہ فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اللہ کا معنی اللہ کی ذات ہے، یعنی تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی ذات ہے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ (الرحمن:۲۷) میں وَجْهُ بمعنی ذات ہے۔

چلتی گاڑی میں عند العذر فرض نماز پڑھنا جائز ہے:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ سے یہ استدلال ہوسکتا ہے کہ جیسے نوافل سواری پر مطلقاً بلا عذر جائز ہیں۔ خواہ سواری کا رخ جدھر ہو جیسا کہ ابھی حدیث گزری اسی طرح عند العذر فرض نماز بھی گاڑی پر جائز ہے۔ خواہ جدھر بھی اس کا

رخ ہو۔عذر یہ ہے کہ سواری سے اترنا ممکن نہ ہو اور گاڑی کا روکنا اختیار میں نہ ہو۔ چنانچہ فتاویٰ قاضی خان، طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح وغیرہ میں اس پر صراحت موجود ہے۔ بلکہ خود قرآن میں اس کا اشارہ ہے۔ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا اَوۡ رُكۡبَانًا ۚ ''جب تم خوف میں ہو تو نماز پڑھو خواہ پیدل یا سوار ہو کر۔'' (بقرہ:۲۳۹) یعنی حالت عذر میں سواری پہ فرض نماز بھی جائز ہے۔

اور ترمذی شریف میں ایک حدیث بھی ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سواریوں پہ نماز پڑھی کیونکہ زمین پہ ہر طرف کیچڑ تھا، انہوں نے سواریوں پہ یوں نماز پڑھی کہ سر کو سجدہ کے لیے رکوع سے زیادہ جھکاتے تھے، (ترمذی کتاب الصلاۃ) خلاصہ یہ ہے کہ جیسے عندالعذر قیام بلکہ رکوع و سجود بھی معاف ہے اور بیماری میں لیٹ کر اشارے سے بھی نماز پڑھی جاتی ہے۔ یونہی عندالعذر استقبال قبلہ بھی معاف ہے۔ اسی لئے شرعی حکم ہے کہ جب قبلہ معلوم نہ ہو تو جدھر دل مانے نماز پڑھ لو۔ معلوم ہوا کہ عندالعذر استقبال قبلہ معاف ہو جاتا ہے۔

ہوائی جہاز اور ٹرین میں نماز پڑھنے کا حکم:

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ہوائی جہاز میں اگر کھڑے ہو کر قبلہ رخ نماز پڑھنے کی بسہولت جگہ ملے تو ایسا کرنا ضروری ہے اگر نہ ملے تو جہاز کی سیٹ ہی پہ بیٹھ کر نماز پڑھی جاسکتی ہے، خواہ جہاز کا رخ جدھر بھی ہو۔ اسی طرح بس یا ٹرین میں بھی نماز قضا کرنے کی بجائے سیٹ ہی پہ بیٹھ کر نماز پڑھی جاسکتی ہے اور ایسی صورت میں سر کے اشارے سے نماز پڑھی جائے اور سجدہ کے لیے سر کو رکوع سے زیادہ جھکایا جائے جیسے رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سواریوں پہ نماز پڑھی تھی۔

فتاوی قاضی خان میں ہے:

فرض نماز سواری پر کسی عذر کے بغیر جائز نہیں ہے اور عذر یہ ہے کہ سواری سے اترنا اپنی جان یا مال کے لیے ہلاکت کا باعث ہو یا زمین پہ کیچڑ ہو یا سواری کا جانور سرکش ہو اگر اتر جائیں تو دوبارہ چڑھنا مددگار کے بغیر ممکن نہ ہو اور مددگار موجود نہ ہو، اگر ان صورتوں میں مسافر نے سواری پہ نماز پڑھ لی بعد میں سواری سے اتر کر پڑھنا ممکن ہو گیا تو اسے نماز کے لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ (فتاوی قاضی خان جلد اول صفحہ ۱۷۱ علی ہامش الھندیہ مطبوعہ کوئٹہ)

تو اسی طرح بسیں ٹرینیں اور ہوائی جہاز یہ سب چیزیں اپنے پروگراموں کے تحت چلتی ہیں، اپنے اوقات پہ چلتی اور رکتی ہیں، ہمارے بس میں نہیں ہے کہ انہیں اپنے وقت کے مطابق چلوائیں اور روکیں یا نماز کے لیے ان کو روک سکیں، تو ان میں سفر کے دوران نماز کا جو بھی وقت آئے گا وہ نماز ان میں پڑھی جاسکتی ہے۔ اگر قیام کے ساتھ نماز کا پڑھنا مشکل ہو تو سیٹ ہی پہ پڑھی جائے۔

اللہ جسم وجسمانیات سے پاک ہے:

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ سے اللہ کا جسمانیت سے پاک ہونا معلوم ہوا، اسے کسی جہت میں مقید ماننا گمراہی ہے۔ اگر کہا جائے کہ پھر دعا کے لیے ہاتھ کیوں اوپر اٹھائے جاتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کی رحمت کے خزانے آسمانوں میں ہیں۔ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ (ذاریات، ۲۲) اس لیے ہاتھ اوپر اٹھائے جاتے ہیں۔ اور یا اس لیے دعا میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں کہ آسمان اللہ کی قدرت کا ہماری نظر میں سب سے بڑا مظہر ہے، دعا میں اوپر ہاتھ اٹھاتے ہوئے کسی مسلمان کے ذہن میں یہ نہیں ہوتا کہ اللہ صرف اوپر ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اور انہوں نے کہا: اللہ کی اولاد ہے، (حالانکہ) اللہ اس سے پاک ہے بلکہ اسی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کے

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا

آگے اطاعت گزار ہیں۔ [111] وہ آسمانوں اور زمین کو نئی طرز پر بنانے والا ہے اور جب وہ کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا چاہے تو

يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اسے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے [112]

[111] یہود و نصاریٰ کی اعتقادی خرابیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اللہ کے لیے اولاد مانتے ہیں۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ (سورہ توبہ، آیت نمبر ۳۰)

جبکہ اللہ اولاد سے پاک ہے۔ اسے اولاد کی کیا ضرورت ہے جبکہ آسمان و زمین کی ہر چیز اس کی ملک میں ہے اور سب مخلوق اس کے آگے طوعاً و کرہاً جھکتی ہے۔ اسلام نے ذاتِ باری تعالیٰ کا جو پاکیزہ تصور دیا ہے وہ کوئی دوسرا مذہب نہیں دے سکتا، قرآن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ماننا اتنا بڑا جرم ہے کہ قریب تھا اس کی نحوست سے آسمان پھٹ جاتے۔ زمین ٹکڑے ہو جاتی اور پہاڑ گر جاتے۔ (مریم: ۹۰)

حدیث شریف میں ہے اللہ سے بڑھ کر کوئی صبر کرنے والا نہیں لوگ اس کے لیے اولاد مانتے ہیں وہ پھر بھی انہیں رزق اور عافیت دیتا ہے۔ (بخاری کتاب الادب، مسلم کتاب المنافقین)

اللہ کے اولاد سے پاک ہونے پہ چند عقلی دلائل:

اللہ کے لئے اولاد نہ ہوسکنے کے چند دلائل ملاحظہ ہوں۔

اول: اللہ کے لیے اولاد ماننے کی صورت میں اس کے لیے بیوی اور میاں بیوی والے تعلقات ماننا پڑیں گے پھر وہ خدا نہیں انسانوں اور جانوروں میں سے کوئی چیز ٹھہرا۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)

دوم: اولاد وہ حاصل کرتا ہے جسے بڑھاپے اور موت کا خوف ہو، تو وہ اولاد حاصل کرتا ہے تاکہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد اس کی جگہ سنبھالے۔ اللہ ہر ضعف اور موت سے پاک ہے۔

سوم: باپ اپنی اولاد کا مالک نہیں ہوتا۔ انہیں قتل، بیچ یا ختم نہیں کرسکتا مگر اللہ ہر ذرے کا مالک ہے اسی لیے یہاں فرمایا گیا: بل له مافي السموات والارض پھر اسے اولاد کی کیا حاجت۔

چہارم: پھر اولاد باپ کی جنس ہوتی ہے، گدھوں، گھوڑوں اونٹوں وغیرہ کی اولاد انہی کی جنس ہے۔ انسانوں میں سید کا بیٹا سید، جاٹ کا جاٹ اور راجپوت کا راجپوت ہوتا ہے۔ اگر اللہ کی اولاد ہو تو وہ اس کی جنس سے ہوگی جبکہ اللہ کی جنس تو کجا کوئی چیز اس کے مشابہ بھی نہیں۔ اسی لیے سورہ اخلاص میں کہا گیا: قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۧ﴿۴﴾

اللہ کو ان ناموں سے پکارنا جائز نہیں جو مخلوق سے خاص ہیں:

جب اللہ اولاد سے پاک ہے تو اللہ کو ایسے ناموں سے پکارنا بھی جائز نہیں ہے جو اللہ کے لیے اولاد ہونے کا وہم پیدا کریں، جیسے عیسائی اللہ کو باپ کہہ کر پکارتے ہیں، یا عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے کوئی جسمانی بیٹا نہیں مانتے مگر اللہ کو ایسے ناموں سے پکارنا جو مخلوق کے ساتھ خاص ہیں جائز ہی نہیں۔ اس میں اللہ کی شان میں بے ادبی ہے۔ اب کیا عیسائی اس بات کو جائز کہیں گے کہ اللہ کو پیار سے چچا جان، دادا جان یا نانا جان کہا جائے اگر یہ جائز نہیں ہے تو اسے باپ کہنا کیسے جائز ہے، اللہ کو سب سے زیادہ اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیار ہے مگر قرآن وسنت میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹا کہہ کر نہیں پکارا نہ کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو باپ کہہ کر پکارا ہے۔

اس جگہ مرزا قادیانی کی گمراہی دیکھو، کہ کہتا ہے اللہ نے اسے یوں کہا:

انت مني بمنزلة ولدي، اے مرزا قادیانی تم میرے لیے میرے بیٹے کی طرح ہو۔

(حقیقۃ الوحی باب ۴ صفحہ ۸۸ مندرجہ روحانی خزائن جلد ۲۲ مطبوعہ لندن)

اس جملہ کے تیور بتاتے ہیں کہ مرزا نے پہلے اللہ کے لیے بیٹا مانا پھر اپنے آپ کو اس سے تشبیہ دی، اندازہ کریں اس سے بڑا کفر کیا ہے کہ اللہ کے لیے اولاد مانی جائے پھر اپنے آپ کو اس سے تشبیہ دی جائے، جبکہ اللہ رب العزت فرماتا ہے:

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۚ﴿۹۱﴾

قریب ہے کہ اس بات کی نحوست سے آسمان گر پڑیں اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ زمین بوس ہو جائیں کہ وہ اللہ کے لیے اولاد مانتے ہیں۔ (سورہ مریم، آیت ۹۱)

مرزا قادیانی کی اللہ رب العزت کے بارہ میں اس قدر جرأت پہ حیرت کی کوئی بات نہیں، جب انسان سے ایمان چھن جائے تو پھر اس سے کچھ بھی متوقع ہے۔

[112] بدیع ابداع سے ہے جس کا معنی کوئی نئی چیز پیدا کرنا جس کی مثال پہلے نہ ہو۔ جیسے قرآن میں ہے: قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ کہہ دیں میں کوئی نیا رسول تو نہیں۔ (احقاف: ۹) تو اللہ کے بدیع ہونے کا یہ معنی ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو نئی طرز پر پیدا کیا پہلے ان کی مثل کچھ موجود نہ تھا جسے دیکھ کر اللہ نے انہیں بنایا ہو۔

لفظ بدیع اور بدعت کا مفہوم:

اسی مفہوم میں لفظ بدعت ہے یعنی دین میں ایسا طریقہ ایجاد کرنا جس کی کوئی مثال یا اصل قرآن وسنت میں موجود نہ ہو۔ حدیث نبوی ہے، (دین میں) نئے امور سے بچو کہ ہر نیا کام بدعت اور گمراہی ہے۔ (نسائی)

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کی یوں تشریح کی، یعنی ہر وہ چیز جو کتاب وسنت اور عمل صحابہ سے موافق نہ ہو۔ آگے وہ فرماتے ہیں کہ اگر دین میں ایسا نیا طریقہ شروع کیا جائے جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو تو وہ عظیم ثواب ہے کیونکہ حدیث میں ہے: جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کیا اسے اپنا ثواب بھی ہوگا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی۔ (ترمذی کتاب العلم، مسند احمد جلد ۲ صفحہ ۵۰۵)

امام قرطبی علیہ الرحمہ کی اس گفتگو سے معلوم ہوا جو لوگ محفل میلاد النبی ﷺ کو یا چالیسواں جیسے سلسلہ ایصال ثواب کو بدعت اور گمراہی کہتے ہیں انہیں دھوکہ ہوا ہے۔ لفظ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ کی روشنی میں بدعت وہ نیا طریقہ ہے جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ یعنی اللہ کو اولاد حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس کے حکم کن سے ہر چیز پیدا ہو جاتی ہے۔

یاد رہے اللہ کے کن کہنے کا یہ معنی نہیں کہ وہ کاف اور نون پر مشتمل لفظ کن بولتا ہے۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ وہ جب کوئی چیز بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ارادے ہی سے وہ چیز بن جاتی ہے۔ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ یعنی اللہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز سے کہنا چاہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ (یٰسین: ۸۲)

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ

اور بے علم لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے

قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا

لوگوں نے بھی انہی جیسی بات کہی تھی۔ ان کے دل باہم ایک جیسے ہیں بے شک ہم نے یقین لانے والی

الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ

قوم کے لئے نشانیاں واضح کردی ہیں۔[113] بیشک ہم نے آپ کو حق دے کر بشارت اور ڈر سنانے کے لئے بھیجا ہے اور آپ سے

عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

دوزخ والوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا۔[114]

[113] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک قول کے مطابق یہود مدینہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اللہ ہم سے براہ راست بات کرے یا ہم پر کوئی بڑی نشانی آئے تب ہم ایمان لائیں گے۔ (تفسیر درمنثور) اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مشرکین مکہ مراد ہیں جنہوں نے کہا۔ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے یا ہم اپنے رب کو براہ راست دیکھیں۔ (فرقان:۲۱) ممکن ہے اس سے دونوں قومیں مراد ہوں کہ دونوں ہی گمراہی میں ایک جیسے تھے۔ مشرکین مکہ تو الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾ کے مصداق تھے ہی، یہود مدینہ بھی اہل کتاب کہلانے کے باوجود لَا يَعْلَمُوْنَ کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ اللہ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ پہلی قوموں کے منکرین بھی ایسی باتیں کہتے اور بے مقصد نشانیاں مانگتے تھے۔ ان کے دل ایک ہی جیسے ہیں۔ حالانکہ یقین لانے والوں کے لیے ہم نشانیاں واضح کر چکے ہیں۔ اگر ایمان لانا مقصود ہے تو پھر نئی نشانیاں مانگنے کی ضرورت نہیں اور اگر کج بحثی مقصد ہے تو پھر ہزار نشانیاں دکھانا بھی لاحاصل ہے۔ سب سے بڑی نشانی تو قرآن ہے۔ ان سے قرآن جیسی ایک سورت لانے کا مطالبہ اور چیلنج کیا گیا مگر وہ عاجز رہے۔ اس لیے دوسری جگہ فرمایا گیا۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ وہ کہتے ہیں اس (رسول) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری جاتی۔ آپ فرمادیں نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں۔ کیا انہیں یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب اتاری ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ (عنکبوت:۵۰)

اس سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ کفر ایک ہی ملت ہے۔ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ سے پتہ چلا سب کفار ہمیشہ ایک ہی بولی بولتے ہیں۔ آج کوئی مسلم حکومت امریکہ کی طرف دیکھ رہی ہے تو کوئی روس یا چائنہ کی طرف مگر وہ آپس میں ایک ہیں ہمیں ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

[114] یعنی اے پیارے محبوب ﷺ ہم نے آپ کو اس لیے نہیں بھیجا کہ کفار کو روز بروز نئی سے نئی نشانیاں دکھائیں۔ اور یوں ان کی سرکشی میں اضافہ ہوتا رہے ہم نے آپ کو دعوت حق دے کر بھیجا ہے تاکہ آپ ایمان لانے والوں کو جنت کی بشارت دیں اور منکروں کو عذاب جہنم سے ڈرائیں اور آپ سے دوزخ والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ ایمان کیوں نہ لائے اور کیوں مستحق جہنم ہوئے۔ آپ نے انہیں دعوت الی الحق دیدی اور بشارت و نذرات کا فریضہ پورا کر دیا۔ اب ان کی فرمائش پوری کرتے ہوئے انہیں نئے سے نیا معجزہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ کفار کو زبردستی مسلمان بنائیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَذَكِّرۡ ۗ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ ؕ﴿۲۱﴾ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ ﴿۲۲﴾ آپ نصیحت فرمائیں کہ آپ کا کام ہی نصیحت فرمانا ہے، آپ ان پہ زبردستی کرنے والے نہیں ہیں۔ (غاشیہ، ۲۲)

حضور ﷺ کے والدین کا اہل ایمان میں سے ہونا:

اس جگہ بعض روایات ہیں کہ ایک بار نبی ﷺ نے فرمایا کاش مجھے معلوم ہو کہ میرے والدین سے کیا معاملہ ہوا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: وَلَا تُسۡـَٔلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۹﴾ (یعنی آپ کے والدین اہل جہنم میں سے ہیں لہٰذا آپ سے ان کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ آپ ان کی فکر نہ کریں۔) امام سیوطی فرماتے ہیں یہ سب روایات ضعیفہ ہیں۔ ان سے استدلال جائز نہیں۔ امام اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آپ ﷺ کے والدین زمانہ فترت میں تھے۔ اہل مکہ کے پاس ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ پھر مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کی تعلیمات ختم ہو گئیں۔ پھر حضور ﷺ کو مکہ میں معبوث کیا گیا تو اس درمیانی مدت کو فترت کہتے ہیں۔ اہل فترت کا توحید پہ قائم رہنا ہی ان کے جنتی ہونے کے لیے کافی ہے۔ حضور ﷺ کے والدین بھی اہل فترت میں سے ہیں۔ لہٰذا ان سے بھی صرف توحید ہی کا سوال ہوگا اور یہ کہیں ثابت نہیں کہ انہوں نے کبھی بت پرستی یا کفر کیا تھا۔ نبی پاک ﷺ کے والد گرامی کا نام عبداللہ ہی ان کے موحد ہونے پر دال ہے۔ (روح البیان جلد اول صفحہ ۲۱۷)

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نبی پاک ﷺ کے والدین بہر حال ناجی (نجات یافتہ) ہیں اور کثیر علماء نے اس کی صراحت کی ہے۔ امام ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آپ ﷺ کے والدین اہل فترت میں سے ہیں اور اہل فترت کو روز قیامت آزمایا جائے گا اگر وہ اسلام پر نکلے تو جنت میں چلے جائیں گے اور یہی گمان ہے کہ وہ امتحان میں مؤمن ثابت ہوں گے۔ (الحاوی للفتاوی جلد ۲ صفحہ ۱۹۶)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہم نے کتاب الذکر میں لکھا ہے کہ اللہ نے حضور ﷺ کے والدین کو پھر زندہ کیا اور وہ

آپ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ (اللہ پر تو وہ پہلے ہی ایمان رکھتے تھے)۔ (تفسیر قرطبی جلد ۲ صفحہ ۱۹۶)

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ

اور یہود تم سے کبھی راضی نہ ہوں گے اور نہ عیسائی یہاں تک کہ تم ان کے دین کی پیروی کر لو، آپ فرما دیں کہ

اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ

اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے اور اگر تم ان کی خواہشات پہ چلے بعد ازاں کہ تمہارے پاس

جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ

علم آ گیا ہے تو تمہارے لئے اللہ کے مقابلہ میں نہ کوئی حمایتی ہو گا نہ مددگار۔ [115] جنہیں ہم نے

اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ

کتاب دی ہے وہ اسے یوں پڑھتے ہیں جیسے پڑھنے کا حق ہے، وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو

يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

اس سے انکار کرے تو وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔ [116]

وقف منزل

ع ۱۴ ۱۴

[115] امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قبلہ تبدیل ہونے سے قبل یہود مسلمانوں سے بہت خوش تھے اور چاہتے تھے کہ وہ بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہیں (کیونکہ یہود کا مرکز عبادت بھی بیت المقدس کے ساتھ ہی ہیکل سلیمانی ہے) مگر جب قبلہ تبدیل ہوا تو یہود بہت مایوس ہوئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ (درمنثور)

یہاں نصاریٰ کا نام اس لیے لیا گیا کہ ان کا سب سے متبرک مقام یعنی جائے پیدائش عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی ارض فلسطین میں ہے جہاں بیت المقدس ہے تو مسلمانوں کا ادھر سے رخ پھیر کر کعبۃ اللہ کی طرف کر لینا عیسائیوں کو بھی ناپسند آیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب کریم ﷺ یہود و نصاریٰ تو آپ سے تب ہی خوش ہوں گے جب آپ ان کا دین اختیار کر لیں لہٰذا آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے دین پر ڈٹے رہیں خواہ آپ کی کوئی بات یہود و نصاریٰ کو کتنی ہی ناگوار گزرے اور فرما دیں کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ بس اسی کی پرواہ رکھنی چاہیے اور اگر تم نے یہود و نصاریٰ کو خوش کرنے کے لئے ان کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کی حالانکہ تمہارے پاس قرآن وسنت کا علم آ گیا اور معلوم ہو چکا کہ اللہ

کی رضا کس چیز میں ہے، تو پھر تمہیں اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی حمایتی یا مددگار نہ ہوگا۔

حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط کے تحت یاد رہے کہ ملت اور دین قریب المعنی ہیں مگر فرق یہ ہے کہ دین کی نسبت اللہ کی طرف بھی جائز ہے اور مخلوق کی طرف بھی جیسے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۞ (سورۃ الکافرون) مگر ملت کی نسبت مخلوق ہی کی طرف کی جاتی ہے جیسے مِلَّتَهُمْ، ملة ابراھیم مگر ملة اللہ نہیں کہا جاتا ہے۔ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ میں صحیح یہ ہے کہ ہر سننے والے کی طرف خطاب متوجہ ہے اور اگر حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہو تو ضروری ہے کہ آپ ﷺ سے خطاب کی صورت میں آپ کی امت مراد ہو۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس جگہ فرماتے ہیں۔ خطاب یہاں رسول ﷺ سے ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

یہاں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اہل اسلام کفار کی خوشنودی مت چاہیں۔

ان کی خوشنودی صرف کفر میں ہے۔ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ط ہمارے لیے تازیانہ عبرت ہے۔ آج ہم کفار کی خوشنودی میں لگے ہیں۔ ہم نے اپنی عورتوں کے سروں سے پردہ کھینچا، نماز ترک کی، انگریزی لباس پہنا، سنت رسول داڑھی مونڈی، اسلامی قوانین کی جگہ عدالتوں میں غیر اسلامی قوانین چلائے، رقص وسرود عام کیا مگر کفار آج بھی ہمارے دشمن ہیں۔ وہ ہم سے تب راضی ہوں گے جب ہم اپنا کلمہ چھوڑ کر ان کا دین اختیار کرلیں۔ تو ہمیں ان کی پرواہ کرنے کی بجائے اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے ہر حکم کی پرواہ رکھنی چاہیے۔

[116] حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ اس سے وہ یہود و نصاریٰ مراد ہیں جو ایمان لے آئیں یعنی انہیں کتاب دی گئی تو انہوں نے اس کی تلاوت کا حق ادا کر دیا اور تلاوت کا حق یہی ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس پر عمل بھی کیا جائے چونکہ تورات وانجیل میں حضور ﷺ کے بارے میں بشارات موجود ہیں تو وہ لوگ انہیں دیکھ کر ایمان لے آئے وہی سچے اہل کتاب ہیں جنہوں نے اپنی کتاب پہ عمل کر دکھایا۔ اللہ فرماتا ہے: يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ز وہ حضور ﷺ کو تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ (انفال: ۱۵۷)

جبکہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس سے اصحاب رسول ﷺ مراد ہیں، گویا معنی یہ ہے کہ انہیں قرآن دیا گیا تو انہوں نے اس کی تلاوت کا حق ادا کر دیا یعنی اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ یاد رہے تلاوتِ قرآن مجید کے حقوق یہ ہیں کہ اس کی ہر آیت کو کامل یقین وایمان کے ساتھ پڑھا جائے۔ باوضو قبلہ رو پڑھنا چاہیے۔ اگرچہ قبلہ رو ہونا ضروری نہیں۔ ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھا جائے تاکہ سمجھ آئے اور عمل کی راہ کھلے، جو پڑھا جائے اس پر عمل کیا جائے اسے دوسروں تک پہنچایا جائے اور اسے درست عربی تلفظ کے ساتھ پڑھا جائے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام فرمائی اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر

عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ

فضیلت دی۔[117] اور اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی (کافر) جان کی طرف سے کوئی بدلہ نہ دے گی اور نہ اس کی طرف سے

مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی شفاعت نفع دے گی اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔[118]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کعبہ اور آمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کرنا

[117] آیت ۴۰ سے لے کر پیش نظر آیت تک اللہ نے بنی اسرائیل کی تاریخ، ان پر ہونے والے انعامات الٰہیہ اور انبیاء کرام سے ان کا معاندانہ رویہ بیان فرمایا۔ اب اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر شروع کیا جا رہا ہے تو آخر میں ایک بار پھر بنی اسرائیل (یعنی یہود) کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائی جا رہی ہیں۔

[118] یعنی اے بنی اسرائیل میں نے تمہیں انبیاء کرام علیہم السلام اور کتب سماویہ کے ذریعے راہِ حق دکھا کر تمام جہانوں پر فضیلت دی۔ اگر تم اس فضیلت سے محروم نہیں ہونا چاہتے ہو تو اللہ کے آخری رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن پکڑ لو ورنہ اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی (کافر) جان کے کچھ کام نہ آسکے گی اور نہ ہی اس کافر جان کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کر کے اسے چھوڑا جائے گا اور نہ ہی اسے کوئی شفاعت بچا سکے گی اور نہ ہی کوئی اس کی مدد کو وہاں تیار ہوگا۔

پیچھے اسی مفہوم والی آیت ۴۸ میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہ آیت یہود جیسے کفار کے لیے ہے کہ ایسے کافروں کی شفاعت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ رہے مومنین تو ان کی شفاعت خود سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے شروع ہوگی اس کے بعد انبیاء، اولیاء، شہداء و دیگر مقبولانِ خدا شفاعت کریں گے اور ان کی شفاعت قبول ہوگی۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ

اور جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے چند کلمات سے آزمایا تو انہوں نے وہ پورے کر دکھائے،[119] اللہ نے فرمایا میں آپ کو لوگوں

اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

کیلئے امام بنانے والا ہوں،[120] انہوں نے عرض کیا: اور میری اولاد میں سے بھی؟ اللہ نے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں ملے گا۔[121]

[119] ذکر بنی اسرائیل کے بعد یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر شروع کیا جارہا ہے۔ یاد رہے ذکر بنی اسرائیل و ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان چند وجوہ سے مناسبت ہے۔

اول: یہود و نصاریٰ اپنے دل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بے حد تعظیم رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کے جداعلیٰ ہیں۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں اور یہود خود کو بنی اسرائیل کہہ کر انہی کی اولاد ہونے کے ناطے دوسروں پر اپنی فضیلت جتاتے ہیں۔ تو یہود کو دعوت حق دی گئی کہ انہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کرنے کے بعد محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی دعا کی تھی اب جب وہ آگئے ہیں تو یہود کو ان کی دشمنی کرنے کی بجائے ان پر ایمان لانا چاہیے۔

دوم: تبدیلی قبلہ کے موقع پر یہودی بہت سٹپٹائے تھے۔ آگے چل کر دوسرے پارہ کے آغاز میں اس کی تفصیل آرہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں انہیں سمجھایا ہے کہ کعبۃ اللہ کے قبلہ بنائے جانے پر وہ کیوں معترض ہیں۔ یہ کعبہ انہی کے جداعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنایا ہوا ہے۔ پھر انہیں اس پر معترض ہونے کی کیا ضرورت ہے، اس لیے یہاں تعمیر کعبہ کی بات شروع کی جارہی ہے۔

سوم: بتایا جارہا ہے کہ اے یہود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تمہارے ہی جداعلیٰ کی نسل سے ہیں پھر تم ان سے کیوں حسد رکھتے ہو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے جداعلیٰ کی نسل میں اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسے سید المرسلین کو مبعوث فرمایا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعارف:

لفظ اِبْرٰهِمَ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں اس کا معنی اَبٌ رَحِيْمٌ ہے۔ یعنی رحم دل باپ اور ان دونوں کا تلفظ بھی باہم قریب تر ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا رحمدل باپ ہونا اس روایت سے بھی واضح ہے جسے احمد و حاکم نے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کے جو چھوٹے بچے بچپن میں فوت ہو جاتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی حضرت سارہ رضی اللہ عنہا جنت میں ان کی کفالت کرتے ہیں اور تا قیامت کرتے رہیں گے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۲۸۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سن پیدائش جدید تحقیق کے مطابق ۱۹۲۲ قبل مسیح ہے۔ آپ کی عمر تورات کے مطابق ۱۷۵ برس تھی۔

آپ کے والد کا نام تارخ ہے، آزر آپ کا چچا ہے۔ آپ عراق میں بابل کے قریب ایک شہر اُر میں پیدا ہوئے۔

وہیں جوان ہوئے جب آپ نے اپنی قوم کے بت توڑے تو نمرود بادشاہ نے آپ کو آگ میں پھینکا اللہ نے اسے آپ پر گلزار بنا دیا۔ اس کے بعد نمرود ذلت کی موت مرا اور ابراہیم علیہ السلام کو حکمِ ہجرت ہوا آپ اپنی بیوی سیدہ سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مصر گئے۔ وہاں سے فلسطین کا رخ کیا اور وہیں سکونت اختیار فرمائی۔ اس دوران اللہ نے آپ کو سرزمین مکہ میں تشریف لے جانے اور کعبۃ اللہ تعمیر کرنے کا حکم فرمایا۔ جس کا آگے ذکر آ رہا ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کن کلمات سے آزمایا گیا، اس کی مختلف تفسیریں:

اس آیت میں ان کی یہ فضیلت بتائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چند کلمات سے آزمایا جو انہوں نے پورے کر دکھائے۔ اب ان کلمات سے کیا مراد ہے جن کے ذریعہ ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلا قول یہ مروی ہے کہ ان کلمات سے یہ امتحانات مراد ہیں کہ پہلے آپ کو اپنی قوم سے علیحدگی کا حکم ملا۔ آپ نے فوراً علیحدگی کر لی، پھر نمرود سے ٹکرانے کا حکم ہوا آپ ٹکرا گئے۔ پھر آپ کو آگ میں ڈالے جانے کا حکم ہوا تو آپ اس کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا تو آپ وطن چھوڑ کر چل دیئے۔ پھر آپ کو بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تو آپ تیار ہو گئے۔ (ابن کثیر جلد اول صفحہ ۱۸۵)

دوسرا قول یہ مروی ہے آپ کو طہارت جسمانی کے دس احکام ملے۔ جیسے مونچھیں تراشنا، موئے زیرناف صاف کرنا، ختنہ کرنا، بغلوں کے بال صاف کرنا اور استنجاء کے بعد جسم کو پانی سے صاف کرنا، حدیث صحیح ہے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ختنہ کا حکم ہوا تو آپ نے تیس برس کی عمر میں تیشے کے ساتھ اپنا ختنہ کیا۔ (بخاری کتاب احادیث الانبیاء)

تیسرا قول یہ ہے کہ آپ کو تیس اخلاقیات سے آزمایا گیا۔ جو آپ نے اپنے اندر پیدا فرمائیں۔ ان میں سے دس سورہ توبہ آیت ۱۱۲ میں مذکورہ ہیں، (یعنی توبہ، عبادت، حمد، روزہ، رکوع، سجود، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، محافظت حدود خدا اور ایمان) دس سورہ مومنون آیت ۱ تا ۹ میں ہیں (یعنی ایمان، خشوع، نماز، لغو باتوں سے اعراض، ادائیگی زکوٰۃ، بے حیائی سے اجتناب، پاکدامنی، امانت، وعدہ وفائی، اور محافظت صلوٰۃ) اور دس سورہ احزاب آیت ۳۵ میں، (یعنی اسلام، ایمان، اطاعت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، روزہ، پاکدامنی اور ذکر اللہ)

چوتھا قول یہ ہے کہ آپ کو مناسک حج کا حکم ہوا۔ جیسے اللہ فرماتا ہے:

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ (سورہ حج: ۲۷)

ان چاروں اقوال میں کوئی تضاد نہیں، ممکن ہے ان سب سے آپ کو آزمایا گیا ہو، کیونکہ یہ سب باتیں بِكَلِمٰتٍ میں داخل ہو سکتی ہیں۔ البتہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک مجلس میں بعض چیزیں بیان کیں تو دوسری مجالس میں بعض دوسری چیزیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے خلیل کو جس بھی آزمائش میں ڈالا انہوں نے اس میں سو فی صد کامیابی

حاصل فرمائی، انسان کو تین چیزیں سب سے زیادہ پیاری ہوتی ہیں، جان مال اور اولاد۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان تینوں چیزوں سے آزمایا گیا، جان کے ذریعے یوں آزمایا گیا کہ جب آپ کو نار نمرود میں ڈالا جارہا تھا تو جبریل امین علیہ السلام بحکم خداوندی نازل ہوئے، عرض کیا اگر آپ کو میری کچھ ضرورت ہو تو بتائے فرمایا: اما الیك فلا، اے جبریل امین علیہ السلام آپ سے میری کوئی حاجت وابستہ نہیں، یعنی میری جملہ حاجات اللہ سے وابستہ ہیں، یعنی آپ اللہ کی رضا پہ آگ میں کود گئے۔

پھر جب اولاد کے ذریعے آزمانے کی بات آئی تو اسی برس کی عمر میں اللہ نے آپ کو اسماعیل علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا، ابھی وہ چند ہی ایام کا تھا کہ حکم ہوا اس بچے اور اس کی والدہ کو اٹھالو اور جہاں آج مکہ ہے وہاں چھوڑ آؤ، حالانکہ وہاں اس وقت کوئی انسان نہیں رہتا تھا، بلکہ وہاں زندگی کے کوئی آثار بھی نہ تھے، مگر اللہ کا خلیل اللہ کے حکم پہ تیار ہو گیا اور اللہ کا حکم پورا کر کے چھوڑا، پھر اسی بیٹے کو حکمِ خداوندی پہ ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو آپ اس پہ بھی تیار ہو گئے۔

مال کے ذریعے یوں آزمایا گیا کہ فرشتے نے انسانی شکل میں اللہ کے نام پہ مانگا تو آپ نے سارا مال پیش کر دیا۔

[120] جب آپ نے وہ سب کلمات پورے کر دکھائے یعنی اللہ کے ہر حکم اور ہر آزمائش کو پورا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا اے ابراہیم میں تجھے لوگوں کا امام بنا رہا ہوں، اب ظاہر ہے کہ نبی تو آپ پہلے تھے ہی، پھر آپ کو یہ امامت کس معنی میں دی گئی تو اس کے تین مظاہر ہیں:

اول؛ سب اقوام و ادیان میں آپ کا احترام رکھا گیا: حتیٰ کہ یہود نے انہیں فرط محبت میں یہودی اور عیسائیوں نے انہیں عیسائی قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انکار فرمایا: مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ یعنی ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ عیسائی، وہ تو ہر باطل سے متنفر مسلم تھے۔ (آل عمران، ۶۷) مشرکین عرب بھی آپ کی نسبت سے عظمت ڈھونڈتے تھے اور امتِ محمدیہ بھی خود کو ملتِ ابراہیمی کہنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ گویا آپ کو امامت کا منصب اس معنیٰ میں دیا گیا کہ ہر قوم آپ کی نسبت سے عزت و افتخار ڈھونڈنے لگی۔

دوم: جد الانبیاء ہونا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ عظیم امامت دی کہ آپ کے بعد جتنے انبیاء آئے سب آپ کی پشت میں رکھ دیئے گئے اور سب کتابیں آپ کی اولاد ہی پر نازل ہوئیں۔ اللہ فرماتا ہے: وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ، ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔ (عنکبوت، ۲۷) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا باقی سب انبیاء آپ کے بیٹے اسحاق علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکیلے اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے۔

سوم: آپ علیہ السلام کی شریعت کے کئی احکام اللہ نے ہمیشہ زندہ رکھے: حتیٰ کہ انہیں آخری شریعت، شریعت محمدیہ میں بھی نافذ رکھا مثلاً حج کے مناسک، قربانی، ختنہ، اور جسمانی صفائی کے دیگر احکام، الغرض آپ کے بعد آنے والی نسلوں اور قوموں نے آپ کی اتباع کی اور آپ کی عظمت کے آگے اپنے سر جھکائے، یہ ہے: اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

میں نے ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ کی شان میں ایک منقبت منظوم کی ہے، وہ میں اس جگہ لکھنا چاہتا ہوں یقیناً اس

کے پڑھنے سننے سے ایمان کو جلاء ملے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ، تو میں نے عرض کیا ہے۔

کیا شان میں بتاؤں جنابِ خلیل کی — بعد از حبیب رب ہے عظمت خلیل کی
رکھی گئی نبوت نسل خلیل میں — قرآں بتا رہا ہے امامت خلیل کی
جائے نماز ان کا ہے نقش قدم بنا — کیسی عظیم تر ہے نسبت خلیل کی
توڑا بتان قوم کو رب کے خلیل نے — اللہ رے بسالت وجرأت خلیل کی
آتش کدے میں کود گئے بہر رضائے حق — یہ ہے خدا سے الفت وخلّت خلیل کی
رکھدی چھری خلیل نے بر گردن پسر — قربانی یوں بنی ہے سنت خلیل کی
کعبہ بنایا آپ نے اور حج کیا شروع — تابندہ کس قدر ہے سیرت خلیل کی
کرتے ہیں ابراہیم دعائے رسول پاک — وابستہ مصطفیٰ سے ہے حاجت خلیل کی
سرکار نے نوازا ہے طیبؔ خلیل کو — رکھی ہے ہر نماز میں دعوت خلیل کی

[121] جب آپ کو مذکورہ امامت عطا فرمائی گئی تو آپ نے دعا کی اے اللہ میری اولاد میں سے بھی ایسے لوگ پیدا فرما جو دینی سیادت اور مذہبی امامت پر فائز ہوں اور خلق خدا کی رہنمائی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہاں آپ کی اولاد میں سے کئی لوگوں کو یہ امامت دی جائے گی۔ مگر ظالموں کو یہ عہد نہیں ملے گا یعنی کافروں، مشرکوں اور بد کرداروں کو امامت نہیں دی جائے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں کونسی امامت رکھی گئی؟

اب یہاں کون سی امامت مراد ہے جو آپ کی اولاد میں رکھی گئی اور ظالم لوگ اس سے محروم رکھے گئے؟ تو شیعہ لوگ اس سے ایک خاص قسم کی امامت مراد لیتے ہیں جو نبوت و رسالت سے بھی اونچا منصب ہے۔ پھر وہ اسے اپنے مقرر کردہ بارہ اماموں تک کھینچ کر لاتے ہیں۔ مگر یہ سب غلط ہے، خود قرآن کی روشنی میں یہاں اللہ کے عہد سے نبوت مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم میرا عہد یعنی نبوت کا منصب ظالموں کو نہیں ملے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول کرتے ہوئے آپ کی ذریت میں نبوت رکھدی اور جسے نبوت دی جاتی ہے وہ ہر ظلم سے پاک ہوتا ہے (اس طرح یہ آیت عصمت نبوت کی دلیل ہے) جیسے فرمایا گیا **وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ** یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں نبوت اور کتاب رکھ دی (عنکبوت:۲۷) دوسری جگہ فرمایا گیا: **وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ**، اور ہم نے نوح اور ابراہیم علیہما السلام کی ذریت میں نبوت اور کتاب رکھدی (حدید،۲۶) اب حضرت نوح علیہ السلام کی ذریت میں نبوت و کتاب کا رکھا جانا اس معنی میں ہے کہ وہ آدم ثانی ہیں، جب ان کے بعد ساری انسانیت ان کی ذریت سے ہے تو نبوت بھی انہی کی ذریت میں رکھی گئی اور کتابیں بھی انہی

کی ذریت میں اتاری گئیں۔ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں نبوت وکتاب کا رکھا جانا اس معنی میں ہے کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کی ذریت میں امامت رکھی جائے تو اللہ تعالیٰ نے نبوت وکتاب کی صورت میں تاقیامت امامت کو ان کی ذریت میں رکھ دیا۔

چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام تک تمام انبیاء کرام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں آتے رہے، جبکہ آخری نبی محمد مصطفیٰ ﷺ آپ کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں تشریف لائے، اور ان پہ دین کو مکمل کر دیا گیا، اب تاقیامت انہی کی نبوت جاری ہے، اور انہی کی کتاب نافذ ہے، لہٰذا جس امامت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی وہ اللہ نے نبوت کی صورت میں ذریت ابراہیمی میں تاقیامت جاری کر دی، اور چونکہ خاتم النبیین ﷺ پر دین کو مکمل کر دیا گیا ہے اس لیے آپ کے بعد نہ کوئی نبوت ہے نہ کوئی ایسی امامت کہ جسے مانے بغیر مومن کا دین مکمل نہ ہو۔

اس آیت کا یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ لا ینال عھدی الظالمین میں اللہ کے عہد سے امامت مطلقہ مراد ہے یعنی مطلقاً مسلمانوں کی پیشوائی خواہ وہ نبوت ہو، حکومت وخلافت ہو یا نماز با جماعت کی امامت، گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی ظالم شخص کو جو اللہ کے حقوق یا بندوں کے حقوق پامال کرتا ہے کسی معنیٰ میں مسلمانوں کی پیشوائی نہیں مل سکتی، نبوت کا تقرر تو اللہ کی طرف ہوتا ہے، اور اللہ جس کو منصبِ نبوت دیتا ہے اسے ظلم وجور سے پاک فرماتا ہے، اور بندوں کے لیے بھی جائز نہیں کہ کسی ظالم کو حاکم بنائیں یا کسی معنی میں اپنا پیشوا قرار دیں، اس معنیٰ کے مطابق کسی فاسق وفاجر کو حاکم یا امام یا پیر ومرشد بنانا جائز نہیں، تاہم پہلا معنیٰ زیادہ قوی اور خود قرآن سے مؤید ہے۔

قال ومن ذریتی سے اہل تشیع کا بارہ اماموں کی امامت پر غلط استدلال

اہل تشیع کہتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس نبوت ورسالت تو پہلے ہی تھی، اس کے بعد آپ کو امام بنایا گیا لہٰذا امامت نبوت سے ہٹ کر ایک منصب ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے لیے مانگا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرا عہد یعنی امامت کا منصب ظالموں کو نہیں ملے گا، معلوم ہوا کہ جب تک دنیا میں ذریت ابراہیمی موجود ہے منصب امامت جاری رہے گا اور وہ نبوت کے علاوہ ہے، لہٰذا وہ بارہ اماموں کی امامت ہے تو اس کا منکر کافر ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے ابھی قرآن کی روشنی میں جو گفتگو کی ہے اس سے خوب واضح ہو گیا ہے کہ یہاں امامت سے نبوت ہی مراد ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے لیے نبوت کی دعا کی جو اللہ نے قبول فرمائی اور وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ کہہ کر اس کی قبولیت کا اعلان فرمایا، اب قیامت تک جاری رہنے والی نبوت محمدیہ کی صورت میں ذریت ابراہیمی کے لیے اللہ کی عظیم ترین نعمت موجود ہے، جس میں ساری انسانیت کے لیے کامل ھدایت ہے اس کی موجودگی میں مزید کسی من گھڑت امامت کی ضرورت نہیں ہے کہ اُسے مانے بغیر انسان مسلمان نہ ہو سکے۔

اس جگہ ہم اہل تشیع سے سوال کرتے ہیں کہ اگر ذریت ابراہیمی میں اللہ تعالیٰ نے نبوت سے ہٹ کر کوئی امامت جاری کی ہے جو نبوت سے بھی بلند تر منصب ہے تو اللہ نے نبوت کے ساتھ اس کا ذکر کیوں نہیں کیا، کیا شیعہ لوگ پورے قرآن میں سے ایسی آیت بتا سکتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ھو وجعلنا فی ذریۃ ابراھیم الامامۃ والنبوۃ، کہ ہم نے ذریت ابراہیمی میں امامت اور نبوت جاری کر دی تو اہل تشیع سیدھی طرح کیوں نہیں مان لیتے کہ ان کی خودساختہ امامت کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بقول شیعہ بارہ اماموں سے حسد کرنے والے انبیاء کو سزائیں دی گئیں (معاذ اللہ):

اس جگہ اہل تشیع نے بارہ ائمہ اہل بیت کی امامت کو نبوت سے بڑا درجہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اہل تشیع نے اہل بیت رسول ﷺ میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سمیت بارہ افراد کو اپنی مرضی سے منتخب کر کے انہیں امامت کا درجہ دے دیا ہے اور وہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط سے استدلال کرتے ہوئے اس امامت کو نبوت و رسالت سے بہت بڑا درجہ قرار دیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ غلو کی اس حد تک گئے کہ کہا انبیاء کو نبوت بھی انہی بارہ اماموں کے صدقے میں ملی حتیٰ کہ انبیاء کو ان اماموں سے حسد ہو گیا تو جس جس نبی نے ان سے حسد کیا اللہ نے اسے مصائب میں مبتلا کر دیا اور تب چھوڑا جب اس نے توبہ کی۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے حسد کیا تو وہ دانۂ گندم کے کھانے میں مبتلا ہوئے اور انہیں جنت سے نکالا گیا (حیات القلوب جلد اول ص ۴۹ مطبوعہ تہران)

حضرت نوح علیہ السلام مبتلائے گرداب ہوئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نارِ نمرود میں ڈالا گیا، (اس کا معنی تو یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام بھی درجہ امامت نہیں رکھتے)۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو چاہ کنعان میں پھینکا گیا، حضرت ایوب علیہ السلام بیماری میں مبتلا ہوئے، حضرت داؤد علیہ السلام سے خطا ہوئی اور حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ڈالا گیا اور اس سب کا سبب یہ تھا کہ اللہ نے ان انبیاء پر بارہ اماموں کی امامت پیش کی کہ اسے قبول کرو انہوں نے انکار کیا تو اللہ نے انہیں ان مصائب میں مبتلا کر دیا جب انہوں نے توبہ کی اور ان کی امامت کو تسلیم کیا تو اللہ نے انہیں معافی دی اور مصائب کو دور کر دیا۔

(انوار نعمانیہ مصنفہ شیعہ عالم نعمت اللہ جزائری ص ۸ مطبوعہ ایران طبع قدیم)

اس جگہ نعمت اللہ جزائری نے ایک من گھڑت حکایت بھی لکھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے ان کی امامت کی دلیل مانگی تو وہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو سمندر پر لے گئے اور حضرت یونس علیہ السلام والی مچھلی کو پکارا تو ایک مچھلی نے پانی سے سر نکالا جو پہاڑ سے بلند تھا پھر حضرت زین العابدین کے پوچھنے پر مچھلی نے بتایا کہ جب حضرت یونس علیہ السلام نے آئمہ اہل بیت کی امامت کو قبول نہ کیا تو اللہ نے مجھے ان کے نگلنے کا حکم دیا میں نے ان کو نگل لیا اور چالیس دن تک اپنے پیٹ میں رکھا، جب انہوں نے آپ کی امامت کا اقرار کیا تو اللہ نے مجھے حکم دیا کہ انہیں سمندر کے کنارہ پر اُگل دو تو میں نے اگل دیا اور اللہ نے ہر نبی کے ساتھ یہی معاملہ کیا۔ (انوار نعمانیہ ص ۸)

مگر ایسے نظریات وخیالات سراسر کفریہ ہیں، کسی غیر نبی کو انبیاء کرام علیہم السلام کے برابر یا ان سے افضل کہنا کفر ہے۔
قرآن فرماتا ہے: وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ یعنی ہم نے تمام انبیاء کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔
(انعام:۸۶) اور امام حضرت باقر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جس نے ہم اہل بیت کو انبیاء کا درجہ دیا (یعنی ان کے برابر کیا) اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جو اس میں شک کرے اس پر بھی اللہ کی لعنت ہے۔ (رجال کشی ص ۲۵۵ مطبوعہ کربلا) خلاصہ یہ ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط کا اہل تشیع کی خود ساختہ امامت سے کوئی تعلق نہیں۔

جتنی بڑی شان اتنا بڑا امتحان:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چونکہ پچھلی تمام نسلوں کا امام بنایا جانے والا تھا اس لیے انہیں سخت کلمات سے آزمایا گیا۔ اسی طرح ہر نبی کو امتحان میں ڈالا گیا اور حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام سب سے بلند ہے۔ اس لیے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مصائب اور آزمائشیں بھی سب انبیاء کرام علیہم السلام سے زیادہ ہیں اور حدیث میں ہے سب سے زیادہ مصائب انبیاء پر آئے پھر ان پر جو ان کے بعد تھے۔ (ترمذی کتاب الزہد) اس میں یہ درس ہے کہ مصائب میں ثابت قدم اور صابر و شاکر رہنا چاہیے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ سے بڑے درجات ملتے ہیں۔

عصمتِ انبیاء کرام علیہم السلام:

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ میں عہد سے مراد قرآنی آیات کی روشنی میں نبوت و رسالت ہے، معلوم ہوا کہ اللہ جس کے سر پہ تاج نبوت رکھتا ہے اسے ہر ظلم سے پاک کر دیتا ہے، اور ہر گناہ ظلم ہے، کیونکہ جو شخص گناہ کرتا ہے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، اللہ فرماتا ہے: وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ط جو شخص اللہ کی حدود سے تجاوز کرے وہ اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ (طلاق،۱) معلوم ہوا کہ ہر نبی ہر قسم کے گناہ اور حدود اللہ سے تجاوز کرنے سے پاک ہوتا ہے۔

بدن کی صفائی فطرت اسلام کا حصہ ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جن امتحانات سے گزارا گیا ان میں بدن کی صفائی کے احکام بھی تھے۔ ان میں ختنہ بھی شامل ہے۔ اس کے بغیر بدن کا پاک رکھنا مشکل ہے اور ناخن تراشنا، بغلوں کے اور زیر ناف بالوں کا صاف کرنا اور استنجاء کرنا دینِ اسلام کے اہم احکام ہیں دوسرے ادیان طہارت کے اس تصور سے محروم ہیں۔ حدیث میں ان چیزوں پر بہت زور دیا گیا ہے۔

سیدہ عائشہ اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
دس چیزیں فطرت اسلام کا حصہ ہیں، مونچھیں کترانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا (وضو میں) ناک میں پانی ڈالنا، ناخن تراشنا، ہاتھوں پیروں کی انگلیوں کے جوڑ دھونا، بغلیں صاف کرنا، زیر ناف بال مونڈنا، پانی سے استنجاء کرنا اور وضو

میں کلی کرنا (مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی ابن ماجہ) اب ان سب چیزوں کا بدن کی صفائی سے تعلق ہے البتہ داڑھی رکھنا الگ حکم ہے، اور اسے بھی فطرت اسلام کا حصہ بنایا گیا ہے۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ
اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کیلئے مرکز عبادت اور جائے امن بنایا اور اے مؤمنو! مقام ابراہیم علیہ السلام کو
مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ
جائے نماز بناؤ، [122] اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا کہ میرے گھر کو طواف کرنے، اعتکاف کرنے
وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾
اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔ [123]

[122] حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے مرکز عبادت بنایا یعنی اس کے حج کا سلسلہ شروع کیا۔ مَثَابَةً ثاب یثوب سے اسم ظرف بمعنی لوٹنے کی جگہ ہے کہ لوگ بیت اللہ کی طرف لوٹ لوٹ کر جاتے ہیں، اسکا مرکز عبادت ہونا اس معنی میں بھی ہے کہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔

اس دعا ابراہیمی فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىْٓ اِلَيْهِمْ (سورہ ابراہیم، آیت نمبر ۳۷) کی برکت سے بیت اللہ کی رونق بڑھتی جارہی ہے اور مَثَابَةً لِّلنَّاسِ کا جلوہ نمودار ہورہا ہے۔

پھر بیت اللہ کو جائے امن بنایا گیا۔ اس سے مراد وہ تمام حدود حرم ہیں جو شہر مکہ کے آس پاس چاروں طرف پھیلی ہیں کہیں دو میل کہیں تین میل کہیں زیادہ، یہاں قتال حرام ہے، شکار حرام ہے۔ بلکہ وہاں کے خودرو پودے اور درخت کاٹنا بھی حرام ہے گویا وہاں کے انسانوں جانوروں اور درختوں سب کو امن حاصل ہے۔ اللہ فرماتا ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا (عنکبوت: ۶۷) وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴿۳﴾ (سورہ التین، آیت نمبر ۳)

آگے فرمایا گیا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ چونکہ پیچھے بیان ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں کا امام بنایا گیا۔ تو اب اس کی ایک جھلک دکھائی جارہی ہے کہ حکم ہوا اے طواف کرنے والو طواف کے بعد مقام ابراہیم پر نماز پڑھو۔ یعنی اس پتھر کے قرب میں نماز پڑھو جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے، اور یوں امامت ابراہیمی کو سلام پیش کرو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی نشانی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا: فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ ''کعبہ شریف میں اللہ کی

واضح نشانیاں ہیں جیسے مقام ابراہیم۔'' (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۹۷)

مقام ابراہیم علیہ السلام والے پتھر کی عظمت:

حضرت سدی رضی اللہ عنہ تابعی سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب دوسری بار اس جگہ تشریف لائے جہاں آج کعبہ ہے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی نے عرض کیا آپ سواری سے اتر کر غسل کر لیں، سر دھوئیں اور آرام کریں۔ آپ نے فرمایا مجھے اترنے کی اجازت نہیں۔ اس نے کہا آپ زمین پر نہ اتریں اس پتھر پر پاؤں رکھ لیں۔ آپ نے اس پر ایک قدم رکھا۔ آپ کی بہو نے آپ کا سر ایک طرف سے دھویا۔ اتنے میں آپ کا قدم پتھر میں اتر گیا۔ (پتھر فرط محبت سے موم ہو گیا) پھر آپ نے دوسرا قدم رکھا اور دوسری طرف سے سر دھلوایا تو دوسرا قدم بھی اس میں اتر گیا۔ (تفسیر قرطبی جلد دوم صفحہ ۱۱۳، تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۴۳)

اور حدیث صحیح ہے کہ اس پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر فرمایا۔ (بخاری کتاب احادیث الانبیاء)

یہ پتھر پہلے باب کعبہ کے دائیں طرف میں نصب تھا۔ دورِ فاروقی میں اسے وہاں سے ہٹا کر مطاف میں نصب کیا گیا تا کہ لوگ چاروں طرف سے اسے دیکھ سکیں۔ حدیث میں ہے حجر اسود اور مقام ابراہیم دونوں جنت کے ہیروں میں سے دو ہیرے ہیں۔ (ترمذی کتاب الحج)

حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ حجر اسود اور مقام ابراہیم دونوں روز قیامت ان لوگوں کی گواہی دیں گے جنہوں نے ان کا حق ادا کیا۔ (حجر اسود کو چوما اور مقام ابراہیم کے پاس نماز پڑھی) (درمنثور جلد اول صفحہ ۲۹۰)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الرکن والمقام یاقوتان من یواقیت الجنۃ، یعنی حجر اسود اور مقام ابراہیم دونوں جنتی ہیروں میں سے ہیں، اور اگر اللہ ان کا نور چھپا نہ دیتا تو یہ دونوں مشرق و مغرب تک ساری دنیا کو روشن کر دیتے ہیں۔

(ترمذی کتاب الحج، مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۱۶۹)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کیا باقی چار چکروں میں آہستہ چلے پھر مقام ابراہیم پر دو رکعت پڑھیں اور فرمایا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ

(مسلم کتاب الحج باب حجۃ النبی)

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر طواف کے بعد خواہ وہ فرض ہو یا واجب و نفل، مقامِ ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز واجب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ نماز کبھی ترک نہ کرتے تھے۔ (بخاری کتاب الحج)

یہ دلیل وجوب ہے۔ کیونکہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ کریں کبھی بیان جواز کے لیے بھی ترک نہ فرمائیں اور وہ کام از قسم عبادت ہو از قسم عادت انسانی نہ ہو تو آپ کا یہ عمل اس عمل کو امت کے لیے واجب کر دیتا ہے۔

اگر اژدھام کی وجہ سے مقام ابراہیم کے سامنے جگہ نہ ملے تو ساری مسجد میں کہیں بھی یہ نماز پڑھی جا سکتی ہے۔
(کنز الدقائق کتاب الحج صفحہ ۷۶)

بلکہ بخاری کی ایک روایت کے مطابق عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے طواف کی رکعات مقام ذی طوا میں ادا کیں، اگر مکروہ وقت ہو تو انہیں بعد میں غیر مکروہ وقت میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اگر دو طواف اکٹھے کیے جائیں تو بعد میں چار رکعات پڑھی جائیں مگر بہتر یہ ہے کہ ہر طواف کے بعد الگ دو رکعات پڑھی جائیں۔

اس جگہ مقام افسوس ہے کہ آج ہم دوران طواف کئی لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ عین مقام ابراہیم کے ساتھ کھڑے ہو کر یہ نماز پڑھتے ہیں اور ان کا یہ عمل طواف کرنے والوں کے لیے ایک مصیبت کا باعث بن جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں، یہ جہالت کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے، اور لوگوں کو حج پہ جانے سے قبل مسائل حج کا علم حاصل ہونا چاہیے، یہ کیا ہوا کہ پتہ ہی نہیں حج کیسے کرنا ہے، بس ویزہ لگوایا اور حج کو چل دیئے۔

[123] جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کر دیا اور لوگوں کو حج کے لیے پکارا اور لوگ آنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام دونوں باپ بیٹے کو حکم فرمایا کہ میرے گھر کو طواف و اعتکاف کرنے اور نماز پڑھنے والوں کے لیے پاک رکھیں۔ یعنی اس میں کوئی ظاہری یا باطنی گندگی نہ آنے دیں۔ ظاہری گندگی سے پاک رکھنا یہ ہے کہ عبادت کا مقام صاف ستھرا ہونا چاہیے اور باطنی گندگی سے دور رکھنا یہ ہے کہ اللہ کا گھر اللہ ہی کی عبادت کے لیے خاص رہے۔ وہاں کفر و شرک نہ داخل ہونے پائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد ایک عرصہ تک آپ کی تعلیمات زندہ رہیں پھر وہ زمانہ بھی آیا کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کو کفر و شرک اور بت پرستی کی آماجگاہ بنا دیا گیا۔ اور کعبہ میں بت نصب کر دیئے گئے، آخر رحمت پروردگار جوش میں آئی اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں مبعوث ہوئے اور آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اللہ کے گھر کو بتوں کی نجاست سے پاک کیا۔ اسی لیے جس رات آپ پیدا ہوئے حدیث میں ہے قریش نے کعبہ کے اندر سے آواز سنی۔ اَلْاٰنَ اُطَهَّرُ مِنْ اَنْجَاسِ الْاَصْنَامِ اب مجھے بتوں کی ناپاکی سے پاک کر دیا جائے گا اور کعبہ شریف تین دن تک حرکت کرتا رہا۔ (ولادت رسول کی خوشی میں جھومتا رہا) (خصائص کبریٰ جلد اول صفحہ ۴۵)

تعظیم تبرکات کا استدلال:

مقام ابراہیم ایک پتھر ہی ہے مگر جب اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں لگ گئے تو وہ اس قدر قابل تکریم ہو گیا کہ اس کے قرب میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اس جگہ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ کے تحت فرماتے ہیں۔

اہل اعتبار کے لیے یہاں مقام غور ہے کہ جس جگہ اہل اللہ میں سے کوئی مرد تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جائے وہاں

آسمان سے برکات اترتی ہیں۔ اور دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور وہاں عبادت کا ثواب کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔
(تفسیر مظہری جلد اول صفحہ ۱۲۸)

سعودیہ میں نجدی علماء غار حرا و غار ثور اور مولد النبی ﷺ کی زیارت سے روکتے ہیں۔ یہ ان کی کج فکری ہے جب مقامِ ابراہیم اس قدر متبرک ہے تو جن مقامات کو ان کے سردار سید الانبیاء ﷺ سے تعلق ہے ان کی عظمت کا کیا عالم ہے۔

پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں وَّجَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ میں جہاں رہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے وہیں برکت والا بنایا ہے۔ (مریم:۳۱) اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی برکت کا یہ عالم ہے تو آقائے عیسیٰ علیہ السلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی برکت کا کیا عالم ہوگا۔

فضیلتِ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ:

مقام ابراہیم کو مصلّٰی بنانے کی آیت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے پر نازل ہوئی

وہ کہتے ہیں تین امور میں اللہ نے میری رائے پر قرآن اتارا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم مقام ابراہیم کو جائے نماز نہ بنائیں۔ تب یہ آیت اتری: وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّی ؕ (بقرہ:۱۲۵) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اپنی ازواج کو حجاب کا حکم دیں۔ تو آیت حجاب نازل ہوئی۔ میں نے ازواج رسول ﷺ سے کہا: عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنۡ طَلَّقَکُنَّ اَنۡ یُّبۡدِلَهٗۤ اَزۡوَاجًا خَیۡرًا مِّنۡکُنَّ تو اللہ تعالیٰ نے انہی لفظوں کے ساتھ قرآن اتارا۔
(تحریم:۵) (بخاری کتاب التفسیر سورہ بقرہ باب ۹)

اسی طرح شراب کی حرمت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی رائے ہی پہ نازل ہوئی اس سلسلہ میں تین بار قرآن نازل ہوا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دعا کی اے اللہ شراب کے بارے میں ہماری ہدایت فرمایہ لوگوں کا عقل اور ایمان برباد کرتی ہے، اللہ نے فرمایا: لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرمادیں کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور منافع بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے منافع سے بہت زیادہ ہے (بقرہ آیت، ۲۲۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہنے لگے یا اللہ اس بارے میں ہمیں مزید راہنمائی عطا فرما تب یہ حکم نازل ہوا کہ جب تم نشے میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ (نساء، آیت ۴۳)، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر دعا کہ اے اللہ اس بارے میں مزید راہنمائی فرما، تب یہ آیت اتری کہ شراب اور جوا شیطانی عمل ہیں، تم ان سے باز آجاؤ (مائدہ، ۹۰) تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے یا اللہ ہم باز آگئے (درمنثور جلد اول) معلوم ہوا کہ قرآن کا ایک معتد بہ حصہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق اتارا گیا۔

مساجد کی صفائی کا حکم:

اَنۡ طَهِّرَا بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡعٰکِفِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾ سے مسجدوں کے صاف ستھرا رکھنے بلکہ مطلقاً جائے نماز کے پاک ہونے کا حکم ثابت ہوا۔

حدیث میں ہے جو رضاء الٰہی کے لیے مسجد میں صفائی کرے اللہ اس کی قبر میں نور پیدا فرمائے گا۔

حدیث میں ہے ایک حبشی عورت مسجد نبوی کی صفائی کرتی تھی، وہ رات کو فوت ہوئی تو لوگوں نے اسے رات ہی میں دفنا دیا، اگلے روز رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا آپ کو ساری بات بتائی گئی، آپ ﷺ نے فرمایا تم نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ پھر آپ ﷺ اس کی قبر پہ تشریف لے گئے اور اس کے لیے خصوصی دعاء خیر فرمائی۔

(بخاری کتاب الجنائز حدیث: ۱۳۳۷)

گویا لوگوں کے نزدیک مسجد کی صفائی کوئی بڑا منصب نہ تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے مسجد کی صفائی کرنے والے کی قدر بتائی اور اس کو یہ شرف عطا فرمایا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ
اور جب ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں کو پھل
الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ
عطا فرما یعنی صرف اس کو جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے، اللہ نے فرمایا: اور جو کفر کرے میں
قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾
اسے (بھی) تھوڑا سا سامان زندگی دوں گا پھر اسے عذاب جہنم کی طرف مجبور کر دوں گا اور وہ کیا ہی برا انجام ہے۔[124]

[124] گزشتہ آیت میں وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ کے تحت ہم بتا چکے ہیں کہ ارض حرم کو کس معنی میں جائے امن بنایا گیا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ارض حرم کا جائے امن بنایا جانا ابراہیم علیہ السلام کی دعا سے ہوا ہے۔

یہ دعا اس جگہ ان الفاظ سے ہے رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا جس کا معنی ہے اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہاں اس وقت کوئی شہر نہ تھا اور سورہ ابراہیم آیت ۳۵ میں اسی دعا کے یہ الفاظ ہیں۔ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا کہ اے اللہ اس شہر کو امن والا بنا دے۔ گویا وہاں شہر تھا جس کے جائے امن بنانے کی انہوں نے دعا کی، اب ان میں تطبیق کیسے ہو؟۔

تو امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یوں لگتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا دوبار کی۔ پہلے اس وقت جب آپ نے اپنی بیوی سیدہ ہاجرہ اور بیٹے اسماعیل علیہما السلام کو وہاں لا کر ٹھہرایا تھا جہاں آج کعبہ ہے اس وقت یہاں چٹیل میدان تھا۔ تب آپ نے کہا اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا دے۔ پھر جب تعمیر کعبہ کے بعد یہاں شہر آباد ہو گیا تو آپ یہاں پھر تشریف لائے، (اور آپ یہاں آتے رہتے تھے)، تب آپنے دعا کی اے اللہ اس شہر کو ہمیشہ امن والا رکھنا۔

یہی وجہ ہے کہ دوسری بار دعا کے ساتھ آپ نے یہ بھی کہا

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾ (ابراہیم، ۳۹)

(ظاہر ہے کہ پہلی دعا کے وقت اسحاق علیہ السلام پیدا ہی نہیں ہوئے تھے)۔ امام ابن کثیر کی یہ تحقیق بہت عمدہ ولائق تحسین ہے۔

سرزمین حرم کے جائے امن ہونے کا معنیٰ:

سرزمین حرم کے جائے امن بنائے جانے کا ایک معنی ہم پہلے بتا چکے کہ وہاں کے انسانوں، جانوروں اور درختوں کو امن دیا گیا ہے۔ نہ وہاں لڑائی جائز، نہ شکار کرنا یا درخت کاٹنا جائز۔ اور اس کا جائے امن ہونا اس معنی میں بھی ہے کہ جو اسے برباد کرنا چاہے اللہ اسے برباد کر دیتا ہے۔ یمن کے بادشاہ ابرہہ نے مکہ پر حملہ کرنا چاہا تو اللہ نے اسے راستہ ہی میں تباہ کر دیا۔ اور قربِ قیامت میں دجال ہر جگہ میں جائے گا اور بربادی کرے گا مگر مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔

یزید وحجاج کی مکہ پہ چڑھائی، اور اس جگہ ایک سوال کا جواب

اگر کہا جائے کہ یزید اور حجاج نے مکہ پر حملہ کیا اور وہاں بہت بربادی کی۔ پھر گزشتہ صدی میں محمد بن عبدالوہاب نجدی نے مکہ پر چڑھائی کی اور قتل وغارت کا بازار گرم کیا۔ تو مکہ شہر امن کیسے ہوا؟۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ سیاسی مقاصد لے کر آئے تھے وہ کعبہ وسرزمین حرم کی بربادی کے ارادہ سے نہ آئے تھے اگر لڑے بغیر ان کے مقاصد حاصل ہو جاتے تو وہ وہاں بازار قتل وغارت گرم نہ کرتے۔ ہاں جو اسے برباد کرنے ہی کے ارادہ سے آئے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا، جیسے ابرہہ کعبۃ اللہ کو مسمار اور شہر مکہ کو تباہ کرنے نکلا تو راستہ ہی میں تباہ کر دیا گیا، اور قربِ قیامت میں دجال جب ہر طرف بربادی پھیلاتے ہوئے مکہ ومدینہ کا رخ کرے گا تو روک دیا جائے گا، اور بالآخر تباہ کر دیا جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ یزید وحجاج اور محمد بن عبدالوہاب نے اس جگہ لڑائی شروع کر کے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کر لیا۔

ارضِ حرم کے جائے امن ہونے سے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے کہ جو شخص قصاص یا حد کا سزاوار ہو اور جان بچانے کے لیے حرم میں داخل ہو جائے تو اسے وہاں سے گرفتار نہ کیا جائے، البتہ اسے کھانے پینے کو نہ دیا جائے تا کہ وہ خود گرفتاری پیش کر دے، کیونکہ اللہ فرماتا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ جو شخص حرم میں داخل ہو جائے اسے امن مل جاتا ہے (آل عمران، ۹۷) اور اس چیز پہ عہد جاہلیت کے لوگ بھی عمل کرتے تھے، اگر انہیں ارض حرم میں اپنے باپ کا قاتل نظر آتا تو یوں گزر جاتے جیسے انہوں نے اسے دیکھا ہی نہیں، کیونکہ وہ ارض حرم کو جائے امن قرار دیتے تھے۔

(احکام القرآن للجصاص جلد اول صفحہ ۹۰ مطبوعہ دار احیاء)

اہل مکہ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پھلوں کی فراوانی کی دعاء کرنا:

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی: وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ کہ اے اللہ سرزمین حرم کے رہنے والوں

کو پھلوں کا رزق عطا فرما۔ اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمائی، چنانچہ وہاں ہر وقت چاروں موسموں گرمی، سردی، خزاں اور بہار کے پھل بیک وقت ملتے ہیں حالانکہ وہاں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہوتی ساری دنیا پھل اگاتی ہے مکہ والے کھاتے ہیں۔

قرآن میں ہے: یُّجْبٰۤی اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا حرم کی طرف ہر چیز کا پھل ڈھوڈھو کر لایا جاتا ہے۔ (قصص:۵۷)

اہل مکہ کے لیے پھلوں کی دعا میں بھی امن کی دعا شامل ہے کیونکہ وہاں تو پھل پیدا نہیں ہوتے باہر سے لائے جاتے ہیں اور باہر سے پھل تب ہی آ سکتے ہیں جب مکہ اور اس کے آس پاس امن ہو۔ اگر وہاں فساد رہے اور راستے پرخطر ہوں تو پھل کہاں سے آئے گا۔

مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعائے ابراہیم علیہ السلام کے صدقے ارض فلسطین کا ایک شاداب حصہ اٹھایا اور اسے مکہ کے قریب رکھ دیا جسے طائف کہتے ہیں۔ وہاں کثرت سے پھل پیدا ہوتے ہیں (اور مکہ میں لائے جاتے ہیں)۔ (درمنثور جلد ا صفحہ ۳۰۳) اور یہ حقیقت ہے کہ آج مکہ مکرمہ میں جو پھل بکثرت ملتے ہیں وہ زیادہ تر طائف سے آتے ہیں، حتی کہ بالکل تازہ سبزیاں ملتی ہیں، جیسے ٹماٹر پودینہ وغیرہ۔ حالانکہ مکہ مکرمہ ایک خشک علاقہ ہے، جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ سال میں صرف ایک دو بار ہی ہوتی ہے۔

یہ بھی مروی ہے۔ کہ طائف شہر کو پہلے کعبہ کے گرد سات مرتبہ گھمایا گیا یعنی طواف کروایا گیا پھر اپنی جگہ رکھ دیا گیا۔ اسی لیے اسے طائف کہتے ہیں۔ یعنی طواف کرنے والا۔ (روح البیان جلد اول صفحہ ۲۲۷)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ کہ اے اللہ یہ پھلوں کی دعا میں صرف مومنوں کے لیے کر رہا ہوں۔ یہاں یہ اس لیے کہا کہ جب آپ نے وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ کہہ کر اپنی اولاد کے لیے امامت مانگی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میرا عہد ظالموں کو نہ ملے گا تو اب آپ نے خود ہی صرف مومنوں کے لیے اللہ کا فضل مانگا۔ اللہ نے جواب میں فرمایا میں کافروں کو بھی دنیا میں تھوڑا سا سامان زندگی دوں گا یعنی جو اخروی نعمتوں کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہے۔ پھر انہیں جہنم کی طرف لے چلوں گا جو برا ٹھکانہ ہے۔

انبیاء کی استجابت دعاء:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سرزمین حرم واہل مکہ کے لیے جو دعائیں کیں وہ اللہ نے من وعن قبول فرمائیں اور یہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نہیں، ہر نبی کی یہ عظمت ہے کہ اللہ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعا رد نہیں فرماتا۔ انبیاء کا منصب تو بہت عظیم ہے۔ ایک بندۂ مومن جب نوافل کے ذریعہ قرب الٰہی پالیتا ہے تو اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے: ان سألني لاعطینه، اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے تو میں اسے ضرور عطا کرتا ہوں (بخاری کتاب الرقاق باب ۳۸) جب ایک عام بندۂ مومن کی یہ شان ہے

تو انبیاء کی دعاء کا کیا کہنا۔

شان نبوت کے گھٹانے والے بعض کم فہم لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کی عدم قبولیت کا حوالہ دیتے ہیں حالانکہ وہ دعا رد نہیں کی گئی تھی کیونکہ انہوں نے دعا کی ہی نہیں تھی بلکہ صرف پوچھا تھا: رب ان ابنی من اھلی کہ اے اللہ میرا بیٹا میرے اہل خانہ میں سے تھا وہ کیوں ہلاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا وہ آپ کے اہل میں سے تھا ہی نہیں کیونکہ کافر تھا۔ تو اس میں دعا کی عدم قبولیت کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ
اور جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام بیت اللہ کی بنیادیں اٹھاتے تھے (اور کہتے تھے) اے ہمارے رب! (اسے) ہماری طرف سے قبول فرما
اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾
بیشک تو ہی (سب کچھ) سننے والا جاننے والا ہے۔[125]

[125] اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں تعمیر کعبہ کا حال بتایا جا رہا ہے کہ انہوں نے اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی بنیادیں بلند کیں۔ یہ اس لیے کہا کہ بنیادیں تو پہلے ہی موجود تھیں۔ کیونکہ سب سے قبل کعبہ شریف کی تعمیر حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی۔ پھر طوفان نوح میں کعبہ کی عمارت گر گئی پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کی تعمیر نو کا حکم ہوا تو آپ نے پہلی بنیادوں ہی کو دوبارہ اٹھایا۔

مروی ہے کہ جب آپ نے دیواریں بلند کر دیں تو مقام ابراہیم والا پتھر جدید دور کی لفٹوں کی طرح چلنے لگا۔ وہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو لے کر اوپر چلا جاتا اور نیچے آ جاتا۔ اس وقت باپ بیٹا دونوں دعا کرتے تھے۔ اے اللہ ہمارا یہ عمل قبول فرما۔

تعمیر کعبۃ اللہ کے مختلف مراحل وادوار:

خلاصہ یہ ہے کہ کعبہ شریف سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا پھر طوفانِ نوح کے بعد اس کی عمارت منہدم رہی پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بحکم ربی اسے حضرت آدم علیہ السلام والی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا۔ پھر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک پینتیس برس تھی تو قریش مکہ نے کعبہ شریف کی تعمیر نو کی اور یہ شرط رکھی کہ صرف خالص حلال مال سے تعمیر کی جائے گی اور ایسا مال بہت کم دستیاب ہوا اس لیے کعبہ کی چار دیواری چھوٹی کر دی گئی اور حطیم والا حصہ نکالا گیا جو حقیقت میں کعبہ کا جزء ہے۔

پہلے کعبہ شریف کے دو دروازے تھے ایک مشرقی دیوار میں ایک مغربی میں، لوگ مشرقی دروازہ سے اندر داخل ہو

کر مغربی دروازہ سے نکل جایا کرتے تھے۔ قریش نے مغربی دروازہ ختم کر دیا اور مشرقی کو بھی زمین سے اونچا کر دیا تا کہ کوئی شخص بلا اجازت خاص اندر نہ جا سکے، نبی اکرم ﷺ کی خواہش تھی کہ کعبہ شریف کا جو حصہ قریش نے تعمیر سے نکالا تھا اسے واپس داخل کریں مگر آپ کو اس کے لئے وقت نہ مل سکا۔

پھر سن ٦٣ ہجری میں جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے کعبہ شریف کو حضور ﷺ کی خواہش کے مطابق مکمل ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کر دیا اور حطیم والا حصہ بھی اس میں شامل کر دیا۔ مگر جب چھ ماہ بعد انہیں شہید کر دیا گیا تو حجاج بن یوسف نے کعبۃ اللہ کو پھر چھوٹا کر کے قریش والی شکل میں بدل دیا اور حطیم کا حصہ تعمیر سے نکال دیا۔

حجاج کے بعد پھر خلفاء نے چاہا کہ کعبہ کو ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کیا جائے تو امام مالک اور دیگر آئمہ رحمھم اللہ نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا کہ کعبہ کو اپنی حالت ہی پہ رہنے دو ورنہ کعبۃ اللہ بادشاہوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائے گا چنانچہ تب سے کعبۃ اللہ موجودہ حالت پر چلا آ رہا ہے اور چونکہ حطیم والا حصہ بھی کعبہ کا جزء ہے اس لئے جو حطیم میں نماز پڑھے اسے کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کا ثواب ملتا ہے۔

نیکی کرنے کے بعد عاجز ہونا چاہیے متکبر نہیں:

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام جیسے جلیل القدر پیغمبروں نے کعبہ بنانے جیسی عظیم نیکی کے بعد عاجزانہ دعا کی۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ اور آگے کہا: وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اس میں یہ تعلیم ہے کہ نیکی کرنے کے بعد لوگوں کے سامنے اسے فخریہ بیان کرنے کی بجائے عاجز ہونا چاہیے کہ نہ معلوم اسے رب نے قبول بھی کیا ہے یا نہیں اگر اللہ نیکی کی توفیق دے تو عاجزانہ دعاء قبولیت میں لگ جانا چاہیے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی نیکی بہر حال مقبول ہے کیونکہ ان کے ارادوں میں ریاء آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود ان کا دعاء قبولیت کرنا ہماری تعلیم ہی کے لیے ہے۔

نیک عمل میں چھوٹے بڑے سب شامل ہوں:

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اپنے ہاتھوں سے کعبہ بنا رہے ہیں حالانکہ وہاں قوم بنی جرہم بھی تھی۔ وہ خدمت گزار اور رشتہ دار بھی تھے مگر اللہ کے پیغمبر اپنے ہاتھوں سے کعبہ بنا رہے ہیں، حضور ﷺ کی سنت بھی یہی ہے آپ نے خندق کھودنے میں صحابہ کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس میں علماء و مشائخ کے لیے درس ہے کہ وہ صرف اپنے مریدین اور شاگردوں سے کام نہ لیں خود بھی شامل ہوں۔ یہ نفس کشی کی بہترین تربیت ہے۔

جب اللہ کے جلیل القدر پیغمبران گرامی دین کے کاموں میں اپنے ہاتھوں سے حصہ لیتے ہیں تو ہم کس باغ کی مولی ہیں کہ سب لوگ کام کریں اور ہم تکبر کا پتلہ بن کر دیکھا کریں۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص وَاَرِنَا

اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنے حضور جھکنے والا بنادے اور ہماری اولاد میں سے اپنے حضور جھکنے والا گروہ بنا اور ہمیں ہمارے

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ

مناسک حج بتادے اور ہماری توبہ قبول فرما بیشک تو ہی توبہ قبول کرنے والا رحم والا ہے۔[126] اے ہمارے پروردگار! ان میں

فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

وہ عظیم الشان رسول مبعوث فرما جو انہی میں سے ہوگا ان پر تیری آیات پڑھے گا اور انہیں کتاب اور دانائی سکھائے گا

وَيُزَكِّيْهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

۱۵ ع ۸ ۱۵

اور انہیں پاک کرے گا بیشک تو ہی (سب پہ) غالب اور حکمت والا ہے۔[127]

[126] حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے یہ دعا بھی کی اے اللہ ہمیں اپنے اطاعت گزار بندے بنادے جو تیرے ہر حکم پر سر تسلیم خم کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔ اس دعا کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ذبح اسماعیل علیہ السلام کا حکم دیا تو دونوں باپ بیٹا اس کے لیے فوراً تیار ہوگئے۔ اللہ فرماتا ہے: فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾ جب دونوں نے حکم ربی کے آگے سر تسلیم خم کردیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل (ذبح کے لیے) زمین پہ لٹادیا۔ (صافات: ۱۰۳) فَلَمَّآ اَسْلَمَا کے الفاظ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ کی قبولیت کا مظہر ہیں۔

پھر انہوں نے دعا کی اے اللہ ہماری اولاد میں ایسا گروہ بنادے جو ہماری طرح ہمیشہ تیرے حکم پر سر جھکاتا رہے۔ یعنی یا اللہ کبھی ایسا زمانہ نہ آئے کہ ہماری ساری اولاد گمراہ ہوجائے۔ انہوں نے یہ دعا اس لیے فرمائی کہ وہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ سے جان گئے تھے کہ ان کی اولاد میں ظالمین بھی آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا بھی قبول فرمائی اور ان کی نسل میں ہمیشہ ایمان دار گروہ زندہ رکھا۔ اللہ فرماتا ہے: وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پشت میں کلمہ اسلام باقی رکھا۔ (زخرف: ۲۸)

چنانچہ علماء محققین نے قرآنی اشارات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد حضرت عبداللہ اور آپ کی والدہ سیدہ آمنہ سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک پچھلی تمام پشتوں میں کوئی کافر و مشرک نہیں آیا۔ اور یہی وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ (شعراء: ۲۱۹) کی معتبر تفسیر ہے یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم آپ کو ہمیشہ سجدہ گزاروں میں پشت در پشت بدل کر لائے ہیں۔

آ گے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے دعا کی۔اے اللہ ہمیں ہمارے مناسک حج اور طریقہ ہائے عبادت بتادے جن کے مطابق ہم تیرے گھر میں تیری عبادت کر سکیں۔اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا بھی قبول فرمائی۔

چنانچہ ابن ابی شیبہ نے ابی مجلز سے روایت کیا ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے تو جبریل علیہ السلام ان کے پاس آئے۔انہیں طریقہ طواف بتایا۔پھر صفا و مروہ میں سعی کر کے دکھائی، پھر منیٰ میں گئے۔وہاں شیطان سامنے آیا۔حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسے سات کنکریاں ماریں اور ابراہیم علیہ السلام سے بھی مروائیں۔پھر درمیانی جمرہ کے پاس بھی یہی کچھ ہوا پھر چھوٹے جمرہ پر بھی یہی کیا گیا۔پھر انہوں نے آپ کو مزدلفہ دکھایا اور بتایا لوگ یہاں جمع ہوا کریں گے۔ (مزدلفہ کا معنی جائے اجتماع ہے)۔پھر وہ آپ کو عرفات میں لے گئے اور بتایا کہ یہاں لوگ مل کر دعا کیا کریں گے۔ پھر کہا عَرَفْتَ یعنی آپ پہچان گئے؟ کہا ہاں پہچان گیا۔اس لیے اس جگہ کو عرفات کہتے ہیں۔(درمنثور جلد اول صفحہ ٣٣٣)

[127] تعمیر کعبہ کے بعد ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے یہ دعا بھی فرمائی کہ اے اللہ! اس سرزمین حرم کے لوگوں میں وہ عظیم الشان رسول مبعوث فرما جو انہی میں سے ہوگا باہر سے نہ آئے گا۔انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے گا۔(تلاوت قرآن کرے گا) انہیں کتاب (قرآن) اور حکمت (اپنی سنت) سکھائے گا۔اے اللہ تو غالب ہے یعنی ہماری دعائیں قبول کر سکتا ہے اور تو حکمت والا ہے۔یعنی بہتر جانتا ہے کہ دعا کب اور کیسے قبول کی جائے۔

ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کا آمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاء کرنا اور میلاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی یہ دعا اس لیے تھی کہ دراصل اس وادی مکہ میں اولاد اسماعیل علیہ السلام کا بسایا جانا اور یہاں کعبہ تعمیر کیا جانا یہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی تیاریوں کا آغاز تھا۔گویا وہ دونوں یہ دعا کر رہے تھے۔اے اللہ! ہم نے کعبہ بنا دیا ہے۔اب اگر اسے قیامت تک تو نے آباد رکھنا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہاں مبعوث فرما جن کی آمد کی برکت سے یہ کعبہ قیامت تک آباد رہے گا۔اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا کئی ہزار سال بعد قبول فرمائی اور سیدہ آمنہ کی جھولی میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں وہ در یتیم ڈال دیا جس کی چمک سے سارا جہان جگمگا اٹھا۔تو اہل ایمان اسی نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے ماہ ربیع الاول میں محافل میلاد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انعقاد کرتے ہیں کہ جس نعمت کے لیے ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے کعبہ کی تعمیر کر کے دعائیں کی تھیں اللہ نے وہ نعمت ہم امت محمدیہ کو عطا فرمائی ہے۔

مفسر کے قلم سے میلادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت پر ایمان افروز نعت

اس جگہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت مبارکہ کے حوالہ سے ایک نعت شریف کہی ہے جو اہل ایمان کے لیے زیادتی ایمان کا باعث ہے،اس کا یہاں لکھنا خالی از برکت نہیں ہے،تو میں نے عرض کیا ہے۔

مبارک ہو اے مومنو صد مبارک جہاں میں حبیب خدا آگئے ہیں
یتیموں کے والی ضعیفوں کے مولیٰ غریبوں کے حاجت روا آگئے ہیں

خبر جن کی دی انبیاء کو خدا نے
مبارک ہو اے مومنو! کہ جہاں میں
وہ جن کی خلیل اللہ نے کی دعائیں
مبارک مبارک ہو صد تہنیت ہو
دعاء کلیم اللہ تھی کہ خدایا
وہ جن کے لیے وعظ کہتے تھے عیسیٰ
سجائے گئے بت تھے کعبہ کے اندر
وہ جن سے ہوئی حرمتِ کعبہ ظاہر
جہاں ان سے پہلے تھا اندھیر کالا
وہ جس نے بتوں کو حرم سے نکالا
رخ حق سے جس نے ہے پردہ اٹھایا
وہ یثرب کو جس نے مدینہ بنایا
وہ جن کی شفاعت کا باڑا بٹے گا
اے طیبؔ مبارک ہو سب عاصیوں کو

بشارت تھی دی جن کی سب انبیاء نے
رسولوں کے وہ پیشوا آگئے ہیں
ذبیح اللہ نے بھی کی التجائیں
وہ سب مرسلیں کی دعاء آگئے ہیں
مجھے ان کی امت میں تو پیدا فرما
رسولوں کے وہ مدّعٰی آگئے ہیں
دل کعبہ گریاں کناں تھا برابر
وہ کعبہ کی بن کر صدا آگئے ہیں
ہوا ان کے آنے سے ہر سو اجالا
مبارک وہ نورِ خدا آگئے ہیں
جہاں نور سے جس کے ہے جگمگایا
وہ منبع رشد و ہدیٰ آگئے ہیں
در خلد جن کے ہی ہاتھوں کھلے گا
وہ شافعِ روز جزا آگئے ہیں

یہاں معلوم رہنا چاہیے کہ اس دعاء ابراہیم و اسماعیل کا مصداق جناب محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کے سوا کوئی دوسرا رسول نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ان دونوں کی نسل میں آپ کے سوا کوئی رسول آیا ہی نہیں۔ باقی سب انبیاء و رسل نسل اسحاق علیہ السلام میں آئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء کو آپ کی نسل میں رکھ دیا اور تقسیم یہ کی کہ باقی سارے انبیاء نسل اسحاق والے پلے میں ڈال دیے اور تنہا اپنے محبوب کریم سرور عالم ﷺ کو نسل اسماعیل والے پلے ڈال کر بتایا کہ سب انبیاء ایک طرف اور اللہ کا محبوب اکیلا ایک طرف۔

سب سے اولیٰ واعلیٰ ہمارا نبی
خلق سے اولیاء اولیاء سے رسل

سب سے بالا و والا ہمارا نبی
اور رسولوں سے اعلیٰ ہمارا نبی

پھر جب حضور ﷺ مبعوث ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام صفات لفظ بلفظ وہی بتلائیں جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے اپنی دعا میں کہی تھیں تو فرمایا: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (آل عمران: ۱۶۴) یہی مضمون سورہ بقرہ آیت ۱۵۱ اور سورہ جمعہ آیت ۲ میں وارد بھی ہوا ہے۔ پھر خود حضور ﷺ نے فرمایا: انا دعوة ابی ابراھیم و

بشارۃ عیسیٰ و رؤیا اُمّی رَأت ''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی والدہ کو دکھایا جانے والا وہ منظر ہوں جو انہوں نے (میری ولادت) کے وقت دیکھا۔'' (مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۱۲۷)

جب ابراہیم علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے دعاء فرمائی تو ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو تعلیم فرمائی کہ ہر نماز میں ابراہیم علیہ السلام کے لیے یوں دعاء کریں: اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انك حمید مجید، گویا جب ابراہیم علیہ السلام نے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک بار ذکر خیر کیا اور ان کے لیے دعاء کی تو ان کو اس دعاء کا اللہ کی طرف سے یہ ثمر ملا کہ آج کروڑوں زبانیں ہر روز کئی بار ان کا ذکر خیر کرتی ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام آباء واجداد کا ایمان:

حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے دعا کی وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ کہ ان کی نسل میں ایک مسلمان گروہ ہمیشہ باقی رہے۔ پھر کہا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ کہ اسی مسلمان گروہ میں وہ رسول معظم اٹھا جو انہی میں سے ہو، مِّنْهُمْ کی ضمیر اُمَّةً مُّسْلِمَةً کی طرف لوٹ رہی ہے۔ (تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۵۸) معلوم ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام آباء واجداد مسلمان گروہ میں سے تھے۔ اس پر میرے والد گرامی محقق اسلام شیخ الحدیث علامہ محمد علی رحمۃ اللہ متوفی ۱۴۱۸ھ بمطابق ۱۹۹۶ء کی کتاب ''نور العینین فی ایمان آباء سید الکونین'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت محققانہ اور قیمتی کتاب ہے۔ ہر مسلمان کو اسے پڑھنا چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سید الرسل ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عظمت ہے کہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام آپ کی آمد کے لیے دعا مانگ رہے ہیں، حالانکہ آپ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام سب انبیاء کرام علیہم السلام میں بلند تر ہے جب وہ آپ کے محتاج دکھائی دیتے ہیں تو سب انبیاء پر آپ کی برتری و سیادت ثابت ہوگئی۔ امام احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

وہ جہنم میں گیا جو ان سے مستغنی ہوا ہے خلیل اللہ کو حاجت رسول اللہ کی
لا وربّ العرش جس کو جو ملا اُن سے ملا بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ

اور ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کون منہ پھیر سکتا ہے سوا اس کے جس نے خود کو پاگل بنا رکھا ہو؟ جبکہ ہم نے انہیں دنیا میں

فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ

چن لیا اور وہ آخرت میں سزاوارانِ رحمت میں سے ہیں۔ [128] جب ان سے ان کے رب نے کہا: سر جھکا دو

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

انہوں نے کہا میں رب کائنات کے حضور سر جھکا تا ہوں۔ [129]

انبیاء کرام علیہم السلام کی عمومی تعلیمات مثلِ توحید ورسالت اور ردِّ یہود ونصاریٰ

[128] ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ تابعی سے روایت کیا ہے کہ یہود ونصاریٰ دین ابراہیم علیہ السلام سے پھر گئے تھے اور دین میں بدعات داخل کر لی تھیں جن کا اللہ سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ یاد رہے دین ابراہیم یہ ہے کہ اللہ کے لیے خالص توحید مانی جائے اور صرف مانی نہ جائے بلکہ اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا کر اور ارباب اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نعرہ توحید بلند کیا جائے۔ اب جو اللہ کا کھا کر اس کے غیروں کے آگے سجدہ ریز ہو اس سے بڑا پاگل کون ہو سکتا ہے

کتا بھی جس در کا کھاتا ہے اسی کا ہو کر رہتا ہے۔ یہود ونصاریٰ نے توحید کی بجائے شرک کا راستہ اپنایا اور اللہ تعالیٰ کے مغضوب ٹھہرے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید باری تعالیٰ کے تحفظ کے لیے جان کی بازی لگائی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں چن لیا جیسے فرمایا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (بقرہ: ۱۲۴) وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا ﴿۱۲۵﴾ (نساء: ۱۲۵)

آگے فرمایا: وانہ فی الآخرۃ لمن الصالحین، اور آخرت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام صالحین میں سے ہیں یعنی رحمت خداوندی کے لیے صالح اور اہل ہیں۔ اور بلاشبہ روزِ قیامت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بلند مقام ہوگا چنانچہ حدیث میں ہے کہ روز قیامت سب لوگ ننگے بدن اٹھیں گے اور سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ (بخاری عن ابن عباس) یاد رہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔

نبی کی طرف نظام کی نسبت جائز ہے:

لفظ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ سے پتہ چلا کوئی نبی جو دین لے کر آئے اس کی طرف اس دین کی نسبت جائز ہے۔ آج بعض لوگ نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصطلاح پر اعتراض کرتے ہیں کہ نظام تو اللہ کا ہے۔ ہم کہتے ہیں ملت اور نظام میں کیا فرق

ہے اگر ملت کی نسبت نبی کی طرف ہوسکتی ہے تو نظام کی کیوں نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح نبی کی طرف دین کی نسبت بھی جائز ہے جیسے لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۝۶ (کافرون:۶)

یہ بھی معلوم ہوا کہ دین کی وہی تشریح معتبر ہے جو اللہ کا رسول کرے۔ یہود ونصاریٰ نے اپنی ایجاد کردہ بدعات کو دین قرار دیا تھا جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کوئی تعلق نہ تھا پھر بھی وہ خود کو ان کا متبع قرار دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ درس دیا کہ نبی کی تعلیمات سے ہٹ کر خرافات کو دین قرار دینا یہود ونصاری کا طریقہ ہے۔

[129] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ ارشاد اس وقت ہوا جب وہ قید خانہ سے باہر آئے (مظہری) یاد رہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پرورش تہہ خانہ میں ہوئی۔ آپ وہاں سے پہلی مرتبہ باہر آئے تو دیکھا لوگ سورج، چاند اور ستاروں کو پوج رہے ہیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا یہ چیزیں عبادت کے لائق نہیں ہیں۔ اس کی تفصیل سورہ انعام میں آئے گی۔

تب اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں بات ڈالی جو یہاں بیان ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا آپ اپنے رب کے آگے سر جھکائیں تو آپ نے کہا میں رب کائنات کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ اس وقت آپ نے یہ بھی کہا تھا: اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝۷۹ (انعام:۷۹) گویا بچپن ہی سے آپ کے قلب وضمیر میں توحید رچی بسی تھی۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ

اور اسی چیز کی وصیت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمائی، کہا: اے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے دین اسلام کو

الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝۱۳۲ ۭ

چن لیا ہے تو تمہیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔[130]

[130] پھر جب آپ کو اللہ نے اولاد عطا فرمائی تو آپ نے انہیں بھی یہی وصیت فرمائی کہ اللہ کی توحید کا نور دنیا میں پھیلاؤ شرک اور بت پرستی کے خلاف جہاد کرو اور آپ کی اولاد نے آگے اپنی اولاد کو یہی وصیت کی چنانچہ آپ کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹوں سے یہی کہا کہ بیٹو! تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام پسند کیا ہے یہ دنیا وآخرت کی عظیم نعمت ہے جو اللہ نے تمہیں دی ہے۔ لہٰذا تمہیں موت آئے تو اسلام ہی پر آئے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کو چھوڑ کر اس لیے لیا گیا کہ یہود انہی کی نسبت سے خود کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ اسرائیل ان کا دوسرا نام ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تمہارے جد اعلیٰ اسلام کی دولت سے اپنی اولاد کو نواز کر گئے تھے تو تمہیں ان کی اولاد ہونے کے ناطے اسلام کی دعوت قبول کرنا چاہیے۔

تمام انبیاء کا دین ''اسلام'' ہی رہا ہے:

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴿۱۳۱﴾ اور فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۳۲﴾ سے معلوم ہوا ہر نبی کا دین ہمیشہ سے اسلام ہی رہا ہے اور سب انبیاء خود کو مسلم ہی کہتے تھے۔ان کی شریعتوں میں احکام بدلتے رہے ہیں مگر بنیادی عقائد سب کے ایک ہی تھے یعنی توحید و رسالت، جنت و نار اور قبر و حشر وغیرہ۔ یہودیت یا عیسائیت انسانوں کے گھڑے ہوئے نام اور ان کی پیدا کردہ چند خرافات کی پہچان ہیں۔ اسی لئے اللہ فرماتا ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ کہ اللہ کے ہاں پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ (آل عمران،۱۹)

نجات کا مدار اچھے انجام پر ہے:

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۳۲﴾ سے معلوم ہوا جس کی موت اسلام پر آئی وہ نجات پا گیا۔ اگر ایک شخص زندگی بھر کفر کرے مرنے سے قبل اسلام لے آئے تو پکا جنتی ہے اگر زندگی بھر مومن رہے۔ آخر میں عقیدہ خراب کر کے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے تو جہنمی۔ تو دعاء کرنی چاہیے کہ خاتمہ ایمان پہ ہو۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مبلغ کو سب سے پہلے اپنے اہل خانہ کو تبلیغ کرنی چاہیے۔ حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام اپنی اولاد کو فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۳۲﴾ کی وصیت کر رہے ہیں کیونکہ تبلیغ کا کام گھر سے شروع کرنا چاہیے۔ حضور ﷺ سے فرمایا گیا:

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴿۲۱۴﴾ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈر سنائیں (شعراء:۲۱۴) اگر ایک شخص سارے جہاں کو وعظ کہتا پھرے اور اپنے گھر والوں کی خبر ہی نہ لے تو وہ بہت بڑا مجرم ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کا وقت وصال آیا؟ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرے بعد تم کس کی

مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ

عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم آپ کے خدا اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل

وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ

اور اسحاق علیہم السلام کے خدا کی عبادت کریں گے جو خدائے واحد ہے اور ہم اسی کے آگے سر جھکانے والے ہیں۔[131] یہ جماعت (انبیاء) ہے

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

جو چلی گئی، ان کیلئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم کماؤ اور تم سے نہ پوچھا جائے گا جو وہ کرتے تھے[132]

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ

اور وہ کہتے ہیں کہ تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو تم ہدایت پالو گے آپ فرمادیں بلکہ دین ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرو جو ہر باطل سے جدا تھے

وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

اور مشرکین میں سے نہ تھے۔[133]

[131] حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت ۲۰۰۰ قبل مسیح ہے اور وفات ۱۸۵۳ قبل مسیح۔ آپ اپنے بھائی عیسو کے ساتھ جڑواں پیدا ہوئے۔ عیسو پہلے پیدا ہوا اور آپ بعد میں، آپ نے عیسو کی ایڑی پکڑ رکھی تھی اس لیے یعقوب کہلائے۔ یعنی عقب میں آنے والا یا عقب (ایڑی) پکڑنے والا۔ آپ فلسطین میں پیدا ہوئے۔ پھر جب مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حکومت قائم ہوئی تو آپ اپنی اولاد سمیت مصر میں آگئے۔ پھر یہیں وصال فرمایا۔ اللہ رب العزت نے آپ کی باقی زندگی کو چھوڑ کر آپ کی بوقت وصال وصیت ذکر فرمائی ہے کیونکہ اس میں توحید کا پیغام ہے۔ آپ کی اولاد میں یہود و نصاریٰ نے توحید کی جگہ شرک اختیار کرلیا تھا اور بت پرستی میں ڈوب گئے تھے تو انہیں اس وصیت کے ذریعے ہدایت دی گئی ہے۔

حیرت ہے کہ آج تورات میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی باقی ساری زندگی مذکور ہے مگر یہ وصیت غائب۔ حضرت عطا تابعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہر نبی کو بوقت وصال زندگی اور موت کے مابین اختیار دیا گیا اور سب نے موت ہی اختیار کی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو جب یہ اختیار دیا گیا تو انہوں نے کہا: اے اللہ! مجھے اتنی مہلت دے کہ اپنے بیٹوں کو وصیت کرسکوں۔ تب

آپ نے یہ وصیت فرمائی کہ اے بیٹو! بتاؤ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا: ابا جان ہم اسی خدا کی عبادت کریں گے جس کی عبادت آپ کرتے رہے اور آپ کے آباء واجداد ابراہیم اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کرتے رہے۔

اولاد کے حسنِ عاقبت کی فکر کرنی چاہیے:

حضرت یعقوب علیہ السلام بوقت وصال اپنی اولاد کو دین پر قائم رہنے کی وصیت کر رہے ہیں۔ اس میں ہمارے لئے یہ درس ہے کہ اولاد کی دنیا سنوارنے سے زیادہ ان کے دین کے سنوارنے کی فکر کرنا چاہیے۔ اور جب کسی مسلمان کی موت قریب آئے تو اسے دنیاداری کی اور مال ودولت کی تقسیم سے متعلقہ وصیتوں کیساتھ اولاد کو دین پر استقامت کی وصیت بھی کرنا چاہیے، کہ مومن کی اصل دولت تو اسکا ایمان ہے۔

لفظ اب چچا کے لیے بھی مستعمل ہے:

اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ میں اسماعیل علیہ السلام کو بھی حضرت یعقوب کا اَب کہا گیا ہے۔ حالانکہ وہ ان کے چچا ہیں۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لِاَنَّ الْعَرَبَ تُسَمِّی الْعَمَّ اَبًا کیونکہ اہل عرب چچا کو بھی اب کہتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۱۹۱) لہٰذا قرآن کریم میں جہاں ابراہیم علیہ السلام کا اپنے اَب کو بت پرستی سے روکنا مذکور ہے وہاں اب بمعنی چچا ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ محققین اسلام ائمہ دین کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سارے نسب پاک میں کوئی کافر ومشرک نہیں ہے۔

اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ بت پرست ٹھہرے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب پاک کے تقدس پر حرف آتا ہے۔ جو اسلام کے لیے ایک عیب ہے اور بہت سی تعلیمات اسلام اور آیات قرآنیہ کے خلاف ہے

یہاں ایک حدیث ان ابی واباك فی النار محل بحث ہے جس کا خلاصہ یہی ہے کہ اس حدیث میں اِنَّ اَبی سے مراد ابولہب ہے، یعنی اس حدیث میں بھی اَب بمعنی چچا ہے۔

[132] یہود کو ناز تھا کہ وہ اولاد انبیاء سے ہیں لہٰذا وہ جو بھی عمل کریں انہیں ان کے نسب کی وجہ سے بخش دیا جائے گا۔ یونہی عیسائیوں نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن کر سولی پر لٹک گئے۔ لہٰذا ہر عیسائی پکا جنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے ان عقائد باطلہ کی تردید کرتے ہوئے انہیں مخاطب کر کے فرمایا یہ جماعت انبیاء دنیا سے چلی گئی ہے۔ انہوں نے جو اعمال کیے وہ انہیں کام آئے اب تم جو عمل کرو گے وہ تمہارے کام آئے گا تم سے روز قیامت یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تمہارے باپ دادا کیا کرتے تھے بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ خود تم کیا کرتے تھے۔ دوسری جگہ فرمایا گیا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ کوئی بوجھ اٹھانے والی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہ اٹھائے گی۔
(سورہ انعام، آیت نمبر ۱۶۴)

اس آیت میں لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ سے استدلال کر کے بعض لوگ ایصال ثواب سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب ہر کسی کو اس کا اپنا عمل ہی کام آئے گا تو پھر ایصال ثواب کا کیا معنی؟ مگر یہ استدلال

باطل ہے۔ اولاً یہ آیت یہود و نصاریٰ کے حق میں اتری ہے۔ یعنی بتایا گیا ہے کہ کسی کافر کو اس کے مومن آباء سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، تو اسے مسلمانوں پر چسپاں کرنا درست نہیں۔ ثانیاً اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص عمل سے بے نیاز نہیں۔ یہ غلط ہے کہ ایک شخص کے اعمال اس کی آئندہ ساری نسل کے لیے کافی ہیں لہٰذا پچھلوں کو عمل سے چھٹی ہے جیسے یہود نے سمجھا کہ انبیاء کے اعمال ہی ان کے لیے کافی ہیں۔ جبکہ ایصالِ ثواب یہ ہے کہ ایک آدمی نیک عمل کرے اور اس کا ثواب وفات یافتہ مسلمانوں کو پہنچائے جانے کی دعا کرے۔ اس کا مفہوم آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

ہر آدمی سے اس کا کسب پوچھا جائے گا نسب نہیں:

یہود نازاں تھے کہ وہ اولادِ انبیاء ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اے یہود! تم سے تمہارا عمل پوچھا جائے گا۔ اولادِ انبیاء ہونا نہیں پوچھا جائے گا۔ یعنی اگر تمہیں جنت چاہیے تو انبیاء والا عقیدہ و عمل اپناؤ۔ آج بہت سے سادات بدعقیدہ ہو کر تشیع میں غلو کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفائے راشدین کو گالیاں دیتے ہیں، قرآن کو ناقص بتاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی نسبت سادات ہی انہیں بچا لے گی۔ مگر یہ غلط ہے یہود جب انبیاء کے لائے ہوئے دین سے ہٹ گئے تو انہیں نسبت انبیاء کام نہ آئی۔ یونہی حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ حسنین کریمین اور دیگر ائمہ اہلِ بیت تو خلفاء راشدین سے محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ اب جو ان کی اولاد میں سے ان کے راستہ سے ہٹ کر خلفاء راشدین اور امہات المومنین کو گالیاں بکے، اللہ و رسول کو ایذاء دے اور تحریفِ قرآن کا قول کرے پھر صرف نسبتِ سادات کی وجہ سے نجات کی امید رکھے تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

دورِ حاضر کے سجادہ نشینوں کے لیے ہدایت:

آج ایسے سجادہ نشین بے شمار ہیں جو اپنے بزرگوں کی قبروں پر تجارت کر رہے ہیں۔ ان کے آباء میں صدیوں پہلے کوئی ولی اللہ گزرا تھا جس نے نیک اعمال سے قربِ الٰہی حاصل کیا۔ اب آگے نسل در نسل اس کی اولاد اس کی قبر پر سجادہ نشین بن کر بیٹھ گئی ہے اور لوگ انہیں بھی اولیاء اللہ سمجھتے اور انہیں نذرانے دیتے ہیں حالانکہ ان میں سے بہت سوں کا کردار شریعت مطہرہ کے خلاف ہے۔ وہ نماز ترک کرتے، داڑھی منڈواتے، کئی فواحش کا ارتکاب کرتے اور رقص و سرود کی محفلیں سجاتے ہیں۔ یہ سب نفس و شیطان کا فریب ہے، ایسے بدعمل سجادہ نشینوں کا حال بھی یہود و نصاریٰ جیسا ہے جو اولادِ انبیاء ہونے پہ قانع تھے، خوب یاد رکھنا چاہیے کہ شریعت کے ان باغی سجادہ نشینوں کو ان کا نسب نہ بچائے گا۔

حدیث میں ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اَبْطَاَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ جسے اس کے عمل نے سست رکھا اسے اس کا نسب تیز نہیں کر سکتا۔

(ابو داؤد کتاب العلم باب ۱)

[133] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یک چشم عبداللہ بن صوریا یہودی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگا ہدایت کا راستہ وہی ہے جس پر ہم ہیں تو اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ ہماری پیروی کریں تو آپ کو ہدایت مل جائے گی۔ (معاذ

اللہ) عیسائیوں نے بھی یہی بات کہی۔ (ممکن ہے وفدِ نجران کے آنے کے موقع پر یہ باتیں ہوئی ہوں جیسا کہ پیچھے آیت ۱۱۳ کے تحت گزرا۔)

تب یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ جواب دیا کہ کیوں نہ ہم سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کریں جو انبیاء کرام علیہم السلام کے جداعلیٰ ہیں۔ ان کے دین سے ہٹ کر تم کونسی ہدایت چاہتے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑ دیئے پھر اس کی پاداش میں آپ کو آگ میں پھینکا گیا مگر آپ نے پرواہ نہ کی۔

آپ کی ساری زندگی بت پرستی کے خلاف جہاد سے عبارت ہے اور تم بت پرستی میں ملوث ہو کر کس ہدایت کے مدعی ہو۔ انہوں نے کعبہ تعمیر کرنے کے بعد نسلِ اسماعیل میں اہلِ مکہ میں رسول معظم کی آمد کے لیے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے ہوئے یہود و نصاری کیوں کر ہدایت یافتہ ہو سکتے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبۃ اللہ کا حج جاری کیا۔ یہود و نصاریٰ اس حج کے مخالف ہیں پھر وہ خود کو ہدایت یافتہ کہتے ہیں یہ کون سی ہدایت ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام مشرکین میں سے نہ تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ کے علاوہ مشرکین مکہ کا رد ہے وہ اولاد ابراہیمی ہونے کے ناطے کعبہ کے مجاور اور سجادہ نشین بن کر بیٹھے تھے اور کعبہ کو تین سو ساٹھ بتوں کی نجاست سے آلودہ کر رکھا تھا۔ انہیں بھی سمجھایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام تو مشرک نہ تھے بلکہ بتان شرک کے ٹکڑے کرنے والے تھے پھر تم کس منہ سے ان کے سجادہ نشین بنے ہو الٹا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو دین ابراہیم کے سچے وارث ہیں کعبہ میں آنے سے روکتے ہو۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ

تم کہو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو ابراہیم، اسماعیل،

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ

اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور (اسرائیلی) نسلوں کی طرف اتارا گیا [134] اور جو موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا اور جو سب انبیاء کو

النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں ڈالتے اور ہم اللہ ہی کے حضور جھکنے والے ہیں۔ [135]

[134] اب یہود و نصاریٰ کو وہ اصول بتائے جا رہے ہیں جن پر چل کر ہدایت مل سکتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے مومنو! تم کہو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا، یعنی ہم اللہ پر ایمان لائے اور جو اس نے ہماری طرف قرآن وسنت کا پیغام بھیجا ہے اس پر ایمان لائے۔ لہٰذا پہلی آسمانی کتابوں کی جو چیز اس کے موافق ہوگی وہ ہم مان لیں گے جو مخالف

ہوگی نہیں مانیں گے۔اور یہ ایک عادلانہ موقف ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہل کتاب اپنی کتاب کا ترجمہ عبرانی سے عربی میں کرتے ہیں۔(اور جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب بلکہ کہو ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اس پر ایمان لائے۔(بخاری کتاب الشہادات باب ۲۹)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مومنو کہو ہم ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام پر اترنے والے کلام الٰہی پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔چونکہ یہ انبیاء یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ سب کے آباء واجداد ہیں۔اس لیے خصوصاً ان کا نام لے کر ان پر نازل شدہ وحی پر ایمان کا حکم دیا گیا تا کہ ان فرقوں کو ہدایت کی طرف رغبت ہو اور اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کر کے یہود کا رد کیا گیا کہ یہود صرف اس لیے ان کی نبوت سے منکر ہیں کہ ان کی نسل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیوں مبعوث ہوئے ہیں۔ گویا یہ ان کی اللہ کے ساتھ ایک لڑائی ہے۔

آگے فرمایا گیا:

وَالْاَسْبَاطِ، یہ سِبْطٌ کی جمع ہے جسکا معنی نسل ہے، یعنی اے مومنو! تم کہو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے جو بارہ نسلیں چلیں ان میں جس قدر انبیاء آئے ہم ان سب انبیاء پر ایمان لاتے اور ان کے مقامات ومعجزات کا اقرار کرتے ہیں۔اگر یہود میں ذرہ بھی انصاف ہوتا تو وہ قرآن کی اس ناصحانہ وعادلانہ دعوت پر غور کرتے اور ایمان کی راہ اپناتے۔مگر ان کے نصیب میں ایمان نہ تھا۔

[135] آگے فرمایا کہ اے مومنو! تم کہو ہم ان کتابوں اور معجزات وکمالات پر ایمان لاتے ہیں جو موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو دیئے گئے (اس میں یہود و نصاریٰ کو نہایت حکیمانہ دعوت حق ہے کہ ہم تو موسی وعیسی علیہما السلام پہ ایمان رکھتے ہیں تو تم جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پہ ایمان کیوں نہیں لاتے ہو، ہم تو کسی مذہبی تعصب کا شکار نہیں ہیں تم کیوں اس میں گرفتار ہو،) اور صرف موسیٰ وعیسیٰ ہی نہیں، ہم تو سب انبیاء کرام کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کلام ومقام دیا اس سب پر ایمان رکھتے ہیں ہم ان میں سے کسی نبی میں فرق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں بعض کو نہ مانیں۔جیسے یہود و نصاریٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا۔وہ حضرت سلمان علیہ السلام کو بھی نبی نہیں مانتے۔مگر کوئی شخص تب تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک ہر نبی کی نبوت اور اس پر اُترنے والی وحی پر ایمان نہ لائے۔

شیعہ فرقہ کی تیار کردہ امامتِ منصوصہ کا رد:

وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ سے معلوم ہوا کہ انسانوں میں سے صرف انبیاء ہی وہ نفوس قدسیہ ہیں جن پہ ایمان لانے کا اللہ حکم فرماتا ہے اور یہ مقام صرف انبیاء کرام علیہم السلام ہی کا ہے کہ جو شخص ان میں سے کسی کی نبوت سے انکار کرے وہ کافر وجہنمی ہے، لیکن شیعہ فرقہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد بارہ امام بنائے ہیں انکا درجہ انبیاء والا بلکہ ان سے بھی بہت بلند ہے، جو شخص کسی امام کی امامت نہ مانے وہ اسی طرح ہے جیسے اس نے سب انبیاء کی

نبوت سے انکار کیا۔ (بحار الانوار جلد ۲۳ صفحہ ۹۸ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

بلکہ شیعہ فرقہ غلو کی انتہاء کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام دنیا میں بارہ اماموں کی امامت کے اعلان کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ (اصول کافی کتاب الحجہ صفحہ ۲۶۳ مطبوعہ دار مجتبیٰ قم)

مگر ہم کہتے ہیں اگر یہ بات ہے تو یہاں قرآن میں یہ بھی ہونا چاہیے تھا:

وما اوتی الائمۃ من ربھم، یعنی ہم ہر اس عظمت کو بھی مانتے ہیں جو ائمہ کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔

کیا سارے قرآن میں ایسا کہیں فرمایا گیا ہے؟ ممکن ہے اس قرآن میں ہو جو ان کے بقول امام مہدی کے پاس ہے اور قرب قیامت میں ظاہر ہوگا، تاہم جو قرآن اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس میں تو ایسا کہیں نہیں ہے، اس میں تو اللہ تعالیٰ نے صرف انبیاء کرام ہی پہ ایمان لانے کا حکم دیا ہے۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ

پھر اگر وہ ایمان لے آئیں جیسے تم لائے ہو تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر وہ منہ پھیریں تو وہ بس جھگڑے ہی میں

فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ؀ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ

مبتلا ہیں، تب عنقریب انہیں اللہ ہی تمہاری طرف سے سنبھال لے گا اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ [136] اللہ کا رنگ پکڑو

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ؀

اور اللہ سے بہتر کس کا رنگ ہو سکتا ہے؟ اور ہم اسی کے عبادت گزار ہیں۔ [137]

[136] اللہ تعالیٰ نے فرمایا دور نبوی کے مسلمانوں یعنی صحابہ کرام کو خصوصاً اور بعد والے مسلمانوں کو عموماً خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اگر یہود و نصاریٰ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو پھر وہ ہدایت یافتہ ہیں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ محض جھگڑے میں مبتلا ہیں، اس جگہ یہ اشارہ ملتا ہے کہ صحابہ کرام کے ایمان کو معیار قرار دیا گیا ہے۔

اسی لیے منافقین سے کہا گیا کہ وہ صحابہ کرام کی طرح ایمان لائیں، ارشاد ہوا: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ جب منافقین سے کہا جائے کہ اس طرح ایمان لاؤ جیسے لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں کیا ہم بیوقوفوں کی طرح ایمان لائیں، تب اللہ تعالیٰ نے منافقین پہ غضب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ؀

[137] حضرت قتادہ (تابعی) فرماتے ہیں یہود اپنے نومولود بچوں کو یہودی قرار دینے کے لیے انہیں ایک مخصوص رنگ میں نہلاتے ہیں۔ عیسائی بھی ایسا ہی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ کے رنگ میں خود کو رنگ لو کہ اللہ سے بہتر کسی کا رنگ نہیں اور وہ رنگ یہ ہے کہ کہہ دو ہم اسی کی عبادت کرتے ہیں یعنی اس کے ہر حکم کے آگے سر جھکاتے ہیں۔

مقصد یہ کہ کسی رنگین پانی میں ڈبکی لگانے سے کوئی فلاح نہیں پا سکتا بلکہ اللہ کے دین کے رنگ میں خود کو رنگنے سے فلاح ملتی ہے۔عیسائیوں کے ہاں یہ رسم آج بھی معروف ہے جسے بپتسمہ (Baptisma) کہتے ہیں۔

نومولود کے کان میں اذان دینا اور بچے کا ختنہ کرنا:

اہل اسلام اپنے نومولود بچوں کو کسی نام نہاد رنگین مذہبی پانی میں ڈبونے کی بجائے نومولود بچے کے کان میں اذان دیتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے حسنین کریمین کے کانوں میں اذان دی اور امت کو اس کا حکم فرمایا۔ (طبرانی)

گویا بچے کے قلب و ذہن میں اللہ و رسول کا نام اور نماز کا پیغام اتارا جاتا ہے۔ یہ طریقہ یہود و نصاریٰ کے بپتسمہ سے ہزار ہا درجہ بہتر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہاں صبغۃ اللہ سے بچے کا ختنہ کرنا مراد ہے کہ اس میں بھی خون بہتا اور بچے کے اعضاء رنگین ہوتے ہیں۔ یہ قول پہلی تفسیر کے مخالف نہیں کہ ختنہ بھی دین اسلام کا حصہ ہے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو اسلام لانے کے بعد بڑی عمر میں ختنہ کرنے کا حکم فرمایا (ابوداؤد کتاب الطہارۃ)

حدیث ہے جو اسلام لایا وہ ختنہ ضرور کرے۔ (بیہقی عن الزہری) تاہم صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ کی بہتر تفسیر یہ ہے کہ اس سے دین اسلام مراد لیا جائے جیسا کہ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ سے اشارہ ملتا ہے۔

اسلام کے رنگ میں ڈوب جانا چاہیے:

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ کہہ کر دین کو رنگ سے تعبیر کیا گیا۔ یہ خوبصورت مثال ہے جب کپڑے کو رنگا جاتا ہے تو اس کا ہر تار پود تانا بانا اندر باہر اسی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ایسے ہی مومن کو چاہیے کہ اسلام کے رنگ میں یوں رنگا جائے اس کا ظاہر باطن قول و عمل صورت و سیرت و گفتار و کردار سب دین کے سانچے میں ڈھل جائے۔مگر آج ہماری شکلیں انگریزوں والی ہیں بلکہ عقلیں بھی انہی جیسی ہو گئی ہیں۔بس رسمی لفظی دعویٰ ایمان رہتا جا رہا ہے جبکہ اللہ فرماتا ہے: اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ اسلام میں پورے داخل ہو جاؤ۔ (بقرہ:۲۰۸)

اتحاد امت کا درس

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ کی مثال سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ کپڑے میں پہلے جتنے بھی نقوش اور رنگ ہوں جب اسے کسی خاص گہرے رنگ میں رنگ دیا جائے تو وہ سارے نقوش اس رنگ میں چھپ کر ختم ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہاں صبغۃ اللہ کہہ کر مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، اور خواہ وہ کسی بھی علاقہ، زبان اور رنگ و نسل سے تعلق رکھتے ہوں اسلام میں آ کر ان کی ان ساری شناختوں پر دین کی شناخت اور اس کے رنگ کو غالب آ جانا چاہیے، علامہ اقبال فرماتے ہیں:

بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

آپ فرمادیں کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا رب ہے ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے

اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝۱۳۹ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ

لئے تمہارے، اور ہم اسی کے لئے مخلص ہیں۔ [138] کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل،

وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ

اسحاق، یعقوب اور اسرائیلی نسلیں یہ سب یہودی یا عیسائی تھے؟ آپ فرما دیں تم

اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا

زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اس شہادت کو چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی

اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۰ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

طرف سے ہو؟ اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ [139] یہ جماعت انبیاء (دنیا سے) چلی گئی، ان کے لئے ان کے اعمال تھے

وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۱ ع

اور تمہارے لئے تمہارے، اور تم سے نہ پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے [140]

ع ۱۶ / ۱۶

[138] یعنی اے مسلمانو! تم یہود ونصاریٰ سے کہہ دو تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو یعنی اس کے لیے اولاد مانتے ہو یا کہتے ہو کہ اس کی رحمتیں صرف ہمارے ساتھ خاص ہیں حالانکہ اللہ تو ہم سب کا رب ہے۔ اس کی رحمتیں کسی خاص قوم سے مختص نہیں۔ اگر تم اچھے اعمال کرو گے یعنی اس کے سب رسولوں اور کتابوں پر ایمان لاؤ گے تو تمہیں فائدہ ہوگا۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم فائدہ اٹھائیں گے۔ لہٰذا ہم تو اسی کے لیے مخلص ہیں یعنی اسی کے لیے عبادت کو خالص رکھتے ہیں۔

[139] یہودی وعیسائی علماء نے اپنے عوام کو سمجھا رکھا ہے کہ ابراہیم، واسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور اسرائیلی نسلوں میں آنے والے سب انبیاء یہودی یا عیسائی تھے۔ یعنی یہود انہیں یہودی قرار دیتے اور عیسائی انہیں عیسائی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ جانتا ہے جب اللہ فرما رہا ہے: مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا

نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ (سورہ آل عمران، آیت نمبر ۶۷) اور فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ؕ۱۳۲ تو پھر ان انبیاء کو یہودی وعیسائی کہنے کا کیا معنی ہے۔ پھر یہودیت پیروان موسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت پیروان عیسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوئی جبکہ یہ انبیاء تو ان سے کئی صدیاں پہلے گزرے ہیں پھر وہ کس طرح یہودی یا عیسائی کہلا سکتے ہیں۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے یہود ونصاریٰ تمہارے پاس تورات وانجیل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے بارے میں جو شہادتیں موجود ہیں انہیں تم چھپاتے ہو تم سے بڑا ظالم کون ہے۔

[140] یہی مضمون آیت ۱۳۴ میں بھی گزرا برائے تاکید اسے پھر دہرایا گیا ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ

عنقریب بے وقوف لوگ کہیں گے ان (مسلمانوں) کو ان کے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے جس پر یہ پہلے تھے؟

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

آپ فرمادیں اللہ ہی کے لئے مشرق و مغرب ہے وہ جسے چاہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے۔[141]

رضائے رسول ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کا قبلہ کو تبدیل کرنا

[141] اس سے قبل پہلے پارہ کے اواخر میں بتایا گیا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سرزمین مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ تعمیر کیا تو حضور ﷺ کی آمد کے لیے دعا فرمائی۔ اب جب حضور سرورِ کائنات ﷺ تشریف لے آئے تو آپ ﷺ نے اللہ سے دعا فرمائی کہ کعبۃ اللہ کو قبلہ بنا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو قبول کر کے کعبہ شریف کو قبلہ نماز بنا دیا۔ تب یہود اور منافقین اس پر بہت چیں بہ جبیں اور معترض ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کے عنقریب کچھ بے وقوف لوگ مسلمانوں پر اعتراض کریں گے کہ انہیں کس چیز نے ان کے پہلے قبلہ سے پھیر دیا ہے۔ حالانکہ انہیں اللہ نے پھیرا ہے اور اللہ کسی خاص جہت میں مقید نہیں۔ مشرق و مغرب سمیت سب جہتیں اللہ کی ہیں وہ جدھر چاہے مومنوں کو رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے سکتا ہے۔

یاد رہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام تک کعبۃ اللہ ہی قبلۂ نماز رہا پھر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک رہا پھر بعثت نبوی کے بعد جب حضور ﷺ پر شب معراج پانچ نمازیں فرض ہوئیں تو آپ کو بھی بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا۔ تاہم جب تک آپ مکہ میں رہے بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی پاک ﷺ مسجد حرام میں ایسی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے جہاں دونوں قبلے بیت المقدس اور کعبہ شریف سامنے آ جائیں۔ (ابن ابی شیبہ، بیہقی)

پھر جب حضور سرکارِ دو عالم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو آپ حکم الٰہی کے مطابق نماز میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے۔ ایسے میں کعبہ شریف آپ کی پشت پر آ جاتا کیونکہ مدینہ طیبہ میں بیت المقدس جانب شمال ہے اور کعبہ شریف جانب جنوب۔ تب آپ کے قلب مبارک میں کعبۃ اللہ کے قبلۂ نماز بنائے جانے کا اشتیاق بڑھ گیا۔ اور آپ نماز پڑھتے ہوئے کئی بار آسمان کی طرف رخ کر لیتے تاکہ آپ کے لیے تبدیلی قبلہ کا حکم نازل ہو جیسا کہ آگے آیت ۱۴۴ میں آ رہا ہے۔

اسی کیفیت میں سولہ ماہ گزر گئے۔ آخر ایک دن نبی پاک ﷺ نماز ظہر پڑھ رہے تھے دوران نماز حکم آیا کہ آپ اپنا چہرہ کعبۃ اللہ کی طرف پھیر لیں۔ آپ ﷺ نے نماز ہی میں بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف یعنی شمال سے جنوب

اپنا چہرہ کعبۃ اللہ کی طرف پھیر لیں۔ آپ ﷺ نے نماز ہی میں بیت المقدس سے کعبۃ اللہ کی طرف یعنی شمال سے جنوب کی طرف رخ پھیر لیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے پیچھے ادھر ہی پھر گئے۔ روایات کے مطابق یہ تحویل قبلہ مسجد بنی سلمہ میں ہوئی جسے آج مسجد "قبلتین" کہتے ہیں۔ تحویل قبلہ کی خبر اہل قباء کو اگلے دن نماز فجر کے دوران ملی، کسی نے آواز دے کر کہا لوگو! گزشتہ رات قرآن اترا ہے اور قبلہ بدل گیا ہے تو وہ لوگ نماز ہی میں کعبہ کو پھر گئے۔ (بخاری کتاب الصلوٰۃ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کردار پر اعتراض بیوقوفوں کا کام ہے:

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ سے پتہ چلا جب منافقین و یہود نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر اعتراض کیا تو اللہ نے انہیں بیوقوف کہا۔ دوسری جگہ اللہ نے فرمایا: اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والے بیوقوف ہیں۔ (بقرہ: ۱۳) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والے بلاشبہ بیوقوف ہیں، اگر ان میں کچھ بھی سمجھداری و عقلمندی ہوتی تو وہ ان لوگوں کو برا نہ کہتے جن کی محنتوں کے صدقے آج ہم مسلمان بیٹھے ہیں۔ اور یہ انسان کی عظیم بدبختی ہے کہ وہ شیطان کے ہاتھوں بیوقوف بن کر اپنے محسنین کو برا کہنا شروع کر دیتا ہے۔

اگر قبلہ معلوم نہ ہو تو نماز میں جدھر دل مطمئن ہو ادھر ہی رخ کر لیا جائے:

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ پتہ چلا اگر کسی جگہ نمازی کو قبلہ معلوم نہ ہو تو جدھر اس کا دل مطمئن اور زیادہ گمان ہو ادھر ہی رخ کر کے نماز پڑھ لے کیونکہ سب مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے۔ اور پیچھے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (بقرہ: ۱۱۵) کے تحت ہم اس موضوع پہ تفصیلی گفتگو کر آئے ہیں کہ جب انسان قبلہ کی طرف منہ کرنے پہ قادر نہ ہو تو جدھر بھی رخ کر کے نماز پڑھی جا سکے پڑھنا جائز ہے، اور جب قبلہ معلوم ہی نہ ہو تو بطریق اولیٰ جائز ہے کہ جدھر دل مطمئن ہو ادھر نماز پڑھ لی جائے۔

خبر واحد لائق حجت ہے:

حدیث بخاری کے مطابق اہل قباء کو ایک شخص نے جا کر بتایا کہ قبلہ بدل گیا ہے تو انہوں نے اسی خبر پر اپنا رخ بدل لیا۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی کی خبر صحیح حجت ہے جس سے احکام ثابت ہو سکتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ

اور اس طرح ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا [142] تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ

الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا

اور رسول ﷺ تم پر گواہ ہو جائیں [143] اور وہ قبلہ جس پر آپ پہلے تھے ہم نے صرف اس لئے

لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ

بنایا تھا تاکہ ہم آزمائیں کہ کون رسول ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے اور بے شک یہ (تحویل قبلہ)

لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ

بڑا بھاری کام تھا مگر ان پر (بھاری نہ تھا) جنہیں اللہ نے ہدایت دی [144] اور اللہ کی شان نہیں کہ تمہارا ایمان ضائع کرے،

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

بے شک اللہ لوگوں پر بہت شفیق اور مہربان ہے۔[145]

[142] تحویلِ قبلہ پر جب یہود و منافقین مدینہ و مشرکین نے اعتراضات کر کے مسلمانوں کو پریشان کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دل جوئی کے لیے فرمایا کہ تم سب سے افضل امت ہو (کہ تمہیں دونوں قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا ملا کسی دوسری امت کو یہ فضیلت نہ ملی۔ لہٰذا مخالفین کے اعتراضات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔)

امتِ وسط ہونے کا معنیٰ:

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تمہیں درمیانی امت بنایا ہے۔ یعنی میانہ روی والی امت جو افراط و تفریط سے ہٹ کر راہ حق پر چلتی ہے۔ چنانچہ یہ امت نہ یہود کی طرح انبیاء کی دشمن ہے نہ عیسائیوں کی طرح انہیں درجہ الوہیت دیتی ہے بلکہ جو ان کا مقام اللہ تعالیٰ نے بنایا اسے مانتی ہے، ان کے لیے احکام بھی میانہ رو رکھے گئے۔ نہ شریعت موسوی کی طرح بہت سخت نہ شریعت عیسوی کا طرح بہت نرم، اسی طرح اسلام میں نہ رہبانیت ہے کہ دنیا کو ہاتھ ہی نہ لگایا جائے نہ ایسی دنیاداری کہ خدا سے بے خبری ہو جائے۔ تو درمیانی امت کا معنی افضل امت ہوا، کیونکہ ہر چیز کا درمیان عموماً اس کا سب سے افضل حصہ ہوتا ہے، خیر الامور اوسطھا، جیسے افراط و تفریط کے درمیان اعتدال، بزدلی اور خونریزی کے درمیان شجاعت اور کنجوسی اور فضول خرچی کے درمیان کفایت شعاری ہے۔ تو ہر چیز کا درمیان ہی افضل ہے، اسی طرح

امت محمدیہ کو درمیانی امت کہہ کر اسے افضل امت قرار دیا گیا ہے۔

[143] جب امت محمدیہ سب سے افضل امت ٹھہری تو اسے یہ اعزاز دیا گیا کہ روز قیامت جب پہلی امتوں کے کفار یہ کہہ دیں گے کہ انہیں راہ حق دکھانے کے لیے کوئی نبی نہیں آیا تھا تو اس وقت امت محمدیہ کے عالی مرتبت لوگ جیسے صدیقین (صحابہ) شہداء و صالحین انبیاء سابقین کے حق میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی امتوں کو دعوت حق پہنچائی تھی اور کفار جھوٹ کہتے ہیں۔ وہ کفار کہیں گے یہ امت محمدیہ تو ہمارے بعد دنیا میں آئی۔ یہ لوگ ہمارے خلاف کیسے گواہی دے سکتے ہیں۔ تب حضور ﷺ اپنی امت کے حق میں گواہی دیں گے کہ ہاں میں نے انہیں بتایا تھا کہ ہر نبی نے اپنا کام پورا کیا تھا۔

چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''روز قیامت حضرت نوح علیہ السلام اللہ کے حضور پیش ہونگے۔ ان سے پوچھا جائے گا کیا آپ نے اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں پہنچایا تھا، تو ان کی قوم انکار کر دے گی، وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہ آیا تھا۔ نوح علیہ السلام سے کہا جائے گا: کیا آپ علیہ السلام کے پاس کوئی گواہ ہے؟ وہ کہیں گے: **مُحمدٌ و اُمتُه** محمد ﷺ اور ان کی امت میرے گواہ ہیں۔ تب امت محمد ﷺ نوح علیہ السلام کے حق میں گواہی دے گی اور حضور ﷺ اپنی امت کی صداقت پہ گواہی دیں گے (کہ ہاں میری امت میرے کہنے پہ گواہی دے رہی ہے) تو اس بارے میں یہ آیت ہے: لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ'' (بخاری کتاب التفسیر حدیث ۴۴۸۷)

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ امت مسلمہ دنیا میں بھی گواہ ہے کہ امت جس شخص کے صالح ہونے کی گواہی دے دے وہ اللہ کے ہاں صالح ہے جس کے فاسق ہونے کی گواہی دے وہ فاسق ہے۔

ایک راوی ابو الاسود کہتے ہیں میں مدینہ طیبہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان پہ مرض کا حملہ تھا، اتنے میں ایک جنازہ گزرا۔ لوگوں نے اس میت کی تعریف کی۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہنے لگے: **وجبت** واجب ہوگئی، پھر ایک جنازہ گزرا لوگوں نے اس کی برائی کہی (کہ یہ شخص اچھا نہیں تھا) حضرت عمر نے کہا: وجبت کہ واجب ہوگئی۔ ابو الاسود کہتے ہیں: میں نے پوچھا اے امیر المؤمنین کیا واجب ہوگئی؟ وہ کہنے لگے: میں نے وہی بات کہی ہے جو میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا تھا۔ پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سنایا کہ جس مسلمان کے لیے چار آدمی بھلائی کی گواہی دیں اللہ اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ ہم نے کہا اگر تین آدمی گواہی دیدیں؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تین بھی کافی ہیں۔ ہم نے کہا: اگر دو ہوں؟ فرمایا دو بھی کافی ہیں۔ (بخاری کتاب الجنائز حدیث ۱۳۶۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار ایک جنازہ گزرا لوگوں نے اس کی تعریف کی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: **وجبت** کہ واجب ہوگئی پھر دوسرا جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کی مذمت کی۔ نبی ﷺ نے فرمایا: **وجبت** یعنی واجب

ہوگئی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا واجب ہوگئی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی تم نے تعریف کی اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ اور دوسرے کے لیے جہنم واجب ہوگئی۔ اور فرمایا انتم شھداء اللہ فی الارض یعنی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ (بخاری کتاب الجنائز حدیث ۱۳۶۸)

امت محمدیہ کی افضلیت:

اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ سے امت محمدیہ کی افضلیت معلوم ہوئی۔ وَّسَطًا سے بھی افضل ہونا مراد ہے اور روز قیامت اس امت کا سب انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں گواہی دینا بھی اسی لیے ہوگا تاکہ اس کی افضلیت ظاہر ہو ورنہ انبیاء کی صداقت کسی اور طرح بھی ظاہر کی جاسکتی تھی۔

اسی لیے فرمایا گیا: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ''اے امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سب سے افضل امت ہو جسے لوگوں کی راہنمائی کے لیے پیدا کیا گیا۔'' (آل عمران، ۱۱۰)

بلکہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب رسولوں سے افضل ہونا بھی معلوم ہوا۔ کیونکہ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ سے معلوم ہوا کہ آپ کے اشارے سے آپ کی امت انبیاء کرام کے حق میں گواہی دے گی پھر آپ کی گواہی سے سارے انبیاء کی مشکل آسان ہوجائے گی۔

امت محمدیہ کا اجماع حجت ہے:

جب لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ کے مطابق امت محمدیہ کی گواہی دنیا و آخرت میں مقبول ہے اور حدیث کے مطابق جب چند افراد کے کسی جنازہ کو اچھا یا برا کہنے سے اس کا جنتی یا دوزخی ہونا ثابت ہوتا ہے تو اس سے اس امت کے علماء و صلحاء کا کسی مسئلہ پر متفق الرائے ہونا اس کے عند اللہ صواب ہونے کی بھی دلیل ہے۔ بلکہ قرآن کے مطابق مسلمانوں کے اجتماعی موقف سے ہٹنے والا شخص جہنمی ہے، وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ ''جو شخص مسلمانوں کے راستہ سے ہٹ کر چلے ہم اسے ادھر ہی پھیر دیتے ہیں جدھر وہ پھرے، اور اسے ہم جہنم میں گرادیں گے۔'' (نساء، ۱۱۵)

اسی لیے حدیث ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، میں نے خود سنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتجتمع امتی علی الضلالة واذا رأیتم اختلافا فعلیکم بالسواد الاعظم ''میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی اور جب تم اختلاف دیکھو تو تم پہ لازم ہے کہ سب سے بڑی جماعت کو پکڑ لو۔''

(ابن ماجہ کتاب الفتن باب ۸ حدیث ۳۹۵۰)

اہل تشیع اجماع امت کو حجت نہیں مانتے حالانکہ یہ حدیث کتب اہل تشیع میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ ملا باقر مجلسی نے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

سیزدہم آنست کہ خدا ایشاں را بہ گرسنگی نمی کشد وایشاں را بر گمراہی جمع نمی کند،

یعنی تیرہویں فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ امت محمدیہ کو بھوک سے نہیں مارے گا اور ان کو گمراہی پہ جمع نہیں کرے گا۔

(حیات القلوب جلد ۳ صفحہ ۳۵۲ مطبوعہ انتشارات سرور، قم)

اس سے خلفاء راشدین کی خلافت پر مہر صداقت بھی ثبت ہوتی ہے کہ وصال رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یعنی تمام امت محمدیہ ان کی خلافت پر متفق ہوئی تو ان کا یہ اجماع خلفاء راشدین کی خلافت کی حقانیت کی دلیل ہے، کیونکہ امت محمدیہ گمراہی پہ جمع نہیں ہوسکتی۔ یہی راہ ہدایت ہے اس سے ہٹنا گمراہی ہے۔

[144] یعنی ہم نے کچھ مدت بیت المقدس کو قبلہ رکھا پھر اسے بدل کر کعبۃ اللہ کو قبلہ بنایا تا کہ ظاہر ہو جائے کہ کون رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتا ہے۔ اور کون تحویل قبلہ دیکھ کر دین ہی سے پھر جاتا ہے اور یہ تحویل قبلہ بہت بھاری کام تھا اسی لیے کئی منافقین اس موقع پر پکے کافر بن گئے اور ایک روایت کے مطابق کئی نئے مسلمان بھی فتنہ میں پڑ گئے۔ (ابن جریر عن ابن جریج) تاہم مہاجرین وانصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے مضبوطی سے دامن رسول تھام رکھا تھا۔ ان کے لیے یہ واقعہ کچھ بھاری نہ تھا۔

حجیت حدیث کی دلیل:

یہاں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ حدیث بھی قرآن کی طرح حجت ہے۔ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ (جس قبلہ پر آپ پہلے تھے وہ ہم نے اس لیے بنایا، الخ) کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ بیت المقدس کی طرف حضور ﷺ کا رخ کرنا آپ کے اجتہاد کے سبب سے نہ تھا جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ وہ اللہ کے حکم سے تھا۔ اسی لیے اللہ نے وَمَا جَعَلْنَا کہہ کر اسے اپنی طرف منسوب کیا۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ ہجرت سے قبل انصار مدینہ کو بھی حکم تھا کہ بیت المقدس ہی کی طرف رخ کیا کریں۔ اب جس حکم کے تحت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے وہ حکم قرآن میں کہیں مذکور نہیں، یقیناً وہ حکم حدیث میں ہوا تھا۔ اب اگر حدیث کو حجت نہ مانا جائے تو تحویل قبلہ کا حکم ثابت ہی نہیں ہوسکتا۔ اس سے حدیث کا حجت ہونا ظاہر و باہر ہے۔ اور اللہ کا **وما جعلنا** کہہ کر پہلے قبلہ کے حکم کو اپنی طرف منسوب کرنا بتا رہا ہے کہ حکم حدیث بھی مثل حکم قرآن ہے۔

اسلام میں نسخ کا ثبوت:

مرزائی اور پرویزی فرقے اسلام میں کسی نسخ کو نہیں مانتے، بلکہ وہ مسلمانوں کا اس بناء پہ مذاق اڑاتے ہیں کہ انہوں نے نسخ مان کر قرآن اور اسلام کو معاذ اللہ غیر محکم اور غیر معتبر بنا دیا ہے، حالانکہ ان کا نسخ سے انکار خود قرآن کریم

سے انکار ہے، اور یہ تحویل قبلہ بھی از قسم نسخ ہے، کیونکہ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ قبلہ پہلے اور تھا پھر اور کر دیا گیا اور اگر وہ نسخ کو نہیں مانتے تو انہیں چاہیے کہ وہ اب بھی بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں۔

[145] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ کو رخ کرنے کا حکم دیا تو لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم میں سے جو لوگ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہوئے فوت ہو گئے ان کا کیا بنا (کیا ان کی نمازیں قبول نہ ہوئیں؟) تب اللہ نے یہ آیت اتاری: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ؕ کہ اللہ تمہارا ایمان ضائع نہیں کرنا چاہتا وہ بہت مہربان و رحیم ہے۔ (ترمذی، حاکم) یعنی جو نمازیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی گئیں وہ اپنے وقت میں قبول تھیں اب کعبہ کو رخ کر کے پڑھو گے تو قبول ہوں گی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ؕ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ نماز کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے دین میں نماز کی اہمیت کا علم ہوا۔ اسی لیے حدیث ہے: لا ایمان لمن لا صلوٰۃ لہٗ جو نماز نہیں پڑھتا اس کا کوئی ایمان نہیں۔ (طبرانی اوسط عن ابن عمر رضی اللہ عنہما) مطلب یہ ہے کہ بے نماز آدمی ایمانی علامت سے محروم ہے۔

نماز میں قبلہ رخ ہونا کیوں لازم ہے، اس کا فلسفہ:

جب اللہ کی ذات کسی خاص جہت میں مقید نہیں ہے تو پھر ایک متعین جہت کی طرف رخ کر کے نماز کا پڑھنا کیوں لازم ہے؟ اس سوال کے متعدد جوابات ہیں۔ اول: کعبہ کی طرف رخ کرنا اس لیے لازم ہے کہ اس سے نماز میں یکسوئی پیدا ہوتی ہے، جب نمازی کعبہ کو رخ کرتا ہے تو اسکے تصور میں کعبہ آجاتا ہے اور وہ اپنے دل میں تصور کعبہ جما لیتا ہے، یوں اس کے دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ دوم: استقبال قبلہ سے نظم و ضبط پیدا ہوتا ہے۔ جب ایک امام کے پیچھے ہزاروں لاکھوں لوگ ایک سمت میں صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں تو ایک پیارا سماں بندھ جاتا ہے۔ اگر یہ لازم نہ ہو بلکہ امام اپنی مرضی سے جدھر چاہے منہ کر لے ہر مقتدی اپنی مرضی اپنا لے تو خاک نظم و ضبط پیدا ہوگا۔ سوم: ساری دنیا کے مسلمانوں کا ایک مرکز کی طرف رخ کرنا اتحاد امت کی عظیم علامت ہے گویا وہ ایک مرکز سے وابستہ اور ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۖ فَوَلِّ

ہم دیکھتے ہیں کہ آپ آسمان کی طرف بار بار چہرہ اٹھاتے ہیں تو ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف ضرور پھیر دیں گے جدھر آپ راضی ہیں

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ

تو آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی سمت پھیر لیں اور اے مسلمانو! تم جہاں بھی ہو اپنے چہرے اسی سمت پھیر لو [146]

شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ

اور بیشک جن لوگوں کو کتاب (تورات و انجیل) دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ (قبلہ بدلنا) ان کے رب کی طرف سے حق ہے

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۴

اور اللہ ان کے اعمال سے بے خبر نہیں۔[147]

[146] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ہجرت کے بعد) اٹھارہ ماہ (ڈیڑھ برس) بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اور نبی پاک صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان کی طرف رخ کرتے، اللہ جانتا تھا کہ آپ کعبہ کو رخ کرنا چاہتے ہیں تو حضرت جبرائیل علیہ السلام آسمان کی طرف گئے۔ آپ کی نگاہ ان کا تعاقب کرتی رہی اس انتظار میں کہ وہ کیا جواب لاتے ہیں۔

تب یہ آیت نازل ہوئی: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ کہ اے پیارے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کا آسمان کی طرف بار بار رخ کرنا (اور دل ہی دل میں تحویل قبلہ کی دعا کرنا) ہم دیکھتے ہیں، تو ہم آپ کو ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر آپ پھرنا چاہتے ہیں تو آپ (ابھی اسی وقت) اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور اے مسلمانو تم دنیا کے جس بھی کونے میں ہو تم اپنا رخ مسجد حرام کی طرف ہی پھیر لو۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا اے جبرائیل جو نمازیں ہم نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھیں ان کا کیا حال ہے۔ تب یہ آیت اتری: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ (ابن ماجہ کتاب اقامۃ الصلوات باب ۵۶ حدیث ۱۰۱۰)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کعبہ شریف کو قبلہ نماز بنانے کی شدید تمنا دل میں رکھنا اس لیے تھا کہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو ملت ابراہیم علیہ السلام قرار دیا اور کعبہ شریف انہی کا بنا کردہ تھا اور اسی کعبہ کی تعمیر کے بعد انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیا میں آمد کی دعا کی تھی جیسا کہ پیچھے وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ (بقرہ، ۱۲۹) گزر چکا۔

لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدید تمنا رکھتے تھے کہ کعبہ کو قبلہ نماز بنایا جائے، البتہ ہجرت کے بعد کچھ عرصہ سولہ یا اٹھارہ ماہ بیت المقدس کی طرف رخ رکھا گیا جو کہ یہود کا بھی قبلہ ہے تاکہ وہ اسلام کے قریب آئیں مگر جب وہ ضد پر اڑے رہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمنا پوری کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو قبلہ نماز بنا دیا۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا چاہتا ہے:

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا میں غور کریں۔ قِبۡلَةً کا معنی جِهَةً ہے یعنی ایسی جہت جدھر رخ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس بھی سمت پر آپ خوش ہیں ہم آپ کو ادھر ہی پھیر دیتے ہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہا گیا کہ ہمیں کسی قبلہ سے غرض نہیں ہمیں تو صرف آپ کی رضا عزیز ہے۔

اسی لیے فرمایا: وَلَسَوۡفَ يُعۡطِيۡكَ رَبُّكَ فَتَرۡضٰى ؕ یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رب آپ کو اسقدر دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ (ضحیٰ، ۴)

حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اسی لیے عرض کیا:

وما نریٰ ربّك الا یُسارِعُ فی هواك یا رسول الله یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ آپ کا رب آپ کی ہر تمنا پوری کرنے میں جلدی فرماتا ہے۔ (دیر نہیں لگائی جاتی)

(بخاری کتاب التفسیر سورہ احزاب زیر آیت ۵۱، مسلم کتاب الرضاع، نسائی کتاب النکاح باب ۱، ابن ماجہ کتاب النکاح باب ۵۷)

اسی لیے امام احمد رضا خان فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم خدا چاہتا ہے رضائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کعبۃ اللہ پہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان ہے:

کعبہ اگر قبلہ بنا ہے تو دعاء رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے بنا ہے۔ کعبہ پہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ احسان بھی ہے کہ کعبہ کو بت خانہ بنا دیا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آکر اسے بت خانہ سے خانۂ خدا بنا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے قبل کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ حدیث مبارک میں ہے کہ جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے کعبۃ اللہ کے ساتھ نصب تمام بت منہ کے بل زمین پہ گر گئے۔

اور پروانے ہیں جو کعبہ پر ہوتے ہیں نثار
شمع اک تو ہے کہ پروانہ ہے کعبہ تیرا
سارے اقطاب جہاں کرتے ہیں کعبہ کا طواف
کعبہ کرتا ہے طواف دور والا تیرا

سارے عالم کے لیے کعبہ شریف کی سمت ہی قبلہ ہے نہ کہ کعبہ کی دیوار:

فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ اور فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ میں لفظ شطر قابل توجہ ہے۔

اس کا معنی طرف اور جہت ہے یعنی اللہ نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو عین دیوار کعبہ کی طرف نہیں بلکہ اس سمت اور جہت کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا ہے جدھر کعبہ ہو۔

اسی لیے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **مابین المشرق والمغرب قبلة**، یعنی (اہل مدینہ کے لیے) مشرق اور مغرب کے درمیان (سارا جنوب) قبلہ ہے۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو الجھن تھی کہ کیسے ہم عین کعبہ شریف کی طرف رخ کریں تو چونکہ وہاں کعبۃ اللہ جنوب میں ہے۔ اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا کہ جب نماز میں تمہارا رخ مشرق اور مغرب کے درمیان رہے گا یعنی پورے جنوب کی کسی جز میں ہوگا تو تمہاری نماز درست ہے۔

اسی لیے فقہاء نے ۴۵ ڈگری کے درمیان کعبہ کی طرف رخ ہو جانا کافی قرار دیا ہے اور جس کا رخ کعبہ سے ۴۵ ڈگری سے زیادہ دائیں بائیں ہٹا ہوا ہو اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لہٰذا پاکستان، انڈیا، چائنہ، انڈونیشیا اور اسٹریلیا اور مشرقی ایشیا کا قبلہ جانبِ مغرب ہے۔ یورپ، امریکہ اور کنیڈا کا قبلہ جانب مشرق ہے ایران، ترکی، قازقستان اور مغربی ایشیا کا قبلہ جانب جنوب ہے اور یمن اور اکثر افریقی ممالک کا قبل جانب شمال ہے۔ البتہ افریقہ میں سے مصر، لیبیا، تیونس اور مراکش کا قبلہ جانب مشرق ہے اسی طرح ہر ۴۵ ڈگری کے درمیان واقع ممالک کا وہی قبلہ ہے جس سمت میں وہاں کعبہ ہے۔

یعنی تمام مسلمانان عالم کے لیے ضروری نہیں کہ ہر شخص یوں نماز پڑھے کہ کعبہ اس کی ناک کے عین سامنے ہو اور نہ ہی یہ ممکن ہے، صرف اتنا ضروری ہے کہ جس سمت میں کعبہ ہے اس سمت کو رخ ہو جائے۔ لہٰذا مشرق والوں کا قبلہ جانب ہے اور مغرب والوں کا قبلہ مشرق ہے۔ یہی حال جنوب وشمال کا ہے۔

لہٰذا اگر کسی مسجد کا قبلہ عین قبلہ کی طرف نہ ہو اور آج کل جو قبلہ نما بنے ہوئے ہیں ان کے رخ سے کچھ ہٹا ہوا تو بھی اس میں نماز جائز ہے، بشرطیکہ ۴۵ ڈگری سے زیادہ ہٹا ہوا نہ ہو۔

5
6 4
3 1
2
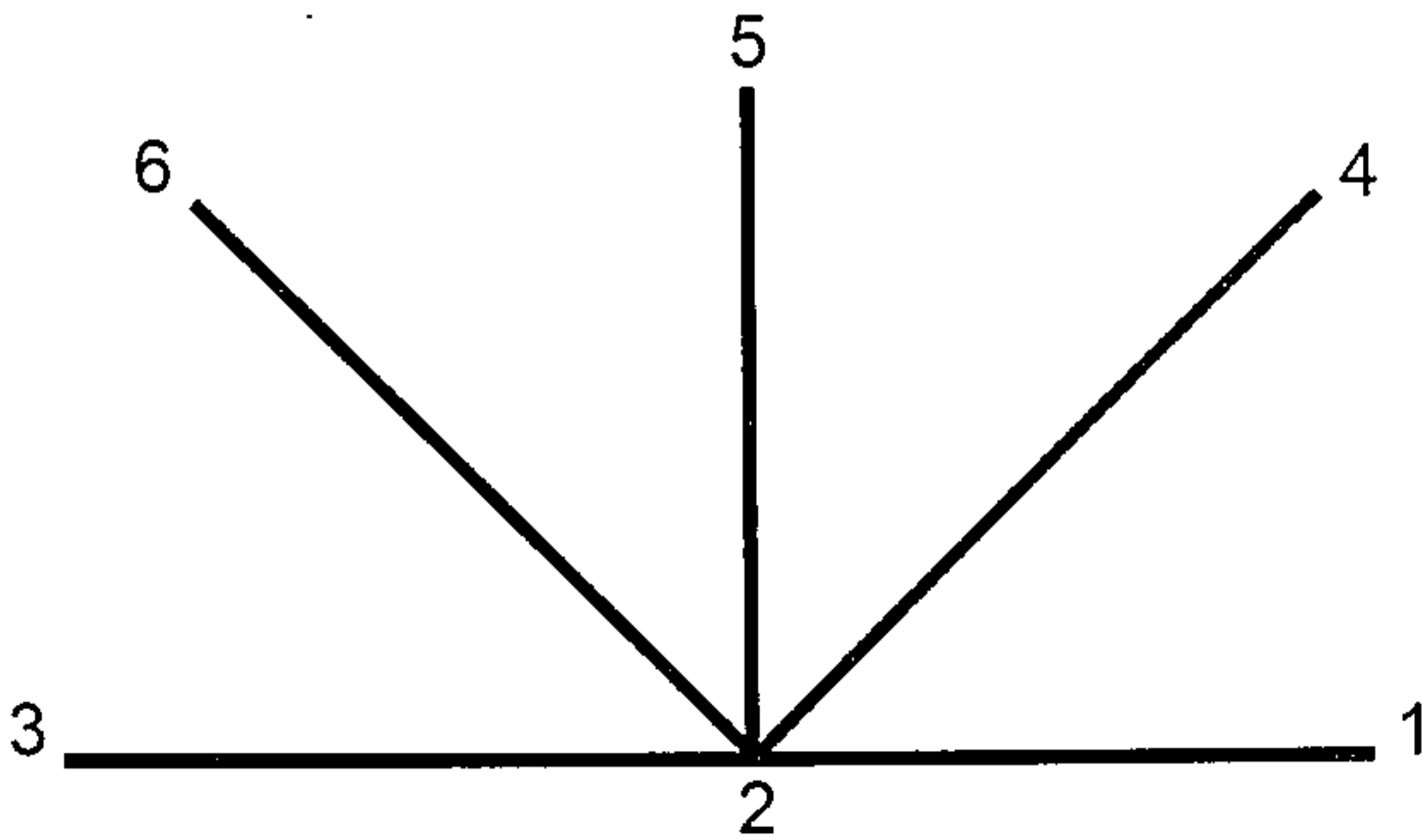
[147] ابوالعالیہ (تابعی) فرماتے ہیں اہل کتاب اچھی طرح جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام

(جو موسیٰ علیہ السلام سے قبل آئے) کا قبلہ کعبۃ اللہ ہی رہا ہے۔ اور یہ کہ آخری نبی دونوں قبلوں کی طرف رخ کرے گا۔ اس کے باوجود یہود نے تحویل قبلہ پر اعتراض کیا تو اللہ ان کی حرکتوں سے بے خبر نہیں۔ (ابن جریر)

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ

اور اگر آپ ان لوگوں کے پاس جنہیں کتاب دی گئی ہے ہر نشانی لے آئیں تو بھی وہ آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ

اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

آپ ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں اور نہ وہ خود ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرتے ہیں اور (اے مؤمنو!) اگر تم

اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾

نے ان کی خواہشات کی پیروی کی بعد ازاں کہ تمہارے پاس علم آ گیا تو تم ظالموں میں سے ہو گے۔ [148]

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا

جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بے شک ان میں سے

مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ

کچھ لوگ حق کو چھپاتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے تو تم شک کرنے والوں

مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ ع

میں سے نہ بنو۔ [149]

وقف لازم

وقف منزل

١٧ ع

[148] یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل کتاب ہر دلیل دیکھنے کے باوجود آپ کا قبلہ نہیں مانیں گے اور آپ بھی ان کے قبلہ کی طرف رخ نہیں کرنے والے۔ اس میں یہ اشارہ دیا گیا کہ آئندہ قبلہ تبدیل ہو کر بیت المقدس کی طرف کبھی واپس نہ جائے گا بلکہ قیامت تک کعبہ ہی قبلہ رہے گا اور اہل کتاب آپ کے قبلہ پر کیوں معترض ہیں وہ تو خود مختلف قبلے رکھتے ہیں۔ عیسائی دعا کے وقت ہمیشہ مشرق کی طرف رخ کرتے ہیں۔ جہاں بھی ہوں اور یہود کا قبلہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی ہے۔ اصل میں ان کی خواہشات ہی ان کا قبلہ ہیں اور اے ہر سننے والے مومن! اگر تم نے ان کے قبلہ کو اپنایا تو تم ظالم ہو گے کیونکہ تمہارے پاس قرآن آ گیا۔ اب جو وہ کہے وہ تم پر لازم ہے۔

گویا بتایا گیا کہ مومن کے لیے اصل قبلہ تو مرضی مولا ہے۔ مولا تعالیٰ کا حکم جدھر ہو مومن ادھر ہی اپنا رخ

کرلیتا ہے۔ اسے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مشرق کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا یا مغرب کی طرف۔ اسی لیے فرمایا گیا: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

[149] تورات وانجیل میں حضور ﷺ کا مکمل حلیہ مبارک بیان کیا گیا۔ جب نبی پاک ﷺ مبعوث ہوئے تو اہل کتاب نے آپ ﷺ کا چہرہ انور دیکھ کر اچھی طرح جان اور پہچان لیا کہ یہ وہی نبی آخر الزمان ہیں جن کی صورت ان کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ یعنی وہ تورات وانجیل میں آپ کا حلیہ لکھا ہوا پاتے ہیں۔ (اعراف: ۱۵۷)

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ آپ کو یوں پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔ اس کے باوجود ان کا ایک گروہ جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے یعنی ان کے علماء جو حضور ﷺ کے ذکر والی آیات اپنی کتابوں سے نکالتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو انہوں نے کہا: آپ ﷺ رسول برحق ہیں آپ کا حلیہ ہماری کتابوں میں لکھا ہوا ہے جبکہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ہماری بیویوں نے کیا کیا لہٰذا ہم آپ کو اپنے بیٹوں سے بھی بڑھ کر پہچانتے ہیں۔ (درمنثور)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ لڑکپن میں اپنے چچاؤں کے ساتھ شام گئے۔ وہاں ایک راہب (بحیرا) کے قریب سے گزر ہوا۔ اس نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: یہ سید العالمین ﷺ ہیں یہ رسول رب العالمین ہیں انہیں اللہ تعالیٰ رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمانے والا ہے۔
(ترمذی کتاب المناقب حدیث ۳۶۲۰)

اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیب ﷺ کا ذکر پسند ہے:

گویا اللہ کو اپنے حبیب ﷺ سے ایسا پیار ہے کہ تورات وانجیل میں آپ کا پورا حلیہ اور صفات مبارکہ بیان کی گئیں تاکہ زمانہ ہمیشہ آپ کے ذکر سے گونجتا رہے۔ قرآن مجید بھی حضور سرورِ کونین ﷺ کی عظمتوں ہی سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ آپ کے فضائل چھپانا کارِ یہود ہے۔ کیونکہ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ، سے پتہ چلا یہود آپ کے فضائل چھپاتے تھے، لہٰذا مؤمن کا حق ہے کہ اپنے آقا و مولیٰ شافع محشر ﷺ کے فضائل بڑھ چڑھ کر بیان کرے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ط اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ

اور ہر کسی کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ رخ کرتا ہے تو تم نیکیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاؤ۔

بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ

تم جہاں بھی ہو اللہ تم سب کو اکٹھا لے آئے گا بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ [150] اور تم جہاں سے بھی

خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ

آؤ تو اپنا چہرہ مسجد حرام ہی کی طرف کرو اور بے شک یہ تمہارے رب کی طرف سے

رَّبِّكَ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

حق ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

تحویل قبلہ پر اعتراضات کا رد اور امت محمدیہ پر اتمام نعمت کا بیان

[150] یعنی ہر قوم کا ایک مذہبی قبلہ ہے جدھر وہ رخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ یہود ہیکل سلیمانی کی طرف رخ کرتے ہیں تو نصاریٰ مشرق کی طرف لہٰذا مسلمانوں کا جو بھی قبلہ ہو خواہ پہلے بیت المقدس تھا یا اب کعبہ ہے۔ اس پر کسی دوسری قوم کو اعتراض کا حق نہیں۔ جب مسلمان کسی قوم کے قبلہ پر اعتراض نہیں کرتے تو انہیں بھی مسلمانوں کے قبلہ پر اعتراض نہیں رکھنا چاہیے تو اے مسلمانو تم ان کے اعتراض کی پرواہ کیے بغیر نیکی کے ہر کام میں سبقت لے جاؤ یعنی ان کے اعتراضات میں الجھ کر اپنی منزل نہ کھولو کیونکہ روز قیامت اللہ تمہیں اپنے سامنے کھڑا کرنے والا ہے۔ وہ ہر چیز پہ جو اس کی شان کے لائق ہے قادر ہے۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا کی دیگر تفاسیر بھی ہیں جو کتب تفسیر میں لکھی ہیں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط کے الفاظ دوبار مزید دوہرائے ہیں، اگر کہا جائے کہ اس کا کیا مقصد ہے، تو ہم عرض کرتے ہیں کہ چونکہ ابتداء میں فرمایا گیا تھا وانها لكبيرة کہ قبلہ کا بدلنا بہت بڑی بات ہے، یعنی اس کا قبول کرنا طبائع انسانی پہ بھاری ہے، اس لیے تحویل قبلہ کے حکم کو تین بار دوہرایا گیا تا کہ اس کے قبول کرنے میں کوئی شخص تردد نہ کرے، بعض مفسرین نے کہا کہ پہلا حکم اہل مکہ کے لیے ہے دوسرا تمام باقی اہل مصار کے لیے اور تیسرا مسافرین کے لیے جو آبادیوں سے باہر ہوں انہیں بھی کہا گیا کہ وہ جہاں بھی ہوں نماز میں قبلہ رخ ہو جائیں۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ

اور تم جہاں سے بھی نکلو تو (نماز میں) اپنا چہرہ مسجد حرام ہی کی طرف رکھو اور تم جہاں بھی ہو

مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ

اپنا چہرہ اسی کی طرف پھیرلو، [151] تاکہ لوگوں کے لئے تم پر کوئی حجت نہ رہے سوا ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں

اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۗ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ

تو تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تاکہ

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥٠﴾ ۙ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا

تم ہدایت پاؤ۔ [152] جیسا کہ ہم نے تمہارے اندر عظیم الشان رسول بھیجا جو تمہی میں سے ہے تم پر

عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ

ہماری آیات پڑھتا ہے، تمہیں پاک کرتا اور تمہیں کتاب و سنت سکھاتا ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم

تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٥١﴾ ؕ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿١٥٢﴾ ع

نہیں جانتے تھے۔ [153] تو تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری نعمتوں کا کفران نہ کرو۔ [154]

معانقة ١٨ ع ۵ ٢

[151] یعنی تم جہاں سے بھی سفر پہ نکلو یا تم جہاں بھی اقامت پذیر ہو الغرض سفر و حضر ہر صورت میں تم پر نماز میں کعبہ ہی کی طرف رخ کرنا لازم ہے اور یہی تمہارے رب کی طرف سے برحق حکم ہے۔ یہ حکم یہاں تین بار دھرایا گیا کیونکہ تحویلِ قبلہ اسلام میں پہلا نسخ تھا۔ طبائع پر گراں تھا جیسے کہا گیا۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ (بقرہ:۱۴۳) اس لیے یہ حکم بار بار دہرایا گیا۔

[152] اس جگہ بتایا جا رہا ہے کہ کن مقاصد کے تحت قبلہ میں تبدیلی کی گئی، کیونکہ اللہ رب العزت جل جلالہ کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں ہوتا، ضرور اس کے پیچھے گہری حکمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں، تو قبلہ کی تبدیلی کن حکمتوں کے تحت کی گئی، اس سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔

کن مقاصد کے تحت تحویل قبلہ کی گئی:

تو فرمایا کہ ہم نے قبلہ اس لیے بدلا ہے تاکہ یہود کا مسلمانوں پر یہ اعتراض نہ رہے کہ مسلمان ہمارا دین تو نہیں مانتے مگر قبلہ ہمارا ہی اختیار کر رکھا ہے کیونکہ ان کا قبلہ ہیکل سلیمانی ہے جو بیت المقدس کے ساتھ ہی ہے۔ اسی طرح مشرکین مکہ کا یہ اعتراض بھی نہ رہے کہ مسلمان یوں تو خود کو ملت ابراہیمی کا حامل کہتے ہیں مگر ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ اختیار نہیں کرتے۔

چنانچہ جب قبلہ تبدیل ہوا تو یہ دونوں اعتراض ختم ہو گئے۔ البتہ بعض ظالم لوگ پھر بھی اعتراض کرتے ہی رہے۔ مثلاً یہود میں سے بعض نے کہا۔ یہ شخص (محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے باپ دادا کے دین کی طرف پھر گیا ہے (یعنی قریش کی طرح مشرک ہو گیا ہے معاذ اللہ) اور مشرکین مکہ میں سے بعض نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اس کا دین مشتبہ ہو گیا ہے اس نے تمہارا قبلہ اختیار کر لیا ہے ممکن ہے جلد ہی تمہارا دین بھی اختیار کر لے، اس لیے کہا گیا: اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ

تحویل قبلہ کے مقاصد میں سے یہ بھی تھا کہ بتایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کسی خاص جہت میں مقید نہیں، اسی لیے فرمایا گیا: لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ (بقرہ، ۱۴۲)

اور یہ آزمایا جائے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے کون نہیں، اسی لیے فرمایا گیا: اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ (بقرہ، ۱۴۳)

اور یہ کہ محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ظاہر کی جائے کہ ان کی رضا کے لیے قبلہ بھی بدلا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ امت محمدیہ کو دونوں قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا اعزاز دیا جائے۔ اس لیے ساتھ فرمایا گیا وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وغیرہ۔

استقبالِ قبلہ کے متعلق چند احکام:

کعبہ شریف کی دیواروں اور پتھروں کا نام قبلہ نہیں ہے بلکہ اس جگہ اور فضا کا نام قبلہ ہے جو اوپر عرش تک ہے نیچے تہ زمین تک، اسی لیے ہوائی جہاز میں نماز پڑھنے والے کعبہ کی فضا کی طرف رخ کرتے ہیں۔

جو شخص مریض ہے، کعبہ کو رخ نہیں کر سکتا اور کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں جو اس کا رخ ادھر کر سکے تو وہ جدھر رخ کر کے نماز پڑھ سکتا ہے پڑھ لے اس کا وہی قبلہ ہے۔

جو شخص سواری پہ ہو اور سواری سے اترنا اس کے لیے ممکن نہ ہو نہ سواری کو ٹھہرانا اس کے اختیار میں ہو (جیسے ہوائی جہاز، ٹرین، کوچ وغیرہ) تو بھی جدھر رخ کرنا ممکن ہو وہ ادھر ہی رخ کر کے نماز پڑھ لے، اسے بعد میں نماز کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر جہت قبلہ معلوم نہ ہو تو پوچھا جائے اگر کوئی بتانے والا نہ ہو تو قیاس کیا جائے، مثلاً سورج اور چیزوں کا سایہ دیکھا جائے، پھر جدھر دل مانے ادھر رخ کرلیا جائے۔ اگر قیاس کر کے نماز پڑھ لی، بعد میں معلوم ہوا کہ غلط سمت میں پڑھی تو نماز ہوگئی لہٰذا اسے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔

اگر نماز کے دوران معلوم ہو کہ قبلہ کسی اور سمت ہے تو نماز ہی میں رخ بدل لیا جائے۔ (عامہ کتب)

بندوں کی ناراضگی کی بجائے اللہ کی ناراضگی کا خوف ہونا چاہیے

اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کے موقع پر ارشاد فرمایا: فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ط یعنی اے مسلمانو تم تحویل قبلہ پہ اعتراض کرنے والوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ اس میں تا قیامت اہل اسلام کے لیے درس ہدایت ہے کہ انہیں کفار کے اعتراضات سے گھبرا کر اپنے دین کے بارہ میں معذرت کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ خم ٹھونک کر ڈنکے کی چوٹ اپنا دین بیان کرنا چاہیے۔

[153] یعنی اے مسلمانو جس طرح ہم نے قبلہ بدل کر تم پر انعام فرمایا اسی طرح ہم نے تم میں عظیم رسول بھیج کر بھی تم پر اپنی نعمت تمام کی۔ تمہیں ایسا رسول دیا جو تمہیں ہماری آیات سناتا اور تمہیں گناہوں سے پاک کرتا اور تمہیں کتاب اللہ اور اپنی سنت کی تعلیم دیتا اور تمہیں وہ کچھ سکھاتا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔

امت محمدیہ پر اتمام نعمت:

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ امت محمدیہ کا اعزاز ہے۔ دوسری جگہ فرمایا گیا: وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (مائدہ:۳) جبکہ بنی اسرائیل سے کہا گیا اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ان کے لیے اتمام نعمت نہ ہوا۔ یہ امت محمدیہ کے افضل الامم ہونے کی دلیل ہے۔ اسی لیے اس امت کو تکمیل دین کی بشارت بھی سنائی گئی اور فرمایا گیا: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ، ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔'' (مائدہ، ۳)

[154] یعنی جب ہم نے تمہیں محمد عربی ﷺ جیسے عظیم رسول کی صورت میں نعمت عظمیٰ عطا فرمائی جو تمہیں قرآن وسنت سکھاتے اور پاک کرتے ہیں تو پھر اے مسلمانو! تمہیں میرا شکر بجالانا چاہیے۔ اس طرح کہ تم میرا ذکر کرو تو میں تمہارا ذکر کروں گا۔

دنیا میں کتنے بادشاہ ہیں کہ لوگ انہیں یاد کرتے ہیں مگر انہیں خبر بھی نہیں ہوتی کہ انہیں کون یاد کرتا ہے مگر قربان جائیں اس احکم الحاکمین کی رحمت پر کہ ہم خاک نشین اسے زمین پہ یاد کرتے ہیں وہ ہمیں عرش پہ یاد فرماتا ہے۔ حدیثِ پاک ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں اگر وہ مجھے اکیلا یاد کرے تو میں اسے اکیلا یاد کرتا ہوں اگر وہ مجھے محفل میں یاد کرے تو میں اسے اس سے بہتر محفل (محفل انبیاء ومحفل ملائکہ) میں یاد

کرتا ہوں۔" (بخاری کتاب التوحید باب ۱۵)

ذکر اور شکر کی اہمیت و فضیلت:

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں جو تمہارے سب اعمال سے بہتر ہے، تمہارے مالک کے ہاں سب سے پاکیزہ تر ہے جس کی فضیلت تمہارے درجات میں سب سے اونچی ہے، جو راہِ خدا میں سونا چاندی کے لٹانے سے بھی بڑھ کر ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ہے کہ تم کفار کی گردنیں کاٹو۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ھو ذکر اللہ** "وہ اللہ کا ذکر ہے۔"
(ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد)

ذکر کی تین اقسام:

یاد رہے کہ ذکر کی تین اقسام ہیں۔ **ذکر باللسان** (زبان سے ذکر)، **ذکر بالجنان** (دل سے ذکر) اور **ذکر بالارکان** (اعضاء جسم سے ذکر)، **ذکر باللسان** تلاوت قرآن، تسبیح وتہلیل اور درود شریف ہے۔ **ذکر بالجنان** (قلبی ذکر) یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں غور کیا جائے، دل کو حسد، بغض، کینہ اور تکبر وغیرہ سے پاک کیا جائے، قرآن کے علوم سمجھے جائیں اور ان سے مسائل شرعیہ کا استنباط کیا جائے اور **ذکر بالارکان** (جسم کے اعضاء کا ذکر) یہ ہے کہ ہر عضو کو رضا مولیٰ میں صرف کیا جائے۔ اسی میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، کسب معاش حلال اور جمیع حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی بھی شامل ہے اور یہ سب **فاذکرونی** میں داخل ہیں۔

آگے فرمایا گیا کہ میرا شکر کرو اور کفران نعمت نہ کرو۔ شکر یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں ان کا حساب لیا جائیگا اور پوچھا جائے گا کہ ان کے بدلے بندے نے کیا کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ابن آدم کے قدم روز قیامت حسب کے مقام سے اس وقت تک ہٹ نہ سکیں گے جب تک اس سے پانچ چیزوں کے بارہ میں پوچھ نہ لیا جائے۔ عمر کے بارہ میں کہ کہاں فنا کی، جوانی کے بارہ میں کہ کہاں گزاری، مال کے بارہ میں کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ اور علم کے بارہ میں کہ اس پہ کتنا عمل کیا۔" (ترمذی) اسی لیے اللہ فرماتا ہے: **وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ﴿۱۳﴾** میرے بندوں میں سے تھوڑے ہی شکر گزار ہیں۔ (سبا، ۱۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کھانا کھا کر شکر کرنے والے کا وہی اجر ہے جو روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کا ہے۔" (ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جس آدمی میں تین باتیں ہوں اللہ اسے اپنی پناہ میں رکھتا ہے۔ اس پہ اپنی رحمت کا سایہ ڈالتا ہے اور اسے اپنی محبت میں داخل کرتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض

کیا یارسول اللہ ﷺ وہ تین چیزیں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب بندے کو نعمت ملے تو شکر بجالائے، کسی کو سزا دے سکتا ہو پھر معاف کردے اور جب اسے غصہ آئے تو اسے پی جائے۔ (حاکم، بیہقی)

شکر کی اقسام

شکر دل کے ساتھ بھی ہے۔ زبان کے ساتھ بھی اور عمل کے ساتھ بھی۔ دل کے ساتھ یہ ہے کہ سمجھا جائے کہ ہر نعمت محض اللہ کی عطاء ہے بندے کا اس میں کوئی کمال نہیں۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے اللہ کی طرف سے ہے۔ (نحل:۵۳) زبان کے ساتھ شکر یہ ہے کہ ہر نعمت پر اللہ کی حمد کی جائے، حدیث میں ہے: افضل ذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے اور افضل شکر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (درمنثور) اور عمل کے ساتھ شکر یہ ہے اللہ کی نعمتیں اللہ کی اطاعت میں صرف کی جائیں نافرمانی میں نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد مانگو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ [155]

[155] پہلے وَاشْكُرُوْا لِيْ میں شکر کا بیان تھا اب صبر کا بیان ہے اور یہ دونوں ایمانی زندگی کا جز و لازم ہیں۔ مؤمن کو نعمت ملے تو شکر کرتا ہے چھن جائے تو صبر بجالاتا ہے، تو فرمایا گیا کہ اے مؤمنو! صبر و نماز کے ساتھ اللہ سے مدد مانگو کہ اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا گیا اللہ نمازیوں کے ساتھ ہے اس لیے کہ ایک پہلو سے نماز بھی صبر میں داخل ہے کیونکہ صبر کا لغوی معنی روکنا ہے۔

صبر کا معنیٰ اور تعریف

کہتے ہیں صَبَرَ الدَّابَّةَ ''اس نے جانور کو چارے سے روک دیا'' اور اصطلاح شرع میں اس کا معنی خود کو رضاء مولیٰ کے خلاف چلنے سے روکنا ہے۔ اس لحاظ سے نماز بھی صبر ہے کہ مومن کو برے کاموں اور بے حیائی سے روکتی ہے۔ روزہ بھی صبر ہے کہ انسان خود کو کھانے پینے سے روکتا ہے۔ زکوٰۃ بھی صبر ہے کہ مومن کو بخل، زر پرستی اور لالچ سے روکتی ہے۔ الغرض سارا دین ہی صبر ہے کہ بندہ جب بھی خود کو کسی گناہ یا نافرمانی مولیٰ سے روکتا ہے تو صبر کرتا ہے۔ اس لیے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ کہا گیا۔ صبر کا حکم قرآن میں ۷۵ مرتبہ آیا ہے۔ اس کا اجر بے حساب ہے۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾ (زمر،۱۰)

اہمیتِ صبر و نماز در مصائب:

معلوم ہوا کہ مصائب میں واویلا کرنے کی بجائے صبر اور نماز سے کام لیا جائے۔ صبر میں تکلیف کم اور اجر زیادہ ہے

اور بے صبری میں تکلیف زیادہ اور اجر کی جگہ زجر، جبکہ مصائب میں نماز کی اہمیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف مشکلات میں مختلف نمازیں پڑھنے کا حکم فرمایا ہے، بارش رک جائے تو نماز استسقاء پڑھو، سورج یا چاند کو گرہن لگ جائے تو نماز کسوف ادا کرو، کوئی فوت ہو جائے تو نماز جنازہ بجالاؤ، الغرض ہر مشکل کے لیے نماز ہے۔ حدیث میں ہے حضور ﷺ جب کسی معاملہ میں گھبراتے تو دوڑ کر نماز میں کھڑے ہو جاتے۔

صبر و نماز اور کردار امام حسین رضی اللہ عنہ:

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پر کربلا میں جیسی مصیبت آئی کسی پر نہ آئی ہوگی۔ ایسے میں انہوں نے جو صبر کیا اس کی مثال نہیں اور جو نماز پڑھی اس کی بھی مثال نہیں۔ گویا آپ نے صفحہ کربلا پر اپنے خون شہادت سے اس آیت کی عملی تفسیر لکھی۔ جس میں ہمیں صبر و نماز کا عظیم درس ملتا ہے، اور اس کا بیمثال نمونہ عمل سامنے آتا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے [156]

[156] جب صبر کی بات چلی تو اللہ نے بطور مثال شہید کا ذکر کیا کہ اس کا صبر سب سے اعلیٰ ہے وہ برستی گولیوں میں سینہ سپر کھڑا رہتا ہے اور بھاگتا نہیں۔ اس سے بڑا صبر کیا ہے۔

حیاتِ شہداء:

اس کا شان نزول یہ ہے کہ جب بدر میں چودہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تو منافقوں نے کہا انہوں نے بلاوجہ جان گنوادی تب یہ آیت اتری: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ (بغوی، مظہری) یعنی اللہ نے فرمایا راہِ حق میں قتل ہونے والا جان گنواتا نہیں بلکہ ابدی زندگی پالیتا ہے۔ چنانچہ شہداء کی حیات بعد الممات کی ایک نشانی یہ ہے کہ انکے اجسام خراب ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔

مروی ہے کہ شہداء احد کی قبور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں (قریباً ۵۰ برس بعد) کھودی گئیں تو ان کے جسم تروتازہ تھے ایک شہید کے پاؤں کو کدال لگا تو اس سے خون بہنے لگا (سنن بیہقی) اور ابن ابی شیبہ کے مطابق وہ حضرت سیدنا امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کا پاؤں تھا۔ علاوہ ازیں یہ بھی مروی ہے کہ ان کی ارواح دنیا میں جہاں چاہیں جاتی ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی مظہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ان اللہ یعطی لارواحھم قوۃ الاجساد فیذھبون من الارض الی السماء والجنۃ حیث یشاءون وینصرون اولیاءھم ویدمرون اعداءھم باذن اللہ تعالیٰ۔

اللہ شہداء کی ارواح کو اجسام والی قوت دیتا ہے وہ آسمان وزمین میں جہاں چاہیں جاتے ہیں، وہ اپنے دوستوں کی مدد اور اپنے دشمنوں کو باذن اللہ ہلاک کرتے ہیں۔ (تفسیر مظہری جلد اول صفحہ ۱۵۲ مطبوعہ کوئٹہ)

حیاتِ شہداء حیاتِ انبیاء کرام علیہم السلام کی دلیل ہے:

شہید اپنے نبی کی اطاعت میں جان دے کر حیات جاوداں پاتا ہے اگر وہ زندہ ہے تو خود نبی دنیا سے پردہ کر کے کیوں زندہ نہیں۔ اسی لیے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَنْ تَاْكُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ فَنَبِيُّ اللّٰهِ حَيٌّ يُرْزَقُ ''اللہ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کا کھانا حرام کیا ہے تو اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے۔ اسے رزق دیا جاتا ہے۔'' (ابن ماجہ ابواب الجنائز، باب ذکر وفاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم) امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ انبیاء کی حیاتِ شہداء سے قوی تر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج سے آپ کے وصال کے بعد نکاح حرام ہے جبکہ شہید کی بیوہ سے نکاح حلال ہے۔ (مظہری جلد اول صفحہ ۱۵۲) شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حیاتِ شہداء معنوی واخروی ہے اور حیاتِ انبیاء حسی ودنیوی ہے۔ (مدارج النبوت جلد دوم صفحہ ۷۴۷)

حیاتِ شہداء سے حیاتِ اولیاء کا بھی پتہ چلتا ہے:

جب شہداء زندہ ہیں تو اولیاء بطریق اولیٰ زندہ ہیں۔ کیونکہ حدیث ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من تمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مأة شهيد ''جس نے میری ایک سنت زندہ کی جب میری امت میں وہ مٹ رہی ہو تو اسے سو شہید کا ثواب ہے۔'' اس کو بیہقی نے کتاب الزہد میں روایت کیا ہے۔
(مشکوۃ شریف کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ فصل دوم، الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ جلد ۲ صفحہ ۱۰ مطبوعہ فاروقی کتب خانہ، ملتان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

المتمسك بسنتي عند فساد امتي فله اجر مأة شهيد ''جو شخص میری سنت سے لپٹنے والا ہو جو کہ میری امت میں فساد آ جائے تو اس کے لیے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔''
(طبرانی اوسط جلد ۴ صفحہ ۱۱۹ حدیث ۵۴۱۴ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت۔ مجمع الزوائد جلد اول صفحہ ۱۷۷ مطبوعہ موسسۃ المعارف بیروت)

جب ایک درجہ کا شہید زندہ ہے تو سو درجے کا شہید یعنی ولی کیوں زندہ نہیں۔ اولیاء اللہ ایک سنت کو نہیں ہزاروں سنتوں کو زندہ کرتے ہیں، وہ ساری زندگی کو سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ شہید لوہے کی تلوار سے کسی کافر کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے اور ولی مجاہدہ کی تلوار سے خود کو بار بار مارتا ہے۔ شہید کفار سے جہاد کرتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے کرتا ہے اور ولی اللہ نفس بدکار وشیطان مکار سے جہاد کرتا ہے اور ساری زندگی کے لیے کرتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے واپسی پر عبادت کی طرف رخ کر کے فرمایا ہم جہادِ اصغر کے بعد جہادِ اکبر کی طرف لوٹتے ہیں۔
(تاریخ بغداد جلد ۱۳ صفحہ ۴۹۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
مومن جب قبر میں جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے منکر و نکیر آ کر اس سے پوچھتے ہیں: ما کنت تقول فی هذا الرجل؟ تم اس شخصیت کے بارہ میں کیا کہتے تھے؟ وہ جواب دیتا ہے: وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں ہمیں معلوم تھا کہ تم یہی جواب دو گے، پھر اس کی قبر ستر گز دائیں اور ستر گز بائیں وسیع کر دی جاتی ہے اور اس کی قبر میں روشنی ہو جاتی ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ سو جاؤ وہ کہتا ہے میں اپنے گھر جاتا ہوں اور انہیں بتاتا ہوں۔ تو دونوں فرشتے اسے کہتے ہیں: نَمْ كنومةِ العروسِ الذی لا یوقظه الا احبُّ اهله الیه تم دلہن کی طرح سو جاؤ جسے اس کے گھر والوں میں سے وہی آ کر جگاتا ہے جو اسے سب سے محبوب ہے (یعنی اسکا شوہر)۔ (ترمذی کتاب الجنائز باب ۷۰ حدیث ۱۰۷۱)

یہ حدیث بھی بتا رہی ہے کہ کامل مومن یعنی متقی و صالح بندہ اپنی قبر میں زندہ ہوتا ہے اور دلہن کی طرح سونے کا معنی یہ ہے کہ کہا جاتا ہے اے مومن تم اپنے نئے گھر میں دلہن کی طرح آئے ہو جو اپنے والدین کا گھر چھوڑ کر شوہر کے گھر آتی ہے۔ یہاں تمہارے لیے عزت ہے اور محبت ہے۔

جب شہید زندہ ہے تو اس کا ماتم کیوں:

اہلِ تشیع محرم میں ہر سال شہداء کربلا کا ماتم بپا کرتے ہیں۔ جب قرآن انہیں زندہ کہہ رہا ہے تو زندہ کے لیے ماتم کا کیا معنی۔ ماتم تو ان پہ کیا جاتا ہے جو مر جائیں اور ان کی اخروی زندگی کا کچھ علم نہ ہو جبکہ شہید کی زندگی پر قرآن گواہی دے رہا ہے، اور حیرت ہے کہ شیعہ لوگ امام عالی مقام امام حسین رضی اللہ عنہ کا ماتم کرتے ہیں جبکہ خود حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے کربلا میں اپنی شہادت سے قبل اپنی ہمشیرہ حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو آخری وصیت یہ کی تھی کہ آپ کی شہادت کے بعد آپ کا ماتم نہ کیا جائے۔

اہل تشیع کے ہاں معتبر ترین مورخ کربلا لوط بن یحیی لکھتا ہے:
وقال لها یا اُختاه اَقسمتُ علیكِ بحقّی، اذا انا قُتلتُ فلا تشقّی علیّ جَیباً ولا تخمشی علیّ وجهاً۔
یعنی حضرت امام عالی مقام امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی ہمشیرہ سے فرمایا: ''اے میری بہن! میں تجھے اپنے حق کی قسم دلاتا ہوں جب مجھے شہید کر دیا جائے تو مجھ پر گریبان مت پھاڑنا اور مجھ پر چہرہ مت پیٹنا۔''
(مقتل ابی مخنف صفحہ ۵۰ مطبوعہ مکتبہ حیدریہ نجف اشرف عراق)

اور ملا باقر مجلسی لکھتا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے یوں وصیت فرمائی:
''اے خواہر گرامی تو را سوگند مے دہم کہ چوں من از تیغ اہل جفا بہ عالم بقا رحلت نمایم گریبان چاک مکنید و رو مخراشید و واویلا مگوئید یعنی اے میری معزز بہن!

''میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ جب میں اہل جفا کی تیغ سے عالم بقا کی طرف رحلت کروں تو تم گریبان مت چاک کرنا چہرہ مت جھیلنا اور واویلا مت پکارنا۔'' (چہاردہ معصوم صفحہ ۶۵۳ مطبوعہ انتشارات سرور، قم)

اور شیخ مفید جو صاحب نہج البلاغہ ملا رضی کا استاذ ہے لکھتا ہے:

وقال لها یا اُخیّة انی اقسمتُ علیكِ فابرّی قسمی لا تشقّی علیّ جیبا ولا تخمشی علیّ وجها ولا تدعی بالویل والثبور

یعنی امام عالی مقام رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے میری بہن میں تجھے قسم دیتا ہوں میری قسم کو پورا کرنا، مجھ پر گریبان نہ پھاڑنا مجھ پر چہرہ نہ نوچنا اور مجھ پر واویلا مت پکارنا۔ (ارشاد شیخ مفید صفحہ ۴۴۶ مطبوعہ انتشارات اسلامیہ ایران)

ہم کہتے ہیں اے شیعہ لوگو ہماری نہ مانو کم از کم امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی مان لو اور انکی وصیت کو توڑ کر انکا ماتم کرتے ہوئے ان کی روح کو تکلیف میں مبتلا تو نہ کرو۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ
اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے،
وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا
اور آپ صبر کرنے والوں کو بشارت دے دیں۔ [157] یعنی وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت آئے تو کہتے ہیں: ہم
لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ قف
اللہ کے (بندے) ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے خصوصی عنایات ہیں
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔[158]

[157] انسان پر دنیا میں ہزار ہا مصائب آتے ہیں۔ وہ جھوٹے مقدمات میں پھنس جاتا ہے طویل بیماری آلیتی ہے۔ مال برباد ہو جاتا ہے، اولاد نافرمان ہو جاتی ہے، قریبی عزیز مثل والدین اولاد وغیرہ فوت ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں اللہ مومنوں کو صبر کرنے کا اجر بتا رہا ہے کہ ان پر اللہ کی رحمت اور عنایت ہے۔

مصیبت پہ صبر کا اجر

حدیث طیبہ ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مومن اپنے مال اور اپنی

جان واولاد میں تکالیف اٹھاتا (اورصبر کرتا) رہتا ہے حتی کہ وہ اللہ کے پاس یوں حاضر ہوتا ہے کہ اس کا ایک گناہ بھی باقی نہیں رہتا (یعنی تکالیف کی وجہ سے اس کے گناہ مٹتے رہتے ہیں۔) (بیہقی فی شعب الایمان عن ابی ہریرہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان کو جو بھی مصیبت آتی ہے حتی کہ اس کے پاؤں میں جو کانٹا چبھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر بھی اس کا ایک گناہ معاف فرماتا ہے۔'' (بغوی)

[158] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مومن کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اسے استرجاع (یعنی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴿۱۵۶﴾ کہنا چاہیے، کیونکہ استرجاع میری امت ہی کو دیا گیا ہے۔'' (طبرانی)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ کہنے کا اجر

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر حضرت یعقوب علیہ السلام کو استرجاع ملا ہوتا تو وہ یاسفیٰ علی یوسف نہ کہتے۔ (ابن جریر)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی مومن کا بچہ فوت ہوجاتا ہے تو اللہ فرشتوں سے فرماتا ہے: کیا تم نے میرے بندے کا بچہ اٹھالیا؟ وہ کہتے ہیں، ہاں، اللہ فرماتا ہے: کیا تم نے اس کے جگر کا ٹکڑا کاٹ لیا؟ وہ کہتے ہیں، ہاں، اللہ فرماتا ہے: پھر میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں، اس نے تیری حمد کہی اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہا، اللہ فرماتا ہے: میرے بندے کے لیے جنت میں ایک (عظیم الشان) محل بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔'' (ترمذی، مسند احمد)

حرمتِ ماتم:

اس سے فائدہ حاصل ہوا کہ ماتم حرام ہے۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ مصیبت میں سینہ کوٹنے، چہرہ پیٹنے، اور گریبان پھاڑنے کی بجائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ﴿۱۵۶﴾ کہنا چاہیے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ''جس نے چہرہ پیٹا گریبان پھاڑا اور جاہلیت والا شور کیا وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔''
(بخاری کتاب الجنائز باب ۳۶، مسلم کتاب الایمان حدیث ۱۶۵)

امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جس نے مصیبت میں اپنے ران پر ہاتھ مارا اس نے اپنا اجر ضائع کر دیا۔'' (فروع کافی جلد ۳ صفحہ ۲۲۴ کتاب الجنائز مطبوعہ تہران)

جب صرف ران پہ ہاتھ مارنے سے مصیبت کا اجر ضائع ہو جاتا ہے تو جس وقت اہل تشیع اپنے جسم پہ چھریاں اور زنجیر مارتے ہیں اسوقت ان پہ کتنا بڑا گناہ لکھا جاتا ہوگا، اور یہ حدیث ہم نے اہل تشیع کی سب سے معتبر کتاب اصول کافی سے نقل کی ہے، جو امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے جنہیں اہل تشیع چھٹا امام معصوم مانتے ہیں۔

اسی طرح اللہ عزوجل نے قرآن میں فرمایا:

وَلَا يَعۡصِيۡنَكَ فِىۡ مَعۡرُوۡفٍ یعنی ''اے نبی اکرم (ﷺ) جب مسلمان عورتیں آپ کے پاس حاضر ہوکر یہ بیعت کرنا چاہیں کہ وہ کسی بھلے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی تو آپ ان سے بیعت لیں۔'' (ممتحنہ، ۱۲)

اس کے تحت امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا یہ بھلا کام کیا ہے، تو انہوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی سے فرمایا تھا:

اذا انا متُ فلا تخمشي علی وجها ولا تنادي عليك بالويل ولا تقيمي علی نائحة.

یعنی اے فاطمۃ! جب میرا وصال ہوجائے تو کسی شخص کو اجازت نہ دینا کہ مجھ پر چہرہ پیٹے، مجھ پر بال کھولے اور مجھ پر نوحہ خوانی کرے، پھر فرمایا: یہ وہ معروف ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ (فروع کافی صفحہ ۸۹۲ مطبوعہ دار المجتبیٰ نجف اشرف)

معلوم ہوا کہ مروجہ ماتم جو اہل تشیع کے ہاں جاری ہے اس کی حرمت پہ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف باقی مسلمان عورتوں سے بیعت کی بلکہ اپنی بیٹی سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو بھی اس کا پابند کیا۔

اِنَّ الصَّفَا وَالۡمَرۡوَةَ مِنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِۚ فَمَنۡ حَجَّ الۡبَيۡتَ اَوِ اعۡتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ

بے شک صفا اور مروہ (دو پہاڑیاں) اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں تو جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس پر کوئی حرج نہیں

عَلَيۡهِ اَنۡ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۵۸﴾

کہ ان دونوں کے مابین چکر لگائے اور جو اپنی خوشی سے نیکی کرے تو بے شک اللہ جزا دینے والا علم والا ہے۔ [159]

[159] پیچھے کعبہ شریف کا قبلہ بنایا جانا مذکور ہوا اب کعبہ کے پاس کھڑی دو پہاڑیوں صفا و مروہ کے درمیان سعی کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ اس سے کعبہ کے بانیان ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور سیدہ ھاجرہ رضی اللہ عنہا کے صبر و رضا کی یاد تازہ ہوتی ہے اور پچھلی آیات میں صبر کا حکم تھا۔ اب صبر کرنے والوں کی یاد دلائی جارہی ہے۔

صفا و مروہ میں سعی کا حکم صرف سنت حضرت سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے احیاء کے لیے دیا گیا:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ جب ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سیدہ ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو وادی مکہ میں چھوڑ کر چل دیئے تو سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے کہا آپ ہمیں یہاں پر کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ فرمایا اللہ کا حکم ہے۔ انہوں نے کہا تب ہمارا رب ہمیں ضائع نہیں کرے گا تو ان کے پاس جو پانی تھا وہ جلد ختم ہوگیا۔ ماں بیٹا دونوں پیاسے ہوگئے۔ بچہ پیاس سے (ماہی بے آب کی طرح زمین پہ) لوٹنے لگا۔ سیدہ ہاجرہ صفا پہ چڑھیں تاکہ کوئی انسان نظر آئے مگر کچھ نظر نہ آیا پھر نیچے اتر کر مروہ کی طرف دوڑیں مروہ پر بھی کوئی انسان نظر نہ آیا۔ یہ عمل انہوں نے سات بار کیا۔ نبی

ﷺ نے فرمایا اسی لیے لوگ صفا و مروہ میں سات چکر لگاتے ہیں۔ (بخاری کتاب احادیث الانبیاء باب ۹)

چنانچہ اللہ عزوجل نے حضرت جبریل علیہ السلام کے پر کی ضرب سے آب زمزم کا چشمہ جاری کر دیا۔

(بخاری کتاب احادیث الانبیاء حدیث ۳۳۶۴)

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا صفا و مروہ اللہ کی نشانیاں ہیں تو حج وعمرہ کرنے والوں کو ان کے درمیان چکر لگانے (سعی کرنے) میں کوئی حرج نہیں۔ ایسا کیوں کہا گیا۔ اس کا جواب درج ذیل روایت میں ہے:

محمد بن اسحاق نے اپنی سیرت میں روایت کیا ہے کہ اساف اور نائلہ دو مرد و عورت نے کعبہ شریف میں برائی کرنا چاہی تو اللہ نے انہیں پتھر بنا دیا۔ قریش نے انہیں کعبہ کے سامنے (صفا و مروہ پر) برائے عبرت نصب کر دیا (اساف کے بت کو صفا پہ اور نائلہ کے بت کو مروہ پہ گاڑ دیا)۔ پھر مدت دراز گزرنے کے بعد ان کی پرستش شروع کر دی گئی۔ کفار جب صفا و مروہ میں سعی کرتے تو ان بتوں کو سجدہ کرتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس لیے سعی سے جھجک محسوس کرتے تھے (کہ اس جگہ کیوں جائیں جہاں بت پرستی ہو رہی ہے) تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا حج وعمرہ کرنے والوں کو صفا و مروہ میں سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

آگے اللہ عزوجل نے فرمایا۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٥٨﴾ یعنی جو شخص فرض حج کے سوا نفل حج یا عمرے ادا کرے تو صفا و مروہ میں بار بار سعی بجالائے تو اللہ جزا دینے والا ہے۔ وہ سب جانتا ہے۔

صفا و مروہ کے مابین سعی کرنے کے احکام:

صفا و مروہ کی سعی کے احکام کتب فقہ وتفسیر میں مفصل مذکور ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ صفا و مروہ میں سعی حج وعمرہ دونوں میں واجب ہے۔ سعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ طواف کے بعد ہو طواف کے بغیر سعی شرعاً غیر مقبول ہے۔

جس نے طواف کے بعد سعی کیے بغیر احرام کھول دیا اس پہ دم واجب ہے۔ سعی کا طریقہ یہ ہے کہ صفا سے مروہ تک جاؤ تو ایک چکر پورا ہو گیا پھر جب مروہ سے صفا تک جاؤ تو دو چکر پورے ہو گئے، اس طرح سات چکر پورے کرنا لازم ہیں، تو سعی صفا سے شروع ہو کر مروہ پہ ختم ہو جاتی ہے۔

اگر سعی کے دوران وضو ٹوٹ جائے تو وضو کے لیے جانا ضروری نہیں کیونکہ سعی کے لیے وضو واجب نہیں، تاہم ضوء کر لینا افضل ہے۔

جس نے سعی کے چار چکر چھوڑ دیے اور احرام کھول دیا اس پہ دم واجب ہے۔ جس نے کم از کم چار چکر کر لیے باقی چھوڑ دیے تو اس پہ دم لازم نہیں مگر ہر چکر کے بدلے ایک صدقہ فطرانہ لازم ہے۔

سعی کا طریقہ یہ ہے کہ طواف سے فراغت کے بعد جب تم دو رکعت ادا کر چکے تو سنت کے مطابق آب زمزم پی کر صفا پہاڑی پہ آؤ۔ بہت اوپر چڑھنے کی ضرورت نہیں چند قدم چڑھ جانا ہی کافی ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر رو بقبلہ ہاتھ بلند

کر کے تین بار اللہ اکبر کہو پھر دعاء واستغفار کرو اور یہی آیت تلاوت کرو اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ الخ،
پھر مروہ کی طرف چل پڑو، تھوڑا چلو تو سبز نشان یعنی سبز لائٹ آجائے گی وہاں سے مرد تیز چل پڑیں اور عورتیں آہستہ ہی چلتی رہیں تا آنکہ اگلی سبز لائٹ آجائے۔ وہاں سے پھر مرد آہستہ چل پڑیں جب صفا پہ پہنچو تو ایک شوط (چکر) پورا ہو گیا، ایسے ہی سات چکر پورے کرو۔

اللہ اپنے نیک بندوں کی یادگاریں قائم کرتا ہے:

سیدہ ہاجرہ علیہا السلام جن پہاڑیوں پر دوڑیں اللہ نے انہیں اپنی نشانیاں قرار دیا۔ پیچھے وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط (بقرہ ۱۲۵) میں مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانے کا حکم ہوا۔
پتہ چلا اللہ اپنے نیک بندوں کی یادگاریں قائم رکھتا ہے تا کہ انہیں دیکھ کر لوگ ان کی سیرت و کردار کو یاد رکھیں اور اپنائیں۔ مقام ابراہیم اور صفا و مروہ کو دیکھ کر حضرت ابراہیم و سیدہ ہاجرہ کی تسلیم و رضا یاد آتی ہے۔ بلکہ حج کے اکثر ارکان مقبولان الٰہی کی یادگاریں ہیں۔ عرفات میں وقوف اس لیے ہے کہ یہاں انسان اول آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔ رمی جمرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور سیدہ ہاجرہ علیہا السلام کے عمل کی یادگار ہے اور قربانی بھی اس عظیم عمل کی یادگار ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی میدانِ منیٰ میں اپنے بیٹے کے گلے پہ رضاء الٰہی کے لیے چھری چلائی تھی۔

آثار مقدسہ کی حفاظت لازم ہے:

صفا و مروہ میں سعی لازم کر کے اللہ تعالیٰ نے ان دو پہاڑیوں کو محفوظ کر دیا کیونکہ یہ اسلام کے آثار مقدسہ ہیں مگر افسوس کہ ہم مسلمانوں کو اس چیز کا کچھ خیال نہیں۔ آج سعودی عرب کی نجدی حکومت نے حرمین شریفین میں حضور ﷺ کی زندگی کے تمام آثار مٹا ڈالے ہیں۔ کوئی نشان باقی نہیں چھوڑا جبکہ ہر قوم اپنی تاریخ محفوظ رکھتی ہے۔
سعودی حکومت نے حضرت سیدہ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے اس مکان کا نام و نشان اڑا دیا۔ جس میں حضور ﷺ نے پچیس سال زندگی گزاری اور قریباً نبی پاک ﷺ کی ساری اولاد وہیں پیدا ہوئی۔ راقم الحروف نے سن ۱۹۸۳ء میں اس مکان کی زیارت کی تھی، بعد میں اسے اڑا کر وہاں ٹائلٹس بنا دی گئیں۔
مگر سعودی حکومت نے اپنے مورث اعلیٰ شاہ عبدالعزیز بن سعود کا مکان، بستر، حقہ اور جوتیاں بھی سنبھال کر رکھیں ہیں۔ کیا یہ مقامِ افسوس نہیں۔ ریاض میں جو وہاں کا دارالخلافہ ہے سعودی بادشاہت کے بانی کنگ عبدالعزیز کا کمرہ سجا ہوا ہے اس میں اس کے استعمال کی چیزیں یوں سجائی گئی ہیں جیسے وہ ابھی یہاں سے اٹھ کر باہر گیا ہے اور ابھی لوٹ آئے گا، گویا کنگ عبدالعزیز کا حقہ اور اسکی جوتیاں رسول اللہ ﷺ کے تبرکات سے زیادہ اہم ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔
پھر سعودی حکومت نے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا مکان شریف ختم کر دیا اسی طرح سعودی حکومت نے کعبہ شریف

کے سامنے جبل ابوقبیس نامی وہ پہاڑ اڑادیا جس پہ کھڑے ہو کر حضور ﷺ نے شق القمر کا معجزہ دکھایا اور اسلام کی سب سے پہلی دعوت پیش کی۔ آج اس کی جگہ پر سعودی بادشاہوں کے محلات بنا دیے گئے ہیں۔ کیا بادشاہوں کے محلات رسول اکرم ﷺ کی یادگار اور اسلام کے تاریخی ورثہ سے زیادہ اہم تھے؟

ہر قوم اپنی تاریخ کو یاد رکھتی اور اس کی حفاظت کرتی ہے۔ جس ملک میں جاؤ ہر قوم نے اپنے تاریخی مقامات اور اپنے آباء واجداد کے آثار محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے فرانس، جرمن، برطانیہ، ڈنمارک، بیلجیئم و دیگر یورپین ممالک وغیرہ کی سیاحت کی ہے، ہر قوم نے اپنے آثار محفوظ رکھے ہوئے مگر یہ کیسے مسلمان ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر نشان کو مٹا رہے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ
بے شک ہم نے جو واضح نشانیاں اور ہدایت اتاری ہے اسے جو لوگ چھپائیں بعد ازاں کہ ہم نے لوگوں کے لیے
لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِۙ اُولٰٓىٕكَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ۝۱۵۹
اسے کتاب میں بتادیا ہے تو انہی لوگوں پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ [160]
اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓىٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْۚ وَ اَنَا
سوا ان کے جو توبہ کریں، اپنی اصلاح کرلیں اور (جو چھپایا تھا اسے) ظاہر کردیں تو میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں
التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝۱۶۰
توبہ قبول کرنے والا رحم والا ہوں۔ [161]

[160] علماء یہود اچھی طرح جانتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنایا مگر یہ بات ان کے لب پہ نہ آتی تھی۔ وہ اسے چھپاتے تھے وہ نہیں چاہتے کہ اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں کوئی نبی مانیں۔ وہ تورات میں حضور ﷺ کی آمد کی پیش گوئیوں پر مشتمل آیات کے الفاظ بدل رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی نازل کردہ آیات کو چھپاتے ہیں ایسے لوگوں پہ اللہ لعنت فرماتا ہے اور سب لعنت کرنے والے بھی۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ کافر کو (قبر میں) پیشانی پر ضربات لگائی جاتی ہیں جنہیں جنوں اور انسانوں کے سوا ہر جاندار چیز سنتی اور اس پر لعنت کرتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ۝۱۵۹ (ابن ابی حاتم عن براء بن عازب رضی اللہ عنہم)

[161] ہاں جو لوگ کفر سے توبہ کرکے اپنے عقیدہ کی اصلاح کرتے ہوئے ایمان لے آئیں اور انہوں نے جو کچھ حق

چھپایا تھا (جیسے یہود نے حضور ﷺ کی پیش گوئی والی آیات تورات میں سے چھپائی تھیں) اسے ظاہر کر دیں تو اللہ ان کی توبہ قبول کرتا ہے۔ وہ بڑا رحیم ہے۔

معلوم ہوا اللہ کو توبہ اس قدر پسند ہے کہ سچی توبہ کی وجہ سے کفر بھی معاف فرما دیتا ہے، اگر کوئی شخص زندگی بھر کفر کرے مگر وصال سے پہلے ایمان لے آئے تو اللہ اسے جنت کا حقدار بنا دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ

بیشک جنہوں نے کفر کیا اور کفر پہ ہی مر گئے انہی لوگوں پر اللہ کی لعنت اور سب فرشتوں

وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٦١﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا

اور لوگوں کی لعنت ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، [162] ان سے عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا اور نہ انہیں

هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿١٦٢﴾ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾ ع

مہلت دی جائے گی۔ [163] اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ مہربان رحم والا ہے۔ [164]

[162] جب کفر سے توبہ کرنے والوں کی بات ہوئی تو اب کہا جا رہا ہے کہ جو شخص کفر سے مرتے دم تک باز نہ آئے کفر ہی میں مر جائے اس پر اللہ کی، سب فرشتوں اور سب انسانوں کی لعنت ہے۔ اگر کہا جائے کہ سب انسانوں میں خود کفار بھی ہیں، وہ خود پر کیسے لعنت کر سکتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بھی کہتے ہیں جھوٹوں پر اللہ کی لعنت۔ بددینوں پر اللہ کی لعنت یوں وہ خود پر لعنت کرتے ہیں، اس کی ایک تفسیر یہ آیت بھی ہے: وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ”روز قیامت کفار ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔“ (عنکبوت:۲۵) یعنی ان کی ہر پچھلی نسل پہلی پر لعنت کرے گی اور کہے گی کہ ان کی وجہ سے ہم ہمیشہ کے لیے جہنمی ہوئے۔ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ط ”ہر گروہ پہلے پر لعنت کرے گا۔“ (اعراف:۳۸)

[163] کفر پہ مرنے والوں کے عذاب میں کبھی کمی نہیں کی جائے گی وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ کفر کی سزا دائمی جہنم اس لیے ہے کہ ان کا ارادہ دائمی کفر کا تھا اگر انہیں قیامت تک یا ہمیشہ تک زندگی دی جاتی تو وہ ہمیشہ کافر ہی رہتے۔ اللہ فرماتا ہے اگر کفار کو قیامت سے لوٹا کر دنیا میں بھیج دیا جاتا تو وہ پھر کفر ہی کرتے وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (انعام:۲۸) اور سزا کا مدار نیت پر ہے۔ دائمی کفر کی نیت پر دائمی جہنم۔ آگے فرمایا کہ کفار سے کبھی عذاب ہلکا نہ کیا جائے گا، نہ کبھی ان کو عذاب میں مہلت اور رخصت ملے گی۔ اگر سوال کیا جائے کہ حدیث بخاری کے مطابق ابولہب کے عذاب کو ہلکا کیا گیا ہے وہ کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابولہب کو رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کی خوشی میں لونڈی آزاد کرنے

کی وجہ سے خصوصی رعایت دیتے ہوئے اس کا عذاب ابتداء ہی سے ہلکا رکھا گیا ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کافر کو جو عذاب جاری کیا گیا اس میں کمی نہ لائی جائے گی۔

صرف اس کافر پہ لعنت جائز ہے جس کا کفر پہ مرنا حتماً معلوم ہو:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ سے معلوم ہوا جس کا کفر پہ مرنا صریحاً معلوم ہوا اس پر لعنت جائز ہے۔ جیسے ابولہب، فرعون وغیرہ اسی لیے امام ابن عربی نے فرمایا کافر معین پر لعنت جائز نہیں کیونکہ موت کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ معین کیے بغیر مطلقاً یہ کہنا جائز ہے کہ کفار پر اللہ کی لعنت ہے۔ معلوم ہوا جب معین کافر پہ لعنت جائز نہیں تو کسی معین مسلمان پہ لعنت کیسے جائز ہے، ہاں یہ کہنا جائز ہے کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت شرابیوں پہ اللہ کی لعنت وغیرہ، قرآن بھی ارشاد فرماتا ہے: فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۱﴾ (آل عمران ۶۱)

[164] یہ بڑی فضیلت والی آیت ہے۔ حدیث میں ہے اللہ کا اسم اعظم آیت الکرسی اور وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۳﴾ میں ہے۔ (ابوداؤد عن اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا) ایک حدیث میں ہے: مردود شیاطین پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ سے بھاری کوئی آیت نہیں۔ (دیلمی عن انس رضی اللہ عنہ)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور ان

الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ

کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا

مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪

پھر اس سے زمین کو اس کے خشک ہو جانے کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر طرح کے جانور پھیلا دیئے

وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ

اور ہواؤں کے چلانے میں اور آسمان و زمین کے درمیان تابع فرمان کیے گئے بادل میں عقل والے لوگوں کے لئے

لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

بڑی نشانیاں ہیں۔[165]

توحید خداوندی اور اس کے منکرین کی اُخروی ندامت

[165] اس سے قبل والی آیت میں اللہ کی توحید بیان ہوئی۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ اب توحید کے دلائل ونشانات دیئے جارہے ہیں۔ تو فرمایا کہ اس کی عظمت و کبریائی کی آٹھ بڑی نشانیاں ہیں جنہیں دیکھ کر انسان کو اللہ کی ذات پہ ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔

پہلی نشانی آسمان و زمین کی تخلیق ہے۔ اتنا بڑا آسماں کسی ستون کے بغیر کھڑا ہے۔ اتنی بڑی زمین سائنسدانوں کے نزدیک فی گھنٹہ ایک لاکھ سات ہزار دو سو چالیس کلومیٹر کی رفتار سے سورج کے گرد گردش کر رہی ہے اور آج تک اس کی رفتار میں ایک سکینڈ کا فرق نہیں آیا۔ تو اللہ کے سوا کون ہے جس نے یہ آسمان و زمین بنائے۔

دوسری نشانی دن رات کا آنا جانا ہے۔ دیکھو سورج ہمیشہ مقرر وقت پر چڑھتا اور ڈوبتا ہے کبھی اس گردش میں فرق نہیں آیا۔ دن میں انسان کام اور رات میں آرام کرتا ہے۔ اگر ہمیشہ دن ہوتا تو آرام مشکل تھا اگر ہمیشہ رات ہوتی تو کام مشکل۔ اگر مسلسل دن بنا دیا جاتا تو گرمی اسقدر ہو جاتی کہ انسان زندہ نہ رہ سکتے، دیکھو جن مہینوں میں دن چند گھنٹہ

لمبا ہو جاتا ہے تو گرمی شدید ہو جاتی ہے اور اگر مسلسل دن ہی رہے تو گرمی کہاں تک پہنچے گی اور اگر اللہ مسلسل رات بنا دیتا تو انسان سردی سے مر جاتے، مگر اللہ نے اپنی رحمت سے دن رات کا آنا جانا بنا دیا ہے۔

تیسری نشانی سمندر میں کشتیوں کا چلنا ہے۔ چنانچہ ہزاروں لاکھوں ٹن وزنی بحری جہاز پانی پر تیرتے رہتے ہیں اور نہیں ڈوبتے۔ کیا یہ قدرت ربانی نہیں ہے۔ اب تو ایسے جنگی بحری بیڑے آ گئے ہیں جن میں بیک وقت کئی سو جنگی ہوائی جہاز اترتے ہیں، اور یہ کشتیاں ہوا کے ذریعہ چلتی ہیں اگر اللہ ہوا کو روک دے تو کشتیاں سمندر پہ کھڑی رہ جائیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ط ''اگر اللہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے اور کشتیاں سمندر کی پشت پہ کھڑی رہ جائیں۔'' (شوریٰ، ۳۳) اور اگر اللہ طوفانی ہوا بھیج دے تو پہاڑوں سے بلند سمندری لہریں بڑے سے بڑے جہاز کو ڈبو دیتی ہیں، بس اللہ ہی کے کرم سے کشتیاں اور بحری جہاز منزل پہ پہنچتے ہیں۔

چوتھی نشانی بارش کا برسنا ہے۔ بارش نہ ہو تو سب انسان حیوان جاں بلب ہو جاتے ہیں۔ خدا کے منکر بھی آسمان کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ان کا (Naturalism) دھرے کا دھرا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی توحید اور اس کے وجود کی عظیم نشانی ہے۔

پانچویں نشانی زمین کا موت کے بعد زندہ ہونا ہے۔ یعنی خشک زمین بارش سے سیراب ہو کر لہلہانے لگتی ہے مگر زمین کے کچھ سخت حصے بارش کے باوجود خشک ہی رہتے ہیں بلکہ بعض تو الٹا اثر لے کر زیادہ شوریدہ ہو جاتے ہیں، صوفیاء کہتے ہیں اسی طرح قرآن بارش ہے۔ بعض اس سے سیراب ہوتے اور ان میں اعمال حسنہ کے پودے اگتے ہیں۔ اور پتھر دل بہت کم فائدہ لیتے ہیں اور بعض کا کفر مزید بڑھ جاتا ہے۔

چھٹی نشانی جانوروں کا زمین پر پھیلنا ہے۔ بارش نہ ہو تو سب جاندار چیزیں مر جائیں۔ اللہ فرماتا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط ہم نے بارش سے ہر زندہ چیز بنائی ہے۔ (انبیاء: ۳۰) جب بارشیں نہیں ہوتیں تو قحط سالی ہو جاتی ہے، جانور مرنے لگتے ہیں، گویا بارش ہی سے ہر جاندار زندہ ہے اور بارش مکمل طور پہ اللہ کے قبضہ واختیار میں ہے۔ انسان اس میں بے بس ہے، تو پھر انسان کو اپنے رب پہ ایمان لا کر اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔

ساتویں نشانی ہواؤں کا بدلنا ہے۔ ہواؤں کا ایک مکمل نظام ہے۔ بعض مشرق سے مغرب کی طرف چلتی ہیں اور بعض اس کا الٹ لیتی ہیں۔ اسی طرح بعض ہوائیں جنوب وشمال سے ادھر ادھر چلتی ہیں۔ جن سے موسم بدلتے اور مختلف پھل اور اناج پیدا ہوتے ہیں اور ہوائیں اللہ ہی کے حکم سے چلتی ہیں۔ ان میں انسان کا کوئی بھی اختیار نہیں ہے۔ اللہ جب چاہے ہوا کو روک دے۔

آٹھویں نشانی بادلوں کا پھیلنا ہے۔ ہوا کے دوش پر بادل ادھر سے ادھر حکم خداوندی کے مطابق چلتے رہتے ہیں اور ان میں لاکھوں ٹن وزنی پانی ہوتا ہے اور وہاں جا کر برستے ہیں جہاں حکم خدا ہوتا ہے۔ اگر یہ سب نشانیاں دیکھ کر بھی کسی کا

عقل اللہ کا وجود اور اسکی وحدانیت نہ مانے تو وہ ازلی بدبخت اور ہٹ دھرم ہے۔

کائنات کی ہر چیز اپنے خالق کا پتہ دیتی ہے:

اس آیت میں عقل والوں کے لیے آٹھ نشانیاں بطور مثال بتائی گئیں ورنہ کائنات کا ہر ذرہ اپنے خالق کا پتہ بتاتا ہے۔ حکایت ہے کہ ایک بڑھیا سے جو چرخا کاتتی تھی۔ کسی نے پوچھا: تم ساری عمر چرخا ہی کاتتی رہی ہو، کیا تم نے اپنے رب کو بھی پہچانا یا نہیں؟ اس نے کہا: میں نے اپنے چرخے ہی سے اپنے رب کو پہچان لیا ہے، دیکھو جب تک میں چرخے کو نہ چلاوں تو یہ از خود نہیں چلتا تو زمین وآسمان کا اتنا بڑا چرخا از خود کیسے چل رہا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے چلانے سے چل رہا ہے پھر اگر میرے ساتھ دوسری عورت بھی چرخا چلانے لگے تو یہ نہیں چلے گا اگر ہم دونوں ایک سمت میں چلائیں تو وہ تیز تر چل کر ٹوٹ جائے گا اور اگر الگ الگ سمت میں چلائیں تو وہ ٹکڑے ہو جائے گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمین وآسمان کے چرخے کو بھی ایک رب ہی چلا رہا ہے۔ الغرض اگر انسان سمجھنا چاہے تو اسے ہر چیز میں اپنے رب کی قدرت نظر آئے گی۔

اس جگہ یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو سائنسی علوم پڑھنے چاہئیں، کیونکہ اس آیت میں جو نعمتیں بیان کی گئی ہیں ان کی صحیح معرفت اور اہمیت سائنسی علوم کے پڑھنے سے جانی جاسکتی ہے یعنی رات اور دن کا آنا جانا کیسے ہے اس کی حقیقت علم فلکیات سے معلوم ہوتی ہے کہ کشتیاں سمندروں میں کیسے تیرتی ہیں۔ اسے سائنس دانوں نے پڑھا اور آج ماڈرن سائنس نے اپنے زور علم سے بڑے بڑے بحری جہاز تیار کر لیے ہیں۔ اسی طرح ہواوں کا چلنا ایک مکمل نظام ہے جسے سائنس ہی بتا سکتی ہے اگر یہ علوم اس نظر سے پڑھے جائیں تا کہ اللہ کی قدرتوں اور قرآنی ارشادات کی حقیقت کا پتہ چلے تو اور یہ کہ ان کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کیسے کی جائے تو یہ علوم بلاشبہ عظیم نور ہیں کیونکہ ان سے علم ہوتا ہے کہ ۔

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید وحدہٗ لاشریک میگوید

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ

اور کچھ لوگ اللہ کے سوا (اس کے) ہمسر بنا لیتے ہیں جن سے وہ اللہ جیسی محبت رکھتے ہیں

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ

جبکہ ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ [166] اور اگر ظالم لوگ (وہ منظر) دیکھ لیں جب وہ

الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

عذاب سے دوچار ہوں گے (تو جان لیں) کہ سب قوت اللہ ہی کیلئے ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب والا ہے۔[167]

[166] دلائل توحید کے بعد منکرین توحید اور مشرکین کا رد لایا گیا جو اللہ کے سوا جھوٹے خدا مانتے ہیں اور ان سے اللہ جیسی محبت رکھتے ہیں یعنی اللہ کی طرح انہیں لائق عبادت اور روزی رساں سمجھتے اور ان کے آگے خود کو یوں گراتے ہیں جیسے بندہ خود کو اللہ کے آگے گراتا ہے اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔فرمایا: اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَّهُوَ خَلَقَكَ یہ کہ تم اللہ کے لیے کوئی ہمسر مانو حالانکہ اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا۔ (بخاری مسلم عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اہل ایمان کی اللہ سے محبت اس سے کہیں زیادہ ہے جو مشرکین کو اپنے بتوں سے ہے۔ چنانچہ قرآن کے مطابق مشرکین عرب مشکلات میں اپنے بتوں کو چھوڑ کر اللہ کو پکارنے لگتے تھے مگر اہل ایمان ہر حال میں اللہ ہی کو پکارتے ہیں۔ پتھروں کے پجاریوں کو جب اچھا پتھر مل جاتا تو پہلے پتھر کو پھینک دیتے اور دوسرے کی عبادت کرنے لگتے۔ مگر اہل ایمان ہر حال میں اللہ ہی کے حضور جھکے رہتے ہیں۔ حدیث میں ہے: اللہ روز قیامت مشرکین سے کہے گا تمہارے معبود تو جہنم میں ہیں جاؤ ان کے پاس پہنچ جاؤ، وہ اس سے انکار کردیں گے۔ پھر اللہ مومنوں سے فرمائے گا تم اس آگ میں داخل ہو جاؤ وہ فوراً داخل ہو جائیں گے۔ (اور وہ ان کے لیے جنت ہو گی)۔ اس وقت عرش سے پکارنے والا پکارے گا: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ (بغوی، قرطبی)

محبت الٰہی کے چار تقاضے:

یاد رہے کہ اللہ کی محبت کے چار تقاضے ہیں۔ اول: اللہ کی خوشنودی کو ہر چیز پہ مقدم رکھا جائے، یعنی وہ کام کیا جائے جس میں اللہ راضی ہو اور جس کام میں اللہ ناراض ہے وہ نہ کیا جائے خواہ اس سے ساری دنیا ناراض ہو جائے۔ دوم: رنج وغم میں بھی اللہ سے محبت رکھی جائے، یعنی اس کی رضا میں راضی رہا جائے اور کبھی زبان پہ حرف شکایت نہ لایا جائے اور یقین رکھا جائے کہ اللہ کا ہر فیصلہ بندے کے لیے بہتری ہی رکھتا ہے۔ سوم: ہر وقت اللہ کا ذکر کیا جائے کیونکہ جو جس کی

محبت میں ڈوب جائے وہ ہر وقت اسی محبوب کا ذکر کرتا ہے۔ چہارم: اللہ کے پیاروں سے پیار کیا جائے کیونکہ ان سے محبت اللہ ہی سے محبت ہے۔اسی لیے اللہ جن سے محبت فرماتا ہے ان کی محبت لوگوں کے سینوں میں ڈال دیتا ہے۔

[167] مشرکین سمجھتے ہیں کہ ان کا کوئی خدا بارش برسانے والا ہے تو کوئی خدا اولاد دینے والا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر انہیں اپنے انجام بد کی خبر ہو جائے تو یہ جان لیں کہ سب طاقتیں صرف اللہ ہی کے پاس ہیں۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ

جب وہ لوگ جن کی (ناجائز) پیروی کی گئی ان لوگوں سے بیزار ہو جائینگے جنہوں نے ان کی پیروی کی اور عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے

بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا

مابین رشتے کٹ جائیں گے۔اور ان کی پیروی کرنے والے کہیں گے کاش! ہمیں (دنیا کی طرف) لوٹنے دیا جائے تو ہم بھی

تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ یُرِیْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ

ان سے بیزار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے بیزار ہوئے، اس طرح اللہ انہیں ان کے اعمال سراپا حسرت دکھائے گا اور وہ

بِخٰرِجِیْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

دوزخ سے (کبھی) نہ نکلیں گے۔[168]

ع ۲۰

[168] کفار کے مذہبی اور سیاسی رہنما انہیں کفر کے راستہ پر گامزن رکھتے ہیں مگر روز قیامت یہ سب لیڈرز اپنے پیروکاروں سے بیزار ہو جائیں گے اور کہیں گے کہ تم نے خود ہی کفر کیا۔ہم نے تمہیں کب مجبور کیا۔

دوسری جگہ فرمایا گیا: قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ ﴿۳۲﴾ (سباء:۳۲)

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖ٘ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر

الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ

مت چلو بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ [169] وہ تو تمہیں برائی اور بے حیائی ہی کا حکم دیتا ہے

وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اور یہ کہ تم اللہ پر بہتان باندھو جو تم نہیں جانتے۔[170]

حلال وحرام کا بیان

[169] گزشتہ رکوع میں اصلاح عقیدہ کی بات تھی اب اصلاح اعمال کی بات ہو رہی ہے اور اس سلسلہ میں اکل حلال پر زور دیا جا رہا ہے کہ حلال چیزوں کو خود پر حرام نہ کرو اور حرام کے قریب مت جاؤ۔

اس آیت کا شان نزول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ کئی قبائل عرب نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کے ناموں سے حلال جانوروں کو از خود حرام قرار دے رکھا تھا، اس کا یہاں رد کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآىِٕبَةٍ وَّ لَا وَصِیْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ (مائدہ: ۱۰۳) یعنی اللہ نے فرمایا جو حلال اور طیب چیزیں ہیں وہ ضرور کھاؤ انہیں خود پر حرام نہ کرو اور شیطان کے پیچھے نہ چلو کہ وہ تمہیں حلال سے ہٹا کر حرام کی طرف لگانا چاہتا ہے۔

حلال اور طیب میں کیا فرق ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

حَلٰلًا طَیِّبًا اس لیے کہ ان دونوں میں فرق ہے۔ حلال کا مقابل حرام ہے اور طیب کا مقابل خبیث، حلال کا معنی جائز اور طیب کا معنی عمدہ یا پاک۔ کئی چیزیں حلال ہیں مگر طیب نہیں۔ چوری کا جانور حلال ہے مگر طیب نہیں۔ اسی طرح ضرورت سے زیادہ کھانا حلال ہے مگر طیب نہیں اور کئی چیزیں طیب ہیں مگر حلال نہیں مٹی پاک ہے یعنی طیب۔ مگر اس کا کھانا حلال نہیں۔ حرام جانور شرعی طریقہ پر ذبح کر دیا جائے تو پاک ہو گیا مگر حلال نہیں۔ اللہ صرف اس چیز کے کھانے کا حکم دے رہا ہے جو حلال بھی ہو اور طیب بھی۔ اب حلال کیا ہے حرام کیا اس کی تفصیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں بتا دی ہے۔

گویا قرآن ایک اصول بتاتا ہے۔ حدیث اس کی تشریح کر دیتی ہے۔ چنانچہ حدیث نے بتایا کہ ہر وہ جانور حرام ہے جو پنجوں اور دانتوں سے شکار کر کے کھائے۔ جیسے شیر، چیتا، بھیڑیا، کتا، اور جنگل کے تمام درندے۔ اسی طرح چیل، کوا، گدھ اور شکرہ و دیگر تمام پرندے جو پنجوں سے شکار کرتے ہیں۔ گویا حدیث کے بغیر صرف قرآن پڑھنے سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ تو قرآن آفتاب ہے حدیث اس کی ضیاء قرآن پھول ہے حدیث اس کی پتیاں۔

اکل حلال کی اہمیت:

يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا سے حلال کھانے کی اہمیت معلوم ہوئی۔ حدیث پاک میں ہے نبی اکرم ﷺ کے سامنے یہی آیت پڑھی گئی: كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا، تو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ دعا فرمائیں اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے سعد اپنا کھانا پاک کر لو تم مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس رب کی قسم جس کے قبضہ میں میں محمد (ﷺ) کی جان ہے: جو شخص ایک لقمہ حرام کھاتا ہے چالیس دن تک اس کی کوئی عبادت قبول نہیں کی جاتی اور جس شخص کا جسم رشوت اور اور سود سے پلا ہوا اس کے لیے سب سے مناسب جگہ جہنم ہی ہے۔ (ابن مردویہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

یاد رہے حرام ذرائع کی کمائی بھی حرام ہے جیسے رشوت، سود، جھوٹ، راہ زنی، جاندار چیزوں کی تصویر سازی، بدکاری، ناچ گانے وغیرہ کی کمائی سب حرام ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”روز قیامت ابن آدم کے قدم ہٹ نہ سکیں گے جب تک وہ پانچ چیزوں کے بارہ میں نہ بتلائے کہ اس نے زندگی کہاں خرچ کی، جوانی کیسے گزاری، مال کہاں سے کمایا، کہاں خرچ کیا اور علم پہ کتنا عمل کیا۔“ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ نے جو چیز حلال بنائی ہے اسے حرام مت کہو:

کفار عرب نے بعض حلال جانور از خود حرام بتائے اللہ نے ان کے رد میں یہ آیت اتاری۔ آج بعض لوگ گیارہویں، محفل میلاد اور ایصال ثواب مثل چالیسواں وغیرہ کے کھانے کو حرام بتاتے ہیں۔ یہ دین میں مداخلت ہے۔ اس پہ ابھی آگے تفصیلی کلام آ رہا ہے۔

اتنا کھانا کہ جان بچ جائے فرض ہے:

كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حکم ربانی ہے، اس سے معلوم ہوا زندہ رہنے کے لیے کھانا فرض ہے۔ لہٰذا بھوک ہڑتال (یعنی مرن برت Death Strike) حرام ہے۔ ہاں روزہ اس سے مختلف ہے۔ وہ رضاء الٰہی کے لیے ہے، اور اس کا مقصد خود کو ہلاک کرنا نہیں ہے، بلکہ اگر روزے کی وجہ سے کسی کی جان پہ بن جائے تو وہ فوراً روزہ توڑ دے۔

بلکہ جان بچانے کے لیے حرام لقمہ کھانے کی بھی اجازت دی گئی ہے، اسی لیے آگے آ رہا ہے کہ اللہ نے فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط یعنی جو جان بچانے کے لیے مردار یا خنزیر کا گوشت کھانے پہ مجبور ہو گیا مگر اس کی کوئی خواہش نہ تھی نہ وہ حد سے بڑھا تو اس پہ کوئی گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے (بقرہ، ۱۷۳)

[170] یعنی شیطان تمہیں حلال سے ہٹا کر حرام میں لگاتا ہے تاکہ تم میں برائی اور بے حیائی لائے۔ کیونکہ رزق حرام سے پلنے والا انسان نیکی کی بجائے برائی اور بے حیائی کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے جبکہ رزق حلال سے دل میں نور ایمان آتا ہے۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ تم از خود چیزوں کو خود پر حرام کر کے اللہ پر بہتان باندھو یعنی یہ سمجھو کہ یہ اللہ کے ہاں بھی حرام ہیں اور تم نہیں جانتے اس کا عذاب کتنا بڑا ہے۔

علم کے بغیر فتویٰ دینے کا گناہ:

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ علم کے بغیر فتویٰ دینا کتنا بڑا گناہ ہے، یہ بھی اللہ ورسول کی طرف ایسی بات منسوب کرنا ہے جسکی سچائی کا کچھ پتہ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ علم دین کو (قرب قیامت میں) یوں نہیں اٹھائے گا کہ اسے سینوں سے نہیں کھینچ لے گا بلکہ یوں اٹھائے گا کہ علماء کو اٹھا لیا جائے گا، پھر جب کوئی عالم نہیں رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنے پیشوا بنالیں گے اور وہ بغیر علم فتویٰ دیں گے، وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے۔ (بخاری کتاب العلم باب ۳۴ حدیث ۱۰۰)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ
اور جب ان سے کہا جائے کہ جو اللہ نے اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں نہیں ہم تو اس (دین) کی پیروی کریں گے
اٰبَآءَنَا ط اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ
جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگر ان کے باپ دادا کچھ عقل اور ہدایت نہ رکھتے ہوں (تو بھی ان کی پیروی کرنا چاہیے؟) [171]
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ط صُمٌّۢ
اور کافروں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو اس (جانور) کو پکارتا ہے جو ایک (بے معنی) پکار اور صدا کے سوا کچھ نہیں سنتا، وہ بہرے
بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾
گونگے اور اندھے ہیں پھر وہ عقل بھی نہیں رکھتے۔ [172]

[171] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بعض یہود کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلام دی۔ انہوں نے کہا ہم تو

اپنے باپ دادا کے دین ہی کی پیروی کریں گے حالانکہ وہ آپ ﷺ کی صداقت سے مکمل آگاہ تھے۔(ابن جریر) اور یہی کفار کا عمومی حال ہے وہ اپنے مذہب کا غلط ہونا جاننے کے باوجود اپنے باپ دادا کی پیروی میں اپنا مذہب ترک نہیں کرتے، کئی بار یہاں برطانیہ میں بدھ مذہب کے لوگوں سے بات ہوئی کہ وہ مہاتما کے جس بت کو اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں اس سے فریادیں کرنا کیا معنی ہے؟ اسلام کی دعوت مانو اوراس رب کی عبادت کرو جس نے سارا جہان بنایا تو وہ کہتے ہیں کیا کریں ہم باپ دادا کا راستہ نہیں چھوڑ سکتے۔ مگر قربان جائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر وہ کتنی سعید روحیں تھیں جب ان کے کانوں میں قرآن کی سچی دعوت گونجی تو ان کے دل کانپ اٹھے اور وہ تمام خاندان اور عزیزوں کی مخالفت کے باوجود دامن رسول ﷺ سے وابستہ ہو گئے اور ہمارے لیے اسلام کا دروازہ کھول گئے۔

[172] وہ کفار جو آوازِ حق سن کر اس پر کان نہیں دھرتے، ان کی مثال ایسے ہے جیسے کسی جانور کو پکارا جائے تو اس کے کان میں ایک آواز اور صدا جاتی ہے مگر وہ سمجھتا نہیں اس کا معنی کیا ہے۔ گویا انہوں نے بے عقلی میں خود کو جانوروں جیسا بنالیا ہے ان کے کان ہیں مگر ان میں حق سننے کی صلاحیت نہیں۔ زبان ہے مگر حق بول نہیں سکتی۔ آنکھ ہے مگر راہ حق دیکھنے سے محروم اور وہ عقل سے بھی محروم ہیں یعنی اگر کسی کی عقل صحیح ہو مگر وہ اندھا یا بہرہ ہو تو کسی نہ کسی طرح اسے سمجھایا جاسکتا ہے، لیکن اگر ساتھ میں بے عقل بھی ہو تو مشکل عظیم ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ

اے ایمان والو! ان پاک چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دیں اور اللہ کا شکر بجا لاؤ اگر تم

كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ

اسی کو پوجتے ہو۔ [173] اللہ نے تو تم پر مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ (جانور)

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ

جس پر (بوقت ذبح) غیر اللہ کا نام پکارا گیا حرام کیا ہے، پھر جو مجبور ہو کہ نہ خواہش رکھتا ہو نہ حد سے بڑھے تو اس پر کوئی گناہ نہیں

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[174]

[173] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''اللہ پاک ہے اور پاک چیز ہی قبول فرماتا ہے۔ اس نے مومنوں کو وہی حکم دیا جو اس نے رسولوں کو فرمایا۔ اس نے رسولوں سے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا

مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ط (مومنون:۵۱) اور مومنوں سے فرمایا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ اس کے بعد نبی پاک ﷺ نے فرمایا۔ ایک آدمی لمبے سفر کرتا ہے۔ اس کے بال غبار آلود اور کپڑے پھٹے پرانے ہیں۔ (دنیا کے لیے مارا مارا پھرتا ہے)۔ وہ آسمان کی طرف ہاتھ لمبے کر کے دعا کرتا ہے۔ اے رب اے رب۔ حالانکہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور بستر حرام ہے اور اس کا جسم حرام سے پلا ہے۔ تو ایسے شخص کی دعا کیسے قبول کی جائے۔'' (مسلم کتاب الزکوۃ حدیث ۶۵، احمد، ترمذی)

[174] ابھی پیچھے آیت ۱۶۸ کے تحت روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان ہوا کہ کفار عرب نے اپنے لیے بعض حلال جانوروں کو از خود حرام قرار دے رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ الخ یعنی اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے تو یہ جانور حرام نہیں کیے۔ اس نے تو مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر خدا کے نام پر ذبح کردہ جانور کو حرام کیا ہے۔

ان چیزوں کا خصوصاً اس لیے ذکر کیا گیا کہ کفار عرب انہیں حلال جانتے تھے۔ وہ مردار جانور کو یہ کہہ کر کھا لیتے کہ اسے اللہ نے مارا ہے۔ جب انسان کا مارا ہوا حلال ہے تو اللہ کا مارا ہوا کیوں حلال نہیں (حالانکہ یہ ان کا ایک بہانہ تھا، مردار کی حرمت کا فلسفہ ہم ابھی بتا رہے ہیں)۔ وہ جانور کو ذبح کرتے وقت اس کا خون مٹکوں میں ڈال لیتے بعد میں اسے پکا کر کھاتے۔ وہ خنزیر کا گوشت بھی کھاتے تھے اور وہ اپنے بتوں کے چرنوں میں بتوں کی خوشنودی کے لیے جانور ذبح کرتے اور بعد میں اسے کھا لیتے گویا اللہ نے فرمایا ہم نے تو یہ چیزیں حرام کی ہیں۔ جو تم نے حلال بنا رکھی ہیں اور جنہیں ہم نے حلال بنایا ہے انہیں تم نے حرام قرار دیا ہے یہ کیسی الٹی چال ہے یہاں چار چیزوں کی حرمت بتائی گئی۔ مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جو جانور غیر خدا کے نام پہ ذبح کیا جائے۔ اب ہم ان چاروں کی کچھ تفصیل بتاتے ہیں۔

مردار کی تعریف اور اس کے احکام:

مردار وہ حلال جانور ہے جو ذبح کر کے کھایا جاتا ہو مگر وہ ذبح کے بغیر از خود مر جائے یا غیر شرعی طریقہ سے ذبح کیا جائے تو اب وہ مردار اور حرام ہو گیا۔ لہٰذا مچھلی حلال ہے کہ وہ ذبح ہی کی نہیں جاتی اور شرعی ذبح یہ ہے کہ جانور کے گلے میں چار رگیں ہوتی ہیں ایک سانس کی، ایک غذا کی، دو خون کی۔ اگر ان میں سے تین کٹ جائیں اور کاٹنے والا اللہ کا نام لے کر کاٹے تو یہ شرعی ذبح ہے۔ لہٰذا ڈوب کر یا گلا گھٹنے سے مرنے والا جانور یا جس کی تین رگیں نہ کٹیں یا جس پر جان بوجھ کر نام خدا نہ لیا گیا یا جسے غیر کتابی کافر یا ملحد کتابی کافر نے ذبح کیا وہ سب مردار اور حرام ہے۔ چونکہ جانور میں اللہ نے روح ڈالی ہے تو ضروری ہے کہ اس کی روح اللہ ہی کے نام پر نکالی جائے تو جو جانور اس کے بغیر مر گیا یا مار دیا گیا وہ حرام ہے، بغیر ذبح از خود مر جانے والے جانور کی حرمت کی ایک طبی وجہ یہ ہے کہ اس کا خون نکالا نہیں گیا بلکہ اس کی رگوں اور گوشت ہی میں جم گیا ایسا گوشت انسانی صحت کے لیے شدید مضر ہے، اس لیے اللہ نے اسے حرام قرار دیا۔

یاد رہے کہ مردار کا کھانا بھی حرام ہے اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت لینا بھی حرام ہے۔ البتہ شریعت نے اتنی گنجائش دی ہے کہ اگر مردار کی چمڑی کو خشک کر کے رنگ لیا جائے اور اس کی ساری رطوبتیں ختم ہو جائیں تو وہ پاک ہو جاتی ہے، اب پانی بھرنے کے لیے اس کا ڈول بنایا جا سکتا اور نماز کے لیے مصلیٰ بنایا جا سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا دُبغ الاھابُ فقد طھُر جب چمڑا رنگ لیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے۔ (مسلم کتاب الحیض حدیث ۱۰۵)

خون کی حرمت اور اس کا فلسفہ:

اس سے بہتا ہوا خون مراد ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا یعنی بہتا ہوا خون حرام ہے۔ (انعام: ۱۴۵) مطلب یہ کہ جانور کو ذبح کرتے ہوئے جو خون بہتا ہے وہ حرام اور نجس ہے اسے پینا یا کھانا جائز نہیں، اہل جاہلیت جانور کو ذبح کرتے ہوئے اس کا خون مٹکے میں ڈال لیتے تھے بعد میں اسے پکا کر کھاتے تھے، آج بھی بعض قوموں میں اس کا رواج ہے، اس خون کا کھانا انسانی صحت کے لیے انتہائی مضر ہے۔ اس لیے شریعت نے اسے حرام قرار دیا اس جگہ دَمًا مَّسْفُوْحًا (بہتے ہوئے خون) کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ کلیجی اور تلی حلال ہیں کہ وہ جما ہوا خون ہیں۔

خنزیر کا نجس عین ہونا:

اس جگہ خنزیر کی بجائے لَحْمَ خِنْزِیْرٍ کا لفظ اس لیے بولا گیا کہ خنزیر نجس عین ہے۔ باقی حرام جانوروں کا چمڑہ اگر رنگ دیا جائے تو وہ پاک ہو جاتا ہے اس پہ نماز جائز ہے اور اس سے استعمال کا برتن یا ڈول بنانا جائز ہے۔ مگر خنزیر کا چمڑہ رنگنے سے کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ باقی حرام جانوروں کی خشک چیزیں یعنی ان کے بال، سینگ، کھر اور ہڈیاں پاک ہیں اگر پانی میں گر جائیں تو وہ پاک ہے مگر خنزیر کی یہ سب چیزیں نجس ہیں کیونکہ یہ سب گوشت ہی سے پیدا ہوتی ہیں اور خنزیر کے گوشت کو نجس کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ کہ خنزیر سراپا ناپاک ہے۔ (انعام: ۱۴۵)

حرمت خنزیر کا فلسفہ:

خنزیر کی حرمت کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ شدید بے حیا جانور ہے۔ یہی ایک جانور ہے جس میں نر نر سے جنسی عمل کرتا ہے اور جو قومیں اسے کھاتی ہیں ان میں بھی ایسی صفات پیدا ہو جاتی ہیں جیسا کہ آج یورپین پارلیمنٹ نے لواطت کو قانونی طور پہ جائز فعل قرار دیا ہے اور یورپ میں لواطت کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور لوطیوں کو قانونی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اور یہ اہل یورپ کی خنزیر خوری کا نتیجہ ہے۔

خنزیر اس قدر بے حیا جانور ہے کہ ایک مادہ جانور کو بہت سے نر خنزیر بیک وقت باری باری استعمال کرتے ہیں اور کسی نر کو اپنی مادہ کے بارہ میں غیرت نہیں ہوتی۔ جبکہ باقی سب جانوروں میں نر اپنی مادہ کے لیے بہت غیرت مند ہوتا

ہے حتی کہ بندر بھی اپنی بندریا کے لیے بہت غیرت مند ہوتا ہے۔ بخاری کتاب مناقب الانصار میں ہے کہ بندروں میں رجم کا طریقہ جاری ہے۔ یعنی جو بندر زنا کا ارتکاب کرے اسے رجم کیا جاتا ہے مگر خنزیر ہر حیاء سے عاری جانور ہے اور آج یورپ میں جو بے حیائی کا سیلاب ہے اس میں خنزیر خوری کا بھی بڑا دخل ہے۔

خنزیر غلاظت خور جانور ہے۔ انگریز اسے اس لیے اپنے ساتھ گھروں میں رکھتے ہیں کہ وہ غلاظت کھا جاتا ہے مگر اس کے کھانے کا نقصان یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان میں بھی غلاظت خوری آ جاتی ہے۔ چنانچہ خنزیر قوموں کو کسی حلال وحرام کی تمیز نہیں ہے۔ وہ ڈڈو، چھپکلیاں اور مینڈک تک کھا جاتے ہیں۔

آخر میں یہاں فرمایا گیا۔ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ ان الفاظ کے معنی میں آج کل بعض لوگ صحابہ کرام وتابعین اور جمہور مفسرین کے بیان کردہ مفہوم سے انحراف کر کے مسلمانوں میں نار فتنہ پیدا کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم اس کا صحیح معنی متعین کرنے میں کچھ تفصیلی بات کرتے ہیں۔

مااُھِلّ بہ لغیر اللہ کا صحیح معنی صحابہ کرام، تابعین اور اجلہ مفسرین کے اقوال کی روشنی میں:

ان الفاظ کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

المراد ما ذبح للانصاب والاوثان یعنی اس سے وہ جانور مراد ہے جو بتوں اور دیوتاؤں کے لیے ذبح کیا جائے۔ (قرطبی جلد ۲ صفحہ ۲۲۴)

مجاہد (تابعی) فرماتے ہیں۔ مَا ذُبِحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وہ جانور جو غیر خدا کے لیے ذبح کیا جائے۔ (درمنثور جلد ۱ صفحہ ۴۵۷)

قتادہ (تابعی) فرماتے ہیں: مَا ذُبِحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ مِمَّا لَمْ يُسَمَّ عَلَيْهِ۔ جو جانور غیر خدا کے لیے ذبح کیا جائے اور اس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ (ابن جریر)

حضرت ضحاک (تابعی) فرماتے ہیں مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِلطَّوَاغِيْت وہ جانور جسے شیاطین کے لیے ذبح کیا جائے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۵۰۷)

امام ابوبکر جصاص حنفی تفسیر احکام القرآن میں فرماتے ہیں۔

لَاخِلَافَ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَنَّ الْمُرَادَبِه الذبيحةُ اِذَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ عِنْدَ الذَّبْحِ یعنی مسلمانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں کہ اس سے مراد وہ جانور ہے کہ ذبح کے وقت اس پر غیر خدا کا نام پکارا گیا ہو۔

(تفسیر احکام القرآن جلد اول صفحہ ۵۴ مطبوعہ بیروت)

امام قرطبی فرماتے ہیں:

وھی ذبیحۃ المجوسی والوثنی والمعطّل فالوثنی یذبح للوثن والمجوسی للنار والمعطل لایعتقد شیئا فیذبح لنفسه. مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے مراد آگ پرست، بت پرست اور بے دین شخص کا ذبیحہ

مراد ہے کیونکہ آگ پرست آگ کے لیے اور بت پرست بت کے لیے ذبح کرتا ہے اور بے دین کوئی اعتقاد نہیں رکھتا بس وہ اپنے لیے ذبح کرتا ہے۔ (تفسیر قرطبی جلد ۲ صفحہ ۲۲۳ مطبوعہ داراحیاء)

امام ابن کثیر فرماتے ہیں:

وھو ما ذُبح علی اسم غیر اللہ تعالیٰ من الانصاب والانداد والازلام، یہ وہ جانور ہے جو بتوں اور جھوٹے معبودوں وغیرہ کے نام پہ ذبح کیا جائے (تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۲۱۱ مطبوعہ دارالفکر) اس کے علاوہ امام فخر الدین رازی، امام نسفی، امام خازن امام بغوی اور دیگر تمام اجلہ مفسرین کرام نے ما اُھلّ بہ لغیر اللہ کا یہی معنی متعین کیا ہے۔

تفسیر جلالین جو درسی کتاب ہے اور تمام علماء اسے سبقاً سبقاً پڑھتے ہیں، میں یوں کہا گیا:

ای ذبح علی اسم غیرہ، یعنی غیر خدا کے نام پہ ذبح کیا ہوا جانور۔ (جلالین مع صاوی جلد اول صفحہ ۷۹ مطبوعہ داراحیاء)

لہٰذا اس معنی کی روشنی میں ہر وہ حلال جانور جسے ایک مسلمان اللہ کے نام پر ذبح کرے اس کا کھانا جائز ہے، خواہ وہ اس لیے ذبح کرے کہ اسنے مہمانوں کو شادی یا کسی اور تقریب میں مدعو کیا ہے اور ان کے لیے کھانا پکایا جائے گا یا محفل میلاد یا محفل گیارہویں شریف کی جائے اور حاضرین کے لیے کھانا بنایا جائے یا کسی بزرگ کے عرس پہ مہمانوں کے لیے کھانا تیار کیا جائے۔

ایک استثنائی صورت

البتہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر کسی بادشاہ یا امیر کے آنے پر اس کے احترام میں جانور ذبح کیا جائے اور مقصد اس کا گوشت کھانا نہ ہو بلکہ صرف بادشاہ کو احترام پیش کرنا مقصد ہو تو یہ جانور حرام اور ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے اور اگر بادشاہ کے کھانے کے لیے ذبح کیا جائے تو وہ حلال ہے اور ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں ذبح سے جانور کا کھانا مقصد نہیں بلکہ اسے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا گیا اور دوسری صورت میں ذبح سے جانور کا کھانا مقصد ہے۔ (درمختار جلد ۵ صفحہ ۱۹۷ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت) اس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی نے کسی بزرگ کے مزار پہ جا کر جانور ذبح کیا اور اس کا مقصد صرف بزرگ کا احترام اور اس کو خوش کرنا ہے، جانور کا کھانا مقصد نہیں تو یہ جانور حرام اور ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہے، مگر حاشا للہ کہ کوئی مسلمان ایسا جاہلانہ کام کرے اور نہ ہی ہم نے آج تک کسی مسلمان کو ایسا کرتے دیکھا ہے اور اگر کسی بزرگ کے مزار پہ حاضری دی جائے اور وہاں جانور ذبح کر کے وہاں کے حاضرین اور فقراء کو کھانا کھلایا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔

ما اُھلّ بہ لغیرِ اللہ کے غلط تراجم کی نشاندہی:

اب بعض نجدیت زدہ لوگ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کا معنی اس طرح کر رہے ہیں: ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا

کسی اور کا نام لیا گیا ہو۔ (تفہیم القرآن، سید ابوالاعلیٰ مودودی، جلد اول صفحہ ۱۳۵)

جس جانور پہ نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی کا (ترجمہ قرآن مولانا محمود الحسن دیوبندی)

اور ہر وہ چیز جس پہ اللہ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو (ترجمہ مولانا فتح محمد جونا گڑھی)

یہ تراجم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جلیل القدر تابعین جیسے مجاہد، قتادہ اور ضحاک رضی اللہ عنہم اور تمام مستند مفسرین کی تفسیر کے خلاف ہیں جیسا کہ ابھی آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔

پھر ان تراجم کو عقل سلیم بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مثلاً مولانا مودودی اور مولانا فتح محمد کے ترجمہ کے مطابق ہر وہ چیز حرام ہے جس پر غیر خدا کا نام لیا جائے اب وہ کونسی چیز ہے جس پہ غیر خدا کا نام نہیں لیا جاتا۔ مثلاً زید کا مکان، خالد کی کار، بشیر کے کپڑے، نذیر کا کھانا وغیرہ تو دنیا میں کونسی چیز حلال رہ گئی؟ اور مولانا محمود الحسن کے ترجمہ کے مطابق ہر وہ جانور حرام ہے جس پہ غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔ اب کہا جاتا ہے زید کا بکرا، کامران کی گائے، خالد کا اونٹ وغیرہ تو پھر دنیا میں کونسا جانور حلال رہ گیا؟ سبھی تو حرام ہو گئے۔

دراصل ان غلط تراجم کی آڑ میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ چالیسواں کے ختم شریف، اعراس بزرگان دین، گیارہویں شریف اور محفل میلاد کے لیے پکائے گئے کھانے کو حرام اور مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کے تحت داخل کیا جائے اور کہا جائے کہ اس کھانے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، غوث اعظم رحمہ اللہ یا کسی اور ولی اللہ کا نام لیا گیا ہے لہٰذا یہ حرام ہے یعنی ان لوگوں کو ختم شریف اور محفل میلاد کے کھانے سے بلاوجہ چڑ ہو گئی ہے۔ اسی طرح وہابیت زدہ لوگ بزرگان دین کے مزارات پر قائم لنگر خانوں میں نذرانے کے بکرے جمع کرانے اور ان کے کھانے کو بھی حرام قرار دیتے ہیں اور اسے بھی مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے نیچے لاتے ہیں مگر یہ ان کی بڑی زیادتی ہے۔ ابھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ سے مراد ہر وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے یا غیر اللہ کے احترام اور خوشنود کے لیے ذبح کیا جائے اور اسکا کھانا مقصد نہ ہو۔

اولیاء اللہ کے لیے نذر ماننے کا شرعی حکم:

اس جگہ یہ سوال باقی ہے کہ اگر یہ نذر مانی جائے کہ یا اللہ اگر میرا یہ کام ہو جائے تو میں فلاں بزرگ کے لیے ایصال ثواب کروں گا اور کھانا پکوا کر اس کے مزار پہ غرباء میں تقسیم کروں گا اور وہ اس کام کے لیے جانور تیار کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، درسِ نظامی کی متداول کتاب ''نورالانوار'' کے مصنف ملا جیون رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور تفسیر قرآن میں فرماتے ہیں: اَنَّ الْبَقَرَةَ الْمَنْذُوْرَةَ لِلْاَوْلِيَآءِ كَمَا هُوَ رَسْمٌ فِيْ زَمَانِنَا حَلَالٌ طَيِّبٌ طَاهِرٌ بے شک جو گائے اولیاء اللہ کے لیے نذر مانی جاتی ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں رائج ہے، حلال اور طیب و طاہر ہے۔'' (تفسیرات احمدیہ صفحہ ۲۹)

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں:

بعض لوگ زندہ جانور جیسے گائے بکری مرغ وغیرہ بزرگوں کے مزارات پر بطور نیاز لے جاتے ہیں اور ذبح کی قید نہیں لگاتے خدام درگاہ مختار ہوتے ہیں کہ خواہ ذبح کریں یا فروخت کردیں۔ نذر کی یہ قسم بھی کچھ قباحت نہیں رکھتی۔
(فتاویٰ شاہ رفیع الدین صفحہ ۸)

البتہ یوں کہنا کہ اے فلاں بزرگ اگر تم میری یہ حاجت پوری کردو تو میں یہ نذر تمہارے پاس لاؤں گا تو فقہاء کے نزدیک یہ نذر حرام ہے۔ چنانچہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں: یوں کہنا کہ اے فلاں بزرگ اگر میرا غائب لوٹ آئے یا میرا بیمار درست ہوجائے یا میری یہ حاجت پوری ہوجائے تو میں اس قدر سونا، چاندی، کھانا، شمع یا تیل تمہارے لیے لاؤں گا تو یہ نذر باطل اور حرام ہے، چند وجوہ سے: ایک یہ کہ یہ مخلوق کے لیے نذر ہے حالانکہ نذر عبادت ہے جو غیر اللہ کے لیے نہیں ہوسکتی، دوسری وجہ یہ ہے کہ جس کے لیے نذر مانی گئی وہ میت ہے اور میت کسی چیز کا مالک نہیں، تیسری وجہ یہ ہے کہ میت کو اللہ کے مقابلہ میں متصرف فی العالم سمجھنا کفر ہے (اگرچہ ایسا سمجھنا زندہ کے حق میں بھی کفر ہے مگر مردہ کے حق میں سمجھنا زیادہ شنیع ہے) البتہ اگر یوں کہا جائے کہ یا اللہ میں تیرے لیے نذر مانتا ہوں کہ اگر تو نے میرے بیمار کو شفا دیدی یا میرا غائب لوٹا دیا یا میری حاجت پوری کردی تو میں سیدہ نفیسہ یا امام شافعی یا امام لیث کے مزار پہ بیٹھے فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا یا وہاں کی مساجد میں چٹائی ڈالوں گا یا وہاں روشنی کے لیے تیل لاؤں گا یا وہاں کے اخراجات کے لیے پیسہ پیش کروں گا تاکہ وہاں کے فقراء کو نفع ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس میں نذر تو اللہ کے لیے ہے مگر اس کا نفع فقراء کے لیے۔ (ردالمحتار کتاب الصوم جلد ۲ صفحہ ۴۶۷ مطبوعہ مصطفٰی البابی مصر)

آگے اللہ نے فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ یعنی اگر کسی شخص کو اس قدر بھوک ہو کہ اگر کچھ نہ کھائے تو مرجائے ایسے میں اگر اسے مردار، خنزیر کا گوشت یا غیر خدا کے نام پر ذبح کردہ جانور کا گوشت کھانا پڑے تو اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بشرطیکہ وہ اس کھانے کی دل میں نہ خواہش رکھے نہ بھوک کی حد سے زیادہ کھائے۔ اگر ایک لقمہ سے جان بچتی ہے تو دوسرا لقمہ حرام ہے۔

جان کا بچانا سب سے بڑا فرض ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ سے معلوم ہوا جان بچانا ایسا فرض ہے جس کے لیے مردار اور خنزیر کا گوشت کھانا بھی جائز قرار دیا گیا اور ائمہ فقہ کے نزدیک اگر ایک شخص مردار نہ کھائے اور بھوکا مرجائے تو وہ شہید نہیں بلکہ گناہگار ہے کیونکہ جان کا بچانا مردار کے نہ کھانے سے بڑا فرض ہے، جان بچے گی تو سب عبادات کی جائیں گی۔

بامرِ مجبوری حرام دوا کا استعمال جائز ہے:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مسلمان ماہر ڈاکٹر مریض کے لیے کوئی حرام دوا (Prescription) تجویز کرے

اور کوئی دوسری دوا اس کا نعم البدل نہ ہو جو مریض کی جان بچا سکے تو حرام دوا بامر مجبوری کھائی یا استعمال کی جا سکتی ہے۔ اور یہ بھی فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ میں داخل ہے۔ چنانچہ اہل عرینہ کو حضور ﷺ نے اونٹوں کا پیشاب پینے کی اجازت دی۔ انہوں نے پیا تو انہیں شفا ہوگئی۔ (بخاری کتاب الوضوء باب ۶۶)

حضرت علامہ بدرالدین عینی اس حدیث کی شرح فرماتے ہیں اگر اعتراض کیا جائے کہ حدیث ہے حرام میں شفاء نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس صورت پر محمول ہے جب کوئی حلال دوا میسر ہو ایسے میں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں نہ ہی اس میں شفاء ہے جبکہ حالتِ اضطرار (مجبوری) میں وہ دوا حرام رہتی ہی نہیں۔ جیسے مجبور شخص کے لیے مردار حرام رہتا ہی نہیں۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۳ صفحہ ۱۵۵) اسی لیے اگر کوئی شخص بھوکا مرجائے اور مردار نہ کھائے تو وہ گناہ گار ہوا، کیونکہ اس نے حلال سے اجتناب کیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا

بے شک جو لوگ (وہ علم) چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب میں اتارا اور اس کے عوض میں قلیل پونجی

قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ

خریدتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے روزِ قیامت اللہ ان سے

الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا

نہ کلام کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ [175] یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے

الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

ہدایت کے بدلے گمراہی اور بخشش کے بدلے عذاب خرید لیا تو وہ نار جہنم کے لئے کتنے دلیر ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ

یہ اس لئے ہے کہ اللہ نے حق کے ساتھ کتاب اتاری اور جو لوگ کتاب میں اختلاف رکھتے ہیں وہ دور کے

لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع

جھگڑے میں جا پڑے ہیں۔ [176]

ع ۲۱ ۵

[175] اب ایک حرام خور قوم کا ذکر ہو رہا ہے جن کی حرام خوری بہت گھناؤنی اور لرزہ خیز تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس

ﷺ فرماتے ہیں یہ آیت علماء یہود کے لیے اتری۔ انہیں امید تھی کہ نبی آخر الزمان ﷺ انہی میں سے مبعوث ہونے والے ہیں مگر جب حضور ﷺ دوسرے لوگوں میں سے مبعوث ہوئے تو انہوں نے تورات میں سے وہ آیات چھپانا یا بدلنا شروع کر دیں جو حضور ﷺ کی صفات بیان کرتی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو یہودی عوام ایمان لے آئیں گے اور انہیں جو نذرانے کھانے کو ملتے ہیں وہ نہیں ملیں گے۔ ان کے متعلق یہ آیات اتریں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَشْتَرُوْنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا (درمنثور جلد اول صفحہ ۴۰۹) اسی طرح مروی ہے کہ کعب بن اشرف یہودی نے یہودی علماء کو بھاری رشوت دے کر اس بات پہ تیار کیا کہ وہ تورات میں سے نبی اکرم ﷺ کی صفات بدل دیں اور انہوں نے ایسا کر دکھایا۔ (روح البیان سورہ بقرہ زیر آیت: یکتبون الکتاب بایدیھم) گویا اللہ نے ان آیات میں ان رشوت خور حرام ہڑپ یہودی علماء پر پھٹکار ڈالی اور ان کا اخروی انجام بد بیان کیا۔

[176] یعنی اللہ تعالیٰ نے تورات حق کے ساتھ اتاری کہ اس میں حضور ﷺ کی سچی صفات بیان کیں مگر ظالم یہود نے ان کی جگہ جھوٹی صفات لکھ دیں تو وہ دور کے جھگڑے میں جا پڑے۔

دنیوی فائدہ کے لیے حق بات کا چھپانا بڑا گناہ ہے:

یہود نے اپنے مالدار لوگوں سے رشوتیں لے کر حضور ﷺ کی صفات تورات میں سے غائب کر دیں۔ اسی طرح وہ رشوت لے کر امراء کے لیے تورات کے احکام بدل کر نرم کر دیتے تھے۔ سورہ مائدہ آیت ۶۲ میں اس کی تفصیل آئے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے چار عذابات بیان کیے وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں۔ اللہ ان سے کلام نہ فرمائے گا (یعنی رحمت بھرا کلام نہ فرمائے گا، ورنہ کلام تو سب سے کریگا)۔ انہیں گناہوں سے پاک نہ کرے گا اور ان کے لیے جہنم کا دردناک عذاب ہے۔

رشوت آگ ہی آگ ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور حدیث نبوی ہے: حضور ﷺ رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت فرماتے تھے۔ (ترمذی کتاب الاحکام)

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو [177] بلکہ نیکی تو یہ ہے

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى

کہ جو شخص اللہ اور روزِ آخرت اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اللہ کی محبت میں

الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ

رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو

وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ

اور گردنیں آزاد کروانے میں مال خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو لوگ

بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ

وعدہ پورا کرتے ہیں جب وہ وعدہ کر لیں اور جو غربت، تکلیف اور جہاد کے وقت صبر

الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

کرتے ہیں انہی لوگوں نے اپنی بات سچ کر دکھائی اور یہی لوگ پرہیز گار ہیں۔[178]

چند بنیادی ایمانی تقاضوں کا حکم

[177] تین رکوع پیچھے تحویل قبلہ کی بات ہو رہی تھی جب اس موقع پر یہود کی زبان درازی طول پکڑ گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ نیکی کا معیار صرف یہ نہیں کہ تم کسی خاص سمت میں منہ کر لو یعنی محض مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر کے عبادت میں کھڑا ہونا ہی نیکی کا بنیادی تقاضا نہیں کہ اگر سمت بدل گئی تو دین بدل گیا بلکہ دین تو ایک مکمل نظام حیات ہے جس کے چند اہم تقاضے ہیں جو اس آیت میں بیان کیے گئے۔ گویا یہاں البرّ کا معنی دین ہے۔

[178] تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دین کے پانچ بنیادی تقاضے یا مومن کی پانچ شانیں بیان کی ہیں۔ ہم ان کی کچھ تفصیل بیان کرتے ہیں۔

مومن کی پہلی شان:

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ یعنی مومن وہ ہے جو اللہ، روز قیامت، فرشتوں، اللہ کی کتابوں اور سب انبیاء پہ ایمان رکھے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ سب سے پہلے اللہ پر یوں ایمان لائے جیسی اس کی ذات وصفات ہیں، یہود ونصاریٰ کی طرح اللہ کے لیے اولاد اور مشرکین کی طرح اس کے لیے شریک نہ مانے پھر روز آخرت پر ایمان رکھے کہ وہاں عقیدہ وعمل کی بنیاد پر جنت ودوزخ ملے گی نہ کہ نسل اور نسبت کی بنیاد پر جیسا کہ یہود ونصاریٰ نے سمجھا اور یہ کہا: لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ ''یہود ونصاریٰ کے سوا کوئی شخص ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' (بقرہ ۱۱۱)

پھر مومن پہ یہ بھی لازم ہے کہ سب فرشتوں پر ایمان لائے کہ وہ سب اللہ کے مقرب بندے ہیں۔ یہود کی طرح یہ نہ کہے کہ میکائیل ہمارا دوست ہے اور جبرائیل ہمارا دشمن۔ پھر مومن پر لازم ہے کہ اللہ کی ہر کتاب پر ایمان لائے، تورات پر ایمان اور قرآن سے انکار یہ مومن کی شان نہیں۔ پھر وہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لائے کہ وہ گناہوں سے معصوم اور اللہ کے منتخب بندے ہیں۔ یہود کی طرح انبیاء کا قاتل اور ان پر الزامات لگانے والا نہ بنے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو سید الانبیاء ہیں ان سے انکار کر کے یہود کس طرح ایمان کے دعویدار اور نجات کے متمنی ہیں۔

مومن کی دوسری شان:

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ یہ ہے کہ مومن اللہ کی محبت میں غریب رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، اور حاجت مند سائلین کی مالی امداد کرتا اور گردنوں کے آزاد کرانے میں لوگوں کا مالی تعاون کرتا ہے۔ یعنی اگر غلام مکاتب ہے تو اس کا زر کتابت ادا کر کے اسکی گردن غلامی کے طوق سے آزاد کرواتا ہے اور مقروض کی مالی مدد کر کے اسکی گردن بار قرض سے چھڑواتا ہے۔

مومن کی تیسری شان:

وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ کہ مومن نماز قائم کرتا اور زکوٰۃ دیتا ہے۔ نماز وزکوٰۃ کا ذکر بطور مثال ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تمام بدنی ومالی عبادات کی پابندی کرتا ہے۔ نماز بدنی عبادات سے اشارہ ہے اور زکوۃ مالی عبادات سے۔

مومن کی چوتھی شان:

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ مومنین جب وعدہ کرلیں تو اس کی پاسداری کرتے ہیں۔ اس میں روز میثاق کا وعدہ الست بربکم، تجارتی معاہدات، حقوق نکاح، امانتوں کی واپسی اور نذر کا پورا کرنا سب شامل ہیں۔ یہ

یہود نصاریٰ پر تعریض ہے کہ انہوں نے تورات و انجیل میں حضور ﷺ کے متعلق ان سے لیے گئے وعدوں کو پس پشت ڈال دیا اور وعدہ شکنی یہود کی فطرت ہے۔ اللہ فرماتا ہے: اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ کیا جب بھی وہ کوئی عہد کرتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ اسے ضرور توڑ دیتا ہے۔ (بقرہ: ۱۰۰)

مومن کی پانچویں شان:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ مومنین ہر حالت میں اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہیں اور صبر و شکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اَلْبَاْسَآءِ سے غربت، الضَّرَّآءِ سے ہر تکلیف جیسے بیماری پریشانی وغیرہ اور الْبَاْسِ سے وقت جہاد مراد ہے یعنی اہل ایمان غربت و پریشانی میں راضی برضا اور جہاد میں ثابت قدم ہتے ہیں یہود کی طرح نہیں کہ اپنے نبی سے کہہ دیں فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ جاؤ تم اور اپنے رب کو بھی ساتھ لیجاؤ اور جا کر لڑو، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ (مائدہ: ۲۴)

اسلام ایک کامل نظامِ حیات ہے:

اس آیت کے شان نزول سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ نے بعض سمتوں میں رخ کر کے چند دعاؤں کے پڑھنے کا نام دین سمجھ لیا تھا۔ اللہ نے فرمایا: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ اور بلاشبہ آج تمام مذاہب کے پاس چند مخصوص مذہبی رسوم کے سوا کچھ نہیں اگر کوئی کامل نظام حیات ہے تو وہ دین اسلام ہے۔ جس میں نظام طہارت ہے، قوانین عبادات ہیں، عائلی قوانین ہیں، خرید و فروخت، اجارت، مشارکت اور مضاربت وغیرہ کے احکام ہیں، اور اس میں احکام حدود و قصاص یعنی فوجداری قوانین ہیں اور وراثت کے مفصل حقوق ہیں، کسی اور دین میں چند دعاؤں اور چند مذہبی رسوم کے سوا کچھ نہیں ہے تو مسلمانوں کو اپنے جامع دین پہ فخر کرنا چاہیے۔

اعمال کی قبولیت صحت ایمان پر موقوف ہے:

اس آیت میں پہلے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ کہہ کر ایمانیات بیان کیے گئے اس کے بعد وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ کہہ کر اعمال حسنہ بتائے گئے۔ گویا اگر ایمان درست نہیں تو کوئی عمل قبول نہیں اور ایمان حب خدا اور رسول اور اللہ و رسول کی کہی ہوئی ہر بات پہ دل کی گہرائیوں سے ایمان لانے کا نام ہے۔ آج یورپ و امریکہ کے لوگ معاملات میں بہت اچھے ہیں مگر عدم ایمان کے سبب ان کے اعمال کا آخرت میں انہیں کچھ فائدہ نہیں۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کسی انسان پر ایمان لانا مدارِ نجات نہیں:

شیعہ لوگوں کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بارہ آئمہ اہل بیت کا ماننا بھی بنیادِ ایمان ہے جو انہیں معصوم و منصوص امام نہ مانے وہ ان کے نزدیک کافر ہے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو اس آیت میں یوں کہا جاتا: من امن باللہ والیوم الآخر والملئکۃ والکتب والنبین والائمۃ الاثنا عشر من اھل بیت النبی بارہ آئمہ کی فضیلت و عظمت سب کو مسلم ہے۔ مگر اہل تشیع کی مزعومہ امامت کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ انبیاء تو دنیا سے چلے گئے، اب تو امت کو ائمہ سے واسطہ پڑنے والا تھا اگر ان پہ ایمان لانا انبیاء پہ ایمان لانے کی طرح لازم ہے تو قرآن میں ان کا مذکور ہونا انبیاء سے بھی زیادہ ضروری تھا۔

قریبی رشتہ دار ہماری مالی مدد کے زیادہ حقدار ہیں:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ میں غریب رشتہ داروں کا ذکر پہلے ہے اور یتامیٰ و مساکین کا بعد میں۔ اس میں یہ درس ہے کہ غریب رشتہ داروں سے منہ موڑ کر اجنبی لوگوں کی مدد اللہ کو پسند نہیں۔ رشتہ داروں کی مدد کا زیادہ ثواب اس لیے ہے کہ اس میں انفاق فی سبیل اللہ کے علاوہ صلہ رحمی کا ثواب بھی ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنے رزق اور عمر میں اضافہ چاہتا ہے اسے رشتہ داروں سے حسن سلوک کرنا چاہیے۔ (صحیح مسلم کتاب البر)

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ
اے ایمان والو! تم پر (ناحق) مقتولین کے بارے میں خون کا بدلہ خون لازم کیا گیا ہے، آزاد کا بدلہ آزاد،
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ
غلام کا بدلہ غلام اور عورت کا بدلہ عورت [179] پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف
فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
کر دیا جائے تو بھلائی کے ساتھ پیروی اور بھلائی کے ساتھ ادائیگی چاہئے یہ تمہارے رب کی طرف سے نرمی
وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِی
اور رحمت ہے پھر جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔[180] اور تمہارے لئے
الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾
خون کے بدلے خون میں زندگی ہے اے عقل والو! تاکہ تم (قتل سے) بچ جاؤ۔[181]

قصاص کا وجوب اور اس کی اہمیت و افادیت

[179] گزشتہ آیت میں دین کے بنیادی عقائد و اعمال اور عبادات و اخلاق پائے گئے۔ اب اسلامی معاشرے کو شرو فساد سے پاک رکھنے کے لیے نظام قصاص بتایا جارہا ہے۔ قصاص کا لغوی معنی کاٹنا ہے اور شریعت میں قصاص یہ ہے کہ کسی کی جان یا اس کا کوئی عضو تلف کرنے والے کی جان یا عضو کو بحکم قاضی تلف کیا جائے۔

ظہورِ اسلام سے قبل عرب میں قصاص میں سخت بے اعتدالی تھی۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ظہور اسلام سے قبل دو عرب قبیلوں (اوس و خزرج) میں عرصہ سے جنگ آرہی تھی۔ ایک قبیلہ والوں نے قسم اٹھا رکھی تھی کہ وہ اپنے غلام کے بدلے آزاد اور عورت کے مقابلہ میں مرد (اور ایک آزاد مرد کے مقابلہ میں دو آزاد مردوں) کو مارے بغیر مطمئن نہ ہوں گے۔ ابھی انہوں نے قسم پوری نہ کی تھی کہ وہ اسلام لے آئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ (ابن ابی حاتم)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دور جاہلیت میں اگر کوئی غلام کسی بڑے قبیلے کے غلام کو مار دیتا تو وہ اس کے عوض

ان کے آزاد مرد کو قتل کیے بغیر چین سے نہ بیٹھتے تا کہ ان کی عزت میں اضافہ ہو اگر کوئی عورت ان کی کسی عورت کو مار دیتی تو وہ بدلے میں مرد کو مارتے (اور ایک آزد مرد کے بدلے دو یا کئی آزاد مردوں کو مارتے) اس کے بارہ میں یہ آیت اتری۔ (سنن بیہقی)

تو آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر آزاد مرد کسی آزاد مرد کو مارے تو اس کے بدلے میں اسی آزاد مرد کو مارا جائے۔ غلام غلام کو مارے تو اسی غلام کو مارا جائے اور عورت عورت کو مارے تو اسی عورت کو مارا جائے۔

[180] یعنی اگر مقتول کے وارث کی طرف سے جو قاتل کا اسلامی ایمانی بھائی ہے قاتل کو معاف کر دیا جائے اور بدل صلح مقرر ہو جائے کہ اگر قاتل اتنی رقم دے تو اسے معافی ہے تو اس رقم کا بھلائی سے تقاضا کرنا چاہیے اور قاتل کو خوش دلی سے بدل صلح ادا کرنا چاہیے۔

ذٰلِكَ تَخۡفِيۡفٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٌ ؕ کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بنی اسرائیل میں صرف قصاص تھا۔ بدل، صلح یا دیت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ پہ احسان کرتے ہوئے انہیں قتل کے معاف کرنے یا بدل صلح لینے کی اجازت دی۔ (ابن ابی حاتم جلد اول صفحہ ۲۹۶ حدیث ۱۵۸۵ مطبوعہ مکہ مکرمہ) اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قصاص کی معافی اور بدل صلح کا جواز امت محمدیہ کے لیے خصوصی تخفیف اور رحمت ہے۔

فَمَنِ اعۡتَدٰى بَعۡدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۱۷۸﴾ کا معنی یہ ہے کہ قاتل کو بلا معاوضہ معاف کر دینے یا بدلِ صلح لے لینے کے بعد اسے قتل کرنا یا قاتل کا معافی لینے کے بعد بدل صلح کی ادائیگی میں پس و پیش کرنا بڑا ظلم ہے۔ اس پر دردناک عذاب کی وعید ہے۔

گناہ کرنے سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہوتا:

فَمَنۡ عُفِىَ لَهٗ مِنۡ اَخِيۡهِ شَىۡءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ ؕ میں مقتول کے وارث کو قاتل کا بھائی کہا گیا ہے یعنی قتل کے باوجود دونوں ایمانی رشتے کے اعتبار سے باہم بھائی بھائی ہیں، ان میں سے کوئی کافر نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ قتل جیسے لرزہ خیز گناہ کے باوجود کوئی مسلمان کافر نہیں ہو جاتا۔ بعض گمراہ فرقوں نے یہ عقیدہ اپنایا کہ گناہ کبیرہ سے مسلمان کا ایمان ختم ہو جاتا ہے مگر ان کا یہ عقیدہ غلط ہے۔

اسی لیے دوسری جگہ فرمایا گیا:

وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ ''اگر مسلمانوں کے دو گروہ باہم قتال کریں تو ان میں صلح کراؤ۔'' (حجرات، ۹) معلوم ہوا کہ وہ باہم لڑائی اور ایک دوسرے کے قتل کے باوجود مومنین ہی ہیں۔ ثابت ہوا کہ کوئی گناہ انسان کو ایمان سے خارج نہیں کرتا۔

آگے اللہ نے فرمایا:

اے مسلمانو! تمہارے لیے نظام قصاص یعنی قتل کے بدلے قتل اور زخم کے بدلے زخم میں حیات ہے کہ جب ہر کسی کو ڈر ہو کہ اگر اس نے کسی کو قتل کیا یا زخم لگایا تو بدلے میں اسے قتل ہونا یا زخم سہنا پڑے گا تو وہ کبھی اس اقدام پر تیار نہ ہوگا اور اگر قاتل کو قتل کر دیا جائے تو اس کے خاندان کے باقی افراد کی جان بچ جائے گی۔ اور اگر وہ قاتل کا ساتھ دیں گے اور اسے بچانے کی کوشش کریں گے تو مقتول کے ورثاء ان سب کو قاتل تصور کر کے ان میں سے ہر کسی کو قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور جو انکے ہتھے چڑھا اسے مار ڈالیں گے۔

عرب میں مہل بن ربیعہ نے اپنے بھائی کے خون کی قیمت پوری کرنے کے لیے بنی بکر بن وائل کے اتنے آدمی مارے کہ قریب تھا کہ قبیلہ دنیا سے مٹ جائے۔ اگر حکومت اسلامیہ قصاص کا قانون نافذ نہ کرے تو ایک قتل ہی سے قتل کا بازار گرم ہو سکتا ہے۔ یاد رہے قصاص یہ ہے کہ جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، ناک کا بدلہ ناک، کان کا بدلہ کان، دانت کا بدلہ دانت اور زخم کے بدلے زخم۔ (مائدہ: ۴۵)

قرآن کی بے مثال فصاحت

[181] ولکم فی القصاص حیاۃ ایسا فصیح جملہ ہے کہ اسے سن کر فصحاء عرب سکتے میں آ گئے۔ ان کے ہاں ایک جملہ مشہور تھا: القتل انفی للقتل۔ قتل کو قتل ہی مٹاتا ہے، اہل عرب کو اپنی اس ضرب المثل پہ ناز تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے مختصر اور پر از حکمت کوئی جملہ نہیں ہو سکتا مگر جب انہوں نے قرآن کا یہ جملہ سنا تو ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

کیونکہ مذکورہ عربی محاورہ میں یہ تین قباحتیں ہیں۔ اول: اس میں لفظی تکرار ہے، لفظ قتل دوبار آیا ہے، دوم: اس میں خوف و دہشت کا بیان، سوم: اس میں صرف قتل کا ذکر ہے باقی جراحات کا ذکر نہیں۔ جبکہ ولکم فی القصاص حیاۃ میں کوئی لفظی تکرار نہیں۔ اس میں دہشت کا ذکر نہیں بلکہ حیات کا پیغام ہے اور اس میں صرف قتل کا ذکر نہیں بلکہ مطلقاً ہر زخم اور قتل سب کے بدلہ کا ذکر ہے کیونکہ قصاص میں جان کا بدلہ جان اور زخم کا بدلہ زخم سب آ جاتا ہے۔ اسی لیے امام احمد رضا فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ ؎

تیرے آگے یوں ہیں دبے لچے فصحا عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زباں نہیں نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚۖ الْوَصِيَّةُ

تم پر لازم کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آئے اگر وہ مال چھوڑے تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۠ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ

بھلائی کے ساتھ وصیت کرے یہ پرہیزگاروں پہ لازم ہے۔ [182] تو جس نے وصیت

بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ

بدل دی بعد ازاں کہ اسے سن لیا تو اس کا گناہ ان پر ہے جو اسے بدلیں بے شک اللہ سننے والا

عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ

جاننے والا ہے۔[183] تو جسے وصیت کرنے والے کی طرف سے ظلم یا گناہ کا خوف ہو چنانچہ وہ ان کے مابین صلح کروادے تو اس پر

عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲ ۶

کوئی گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[184]

[182] میراث کے احکام اترنے سے قبل اس آیت کے ذریعے یہ حکم دیا گیا کہ جب کسی کو موت کے آثار نظر آنے لگیں۔ مثلاً ڈاکٹرز اس کو جواب دیدیں یا عمر ستر اسی برس ہو جائے اور ضعف بہت ہو جائے تو ایسے میں اگر اس کے پاس خیر یعنی حلال مال ہو تو اسے لازم ہے کہ والدین اور دوسرے قریبی عزیزوں کے لیے وصیت کرے یعنی کہہ دے کہ میرے مال میں سے والدین کو اتنا میرے بیوی بچوں کو اتنا اور دوسرے عزیزوں کو اتنا دیدیا جائے۔ دورِ جاہلیت میں لوگ اپنے قریب ترین عزیزوں کو بھوکا چھوڑ کر دور کے رشتہ داروں یا دوسرے لوگوں کے لیے لمبی وصیتیں کر جاتے تھے اس کے سدباب کے لیے یہ آیت اتاری گئی۔ اس آیت پر کچھ عرصہ عمل ہوا اس کے بعد میراث کی آیات (سورہ نساء دوسرا رکوع) کا نزول ہوا اور والدین یا قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت ممنوع کر دی گئی کیونکہ اللہ نے میراث میں ان کے حصے خود مقرر فرما دیے، اب ان کے لیے کسی وصیت کی ضرورت نہ رہی۔ اور نبی اکرم ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں واضح اعلان فرمایا کہ اللہ نے ہر حقدار کو حق دیدیا ہے۔ فلا وصیة لوارث لہٰذا کسی وارث کے لیے وصیت نہیں کی جاسکتی۔
(مسند احمد عن امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ)

اسلام میں نسخ ثابت ہے اس کا منکر جاہل ہے:

اس آیت میں والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت کا حکم کیا گیا۔ اب یہ حکم منسوخ ہے کیونکہ بعد میں اللہ

تعالٰی نے احکام میراث کے لیے سورۃ نساء کا پورا دوسرا رکوع اتار دیا جس نے یہ آیت منسوخ کردی اور حدیث نے اس کی تشریح کردی۔ اس کے باوجود آج قادیانی اور پرویزی فرقوں کی رٹ ہے کہ قرآن میں کوئی نسخ نہیں۔ یہ جہالت و گمراہی نہیں تو کیا ہے۔ کیا آج کوئی مرزائی یا پرویزی یہ فتویٰ دے سکتا ہے کہ والدین یا قریبی عزیزوں کے لیے وصیت جائز ہے بلکہ فرض ہے؟ اگر کسی میں جرأت ہے تو ایسا کر کے دکھائے۔

والدین کا حق سب اقرباء سے مقدم ہے:

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ میں والدین کو سب رشتہ داروں پر مقدم کیا گیا۔ دوسری جگہ فرمایا گیا: قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (بقرہ:۲۱۵) لہٰذا اگر والدین حاجت مند ہوں تو سب سے قبل انسان پہ شرعی واجب ہے کہ ان کے اخراجات برداشت کرے، اس کے بعد کسی دوسرے حاجتمند کو کچھ دے۔

[183] یعنی جب وصیت کرنے والا وصیت کر کے مرجائے اور بعد میں اس کے گھر والے اس کی وصیت میں تبدیلی کردیں یعنی جس کے لیے کم مال کی وصیت تھی اسے زیادہ اور جس کے لیے زیادہ تھی اسے کم دیں تو وصیت کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں اس کا گناہ اس کی وصیت بدلنے والوں پر ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یزید کے کرتوتوں سے بری ہیں:

اس جگہ یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بوقت وصال یزید کو وصیت کی کہ امام حسین رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم سے حسن سلوک کرنا کیونکہ ان کا نسب بہت بلند ہے۔ (تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ۲۶۰، البدایہ جلد ۸ صفحہ ۱۱۶) مگر یزید نے بعد میں ان کی وصیت پس پشت ڈال کر آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بازار ظلم گرم کیا تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس کے مظالم سے بری ہیں۔ ان کا ذمہ دار یزید ہی ہے اور اگر امام عالی مقام امام حسین رضی اللہ عنہ کا وصال امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں ہوتا تو ہرگز واقعہ کربلا رونما نہ ہوا ہوتا۔ رہی یزید کی ولی عہدی تو وہ ایک مجبوری تھی۔ اس کے بغیر حکومت اسلامیہ کی وحدت ممکن نہ تھی کیونکہ دوسری صورت میں تمام اہل شام بغاوت کردیتے اور دور امارت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں یزید کی کوئی بدکرداری نمایاں نہ تھی۔

[184] مرنے والا جس شخص کو وصیت جاری کرنے کا ذمہ دار بنائے اسے وصی کہتے ہیں اور وصیت کرنے والے کو موصی، تو معنی یہ ہے کہ اگر وصی محسوس کرے کہ وصیت کرنے والا انصاف سے کام نہیں لے رہا مثلاً جو زیادہ کا حقدار ہے اسے کم دے رہا ہے کیونکہ اس سے اس کا دل ٹھنڈا نہیں۔ تو وہ ان دونوں میں صلح کرادے تاکہ اس کے لیے اس کے حق کے مطابق وصیت جاری ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ آج بھی کئی لوگ اپنا سارا مال کسی مسجد یا ادارہ کو دے کر اپنے ورثاء کو

محروم چھوڑ جاتے ہیں یہ ظلم ہے۔تو وصی کو چاہیے کہ موصی کو اس ظلم سے روکے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی ساٹھ برس اطاعتِ خدا میں گزارتا ہے پھر مرتے ہوئے وصیت میں ناانصافی کر کے جہنم کو خود پر واجب کر لیتا ہے۔'' (ابوداؤد)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾
فرض کئے گئے تا کہ تم پرہیز گار بنو۔[185]

روزۂ رمضان کی فرضیت اور اس کے چند احکام

[185] اس سے قبل قصاص و وصیت کے احکام مذکور ہوئے جن میں اسلامی معاشرے کی دنیوی سلامتی ہے۔اب روزۂ رمضان کی فرضیت بیان ہو رہی ہے جس میں ہماری اخروی فلاح مضمر ہے تو فرمایا گیا کہ اے مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پہ بھی فرض کیے گئے تھے، آخر میں لعلکم تتقون کہہ کر روزہ کا فلسفہ بتایا گیا۔

روزہ کا فلسفہ اور اس کے روحانی وجسمانی فوائد:

یاد رہے روزہ کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں تقویٰ اور خوفِ خدا پیدا ہو، کیونکہ یہ خوفِ خدا ہی ہے جو روزہ دار کو بھوک پیاس کے باوجود تنہائی میں کھانے پینے نہیں دیتا، کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

دوم: روزہ نفس پر کنٹرول سکھاتا ہے کہ نفس کہتا ہے کھاؤ پیو، عیش کرو، اور ہر شیطانی خواہش کو پورا کرو مگر روزہ ایمان کو اتنا مضبوط کر دیتا ہے کہ نفس کی ایک نہیں چلتی اور نفس پہ کنٹرول ہی تقویٰ کی بنیاد ہے، نفس کتے کی طرح ہے، اس کو اگر قابو میں نہ رکھا جائے تو یہ انسان پہ قابو پا لیتا ہے اب جو شخص کتے کے کنٹرول میں ہو اس کی کیا بری حالت ہے۔

سوم: روزہ بتاتا ہے کہ کھانا پینا تو عارضی طور پر حرام ہے جبکہ جھوٹ، فریب، غیبت اور بے حیائی وغیرہ مستقل حرام ہے۔جب ہم روزہ میں عارضی حرام سے بچتے ہیں کہ کہیں اللہ ناراض نہ ہو جائے تو مستقل حرام سے کیوں نہ بچا جائے، یہی روزہ کا درس اور اس کی تربیت ہے۔

چہارم: اُس کے علاوہ روزہ امیروں کو غرباء کی بھوک پیاس کا احساس دلاتا ہے، اگر روزہ نہ ہو تو امیر لوگوں کو بھوکے فقیروں کی بھوک کا کیسے احساس ہو؟

پنجم: روزہ یہ احساس بھی دلاتا ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں اللہ کی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ روزے کی پیاس سے احساس ہوتا ہے کہ پانی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے، روزے کی بھوک بتاتی ہے کہ کھانا اللہ کی کیسی نعمت ہے لہٰذا ان نعمتوں کی بے قدری نہ کی جائے انہیں ضائع نہ کیا جائے، اور کھانے پینے کے بعد اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور یہ سب باتیں تقویٰ ہی کے تقاضے ہیں۔

ششم: روزہ جسم کو کمزور اور روح کو طاقتور کرتا ہے۔ زیادہ کھانا جسم کو فربہ اور روح کو کمزور کر دیتا ہے مگر اللہ کو یہ پسند ہے کہ جسم کی بجائے ہماری روح قوی ہو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم روزہ رکھیں، روزے میں انسان کی طبیعت عبادت کی طرف زیادہ مائل ہو جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ روح طاقتور ہوتی ہے۔

ہفتم: روزہ جسمانی صحت کے لیے بھی مفید تر ہے۔ دیکھو معدہ ایک مشین کی طرح ہے اور ہر مشین کے لیے ضروری ہے کہ اسے وقفہ دیا جائے تا کہ وہ زیادہ دیر تک چل سکے، معدہ کی مشین کو وقفہ دینے کا طریقہ روزہ رکھنا ہے۔ ہمیں روزۂ رمضان کے علاوہ بھی روزے رکھنے چاہئیں۔

روزہ کب اور کیسے فرض ہوا اور اس کے چند احکام:

روزۂ رمضان سن ۲ ہجری میں فرض ہوا ابتداء میں یہ تھا کہ افطاری کے بعد آدمی کی جب آنکھ نہ لگی ہو وہ کھا پی سکتا ہے، جیسے ہی وہ سو گیا تو روزہ شروع ہو گیا بعد میں رات کو طلوعِ فجر تک مطلقاً کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات کی اجازت دیدی گئی۔ جیسا کہ آگے سورہ بقرہ آیت ۱۸۷ میں آ رہا ہے۔ روزۂ رمضان ہر مسلم، عاقل و بالغ پر فرض ہے اور اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے۔

روزہ اس چیز کا نام ہے کہ طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک عبادت کی نیت سے کھانے پینے اور جماع (میاں بیوی والا جسمانی تعلق قائم) کرنے سے رکا جائے، اس دوران اگر کسی نے بھول کر کھا پی لیا تو اس سے روزے میں کچھ فرق نہیں آتا اور جس نے جان بوجھ کر کھایا پیا یا ازدواجی تعلق قائم کیا تو اُس کا روزہ ٹوٹ گیا اُس پہ لازم ہے کہ اس کے بدلے ایک روزہ بھی بطور قضاء رکھے، اور کفارہ بھی دے۔ کفارہ یہ ہے کہ مسلسل ساٹھ روزے رکھے۔ جن میں رمضان اور عید اور تشریق (گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحجہ) کے ایام نہ آئیں اگر ایک روزہ بھی چھوڑ دیا یا درمیان میں یہ دن آ گئے تو پھر ابتداء سے مسلسل ساٹھ روزے رکھے۔

اگر روزہ رکھا ہو اور ایسی شدید بھوک لگے کہ اگر نہ کھائے تو جان پہ بن سکتی ہے یعنی جان جا سکتی ہے۔ جیسا کہ شوگر کے مریضوں کا حال ہے تو وہ روزہ توڑ دے اور اس کے بدلے بعد میں ایک روزہ رکھ لے، اس پہ کفارہ لازم نہیں۔

اگر کوئی بہت بوڑھا ہے کہ روزہ نہیں رکھ سکتا اور اس کے صحت مند ہونے کا امکان نہیں یا اگر کسی کو ایسی مستقل بیماری لگ جائے کہ روزہ نہیں رکھ سکتا جیسا کہ شوگر کے کئی مریض ایسے ہوتے ہیں تو وہ ہر روزہ کے عوض ایک مسکین کو دو وقت کا

کھانا دیدے یا ایک صدقہ فطرانہ کی رقم ادا کردے، اگر کسی نے غلطی سے طلوع فجر کے بعد کھایا پیا یا غروب آفتاب سے قبل افطار کرلیا تو اسے اس کے بدلے ایک روزہ رکھنا ہوگا۔

تحقیق یہ ہے کہ انجکشن لگوانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

انجکشن خواہ گوشت میں لگوایا جائے یا کسی رگ میں بہر حال اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، کیونکہ اس بارہ میں ضابطہ کلیہ یہ ہے کہ جماع اور اس کے ملحقات روزہ توڑتے ہیں۔ اسکے علاوہ روزہ توڑنے والی کوئی چیز صرف وہی ہوسکتی ہے جو بطور دواء یا غذاء کسی قدرتی ذریعہ سے معدہ میں قصداً ڈالی جائے۔

ردالمحتار میں ہے:

الذی ذکرہ المحققون ان معنی المفطر وصول ما فیہ صلاح البدن الی الجوف اعم من ان یکون غذاء اودواء، محققین نے یہی ذکر کیا ہے کہ روزہ توڑنے والی چیز یہ ہے کہ معدہ میں ایسی چیز پہنچے جو بدن کے لیے مفید ہو خواہ وہ غذاء ہو یا دواء۔ (ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ کتاب الصوم)

اور ظاہر ہے کہ انجکشن سے کوئی چیز معدہ میں نہیں جاتی، بلکہ جسم ہی میں پھیل جاتی ہے لہٰذا اس سے روزہ کے ٹوٹنے کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ جسم میں کوئی ایسی رگ نہیں ہے جو معدہ میں جا کر کھلتی ہو۔

اور یہ بھی یاد رہے کہ اس میں اس بات کا بھی لحاظ ہے کہ جسم کے مسامات اور عروق (رگوں) کے ذریعہ جسم میں کسی چیز کا داخل ہونا روزہ کو نہیں توڑتا۔

چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لو اقطر شیئا من الدواء فی عینہ لا یفسد صومہ عندنا وان وجد طعمہ فی حلقہ واذا بزق فرأی اثر الکحل ولونہ فی بزاقہ فعامۃ المشائخ علی انہ لایفسد صومہ کذا فی الذخیرۃ وھو الاصح ھکذا فی التبیین،

اگر کسی نے اپنی آنکھ میں دوائی ڈالی تو ہمارے نزدیک اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا، خواہ وہ دواء کا اثر اپنے حلق میں محسوس کرے۔ اسی طرح اگر اس نے تھوکا اور تھوک میں سرمہ کا اثر اور رنگ دیکھا تو عام مشائخ یہی کہتے ہیں کہ اس کا روزہ نہیں ٹوٹا۔ ایسے ہی ذخیرہ میں لکھا ہے اور یہی صحیح تر ہے، ایسے ہی تبیین میں مرقوم ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ ۱۹۰ مطبوعہ مصر)

اسی طرح مراقی الفلاح میں امام شرنبلالی کا ارشاد ہے:

او اکتحل ولو وجد طعمہ فی حلقہ او لونہ فی بزاقہ او نخامتہ فی الاصح وھو قول الاکثر، ولو وضع فی عینہ لبنا او دواء مع الدھن فوجد طعمہ فی حلقہ لا یفسد صومہ اذ لا عبرۃ بما یکون

من المسام۔

یا اس نے سرمہ لگایا خواہ اس کا ذائقہ اس نے اپنے گلے میں محسوس کیا یا اس کا رنگ اپنی تھوک یا بلغم میں دیکھا تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹا یہی صحیح تر قول ہے اور اگر اس نے اپنی آنکھ میں دودھ یا تیل کے ساتھ دوائی ملا کر ڈالی تو اس کا ذائقہ اپنے گلے میں پایا تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا کیونکہ اس بارہ میں قانون یہ ہے کہ مسام کے ذریعہ کسی چیز کے جسم میں داخل ہونے کا کوئی اعتبار نہیں۔ (مراقی الفلاح شرح نور الایضاح کتاب الصوم باب مالایفسد الصوم صفحہ ۳۶۱)

معلوم ہوا کہ مسامات کے ذریعہ اگر کوئی چیز حلق میں چلی جائے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا اور انجکشن میں تو ایسا بھی نہیں ہوتا کہ کوئی چیز حلق میں محسوس ہو تو اس سے روزہ کے ٹوٹنے کا کیا تعلق۔ اسکی مثال تو ایسے ہے کہ روزہ دار غسل کرتا ہے تو پانی کی ایک معقول مقدار اس کے سارے جسم کے مسامات کے ذریعہ اس کے بدن میں داخل ہوتی ہے حتی کہ اس کی پیاس کی شدت جاتی رہتی ہے اور اس کو اپنے جگر میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ ہرگز نہیں، تو یہی حال انجکشن کا ہے کہ اس سے بھی مسامات میں دواء داخل ہوتی اور خون میں اثر کرتی ہے۔

انجکشن سے روزہ ٹوٹنے کے دلائل کا جواب:

دور حاضر کے معروف محقق مفسر قرآن شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ نے اپنی تفسیر میں اس جگہ جو بحث فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انجکشن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں دواء کو براہ راست خون میں داخل کرنے کا کوئی طریق نہ تھا، سوا اس کے کہ دواء معدہ میں جائے اور وہاں سے خون میں داخل ہو۔ آج انجکشن کے ذریعہ دواء کو براہ راست خون میں داخل کر دیا جاتا ہے تو جیسے معدہ میں دواء ڈالنے سے روزہ ٹوٹتا ہے یونہی ٹیکے کے ذریعہ خون میں دواء انجیکٹ کرنے سے بھی روزہ ٹوٹنا چاہیے۔ ملخصاً (تبیان القرآن جلد اول صفحہ ۷۰۲)

مگر ہم بصد ادب واحترام عرض کرتے ہیں کہ سعیدی صاحب قبلہ کی یہ بات درست نہیں ہے۔ پہلے زمانہ میں بھی معدہ کے بغیر براہ راست خون میں دواء پہنچائی جاتی تھی یعنی جو دوائیں جسم کے اوپر ملی جاتی ہیں وہ براہ راست خون میں چلی جاتی ہیں، ان میں معدہ کا راستہ نہیں اختیار کیا جاتا اور وہ جلد پر اثر کرتی ہیں۔ پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ پچھنے لگوائے جاتے تھے یعنی جن سے کبھی خون نکالا جاتا تھا اور کبھی دواء جسم میں داخل کی جاتی تھی۔ دواء کے داخل کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ جسم کے کسی حصہ پہ نشتر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ٹک لگائے جاتے تھے پھر ان پہ دواء مل دی جاتی تھی اور وہ دواء خون کے ذریعہ فوراً جسم میں سرایت کر جاتی تھی۔ تو اب سوال یہ ہے کہ کیا جسم پہ ملی جانے والی دواؤں سے بھی روزہ کے ٹوٹنے کا حکم کیا جائے گا؟ اگر نہیں تو پھر صرف انجکشن ہی سے روزہ کا ٹوٹ جانا کیوں مان لیا گیا ہے؟

پچھنے لگوانے کو عربی میں حجامت کہتے ہیں اور فقہاء نے نص فرمائی ہے کہ حجامت سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے روزہ میں عمل حجامت کروایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ فرمایا: احتجم النبی ﷺ

وھو صائم، نبی اکرم ﷺ نے روزہ میں پچھنے لگوائے۔ (بخاری کتاب الطب حدیث ۵۶۹۴)

آج بھی اگر ایسا طریقۂ علاج اختیار کیا جائے کہ پہلے جسم پہ چھوٹے چھوٹے زخم لگائے جائیں پھر ان پہ دواء ملی جائے جو خون میں چلی جائے تو کون سا مفتی اس سے روزہ کے ٹوٹنے کا فتویٰ دے گا؟ کیا آج ایسا نہیں ہوتا کہ لوگوں کو گہرے زخم آجاتے ہیں، وہ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ ڈاکٹر زخم میں دواء ڈالتا ہے جو جسم میں چلی جاتی ہے اور خون میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کا اثر سارے جسم میں محسوس ہوتا ہے مگر کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ نہیں، اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وفی دواء الجائفة والآمة اکثر المشائخ علی ان العبرة للوصول الی الجوف والدماغ، لالکونه رطبا او یابسا،

جو دواء (زخم کے ذریعہ) معدہ یا دماغ میں پہنچ جائے تو عام مشائخ یہی کہتے ہیں کہ دیکھا جائے گا اگر دواء معدہ یا دماغ میں پہنچ گئی تو روزہ جاتا رہا، یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ دواء تر تھی یا خشک۔

(فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ ۲۰۴ کتاب الصوم باب فیما یفسد الصوم مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

معلوم ہوا کہ جو زخم پیٹ میں ہو اور سیدھا معدے تک چلا گیا ہو اگر اس میں دواء ڈالی جائے اور وہ سیدھی معدہ تک پہنچ جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے ورنہ نہیں، لہٰذا جو زخم بازو، ٹانگ، سینہ پشت وغیرہ میں ہو وہ خواہ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو اس میں دواء ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، تو انجکشن کے ذریعہ جسم میں دواء ڈالنے سے روزہ کیوں ٹوٹے گا؟

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب گلوکوز کا ڈرپ لگوایا جائے تو انسان کو وہ توانائی مل جاتی ہے جو کھانے پینے سے ملتی ہے تو یہ بھی معناً کھانا پینا ہی ہے اور فقہاء کے نزدیک روزہ توڑنے والی چیز بہر حال روزہ توڑتی ہے خواہ صورتاً پائی جائے یا معناً، جیسے بیوی سے جماع کرنا روزہ کو توڑتا ہے لیکن اگر کوئی شخص بیوی کے رانوں وغیرہ میں قضاء شہوت کرلے تو بھی اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ یہ جماع معنوی ہے۔ اسی طرح گلوکوز کا لگوانا بھی معناً کھانا پینا ہی ہے، اس سے بھی روزہ ٹوٹے گا۔

مگر یہ قیاس بھی درست نہیں ہے کیونکہ پھر تو غسل کرنے سے بھی روزہ ٹوٹنا چاہیے۔ اس لیے کہ چند بار غسل کرنے سے جسم میں مسامات کے ذریعہ اس قدر پانی داخل ہو جاتا ہے جس قدر گلوکوز کی ایک ڈرپ میں ہوتا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ نہانے سے جسم میں توانائی آتی ہے۔ ایک تھکا ماندہ انسان گھر پہنچ کر جب غسل کرتا ہے تو اس کی تھکاوٹ کافی حد تک دور ہو جاتی ہے، وجہ یہی ہے کہ نہانے سے اس کے جسم میں اس قدر پانی داخل ہوتا ہے جو پسینے کے ذریعہ خارج ہونے والے پانی کی کمی پوری کر دیتا ہے اور جسم کی توانائی بحال ہو جاتی ہے، تو کیا اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ومن اغتسل فی ماء حتی وجد بردہ فی باطنه لا یفطرہ هکذا فی النهر الفائق، جس نے پانی میں

غسل کیا حتی کہ اس کی ٹھنڈک اپنے باطن (جگر ومعدہ) میں پائی تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا ''النہر الفائق'' میں ایسا ہی لکھا ہے۔
(عالمگیری جلد اول صفحہ ۲۰۳)

رہا بیوی کے رانوں وغیرہ میں قضاء شہوت سے روزہ کا ٹوٹنا تو اس کے دو جوابات ہیں۔ اول: وہ جماع پہ قیاس کرنے اور اسے معنوی طور پر جماع قرار دینے سے ثابت نہیں ہوا بلکہ وہ الگ سے حدیث سے ثابت ہے چنانچہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تین چیزیں روزہ نہیں توڑتی ہیں، پچھنے لگوانا، قی کرنا اور احتلام۔''
(ترمذی کتاب الصوم باب ۲۴)

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خواب میں اگر ایسا عمل ہو جس سے مادہ منویہ نکلے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، گویا اگر جاگتے ہوئے کسی صورت میں مادہ نکلے تو روزہ بہر حال ٹوٹ جاتا ہے، خواہ بیوی کے رانوں میں ہو یا ہاتھ سے اخراج کیا جائے تو اس سے انجکشن سے روزہ کا ٹوٹنا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

دوم: یہ بات ہی غلط ہے کہ انجکشن لگوانا کھانے پینے کی جگہ لے لیتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ گلوکوز کی ڈرپ سے بھوک ختم ہوجاتی ہے اور پیاس مٹ جاتی ہے؟ ہاں کچھ کمزوری بحال ہوجاتی ہے، بس۔ اس سے زائد کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو معناً قضاء شہوت پہ قیاس کرنا غلط ہے، استمناء بالید اور بیوی کے رانوں میں قضاء شہوت سے باقاعدہ شہوت مکمل طور پر مٹ جاتی ہے مگر ڈرپ لگانے سے بھوک پیاس کا مٹنا محض ایک باطل خیال ہے، لہٰذا ان دونوں میں بُعدِ بعید ہے اور یہ قیاس مع الفارق ہے، کوئی اور قیاس پیش کرو۔ جب گلوکوز کی پوری ڈرپ سے بھوک پیاس نہیں جاتی تو دوسرے انجکشنوں کا کہنا ہی کیا ہے، ان کی وجہ سے روزہ کے ٹوٹنے کا حکم دینا بہت عجیب وغریب ہے۔

ہاں اگر براہ راست معدہ میں خوراک یا پانی کی نالی لگائی جائے جیسا کہ آجکل کیا جاتا ہے تو وہ بہر حال روزہ کو توڑے گی۔ جیسا کہ فقہاء نے جائفہ اور آمہ دوا کو ناقض روزہ قرار دیا ہے مگر بازو میں لگائی جانے والی ڈرپ کا نقضِ روزہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

روزے کے فضائل:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ کو کستوری سے محبوب تر ہے۔ ابن آدم کے عمل کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے مگر اللہ کہتا ہے روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی (بے حساب) جزا دیتا ہوں۔'' (بخاری، مسلم)

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جنت کا ایک دروازہ ہے جسے ''ریّان'' کہتے ہیں، اس میں صرف روزہ دار داخل ہونگے۔'' (بخاری کتاب الصوم باب ۱) یعنی روزہ سے محبت رکھنے والوں کے لیے اللہ نے جنت کا خصوصی دروازہ بنایا ہے اور اسے ''ریان'' اس لیے کہتے

ہیں کہ اس کا معنی ہے سیراب کرنے والا۔ چونکہ روزہ داروں نے خود کو رضاء الٰہی کے لیے پیاسا رکھا تو انہیں اس دروازے سے جنت میں داخل کیا جائے گا جہاں ان کے لیے سیرابی کا اہتمام ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''روزہ دار کیلیے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اسوقت جب وہ روزہ افطار کرتا ہے اور دوسری اسوقت جب وہ اللہ سے ملاقات کرے گا۔'' (بخاری کتاب الصوم باب ۹)

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''روزہ دار کی نیند مثل عبادت ہے اور اسکی خاموشی مثل تسبیح، اس کا عمل ثواب میں بڑھا ہوا ہے، اس کی دعا مقبول اور گناہ مغفور ہے۔'' (بیہقی) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے رضاء الٰہی کے لیے ایک روزہ رکھا وہ جہنم سے اتنا دور ہو جائے گا جیسے ایک کوا بچپن سے اڑنا شروع کرے اور اڑتے اڑتے بوڑھا ہو کر مر جائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے راہ خدا میں ایک روزہ رکھا اللہ اس کے اور جہنم کے درمیان زمین و آسمان کی وسعت کے برابر خندق بنا دیتا ہے۔'' (طبرانی صغیر)

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ

یہ گنتی کے چند ہی دن ہیں پھر جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی

اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ

پوری کرلے۔ [186] اور جو لوگ اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا بطور معاوضہ لازم ہے، پھر جو اپنی خوشی سے

خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

نیکی کرے تو وہ اس کیلئے بہتر ہے اور یہ کہ تم روزہ رکھو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ [187]

[186] یعنی یہ گنتی کے ۲۹ یا ۳۰ دن ہیں جو سال بعد آتے ہیں۔ لہٰذا خوشی خوشی روزے رکھو بلکہ اگر ان کے ساتھ شوال کے چھ روزے بھی شامل کر لیے جائیں تو اتنا ثواب ہے جیسے سارا سال روزے رکھے کیونکہ ۳۰ دن کا مہینہ ہے چھ مزید لگائے ۳۶ تو ہو گئے اور ہر نیکی کم از کم دس گنا ثواب رکھتی ہے اور ۳۶ کو ۱۰ سے ضرب دیں تو ۳۶۰ ہو گئے اور ایک سال میں ۳۶۰ ہی دن ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ شوال کے چھ روزے رکھتے تھے۔ ہمیں بھی اپنے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو اپنانا چاہیے۔ آگے فرمایا: فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ کہ اگر تم میں سے کوئی رمضان المبارک میں بیمار ہو کہ روزہ رکھنے سے اس کی بیماری بڑھ جائے گی اور جان کو خطرہ لاحق ہوگا یا جو شخص سفر میں ہو تو اسے

اختیار ہے کہ روزہ چھوڑ دے اور رمضان کے بعد اس کی جگہ دوسرے دنوں میں بطور قضا روزر کھ لے تا کہ گنتی پوری ہو جائے۔

[187] اس جملہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط میں مختلف تفسیریں ہیں۔ایک وہ ہے جو ابن عباس، ابن عمر، معاذ بن جبل اور سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کبار سے مروی ہے کہ یہ جملہ منسوخ ہے اور ابتداء میں جب روزے فرض کیے گئے تو اختیار دیا گیا کہ جو شخص روزے رکھ سکتا ہے وہ اگر چاہے تو روزے رکھ لے چاہے تو اس کے بدلے صدقہ دے دے اور صدقہ دینے کی صورت میں اس پر لازم ہے کہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے اس لیے فرمایا گیا۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط پھر جب یہ آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط اتری تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور بہر حال روزہ ہی رکھنا لازم ٹھہرا۔ بخاری و مسلم وغیرہ نے سلمہ بن اکوع سے، ابن ابی حاتم وغیرہ میں ابن عباس سے اور دیگر محدثین نے ابن عمر و معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم سے ایسے ہی روایت کیا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ يطيقونه يُطوّقونه کے معنی میں ہے، یعنی جس شخص پہ روزہ رکھنا بھاری اور دشوار ہو یعنی ایسے ہو جیسے اس کے گلے میں طوق ڈال دیا گیا ہے اور اس کے صحت مند ہونے کی امید نہ ہو جیسے بہت بوڑھا آدمی یا وہ جسے دائمی مرض لاحق ہو (جیسے تیز شوگر اور بلڈ پریشر وغیرہ) وہ ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دیدے۔ امام بغوی، امام خازن، امام قرطبی، امام ابن کثیر وغیرھم فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے یوں پڑھا: وعلی الذين يُطوّقونه فدية، یعنی انہوں نے يطيقونه کی تفسیر يطوّقونه سے کی، اس تفسیر پہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے لہٰذا پہلی تفسیر اگرچہ روایةً زیادہ قوی ہے مگر دوسری تفسیر درایةً زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں آیت کو منسوخ نہیں ماننا پڑتا اور ہم نے اسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔

آگے اللہ عزوجل نے فرمایا: فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ط وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ یعنی ایک روزے کے بدلے میں مسکین کا کھانا (ایک صدقہ فطرانہ) تو بہر حال لازم ہے اور جو اپنی خوشی سے نیکی کماتے ہوئے ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کے کھانے سے زیادہ راہ خدا میں دیدے تو اس کے لیے بہتر ہے۔ اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ رمضان کے روزے تو فرض ہیں اور جو اپنی خوشی سے مزید روزے رکھے تو اس کے لیے بہتر ہے۔ اسی طرح ہر فرض عبادت کے ساتھ نفل کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جیسے نفل نماز، حج وغیرہ۔ آگے تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ کا معنی یہ ہے کہ مریض و مسافر اگر ہمت کر کے مرض اور سفر کے باوجود رمضان میں روزے رکھ ہی لیں تو ان کے لیے بہتر ہے۔ بشرطیکہ ان کی صحت کو خطرہ نہ لاحق ہو یا یہ اس وقت کی بات ہے جب ابتداء میں روزہ رکھنے یا اس کی جگہ مسکین کا کھانا دینے میں سے کسی بھی ایک چیز کو لیا جا سکتا تھا۔ اس وقت کہا گیا کہ بہتر یہ ہے کہ روزہ رکھ ہی لیا جائے۔

شریعت میں نرمی ہے سختی نہیں:

مریض و مسافر کو رمضان کے بعد روزہ رکھنے کی اجازت دے کر بتایا گیا کہ اللہ بندے پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اس لیے اگلی آیت میں فرمایا جارہا ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ اللہ تمہارے

لیے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں۔ چنانچہ جو نماز میں کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے وہ بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر پڑھ لے۔ وضو نہ کر سکتا ہو تو تیمم کر لے یہ نہیں کہ روزہ یا نماز بالکل ہی چھوڑ دے۔

فرض کے ساتھ نفل کا اہتمام کرنا چاہیے:

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ط کہہ کر نفل روزے یا نفل صدقے کی رغبت دلائی گئی اور عقل بھی کہتی ہے کہ فرض تو اللہ کا قرض ہے وہ بہر حال ادا کرنا ہے، نہیں تو سزا ملے گی مزا تو یہ ہے کہ بندہ اپنی خوشی سے نفل ادا کرے۔ اسی لیے حدیث قدسی ہے کہ بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب آتا ہے حتیٰ کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں پھر میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے سنتا ہے آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے دیکھتا ہے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جن سے چلتا ہے۔ (بخاری کتاب الرقاق باب ۳۸)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ

ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو (سب) لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل میں

الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط وَمَنْ كَانَ

امتیاز کے واضح دلائل ہیں [188] تو تم میں سے جو یہ مہینہ پائے وہ اس کے روزے رکھے [189] اور جو مریض ہو

مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا

یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے تمہارے لئے

يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ز وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی کہو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

اور تاکہ تم شکر بجا لاؤ۔ [190]

فضیلت ماہ رمضان اور عظمت قرآن

[188] روزہ رمضان کی فرضیت بتانے کے بعد ماہ رمضان کی یہ فضیلت بتائی جا رہی ہے کہ اس ماہ مبارک میں قرآن

اتارا گیا یعنی اس میں وہ رات ہے جسے لیلۃ القدر کہتے ہیں اس میں سارا قرآن لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر بیت العزۃ میں اتارا گیا۔ پھر وہاں سے حضور ﷺ کے قلب مبارک پر ۲۳ برسوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا۔ بلکہ یہ بھی مروی ہے کہ غار حرا میں پہلی اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ① وحی بھی رمضان ہی میں نازل ہوئی۔ اور قرآن پاک تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے کہ انہیں دوزخ کے راستہ سے ہٹا کر جنت کی طرف لے چلتا ہے۔ یہ اس کی عمومی ہدایت ہے اور اس میں خصوصی رہنمائی اور حق و باطل میں امتیاز کی بینات و براہین بھی ہیں یہ اس کی خصوصی ہدایت ہے جو مفسرین و مجتہدین و عارفین کو ملتی ہے جو قرآن میں گہرا تدبر کر کے حکمت کے موتی چنتے ہیں۔

فضیلتِ ماہِ رمضان المبارک:

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ ۚ میں فضیلت ماہ رمضان بیان ہوئی اور کیوں نہ ہو یہ سب سے افضل ماہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''رمضان میں جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے اور دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔'' (بخاری کتاب الصوم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب بھی روزہ دار روزہ افطار کرتے ہیں تو اللہ بہت سارے جہنمیوں کو جہنم سے آزاد کرتا ہے اور یہ رمضان کی ہر رات میں ہوتا ہے۔'' (ابن ماجہ)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''رمضان میں عمرہ کرو کہ وہ حج کے برابر ہے۔'' (نسائی کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے فرمایا ''جس نے لیلۃ القدر میں ایمان و اخلاص کے ساتھ قیام کیا اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ جس نے ماہ رمضان کے روزے ایمان و اخلاص کے ساتھ رکھے اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔'' (بخاری کتاب الصوم) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نیکی کے معاملہ میں سب سے سخی تر تھے اور آپ کی سخاوت ماہ رمضان میں سال بھر سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ رمضان میں ہر رات جبریل امین علیہ السلام نبی اکرم ﷺ سے ملتے تھے تا آنکہ رمضان ختم ہو جاتا اور جب جبریل حضور ﷺ سے ملتے تو آپ نسیم بہار سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔'' (بخاری کتاب الصوم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''پانچ نمازیں اور جمعہ کے بعد جمعہ اور رمضان کے بعد رمضان یہ اپنے درمیان میں ہونے والے تمام گناہوں کا کفارہ ہیں جب تک آدمی کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔'' (مسلم کتاب الطہارۃ)

تحقیق یہ ہے کہ انہیلر (INHALER) سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے

دمہ کے مریض بار بار انہیلر استعمال کرتے ہیں، کیونکہ انہیں سانس میں دشواری ہوتی ہے جس سے وہ اپنے گلے کو بند

ہوتا محسوس کرتے ہیں تب وہ انہیلر کے ساتھ گلے میں ایک دوا اسپرے کرتے ہیں۔اس کے متعلق ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کا اکثر حصہ سانس کی نالی میں جاتا ہے اور سانس میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کو دور کرتا ہے اور اس کا کچھ حصہ خوراک کی نالی میں بھی جاتا ہے یعنی نالی کے ذریعے معدہ میں اترتا ہے تو وہ یقیناً روزہ کو توڑ دیتا ہے۔اس کے چند دلائل درج ذیل ہیں:

اول: یاد رکھنا چاہیے کہ انہیلر کی چھوٹی بوتل یا شیشی میں دوا پانی کی صورت میں موجود ہوتی ہے اور جو قریباً ایک گھونٹ یا دو گھونٹ کے برابر ہوتی ہے اور اس میں پانی باقاعدہ ہل رہا ہوتا ہے اس کی حرکت محسوس ہوتی ہے پھر جب اسے پریس کرتے ہیں تو وہ ہوا بن کر نکلتا ہے اور سفید شکل میں نظر آتا ہے۔یہ پانی ہی سوکھ کر ہوا بن جاتا ہے اور ہر ہوا جم کر پانی بن جاتی ہے۔تو کیا ہر ہوا گلے میں داخل ہو کر روزہ توڑتی ہے؟ نہیں کیونکہ ہوا کی کوئی قابل رؤیت شکل نہیں ہوتی لیکن اگر ہوا میں مٹی غبار ہو جو نظر آئے اور کوئی شخص اسے خود منہ سے کھینچ کر گلے میں اتارے تو فقہاء کے نزدیک اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کما ھو مصرح فی متونِ الفقہ۔

اس قاعدہ کے مطابق انہیلر ناقضِ صوم ہے۔کیونکہ اس کے سپرے سے نکلنے والی ہوا باقاعدہ نظر آتی ہے۔چنانچہ میں نے اس مقصد کے لیے خصوصی طور پر انہیلر منگوایا اور خود دائیں ہاتھ سے میں نے اپنے بائیں ہاتھ پر سپرے کیا تو سب نے دیکھا کہ میری ہتھیلی پر دانۂ گندم کے برابر سفید مواد جمع ہو گیا مگر وہ ساتھ ہی اڑ گیا۔معلوم ہوا کہ انہیلر کی ہوا مثل غبار ہے جس میں مٹی کے نہایت باریک ذرّے شامل ہوتے ہیں۔جیسے غبار نظر آتا ہے یوں ہی انہیلر کا سپرے نظر آتا ہے۔تنویر الابصار مع درمختار میں ہے۔

لو ادخل حلقہٗ الدخان افطر ایّ دخانٍ کان ولو عوداً او عنبراً۔

یعنی اگر کسی نے اپنے حلق میں خود غُبار داخل کیا تو اس کا روزہ ٹوٹ گیا۔خواہ وہ کسی قسم کا غبار ہو۔جیسے عود و عنبر کا غبار (یعنی اگربتی کا دھواں)۔(تنویر الابصار مع درمختار، جلد دوم، صفحہ ۴۲۰، کتاب الصوم، باب مایفسد الصوم مطبوعہ مصطفیٰ البابی مصر) یہ عبارت بطور مثال ہے۔ورنہ غبار کا منہ میں داخل کرنا مفسد صوم ہے یہ ہدایہ، عالمگیری، خانیہ، اور حاشیہ طحطاوی وغیرہم سب میں مذکور ہے۔

دوم: انہیلر کا سپرے غبار کے نگلنے سے زیادہ خطرناک ہے۔کیونکہ غبار کا نگلنا اپنی ذات میں نہ غذا ہے نہ دوا، بلکہ داء ہے جبکہ انہیلر کا سپرے مستقل دوا ہے اور فقہاء کے نزدیک جو چیز کھائی پی جائے خواہ بطور غذاء یا دواء وہ ناقضِ وضوء ہے بلکہ اس میں کفارہ بھی لازم ہے۔چنانچہ کنز الدقائق میں ہے:

من اکل او شرب غِذاءً او دواءً عمداً قضیٰ و کفَّر۔

جس نے روزہ میں کچھ کھایا یا پیا چاہے بطور غذا یا دوا وہ روزے کی قضاء بھی دے اور اس کا کفارہ بھی۔

(کنز الدقائق، کتاب الصوم، باب مایفسد الصوم صفحہ ۸۳، مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

امام ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ان معنیٰ المفطر وصول ما فیہ صلاح البدن الی الجوف اعم من ان یکون غذاءً او دواءً۔ ''روزہ کے توڑنے کا معنیٰ یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز جس میں بدن کی بہتری مقصود ہے، جوف میں جائے خواہ بطور غذاء یا دوا۔'' (ردالمحتار جلد ۲، صفحہ ۱۰۸، کتاب الصوم)

جب انہیلر کا سپرے بطور دواء ہوتا ہے اور اس میں دواء کی ایک مقدار قصداً گلے میں ڈالی جاتی ہے جو خوراک کی نالی کے ذریعے جوف میں جاتی ہے تو یقیناً یہ مفسد صلوٰۃ ہے۔ خواہ وہ قلیل مقدار میں ہے۔

سوم: فقہاء کے ہاں یہ بھی ضابطہ ہے کہ اگر سحری کھاتے ہوئے دانتوں میں چنے کے دانے سے کم تر کوئی چیز پھنس گئی اور روزے دار اسے روزے کی حالت میں نگل گیا تو روزہ نہیں ٹوٹا لیکن اگر اسے منہ سے باہر نکال کر واپس منہ میں ڈالا تو روزہ ٹوٹ جائے گا خواہ وہ تل کے برابر ہو۔ تفصیلی عبارات کے لیے دیکھئے ہدایہ کتاب الصوم، باب ما یفسد الصوم۔ فتاویٰ عالمگیری جلد اول صفحہ ۲۰۲۔ فتاویٰ قاضی خان جلد اول صفحہ ۲۰۹، وغیرہ۔ مثلاً عالمگیری میں ہے:

اذا ابتلع سمسمة بين اسنسانه لا يفسد صومهٗ لانهٗ قليل و ان ابتلع من الخارج يفسد۔

اگر روزہ دار نے تل برابر کوئی چیز جو دانتوں میں پھنسی ہو کھالی تو روزہ نہیں ٹوٹا اور اگر اسے باہر سے منہ میں ڈالا تو روزہ ٹوٹ گیا۔ (عالمگیری جلد اول صفحہ ۲۰۲، کتاب الصوم، الباب الرابع ما یفسد الصوم، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

اور سب سے پہلے بتا چکا ہوں کہ انہیلر کے صرف ایک بار سپرے کرنے سے نکلنے والا مادہ گندم کے دانہ کے برابر ہوتا ہے گویا تل سے کئی گنا بڑا، اور دمہ کے مریض کو سانس کی تکلیف میں بسا اوقات صرف ایک بار انہیلر کے پریس کرنے سے افاقہ نہیں ہوتا اسے لگاتار تین چار بار یا اس سے زائد پریس کرنا پڑتا ہے۔ فانی هٰذا من ذٰلك۔

روزہ میں انہیلر کے جواز کے بعض قائلین کہتے ہیں کہ اگر اسے پانچ سو بار پریس کیا جائے تو پھر وہ ایک تل کے برابر ہوسکتا ہے۔ لاحول و لا قوۃ الا باللہ۔ شائد وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا چیز ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وضوء میں کلی کرتے ہوئے منہ میں پانی کی جو تری رہ جاتی ہے وہ انہیلر کے ایک پف سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، مگر وہ روزہ نہیں توڑتی کیونکہ وضوء شرعی عذر ہے۔ جبکہ دمہ جیسا مرض بدنی عذر ہے۔ جب کلی جائز ہے تو انہیلر کا استعمال کیوں حرام ہے؟ ہم کہتے ہیں یہ بات سراسر غلط ہے کہ کلی کا کچھ پانی منہ میں رہ جاتا ہے۔ نہیں۔ بلکہ جب کلی کر کے پانی باہر پھینکا جاتا ہے تو نہ صرف سارا پانی نکل جاتا ہے بلکہ ساتھ میں تھوک کی ایک مقدار بھی نکل جاتی ہے۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے منہ میں ٹھنڈک رہ جاتی ہے اور ٹھنڈک تو ناقضِ صوم نہیں جیسے نہانے سے سارا جسم ٹھنڈا کر لیا جاتا ہے مگر روزے میں فرق نہیں آتا اور فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ اگر کلی کا پانی بالفرض منہ میں رہ گیا اور گلے میں اترا تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

انظر فی الخانية و الشامية و العالمكيرية و غيرها۔ یہ عذر بھی کیا جاتا ہے کہ انہیلر کا سپرے اکثر و بیشتر سانس کی نالی میں جاتا ہے البتہ اس کی بہت قلیل مقدار خوراک کی نالی میں جاتی ہے تو اسے مُفسدِ صوم نہیں ہونا چاہیے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ پھر حقہ نوشی اور سگریٹ نوشی سے بھی روزہ برقرار رہنا چاہیے ان کا دھواں بھی سانس کی نالی ہی میں جاتا ہے حالانکہ اس سے نہ صرف روزہ ٹوٹتا ہے بلکہ بعض فقہاء نے اس میں کفارہ بھی لازم کیا ہے کیونکہ یہ عادی لوگوں کے لیے مثل غذاء ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دمہ کے مریضوں کو جبراً روزہ کے ثواب سے محروم رکھنا کہاں کا انصاف ہے؟ ہم عرض کرتے ہیں کہ جب مریض کو اللہ نے فدیہ کی اجازت دی ہے تو اسے جبراً روزہ داروں میں ڈالنا کہاں کا انصاف ہے؟ اگر مقصود ثواب ہے تو وہ اتباع شرع میں ملتا ہے۔ فدیہ دینے والے مجبور شخص کا ثواب بھی مثل صائم ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ایک بار میدان جنگ میں مجاہدین سے فرمایا کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں ہیں، مگر وہ تمہاری ہر جہادی کاروائی

میں تمہارے ساتھ شریک ہیں حبسهم العُذرُ انہیں مجبوری نے روک رکھا ہے۔ (بخاری، کتاب الجہاد باب ۳۵)
بلکہ بسا اوقات مجبور شخص صحت مند سے دوگنا ثواب پالیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں اٹکتا ہے (مشکل سے پڑھتا ہے) اس کے لیے دوہرا اجر ہے۔ (صحیح مسلم، کتاب صلوٰۃ المسافرین، حدیث ۲۴۴)

عظمت قرآن:

اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ میں رمضان کی عظمتِ نزول قرآن کے حوالے سے ظاہر کی گئی گویا قرآن سے نسبت وجہ عظمت ہے اور کیوں نہ ہو جس ماہ میں قرآن اترا وہ ہر ماہ سے افضل، جس رات میں اترا وہ ہر رات سے افضل، جس امت کے لیے اترا وہ ہر امت سے افضل، جس رسول پر اترا وہ ہر رسول سے افضل۔ تو مانیے کہ جس انسان کے دل میں قرآن ہو وہ دوسرے انسانوں سے افضل۔ اسی لیے حدیث نبوی ﷺ ہے "تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔"
اس جگہ رمضان شریف کی عظمت اس حوالہ سے بتائی گئی کہ اس میں قرآن اتارا گیا ہے تو اس میں یہ اشارہ ہے کہ مومن کو اس ماہ مبارک میں کثرت سے قرآن مجید پڑھنا چاہیے کیونکہ اس ماہ کو قرآن مجید سے خصوصی تعلق ہے۔ اسی لیے اس ماہ میں نماز تراویح جاری کی گئی ہے جس میں تمام قرآن کریم کا پڑھا جانا خلفاء راشدین کی سنت ہے۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ "تم پر میری سنت اور میرے خلفاء کی سنت جو ہدایت یافتہ اور ہادی ہیں، لازم ہے۔" (ابن ماجہ کتاب السنۃ باب ۶)
اور ہر مسلمان کو جو قرآن پڑھ سکتا ہے چاہیے کہ رمضان میں اگر ہو سکے تو کم از کم ایک بار قرآن کریم ضرور ختم کرے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رمضان اور قرآن روز قیامت بندے کے لیے اللہ کے ہاں جھگڑا کریں گے۔ رمضان کہے گا یا اللہ میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور اس کی شہوات سے روکے رکھا لہٰذا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما اور قرآن کہے گا یا اللہ میں نے اسے رات میں سونے سے روکے رکھا (مثلاً تراویح میں مشغول رکھا) تو اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما تو اللہ رب العزت دونوں کی شفاعت کو قبول فرمائے گا (یعنی اس بندے کو بخش دے گا) (مشکوٰۃ المصابیح باب الصوم فصل سوم بروایت بیہقی فی شعب الایمان)

نبوتِ محمدیہ عالمگیر نبوت ہے، اور ختم نبوت:

هُدًى لِّلنَّاسِ کہہ کر قرآن کو سب انسانوں کے لیے ہدایت بتایا گیا۔ لہٰذا قرآن والا رسول تمام نسل انسانیت کا رسول ہے۔ اس لیے فرمایا گیا یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (سورہ اعراف: ۱۵۸) معلوم ہوا کہ رسول پاک ﷺ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔

رؤیتِ ہلال کا اسلامی نظام

[189] فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ جو شخص ماہ رمضان پائے اس پہ لازم ہے کہ اس ماہ کے روزے رکھے۔ اب کوئی شخص ماہ رمضان کو کیسے پائے؟۔
تو امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اجمع المسلمون علی ان رؤیة الهلال هو شهود الشهر اس پر

تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ چاند کا دیکھنا ہی اس ماہ کا پانا ہے۔(احکام القرآن للجصاص جلد اول صفحہ ۲۴۹)

قاضی ابوبکر ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ رویتِ ہلال پر محمول ہے۔
(احکام القرآن لابن عربی جلد اول صفحہ ۱۱۸)

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ کا معنی ہے ومن وجد استهلال الشهر یعنی جو شخص اس ماہ کے چاند کا دیکھنا پالے وہ اسکے روزے رکھے۔(تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۲۲۲) اس کے علاوہ تمام اجلہ مفسرین اسی مفہوم پر متفق ہیں۔اور اس پر کثیر احادیث وارد ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''چاند دیکھ کر روزہ رکھو چاند دیکھ کر عید کرو اگر تم پر بادل چھا جائیں تو تیس کی گنتی پوری کرلو۔''
(بخاری کتاب الصوم، مسلم کتاب الصوم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''رمضان سے پہلے روزے نہ شروع کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو یا گنتی پوری نہ کرلو۔اس کے بعد روزہ رکھو تا آنکہ چاند دیکھ لو یا گنتی پوری کرلو۔تب روزہ چھوڑو۔''(نسائی جلد اول صفحہ ۳۰۱، ابوداؤد جلد اول صفحہ ۳۲۵)

ان احادیث سے بھی خوب واضح ہو گیا کہ فمن شهد منكم الشهر میں رمضان کو پالینے کا معنیٰ چاند کا دیکھ لینا ہے۔ یادرہے! ہر شخص پر چاند دیکھنا لازم نہیں نہ ہی یہ ممکن ہے۔ بلکہ اس کی چند صورتیں ہیں۔اول: کوئی شخص خود رمضان کا چاند دیکھ لے۔دوم: اسے چاند کے دیکھے جانے کی شرعی شہادت مل جائے۔سوم: ملک کا قاضی یا مفتی (جیسے حکومت کا مقرر کردہ عالم دین چیئرمین رویت ہلال کمیٹی) رویت ہلال کا اعلان کر دے۔چہارم: کسی دوسرے ملک سے چاند کے دیکھے جانے کی باوثوق معتبر شہادت یا خبر مل جائے۔بہرحال جب کسی شخص پہ مذکورہ صورتوں میں سے کسی صورت میں رؤیت ہلال متحقق ہو جائے تو اس پہ روزہ رمضان لازم ہو گیا اور وہ فمن شهد منكم الشهر فليصمه کا مصداق بن گیا۔

رؤیت ہلال میں علم فلکیات سے مدد لینا جائز ہے

رؤیت ہلال کے سلسلہ میں مسلم ماہرین فلکیات سے استفادہ بھی جائز ہے اور علم فلکیات مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے مگر اس کا یہ معنی نہیں کہ صرف ایسی سائنسی رپورٹ پر کہ فلاں شام کو چاند نظر آ سکتا ہے رمضان یا عید کا اعلان کر دیا جائے اور آنکھوں سے چاند کے دیکھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی کہے کہ اس نے چاند دیکھا ہے اور فلکیات کے مطابق اس دن نیا چاند پیدا ہی نہ ہو، یا اس کی رویت ممکن نہیں تو خوب پرکھا جائے کہ اس شخص نے چاند کیسے دیکھا اور تجربہ شاہد ہے کہ ناممکن الرؤیت چاند کے دیکھنے کی شہادتیں عموماً جھوٹی یا وہمی ہوتی ہیں۔

اسی لیے حضرت امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمهم الله تینوں کی یہ بالاتفاق رائے ہے کہ اگر آسمان صاف ہو تو جب تک جم غفیر یعنی کثیر لوگ چاند دیکھنے کی گواہی نہ دیں اس کا اعلان نہ کیا جائے۔(عامہ کتب احناف)

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگوں کی سماعت و بصارت میں اتنا بڑا فرق نہیں ہوتا کہ جو چیز باقی سب

لوگوں کو دکھائی یا سنائی نہ دے اسے صرف ایک یا دو آدمی دیکھ یا سن لیں اور اس لیے ان کی گواہی نا قابل قبول ہے۔ ضرور انہیں وہم ہوا ہے یا وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص جلد اول صفحہ ۲۵۱ دراحیاء التراث العربی بیروت)

مطلب یہ ہے کہ جب مطلع صاف ہو تو ایسے میں بہت سے لوگوں کے چاند دیکھنے کی گواہی ضروری ہے۔ صرف ایک دو آدمی کی گواہی کافی نہیں، خواہ رمضان کا چاند ہو یا عید کا، تو جیسے امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ نے رؤیت ہلال کے سلسلہ میں جم غفیر کی قید لگائی تا کہ جھوٹی گواہیوں کا سدِ باب ہو۔ اسی طرح دورِ حاضر میں چاند کا قابل رؤیت ہلال ہونا ضروری قرار دیا جائے تو وہی نتیجہ نکلے گا جو قیدِ جمِ غفیر کا ہے۔

برطانیہ میں مسئلہ رؤیت ہلال کا شرعی حل

یہاں ہمارے ہاں برطانیہ میں اکثر بادل چھائے رہتے ہیں۔ چاند نظر نہیں آتا بلکہ کئی دن سورج دیکھے بغیر گزر جاتے ہیں۔ یہاں رؤیت ہلال پر بہت اختلاف وانتشار ہے جس کی وجہ سے کفار کے سامنے مسلمانوں کی جگ ہنسائی الگ ہے۔ اس جھگڑے کا سب سے بہتر حل یہ ہے کہ قریب ترین اسلامی ملک مراکش کے اعلان پر برطانیہ میں روزہ وعید کا اعلان کیا جائے، دوسرا حل یہ ہے کہ جب برطانیہ میں علم فلکیات کے مطابق چاند کی رؤیت (Obsevatory) ممکن ہو تو دنیا کے کسی بھی خطہ سے رؤیت ہلال کی مصدقہ اطلاع قبول کر لی جائے۔

روزہ وعید کے لیے چاند کی بصری رؤیت ضروری ہے علمی رؤیت کافی نہیں:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ خود مسلمان چاند دیکھ کر رمضان کا مہینہ پائیں اور اس کا روزہ رکھیں۔ یہ جائز نہیں کہ فلکی رپورٹ پر پہلے ہی فیصلہ کر لیا جائے کہ فلاں دن رمضان شروع کیا جائے گا اور فلاں دن عید کی جائے گی۔ جیسا کہ برطانیہ میں بعض گروپ پہلے سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ فلاں دن روزہ وعید کریں گے۔ یہ غیر شرعی غیر اسلامی طریقہ ہے۔ کیونکہ اس صورت میں لوگوں نے رمضان کو نہیں پایا بلکہ رمضان نے انہیں آپایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ کہ تم میں سے جو شخص یہ مہینہ پائے، اللہ نے یہ نہیں فرمایا: فمن وجدہ منکم هذا الشهر۔

جس کی گواہی نہ مانی جائے وہ خود روزہ رکھے:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ سے اشارہ ملتا ہے کہ اگر کسی کو چاند نظر آئے مگر کسی وجہ سے اس کی گواہی نہ مانی جائے تو وہ خود روزہ رکھے، بلکہ فقہاء کہتے ہیں کہ اگر وہ روزہ نہ رکھے تو اس پہ قضا لازم ہے۔ (کنز الدقائق کتاب الصوم)

[190] مریض ومسافر کے لیے دوبارہ کہا گیا کہ جو شخص رمضان کا مہینہ پائے اور مریض یا مسافر ہونے کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے وہ بعد میں دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے کیونکہ اللہ تمہیں تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے۔ (حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی اگر اپنی یا بچے کی صحت کے بارہ میں پر خطر ہو تو بعد میں روزے رکھے۔ حیض ونفاس والی عورت روزہ نہیں رکھ سکتی بعد میں گنتی پوری کرے) اور اے مسلمانو! جب رمضان کی گنتی

پوری کرلو تو اللہ کے لیے تکبیر کہو اور شکر بجالاؤ۔ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ میں نماز عید پڑھنے اور اس میں زائد تکبیریں کہنے کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے عید کی ہر رکعت میں تین ہی زائد تکبیریں مروی ہیں۔ (طحاوی وغیرہ)

اگر کوئی شخص مغرب سے روزہ رکھتے ہوئے مشرق میں جائے یا اس کا الٹ ہو تو کیا کرے:

یہ فلکی اصول ہے کہ مغربی ممالک میں چاند مشرقی ممالک سے پہلے نظر آتا ہے کیونکہ قمری ماہ کا نیا چاند جب سورج سے جدا ہوتا ہے تو اسے کہتے ہیں کہ نیا چاند پیدا ہوا پھر سورج جیسے جیسے مشرق سے مغرب کی طرف سفر کرتا ہے تو نیا چاند اس سے آہستہ آہستہ دور ہوتا جاتا ہے لہٰذا سورج جب مشرق میں ڈوبتا ہے تو نیا چاند اس سے قریب تر اور اس کی شعاؤں میں گم ہوتا ہے اور اس کے نظر آنے کے امکانات کم ہوتے ہیں پھر سورج جس قدر مغرب میں چلا جاتا ہے نیا چاند اس سے اتنا ہی دور اور قابل رؤیت ہوجاتا ہے۔ اس لے مغربی ممالک میں چاند کا پہلے نظر آنا فطری بات ہے اور آج انسان چند گھنٹوں میں ہزارہا میل کا فاصلہ بذریعہ ہوائی جہاز طے کر لیتا ہے اور عموماً یہ صورت حال پیدا ہوجاتی ہے کہ کسی نے برطانیہ میں روزۂ رمضان شروع کیا پھر وہ رمضان میں پاکستان پہنچ گیا (اور برطانیہ میں رہنے والے ہزاروں پاکستانی پاکستان میں جا کر عید کرتے ہیں) وہاں جس دن اس کے تیس روزے پورے ہوگئے اس دن پاکستان میں ابھی رمضان تھا تو اب وہ کیا کرے۔ کیا روزہ چھوڑ دے یا اہل پاکستان کے ساتھ روزہ رکھے؟ تو اس بارہ میں عرض ہے کہ اسے اہل پاکستان کے ساتھ روزہ رکھنا چاہیے کیونکہ جب وہ پاکستان میں آگیا تو اب اس پہ یہاں کے احکام لازم ہوگئے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص پاکستان سے روزہ شروع کر کے سعودیہ، برطانیہ یا امریکہ میں پہنچے تو ممکن ہے جس دن اس کے اٹھائیس روزے پورے ہوں اس دن وہاں عید کا اعلان ہوجائے تو اب وہ کیا کرے۔ کیا روزہ رکھے یا مقامی لوگوں کے ساتھ عید کرے؟ تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ جب وہ کسی مغربی ملک میں پہنچ گیا تو اس پہ وہاں کا حکم لاگو ہوگیا۔ وہ مقامی لوگوں کے ساتھ عید کرے، البتہ بعد میں ایک روزہ مزید رکھے تاکہ انتیس کی گنتی پوری ہوجائے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ فقہاء کے نزدیک مطالع بعیدہ میں اختلاف معتبر ہے یعنی جن ممالک کے درمیان طویل فاصلہ ہے۔ جیسے پاکستان اور سعودیہ، ان ممالک میں اختلاف مطالع کا اعتبار ہے اور ان میں سے ہر ایک ملک کی اپنی رؤیت ہوگی اور اس کے مطابق وہاں روزہ یا عید کا حکم ہوگا۔ احناف میں سے علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ نے "بدائع الصنائع" میں، مالکیہ میں سے ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے "بدایۃ المجتہد" میں، شوافع میں سے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں اور حنابلہ میں سے امام مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے "کتاب الفروع" میں اس پہ خوب داد تحقیق دی ہے۔ لہٰذا جو شخص جس ملک میں ہو وہاں پہ اسی ملک کا حکم اس پہ جاری ہوگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہر ملک میں اپنے وقت پہ نماز پڑھی جاتی اور روزہ افطار کیا جاتا ہے تو جو شخص روزہ رکھ کر ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ جائے وہ وہاں کے وقت کے مطابق ہی روزہ افطار کرے گا۔ اس ملک کے مطابق روزہ افطار نہیں کرے گا جہاں اس نے روزہ شروع کیا تھا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا

اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو میں قریب ہوں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں

دَعَانِ لا فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿١٨٦﴾

جب وہ مجھے پکارے، تو چاہئے کہ میرے بندے میری بات مانیں اور مجھے پر ایمان رکھیں تا کہ وہ ہدایت پائیں۔ [191]

دعا کی فضیلت وبرکت

[191] روزے کی فرضیت کے ساتھ دعا کی اہمیت بتائی جارہی ہے کیونکہ روزہ بھی نفس کی سرکوبی کرتا ہے اور دعا بھی اور رمضان المبارک میں جو روزوں کا مہینہ ہے کثرت سے دعائیں کی جاتی ہیں لہٰذا اس جگہ دعا کی اہمیت بتائی جارہی ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں۔ (یعنی آہستہ پکاریں) یا دور ہے کہ اسے زور سے پکاریں۔ تب یہ آیت اتری: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ لا فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿١٨٦﴾ (ابن ابی حاتم) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے میرے حبیب ﷺ جب آپ سے لوگ میرے بارہ میں پوچھیں تو انہیں بتادیں کہ میں تو اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں وہی مجھ سے دور ہو جاتے ہیں۔ وہ جب بھی میرے قریب آئیں مجھے پکاریں تو میں ان کی پکار سنتا ہوں مگر انہیں چاہیے کہ مجھے پکارنے کے ساتھ میری بات بھی سنیں۔ مجھ پر کامل ایمان رکھیں کہ میں ہی ان کی حاجات کا کفیل ہوں۔ یہی ان کی ہدایت کا راستہ ہے

دعاء کی فضیلت و برکت اور اہمیت قرآن وحدیث سے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دعاء کا بار بار حکم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٥٥﴾ ''اپنے رب سے عاجزی اور خفیہ طریق سے دعاء کرو وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں رکھتا۔'' (اعراف، ۵۵)

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٦﴾ ''اور تم اللہ کو خوف وامید کے ساتھ پکارو، بیشک اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے۔'' (اعراف، ۵۶)

وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ط ''اور اللہ کو پکارو اسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔'' (اعراف، ۲۹)

قرآن بتاتا ہے کہ انبیاء کرام ﷺ مشکلات میں اللہ تعالیٰ کو بہت عاجزی وتضرع سے پکارتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا

ہے: اِنَّهُمۡ كَانُوۡا يُسٰرِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ وَيَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوۡا لَنَا خٰشِعِيۡنَ۝۹۰ ''انبیاء کرام نیکیوں میں سبقت لے جاتے تھے اور ہمیں امید وخوف کے ساتھ پکارتے تھے اور وہ ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔'' (انبیاء، ۹۰)

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمائی: وَزَكَرِيَّاۤ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرۡنِىۡ فَرۡدًا وَّاَنۡتَ خَيۡرُ الۡوٰرِثِيۡنَ۝۸۹ ''اور زکریا (علیہ السلام) کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا اے میرے رب مجھے تنہا نہ چھوڑ اور تو بہتر وارث ہے۔ (سورہ انبیاء، آیت نمبر ۸۹)

حضرت یونس علیہ السلام کی دعاء کا منظر یہ تھا: فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ۖ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ۝۸۷ ''انہوں نے تہہ در تہہ تاریکی میں اللہ کو پکارا کہ اے اللہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے میں ہی خود پہ زیادتی کرنے والا تھا۔'' (انبیاء، ۸۸)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بدر میں اللہ تعالیٰ کو پکارنا، فتح کے لیے فریاد کرنا اور ہاتھوں کو اس قدر بلند کرنا کہ آپ کی چادر تین بار کندھوں سے گری اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے واپس رکھی معروف واقعہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام یوں رو رو کر اللہ کو پکارتے تھے تو ہم گناہگاروں کو اللہ کے حضور کیسے گڑگڑانا چاہیے یہ سمجھا جاسکتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ليس شيئٌ اكرمَ على الله من الدعاء ''دعاء سے بڑھ کر کوئی چیز اللہ کے ہاں لائق تکریم نہیں۔'' (ترمذی کتاب الدعوات)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الدعاء مُخُّ العبادة ''دعاء عبادت کا مغز ہے۔'' (ترمذی کتاب الدعوات)

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انا عند ظن عبدى بى وانا معه اذا سئلنى، ''میں اپنے بندے سے وہی معاملہ کرتا ہوں جو میرے بارہ میں گمان رکھے اور جب وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۲۵۱)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الدعاء هو العبادة دعا ہی عبادت ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ادۡعُوۡنِىۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَـكُمۡ ؕ اِنَّ الَّذِيۡنَ يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ عِبَادَتِىۡ سَيَدۡخُلُوۡنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيۡنَ۝۶۰ (سورہ غافر، ۶۰) (ترمذی حوالہ مذکورہ)

دعاء کی عدم قبولیت کے اسباب:

یہاں سوال ذہن میں آتا ہے کہ ہماری بہت سی دعائیں قبول نہیں ہوتی پھر اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ کا کیا معنیٰ ہوا؟ اس کا جواب اللہ نے فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِىۡ وَلۡيُؤۡمِنُوۡا بِىۡ کہ بندوں کو میری بات بھی سننا ماننا چاہیے، کہہ کر

یہ بتلایا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی ہر دعا قبول ہو تو انہیں میری اطاعت بھی قبول کرنی چاہیے۔ اسی لیے حدیث میں ہے ''بعض غبار آلود بالوں والے لوگ لمبے ہاتھوں سے دعا کرتے ہیں۔ اے رب اے رب مگر ان کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام اور بستر حرام ہے تو ان کی دعا کیسے قبول کی جائے۔'' (مسلم کتاب الزکوۃ، حدیث ۶۵) تو اس حدیث کے مطابق دعا کی عدم قبولیت کے اسباب میں بڑا سبب رزق حرام ہے۔

پھر یاد رکھنا چاہیے کہ جو دعا قبول ہو جاتی ہے ضروری نہیں کہ اس کا ثمر اسی صورت میں ظاہر ہو کہ بندے نے جو مانگا وہ اسے دیدیا جائے، بلکہ دعاء کی قبولیت کا ثمر مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس کا ثمر کبھی یوں ظاہر ہوتا ہے کہ جو مانگا وہ مل گیا، کبھی یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے کوئی آنے والی مصیبت دور کر دیتا ہے اور کبھی اس کا عوض آخرت میں اس کے لیے رکھ لیتا ہے اور بندہ یہی سمجھتا رہتا ہے کہ اسکی دعاء قبول نہیں کی گئی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب کوئی بندۂ مومن دعاء کرتا ہے جس میں گناہ یا قطع رحمی کا سوال نہ ہو تو اللہ اسے تین چیزوں میں سے ایک ضرور دے دیتا ہے یا تو اس کی دعاء جلد قبول فرمالیتا ہے یا اس کے بدلے میں اس کے لیے آخرت میں اجر لکھ دیتا ہے اور یا اس سے ویسی ہی کوئی برائی دور کر دیتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ یہ سن کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ پھر تو بندے کو کثرت سے دعاء کرنی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَللّٰہُ اَکْثَرُ، اللہ اس سے بھی زیادہ دینے والا ہے۔

(الادب المفرد صفحہ ۲۴۸ حدیث ۷۱۰)

یاد رہے قبولیت دعا کا اصل ذریعہ تو اطاعت خداوندی ہے جیسا کہ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ کہہ کر واضح کیا گیا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا وسیلہ، متبرک مقام اور متبرک وقت میں دعا کرنا اور دعا کے اول و آخر میں درود شریف کا پڑھنا بھی قبولیت دعا کے ذرائع ہیں۔

مفسر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک خوبصورت منظوم دعاء:

اس جگہ میں وہ دعاء لکھنا چاہتا ہوں جو میں نے کسی ایسے وقت لکھی جب طبیعت حاضر تھی اور کیفیت طاری تھی یقیناً اہل ایمان اس سے تازگی ایمان محسوس کریں گے۔ ان شاء اللہ

مجھ کو دارین کی عطا دیدے ۔۔۔ اپنی مولا مجھے رضا دیدے
جن کو مرضوں نے مار ڈالا ہے ۔۔۔ میرے مولا انہیں شفاء دیدے
ہاتھ اٹھے نہ میرا سوئے گناہ ۔۔۔ مجھ کو ایسی حیاء خدا دیدے
مشکلیں میری ساری ہوں آساں ۔۔۔ رحمتوں کی مجھے عطاء دیدے

جس سے بر آئے ہر دعاء میری ۔۔۔ میرے ہونٹوں کو وہ دعاء دیدے
میرے سارے گناہ کردے معاف ۔۔۔ نیکیوں کا مجھے صلہ دیدے
میرے عیبوں کو سب چھپا رکھنا ۔۔۔ اپنی رحمت سے وہ خفا دیدے
لب پہ میرے رہے درود وسلام ۔۔۔ اپنے محبوب کی ولاء دیدے
جاؤں دنیا سے کلمہ پڑھتے ہوئے ۔۔۔ موت کا یوں مجھے مزا دیدے
ہو لحد میری نور سے روشن ۔۔۔ قبر میں وہ مجھے ضیاء دیدے
گرمی حشر میں میرے سر پر ۔۔۔ اپنے محبوب کی رداء دیدے
پل سے جاتے ہوئے بصوت نبی ۔۔۔ رب سلم کی بس صداء دیدے
دیکھ پاؤں تیرے حبیب کو میں ۔۔۔ مجھ کو جنت میں وہ جگہ دیدے
دور طیبؔ سے کردے نار سقر ۔۔۔ اور جنت کا داخلہ دیدے

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ

تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کیا گیا ہے، وہ تمہارے لئے لباس ہیں

لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ

اور تم ان کے لئے لباس ہو [192] اللہ جانتا ہے کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے

اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا

تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی اور تمہیں معاف فرمایا، [193] چنانچہ اب تم ان سے مباشرت کرو اور جو اللہ نے

مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ

تمہارے لئے لکھا ہے اسے طلب کرو اور کھاؤ پیو حتیٰ کہ تمہارے لئے

الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ

سفید دھاگہ کالے دھاگے سے ممتاز ہو جائے یعنی فجر ہو جائے پھر تم رات تک روزے پورے کرو [194]

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ

اور عورتوں سے مباشرت نہ کرو جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو یہ اللہ کی حدود ہیں

فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ان کے قریب مت جاؤ اس طرح اللہ لوگوں کے لئے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بنیں۔[195]

روزوں کی راتوں میں مباشرت اور کھانے پینے کی اجازت

[192] حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ لوگ ابتداء میں رمضان کے دوران ایسا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص روزہ افطار کرنے کے بعد سو جاتا تو اس پر کھانا پینا اور بیوی سے صحبت حرام ہو جاتی (روزہ شروع ہو جاتا) ایک رات حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر رات گئے گھر لوٹے۔ بیوی تب تک سو گئی تھی اسے جگایا اور مباشرت کا تقاضا کیا اس نے کہا میں سو گئی تھی۔ (میرا روزہ شروع ہو گیا ہے) آپ نے فرمایا نہیں تم کب سوئی تھی اور پھر

مباشرت کرلی۔ اگلے روز انہوں نے حضور ﷺ سے ماجرا کہا تب اللہ نے یہ آیت اتاری: اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ (درمنثور جلد اول صفحہ ۴۷۵)

یعنی اجازت دیدی گئی کہ لوگو تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں طلوع سحر سے قبل اپنی بیویوں کے پاس جانا جائز ہے کیونکہ وہ تمہارا لباس ہیں تم ان کا لباس ہو۔ یعنی تم ان کی وجہ سے گناہوں سے بچتے ہو وہ تمہاری وجہ سے گناہوں سے بچتی ہیں جیسے لباس انسان کو سردی گرمی سے بچاتا ہے یونہی میاں بیوی ایک دوسرے کو گناہوں اور الزامات سے بچاتے ہیں پھر لباس انسان کے لیے باعث زینت وسکون بھی ہے یونہی میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے باعث زینت وسکون ہیں۔

میاں بیوی کو ایک دوسرے کا راز نہیں ظاہر کرنا چاہیے:

جب مرد وعورت ایک دوسرے کا لباس ٹھہرے تو لباس کا کام چھپانا ہے ننگا کرنا نہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''مرد اپنی بیوی سے ہونے والے معاملات دوستوں کو نہ بتائے اور بیوی ایسی باتیں اپنی سہیلیوں کو نہ بتائے۔'' یونہی میاں بیوی کو ایک دوسرے کے عیوب چھپانا چاہئیں۔ بشرطیکہ اس میں کسی پر ظلم کا پہلو نہ ہو۔

نکاح کی اہمیت:

جب مرد وعورت ایک دوسرے کا لباس ہیں تو جو شخص نکاح نہ کرے وہ بے لباس رہنا چاہتا ہے۔ وہ خود کو محل اعتراض بناتا ہے۔ اور حضور سید المرسلین ﷺ کا ارشاد ہے ''تہمت کی جگہوں سے بچو۔'' (الموسوعہ جلد اول صفحہ ۹۶)

یعنی جو نکاح نہیں کرتا لوگ اس کے بارہ میں جلد تہمت زنی کرتے ہیں۔ اور نکاح نصف ایمان ہے یعنی نکاح کے بغیر شیطانی اور نفسانی حملوں سے بچنا دشوار تر ہے۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ ''جب مومن نکاح کرتا ہے تو شیطان اپنے سر میں خاک ڈال کر روتا ہے کہ ہائے اس نے مجھ سے اپنا ایمان بچالیا۔''

اور مشہور حدیث رسول ﷺ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **النکاح سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی**۔ یعنی ''نکاح میری سنت ہے، تو جس نے میری سنت سے (جان بوجھ کر بلا عذر) اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

ازواجِ مطہرات حضور ﷺ کا لباس ہیں:

جب یہ ضابطۂ قرآن ٹھہرا کہ بیوی شوہر کا لباس ہے اور شوہر بیوی کا تو معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی بیویاں آپ کا لباس ہیں اگر ان میں کوئی عیب تھا تو اللہ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ کے لیے ایسا لباس کیوں پسند کیا۔ اہل تشیع کو یہاں سے سبق لینا چاہیے کہ وہ ازواج مطہرات پہ نہیں لباس رسول ﷺ پہ اعتراض کرتے ہیں۔

اسی لیے جب منافقین نے سیدہ عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا پر الزام رکھا تو اللہ نے اس کے جواب میں سورہ نور کے پہلے

تین رکوع نازل فرما کران کی طہارت وعفت بیان فرمائی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس وقت کہا تھا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ آپ کے جسم اقدس پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا وہ کسی غلط کار عورت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھی بنانا کیسے گوارا کرے گا۔لہٰذا منافقین کا الزام جھوٹا ہے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ نے آپ کا سایہ نہیں بنایا، تاکہ کسی کا قدم آپ کے سائے پہ نہ آجائے، تو جو رب آپ کے سائے پہ کسی کا قدم نہیں آنے دیتا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا کس قدر لحاظ ہوگا۔

اور مولا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار آپ کی نعل مبارک سے کوئی گندی چیز لگی تھی تو اللہ نے وحی نازل فرمائی کہ نعل مبارک کو اتار دیں، جب اللہ آپ کی نعل سے گندگی کا لگنا گوارا نہیں فرماتا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے قریب کوئی گندگی کیسے آنے دے گا۔ (مدارج النبوت جلد دوم صفحہ ۵۸۶ مطبوعہ مکتبہ اعلیٰ حضرت لاہور)

پھر اللہ نے فرمایا: وازواجه امهاتهم، ''نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔'' (احزاب،۶) اب جو شخص خود کو مومن سمجھتا ہے۔ وہ تو اپنی ایمانی ماں پہ اعتراض نہیں کرے گا۔

اور یاد رکھنا چاہیے کہ حلال زادے اپنی ماؤں پہ طعنہ زنی نہیں کرتے۔ یہ حرام زادوں کا کام ہے۔ جو جسمانی ماں ہے اس میں اگر کوئی عیب ہو بھی تو حلالی بیٹا اسے بہر حال سننا گوارا نہیں کرتا اور اگر جھوٹا الزام ہو تو اسے سن کر بیٹے کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے، یہ جسمانی ماں کا مقام ہے تو ایمانی اور روحانی ماؤں کی عظمت کا کیا کہنا۔

اسلام نے عورت کو عزت بخشی ہے:

اسلام سے قبل عورت کو مرد اپنے پاؤں کی جوتی سمجھتا تھا مگر اسلام نے آکر عورت کو عزت دی اور کہا کہ مرد اس کا لباس ہے وہ مرد کا لباس ہے۔لہٰذا جو لوگ اسلام پہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں عورت کے حقوق دبائے گئے ہیں وہ اندھیرے میں رہتے ہیں، انہیں قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

[193] یعنی اس سے قبل تم سے خیانت ہو جاتی تھی تم رات کو بیویوں سے صحبت کر لیتے تھے حالانکہ اس وقت روزہ کا وقت شروع ہو چکا ہوتا تھا جیسا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ شان نزول میں بیان ہوا تو اللہ نے تمہاری وہ خطائیں معاف فرمائیں۔ اب تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ روزوں کی راتوں میں بیویوں سے صحبت کر کے وہ اولاد حاصل کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھی ہے۔

شان فاروق اعظم رضی اللہ عنہ:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وجہ سے تا قیامت مسلمانوں کو یہ سہولت ملی کہ روزوں کی راتوں میں روزوں والی پابندیاں اٹھالی گئیں۔ گویا وہ اللہ رب العزت کے ایسے محبوب بندے ہیں کہ ان کی خطاء ساری امت کے لیے باعث

رحمت بن گئی۔ جب ان کی خطاء کا یہ عالم ہے تو انکی عطاء کا عالم کیا ہوگا، جب ان کی غلطی کا یہ عالم ہے تو ان کی نیکی کا کیا عالم ہوگا۔ اور کیوں نہ ہو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ وہ ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ سے مانگ کر لیا اور دعا کی اللھم اعز الاسلام بایمان عمر بن الخطاب خاصة "اے اللہ عمر بن خطاب کے ایمان سے اسلام کو عزت عطا فرما۔"
(ترمذی کتاب الفضائل)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے پہ قرآن کریم کا ایک حصہ نازل ہوا ہے۔ جیسے حرمت شراب، مقام ابراہیم کا جائے مصلیٰ بنایا جانا اور ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حکم حجاب کا نزول، اس لیے اگر ان کی خواہش پہ رمضان کی راتوں میں بیوی سے قربت کی اجازت دیدی گئی تو یہی قرین قیاس ہے۔

ایمان بالقدر:

وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ سے معلوم ہوا انسان کو وہی اولاد ملتی ہے جو اللہ نے اس کے لیے پہلے سے لکھ دی۔ تو مومن کو راضی برضا رہنا چاہیے۔ بعض جہلاء محض بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے بیوی کو طلاق دیدیتے ہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ اس میں اس عورت کا کیا گناہ ہے۔

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روزے کے احکام میں جو خطائیں ہوئیں انہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا، اس سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ کو ان کی دلداری کس قدر عزیز ہے اگر اللہ ان کی معافی کا اعلان نہ کرتا تو نہ جانے وہ رو رو کر اپنا کیا حال کر لیتے اور ان کے بارہ میں منافقین کیا کیا باتیں بناتے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے غزوہ احد میں دو تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے خطاء ہوئی کہ وہ میدان جنگ چھوڑ کر چل دیے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی غلط افواہ سن کر وہ حوصلہ ہار گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کی معافی کا اعلان کیا، ارشاد ہوا: اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ "تم میں سے جو لوگ دونوں لشکروں کے مقابلہ کے دن بھاگ گئے تھے، ان کو شیطان نے ان کی بعض غلطیوں کے سبب بہکا دیا تھا، اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا۔" (آل عمران، ۱۵۵)

یہ اعلان اس لیے کیا گیا تا کہ ملحدین و منافقین ان کے بارہ میں زبان طعن دراز نہ کریں۔ اللہ کے اس اعلان معافی کے باوجود منافقین انہیں معاف نہیں کر رہے اور اگر یہ اعلان نہ ہوتا تو نہ جانے ان کی زبانیں مزید کتنی لمبی ہو جاتیں۔

[194] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحاب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شروع میں یہ طریقہ تھا کہ غروب آفتاب کے بعد اگر کوئی شخص سو جاتا تو اس کے بعد اس کے لیے کھانا پینا ممنوع ہو جاتا اگر اس نے کچھ نہ کھایا ہوتا تو اس کا کھانا پینا اگلے دن کی شام تک دھرے کا دھرا رہ جاتا۔ حضرت قیس بن خرمہ رضی اللہ عنہ روزہ دار تھے۔ افطار کے وقت وہ گھر آئے وہ کام کاج کر کے تھکے تھے۔ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے تو آنکھ لگ گئی، بیوی کھانا لائی اور انہیں سوتے ہوئے دیکھ کر

بولی تمہاری ناکامی اب تم کچھ نہیں کھا سکتے۔ اگلے دن دوپہر کو حضرت قیس بن خرمہ رضی اللہ عنہ پر بھوک پیاس کے سبب غشی آ گئی۔ ان کا ماجرا نبی ﷺ کی بارگاہ میں عرض کیا گیا تب یہ آیت اتری۔ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس آیت کے نزول پر بہت خوش ہوئے۔
(بخاری جلد اول صفحہ ۲۵۷ مطبوعہ کراچی)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اب تم روزوں کی راتوں میں کھا پی سکتے ہو تا آنکہ سفید دھاگہ یعنی فجر کالے دھاگے یعنی رات سے جدا ہو جائے۔ معنی یہ ہے کہ فجر طلوع ہو جائے۔ رات کو کالے اور صبح کو سفید دھاگے سے تعبیر کرنا عربی محاورہ ہے یاد رہے صبح کے وقت مشرق میں زمین سے آسمان کی طرف ایک لمبی روشنی نمودار ہوتی اور کچھ دیر بعد گم ہو جاتی ہے اسے صبح کاذب کہتے ہیں پھر مشرق میں ایک روشنی جنوباً شمالاً ابھرتی ہے اور پھیلتی جاتی ہے حتیٰ کہ دن چڑھ آتا ہے۔ یہ روشنی صبح صادق ہے اسی کو یہاں سفید دھاگہ کہا گیا ہے۔ اس کے طلوع پر سحری کا وقت ختم اور نماز فجر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

طلوع فجر کی تحقیق اور برطانیہ میں طلوع فجر کا صحیح وقت:

جاننا چاہیے کہ جب سورج افق سے ۱۸ ڈگری نیچے ہو تو صبح صادق طلوع ہو جاتی ہے اور یہ ضابطہ ساری دنیا کے لیے ہے۔ علم فلکیات کے موجد علامہ ابوریحان المسعودی فرماتے ہیں:

انحطاط الشمس تحت الافق اذا کان ثمانیة عشر جزء کان ذالك طلوع الفجر، جب سورج انحطاط افق سے ۱۸ ڈگری رہ جائے تو وہی طلوع فجر ہے۔ (کتاب القانون المسعودی جلد دوم باب ۱۳ مقالہ ۸)

فلکیات کی درسی کتاب شرح چغمینی میں ہے:

ان اول الصبح وآخر الشفق انما یکون اذا کان انحطاط الشمس ثمانیة عشر جزءا من دائرة ارتفاع الشمس، صبح کی ابتداء اور شفق کی انتہاء اس وقت ہوتی ہے جب سورج کا انحطاط دائرہ ارتفاع شمس سے ۱۸ ڈگری پر ہو۔ (شرح چغمینی باب ۳ مقالہ ۲)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

۱۸ درجہ انحطاط پر صبح صادق طلوع ہو جاتی ہے، فقیر کا ذاتی تجربہ ہے کہ اس کی ابتدا کا وقت ہمیشہ ہر موسم میں آفتاب ۱۸ درجہ ہی زیر افق پایا۔ (فتاویٰ رضویہ، رسالہ درء القبح عن وقت الصبح)

اسی طرح علماء دیوبند کے پیشوا مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کو ان کے زمانہ میں سکاٹ لینڈ (جو برطانیہ کا شمالی صوبہ ہے) سے اوقات نماز کے بارہ میں خط لکھا گیا، تو اس کے جواب میں انہوں نے یہی لکھا کہ صبح صادق کی ابتداء آپ لوگوں کے نزدیک بھی سورج کے ۱۸ ڈگری زیر افق ہونے ہی پہ ہوتی ہے۔ (امداد الفتاویٰ صفحہ ۱۷۸)

ہم نے برطانیہ میں اس کی تحقیق کروائی تو گرین وچ ابزرویٹری (جو برطانیہ کی عالمی رصد گاہ ہے، جس کے مقرر کردہ

ضوابط اور معلومات کو دنیا بھر میں معتبر سمجھا جاتا ہے) نے ہمیں خط ارسال کیا اور اس میں وہی کچھ لکھا جو آج سے آٹھ صدیاں قبل ایک مسلمان ماہر فلکیات علامہ البیرونی نے لکھا تھا، ان کے خط کے بعض الفاظ یہ ہیں (یہ خط میرے پاس محفوظ ہے)۔

You would be aware of dawn or sun comming up when it reaches an altitue of 18،

یہ ساری تحقیق ہم نے اس لیے پیش کی کہ برطانیہ میں صبح صادق کے وقت میں ایک غلطی بہت دیر سے چلی آرہی ہے۔ وہ یہ کہ یہاں برطانیہ میں جب مسلمان اول اول آئے تو فقہی مسائل سے ناواقفی تھی، تب کسی نے نماز ٹائم ٹیبل بنایا اور اس میں صبح صادق کا تعین ۱۵ ڈگری کی بنیاد پہ کیا گیا جو کہ غلط ہے۔ چنانچہ اس میں انگریزی کیلنڈر کے پہلے دن یکم جنوری کو طلوع فجر کا وقت (مانچسٹر و مضافات کے لیے) چھ بج کر پینتالیس منٹ لکھا گیا ہے اور عرصہ سے لوگ اس کو اپنا رہے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ علم توقیت کے ماہرین کی آراء آپ نے پڑھ لیں کہ صبح صادق کا طلوع ۱۸ ڈگری پہ ہوتا ہے اور اس کے مطابق یکم جنوری کو صبح صادق کا وقت چھ بج کر سولہ منٹ ہے۔ علماء برطانیہ پر لازم ہے کہ لوگوں کی عبادات خراب ہونے سے بچائیں ہمارے پاس اس بارہ میں تحقیقی مواد ہے۔ اس کے مطابق ہم نے برطانیہ کے لیے صحیح نظام الاوقات (Prayer Time Table) چھپوایا ہے۔

برطانیہ کی مختصر ترین راتوں میں ختم سحری کیسے کی جائے

برطانیہ میں صبح صادق کے حوالہ سے ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ہر سال ۱۳ مئی سے جولائی کے آخر تک رات بھر سفیدی ہی رہتی ہے اور طلوع فجر کا پتہ نہیں چلتا نہ ہی اس کا تعین کیا جا سکتا ہے اس کے لیے فقہاء نے مختلف اقوال کہے ہیں۔

اول: سبع اللیل یعنی غروب آفتاب سے طلوع آفتاب کے سارے وقت کا آخری ساتواں حصہ نماز فجر کے لیے ہے۔

دوم: غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک کے سارے وقت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ آخری نصف کو نماز فجر کے لیے رکھا جائے اور پہلے نصف میں سے شفق احمر کا وقت نماز مغرب کے لیے رکھا جائے اور باقی نماز عشاء کے لیے۔

سوم: اقرب الایام۔ یعنی ۱۲ مئی کو طلوع فجر کا جو وقت تھا اسی کو جولائی کے اختتام تک جاری رکھا جائے۔

چہارم: اقرب البلاد۔ یعنی اگر برطانیہ میں ان دنوں طلوع فجر کا علم نہیں ہوتا تو جس قریب تر ملک میں فجر طلوع ہوتی ہے اس کو اختیار کر لیا جائے۔ علماء برطانیہ کو چاہیے کہ ایک جامع، متفقہ اور سال بھر کے لیے نماز ٹائم ٹیبل مرتب کریں اور مذکورہ بالا مختلف اقوال میں سے کسی کو بنیاد بنا کر ان ایام غیر معتدلہ میں صبح صادق کا تعین کریں۔ تا کہ اہل اسلام اپنی عبادات میں شکوک وشبہات کا شکار نہ ہوں۔ ان میں سے اقرب البلاد اقرب الی الفھم ہے، اور اس میں سب

سے زیادہ آسانی ہے۔ برطانیہ سے قریب ترین ملک فرانس ہے اور فرانس میں ان ایام میں باقاعدہ طلوع سحر ہوتا ہے تو اسی کو برطانیہ میں اپنانا چاہیے۔

امام شامی فرماتے ہیں :یکون العشاء فی حقھم بقدر مایغیب فیه الشفق فی اقرب البلاد الیھم ،یعنی جہاں وقت عشاء نہ آئے وہاں قریب ترین علاقوں کا وقت لیا جائے (ردالمحتار جلد اول صفحہ ۳۷۸ مطبوعہ مصر) اوران سب سے مشکل تر نصف اللیل کا قول ہے مگر بعض لوگ اس پہ بہت زیادہ زور دیتے ہیں، نہ جانے کیوں؟

فضیلتِ سحور:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ یعنی روزوں کی راتوں میں طلوع فجر تک کھاؤ پیو، سے معلوم ہوا روزہ رکھنے کے لیے سحری کا کھانا محبوب ہے تاکہ روزہ آسانی سے رکھا جاسکے جو چیز عبادت میں آسانی لائے وہ اللہ کو محبوب ہے۔ اسی لیے حدیث مبارکہ ہے:تسحّروا فانّ فی السحور برکۃً ''سحری ضرور کھاؤ کہ اس میں برکت ہے۔'' (بخاری کتاب الصوم باب ۲۰، مسلم کتاب الصوم حدیث ۴۵) یادرہے روزہ دار کا سحری وافطاری کے لیے کھانا پینا بھی ثواب ہے

احکامِ اعتکاف

[195] جب روزوں کے احکام بیان ہوئے تو ساتھ میں اعتکاف کا ذکر بھی لایا گیا کیونکہ ماہِ رمضان المبارک میں روزوں کے ساتھ اعتکاف بھی کیا جاتا ہے جو سنت موکدہ علی الکفایہ ہے تو فرمایا کہ لوگو جب تم مسجد میں اعتکاف کروتو بیویوں سے مباشرت نہ کرو یعنی روزہ میں توتم صرف دن کو مباشرت نہیں کر سکتے لیکن اگرتم روزہ کے ساتھ اعتکاف بھی کرلو تو پھر رات کو بھی مباشرت نہیں کرسکتے کیونکہ اعتکاف مسجد ہی میں ہوسکتا ہے اور مسجد میں مباشرت کی اجازت نہیں۔

اعتکاف کی تعریف، اقسام اور چند احکام:

اصطلاح شرع میں اعتکاف کا معنی کچھ دیر خود کو مسجد میں عبادت کے لیے ٹھہرانا ہے اگر کوئی نذر مان لے کہ وہ اللہ کے لیے اتنے دن اعتکاف کرے گا تو اسے اتنے دن اور ان کی راتیں مسجد میں ٹھہرنا اور روزہ رکھنا واجب ہے۔ یہ اعتکاف واجب ہے یہ رمضان وغیر رمضان میں کسی وقت ہوسکتا ہے اور رمضان کی آخری دس راتیں مسجد میں ٹھہرنا اعتکاف سنت ہے جو مؤکدہ علی الکفایہ ہے اگر ایک شخص مسجد میں ٹھہر جائے تو تمام اہل مسجد سے ذمہ اتر گیا اگر ایک بھی نہ ٹھہرا تو سب گناہگار ہوئے۔ اعتکافِ سنت ایسی مسجد میں ہوسکتا ہے جہاں نماز پنجگانہ ادا کی جاتی ہو۔ جمعہ کی ادائیگی ضروری نہیں، اس کے علاوہ اعتکاف نفل یہ ہے کہ کچھ دیر مسجد میں عبادت کے لیے ٹھہرا جائے۔ یہ ایک منٹ یا ایک گھنٹہ

کیلئے بھی ہوسکتا ہے۔اس کے لیے روزہ لازم نہیں۔

جو شخص عشرۂ رمضان میں معتکف ہو وہ کسی شرعی یا بدنی حاجت کے سوا مسجد سے باہر نہیں جاسکتا۔شرعی حاجت یہ ہے کہ اگر مسجد میں نماز جمعہ نہ ہوتی ہو تو دوسری مسجد میں نماز جمعہ کے لیے جایا جاسکتا ہے اور بدنی حاجت میں کھانا پینا اور قضاء حاجت کرنا وغیرہ شامل ہیں۔لہٰذا اگر مسجد میں کھانا نہ لایا جاسکتا ہو تو کھانے کے لیے معتکف باہر جاسکتا ہے جیسے حرمین شریفین کا حال ہے، جو شخص شرعی یا بدنی حاجت کے بغیر مسجد سے نکلا اس کا اعتکاف جاتا رہا۔اسی طرح اگر غسل نہ کرنے کی وجہ معتکف کے بدن سے پسینے کی بو آنے لگے یا اس کی عبادت میں خلل انداز ہو تو اس کے لیے نہانا بھی بدنی حاجت ہے وہ نہانے کے لیے جاسکتا ہے اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر نہیں جاسکتا۔

اعتکافِ رمضان کی فضلیت:

اعتکاف سنت جو رمضان میں ہوتا ہے کی عظیم فضلیت ہے۔امام زین العابدین رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من اعتکف عشرا من رمضان کان کحجتین وعمرتین، جس شخص نے رمضان کے دس دن اعتکاف کیا تو یہ عمل دو حج اور دو عمرہ کا ثواب رکھتا ہے۔(سنن بیہقی کتاب الصوم)

سیدہ عائشہ صدیقہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں ہر سال اعتکاف فرماتے تھے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج بھی اعتکاف کرتی تھیں۔
(بخاری کتاب الصوم باب الاعتکاف)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''جس شخص نے رضاءالٰہی کے لیے ایک دن اعتکاف کیا اللہ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں بنادے گا جو مشرق ومغرب کے فاصلہ کے برابر وسیع ہیں۔''
(درمنثور جلد اول صفحہ ۴۸۶ بروایت طبرانی اوسط وحاکم وبیہقی)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ یعنی روزوں کی راتوں میں کھانے پینے اور مباشرت کی اجازت اور دن میں اس کی ممانعت اسی طرح اعتکاف میں مباشرت نہ کرنا، یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں۔انہیں مت توڑو۔اللہ تعالیٰ نے اس طرح لوگوں کو اپنے دین کے احکام بتائے ہیں تاکہ وہ انہیں اپنا کر پرہیزگار بن جائیں۔

مسجد میں میاں بیوی کی صحبت حرام ہے:

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِی الْمَسٰجِدِ ؕ واضح حکم ہے اور مسجد وہ جگہ ہے جو نماز کے لیے مخصوص ہو اور سب مسلمانوں کو اس میں آنے کا اذن عام ہو۔لہٰذا مسجد سے ملحق وضو اور طہارت کی جگہ اور امام کی رہائش گاہ مسجد کی پراپرٹی ہے مگر مسجد کے حکم میں نہیں۔تو اگر مسجد کے طہارت خانوں کے اوپر کمرہ بنا ہو تو اس میں اعتکاف جائز نہیں اور

وہاں امام صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہ سکتے ہیں اور مباشرت بھی جائز ہے۔

اعتکاف مسجد ہی میں ہوسکتا ہے:

وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ سے معلوم ہوا اعتکاف مسجد ہی میں ہوسکتا ہے حتیٰ کہ اگر عورت گھر میں اعتکاف کرنا چاہے تو اسے ایک کمرہ کو نماز کے لیے مخصوص کرنا چاہیے وہاں اعتکاف کرے وہ اس کے گھر کی مسجد ہے۔ اگر وہ وہاں سے بلا عذر نکلے گی تو اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا کیونکہ بلا ضرورت مسجد سے نکلنا اعتکاف کو توڑ دیتا ہے۔ اسی طرح اگر مسجد سے ملحق مدرسہ یا کلاس رومز میں اعتکاف کیا جائے تو وہ معتبر نہیں ہے کیونکہ وہ مسجد میں نہیں ہے۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا
اور تم اپنے اموال آپس میں ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ انہیں حاکموں کے پاس لے جاؤ تاکہ لوگوں کے
فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾
اموال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ کھالو حالانکہ تم جانتے ہو۔[196]

ع ۲۳

حرام ذرائع سے مال کمانے کی برائی

[196] اس سے قبل روزے میں کھانے پینے کی حرمت بتائی گئی جو عارضی حرمت ہے اب بتایا جارہا ہے کہ حرام مال کا کھانا تمہارے لیے کسی صورت میں حلال نہیں۔ یہ مستقل حرمت ہے، تو فرمایا کہ اے مومنو تم ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ جیسے رشوت، سود، ناجائز منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، جھوٹ فریب، چوری، ڈاکہ اور کسی بھی گناہ کی دعوت دے کر لوگوں سے مال کمانا سب حرام ہے مثلاً ناچنے، گانے، جاندار چیزوں کی تصویر بنانے، داڑھی مونڈنے، شراب بیچنے اور دیگر حرام کاموں کے عوض لوگوں سے مال حاصل کرنا۔ یہ سب وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ میں داخل ہے۔

آگے فرمایا: وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ یعنی ایسا نہ کرو کہ لوگوں پر ناجائز مقدمات قائم کر کے انہیں حکام کے پاس لے جاؤ اور ان پر جھوٹی گواہیاں قائم کر کے ان سے اموال ہتھیا لو یا وہ تمہیں کچھ مال دے کر اپنے دیگر اموال تم سے بچائیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ آج پاکستان میں کئی بااثر لوگ جعلی رجسٹریاں بنوا کر لوگوں کی جائیدادوں پہ قبضہ کر لیتے ہیں، پھر یا تو واپس ہی نہیں کرتے یا بھاری رقوم لے کر واپس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وانتم تعلمون یعنی تم جانتے

ہو کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے کیونکہ اس میں جھوٹ، دھونس، فریب، ایذاء مسلم، لالچ، حسد اور دیگر گناہ شامل ہیں۔

جھوٹا دعویٰ کر کے مال ہتھیانے کی برائی:

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ سے جھوٹے دعویٰ کے ذریعے مال ہتھیانے کی برائی معلوم ہوئی۔

چنانچہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''تم میرے پاس جھگڑے لاتے ہو ممکن ہے تم میں سے کوئی شخص اپنی دلیل بیان کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کے حق میں فیصلہ دیدوں اور یوں وہ اپنے بھائی کا حق لے لے، تو وہ یاد رکھے کہ میں اس طرح اسے جہنم کا ٹکڑا ہی دوں گا۔ (یعنی وہ اپنے لیے نار جہنم جمع کرلے گا)'' (بخاری کتاب الشہادات باب ۲۷، مسلم کتاب الاقضیہ حدیث ۴)

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا ایک شخص آپ کے حجرہ کے دروازہ پہ کھڑا کسی سے جھگڑ رہا تھا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف لے گئے اور فرمایا:

''سنو میں ایک بشر ہوں۔ میرے پاس لوگ جھگڑے لے کر آتے ہیں، شائد ان میں سے بعض اپنی بات کو دوسروں سے بہتر بیان کرسکتے ہوں، تو جس کو میں کوئی چیز دیدوں اور وہ اس کی نہ ہو تو وہ آگ کا ٹکڑا ہے۔ فليحملها او ليذرها، اب اسی مرضی ہے کہ اسے اٹھالے یا چھوڑ دے۔'' (مسلم کتاب الاقضیہ)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے قاضی اسلام سے جھوٹی گواہیوں کے ذریعہ غلط فیصلہ کروالیا اس نے نار جہنم جمع کرلی۔ ورنہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ نے اس سے محفوظ رکھا ہے کہ کوئی شخص آپ سے غلط فیصلہ کرواسکے۔

اسی لیے اللہ نے طعمہ بن ابیرق منافق کے قصہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہنمائی فرمائی۔ اس نے چوری کی اور مسروقہ مال ایک یہودی کے ہاں امانت رکھ دیا۔ جب وہ مال یہودی کے گھر سے برآمد ہوا تو قریب تھا کہ وہ مجرم قرار پاتا کیونکہ طعمہ بن ابیرق کے منافق ساتھی اس کے حق میں جھوٹی گواہیاں دے رہے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کی راہنمائی فرمائی، تو اس بارہ میں فرمایا گیا:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ یعنی ''اگر آپ پہ اللہ کا خاص فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو منافقین کا ایک گروہ آپ کو بہکانا چاہتا تھا۔'' (نساء، ۱۱۳) اس کا معنی یہ ہے کہ چونکہ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم اور رحمت خاصہ ہے اس لیے کوئی منافق آپ سے غلط فیصلہ نہیں کرواسکتا۔

اسی طرح جھوٹے مقدمات کرنے کی برائی میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

''جس نے ناجائز دعویٰ کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے اس نے جہنم میں اپنی جگہ پکی کرلی۔'' (ابن ماجہ ابواب الاحکام)

جھوٹی گواہی دینے کا عذاب:

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ کے مفہوم میں جھوٹی گواہی دینا بھی شامل ہے اور یہ عظیم گناہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”جھوٹے گواہ کے قدم (دربارِ الٰہی سے) ہٹنے نہ پائیں گے تاوقتیکہ اس کے لیے جہنم واجب ہو جائے۔“

(ابن ماجہ ابواب الاحکام)

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ
لوگ آپ سے نئے چاند کی بابت پوچھتے ہیں آپ فرمادیں یہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے نظام اوقات ہے [197] اور یہ کوئی
الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا
نیکی نہیں کہ تم گھروں میں ان کی پچھلی جانب سے آؤ بلکہ نیکی اس کیلئے ہے جو تقویٰ اختیار کرے اور تم گھروں میں
الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾
ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ کامیابی پاؤ۔[198]

[197] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ معاذ بن جبل و دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہلال (نیا چاند) کیا چیز ہے کہ وہ بہت باریک ہوتا ہے پھر بڑھتے بڑھتے گول ہو جاتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے پہلی حالت پر چلا جاتا ہے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ یعنی بتایا گیا کہ چاند کی یہ مختلف صورتیں اس لیے ہیں تاکہ لوگ اس سے اپنے معاملات کے اوقات مقرر کر سکیں کہ چاند کی فلاں تاریخ کو وہ کچھ خریدیں گے یا بیچیں گے، فلاں جگہ پہنچیں گے یا فلاں کام کریں گے یا بتا سکیں کہ فلاں قمری تاریخ کو یہ واقعہ ہوا تھا۔ جیسا کہ ہم قمری کیلنڈر کے مطابق اسلامی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے حج کی تاریخ مقرر ہوتی ہے کہ چاند کی فلاں تاریخ کو حج ہے۔ حج کا نام خصوصاً اس لیے لیا گیا کہ اہل حجاز یعنی اہل حرمین کے لیے حج کی بہت اہمیت ہے اس سے ان کی معیشت وابستہ ہے۔ تو چاند کی تاریخوں کے حوالے سے حج کی خصوصیت ان کے لیے بہت نمایاں ہے۔

اسلامی کیلنڈر قمری مہینوں سے ہے شمسی مہینوں سے نہیں:

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ سے معلوم ہوا اسلامی کیلنڈر کا تعلق قمری مہینوں سے ہے شمسی مہینوں سے نہیں۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ قمری کیلنڈر آسان تر ہے۔ جنگل میں رہنے والا بھی چاند کی

شکلیں دیکھ کر تاریخ جان سکتا ہے اور شمسی تاریخوں کو یاد رکھنا پڑتا ہے۔ ان کے لیے کوئی ظاہری علامت نہیں ہے۔ افسوس! آج بہت سے مسلمانوں کو قمری مہینوں کے نام تک یاد نہیں حالانکہ کثیر اسلامی عبادات کا اسلامی مہینوں اور تواریخ سے تعلق ہے جیسے حج، روزہ، عیدین، قربانی اور فطرانہ وغیرہ۔

اسلامی مہینوں کا آغاز چاند کی رؤیت سے ہوتا ہے اس کی ولادت سے نہیں:

یہاں یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَہِلَّۃِ ؕ فرمایا گیا۔ الۡاَہِلَّۃِ ھلال کی جمع ہے۔ ہلال نئے چاند کو کہتے ہیں اس لیے کہ یہ لفظ اَھلّ یُھلّ بمعنی چیخنا چلانا سے ہے۔ لوگ نیا چاند دیکھ کر چلاتے ہیں کہ وہ دیکھو چاند نظر آ گیا۔ معلوم ہوا کہ قمری مہینہ کا آغاز اس چاند سے ہوتا ہے جو قابل رؤیت ہو اور اسے دیکھ کر لوگ چلائیں کہ چاند نظر آ گیا لیکن آج بعض لوگ چاند دیکھنے کے شرعی ضابطہ کی بجائے چاند کی پیدائش سے قمری مہینوں کے آغاز کی بات کر رہے ہیں حالانکہ پیدائش کے وقت چاند کو ہلال نہیں محاق کہتے ہیں۔ گویا لفظ الۡاَہِلَّۃِ ہی ان لوگوں کا نظریہ رد کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ ھلال قابل رؤیت چاند ہی کو کہتے ہیں جسے دیکھ کر لوگ چلائیں اور اسی سے مہینہ اور تاریخ مقرر ہوتی ہے۔

اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتصوموا حتی تروا الھلال ولا تفطروا حتی تروہ ،فان غُمّ علیکم فاقدروا لہ ''کہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر عید کرو اور اگر چاند بادلوں میں چھپ جائے (نظر نہ آسکے) تو اس کے لیے اندازہ کرلو۔''

(بخاری کتاب الصوم باب ۱۱ حدیث ۱۹۰۶، مسلم کتاب الصیام حدیث ۱۷)

تو نص صریح سے معلوم ہو گیا کہ اسلامی مہینے چاند کی رؤیت سے شروع ہوتے ہیں اس کی پیدائش سے نہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ چاند کی پیدائش سے قمری ماہ کا آغاز کرنا یہود کے ہاں مروج ہے، مسلمانوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

[198] حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ اہل عرب جب احرام باندھ لیتے پھر انہیں کسی وجہ سے احرام ہی میں گھر آنا پڑتا تو وہ دروازے سے داخل ہونے کی بجائے۔ (چھت پھلانگ کر) پچھلی طرف سے داخل ہوتے۔ (یعنی وہ سمجھتے کہ جس دروازہ سے وہ حج کے لیے نکل گئے ہیں اب حج کیے بغیر اس میں کیسے داخل ہوں) اس جاہلانہ رسم کے رد میں یہ آیت اتری: وَلَیۡسَ الۡبِرُّ بِاَنۡ تَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ ظُہُوۡرِہَا وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنِ اتَّقٰی ۚ وَاۡتُوا الۡبُیُوۡتَ مِنۡ اَبۡوَابِہَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۸۹﴾ (بخاری کتاب التفسیر سورہ بقرہ)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا گھروں میں پشت کی طرف سے داخل ہونا بھی کوئی نیکی ہے؟ نیکی تو اللہ سے ڈرنے کا نام ہے اور گھروں میں ان کے دروازوں سے ہی داخل ہونا چاہیے الغرض اسلام دین فطرت ہے وہ جاہلانہ رسموں کا قلع قمع کرتا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْاؕ اِنَّ اللّٰہَ

اور اللہ کی راہ میں ان سے لڑو جو تم سے لڑیں اور حد سے نہ بڑھو بے شک اللہ حد سے

لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

بڑھنے والوں کو پسند نہیں رکھتا۔[199]

راہ خدا میں جہاد کا حکم

[199] حضور ﷺ ذوالعقدہ ۶ھ میں چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کے لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ کفارِ مکہ نے آپ ﷺ کو ارضِ حرم سے باہر مقام حدیبیہ پر روک دیا کچھ سنگباری اور تیراندازی بھی کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم احرام میں تھے۔ اس لیے کچھ جواب نہ دیا، ہتھیار بھی ساتھ نہ تھے۔ بالآخر صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہوا اور طے ہوا کہ آپ اس سال کی بجائے اگلے سال عمرہ کر سکیں گے۔ نبی پاک ﷺ نے سرزمینِ حرم میں قربانی کے جانور ذبح کیے اور احرام کھول کر واپس چلے گئے۔ اگلے سال ذی قعدہ ۷ھ میں نبی پاک ﷺ نے عمرہ کیا اسے ''عمرۃ القضا'' کہتے ہیں یعنی گزشتہ برس کے عمرہ کی قضا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ڈر تھا کہ کفار مکہ بدعہدی کریں گے اور ارضِ حرم اور احرام کا تقدس پامال کرتے ہوئے لڑائی چھیڑیں گے۔ تب یہاں سے لے کر آیت ۱۹۵ تک کا حصہ قرآن نازل ہوا۔ (ابن ابی حاتم وابن جریر عن ابن عباس)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے مومنو! تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے ضرور لڑو جو تم سے لڑیں گویا اگر وہ ارضِ حرم کا تقدس پامال کر کے لڑائی چھیڑ دیں تو تم بھی ارضِ حرم کی پرواہ کیے بغیر منہ توڑ جواب دو مگر حد سے نہ بڑھو یعنی از خود حرم میں قتال شروع نہ کرو کہ یہ حرام ہے۔ ہاں اگر کوئی تم پر زیادتی کرے تو اس کے عمل کی سزا ضرور دو۔

مرزائیوں کے اقدامی جہاد کو حرام کہنے کی دلیل کا رد

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ سے مرزائی گروہ استدلال لاتا ہے کہ مسلمانوں کو صرف دفاعی جنگ جائز ہے یعنی اگر کفار مسلمانوں سے جنگ چھیڑیں تو ان سے جنگ کی جائے ورنہ کفار سے جہاد جائز نہیں ہے مگر یہ استدلال غلط ہے ان آیات کا صرف ارض حرم میں قتال سے تعلق ہے کہ وہاں لڑائی کی ابتداء جائز نہیں۔ اگلی آیات کے الفاظ اس پر صریح دلالت کر رہے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی شان نزول مروی ہے جیسے ابھی گزرا۔ اس سے ہٹ کر باقی ساری دنیا میں اعلاء کلمۃ الحق کے لیے مسلمانوں کو ازخود اقدامی جہاد شروع کرنا جائز ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کفار پر اسلام پیش کیا جائے اگر قبول کر لیں تو وہ ہمارے بھائی ہیں اگر قبول نہ کریں تو جزیہ دینے پر راضی

ہوں، ورنہ لڑائی کیلئے تیار ہو جائیں۔ یوں ساری زمین پر زمین کے خالق و مالک کا قانون اور دین غالب کیا جائے۔
یہ الگ بات ہے کہ مسلمان پوری تاریخ اسلام میں ہمیشہ دفاعی جنگ ہی کرتے رہے ہیں کیونکہ کفار نے کبھی ان کو چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیا اور اقدامی جہاد کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مگر اب تو یہ افسوس ہے کہ مسلمان قوم دفاعی جہاد کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ اس لیے ساری دنیا میں مار کھا رہی ہے۔
اور یہ بھی واضح رہے کہ موجودہ مرزائی گروہ کا دفاعی جہاد کو جائز کہنا بھی مغالطہ دہی ہے۔ کیونکہ مرزا غلام احمد قادیانی نے تو ہر طرح کے جہاد کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے۔ ؎

دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد
یہ حکم سن کے جو بھی لڑائی کو جائے گا
وہ کافروں سے سخت ہزیمت اٹھائے گا
تم مر گئے تمہاری وہ عظمت نہیں رہی
صورت بگڑ گئی ہے وہ صورت نہیں رہی
اب تم میں کیوں وہ سیف کی طاقت نہیں رہی
بھید اس میں ہے یہی کہ وہ حاجت نہیں رہی

(دیکھئے ضمیمہ تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۷۸)

گویا مرزا غلام احمد قادیانی نے ان اشعار میں یہ درس دیا ہے کہ آج مسلمانوں میں کفار کے خلاف تلوار اٹھانے کی طاقت اس لیے نہیں رہی کہ اب تلوار اٹھانے کی حاجت نہیں رہی کیونکہ جہاد حرام ہو چکا ہے، لہٰذا اب کفار کشمیر میں فلسطین میں اور عراق وافغانستان میں جس قدر بھی مسلمانوں کا خون بہائیں بہر حال مسلمانوں کو تلوار اٹھانے یعنی دفاع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر اس کے باوجود مرزائیوں کے بارہ میں مسلمانوں کی آنکھیں نہ کھلیں تو کیسے کھلیں گی؟
مرزا قادیانی جہاد کی مخالفت اس لیے کرتا تھا کہ اسے برطانیہ کی عیسائی گورنمنٹ ہی نے کھڑا کیا تھا۔ وہ انگریز سرکار کی خدمت میں خطوط لکھتا تھا کہ میں آپ ہی کا لگایا ہوا پودا ہوں اس لیے میرے بارہ میں احتیاط سے کام لیا جائے، چنانچہ اس کے اپنے الفاظ پڑھیں۔ وہ لکھتا ہے:
''سرکار دولت مدار ایسے خاندان کے بارہ میں جس کو پچاس برس کے متواتر تجربہ سے ایک وفادار جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے کہ وہ قدیم سے گورنمنٹ انگریزی کے پکے خیر خواہ اور خدمت گزار ہیں۔ اس خود کاشتہ پودا کی نسبت حزم اور احتیاط اور تحقیق اور توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو بھی اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر میرے اور میری جماعت کو ایک خاص عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔ ہمارے خاندان نے سرکار انگریزی کی راہ میں اپنے خون بہانے اور جان دینے سے فرق نہیں کیا''۔

(مجموعہ اشتہارات جلد سوم صفحہ ۲۱ مطبوعہ احمدیہ مرکز لندن)

اس عبارت میں مرزا غلام احمد قادیانی نے خود اپنے لفظوں سے تسلیم کیا ہے کہ وہ انگریزی سرکار کا خود کاشتہ پودا ہے اور اس کا سارا خاندان اور اس کی ساری جماعت جان ودل سے انگریزی سرکار کی وفادار غلام ہے اور اس غلامی میں وہ

اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ حیرت ہے مرزا کے نزدیک دین اسلام کی حمایت میں جہاد حرام ہے مگر کفار بد انجام کی حمایت میں لڑنا کار ثواب ہے۔ کیا ایسے شخص کو مسلمان ہی سمجھا جائے؟

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ

اور انہیں قتل کرو جہاں انہیں پاؤ اور انہیں وہاں سے نکال دو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى

اور فتنہ (کفر) قتل سے بدتر ہے [200] اور ان سے مسجد حرام کے قریب مت لڑو یہاں تک کہ

يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

وہ تم سے اس میں لڑائی شروع کریں، تو اگر وہ تم سے وہاں لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو اسی طرح کافروں کی

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ

سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ [201] اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے

وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہ کی جائے۔ [202]

[200] یعنی اگر کفار تم سے ارض حرم اور شہر مکہ میں لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو اور جہاں انہیں پاؤ اتنا مارو کہ انہیں مکہ سے نکال کر دم لو۔ جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا اور ایسے میں تقدیس حرم تمہیں کفار کی سرکوبی سے مانع نہ ہو کیونکہ ان کا حرم میں بت پرستی کرنا اور حرم کعبہ کو بتوں کی نجاست سے بھرنے کا فتنہ حرم میں قتال سے کہیں بدتر ہے۔ اگر قتال کے ذریعے اللہ کا حرم کفر و شرک کے فتنہ سے پاک ہو جائے تو ایسا کرنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہاں فتنہ سے مراد شرک ہے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۴۹۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

مؤمن اسلحہ اور تعداد پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت پر بھروسہ رکھتا ہے:

یہ آیات ۷ھ میں ''عمرۃ القضا'' کے موقع پر اتریں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت اسلحہ کی بجائے حالت احرام میں تھے، تعداد بھی دو ہزار سے تجاوز نہ تھی پھر حالت سفر میں تھے۔ جنگ کے لیے آئے ہی نہ تھے۔ اس وقت اگر کفار لڑائی شروع کرتے تو وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ کے مطابق انہیں اس قدر ہزیمت ہوتی کہ مکہ چھوڑ کر بھاگ اٹھتے

کیونکہ مسلمانوں کو اسلحہ وتعداد کی بجائے اللہ تعالیٰ کی کامل مدد ونصرت پر بھروسہ تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قوم مسلم اسلحہ تیار نہ کرے، کیونکہ حکم خداوندی ہے کہ تم کفار کے مقابلہ میں جو طاقت جمع کر سکتے ہو کرو۔ (سورہ انفال، ۶۰) مطلب یہ ہے کہ قوم مسلم کی اصل طاقت اللہ تعالیٰ کی ذات پہ کامل یقین ہے اگر یہ طاقت نہ ہو تو پھر کوئی اسلحہ انہیں کامیاب نہیں کرسکتا، اگر یہ طاقت ہو تو پھر وہ بے سروسامانی میں بھی غالب آسکتے ہیں۔ حفیظ جالندھری مرحوم نے اہل بدر کے بارہ میں کہا تھا۔

نہ تیغ و تیر پر تکیہ نہ خنجر پر نہ بھالے پر بھروسہ تھا انہیں سادی سی کالی کملی والے پر

اور مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ بھی اس بارہ میں یوں فرماتے ہیں۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اعلیٰ مقصد کے لیے بدی بھی نیکی بن جاتی ہے:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ کہہ کر بتایا گیا کہ حرم میں قتال اچھا نہیں مگر وہاں شرک وکفر کا دور دورہ اس سے بدتر چیز ہے اس کے خاتمہ کے لیے وہاں قتال برائی نہیں نیکی ہے، بلکہ جہاد کا بنیادی فلسفہ ہی یہ ہے کہ معصیتِ الٰہی کی بدی مٹائی جائے۔

[201] ان الفاظ سے مزید معلوم ہو گیا کہ ان آیات کا تعلق صرف سرزمین حرم میں قتال سے ہے کہ وہاں لڑائی کا آغاز حرام ہے ہاں اگر کفار وہاں لڑائی شروع کریں تو اس کا جواب لازم ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو فرمایا اللہ عزوجل نے مکہ کو حرمت دی ہے۔ یہاں کسی کا خون بہانا یا یہاں کا درخت کاٹنا جائز نہیں اور یہاں میرے لیے دن کی ایک گھڑی قتال حلال کیا گیا اب اس کی حرمت پھر لوٹ آئی ہے جیسے پہلے تھی۔ (بخاری کتاب المغازی باب ۵۲ حدیث ۴۲۹۵)

[202] اب اس آیت میں کفار سے مطلقاً لڑائی کی اجازت دی گئی ہے خواہ کفار اہل اسلام پر حملہ آور ہوں یا نہ ہوں، تو فرمایا کہ تم ان سے اس وقت تک لڑو کہ فتنہ کفر ختم ہو جائے اور ساری زمین پر صرف اللہ کا دین غالب آجائے یعنی اے مومنو! جب تک فتنہ کفر ختم ہو کر ساری زمین پر غلبہ اسلام کا جھنڈا نہیں لہرادیا جاتا تب تک کفار سے جہاد جاری رکھو۔ فتنے سے مراد یہاں کفر ہے جیسے ابھی آیت ۱۹۱ کے تحت ہم واضح کر چکے۔ آگے فرمایا گیا اگر کفار کفر سے یا مسلمانوں کو تنگ کرنے سے باز آجائیں تو ان پر کوئی زیادتی نہ کی جائے یا یہ معنی ہے کہ جب وہ جہاد کی برکت سے مغلوب ہو کر اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرلیں تو پھر وہ اسلامی مملکت کے باشندے ہیں پھر ان پر کوئی زیادتی نہ کی جائے ہاں جو کفار بد عہدی کر کے مسلمانوں کو تنگ کریں یا اطاعت قبول کرنے کے بعد بغاوت پر اتریں یا اسلام قبول کرنے کے بعد سلام سے پھر جائیں تو ایسے ظالموں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

جہاد تا قیامت جاری ہے اور اس کا منکر کافر ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ط سے صاف معلوم ہوا کہ جب تک دنیا پہ فتنہ کفر موجود ہے جہاد جاری ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ط (توبہ:۵) گویا جب تک مشرکین توبہ کر کے قبول ایمان اور پابندی صلوٰۃ وزکوٰۃ نہ کریں تب تک ان سے قتال جاری رکھا جائے۔

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ گواہی دیدیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، اگر وہ ایسا کرلیں تو انہوں نے مجھ سے اپنے اموال اور خون محفوظ کر لیے۔ سوا حق اسلام کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔''

(بخاری کتاب الایمان باب ۲۸، مسلم کتاب الایمان حدیث ۳۲، ابوداؤد کتاب الجہاد باب ۹۵ ترمذی کتاب التفسیر سورہ غاشیہ)

گویا جب تک دنیا میں کفار کا وجود ہے جہاد کا حکم جاری ہے، اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ''گھوڑوں کی پیشانیوں سے تا قیامت بھلائی وابستہ کردی گئی ہے جو جہاد کا ثواب اور مال غنیمت ہے۔'' (بخاری کتاب الجہاد)

اور حدیث ہے ''میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ حق پر قتال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ان میں سے آخری لوگ دجال مسیح سے قتال کریں گے۔'' (ابوداؤد کتاب الجہاد)

اس موضوع پر مزید احادیث ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاد تا قیامت جاری ہے۔ اس کے باوجود مرزا غلام احمد قادیانی نے کہا کہ اب اس کے آنے سے جہاد منسوخ ہوگیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال — دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب جنگ اور جہاد حرام اور قبیح ہے — لوگوں کو یہ بتاؤ کہ وقتِ مسیح ہے

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ، روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۸۰)

مرزا قادیانی کا یہ نظریہ صریح کفر ہے۔ مرزا قادیانی جہاد کو حرام کہتا تھا مگر مسلمانوں کو مارنے کے لیے انگریزوں کی مدد میں لڑنے پر فخر رکھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

میرے والد صاحب انگریزوں کے وفادار رہے اور انہوں نے میرے بھائی مرزا غلام قادر کو صرف گورنمنٹ کی خدمت گزاری کے لیے بعض لڑائیوں میں بھیجا (شہادۃ القرآن مندرجہ روحانی خزائن جلد ۶ صفحہ ۳۷۸ مطبوعہ لندن)

اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ کس قوم کا دشمن اور کس قوم کا وفادار تھا اور اس سے اس کے منکر جہاد ہونے کا مقصد بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔

جہاد وہ ہے جو اعلاء کلمۃ الحق کے لیے ہو:

وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ سے معلوم ہوا جہاد وہ ہے جو سربلندی دین کے لیے ہو آج بعض کشمیری و فلسطینی اور افغانی و عراقی تنظیمیں اپنے علاقوں کی آزادی کے لیے لڑ رہی ہیں وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ اسلام کی سربلندی اور کفار کی قوت کے خاتمے کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا کہیں اور سوچیں تو اللہ ان کی مدد بھی کرے گا انہیں جہاد کا اجر و ثواب بھی ملے گا اور ان کا دنیوی مقصد بھی پورا ہو جائے گا یعنی ان کے علاقے بھی آزاد ہونگے۔ یاد رہے اپنی زمین اور مال کی واپسی کے لیے لڑنا بھی جائز ہے مگر وہ جہاد نہیں۔ جہاد وہ ہے جو صرف اعلاء کلمۃ الحق کے لیے ہو۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى

حرمت والے مہینہ کے بدلے حرمت والا مہینہ ہے اور عزت کے بدلے عزت ہے [203] تو جو تم پر زیادتی کرے

عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

تم اس پر اسی قدر زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر کی اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ

اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى

پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ [204] اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو

التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

ہلاکت میں نہ ڈالو اور اخلاص رکھو بیشک اللہ اخلاص والوں کو پسند رکھتا ہے۔ [205]

مع

[203] اسلام سے قبل اہلِ عرب میں یہ دستور تھا کہ ذیقعدہ، ذی الحج، محرم اور رجب میں لڑائی ممنوع سمجھی جاتی تھی۔ پہلے تین ماہ میں اس لیے تاکہ حجاج کے لیے راستے پر امن رہیں اور رجب کا مہینہ عمرہ والوں کے لیے لڑائی سے پاک رکھا جاتا اور انہیں حرمت والے مہینے سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے حضور ﷺ نے ذی قعدہ ۶ ھ میں عمرہ کا پروگرام بنایا۔ مگر کفار نے شہر حرام (حرمت والے ماہ) کا تقدس پامال کرتے ہوئے احرام پہنے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر پتھراؤ اور تیر اندازی کی اور انہیں حدیبیہ کے قریب حدود حرم میں داخلہ سے روکا، پھر یہ معاہدہ ہوا کہ آپ اگلے برس رجب میں عمرہ کے لیے آئیں گے۔ اگلے برس جب نبی پاک ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرۃ القضا کے لیے آئے تو اللہ نے یہ آیات اتاریں اور فرمایا اگر کفار تم سے دوبارہ ذی قعدہ جیسے حرمت والے ماہ میں لڑائی کریں تو تم ان سے ضرور لڑائی کرو کیونکہ انہوں نے گزشتہ ماہ حرام میں تم پر حملہ کیا تھا۔ اب اگر کریں تو سارے پچھلے حساب چکا دو اور عزت تو عزت کے بدلے ہوتی ہے جو عزت کرے وہ عزت کروائے۔

[204] یعنی اگر تم پر ماہ حرام میں حملہ کیا جائے تو بدلے میں تم بھی ان پر اتنی ضرب لگاؤ جس قدر انہوں نے کارروائی

کی۔ یہاں زیادتی کے بدلے کو زیادتی کہنا زیادتی کا بدلہ دینے کے معنی میں ہے جیسے وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۚ میں اللہ کی طرف مکر کی نسبت کفار کے مکر کا بدلہ دینے کے معنی میں ہے۔

[205] یعنی راہ جہاد میں مال خرچ کرو کہ مجاہدین کو اسلحہ لے کر دوان کے لیے زاد و راحلہ کا انتظام کرو۔ اگر تم راہ خدا میں مال خرچ نہ کرو گے تو ہلاکت میں پڑ جاؤ گے کیونکہ جہاد ہی تمہاری قومی زندگی کی بقاء ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری ؓ اس آیت کے تحت فرماتے ہیں یہاں ہلاکت میں پڑنے کا یہ معنی ہے کہ ہم گھر بیٹھ جائیں اور جہاد ترک کر دیں۔ (ترمذی کتاب التفسیر سورہ بقرہ) آگے فرمایا کہ جہاد میں اخلاص رکھو کہ ایسے مخلصین ہی کو اللہ جنگ میں غالب کرتا ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ

اور حج اور عمرہ کو اللہ کی رضا کے لیے پورا کرو [206] پھر اگر تمہیں روک لیا جائے تو جو قربانی میسر آئے کرو

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

اور اپنے سر نہ منڈواؤ یہاں تک کہ قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پہنچ جائے، [207] تو تم میں سے

مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ

جو کوئی مریض ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو بدلہ دینا لازم ہے خواہ روزے یا صدقہ یا قربانی [208]

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۥ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ

پھر جب تم امن میں ہو تو جو شخص فائدہ اٹھا کر عمرہ کے ساتھ حج ملائے تو جو قربانی

الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا

میسر آئے کرے پھر جو قربانی نہ پائے وہ تین روزے حج میں رکھے اور سات اس وقت جب تم

رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى

گھر لوٹو یہ دس پورے ہوئے یہ اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام (کی سرزمین) کے

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ؑ ﴿١٩٦﴾

رہنے والے نہ ہوں اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ سخت پکڑ والا (بھی) ہے۔ [209]

ع ٢٤ ٨

[206] اس سے قبل حج کا ذکر ہو رہا تھا پھر عمرۃ القضا کی بات آ گئی اب پھر حج کا ذکر لایا گیا ہے۔ تو فرمایا کہ حج و عمرہ کو

جب تم شروع کرلو تو اللہ کی رضا کے لیے انہیں ضرور پورا کرو کیونکہ کسی عبادت کو شروع کر کے اسے نامکمل چھوڑ دینا جائز نہیں ہے، اسی لیے فرمایا گیا: وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔ (محمد، ۳۳)

حاضری روضۂ رسول ﷺ کا تکمیل حج میں سے ہونا:

یاد رہے! روضہ رسول ﷺ کی حاضری بھی وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ میں داخل ہے کیونکہ حضور سرورِ کونین ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہ آیا اس نے مجھ پر زیادتی کی۔''
(درمنثور بحوالہ ابن عدی فی الکامل والدارقطنی فی سننہ جلد اول صفحہ ۶۵)

گویا زیارت روضہ رسول ﷺ سے حج معنوی طور پر مکمل ہوتا ہے، حج کرنا اور مدینہ طیبہ نہ جانا ایسے ہے جیسے کوئی شخص اپنے کسی ضروری کام کو مثلاً برطانیہ سے پاکستان کراچی جائے اور لاہور میں اس کا والد رہتا ہو، وہ اسے ملنے نہ جائے تو اسکے والد کے دل پہ کیا گزرے گی اور رسول اللہ ﷺ اپنی امت کے روحانی و ایمانی باپ ہیں اسی لیے فرمایا گیا: وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ ''آپ (ﷺ) کی ازواج امت کی مائیں ہیں۔'' (احزاب،۶)

بلکہ اگر ہزاروں والدین کی محبت جمع کی جائے تو اس محبت کی مثال نہیں بن سکتی جو رسول اللہ ﷺ کو اپنی امت سے ہے، تو آپ ﷺ اس بات کی شدید محبت رکھتے ہیں کہ آپ کے روحانی بیٹے بیٹیاں حج کے موقع پہ آپ کے پاس ضرور حاضر ہوں، اس لیے آپ ﷺ نے انہیں شفاعت کا وعدہ فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من حج فزار قبری بعد وفاتی فکأنما زارنی فی حیاتی، ''جس نے حج کیا پھر میری قبر کو زیارت کو آیا تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔'' (سنن دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ باب المواقیت مطبوعہ دارالفکر بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من زار قبری وجبت له شفاعتی، ''جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔'' (سنن دارقطنی جلد ۲ صفحہ ۲۱۷)

بلکہ اہل محبت کا نظریہ تو یہ ہے کہ حج میں اصل مقصود بارگاہ رسول ﷺ کی حاضری ہے کیونکہ حضور ﷺ ہی کے ذریعہ سے حج ملا ہے بلکہ آپ ﷺ ہی اصل مقصود کائنات ہیں۔ حضور ﷺ نہ ہوتے تو کہاں کعبہ ہوتا اور کہاں حج ہوتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آدم علیہ السلام نے وسیلۃ رسول ﷺ سے دعا کی تو اللہ نے خطا بخش دی اور فرمایا اے آدم لولاہ ما خلقتك، ''اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں آپ کو پیدا نہ کرتا۔''
(طبرانی صغیر جلد ۲ صفحہ ۸۳ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

عظمتِ مدینہ طیبہ پہ مفسر کی لکھی ہوئی خوبصورت نظم

میں کرتا ہوں ہردم دعائے مدینہ — کہ مولا مجھے بھی دکھائے مدینہ
نبی کے پسینے کی خوشبو سے یارو — معطر ہے اب تک ہوائے مدینہ
ضیائے رخ شاہ دنیا ودیں سے — منور منور فضائے مدینہ
شفا ہو نہ جس کو کسی بھی دوا سے — ذرا لے وہ خاک شفائے مدینہ
چمک تجھ کو بھاتی ہے پیرس کی ناداں — ہمیں بس ہے بھاتی ضیائے مدینہ
تجھے شوق جاؤں میں لندن یا پیرس — میں دیتا ہوں تجھ کو دعائے مدینہ
کہاں تم کو موت آئے گر مجھ سے پوچھو — کہوں گا نہ کچھ بھی سوائے مدینہ
یہ ہر اہل ایماں کی حسرت ہے اس کو — مدینے کا والی بلائے مدینہ
دعا ہے یہ طیبؔ کی اے مولا دیدے — بنے قبر دو گز ہی جائے مدینہ

حج وعمرہ کے بعض احکام

[207] اے مومنو! اگر تمہیں حج یا عمرہ کے راستہ میں روک لیا جائے جیسے حضور ﷺ کو کفار نے مقام حدیبیہ پر روک لیا تھا تو تمہیں جو جانور میسر آئے جیسے دنبہ، بھیڑ، گائے یا اونٹ اسے ذبح کر کے احرام کھول دیا جائے اور احرام یوں کھولا جائے کہ وہ جانور ارض حرم میں لے جایا جائے جب تک وہ جانور وہاں ذبح نہ ہو جائے تب تک سر نہ منڈوایا جائے پھر جب سر منڈوایا جائے گا تو یہی احرام کا کھل جانا ہے پھر اس کے بعد جب توفیق ملے اس حج یا عمرہ کی قضا دی جائے۔ جیسے حضور ﷺ نے اگلے برس عمرۃ القضا ادا فرمایا تھا۔

آج کل کئی لوگ رمضان المبارک میں عمرہ پر سعودیہ جاتے ہیں پھر حج کے لیے گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر وہاں رک جاتے ہیں بسا اوقات جب وہ حج کا احرام باندھ کر مدینہ طیبہ سے مکہ جاتے ہیں تو راستہ میں پولیس انہیں روک دیتی بلکہ احرام کھلوا کر سیدھا ایئرپورٹ پہنچا دیتی ہے۔ ایسا شخص محصر کہلاتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ احرام میں رہے اور مکہ میں اس کی طرف سے کوئی شخص جانور ذبح کرے تب وہ احرام کھول سکتا ہے اور اگر حرم میں جانور کا ذبح کروانا مشکل ہو تو جہاں کسی کو روکا جائے وہیں جانور ذبح کر کے احرام کھولا جا سکتا ہے۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسا قول مروی ہے۔

اسی طرح جو شخص حج یا عمرہ سے قبل دوران سفر یا مکہ معظمہ پہنچ کر حالت احرام میں ایسا بیمار ہو جائے کہ حج یا عمرہ مکمل نہ کر سکے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ بھی محصر ہے، وہ بھی ایسے ہے جیسے اسے دشمن نے روک لیا۔ وہ قربانی کر کے احرام کھول دے اور اگلے برس یا جب ممکن ہو عمرہ یا حج کی قضا دے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

من حبسه عذر او غير ذالك فانه يحل ولا يرجع واذا كان معه هدى وهو محصر نحره ان كان لا يستطيع ان يبعث وان استطاع ان يبعث به لم يحل حتى يبلغ الهدى محله جس شخص کو کوئی عذر یا کوئی اور چیز حج سے مانع ہو جائے تو وہ احرام کھول دے اور لوٹ نہ جائے اور اگر اس کے پاس قربانی کا جانور ہو اور وہ اسے حرم میں بھیج نہ سکتا ہو تو اسے وہیں ذبح کر دے اور اگر بھیج سکتا ہو تو جب تک جانور حرم میں ذبح نہ ہو جائے تب تک وہ احرام نہ کھولے۔ (بخاری کتاب الحج حدیث ۱۸۱۲)

احرام کھولنے کے لیے سر کا منڈوانا افضل ہے:

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ سے معلوم ہوا احرام کھولنے کے لیے اگرچہ سر کے بالوں کا کترانا بھی جائز ہے مگر افضل یہی ہے کہ بال منڈوائے جائیں اس لیے یہاں صرف حلق ہی کا ذکر کیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللهم اغفر للمحلقين، ''اے اللہ حلق کرنے والوں پہ رحم فرما''، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا والمقصرين يا رسول الله، یعنی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قصر کرنے والوں کے لیے بھی دعا فرمائیں، آپ نے پھر حلق والوں کے لیے مذکورہ دعا فرمائی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پھر یہی کہا، آپ نے پھر حلق والوں کے لیے دعا فرمائی، آخر چوتھی بار آپ نے فرمایا: والمقصرين، یعنی اے اللہ قصر کرنے والوں پر بھی رحم فرما۔ (بخاری کتاب الحج)

[208] یعنی اگر احرام میں تمہیں کسی مجبوری کے تحت بال منڈوانا پڑیں مثلاً سرسام کی بیماری میں بال منڈوانے سے فائدہ ہوتا ہے یا سر میں کوئی تکلیف ہو جیسے سر میں زخم آ جائیں یا پھوڑے نکل آئیں اور بال مونڈنا پڑیں تو اس سے احرام نہیں کھلتا البتہ چونکہ یہ امر پابندی احرام کے خلاف ہے کہ احرام میں جسم کا کوئی بال مونڈنا جائز نہیں تو اس کے عوض محرم پر لازم ہے کہ تین روزے رکھے یا چھ مساکین کو کھانا کھلائے یا ایک بکری وغیرہ کی قربانی دیدے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابی کے سر سے جوئیں گرتی دیکھیں تو انہی تینوں چیزوں میں سے کسی ایک کے کرنے کا حکم دیا تھا۔
(بخاری جلد اول صفحہ ۲۴۴ مطبوعہ کراچی)

اور یہ حکم ہر اس صورت میں ہے جب پابندی احرام کے خلاف کوئی کام بامر مجبوری کرنا پڑے۔ مثلاً کسی کی رمی یا وقوف مزدلفہ مجبوراً رہ جائے تو وہ انہی تینوں کاموں میں سے کوئی کر لے۔

[209] یعنی پہلے تو وہ صورت بیان کی گئی جب کسی کو حالت احرام میں حج یا عمرہ سے روک دیا جائے۔ اب حالت امن کی بات کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ "حج تمتع" کیسے کیا جاتا ہے چونکہ دنیا بھر سے حج کے لیے جانے والے لوگ اکثر حج تمتع ہی کرتے ہیں۔ اس لیے اسی کا حکم بتایا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو شخص ایامِ حج میں یعنی رمضان کے بعد عمرہ کرے پھر سر منڈوا کر احرام کھول دے اور حج کا انتظار کرے اور حج قریب آنے پر حج کا احرام باندھ لے تو یہ حج تمتع ہے۔ تمتع کا معنی فائدہ اٹھانا ہے یعنی ایک ہی سفر میں عمرہ کے ساتھ حج بھی شامل کر کے زیادہ ثواب کا فائدہ اٹھانا۔ تو اس فائدہ کے بدلے اس شخص پر ایک جانور کی قربانی لازم ہے اور جو غربت کے باعث قربانی نہ دے سکے وہ تین روزے وہاں ایام حج میں رکھے اور سات روزے واپس گھر آ کر، یہ دس پورے ہوئے مگر یہ حج تمتع اسی شخص کے لیے جائز ہے جو سرزمین مسجد حرام یعنی حدود میقات کے اندر رہنے والا نہ ہو اور جو شخص وہاں کا رہنے والا یعنی مکی ہو وہ اگر حج تمتع کرے تو اس پر دم لازم ہے۔ (درمختار)

اسی طرح مکی آدمی "حج قران" بھی نہیں کر سکتا وہ یہ ہے کہ احرام میں عمرہ و حج دونوں کی اکٹھی نیت کر لی جائے۔ اس میں حاجی پہلے عمرہ ادا کرتا ہے پھر احرام ہی میں رہتا ہے اور موقع حج آنے پر افعال حج ادا کر کے احرام کھولتا ہے۔ حج تمتع اور حج قران صرف انہی حجاج کے لیے جائز ہیں جو حدود میقات سے باہر رہنے والے ہیں۔ (کنز الدقائق صفحہ ۸۱) حدود میقات کے اندر رہنے والوں کے لیے صرف حج افراد جائز ہے یعنی صرف حج جس کے ساتھ عمرہ شامل نہ ہو، تمتع اور قران دونوں میں جانور کی قربانی لازم ہے مگر افراد میں قربانی لازم نہیں۔ احناف کے نزدیک سب سے افضل حج قرآن ہے پھر تمتع پھر افراد۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ

حج (کے لیے) چند مقرر مہینے ہیں [210] تو جس نے ان میں حج کا ارادہ کرلیا وہ نہ تو حج کے دوران عورتوں سے جماع کی کوئی بات کرے

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ

نہ گناہ نہ جھگڑا اور تم جو نیکی کرو اسے اللہ جانتا ہے [211] اور (حج میں) زاد راہ لے کر چلو پھر بہتر زادِ

خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾

راہ تقویٰ ہے اور اے عقل والو مجھ سے ڈرو۔ [212]

حج کے بعض ضروری آداب

[210] اس سے قبل حج تمتع کی بات ہو رہی تھی۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ حج تمتع کے لیے چند مقرر مہینے ہیں یعنی جو شخص ان مہینوں میں عمرہ کرلے پھر حج کا موقع آنے پر حج کرے تو وہ حج تمتع بن جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس سے شوال ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے پہلے دس دن مراد ہیں (درمنثور) لہٰذا جس نے شوال سے پہلے عمرہ کیا پھر حج ہیں شامل ہوا تو وہ حج تمتع نہیں حج افراد ہے۔

[211] لہٰذا جو شخص حج کے مہینوں میں حج کا ارادہ کرلے یعنی احرام باندھ کر خود یہ حج فرض کرلے تو وہ بیوی سے مباشرت یا اس کے دواعی جیسے بوس وکنار اور اس کے بارہ میں کوئی بات نہ کرے۔ رَفَثَ بیوی سے مباشرت کو کہتے ہیں، مثلاً اللہ عزوجل نے فرمایا:

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ تمہارے لیے حلال کیا گیا ہے کہ روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جاؤ۔ (بقرہ، ۱۸۷)

اس کے علاوہ حاجی پہ لازم ہے کہ حج میں ہر فسوق یعنی وہ امور جو احرام میں حرام کیے گئے ہیں، سے بچے۔ جیسے خوشبو لگانا، ناخن کاٹنا، حجامت کرنا، سلے کپڑے پہننا، سر ڈھانپنا وغیرہ۔ اور کوئی جھگڑا نہ کرے۔ اہل جاہلیت حج کا مہینہ مقرر کرنے میں جھگڑتے تھے، دورانِ حج خیموں کی جگہ مقرر کرنے میں لڑائیاں کرتے تھے اللہ نے اس کا رد کیا اور یوں بھی حج کی بھیڑ کے سبب دھکم پیل سے لڑائی ہو سکتی ہے اللہ نے ان چیزوں سے منع فرمایا اور حاجی کو صبر کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے حج کیا اور اسمیں بے حیائی کی کوئی بات نہ کہی اور کوئی گناہ نہ کیا وہ حج سے یوں پاک ہو کر لوٹا جیسے اس کو ماں نے آج جنم دیا ہے۔''

(بخاری کتاب الحج باب ۳، مسلم کتاب الحج حدیث ۴۳۸، نسائی کتاب حج باب ۴، ابن ماجہ کتاب المناسک باب ۳)

حج میں صبر کی اہمیت:

وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ کہہ کر اللہ نے حجاج کو تلقین صبر فرمائی ہے کہ سفر حج میں کثیر مشکلات پیش آتی ہیں۔جیسے آجکل ایئرپورٹ پر کئی گھنٹے رکنا پڑتا ہے۔رش کے باعث معلموں کی بسیں ایک گھنٹے کا سفر تین تین گھنٹوں میں طے کرتی ہیں۔طہارت خانوں کے سامنے لمبی قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔کنکریاں مارتے ہوئے دھکے لگتے ہیں،طواف وسعی میں رش کی وجہ سے شدید تکلیف درپیش ہوتی ہے الغرض حج بہت تھکا دینے والا کام ہے۔اور قدم قدم پہ لڑائی جھگڑے کے امکانات ہوتے ہیں۔ضروری ہے کہ اس میں صبر سے کام لیا جائے۔اگر کوئی جھگڑا کرے تو بھی تو خاموشی رکھی جائے۔یہی حج مقبول کی نشانی ہے۔یہ اسی طرح ہے جیسے روزہ دار سے کہا گیا کہ اگر کوئی اسے گالی دے یا برا کہے تو وہ بدلے میں یہی کہے کہ میں روزہ دار ہوں کیونکہ روزہ ایک عبادت ہے جو صبر سے عبارت ہے اور یہی حال حج کا ہے۔

بیکار باتوں کی جگہ تلبیہ کی کثرت کی جائے:

لَا رَفَثَ کہہ کر حاجی کو بیکار باتوں سے اس لیے روکا گیا ہے تاکہ وہ تلبیہ زیادہ کہے حدیث میں ہے جب حاجی تلبیہ کہتا ہے تو اس کے دائیں بائیں پتھر درخت سب تلبیہ کہتے ہیں۔جنہیں سن کر اگلے پتھر تلبیہ بولتے ہیں اور یوں زمین کے آخری کناروں تک ہر چیز تلبیہ پکارنے لگتی ہے۔(ترمذی ابواب الحج) مگر افسوس ہے کہ حجاج کی اکثریت ان چیزوں کا خیال کم ہی رکھتی ہے۔

حج محبت الٰہی میں وارفتگی کا نام ہے

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ میں یہ درس دیا گیا ہے کہ حاجی کو اللہ کی محبت میں وارفتہ ہو جانا چاہیے،اسے دنیا کے کاموں اور گناہوں کی باتوں کا کچھ علم نہیں ہونا چاہیے،اسے دیوانہ وار تلبیہ کی کثرت کرنی چاہیے،اسی لیے حاجی کا لباس صرف دو چادریں رکھا گیا،گویا وہ اپنے اوپر دیوانگی طاری کر لیتا ہے،اسے حاجت نہیں رہتی کہ عمدہ لباس پہنے،عمدہ جوتا پہنے اور سر پہ اونچی دستار یا ٹوپی رکھے،دیوانے کو خوشبو لگانے اور حجامت کے درست کرنے کی فکر نہیں ہوتی،دیوانے کے ناخن بڑھے ہوتے ہیں،حجامت خراب ہوتی ہے اور بال پراگندہ ہوتے ہیں۔

یہی حال حاجی کا ہے۔وہ محبت مولائے حقیقی میں دیوانہ بن گیا،اس کے ناخن بڑھے ہیں،حجامت خراب ہے اور بال پراگندہ ہیں،اس کے جسم پہ میل جمع ہے،پسینے سے شرابور ہے،اسی لیے حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ یوم عرفہ میں میدان عرفات میں جمع ہونے والے حجاج پہ فخر کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ دیکھو میرے بندے میرے حضور غبار آلود بکھرے بالوں کے ساتھ جمع ہوئے ہیں۔(مسند احمد بن حنبل جلد ٢ صفحہ ٢٢٤)

[212] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بعض اہل یمن حج پر آتے تو زادِ راہ ساتھ نہ لاتے،کہتے ہم متوکل

ہیں مگر مکہ پہنچ کر مانگنا شروع کر دیتے۔ اس بارہ میں یہ آیت اتری: وَتَزَوَّدُوْا کہ حج پر زادِ سفر ضرور لے کر جاؤ (بخاری کتاب الحج) یعنی خوراک رہائش اور سفر کے اخراجات ساتھ لے کر نکلو اور جس کے پاس یہ اخراجات نہ ہوں اس پر حج فرض ہی نہیں۔ اللہ فرماتا ہے: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ (آل عمران: ۹۷)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بہترین زادِ سفر تقویٰ ہے یعنی اے مومنو! سفرِ حج میں جسمانی ضروریات کا توشہ تو ساتھ لو ہی، اس کے ساتھ اس رب کے خوف کا توشہ بھی ضرور ساتھ لو جس کے گھر کی حاضری کو تم جا رہے ہو۔ یعنی جسمانی توشہ کے ساتھ ایمانی و روحانی توشہ بھی لازم ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ (دورانِ حج) اپنے رب کا فضل تلاش کرو [213] پھر جب تم

عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ

عرفات سے لوٹو تو مشعر حرام کے پاس (مزدلفہ میں) اللہ کا ذکر کرو اور اسے اس طرح یاد کرو جیسے اس نے تمہیں ہدایت دی

وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝۱۹۸ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ

اور بیشک تم اس سے قبل گمراہوں میں سے تھے۔ [214] پھر تم بھی وہاں سے پلٹو

اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۹۹ فَاِذَا قَضَيْتُمْ

جہاں سے لوگ پلٹیں اور اللہ سے بخشش مانگو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ [215] پھر جب تم اپنے

مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ

ارکانِ حج ادا کر چکو تو یوں اللہ کو یاد کرو جیسے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے یا اس سے بھی زیادہ [216] تو لوگوں میں سے

النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰

کچھ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ [217]

[213] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ظہورِ اسلام سے قبل حج کے موقع پر مکہ میں دو منڈیاں لگتی تھیں ذوالمجاز اور عکاظ، اہلِ جاہلیت حج کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے۔ ظہورِ اسلام کے بعد اہلِ ایمان نے حج کے ساتھ تجارت کو ناپسند جانا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی اللہ نے فرمایا اگر تم حج کے ساتھ اللہ کا فضل یعنی رزق حلال تلاش کرو تو اس میں تم پر

کوئی گناہ نہیں۔ (بخاری کتاب المناسک)

حج میں تجارت جائز ہے:

حج میں اللہ کا فضل تلاش کرنا جائز کہا گیا اور قرآن رزق حلال کو اللہ کا فضل کہتا ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ یعنی ''جب نماز جمعہ ادا ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔'' (جمعہ:۱۰) حج میں جوازِ تجارت کی دلیل یہ آیت بھی ہے: لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ یعنی حجاج اپنے منافع بھی کھائیں۔ (حج،۲۸)

تجارت اللہ کا فضل ہے:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ط میں تجارت کو اللہ کا فضل کہا گیا ہے اور بلاشبہ حلال ذرائع سے مال کمانا اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء ''سچا اور امین تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔'' (ترمذی کتاب البیوع باب ۴ حدیث ۱۲۰۹) تجارت سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور حدیث کے مطابق رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں ہیں۔

[214] یعنی جب تم میدان عرفات میں وقوف کر کے رات کو وہاں سے لوٹو تو مشعر حرام میں اللہ کا ذکر کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مزدلفہ میں وقوف کرو۔ عرفات بھی ایک میدان ہے اور مزدلفہ بھی، عرفات مکہ سے نو میل پر جانب مشرق میں ہے اور مزدلفہ چھ میل پر۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا سارا مزدلفہ مشعر حرام ہے (تفسیر طبری جلد ۲ صفحہ ۱۶۷) مشعر حرام کا معنی ہے حرمت والی نشانی۔ یعنی یہ میدان مزدلفہ اللہ کی مقدس نشانی ہے کیونکہ یہاں حجاج دس ذی الحجہ کی نماز فجر کے بعد خصوصی دعائیں مانگتے ہیں اور اسے مزدلفہ اسے لیے کہتے ہیں کہ اس کا معنیٰ جمع کرنے والی ہے یعنی یہ جگہ بندگان خدا کو اپنے اندر جمع کرتی ہے اور لفظ عرفات کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس میدان میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام کی زمین پر باہم پہلی ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو پہچانا یعنی ان کی باہمی معرفت ہوئی تو لفظ عرفات معرفت سے ہے۔

یہاں فَاذْكُرُوا اللّٰهَ کے صیغہ امر سے وقوف مزدلفہ کا وجوب ثابت ہوا۔ یاد رہے حجاج پر دس ذی الحجہ کی فجر سے طلوع آفتاب تک کے مابین مزدلفہ میں وقوف واجب ہے خواہ ایک لمحہ کے لیے ہو اگر یہ رہ جائے تو دم واجب ہے۔ مزدلفہ میں حجاج مغرب وعشاء دو نمازیں اکٹھی پڑھتے ہیں، جس نے عرفات سے لوٹتے ہوئے راستہ میں مغرب پڑھ لی اسے مزدلفہ پہنچ کر اس کا دہرانا ضروری ہے۔ (درمختار) دونوں نمازوں کو یوں اکٹھا کیا جائے کہ ان کے لیے ایک ہی اذان اور ایک ہی اقامت کہی جائے۔ پہلے مغرب کے تین فرض پڑھے جائیں اور ساتھ ہی عشاء کے دو فرض بطور نماز قصر، پھر

یوم الحج الاکبر (ذی الحجۃ ۹ھ)

وَأَذَانٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللَّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ...

"اور اعلان ہے اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لوگوں کی طرف اس حج اکبر کے دن کہ بے شک اللہ بیزار ہے مشرکین سے اور اس کا رسول (بھی) پس اگر تم توبہ کرلو تو یہ بہتر ہے تمہارے لیے (التوبہ: 2/9)

وادی ابراہیم
جبل نور
غار حراء
بئر طوی
الحجون
مکہ مکرمہ
بیت الحرام
محصب (بطحاء مکہ)
جبل ثبیر
منحر
(قربان گاہ)
منیٰ
جمرات
مسجد خیف
جبل احدب
غار ثور
جبل ثور
موقف
مشعر الحرام
مسجد مزدلفہ
مزدلفہ
وادی باز
بطن محسر
جبل ثبیر
جبل ثبیر
جبل ستار
وادی عرنہ
جبل سعد
جبل القصار
عرفات (عرفہ)
جبل الرحمۃ
عرفات کی دونشانیاں
مسجد نمرہ
جبل نمرہ
وادی عرنہ
عابدیہ
طائف کا راستہ
عین زبیدہ
وادی نعمان
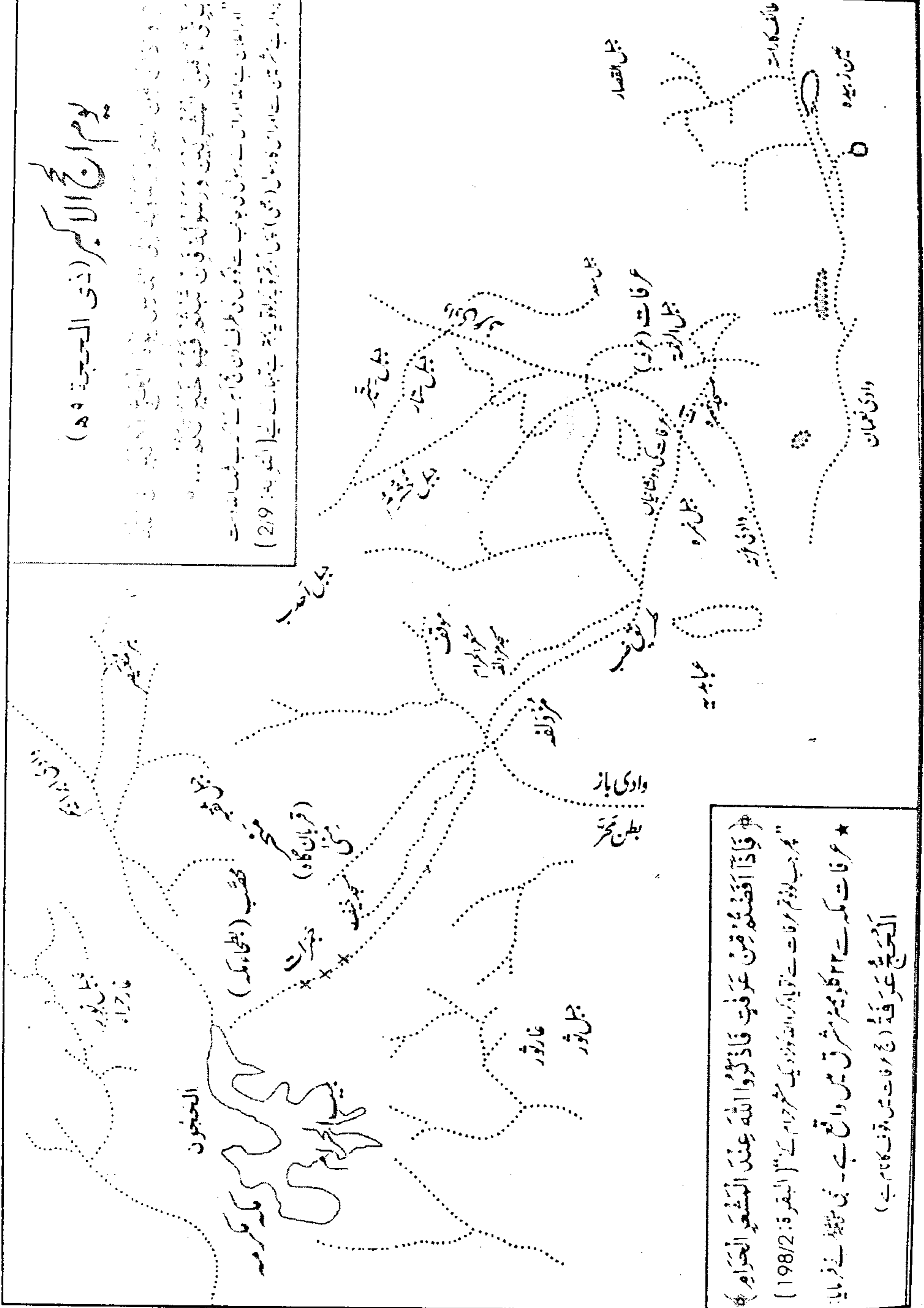
﴿فَإِذَا أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللَّهَ عِندَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ﴾

"پھر جب لوٹو تم عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر حرام کے" (البقرۃ: 198/2)

★ عرفات مکہ سے ۲۲ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

اَلْحَجُّ عَرَفَةُ (حج عرفات میں وقوف کا نام ہے)

مغرب کی دوسنتیں پھر عشاء کی دوسنتیں پھر وتر۔(درمختار)

[215] حضرت عروہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں دور جاہلیت میں عام لوگ تو حج میں نوں ذی الحجہ کو عرفات جاتے اور وہاں وقوف کر کے مزدلفہ واپس آتے تھے مگر قریش مزدلفہ ہی سے لوٹ آتے۔ وہ عرفات نہ جاتے تب یہ آیت نازل ہوئی (بخاری) بقول امام بغوی قریش خود کو حُمس (بہادر) کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا وہ اہل حرم ہیں وہ حرم چھوڑ کر باہر نہیں نکلیں گے۔ (عرفات حدود حرم سے باہر ہے) اللہ نے اس آیت میں انکار دفرمایا اور حکم دیا کہ اے مومنو تم ایسا نہ کرو تم وہاں سے واپس آؤ جہاں سے لوگ (عہد ابراہیمی سے لے کر) آرہے ہیں یعنی عرفات پہنچ کر وہاں سے واپس پلٹو۔

وقوفِ عرفہ کے چند احکام اور یوم عرفہ کی فضیلت:

نو ذی الحجہ کو حجاج پہ عرفات میں وقوف حج کا سب سے اہم فرض ہے، بلکہ اسی کا نام حج ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا الحج عرفة ''حج وقوف عرفہ ہی ہے۔'' (مظہری) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جو شخص عرفہ کے دن یا اس کی رات میں صبح سے قبل عرفات میں بنیت حج پہنچ جائے اس کا حج ادا ہو گیا جس سے یہ رہ گیا اس کا حج رہ گیا (درمنثور بحوالہ بیہقی) تو جو شخص نوں ذی الحجہ کو زوال سے قبل عرفات سے نکل گیا یا نوں کی رات کو صبح کے بعد وہاں گیا اس کا حج نہ ہوا اور جس کا وقوف عرفہ رہ گیا اس کے باقی ارکان حج بھی ساقط ہو گئے اور اسکا احرام حج سے عمرہ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ حاجی پہ لازم ہے کہ نو ذی الحجہ کو غروب آفتاب سے قبل عرفات سے نہ نکلے جس نے ایسا کیا اس پہ قربانی لازم ہے۔ (عامہ کتب فقہ)

یہاں فَاذْكُرُوا اللّٰهَ کہہ کر عرفات و مزدلفہ میں اللہ سے بخشش مانگنے کی طرف خصوصی توجہ دلائی گئی کہ اس وقت حجاج کے لیے اللہ کا دریائے بخشش جوش پر ہوتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے: ''اللہ تعالیٰ اہل عرفات پر فرشتوں کے سامنے اظہار فخر کرتا اور فرماتا ہے اے فرشتو! گواہ ہو جاؤ میں نے انہیں بخش دیا ہے۔'' (مسند احمد بن حنبل)

اور ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ اہل عرفات کے بارہ میں اللہ فرشتوں سے فرماتا ہے: ''دیکھو میرے بندے دور دور سے پراگندہ سر میری رحمت کے امیدوار ہو کر حاضر ہوئے ہیں، پھر فرماتا ہے اے میرے بندو اگر تمہارے گناہ ریت کے ذروں، بارش کے قطروں اور سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں تو بھی میں بخش دوں گا۔ میرے بندو واپس جاؤ تمہاری بخشش ہو گئی ہے۔'' (الترغیب والترھیب کتاب الحج جلد ٢ صفحہ ١١٠)

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یوم عرفہ سے بڑھ کر کوئی ایسا دن نہیں جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی بخشش فرماتا ہو، اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت کے ساتھ) ان کے قریب آجاتا ہے۔ پھر فرشتوں کے سامنے ان پہ فخر فرماتا ہے، پھر فرماتا ہے میرے بندے مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔'' (مسلم کتاب الحج)

راقم الحروف گناہگار محمد طیب غفرلہ عرض کرتا ہے کہ میں نے ١٤١٩ھ مطابق ١٩٩٩ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اس وقت حاضری کعبہ و وقوف عرفہ کے دوران حج کے بارہ میں چند اشعار میرے ذہن میں اترے تھے۔ میں

حصول برکت کے لیے انہیں یہاں نقل کرنا چاہتا ہوں۔اسوقت میری جو کیفیت تھی وہ میں نے اشعار میں بتائی ہے۔

کعبہ ہے میرے پیش نظر — سبحان اللہ سبحان اللہ
ہے کتنا حسین اللہ کا گھر — سبحان اللہ سبحان اللہ
پرنور یہاں کے سب دن ہیں — پرکیف یہاں کی ہیں راتیں
کیا خوب یہاں کی شام وسحر — سبحان اللہ سبحان اللہ
پر نور یہاں کے مینارے — فردوس بریں کے ہیں تارے
ہے خلد سے بہتر ہر پتھر — سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ رکن یمانی کی برکت — یہ حجر اسود کی عظمت
جنت سے بڑھ کر یہ منظر — سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ مقام ابراہیم بھی ہے — یہ صفا مروہ و حطیم بھی ہے
زمزم میں رواں حوض کوثر — سبحان اللہ سبحان اللہ
ہے کتنا خدا کا مجھ پہ کرم — ہیں محو طواف کعبہ قدم
اور لب ہیں ذکر خدا سے تر — سبحان اللہ سبحان اللہ
عرفات میں پھر ہم جا پہنچے — احرام بدن پہ باندھے ہوئے
لبیک کا نعرہ ہے لب پر — سبحان اللہ سبحان اللہ
سرکار مدینہ کا صدقہ — حج سب کا کر مقبول خدا
محروم نہ جائے کوئی بشر — سبحان اللہ سبحان اللہ
سب تیرا کرم ہے اے مولا — کہاں حرم کعبہ کا سجدہ
کہاں طیبؔ مجرم کا یہ سر — سبحان اللہ سبحان اللہ

[216] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مشرکین جاہلیت دوران حج جمرات کے قریب جمع ہو کر اپنے اپنے قبائل کے مفاخر بیان کرتے تھے کوئی کہتا ہمارے دادا نے یہ کارنامہ کیا کوئی کہتا میرے باپ نے یہ کمال کیا۔اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت اتاری (تفسیر ابن ابی حاتم جلد دوم صفحہ ۳۵۵ حدیث ۱۸۷۰ مطبوعہ مکہ مکرمہ) یعنی اللہ نے فرمایا:''مومنو جب تم ارکان حج ادا کرو تو اللہ کا ذکر کرو جیسے پہلے اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر زیادہ زور شور سے اللہ کا ذکر کرو۔''

ذکر بالجہر کی فضیلت:

كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ سے معلوم ہوا بلند آواز سے اللہ کا ذکر اللہ کو محبوب ہے۔ مشرکین اپنے آباء کا زور وشور سے ذکر کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے زیادہ زور وشور سے ذکر اللہ کا حکم دیا۔ مساجد میں نماز کے بعد کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کے بلند آواز سے پڑھے جانے پر بعض لوگ معترض ہیں مگر ان کا اعتراض حدیث کے خلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: اِنَّ رَفْعَ الصَّوْتِ بِالذِّكْرِ حِيْنَ يَنْصَرِفُ النَّاسُ مِنَ الْمَكْتُوْبَةِ كَانَ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ "فرض نماز کے اختتام پر بلند آواز سے ذکر، عہد رسول ﷺ میں مروج تھا۔" حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مجھے حضور ﷺ کے نماز فرض کے اختتام کا ایسے ہی پتہ چلتا تھا کہ لوگ بلند آواز سے ذکر کرتے تھے۔

(بخاری کتاب الاذان باب ۱۵۵ حدیث ۸۴۱، مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الذکر بعد الصلوٰۃ حدیث ۱۲۰، سنن ابی داود کتاب الصلوٰۃ باب ۱۸۵، مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۳۶۷)

نسبی تفاخر کا رد:

كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ سے اس چیز کا رد مقصود ہے جو اہل عرب حج کے بعد اپنے باپ دادا کے مفاخر بیان کرتے تھے۔ اسلام ایسی جاہلانہ مفاخرت کا رد کرتا ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (حجرات، ۱۳)

[217] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اہل عرب عرفات میں یوں دعائیں کرتے تھے اے اللہ! یہ برسات کا سال ہو، یہ مالی فراوانی کا سال ہو، یہ ولادت کا سال ہو (بچے ہوں) مگر آخرت کا کوئی سوال نہ کرتے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: وہ مشعر حرام میں یوں دعا کرتے کہ کوئی کہتا مجھے اونٹ چاہیے، کوئی کہتا مجھے بکریاں چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا کہ صرف دنیا مانگنے والوں کو دنیا ہی ملتی ہے۔ وہ آخرت سے محروم رہتے ہیں اور جو آخرت مانگیں انہیں دنیا بھی مل جاتی ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا

اور ان میں سے کچھ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں

عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

عذاب جہنم سے بچا۔ [218] یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ان کے (نیک) عمل کا حصہ (ثواب) ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ

اور چند مقرر دنوں میں اللہ کا ذکر کرو [219] تو جو دو دنوں میں جلدی (حج سے واپس) چلا جائے اس پر کوئی

عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

گناہ نہیں اور جو دیر کرے اس پر (بھی) کوئی گناہ نہیں (یہ خوشخبری) ڈرنے والے کیلئے ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم

اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

اسی کی طرف اٹھائے جاؤ گے۔ [220]

[218] یعنی کفار تو صرف دنیا مانگتے ہیں جبکہ مومنین کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں بھلائی یہ ہے: دین پر استقامت، اخلاق صالحہ، علم دین، نیک بیوی، صالح اولاد اور رزق حلال وغیرہ اور آخرت کی بھلائی میں اچھی موت، قبر کی فراخی، حساب میں آسانی اور شفاعت رسول ﷺ شامل ہیں۔ الغرض یہ بہت جامع دعا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور ﷺ اکثر یہ دعا مانگتے تھے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ (بخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی کہ ایک آدمی سخت لاغر تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا کیا تم کوئی دعا کرتے ہو؟ کہا میں دعا کرتا ہوں یا اللہ مجھے تو نے جو سزا دینی ہے دنیا ہی میں دیدے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ تم میں اس کی طاقت کہاں؟ تم یوں دعا کرو: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ (مسلم، کتاب الذکر) آگے اللہ تعالیٰ نے یہ دعا کرنے والوں کے لیے فرمایا کہ ان لوگوں کو ان کے عمل کا حصہ ثواب ضرور ملے گا۔

آخر میں فرمایا گیا اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ یعنی موت قریب ہے اور جلدی حساب ہوگا۔ یا یہ معنی ہے کہ اللہ قیامت میں ساری دنیا کا حساب بہت جلد لے گا۔ حدیث طیبہ میں ہے "بکری کا دودھ دوھنے کے وقفہ میں سب کا حساب

ہو جائے گا۔'' (قرطبی)

[219] اس سے ۹ ذی الحجہ سے لے کر تیرہ ذی الحجہ تک پانچ دن مراد ہیں۔ اور ان میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی ذکر کی کئی صورتیں ہیں۔

اول۔ یہ ہے کہ نوں ذی الحجہ کو حجاج میدان عرفات میں دعا و استغفار کرتے ہیں۔ یعنی سارا یوم عرفہ ذکر خداوندی کا نام ہے۔ اس دن جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ اس قدر ہیں کہ ان پہ مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔

دوم۔ حجاج کرام دس ذی الحجہ کی فجر کو مزدلفہ میں دعا و استغفار اور دن کو قربانیاں کرتے اور ان پر اللہ کا ذکر بلند کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ نے فرمایا:

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ''اور قربانی کے جانوروں کو ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیاں بنایا ہے، تمہارے لیے ان میں خیر ہے تو ان کو کھڑا کر کے ان پہ اللہ کا نام لو۔'' (حج، ۳۶)

سوم۔ پھر دس سے بارہ تک تین دن جمرات کو کنکریاں مارتے ہوئے ہر کنکری پر تکبیر بلند کی جاتی ہے اور اس کے بعد دعا کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تیرہ ذی الحجہ کو بھی کنکریاں مارنے کا امکان ہے جیسا کہ اگلے الفاظ وضاحت کر رہے ہیں۔

چہارم۔ اس کے علاوہ نو ذی الحجہ کی نماز فجر سے تیرہ ذی الحجہ کی نماز عصر تک ہر نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیرات تشریق پڑھی جاتی ہیں اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔ تو یہ ان چند مقرر دنوں میں ذکر اللہ کے خصوصی طریقے ہیں۔ ان سب کا بجا لانا اس آیت کے مفہوم میں شامل ہے۔

یاد رہے کہ ہر عاقل بالغ مقیم مسلمان مرد پہ نماز باجماعت کے بعد تکبیرات تشریق کا پڑھنا واجب ہے۔ گویا بچوں، عورتوں اور مسافروں پہ ان کا پڑھنا واجب نہیں اور یہ وجوب نو ذی الحجہ کی نماز فجر سے لیکر تیرہ ذی الحجہ کی عصر تک ہے۔ معلوم ہوا بعض مبارک اوقات میں ذکر اللہ کا زیادہ ثواب ہے اس لیے اس کا خصوصی حکم ہے۔

[220] یعنی جو حاجی گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو منیٰ میں جمرات کو کنکریاں مار کر رات کو مکہ چلا جائے تو یہ جلدی کرنا بھی جائز ہے اور جو حاجی دیر کرے، یوں کہ رات منیٰ ہی میں گزارے حتیٰ کہ تیرہویں کی فجر اسے یہیں آجائے تو اب اس پر تیرہویں تاریخ کو زوال کے بعد کنکریاں مارنا ضروری ہے تو یہ دیر کرنا بھی جائز ہے اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ دراصل جاہلیت میں کفار کے مابین جھگڑا رہتا تھا کوئی کہتا بارہ تاریخ کو منیٰ سے چلے جانا گناہ ہے۔ دوسرا کہتا یہاں تیرہ تاریخ تک رکنا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان دونوں کا رد کیا۔

کیا رمی جمرات، قربانی اور حلق کے درمیان ترتیب واجب ہے؟

سنت یہ ہے کہ حاجی یوم نحر یعنی دس ذی الحجہ کے دن جو مناسک حج ادا کرتا ہے ان میں ترتیب ملحوظ رکھے۔ لہٰذا پہلے

رمی جمار کرے، پھر قربانی کرے اس کے بعد سر منڈوا کر احرام کھولے لیکن اگر کسی نے ان مناسک میں اس ترتیب کو ملحوظ نہ رکھا بلکہ اس میں تقدیم وتاخیر کردی مثلاً پہلے حلق کرلیا پھر کنکریاں ماریں یا قربانی کی یا پہلے قربانی کردی پھر کنکریاں ماریں تو کیا اس پہ دم واجب ہوگا۔

اس بارہ میں فقہاء کا اختلاف ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رمی، ذبح اور حلق کے درمیان ترتیب سنت ہے واجب نہیں لہٰذا اس ترتیب کے بدلنے والے پہ دم واجب نہیں ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارہ میں مختلف اقوال ہیں، مشہور قول ان کا بھی یہی ہے کہ دم واجب نہیں ہے۔

اور احناف میں سے صاحبین کا بھی اس بارہ میں یہی موقف ہے کہ دم واجب نہیں ہے جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ترتیب واجب ہے اور اس کے بدلنے والے پہ دم لازم ہے۔

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی یہ دلیل ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: من قدم نسكاً علی نسك فعليه دم ،جس نے کسی رکن حج کو دوسرے رکن پہ مقدم کیا اس پہ دم لازم ہے۔ (ابن ابی شیبہ)

جب کہ صاحبین اور دیگر فقہاء ان کثیر احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو کتبِ صحاح میں مذکور ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یوم نحر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو بھی پوچھا جاتا آپ یہی کہتے: لَا حَرَجَ کہ کوئی حرج نہیں۔ ایک شخص نے پوچھا میں نے ذبح سے قبل حلق کردیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، اب ذبح کرلو ،ایک نے کہا میں نے شام کے بعد رمی کی ہے۔ (یعنی حلق کے بعد رمی کی ہے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کو حرج نہیں۔
(بخاری کتاب الحج حدیث ۱۷۳۵، مسلم کتاب الحج حدیث ۳۰۶۰)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وقوف فرمایا: لوگ آپ سے پوچھنے لگے۔ ایک شخص نے کہا مجھے پتہ نہ چلا میں نے ذبح سے قبل حلق کردیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کوئی حرج نہیں، اب ذبح کرلو۔ دوسرا شخص آیا اس نے کہا میں نے ذبح سے قبل رمی کردی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ جس بھی شخص نے تقدیم وتاخیر کے بارے میں کوئی بھی سوال کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی جواب دیا کہ کوئی حرج نہیں۔
(بخاری کتاب الحج حدیث ۱۶۱۷، مسلم کتاب الحج ۳۰۹۵)

ایسی احادیث کتب صحاح میں کثیر ہیں ،فقہاء احناف کی طرف سے ان احادیث کی یہ تاویل کی جاتی ہے کہ لَا حَرَجَ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اخروی گناہ کی نفی کی ہے، یعنی جس نے بھول کر کوئی تقدیم وتاخیر کردی اس پہ کوئی گناہ نہیں جبکہ دیگر فقہاء سختی سے اس تاویل کی تردید کرتے ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم میں اس پہ مفصل کلام کیا ہے ،اور اس میں کوئی شک نہیں کہ لاحرج والی احادیث اپنی کثرت اور صحت میں قول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہیں قوی تر وصحیح تر ہیں۔ البتہ ممکن ہے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک یہ احادیث معتبر طریق سے نہ پہنچی ہوں، اس لیے انہوں نے ان کو حجت نہ بنایا اور مناسک میں ترتیب کے بدلنے پہ دم واجب کیا اور آج فقہ حنفی میں اس ترتیب کے بدلنے پر دم کے وجوب

ہی کا فتویٰ دیا جاتا ہے۔

مگر آج حج میں اس قدر ازدحام ہوگیا ہے کہ اس ترتیب کی رعایت بہت مشکل ہوگئی ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک دولاکھ افراد حج کرتے تھے آج حجاج کی تعداد چالیس لاکھ سے بڑھ گئی ہے اور رمی اور ذبح کے مقامات میں بہت دوری آ گئی ہے اور اس ترتیب کی رعایت اگر ہر شخص پہ لازم کردی جائے تو شدید مشکلات پیدا ہوجائیں گی پہلے چالیس لاکھ آدمی قربانی سے فارغ ہوں پھر رمی شروع کریں تو اس کی پابندی عملاً مشکل ہے اس لیے آج بہتر یہی ہے کہ قول صاحبین کے مطابق فتویٰ دیا جائے۔ مجمع الفقہ الاسلامی الھند نے اس بارہ میں کثیر علماء کی متعدد مجالس کے بعد جو متفقہ فیصلہ دیا وہ یہ ہے:

''حنفیہ کے قول راجح کے مطابق ۱۰ ذی الحجہ کے مناسک میں رمی، ذبح اور حلق کو ترتیب کے ساتھ انجام دینا واجب ہے اور صاحبین اور اکثر فقہاء کے یہاں مسنون ہے جس کی خلاف ورزی سے دم واجب نہیں ہے ،حجاج کو چاہیے کہ جہاں تک ہوسکے ترتیب کی رعایت ملحوظ رکھیں۔ تاہم ازدحام اور موسم کی شدت اور مذبح کی دوری وغیرہ سے صاحبین اور دیگر ائمہ کے قول پہ عمل کرنے کی گنجائش ہے لہٰذا اگر یہ مناسک ترتیب کے خلاف ہوں تو بھی دم واجب نہیں ہوگا''۔ (اہم فقہی فیصلے صفحہ ۱۱۴ مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا

لوگوں میں سے کوئی وہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں اس کا قول تمہیں تعجب میں ڈالتا ہے اور وہ اللہ کو اپنے دل کی بات پر

فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا

گواہ بناتا ہے حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔ [221] اور جب وہ بااختیار ہوتو زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتا

وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ

اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرتا ہے اور اللہ فساد کو پسند نہیں رکھتا۔ [222] اور جب اسے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو

اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶

تو اسے (جھوٹی) عزت گناہ پر روک لیتی ہے تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے [223]

ایک منافق اور ایک مومن کے کردار کا باہمی تقابل

[221] یہ آیت ایک منافق اخنس بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی وہ بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوکر بڑی

محبت ظاہر کرتا۔ کہتا میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں آپ کا سچا عاشق اور خادم ہوں حالانکہ وہ جھوٹ کہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ عزوجل نے اس کے رد میں فرمایا کہ اے مومنو! تمہیں اس منافق اور ایسے ہی دوسرے منافقین کی میٹھی باتیں دھوکہ میں نہ ڈالیں، وہ سخت جھگڑالو آدمی ہے۔ (ابن جریر) یعنی اس کے دل میں اسلام سے سخت نفرت ہے۔

منافقت کی برائی:

اس آیت میں ایسے شخص کی برائی بیان کی گئی جو زبان کا میٹھا اور دل کا منافق ہے۔ آج ہم اپنے گردوپیش میں ایسے لوگ بہت دیکھتے ہیں جو اپنے مفاد کے لیے بہت میٹھے بنتے اور بڑی تعریفیں کرتے ہیں اور مفاد نکل جانے کے بعد آنکھ ملانا بھی پسند نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کا حال اخنس بن قیس جیسے منافقین مدینہ سے مختلف نہیں ہے۔ جبکہ مومن کی ایک زبان اور ایک چہرہ ہوتا ہے۔ محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو یہ وحی فرمائی: کچھ لوگوں کی زبانیں شہد سے میٹھی ہوتی ہیں اور دل صبر سے کڑوے، وہ بھیڑوں کی نرم کھالیں پہنتے ہیں (بہت نرم خو نظر آتے ہیں) مگر دین کو دنیا کے بدلے بیچ ڈالتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا وہ میرے اوپر جرأت کرتے ہیں اور میرے بارہ میں مغرور ہیں؟ مجھے میری عزت کی قسم میں ان پہ ایسا فتنہ بھیجوں گا جو انکے بردبار شخص کو بھی حیران کر دے گا۔

(درمنثور بروایت بیہقی فی شعب الایمان، وابن جریر)

عمل سے خالی دعویٰ محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذمت:

اخنس بن قیس بظاہر محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوے کرتا تھا مگر اس کا عمل اس کے خلاف تھا۔ آج ہماری حالت بھی اس سے مشابہ ہے۔ ہم محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں کہ غلامی رسول میں موت بھی قبول ہے، مگر کیا محبت رسول میں نماز بھی قبول ہے، کیا غلامی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حرام مال سے بچنا بھی قبول ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے، تو یہ کیسی محبت ہے۔

[222] حضرت مقاتل سے روایت ہے کہ اخنس بن قیس طائف گیا۔ اس نے ایک شخص سے قرض واپس لینا تھا اس نے اس کی کٹی ہوئی فصل کے ڈھیر جلا دیئے اور اس کے بعض جانوروں کے پاؤں کاٹ دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کرتوت کی طرف اشارہ کیا کہ وہ زبان کا تو بہت میٹھا ہے مگر کردار کا اس قدر کڑوا ہے کہ اگر اسے اختیار مل جائے تو زمین میں فساد برپا کرنے اور کھیتی اور نسل یعنی جانوروں کو ہلاک کرنے سے باز نہیں آتا اور اللہ عزوجل کو ایسے فسادی لوگ ہرگز پسند نہیں۔ (ابن جریر)

اس میں ان حکمرانوں کے لیے درس ہے جو بہت میٹھے سیاسی نعروں سے اقتدار پر قبضہ کرتے ہیں پھر جب انہیں اختیار ملتا ہے تو لوگوں کی املاک اور جانوں کے ہلاک کرنے میں باک نہیں رکھتے۔

[223] یعنی جب منافق شخص کو ایسی ظالمانہ کارروائیوں پر متنبہ کیا جائے تو وہ اچھا اثر لینے اور باز آنے کی بجائے کہتا ہے

جاؤ اپنا کام کرو۔ میں جو کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں اور یوں وہ اپنے گناہ پر اڑ جاتا ہے۔ ایسے شخص کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے بھائی سے کہے اللہ سے ڈرو اور وہ کہے جاؤ تم اپنا کام کرو۔ (درمنثور)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ

اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کو اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر

بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا

مہربان ہے۔ [224] اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر

خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا

مت چلو بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ [225] پھر اگر تم پھسل گئے اس کے بعد کہ تمہارے پاس واضح

جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ

نشانیاں آ گئیں تو جان لو کہ اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ وہ کس چیز کے منتظر ہیں سوا اس کے کہ

اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى

اللہ (کا عذاب) سایہ دار بادلوں کی صورت میں ان پر آ پہنچے اور فرشتے اتر آئیں اور کام پورا ہو جائے اور اللہ

اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع

ہی کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔ [226]

ع ۲۵ / ۹

[224] منافقین کا حال بیان کرنے کے بعد اب مخلص مومنین کا تذکرہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلیے جان کی بازی تک لگا دیتے ہیں۔ مروی ہے کہ یہ آیت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری۔ انہوں نے شب ہجرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر اطہر پر لیٹ کر جان کی بازی لگائی کیونکہ کفار مکہ نے خانۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد خون آشام تلواریں اٹھائے محاصرہ کر رکھا تھا۔ ایسے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سونا جان کی بازی لگانے کے برابر تھا۔ اس میں ہمارے لیے یہ درس ہے کہ اسلام کا فلسفہ زندگی نام خدا پر سب کچھ لٹانا ہے اور مفاد پرستی اخنس بن قیس جیسے منافقوں کا کام ہے۔

[225] حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کا شان نزول یہ مروی ہے کہ بعض لوگ یہودیت چھوڑ کر اسلام لائے جیسے

اسد بن کعب، اسید بن کعب اور قیس بن سعد رضی اللہ عنہم، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم یہودیت میں ہفتہ کو مقدس دن سمجھ کر عبادت کرتے تھے۔ آپ ہمیں اس دن کے منانے (اس دن چھٹی کر کے عبادت کرنے) کی اجازت دیں اور یہ بھی کہ ہم دن کو قرآن اور رات کو تورات پڑھ لیا کریں۔ تب یہ آیت اتری۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۵۷۹)

یعنی اللہ عزوجل نے فرمایا۔ اے مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور کفار سے مشابہت رکھنے والی کوئی چیز نہ اپناؤ۔ یہ شیطان کی پیروی ہے۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ سِلْمِ اور اسلام دونوں کا معنی سلامتی ہے۔ لہٰذا سِلْمِ بمعنی اسلام لیا جاتا ہے۔ اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا یہ معنی ہے کہ ہمارا عقیدہ، عمل، اخلاق، صورت، سیرت، خلوت، وجلوت اور معیشت و معاشرت سب کچھ اسلام کے رنگ میں ڈھل جائے۔ جب اسلام میں کوئی کمی ہی نہیں تو غیروں سے کوئی چیز مستعار لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

مسلمانوں کو کوئی غیر اسلامی رسم نہیں اپنانی چاہیے:

صحابہ کرام علیہم الرضوان کو تورات کے پڑھنے اور ہفتہ کے دن میں خصوصی عبادت سے روک دیا گیا کہ یہ یہودی طریقے ہیں۔ آج ہم مسلمانوں نے کفار والی شکلیں اپنالی ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان میں اکثر غیر اسلامی قوانین رائج ہیں، ہم شادی بیاہوں پر ہندوؤں کی طرح ناچ گانے اور برتھ ڈے پر انگریزوں کے طریقے اور دیگر غیر اسلامی رسمیں اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن کے صرف نام مسلمانوں والے ہیں۔ یہاں برطانیہ میں ایسے مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے اللہ ہمیں ہدایت دے۔

اسلام کامل ضابطۂ حیات ہے:

صحابہ کرام علیہم الرضوان نے تورات کی تلاوت کرنا چاہی تو یہ آیت اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً اتری۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلام مکمل ضابطہ زندگی ہے۔ اس میں کسی چیز کی کمی نہیں اور قرآن کی موجودگی میں کسی الہامی کتاب کی حاجت نہیں۔ ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے تورات کا کوئی ورقہ پڑھنا شروع کر دیا۔ حضور ﷺ سخت غضبناک ہوئے اور فرمایا اللہ کی قسم اگر موسیٰ علیہ السلام آج تم میں زندہ ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کرو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ (مسند احمد بن حنبل)

[226] یعنی جب کفار پر ہدایت کی نشانیاں خوب واضح ہو گئی ہیں تو اس کے باوجود وہ ایمان کیوں نہیں لاتے وہ کس چیز کے انتظار میں ہیں سوا اس کے کہ ان پر موت آ جائے اور اللہ کا عذاب سیاہ بادل کی طرح انہیں ہر طرف سے گھیر لے اور موت کے فرشتے اتر آئیں اور کام تمام ہو جائے اور ہر کام کی انتہاء اللہ کی طرف سے یعنی وہی ہر چیز کا کارساز حقیقی ہے جب تم اس کے حضور پیش ہو گے تو وہاں تمہیں کوئی اس کے حکم سے بچا نہ سکے گا۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ

بنی اسرائیل سے پوچھیے ہم نے انہیں کتنی ہی واضح نشانیاں دیں، اور جو اللہ کی نعمت بدل دے

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا

بعد ازاں کہ وہ اس کے پاس آجائے تو بے شک اللہ سخت عذاب والا (بھی) ہے۔[227] کفار کے لئے دنیوی زندگی

الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ

آراستہ کی گئی ہے اور وہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ

یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

روزِ قیامت ان سے اعلیٰ درجہ میں ہوں گے اور اللہ جسے چاہے بے حساب عطا فرماتا ہے۔[228]

وقف لازم

یہود و نصاریٰ کی اعتقادی خرابیاں

[227] قرآن میں لفظ بنی اسرائیل سے عموماً یہود مراد ہوتے ہیں۔ مگر نصاریٰ بھی معنوی لحاظ سے اس لفظ میں داخل ہیں اور ان کی اعتقادی خرابیاں بھی یہود ہی جیسی ہیں۔ اس لیے یہاں دونوں کو مراد لیا جا سکتا ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے ہم نے ان لوگوں کو بہت سی واضح نشانیاں دیں یعنی تورات و انجیل میں واضح آیات رکھیں جو حضور ﷺ کے بارہ میں صریح پیش گوئیاں کرتی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے جان بوجھ کر انہیں بدل دیا اور جو اللہ کی نعمتیں بدل دے اس کے لیے اللہ کا عذاب سخت ہے۔ نعمت کا بدلنا یہ بھی ہے کہ اللہ کی نعمتوں کے بدلے کفر اور نافرمانی کی جائے، مومن بھی اگر اللہ کی نعمتوں کے بدلے نافرمانی کرتا ہے تو وہ بھی اس وعید کا مستحق ہے۔

[228] کفار کے لیے دنیوی زندگی آراستہ کی گئی ہے کیونکہ ان کے لیے آخرت میں سے کچھ حصہ نہیں ہے۔ وہ ایمان والوں کی غربت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ دراصل مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اکثر فقراء تھے اور انصار مدینہ کی اکثریت بھی متوسط طبقہ سے تھی جبکہ مدینہ طیبہ کے یہود مال و دولت میں ان سے بہت آگے تھے۔ وہ مسلمانوں کی مالی کمزوری پر ہنستے تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا آج جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے اور وہ دامن رسول سے وابستہ ہوگئے ہیں وہ روز قیامت ان مالدار کافروں سے بہت بلند ہوں گے۔ (آج بھی مسلمان ممالک کی اکثریت کفار کے مقابلہ میں غریب ہی ہے۔)

اللہ تعالیٰ کے بے حساب دینے کے معانی

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ جسے چاہے بے حساب دیتا ہے۔ اللہ کے بے حساب دینے کے کئی معانی ہیں:

اول: اللہ تعالیٰ سے کوئی حساب لینے والا نہیں کہ اس نے فلاں کو اتنا کیوں دیا اور فلاں کو کیوں نہیں دیا۔ اس کے سوا ہر کسی سے کوئی حساب لینے والا ہے۔

دوم: اللہ تعالیٰ گن کر نہیں دیتا بلکہ بے حساب دیتا ہے، گنتا وہ ہے جسے خزانے کے ختم ہونے کا ڈر ہو۔ اللہ کو یہ ڈر نہیں ہے۔

سوم: حساب بمعنی گمان بھی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴿۱۱۵﴾ کیا تمہارا گمان ہے کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ (مومنون، ۱۱۵) حساب کا معنی گمان بھی قرآن کریم میں آتا ہے، تو اللہ کے بے حساب دینے کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ اللہ بندے کو وہاں سے دیتا ہے کہ بندے کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ جیسے وہ فرماتا ہے وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ اللہ بندے کو یوں دیتا ہے کہ وہ گمان بھی نہیں کرسکتا۔ (طلاق، ۳)

کسی کمزور کا مذاق اڑانے کی برائی:

وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ سے معلوم ہوا کہ اپنے سے کمزور شخص کا مذاق اڑانا کفار کا طریقہ ہے کہ وہ مالی طور پر کمزور مسلمانوں کو دیکھ کر انکا مذاق اڑاتے تھے اور اللہ کو یہ بات بہت ناپسند ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کمزور لوگ زیادہ پسند ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مالی اور جسمانی طور پر تکلیف میں رکھا ہے۔ انہیں وہ آخرت میں بلند تر درجہ دے گا۔ وہ اس کے محبوب ہیں تو کسی غریب، اپاہج یا کمزور کا مزاق نہیں اڑانا چاہیے۔

اللہ کی تقسیم پر اعتراض نہیں:

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴿۲۱۲﴾ بغیر حساب سے یہ درس ملا کہ اللہ جس کو جتنا اور جو چاہے دے وہ بے نیاز اور دانا ہے ہم نیازمند اور نادان ہیں۔ واللہ یعلم و انتم لا تعلمون۔ اگر ہم اس کی تقسیم پر اعتراض کریں گے تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اسی لیے اللہ جس کو جتنا دے اس پہ حسد نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ بھی اللہ کی عطاء پہ اعتراض ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠

سب لوگ (پہلے) ایک ہی دین پر تھے (پھر کچھ گمراہ ہوئے) تو اللہ نے انبیاء بھیجے جو بشارت سنانے اور ڈرانے والے تھے [229]

وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ

اور ان کے ساتھ سچائی والی کتاب اتاری تا کہ اللہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف کرتے تھے

وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

اور کتاب میں انہی لوگوں نے اختلاف کیا جنہیں کتاب دی گئی بعد ازاں کہ ان کے پاس

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ

واضح نشانیاں آگئیں، باہمی سرکشی کے سبب [230] تو اللہ نے ایمان والوں کو اس سچائی کے بارے میں اپنے اذن سے ہدایت دی جس میں

بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾

پہلے لوگ اختلاف کرتے تھے اور اللہ جسے چاہے سیدھے راستہ کی ہدایت دیتا ہے۔[231]

[229] اس کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام سے نوح علیہ السلام تک پانچ صدیاں گزریں اور لوگ شریعت حق پر تھے۔ (ابن ابی حاتم، ابن جریر)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ آدم ونوح علیہما السلام کے مابین دس صدیاں گزریں۔ (پانچ والی روایت زیادہ قوی ہے) جن میں لوگ حق پر تھے۔ پھر ان میں اختلاف ہو گیا یعنی بعض لوگ ایمان پہ قائم رہے اور بعض لوگ بت پرستی کرنے لگے۔ تب اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو بھیجا تو وہ پہلے پیغمبر ہیں جو (کفار کی) ہدایت کے لیے بھیجے گئے (مظہری)

سورہ نوح کے تحت بیان ہوگا کہ وَد، یعوق، نسر اور سواع وغیرہ نام کے بتوں کی پرستش کیسے شروع ہوئی اور لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے دین سے گمراہ ہو کر کیسے بت پرست بنے اور پھر نوح علیہ السلام کو بھیجا گیا۔

پھر حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا سب کفار ہلاک ہو گئے پھر نسل انسانی ازسرنو پھیلی، جو کچھ عرصہ ہدایت پر متحد رہی پھر ان میں اختلاف ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے پے در پے انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے جو مومنوں کو جنت کی بشارت اور کافروں کو دوزخ کا ڈر سناتے تھے۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جن میں سے تین سو پندرہ رسول ہیں۔ (مسند احمد عن ابی ذر جلد ۵ صفحہ ۱۷۸)

[230] یعنی جب لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور روز قیامت کے بارہ میں اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر کتابیں اتاریں اور بتایا کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کیا جائے اور آخرت پر ایمان رکھا جائے۔ (یہاں الکتاب سے جنس کتاب مراد ہے۔ خواہ کوئی کتاب ہو جیسے انبیاء کے صحائف اور تورات و انجیل وغیرہ) مگر جن لوگوں کو کتاب دی گئی یعنی جو لوگ اللہ کی کسی کتاب پر ایمان لائے وہی لوگ بعد میں اپنی کتاب کے اندر اختلاف کرنے لگے۔ مطلب یہ کہ بجائے اس کے وہ اس کتاب کو مضبوطی سے تھامتے اور اسے دوسروں تک پہنچاتے۔ انہوں نے اپنی ہی کتاب کے حصے بخرے کر دیئے۔

چنانچہ آج عیسائیوں میں بائبل کے بارہ میں ہزار ہا اختلافات ہیں کوئی فرقہ اس کے کسی حصہ کو مانتا ہے تو کوئی کسی حصے کو، ہر فرقے کی اپنی علیحدہ بائبل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ یعنی اے اہل کتاب تم نے تورات کے کئی حصے کر دیے ہیں، کچھ کو ظاہر کرتے ہو اور اکثر کو چھپاتے ہو۔ (انعام:۹۱) اور یہ اختلاف ان کی باہمی فرقہ بندی اور سرکشی کے سبب ہوا (اور ان میں یہ اختلاف اس قدر بڑھا کہ انہوں نے بعض انبیاء کی نبوت سے انکار کر دیا بلکہ اللہ کے بارہ میں الجھ گئے۔ آج عیسائیوں کا کوئی فرقہ کہتا ہے خدا تین ہیں باپ، بیٹا اور روح القدس، کوئی کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ میں حلول کیا ہے اور کوئی انہیں اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتا ہے)۔

[231] تب اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور نبی آخر الزمان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔ آپ پر قرآن اترا جس کے ذریعے اللہ نے ایمان والوں کو ان امور کے بارے میں ہدایت دی جن میں اہل کتاب اختلاف کر رہے تھے۔ مثلاً یہود نے کہا عزیر (علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے۔ نصاریٰ نے کہا عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے تو اللہ نے قرآن کے ذریعہ بتایا کہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ یونہی یہود حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودی اور عیسائی انہیں عیسائی کہتے تھے۔ قرآن نے بتایا کہ دونوں غلط کہتے ہیں۔ وہ تو ہر باطل سے جدا اور مسلم تھے۔ (آل عمران، ۶۷) اسی طرح یہود عیسیٰ علیہ السلام کو گالی دیتے ہیں کہ ان کا کوئی باپ نہیں اور نصاریٰ انہیں اللہ کا بیٹا سمجھتے ہیں، تو قرآن نے ان پہ حقیقت حال کو واضح فرمایا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے باہمی اختلافات کے بارہ میں مسلمانوں پہ راہ حق واضح فرمائی۔

اسی طرح دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں اہل کتاب کی جو گمراہیاں ہیں ان کے بارہ میں اہل ایمان کو ہدایت دی گئی، جیسے تورات میں یہود و نصاریٰ کی جو گمراہیاں ہیں اس بارہ میں مسلمانوں کو راہ ہدایت دی گئی۔

جیسے بائبل کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام ایک جادوگر تھے۔ آج یہود اسماعیل علیہ السلام کو نبی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، پھر عیسائیوں میں سے کسی نے کہا کہ اللہ ہی مسیح بن کر دنیا میں آ گیا۔ کسی نے کہا کہ اللہ نے اپنے بیٹے مسیح کو دنیا میں بھیجا تاکہ لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن کر سولی پہ چڑھ جائے، تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اہل ایمان کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے، اس نے کسی کو نہیں جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے بلکہ اللہ کی مثل کوئی بن ہی نہیں سکتا۔

دلیل ختم نبوت

یہ آیت ختم نبوت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے گزشتہ امم کے بعد اس امت یعنی اہل ایمان کا ذکر کیا مگر اس کے بعد کسی امت کا ذکر نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ اس امت کو دی جانے والی ہدایت کو مکمل اور آخری ہدایت کے طور پر پیش فرما رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ امت آخری امت ہے اور اس کو ملنے والی ہدایت آخری ہدایت ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس ہدایت کا لانے والا نبی سب سے آخری نبی ہے۔

اسی لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

نحن الاولون الآخرون الاولون یوم القیامة واول الناس دخولا الجنة بید انهم اوتوا الکتاب قبلنا واوتیناه من بعدهم فهدانا الله لما اختلفوا فیه من الحق۔ ''ہم پہلے اور آخری لوگ ہیں، روز قیامت ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہونگے اگرچہ گزشتہ لوگوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہمیں ان کے بعد کتاب دی گئی اور جن معاملات میں وہ اختلاف کرتے تھے اللہ نے ان میں ہماری راہنمائی فرمائی۔

(در منثور بحوالہ ابن جریر، ابن منذر ابن ابی حاتم وغیرہم جلد اول صفحہ ۵۸۳)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

کیا تم گمان رکھتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر ویسے مصائب نہیں آئے جیسے تم سے

قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ

پہلوں پر آئے، انہیں مصیبت اور تکلیف آئی اور وہ دہلا دیئے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

مؤمن ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ رہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔ [232]

اہل ایمان کو صبر اور جہاد کی تلقین

[232] اس سے قبل یہود و نصاریٰ کی اعتقادی خرابیاں بتائی جا رہی تھیں۔ ان میں یہ بھی تھی کہ وہ محض یہودی یا عیسائی ہونے ہی کو حصول جنت کی ضمانت قرار دیتے تھے۔ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (بقرہ:۱۱۱) اب مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ صرف مسلمان کہلانے سے تم جنت میں چلے جاؤ گے اور تمہاری آزمائش نہ ہوگی۔ ابھی تم پر وہ مصائب نہیں آئے جو پہلے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے مخلص ساتھیوں پر آئے تھے۔

انہیں اس قدر مصائب دیکھنا پڑے کہ وہ پکار اٹھے اللہ کی مدد کب آئے گی۔ تو سن لیجئے کہ اللہ کی مدد ایمان والوں سے قریب ہے۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تم سے پہلے لوگوں میں سے کسی کو زمین میں گڑھا کھود کر اس میں کھڑا کیا جاتا پھر اس کے سر پہ آرا رکھ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے مگر یہ چیز اس کو اس کے دین سے برگشتہ نہ کر سکتی اور ان میں سے کسی کے جسموں کو لوہے کی کنگھیوں سے نوچا گیا اور وہ کنگھی اس کی ہڈیوں تک جا پہنچی مگر اس کے قدم دین سے نہ ڈگمگائے۔'' (بخاری کتاب احادیث الانبیاء) قرآن میں اس کی مثال اصحاب الاخدود (سورہ بروج، ۴) کے واقعہ میں ملتی ہے جو اہل ایمان کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک دیتے تھے مگر اہل ایمان آگ میں جل کر بھی توحید کا نعرہ بلند کرتے رہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کے بقول یہ آیت غزوہ خندق کے موقع پر اتری جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عظیم امتحان میں مبتلا ہوئے (ابن جریر) یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کا حوصلہ بڑھایا اور صبر و استقامت کی تلقین فرمائی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین استقامت کا پہاڑ بن گئے۔ بڑی سے بڑی آزمائش ان کے قدم نہ ہلا سکی۔ پہلے لوگوں کے لیے کہا گیا وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ اور غزوہ خندق کے موقع پر صحابہ کے لیے کہا گیا: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾ (احزاب:۱۱)

حصول جنت کے لیے تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ سے پتہ چلا جنت کے لیے تکالیف اٹھانا پڑتی ہیں۔ نماز کے لیے نیند قربان کرنا نفس کے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ جھوٹ غیبت سے رکنا بہت مشکل ہے۔ حرام مال آسانی سے دستیاب ہو تو اس کا چھوڑنا بہت تکلیف دہ ہے مگر جنت حاصل کرنے کے لیے ان تکالیف کو اٹھانا ہی پڑے گا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جہاد سے ہم گھبراتے ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کو کفار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے میں اپنی کرسیوں سے دستبرداری کا خطرہ ہے۔ بلکہ جان کا ڈر ہے مگر آخرت سنوارنے کے لیے تکلیف اٹھانا پڑے گی اور جہاد کے لیے کمربستہ ہونا پڑے گا۔ یہ آیات جہاد ہی کے بارہ میں اتری ہیں۔ جیسا کہ اگلی آیت بتا رہی ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں نے دین کے لیے عملی جدوجہد کی:

وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ سے پتہ چلا دین صرف دعاؤں سے

غالب نہیں آتا۔اس کے لیے عملی جدوجہد لازم ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ﴿۱۴۲﴾ کیا تم سمجھتے ہو کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کی جانچ نہیں کی اور صبر کرنے والوں کو نہیں پرکھا؟ (آل عمران ۱۴۲)

دوسری جگہ ارشاد ہوا: اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ يُّتۡرَكُوۡۤا اَنۡ يَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَهُمۡ لَا يُفۡتَنُوۡنَ﴿۲﴾ کیا لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں صرف اسی بات پہ چھوڑ دیا جائے کہ وہ دعویٰ ایمان رکھتے ہیں اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی؟ (عنکبوت،۲)

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے میدان بدر میں اتر کر فتح کے لیے دعا کی کہ اے اللہ میں ایک چھوٹی سی جماعت لے کر آ گیا ہوں اگر یہ ہلاک ہوگئی تو قیامت تک تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔اگر حضور ﷺ چاہتے تو مسجد نبوی ہی میں غلبہ اسلام کی دعا کر دیتے تو اللہ آپ کی دعا قبول فرمالیتا، مگر آپ ﷺ امت کو سبق دے رہے ہیں کہ میری سنت یہ ہے کہ پہلے میدان میں اترو، پھر دعا کرو۔آج ہم یہ چاہتے ہیں کہ جہاد کے لیے ایک قدم نہ اٹھائیں بس دعاء ہی سے غلبہ مل جائے، ایسا نہیں ہوگا۔

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ
لوگ آپ سے پوچھتے ہیں وہ کیا خرچ کریں آپ فرمائیں تم جو بھلا مال خرچ کرو تو وہ والدین،
وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ
قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے اور تم جو بھلائی کرو
فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ﴿۲۱۵﴾
اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔[233]

[233] جب جنت میں جانے کے لیے تکالیف کا اٹھانا ضروری ہے تو اس سلسلہ میں مالی قربانی بھی لازم ہے۔لہٰذا اب مالی قربانی کی تلقین فرمائی جارہی ہے۔حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے پوچھا یارسول اللہ! ﷺ ہم اپنے مالوں میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ تب اللہ نے یہ آیت اتاری: يَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ؕ قُلۡ مَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ؕ وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ﴿۲۱۵﴾ (درمنثور جلد اول صفحہ ۵۸۵) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم جو بھی خرچ کرو وہ خیر یعنی مال حلال ہونا چاہیے اور اسے تم والدین، قریبی رشتہ داروں، یتامیٰ و مساکین اور مسافروں پر خرچ کرو۔

والدین اگر فقیر ہوں تو ان کی کفالت اولاد پر لازم ہے۔ یہی حکم قریبی رشتہ داروں کا ہے۔ بشرطیکہ اولاد کے پاس اپنے بیوی بچوں کے خرچہ سے زائد مال ہو (احکام القرآن للجصاص جلد اول صفحہ ۳۹۹) بلکہ والدین اور اقارب سے صلہ رحمی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی تنگدستی کے باوجود بقدر ہمت تنگدست والدین اور اقارب کی مدد کی جائے اس صورت میں یہ فرض نہیں نفل ہے۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰۤی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ
تم پر جہاد فرض کیا گیا اور وہ تمہیں ناگوار ہے اور قریب ہے کہ تم کوئی چیز ناگوار جانو اور وہ تمہارے لئے
خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ ؕ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ
بہتر ہو اور قریب ہے کہ تم کوئی چیز پسند رکھو اور وہ تمہارے لئے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم
لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ ع
نہیں جانتے۔[234]

ع ۲۶ / ۱۰

[234] جنت میں جانے کے لیے جب تکالیف کا اٹھانا ضروری ہے تو اس سلسلہ میں سب سے بڑی تکلیف اور آزمائش کی بات حکم جہاد ہے تو فرمایا کہ اے قیامت تک آنے والے مسلمانو تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے مگر یہ چیز تمہاری طبیعت پر گراں ہے کیونکہ اس میں جان جانے، اعضاء کٹنے، زخمی ہونے اور کفار کے ہاتھ میں قیدی بن جانے کا خطرہ ہے۔ مگر ہوسکتا ہے کہ جو چیز تمہیں طبعاً ناپسند ہو اسی میں تمہارا دینوی واخروی بھلا ہو۔ یعنی جہاد ہی میں تمہارا بھلا ہے۔ اگر تم جہاد سے منہ موڑو گے تو دوسری قومیں تم پر غالب آجائیں گی اور تمہارا خون بہنے لگے گا۔ آج مسلمانوں نے جہاد چھوڑ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ کشمیر، فلسطین، بوسینا، عراق اور افغانستان میں ان کے خون سے زمین سرخ ہو رہی ہے جس طرح موذی جانور سانپ بچھو وغیرہ کا مارنا ضروری ہے تاکہ انسانوں کی جانیں ضائع نہ ہوں۔ اسی طرح موذی انسانوں بلکہ انسان نما درندوں کا خاتمہ بھی ضروری ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد میں عظیم اجر وثواب رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ (توبہ ۱۱۱)

جہاد کا منکر کافر ہے:

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ کا حکم تا قیامت نافذ ہے جب تک قرآن موجود ہے یہ حکم بھی

نافذ ہے۔اب مرزا غلام احمد قادیانی کا کہنا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جہاد منسوخ کرنے کیلئے بھیجا ہے صریح کفر ہے۔مرزائی کہتے ہیں دفاعی جہاد کے ہم بھی قائل ہیں مگر یہ دھوکہ دہی ہے مرزا قادیانی نے جہاد سے مطلقاً انکار کیا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ اس نے دفاعی جہاد ہی سے انکار کیا ہے کیونکہ بیسویں صدی عیسوی میں مسلمان قوم اپنی مغلوبیت کے باعث صرف دفاعی جہاد ہی کرسکتی تھی مگر مرزا نے اس جہاد کو بھی مسلمانوں کے دلوں سے نکالنے کی پوری کوشش کی۔تا کہ قوم مسلم کفار کی مکمل غلام بن جائے۔

مفسر کے قلم سے جہاد کے بارہ میں ایک خوبصورت نظم

اسلام کے بقا کی علامت جہاد ہے — دین متیں کی عزت وحرمت جہاد ہے

غزوات میں حضور ﷺ کی گزری ہے زندگی — سردار دوجہان کی سنت جہاد ہے

ذلت میں ہم گرے ہیں ترک جہاد سے — راہ حصول شوکت وعزت جہاد ہے

رنگیں رداء ارض ہے از خون مسلماں — عزت سے زندہ رہنے کی صورت جہاد ہے

ہندو نہ باز آئیں گے ظلم وفجور سے — کردے جو ٹھیک ان کی طبیعت جہاد ہے

فلسطینیوں کے خوں کی حفاظت کے واسطے — ظالم یہودیوں کی مرمت جہاد ہے

معصوم لوگ مارنا دہشت گردی ہے یہ — اور ظالموں کو درس نصیحت جہاد ہے

اسلام کا پیام ہے امن وسلامتی — ہاں شر کے خاتمے کی ضرورت جہاد ہے

امریکہ کو بتادو نہ چھوڑیں گے ہم جہاد — طیبؔ مرے رسول کی سیرت جہاد ہے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ

لوگ آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی کے بارے میں پوچھتے ہیں [235] آپ فرمائیں اس میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کی

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ

راہ سے روکنا اور اس سے انکار اور مسجد حرام سے روکنا اور مسجد حرام کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے ہاں اس سے

عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى

بڑا گناہ ہے اور فتنہ گری قتل سے بھی بڑا گناہ ہے [236] اور کفار ہمیشہ تم سے جنگ کریں گے حتیٰ کہ

يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ

تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں اگر ان کا بس چلے، اور جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے

فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ

پھر کفر ہی پہ مر جائے تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہو گئے [237]

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾

اور وہ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

حرمت والے مہینوں میں لڑائی کا حکم

[235] جہاد کی بات جاری رکھتے ہوئے ایک سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (غزوہ بدر سے کچھ قبل) کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک جنگی مہم پر روانہ کیا۔ یہ لوگ ''مقام نخلہ'' پر پہنچے۔ وہاں انہیں قریش کا ایک قافلہ تجارت نظر آیا۔ اس وقت ماہ جمادی الثانی ختم اور رجب شروع ہو رہا تھا اور رجب ان چار مہینوں میں سے ہے جن میں کفار سے لڑائی شروع کرنا حرام ہے تاکہ عمرہ پر جانے والوں کے لیے راستہ پر امن رہے، کفار عرب بھی اس حرمت کا لحاظ رکھتے تھے۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا اس قافلہ کو کچھ نہ کہا جائے کیونکہ رجب میں لڑائی ممنوع ہے۔ دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا ابھی رجب شروع نہیں ہوا۔ انہوں نے قافلے پر حملہ کیا۔ ایک کافر عمرو بن

حضرمی مارا گیا اور بہت سا مال تجارت بطور غنیمت ہاتھ آیا اور دو کفار گرفتار ہوئے۔ یہ مسلمانوں اور کفار کے مابین ہونے والا پہلا مقتول تھا چنانچہ قریش کا وفد مکہ سے حضور ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا کہ حرمت والے مہینے میں لڑائی کیوں کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں اللہ نے یہ آیت اتاری: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ (درمنثور بحوالہ دلائل النبوۃ للبیہقی)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیارے رسول ﷺ کفار آپ سے ماہ حرمت میں لڑائی کے بارہ میں پوچھتے ہیں۔ انہیں یہ جواب دیا جائے کہ ہاں ماہ حرمت میں لڑائی گناہ ہے مگر اے مشرکو تم نے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکا، اللہ سے انکار کیا اور لوگوں کو مسجد حرام سے روکا اور صحابہ کرام کو جو مسجد حرام یعنی سرزمین حرم کے رہنے والے تھے، انہیں وہاں سے ہجرت پر مجبور کیا۔ کیا یہ باتیں گناہ نہیں ہیں؟ اور فتنہ یعنی کفر تو بڑے سے بڑے قتل سے بھی بدتر گناہ ہے۔ تم ان جرائم کا ارتکاب کرنے کے بعد ماہ حرام میں ایک قتل کے بارے میں پوچھنے چلے آئے ہو؟ یہ وہی بات ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک کوفی شخص نے حالت احرام میں مچھر کے مارنے کے بارہ میں پوچھا کہ اس کا کیا کفارہ ہے؟۔ آپ نے فرمایا اے کوفیو تم نواسۂ رسول ﷺ کو کربلا میں بیدردی سے شہید کرنے کے بعد مجھ سے ایک مچھر کے مارنے کا کفارہ پوچھ رہے ہو؟ (بخاری کتاب الادب باب ۱۸) یعنی کسی کی غلطی پکڑنے سے قبل انسان کو اپنے جرائم پر نظر کرنا چاہیے، کفار مکہ نے اپنے جرائم نہ دیکھے مگر بعض مسلمانوں کی ایک اجتہادی غلطی کے خلاف شور مچا دیا۔

[236] یاد رہے! ذی العقدہ، ذی الحج، محرم اور رجب ان چار ماہ میں دور ابراہیمی سے لڑائی کا آغاز کرنا حرام چلا آرہا ہے، ذی القعدہ، ذی الحج اور محرم میں اس لیے تا کہ راستے پرامن رہیں اور لوگوں کو دنیا کے کسی بھی خطہ سے حج کے لیے آنے میں دشواری پیش نہ آئے اور رجب کا مہینہ عمرہ کے لیے رکھا گیا اور اس میں لڑائی حرام کی گئی تا کہ سال میں ایک ماہ ایسا ہو جس میں لوگ بلا خوف وخطر عمرہ پہ جاسکیں۔ اہل جاہلیت بھی اس حرمت کا لحاظ رکھتے تھے۔ بلکہ روایات کے مطابق اگر انہیں ان مہینوں میں اپنے باپ کا قاتل نظر آجاتا تو وہ اس سے بھی تعرض نہ کرتے تا کہ لڑائی شروع نہ ہو، پھر اسلام آیا تو اس نے بھی ان چار مہینوں کا تقدس قائم رکھا اور فرمایا مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ یعنی "ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔" (توبہ،۳۶)

اور حق یہ ہے کہ ان مہینوں میں آج بھی دنیا کے کسی بھی خطہ میں کفار سے لڑائی کا آغاز کرنا حرام ہے کیونکہ دنیا کے جس بھی خطہ میں لڑائی چھڑ جائے تو اس علاقہ کے بری اور ہوائی راستے پرخطر ہو جاتے ہیں اور حج کے لیے نکلنا دشوار ہو سکتا ہے۔ بعض فقہاء کرام کے نزدیک یہ حرمت بعد میں منسوخ ہو گئی تھی مگر تحقیق یہ ہے کہ یہ حرمت اب بھی برقرار ہے، اس کی تفصیل سورہ توبہ آیت ۳۶ کے تحت آئے گی۔

نیت اچھی ہو تو خطاء معاف ہوسکتی ہے:

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حرمت والے مہینے میں قتال شروع کیا جو انکے لیے جائز نہ تھا مگر چونکہ اس سے دشمنانِ اسلام کو سبق سکھانا مقصود تھا تو اللہ نے ان پر پکڑ نہ فرمائی بلکہ کفار کا رد کیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی آنکھ کا شہتیر نہ دیکھنا طریقہ کفار ہے۔ کفار مکہ نے اپنے جرائم پر نظر نہ کی اور بعض مسلمانوں کی ایک اجتہادی غلطی پکڑ کر بیٹھ گئے۔ شر پسند لوگوں کا یہی طریقہ ہے۔ آج کئی لوگ اپنے عظیم جرائم سے صرف نظر کر کے علماء و مشائخ کی معمولی غلطیوں پر کیچڑ اچھالتے ہیں تا کہ علماء ان کے جرائم پر پکڑ نہ کریں۔ یہ شرمناک طرزِ عمل ہے۔

[237] یعنی کفار کو دراصل تم سے نہیں تمہارے دین سے اختلاف ہے۔ لہٰذا وہ تم سے ہمیشہ لڑائی جاری رکھیں گے جب تک تم اپنے دین سے پھر نہیں جاتے اور جو شخص اسلام لا کر اس سے پھر جائے اس کے تمام نیک اعمال دنیا و آخرت میں برباد ہوگئے۔ دنیا میں اس طرح کے مرتد کی سب نیکیاں ضائع ہیں۔ اگر اس نے حج کیا تھا تو وہ ساقط ہے اگر وہ دوبارہ اسلام لے آئے تو اس پر دوبارہ حج لازم ہے۔ اس کا نکاح ٹوٹ گیا اور وہ مومن رشتہ داروں کی میراث سے محروم ہوگیا، الا یہ کہ سچی توبہ کر کے دوبارہ اسلام لائے تو دوبارہ نکاح کرے اور آخرت میں اس طرح کہ ارتداد سے قبل والی کوئی نیکی اسے آخرت میں کام نہ آئے گی ایسے لوگ اگر توبہ نہ کریں تو ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ
بے شک جو لوگ ایمان لائیں اور اللہ کی راہ میں ہجرت و جہاد کریں تو یہ لوگ
يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾
رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ [238]

[238] آیت ۲۱۷ کے تحت بیان ہوا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ماہ رجب میں کفار مکہ کے ایک قافلہ تجارت سے لڑائی کی یہ ان کی غلطی تھی اللہ نے ان کا قصور معاف کر دیا۔ تب انہوں نے پوچھا کہ انہوں نے جہاد کے لیے جو سفر کیا اور تکالیف اٹھائیں کیا اس کا انہیں ثواب ملے گا؟ تب اللہ نے یہ آیت اتاری: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾ یعنی اللہ نے ایک عمومی ضابطہ بیان فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائیں اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کریں۔ تو ایسے لوگ ہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

فضیلت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم:

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ کے آئینہ میں خلفاء راشدین اور دیگر مہاجرین صحابہ

کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت ظاہر ہے اوران کے سردار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جن کا ایمان سب سے پہلے اور سب سے بھاری، ان کی ہجرت معیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اوران کا جہاد سب سے بے مثال وہ کسی غزوہ میں اللہ کے رسول سے پیچھے نہ رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں جنگوں میں اپنے قریب تر رکھتے تھے۔اسی طرح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے اسلام پر بہار آ گئی، پہلے چھپ کر نمازیں پڑھی جاتی تھیں اب اعلانیہ حرم میں آ کر نماز پڑھی جانے لگی یعنی دین کا وہ چراغ جو پہلے دار ارقم میں جل رہا تھا وہ صحن حرم میں آ کر اپنی ضیا پاشی کرنے لگا۔حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی مالی وجانی قربانیاں کون بیان کرے، ان کا دو ہجرتیں کرنا اور راہ خدا میں مال کا دریا بہانا کون نہیں جانتا اور سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا سابق الایمان ہونا، ان کی شب ہجرت کی قربانی، پھر ہر میدان جنگ میں ان کی تلوار کا فیصلہ کن کردار ادا کرنا اس سے کون ناواقف ہے۔ الغرض یہ آیت صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ایمان، ان کی ہجرت اوران کے جہاد فی سبیل اللہ کی گواہی دے رہی ہے اور ان کی اخروی کامیابی کا اعلان کر رہی ہے۔

اعمال کی قبولیت کے لیے ایمان پہلی شرط ہے

اس آیت میں اللہ عزوجل نے سب سے پہلے ایمان کا ذکر کیا، اس کے بعد ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔معلوم ہوا کہ اگر ایمان درست ہے تو سارے اعمال مقبول ہیں، اگر ایمان درست نہیں تو کسی عمل کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ایمان درخت کی طرح ہے اور اعمال اس کا پھل ہیں، درخت ہے تو پھل لگ سکتے ہیں، درخت ہی نہیں تو پھل کہاں۔

اسلام میں قومیت کا تصور صرف ایمان کی بنیاد پہ ہے

اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کو اگر ایمان کی حفاظت کے لیے اپنا علاقہ اور خاندان کو چھوڑ کر ہجرت کرنا پڑے تو اس سے دریغ نہیں کرتے گویا ان کی پہچان صرف ان کا دین اوران کا ایمان ہوتا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرمائیں کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فوائد (بھی) ہیں

وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ

اور ان کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے [239] اور لوگ آپ سے پوچھتے ہیں وہ (راہ خدا میں) کیا خرچ کریں آپ فرمائیں جو

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾

ضرورت سے زائد ہو، [240] اسی طرح اللہ تمہارے لئے آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو۔

شراب اور جوئے کی برائی

[239] اس سے قبل روزہ، حج اور جہاد جیسی عظیم عبادات کا ذکر ہوا لیکن شراب اور جوئے میں پڑ کر انسان سب عبادات سے متنفر ہو جاتا ہے اور آگے نکاح کے مسائل بیان کیے جا رہے ہیں اور شراب اور جوا انسان کی گھریلو زندگی تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے اب یہاں شراب اور جوئے کی مذمت لائی گئی ہے۔ حدیث میں ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اللہ سے دعا کی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ شراب کے بارہ میں واضح حکم بیان فرمایا جائے کیونکہ یہ مال اور عقل دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ تب یہ آیت اتری: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

شراب اور جوئے کے دنیوی واخروی نقصانات:

یعنی لوگ شراب اور جوئے کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیں ان میں بڑا گناہ ہے۔ یعنی ان میں پڑ کر انسان زنا، چوری اور بے حیائی جیسے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور ان میں منافع بھی ہیں مثلاً شراب سے سردی دور ہو جاتی ہے اور وقتی طور پر سب غم بھول جاتے ہیں اور جوئے میں بسا اوقات یک دم بہت سا مال مل جاتا ہے مگر ان کا گناہ ان کے منافع سے بہت بڑا ہے۔ کیونکہ شراب میں انسان کو بیوی اور بہن میں امتیاز نہیں رہتا، شراب دولت بہا کر لے جاتی ہے۔ اس سے حادثات ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں اکثر روڈ ایکسیڈنٹس کا سبب شراب نوشی ہے اور جوا اکثر مال برباد کرتا ہے۔ جواری انسان گھر کی چیزیں حتیٰ کہ سب جائیداد اور بیوی کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔

یہ شراب اور جوئے کے دنیوی نقصانات ہیں جبکہ اخروی نقصانات کا تصور بھی ہوش ربا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر نشہ والی چیز حرام ہے اور جس نے نشہ والی چیز کو پیا اس کی چالیس

دن کی نمازیں ضائع ہوگئیں۔ اگر توبہ کرے تو اللہ توبہ قبول فرماتا ہے، اگر چوتھی بار پیے تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ اسے طینة الخبال سے پلائے، عرض کیا گیا یارسول اللہ ﷺ طینة الخبال کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ زخمیوں کے جسم سے نکلنے والا گندہ خون ہے۔ (ابوداود کتاب الاشربہ جلد دوم صفحہ ۱۶۲)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لا یدخل الجنة عاقٌّ ولا منّان ولا مدمن خمر۔ ''دین کا نافرمان، احسان جتلانے والا اور شراب کا عادی جنت میں نہ جائے گا'' (سنن دارمی جلد ۲ صفحہ ۱۱۲ مطبوعہ دارالفکر)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لاتشربین خمرا فانه رأس کل فاحشة۔ ''شراب مت پیو کہ یہ ہر بے حیائی کی جڑ ہے۔''
(مسند احمد بن حنبل جلد اول ۲ صفحہ ۵۳۸)

یاد رہے کہ انگور سے بنائی جانے والی شراب حرام قطعی ہے، اس کی حرمت کا منکر کافر ہے اور اس کا ایک قطرہ پینے والے پر حد شرعی نافذ ہے یعنی اسی کوڑے۔ جبکہ غیر انگوری شراب کو اگر اس قدر کم پیا جائے کہ اس سے نشہ نہ آئے تو یہ بھی حرام ہے اور وہ انگوری شراب کی طرح ناپاک ہے تاہم چونکہ اس میں بعض ائمہ کا اختلاف ہے، اس لیے اس کی حرمت کے منکر کو کافر نہیں کہا جائے گا اور اس پہ حد نہیں آئے گی اور اگر غیر انگوری شراب کو نشہ آور حد تک پیا جائے تو اس پہ حد بھی آئے گی اور اس کی حرمت کا منکر کافر ہے۔

جبکہ جوئے کے بارے میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جس نے نردشیر (جوئے کی ایک قسم) کے ساتھ کھیل کھیلا تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے اپنے ہاتھ کو خنزیر کے گوشت اور خون میں ڈبویا۔'' (ابوداود جلد دوم صفحہ ۳۲۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو کبوتری کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا (ممکن ہے وہ کافر یا منافق ہو) فرمایا: شیطانٌ یتبع شیطانةً، ''یہ شیطان ہے جو ایک مادہ شیطان کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔'' (ابوداود جلد دوم کتاب الادب صفحہ ۳۲۷) کبوتری کو مجازاً شیطان کہا گیا کہ جس طرح شیطان بندے کو ذکر اللہ سے غافل کرتا ہے یونہی جوئے کی کبوتری بندے کو نماز اور ذکر اللہ سے غافل کر دیتی ہے۔

مروّجہ لاٹری بھی جوئے ہی کی ایک قسم ہے:

جاننا چاہیے کہ آج کل کی لاٹری جوئے ہی میں داخل ہے، جوئے میں آدمی اپنی دولت کو اس امید پہ داؤ پہ لگاتا رہتا ہے کہ شائد کوئی لاکھوں کا جوا نکل آئے یہی لاٹری کا نظام ہے۔ لوگ لاٹری میں رقم لگاتے رہتے ہیں کہ شائد کوئی لاکھوں کی لاٹری نکل آئے، اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ الغرض ہر وہ طریقہ جس میں دوطرفہ مالی شرط لگی

ہو کہ اگر جیت گئے تو اتنا مال ملے گا اور ہار گئے تو اتنا دینا پڑے گا وہ جوا ہے اور حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور اگر یک طرفہ شرط ہو کہ جیت گئے تو اتنا انعام ملے گا، ہار گئے تو آپ کی لگائی ہوئی رقم آپ کو واپس مل جائے گی تو یہ جوا نہیں ہے بلکہ محض انعام ہے۔

آجکل ایک مکروہ دھندا یہ بھی چلا ہے کہ بعض ٹی وی چینلز لوگوں سے آسان سا سوال پوچھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ درست جواب پہ عمرہ کا ٹکٹ یا فلاں انعام دیا جائے گا اور لوگ لالچ میں ان کو فون کال کرتے ہیں اور وہ کال بہت مہنگی ہوتی ہے اور وہ سارا پیسہ ٹی وی چینل کو مل جاتا ہے۔ اسی میں سے وہ عمرہ کا ایک ٹکٹ نکال دیتے ہیں، یہ بھی جوئے ہی کی ایک قسم ہے۔

یاد رہے شراب کے بارے میں نازل ہونے والی یہ پہلی آیت تھی۔ اس میں شراب کا نقصان دہ ہونا بتایا گیا۔ حدیث میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر دعا کی۔ اے اللہ ہمیں شراب کے بارے میں مزید واضح ہدایت عطا فرما۔ تب یہ آیت اتری: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی کہ ''تم نشے میں نماز کے قریب نہ جاؤ'' (نساء: ۴۳) انہوں نے پھر یہی دعا کی، تب یہ آیت اتری: کہ ''شراب اور جوا اور بتوں سے فال لینا گندا شیطانی کام ہے، اس سے باز آجاؤ'' (مائدہ: ۹۰) تب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ ہم باز آ گئے ہم باز آ گئے۔ (ترمذی، کتاب التفسیر سورہ مائدہ)

فضیلت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ:

یہاں سے ان کی فضیلت واضح ہوئی کہ ان کی دعا اور سوال پر یہ آیت اتری اور شراب اور جوئے کی برائی بتائی گئی۔ یہاں یَسْـَٔلُوْنَکَ میں سوال کرنے والے وہی تھے۔ اسی لیے حدیث میں ہے کہ اللہ عمر کی زبان پر بولتا ہے اور قرآن کی کثیر آیات ان کی رائے پر نازل ہوئیں۔ جیسے مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانا، بدر کے قیدیوں کا مسئلہ، ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حجاب کا نزول، اور ان کا بعض ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنا کہ اگر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مطالبات کا اصرار جاری رکھا تو اللہ اور جبریل اور نیک مومنین آپ کے مددگار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان تمام امور میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے کے حق میں قرآن نازل فرمایا۔ (بخاری کتاب التفسیر سورہ تحریم)

اور امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی ہے: ''کتف الثمر فی موافقات عمر'' اس میں انہوں نے ان تمام آیات کا احاطہ کیا ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے پر نازل ہوئیں یعنی یہ بار ہا واقع ہوا کہ ادھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زبان سے کوئی رائے ظاہر ہوئی ادھر اسی رائے پر قرآن اتر آیا یعنی ان کی رائے وحی الٰہی سے گہری موافقت رکھتی تھی۔ اسی لیے ان کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو کان بعدی نبی لکان عمر ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر نبی ہوتا۔'' (بخاری)

[240] اب فرمایا جا رہا ہے کہ شراب اور جوئے میں مال کو برباد کرنے کی بجائے اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب راہ خدا میں مال خرچ کرنے کا حکم ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سمجھ نہ پائے کہ کون سا مال کتنا خرچ کریں۔ تب یہ آیت اتری: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ یعنی اللہ نے فرمایا عفو خرچ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں عفو وہ مال ہے جو تمہارے اہل وعیال کی ضرورت سے زائد ہو۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۶۰۷) بعض مفسرین کے نزدیک عفو وہ مال ہے جو بیوی بچوں اور حاجت مند والدین اور اقارب کی ضرورت سے زائد ہو، دونوں اقوال کا قریبا ایک ہی مفہوم ہے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے العفو کہہ کر انسان پر پہلے اپنے مالی فرائض وحقوق کا بجالانا لازم کیا ہے۔ اس کے بعد اسے اجازت دی ہے کہ راہ خدا میں جو چاہے خرچ کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہتر صدقہ وہ ہے جس کے بعد انسان مالدار ہی رہے۔ (خود حاجت مند نہ ہو جائے اور بیوی بچوں اور والدین وغیرہ کے حقوق بجالانے سے عاجز نہ رہ جائے) اور دینے والا ہاتھ لینے والے سے بہتر ہے اور سب سے پہلے ان پر خرچ کرو جن کے تم ذمہ دار ہو۔''

(ابوداؤد عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما)

فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ

دنیا و آخرت میں، اور وہ آپ سے یتیموں کے متعلق پوچھتے ہیں آپ فرمائیں ان کے لئے بھلائی کرنا اچھا ہے

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ

اور اگر تم انہیں خود سے ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں [241] اور اللہ جانتا ہے کہ فسادی کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون،

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۰﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈالتا بیشک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ [242]

[241] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جب مال یتیم کے ظلماً کھانے پر سخت وعید نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ڈر گئے حتیٰ کہ اگر کسی کے گھر میں کوئی یتیم (بھانجا بھتیجا وغیرہ) تھا تو اس نے اس کا کھانا پینا الگ کر دیا، جو کھانا یتیم کے کھانے سے بچ جاتا وہ اسے نہ کھاتے، اگلے وقت میں وہ خود ہی کھاتا یا اسے ضائع کر دیا جاتا۔ تب انہیں الجھن ہو گئی اور انہوں نے اس بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ چنانچہ یہ آیت اتری: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ (ابوداؤد) یعنی اللہ عزوجل نے فرمایا تم یتیموں کے بارے میں ایسا طریقہ اپناؤ جس میں ان کی بھلائی ہو اور اگر تم ان کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ تجارت میں ملا لو تو اس میں کوئی حرج نہیں وہ تمہارے دینی اور خاندانی بھائی ہیں۔ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ کی یہ تفسیر بھی ہے کہ یتیموں سے رشتہ داری کرو انہیں اپنے خاندان میں

ملاؤ کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔

[242] یعنی اللہ جانتا ہے کہ کون یتیم کا بھلا چاہتا ہے اس لیے وہ اس کے مال کو اپنے مال میں ملا کر تجارت کرتا ہے تا کہ یتیم کا مال بھی بڑھے اور کون یتیم کے حق میں فساد کرنے والا ہے اور اس کے مال کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے۔ لہٰذا یتیم کے مال کو اپنے مال میں ملاتے ہوئے اللہ سے ڈرتے رہو وہ سب کچھ جانتا ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو تم پر سخت احکام اتارتا اور مالِ یتیم کو ہمیشہ الگ رکھنے کا حکم دیتا مگر اس نے اپنی رحمت سے نرمی کی اور مخالطت کی اجازت دی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ
اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں [243] اور مؤمنہ لونڈی مشرکہ (آزاد) عورت سے بہتر ہے
وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ
خواہ وہ مشرکہ تمہیں بھلی لگے [244] اور مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کا نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اور مؤمن غلام
مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ
مشرک (آزاد مرد) سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں بھلا لگے [245] وہ لوگ (تمہیں) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں
وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ
اور اللہ جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اپنے اذن سے، اور لوگوں کو اپنی آیات بیان کرتا ہے
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ؀ ع
تا کہ وہ نصیحت پکڑیں۔ [246]

نکاح کیلئے صاحبِ ایمان جیون ساتھی چننے کا حکم

[243] ایک صحابی مرثد بن ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے ایک مشرکہ عورت سے شادی کرنا چاہی، تب یہ آیت مبارکہ اتری۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مشرکہ عورتیں جب تک ایمان نہ لائیں ان سے نکاح مت کرو۔ یہاں مشرکہ سے مطلقاً کافرہ عورت مراد ہے۔ خواہ وہ شرک کرتی ہو جیسے ہندو، مجوسی یا سکھ عورتیں۔ یا نہ کرتی ہو، جیسے دھریہ و ملحدہ عورتیں۔ اور شرک بمعنی کفر قرآن میں مستعمل ہے جیسے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ یعنی اللہ تعالیٰ شرک معاف نہیں کرتا اور اس سے کم تر گناہ جو چاہے معاف فرما دیتا ہے۔ (النساء، ۱۱۶) اس آیت میں شرک سے مطلقاً کفر

مراد ہے۔اسی طرح وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ میں بھی مطلقاً کافرہ عورتیں مراد ہیں۔

البتہ اہل کتاب (یہودی عیسائی) عورتوں سے نکاح کی حلت اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ کہ وہ پاکدامن عورتیں جو اہل کتاب میں سے ہوں تمہارے لیے حلال ہیں۔(مائدہ:۵)

اگرچہ اہل کتاب بھی مبتلائے شرک ہیں مگر چونکہ وہ اللہ، انبیاء، آسمانی کتب اور جنت ونار کے قائل ہیں اس لیے باب نکاح میں ان کے بعض احکام دیگر مشرکین سے کچھ نرم ہیں کہ ان کی عورتوں سے مومنوں کا نکاح حلال رکھا گیا۔البتہ افضل یہی ہے کہ اہل کتاب عورتوں سے نکاح نہ کیا جائے۔

[244] اس جملہ کا نشان نزول الگ مروی ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے ایک بار اپنی سیاہ رنگ مومنہ لونڈی کو کسی وجہ سے مارا پھر پشیمان ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشورہ سے اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لیا۔بعض مسلمانوں کو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل پسند نہ آیا اور انہوں نے اعتراض کیا کہ دیکھو ایک لونڈی سے شادی کر لی وہ یہ رغبت رکھتے تھے کہ حسب ونسب والی عورتوں سے شادی کی جائے خواہ وہ مشرکہ ہوں۔

تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ (درمنثور جلد اول صفحہ ۶۱۵)

یعنی خواہ مشرکہ عورت کا حسب ونسب اور حسن وجمال تمہیں بھلا لگے بہر حال اللہ کے ہاں اس سے مومنہ لونڈی اچھی ہے،تم حسن وجمال اور حسب ونسب دیکھتے ہو مگر اللہ تعالیٰ ایمان دیکھتا ہے۔

[245] یعنی اے مومنو اپنی بیٹیوں، بہنوں کا نکاح مشرکوں سے مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔یہاں بھی مشرک سے مراد مطلقاً کافر ہے کہ کسی کافر مرد سے کسی مومنہ عورت کا نکاح جائز نہیں۔اللہ فرماتا ہے: لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمۡ وَلَا هُمۡ يَحِلُّوۡنَ لَهُنَّ ؕ نہ مسلمان عورتیں کفار کے لیے حلال ہیں نہ وہ ان کے لیے۔(ممتحنہ:۱۰)

نکاح کیلئے ایمان اور اچھے کردار کو معیار بنایا جائے:

اس آیت میں ایمان دار جیون ساتھی چننے پر زور دیا گیا ہے۔اور ایمان کو حسب ونسب اور حسن وجمال پر ترجیح دی گئی ہے۔لَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اور لَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ کے الفاظ اس پر دال ہیں۔اس لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انما تنکح المرأة لمالها ولحسبها ولجمالها ولدينها،فعليكم بذات الدين ''عورت سے اس کے جمال،نسب،مال یا دین کی وجہ سے شادی کی جاتی ہے تم صرف دین والی عورت کو اختیار کر لو۔'' (بخاری کتاب النکاح)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے عورت کے مال کے لالچ میں اس سے نکاح کیا اسے فقر کے سوا کچھ نہ ملے گا اور جس نے اس کے

حسب کے سبب اس سے نکاح کیا اسے کمینگی کے سوا کچھ نہ ملے گا اور جس نے نگاہ پاک اور عزت محفوظ رکھنے کیلئے نکاح کیا اسے اللہ تعالیٰ برکت دے گا۔'' (طبرانی عن انس رضی اللہ عنہ)

غیر کفو میں نکاح جائز ہے:

اس آیت میں آزاد مرد کو مومنہ لونڈی سے شادی کی اجازت دی گئی اور آزاد عورت کو غلام مومن سے شادی کی اجازت دی گئی جیسا کہ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ سے ظاہر ہے۔ اب آزاد اور غلام کے مابین کوئی کفاءت نہیں۔ آزاد کا کفو غلام سے بلند تر ہے۔ معلوم ہوا اصل کفاءت صرف ایمان ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا اپنے غلام حضرت زید رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا، اس کی تفصیل پارہ ۲۲ رکوع ۲ میں آئے گی۔

ہاں اگر کوئی لڑکی والدین کی رضا کے خلاف ادنیٰ کفو میں از خود نکاح کر لے تو شریعت والدین کو بذریعہ عدالت حق فسخ دیتی ہے تاکہ وہ خود سے عار کو دور کر سکیں۔ لیکن اگر خود والدین اپنی بیٹی کا نکاح اس کی رضا سے ادنیٰ کفو میں کریں تو اسے کوئی فسخ نہیں کر سکتا۔ تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

مسلمان عورت کا از خود اپنا نکاح کرنا عند اللہ پسندیدہ نہیں:

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ عورت کا نکاح اس کے اولیاء ہی کریں، یہی اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ اس لیے عورت کے نکاح کی نسبت خود عورت کی بجائے اس کے اولیاء کی طرف کی گئی کہ وہ اس کا نکاح کریں، نہ کہ وہ خود اپنا نکاح کرے۔ حالانکہ اس سے قبل اسی آیت میں مردوں کے نکاح کی نسبت مردوں ہی کی طرف کی گئی اور فرمایا: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ مگر عورتوں کا نکاح ان کے اولیاء کی طرف منسوب کرتے ہوئے وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ کہا گیا، اس میں یہی راز ہے۔

کتابیہ عورت سے شادی کرنے میں شدید احتیاط کی ضرورت ہے

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ میں بتایا گیا ہے کہ کفار و مشرکین دوزخ کی طرف دعوت دینے والے ہیں تو اہل عورتوں سے اگرچہ قرآن نے اجازتِ نکاح دی ہے مگر اس میں شدید احتیاط لازم ہے۔ اگر خطرہ ہو کہ کتابیہ عورت اپنے شوہر یا بچوں کے ایمان کو برباد کر دے گی تو کتابیہ سے نکاح بھی جائز نہیں ہے۔

[246] مشرکین سے نکاح کے عدم جواز کی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ مشرکین تو تمہیں دوزخ ہی کی طرف بلاتے ہیں اگر ان سے نکاح کیا جائے تو نکاح میاں بیوی بلکہ ان کے خاندانوں کے مابین باہمی الفت پیدا کرتا ہے۔ ایسے میں خطرہ ہے کہ مشرکین تمہیں اپنے عقیدہ کی طرف کھینچیں گے جبکہ اللہ تمہیں جنت و مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اہل کتاب عورتوں سے نکاح نہ کرنے ہی میں بھلائی ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي

اور لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرمائیں وہ ایک گندگی ہے تو تم حیض میں عورتوں سے

الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ

جدا رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ [247] پھر جب پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ

مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

جیسے تمہیں اللہ نے حکم دیا بے شک اللہ توبہ کرنے اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ [248]

نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تو تم اپنی کھیتی کے پاس جیسے چاہو آؤ [249] اور تم اپنی جانوں پر پہلے ہی بھلا کرلو

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور آپ مؤمنوں کو بشارت سنادیں۔ [250]

بیوی سے مجامعت کے احکام

[247] حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہود کے ہاں جب عورت کو حیض آتا تو وہ اس کا کھانا پینا الگ کردیتے۔ بعض اسے گھر سے نکال دیتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارہ میں پوچھا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم عورتوں کے ساتھ حیض میں اکٹھے ہی رہو اور جماع (ہم بستری) کے علاوہ ان سے ہر معاملہ کرو۔ جب یہود کو یہ بات پہنچی تو کہنے لگے یہ آدمی ہمارے ہر کام کی مخالفت کیوں کرتا ہے۔
(مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

حیض والی عورت کے لیے چند احکام:

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حیض ایک گندگی ہے تم گندگی میں بیوی سے جماع مت کرو، حدیث میں اس پر سخت وعید آئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص عورت کے ساتھ حیض کی حالت میں یا اس کی دبر میں (پاخانہ والے راستہ میں) جماع کرے اس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والے دین سے انکار کردیا۔'' (ترمذی، ابن ماجہ) نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا ''اگر حیض میں جماع کے سبب کسی کی اولاد برص زدہ پیدا ہو تو اسے خود ہی کو ملامت کرنا چاہیے۔'' (درمنثور) جدید سائنس کے مطابق بھی حیض میں جماع سے مرد کو آتش وسوزاک اور عورت کو نظام حیض کی خرابیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ البتہ حالت حیض میں مرد اپنی بیوی کے ساتھ اکٹھے سو سکتا ہے۔ حیض میں عورت سے نماز معاف ہے مگر جتنے دن وہ روزہٗ رمضان نہ رکھ سکے اسے اتنے دن بعد میں قضا دینا ہوگی، حیض والی عورت مسجد میں داخل نہیں ہو سکتی، نہ قرآن پڑھ سکتی ہے نہ طواف کعبہ کر سکتی ہے۔ حیض کی مدت کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگر تین دن سے کم اور دس دن سے زائد خون آئے تو وہ خون استحاضہ کا ہے یعنی بیماری کا خون، اس سے نماز روزہ معاف نہیں ہوتے۔

اسلام نے عورت کو تحفظ دیا:

یہود حالت حیض میں عورت کو اچھوت بنا دیتے ہیں۔ تورات میں یہود نے یہ عبارت اپنی طرف سے داخل کر دی ہے۔ ''حیض والی عورت جس بستر پر بیٹھ جائے اسے دھوؤ بلکہ جو شخص اس بستر پر بیٹھے وہ بھی اپنے کپڑے دھوئے اور حیض والی عورت کو ہاتھ لگانے والا شام تک نجس رہے گا۔'' (تورات کتاب احبار باب ۱۵ آیت ۱۹) تب اسلام نے آ کر عورت کو اس ظلم سے نجات دلائی۔ نبی اکرم ﷺ حیض میں اپنی بیویوں کے ساتھ ہی نیند فرماتے اور ان کے ہاتھوں سے اپنے سر میں کنگھی کرواتے وغیرہ۔ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں اعتکاف میں ہوتے تھے۔ آپ مسجد کے صحن میں کھڑے اپنا سر انور اپنے حجرہ کی طرف بڑھا دیتے اور میں آپ کے سر میں کنگھی کر دیتی تھی۔
(مسلم کتاب الحیض حدیث ۷)

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ ہاتھ بڑھا کر مجھے مسجد میں سے چٹائی دیدے۔ انہوں نے عرض کیا میں حیض میں ہوں۔ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: لیست الحیضۃُ فی یدِكِ حیض تمہارے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔ (مسلم کتاب الحیض حدیث ۱۱) گویا رسول اللہ ﷺ نے عملی طور پر بتلایا کہ حیض میں عورت کوئی اچھوت نہیں بن جاتی، صرف اس کے لیے چند احکام بدل جاتے ہیں۔

اسلام عادلانہ مذہب ہے:

یہود نے حیض میں عورت سے مکمل لاتعلقی کر لی اور اسے ایک اچھوت بنا کر رکھ دیا۔ جبکہ عیسائی حیض میں مباشرت (ہم بستری) تک بھی کر لیتے ہیں۔ اسلام نے مباشرت کو ممنوع اور باقی ہر معاملہ کو حلال قرار دیا۔ یہ اسلام کی عادلانہ روش ہے۔ اور واقعتاً اسلام عقل وشعور اور انسانی فطرت کے عین مطابق مذہب ہے۔

عورت سے وطی فی الدبر جائز نہیں:

حیض میں مجامعت کا سبب گندگی کو بتایا گیا، فرمایا گیا: قُلْ هُوَ اَذًى کہ کہہ دو یہ گندا کام ہے، حالانکہ حیض کی گندگی

عارضی ہے جو ہر مہینہ میں چند دن کے لیے ہوتی ہے جبکہ دبر کی گندگی دائمی ہے۔ لہٰذا وطی فی الدبر کی حرمت زیادہ واضح ہے۔ ابھی حدیث گزری کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص حیض والی عورت کے پاس جائے یا عورت کے پچھلے راستہ کو استعمال کرے اس نے اس دین سے انکار کیا جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ نازل کیا گیا۔''
(ترمذی کتاب الطہارۃ حدیث ۱۳۵)

[248] لہٰذا جب تک بیوی حیض سے پاک نہ ہو جائے تب تک تم اس کے قریب نہ جاؤ۔ یاد رہے جب تک حیض کے خون کی سرخی اور اس کے بعد آنے والی زردی ختم نہ ہو اور خالص سفیدی نہ آ جائے تب تک عورت پاک نہیں ہوتی نہ اس سے جماع جائز ہے نہ وہ نماز، روزہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح جیسے ہی زردی آنا شروع ہو نماز ختم اور جماع حرام ہو جاتا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عورت کے پاک ہونے کے بعد اس طرح اس کے قریب جایا جا سکتا ہے جیسے اللہ نے حکم دیا ہے کہ اگلے راستے میں آؤ پچھلے میں نہیں اور اگر گناہ ہو جائے یعنی حیض میں جماع کر لیا جائے تو توبہ لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند رکھتا ہے۔

حالتِ حیض میں بیوی سے مجامعت کا نقصان اور گناہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

من اتی حائضا او امرأۃ فی دبرھا او کاھنا فقد کفر بما انزل علی محمد۔ ''جس نے حیض والی عورت سے صحبت کی یا اس کی دبر کو اختیار کیا یا وہ کسی کاہن کے پاس گیا تو اس نے اس دین سے انکار کر دیا جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہ نازل کیا گیا ہے۔'' (ترمذی کتاب الطہارۃ باب ۱۰۲۔ ابن ماجہ کتاب الطہارۃ باب ۱۲۲۔ مسند احمد بن حنبل جلد ۲ صفحہ ۴۰۸)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''حیض میں جماع کرنیوالا ایک دینار صدقہ دے۔'' (ترمذی عن ابن عباس) یہ قریباً دو اعشاریہ چھ تولہ [2.6] سونا ہے۔ یعنی اڑھائی تولہ سونا سے کچھ زیادہ۔ آگے اللہ نے فرمایا: وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ کہ اللہ پاک رہنے والوں کو جو حیض کی گندگی سے دور رہتے ہیں پسند رکھتا ہے۔

آج جدید سائنس بھی مانتی ہے کہ حیض میں جماع کرنے سے مرد و عورت دونوں میں ایک دو نہیں کئی خرابیاں اور بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ جیسے نظام حیض کا خراب ہو جانا، بچے کی ولادت میں خرابی آنا، اولاد کا برص زدہ پیدا ہونا یہ عورت کی امراض ہیں، جبکہ مرد میں آتش و سوزاک وغیرہ کا پیدا ہونا۔

[249] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہلاک ہو گیا۔ میں نے آج رات اپنا کجاوہ الٹ لیا۔ (یعنی بیوی کو الٹا لٹا کر اس سے جماع کیا) تب یہ آیت اتری: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ (ترمذی، نسائی) یعنی اللہ نے فرمایا کہ تمہاری

بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی میں جیسے چاہو جاؤ، خواہ سیدھا لٹا کر جماع کرو یا الٹا لٹا کر، البتہ حیض اور پچھلے راستے سے بچو۔

بیوی کو کھیتی سے تشبیہ دینے کی وجہ

بیوی کو کھیتی سے اس لیے تشبیہ دی گئی کہ کسان کھیت میں بیج ڈالتا ہے اور فصل اللہ اگاتا ہے۔ یونہی شوہر بیوی کے رحم میں نطفہ ڈالتا ہے جس سے اولاد اللہ پیدا کرتا ہے۔ بعض کھیتوں سے زیادہ فصل ہوتی ہے بعض سے کم اور بعض سے کچھ نہیں۔ یونہی بعض عورتوں سے زیادہ اولاد ہوتی ہے بعض سے کم اور بعض سے کچھ نہیں۔ کسان اپنی کھیتی کی نگرانی کرتا ہے یونہی شوہر اپنی بیوی کی نگرانی کرتا ہے پھر ایک دفعہ فصل کاٹ کر دوبارہ بیج بویا جاتا ہے۔ یونہی ایک بچے کی ولادت کے بعد دوبارہ عورت سے مباشرت کی جاتی ہے تو عورت کئی لحاظ سے کھیتی ہے۔

اس جگہ بھی یہ معلوم ہوا کہ بیوی کے پچھلے راستہ میں جماع حرام ہے۔ کیونکہ عورت کو کھیتی کہا گیا۔ کھیتی وہ ہے جہاں سے فصل اُگے اور بیوی سے اگلے راستہ ہی میں جماع کیا جائے تو اولاد کا پھل ملتا ہے پچھلے راستہ سے کچھ نہیں مل سکتا۔ لہٰذا پچھلے راستہ کا استعمال جائز نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو عورت کا پچھلا راستہ کا استعمال کرے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ (مسند احمد عن ابی ہریرہ جلد اول صفحہ ۴۴۴) آپ ﷺ نے فرمایا جو عورت کا پچھلا راستہ استعمال کرے یا کسی مرد سے ایسا کرے اللہ اس کی طرف نظر رحمت سے نہ دیکھے گا۔ (ترمذی عن ابن عباس)

بیوی سے عزل جائز ہے:

جب عورت کھیتی ہے تو کسان کھیتی میں فصل اگائے یا نہ اگائے، یہ کسان کی مرضی ہے۔ یونہی شوہر بیوی کے رحم میں نطفہ ڈالے یا نہ ڈالے یہ اس کی مرضی ہے البتہ جماع عورت کا حق ہے جس سے اسے محروم رکھنا جائز نہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں کنا نعزل علی عهد النبی ﷺ ہم حضور ﷺ کے عہد مبارک میں عزل کیا کرتے تھے۔ (بخاری کتاب النکاح باب ۹۶) یعنی ہمیں اس کی اجازت تھی اور رسول اللہ ﷺ ہمیں اس سے منع نہیں فرماتے تھے۔

[250] یعنی جان لو کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونا ہے۔ وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارہ میں ضرور پوچھے گا جن لوگوں نے اس پیشی کے لیے تیاری کر لی ہے ان کے لیے بشارت ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ

اور اللہ کو اپنی قسموں کے سبب اِس چیز سے آڑ نہ بناؤ کہ نیکی کرو اورتقویٰ اختیار کرو اور لوگوں کے مابین

النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ

صلح کراؤ اور اللہ سب سننے جاننے والا ہے۔ [251] اللہ تمہاری بے کار قسموں پر پکڑ نہیں کرے گا

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

مگر ان (قسموں) پہ پکڑ کرے گا جو تمہارے دلوں نے منعقد کیں اور اللہ بخشنے والا بُردبار ہے۔ [252]

قسم اٹھانے کے بارے میں ہدایت

[251] جب پچھلی آیت میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ فرمایا گیا تو اب تقوے کی وضاحت میں اس کے ایک بے جا تقاضہ کا رد کیا جارہا ہے۔ اس کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما کی اپنے بہنوئی حضرت بشیر بن نعمان رضی اللہ عنہ سے کوئی رنجش ہوگئی۔ انہوں نے قسم اٹھالی کہ وہ اپنے بہنوئی سے کبھی کلام نہیں کریں گے، ان کے گھر نہیں جائیں گے اور ان کی بیوی اور ان کے درمیان صلح بھی نہیں کروائیں گے۔ لوگوں نے ان سے کہا آپ اپنی بہن اور بہنوئی کے مابین صلح کیوں نہیں کرواتے؟ انہوں نے کہا میں نے قسم اٹھالی ہے کہ بہنوئی سے کلام نہ کروں گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (جامع النقول فی اسباب النزول للسیوطی جلد اول صفحہ ۲۸۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ مومنو! اللہ کو (یعنی اس کے نام کی قسم کو) نیکی کرنے، پرہیز گاری برتنے اور لوگوں کے مابین صلح کروانے کے مقابلہ میں رکاوٹ نہ بنالو، مطلب یہ کہ اگر تم نے کوئی نیک کام نہ کرنے کی قسم اٹھالی ہے تو مت سمجھو کہ اگر تم نے یہ کام کرلیا تو اللہ ناراض ہو جائے گا۔ اللہ تو نیک کاموں سے خوش ہوتا ہے بلکہ تمہیں چاہیے کہ قسم توڑ کر اس کا کفارہ دیدو اور نیک اعمال جاری رکھو۔

یہاں سے تین فوائد حاصل ہوئے: (۱) بری قسم کو توڑ دینا چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی قسم اٹھائی پھر اس کے خلاف چلنے کو بہتر جانا تو اپنی قسم کا کفارہ دے اور جو کام بہتر ہے وہ کرتا رہے۔'' (مسلم کتاب الایمان حدیث ۲۶) (۲) قطع رحمی کی برائی: حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما نے اپنے بہنوئی سے کلام نہ کرنے کی قسم اٹھائی تو اللہ نے یہ آیت اتار کر ان کی اصلاح فرمائی، گویا قطع رحمی اللہ کے ہاں سخت ناپسندہ ہے ایک جگہ قرآن میں قطع رحمی پر لعنت وارد ہوئی ہے۔ (رعد، ۲۵) (۳) صلح کرانے کی فضیلت۔ وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ سے صلح کروانے کی فضیلت ظاہر ہے۔ افسوس آج بہت سے لوگ صلح کی بجائے بھائی کو بھائی سے لڑا کر بہت

خوش ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم ﷺ کے صدقے میں سب کو ہدایت عطا فرمائے۔
[252] یعنی اللہ تمہاری لغو قسموں پر تم پر پکڑ نہیں کرے گا۔ لغو قسم یہ ہے کہ بھول کر جھوٹی قسم اٹھالی جائے مثلاً کوئی آدمی نہیں آیا تھا اور یہ کہا جائے کہ اللہ کی قسم وہ آ گیا ہے یا وہ آ گیا تھا تو کہا جائے قسم بخدا وہ نہیں آیا ہے چونکہ اس قسم میں جھوٹ بولنے کا ارادہ نہیں ہوتا اس لیے اللہ اس پر پکڑ نہیں فرمائے گا اسے یمین لغو کہتے ہیں۔ البتہ جب جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھائی جائے تو اللہ ضرور پکڑ فرمائے گا۔ اسے یمین غموس کہتے ہیں۔ غموس کا معنی ڈوبنا ہے۔ یعنی جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھانے والا گناہ میں مکمل ڈوب جاتا ہے۔ جھوٹے شخص پر اللہ کی لعنت ہے، فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَی الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾
(آل عمران:۶۱)

جھوٹی قسم اٹھانے کی برائی

یہاں تو صرف یہی فرمایا گیا کہ جان بوجھ کر جھوٹی قسم اٹھانے پہ اللہ تعالیٰ پکڑ فرمائے گا جبکہ دوسری جگہ اللہ نے جھوٹی قسم کے اٹھانے کو منافقین کی علامت قرار دیا ہے اور اس پہ عذاب شدید کی وعید فرمائی ہے۔ اللہ فرماتا ہے:
وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۶﴾ ''وہ جان بوجھ کر جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں، اللہ نے ان کے لیے عذاب شدید تیار کیا ہے ان کا عمل کتنا برا ہے، انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنالیا ہے تو وہ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں تو ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے۔'' (مجادلہ، ۱۶)
حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ کہ بدترین گناہ کونسے ہیں؟ ہم نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ یہ ہیں اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی، حضور ﷺ کسی چیز سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے پھر آپ سیدھے بیٹھے گئے اور فرمایا: الا وشهادة الزور، سن لو کہ جھوٹی گواہی بھی بدترین گناہ ہے پھر آپ ﷺ یہ الفاظ مسلسل کہتے چلے گئے حتی کہ ہم سوچنے لگے کاش آپ خاموش ہو جائیں کیونکہ آپ ﷺ کو بار بار کہنے سے تکلیف ہو رہی تھی۔'' (بخاری، ترمذی، نسائی)

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ

جولوگ اپنی عورتوں کے قریب نہ جانے کی قسم اٹھالیں ان کے لئے چار ماہ کا انتظار مقرر ہے اگر وہ (اس میں) واپس پلٹ آئیں تو

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ [253] اور اگر طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

بیوی سے ایلاء کرنے کا حکم

[253] ایلاء کا معنی قسم اٹھانا ہے، چونکہ اس سے قبل قسم اٹھانے کی بات ہو رہی تھی تو اب ایک خاص معاملہ میں قسم اٹھانے کا حکم بیان فرمایا جا رہا ہے جسے ''ایلاء'' کہتے ہیں۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اہل جاہلیت میں اگر کسی کو اپنی بیوی سے محبت نہ ہوتی اور نہ وہ یہ چاہتا کہ اس سے کوئی دوسرا شخص نکاح کرے تو وہ قسم اٹھالیتا کہ کبھی اس کے قریب نہ جائے گا تو وہ اسے یوں چھوڑ دیتا کہ نہ وہ شادی شدہ ہوتی نہ مطلقہ، بعض لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ وہ اسلام لے آئے تب اللہ نے یہ آیت اتاری: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ (مظہری)

یعنی اللہ نے فرمایا جو شخص یہ قسم اٹھائے کہ وہ کبھی اپنی بیوی کے قریب نہ جائے گا تو یہ ایلاء ہے اب اسے چار ماہ کی مہلت ہے اگر اس دوران وہ بیوی کے قریب چلا جائے تو اس کی قسم ٹوٹ گئی اور نکاح بچ گیا۔ اب وہ قسم کا کفارہ دیدے اور اگر چار ماہ تک وہ بیوی کے قریب نہ گیا تو نکاح از خود ختم ہو جائے گا پھر وہ عورت عدت گزار کر دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص چار ماہ سے کم کے لیے بیوی کے قریب نہ جانے کی قسم اٹھاتا ہے تو وہ ایلاء نہیں ہے، اس سے نکاح پر کوئی زد نہیں آتی۔ وہ صرف قسم ہے اگر اس کو توڑے گا تو اس پہ کفارہ آئے گا۔

ایلاء میں یہی حکمت ہے کہ کبھی عورت نافرمان ہوتی ہے۔ اسے راہ راست پر لانے کے لیے اس سے مجامعت (ہم بستری) ترک کرنا پڑتی ہے اگر وہ چار ماہ کی ترک مجامعت کے باوجود نہ سدھرے تو اس کا سدھرنا مشکل ہے۔ پھر اسے چھوڑ ہی دینے میں مصلحت ہے۔ اگر اس میں کچھ بھی جذبہ اطاعت ہے تو چار ماہ میں ہی وہ باز آ جائے گی۔ ایسے میں مرد کو قسم توڑ کر نکاح بحال رکھنا چاہیے۔

اسلام حقوق نسواں کا محافظ ہے:

اسلام سے قبل عوتوں سے ظالمانہ ایلاء کیا جاتا تھا یعنی زندگی بھر کے لیے انہیں لٹکا دیا جاتا تھا۔ اسلام نے چار ماہ کی مدت مقرر کر کے اس ظلم کا خاتمہ کر دیا۔ آج مغربی دنیا اسلام کو حقوق نسواں کا غاصب کہتی ہے جو جھوٹا پراپیگنڈا ہے۔ مغربی

اقوام نے آزادی نسواں کے نام پر عورت کی جو تذلیل کی ہے چونکہ اسلام کو وہ برداشت نہیں ہے اس لیے وہ اسلام پر عورتوں سے زیادتی کا الزام رکھتے ہیں۔

بیوی کو بلاوجہ مجامعت سے دور رکھنا گناہ ہے:

ایلاء کو چار ماہ سے مقید کرنا اس لیے ہے تاکہ عورت کو ترک مجامعت کی اذیت سے بچایا جائے۔ حدیث میں ہے کیا تم یہ نہیں کر سکتے کہ شبِ جمعہ کو بیوی سے مجامعت کرو جو ایسا کرے اسے اپنے اور بیوی کے غسل کا ثواب ملے گا۔
(شعب الایمان عن ابی ہریرہ)

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ
اور طلاق یافتہ عورتیں خود کو تین حیض تک روکے رکھیں [254] اور ان کے لئے حلال نہیں کہ
یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ
وہ کچھ چھپائیں جو اللہ نے ان کی بچہ دانیوں میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ اور روزِ قیامت
الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ
پر ایمان رکھتی ہیں [255] اور ان کے شوہر ہی انہیں لوٹا لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ اس میں اصلاح چاہیں۔ [256]
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ
اور بیویوں کیلئے اسی طرح حقوق ہیں جیسے بھلائی کے ساتھ ان پر (شوہروں کے) حقوق ہیں [257] اور مردوں کو ان پر درجہ حاصل ہے
وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۟ ع
اور اللہ غالب حکمت والا ہے [258]

ع ۲۸ ۱۲

عدت، طلاق اور حقوقِ زوجین کا بیان

[254] اس سے قبل نکاح کی بات چل رہی تھی۔ اب طلاق اور عدت پر روشنی ڈالی جا رہی ہے تو فرمایا گیا کہ طلاق یافتہ عورتیں تین حیض تک خود کو (دوسرے نکاح سے اور بناؤ سنگھار سے) روکیں (یعنی طلاق کے بعد ان کو تین بار ماہانہ خون آئے، تب ان کی عدت ختم ہوگی اور ان کے لیے دوسرا نکاح حلال ہوگا) طلاق خواہ رجعی ہو یا بائنہ یا مغلظہ، عدت بہر

حال تین حیض ہی ہے۔

یہ امام اعظم امام ابوحنیفہ وامام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ کا مذہب ہے۔ وہ اس آیت میں ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ سے تین بار حیض کا آنا مراد لیتے ہیں امام شافعی وامام مالک کے نزدیک طلاق کی عدت تین طُہر ہے (طُہر سے مراد پاکیزگی کے وہ ایام ہیں جو ایک حیض سے دوسرے حیض کے درمیان ہوتے ہیں) امام شافعی اور امام مالک ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ سے تین طُہر مراد لیتے ہیں یعنی تین بار وہ پاکیزگی کے دن گذر جائیں تب طلاق والی عورت کی عدت ختم ہوتی ہے۔

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اگر پاکیزگی کے ایام میں طلاق دی گئی (اور یہی صحیح طریقہ ہے) تو امام ابوحنیفہ وامام احمد کے نزدیک اگلے حیض سے عدت کی گنتی شروع کی جائے گی اور امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک اگلے طہر سے اور اگر حالت حیض میں طلاق دی گئی تو امام شافعی امام مالک کے نزدیک آنے والے طہر سے عدت شروع ہوگی اور امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے نزدیک آنے والے حیض سے عدت شروع ہوگی۔

مطلقہ کی عدت تین حیض ہے نہ کہ تین طہر:

مگر حضرت امام ابوحنیفہ وامام احمد کے دلائل بہت قوی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے: وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ؕ ''جو عورتیں حیض سے مایوس ہو جائیں یا جن عورتوں کو حیض نہیں آتا ان کی عدت تین ماہ ہے۔'' (طلاق، ۴)

معلوم ہوا اگر حیض آتا ہو تو پھر تین حیض ہی عدت ہے۔ پھر سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لونڈی کی طلاق صرف دو ہیں (اس کے حق میں دو طلاق ہی طلاق مغلظہ ہیں) اور فرمایا: عدّتھا حیضتان ''اس کی عدت دو حیض ہے۔'' (ترمذی کتاب الطلاق باب ۷، ابوداود کتاب الطلاق باب ۶)

جب لونڈی کی عدت دو حیض ہے تو آزاد عورت کی عدت تین حیض ٹھہری نہ کہ تین طہر۔ بالکل اسی طرح، جس طرح لونڈی کے لیے دو طلاق ہیں اور آزاد عورت کے لیے تین طلاق۔

عبد الرزاق، ابن منذر، ابن جریر اور بیہقی نے عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لاقراء الحیض من اصحاب محمد ﷺ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیض ہی کو اقراء کہتے تھے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۶۵۵)

عدت کا گذارنا مطلقہ عورت پر کیوں لازم ہے؟

یہ اس لیے لازم ہے کہ اگر عورت کو حمل ہو تو تین بار حیض نہ آنے کی وجہ سے حمل ظاہر ہو جائے گا۔ پھر اس کی عدت وضع حمل (بچہ پیدا ہونے) تک چلے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ ''حمل والی عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل

رکھدیں (یعنی بچہ جن دیں)۔" (سورہ طلاق، ۴) اور اگر عورت کو حمل نہ ہو تو تین بار حیض آنے سے اس کا رحم پہلے مرد کے نطفہ سے صاف ہو جائے گا اور نکاح ثانی کی صورت میں دو مردوں کے پانی ایک رحم میں جمع نہ ہونگے۔

علاوہ ازیں عدت کے لازم کرنے میں یہ حکمت بھی ہے کہ عورت کو دوران عدت یہ سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ کن اسباب سے اسے طلاق ہوئی تاکہ نکاحِ ثانی میں وہ ان اسباب کو پھر نہ پیدا ہونے دے۔

پھر رجعی طلاق میں شوہر کو موقع دیا گیا کہ وہ عدت میں رجوع کر کے اپنے گھر کو ٹوٹنے اور اپنے بچوں کی زندگیاں تباہ ہونے سے بچالے۔ اگر عدت ہی نہ رکھی جاتی بلکہ عورت کو طلاق کے بعد فوراً دوسرے نکاح کی اجازت دیدی جاتی تو دو مردوں کے پانی ایک رحم میں جمع ہو جاتے اور مرد کو طلاق کے بعد اپنے گھر کو بچانے کا موقع نہ مل سکتا اور دیگر مذکورہ بالا مقاصد بھی حاصل نہ ہو سکتے۔ الغرض اسلام کا ہر حکم گہری حکمتوں پر مبنی ہے۔

اسلام سے ہٹ کر دوسرے مذاہب کو ان قوانین کا نہ شعور ہے نہ احساس۔ یہ علم و معرفت اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بذریعہ محمد مصطفیٰ ﷺ عطا فرمائے ہیں۔ گویا اسلام کے سوا کوئی ایسا مذہب نہیں جو انسان کی کامل راہنمائی کر سکے۔ دوسرے مذہب کو اس سے غرض نہیں کہ ایک انسان ایک مرد کے نطفے بنے یا کئی مردوں کے نطفہ سے۔ اسی لیے آج یورپ اور امریکہ میں پاسپورٹ میں سے ولدیت کا خانہ نکال دیا گیا ہے کیونکہ وہاں کی اکثریت کو علم نہیں کہ ان کا باپ کون ہے کیونکہ ایک عورت کو کئی مرد استعمال کرتے ہیں۔

[255] یعنی اگر مطلقہ عورت کے پیٹ میں ابتدائی مرحلہ میں حمل ہے اور اسے خطرہ ہے کہ حمل ظاہر ہونے کی صورت میں اسے وضع حمل تک طویل عدت گزارنا ہوگی۔ ایسے میں اسے نہیں چاہیے کہ اللہ نے اس کے رحم میں جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھپائے اور جھوٹ بول کر کہدے کہ اسے حیض آ رہا ہے۔ اگر وہ جھوٹ بول کر تین ماہ بعد دوسرا نکاح کر لے گی تو جو زنا ہوگا اس کی ذمہ دار وہ خود ہے۔ اسی طرح طلاق کی صورت میں عورت کو اگر حیض آ رہا ہے تو وہ اسے نہ چھپائے اور جھوٹ بول کر نہ کہہ دے کہ اس کی عدت ختم ہوگئی ہے، ایسے میں اگر وہ اختتام عدت سے قبل نکاح کر لے تو وہ حرام کاری کی مرتکب ہوگی۔

عدت کے بارہ میں عورت ہی کا قول معتبر ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ سے معلوم ہوا کہ عدت کے معاملہ میں عورت ہی کا قول معتبر ہے نہ کہ شوہر کا۔ یعنی اگر عورت کہے کہ اسے حیض آ رہا ہے اور مرد کہے کہ نہیں یا عورت کہے کہ تین بار حیض گذر گیا ہے (عدت ختم ہو چکی ہے) اور مرد کہے کہ ابھی نہیں گذرا تو عورت ہی کا قول معتبر ہے کیونکہ اسے وہی بہتر جان سکتی ہے، وہ جھوٹ کہے یا سچ، بہر حال اس کا قول معتبر ہے اِلّا یہ کہ وہ ایسی بات کہے جس کا امکان ہی نہیں ہے۔ مثلاً دو ماہ ہی میں کہہ دے کہ عدت ختم ہوگئی ہے۔

[256] یعنی جس شوہر نے طلاق دی ہے وہی سب سے پہلے حق دار ہے کہ اپنی بیوی کو واپس اپنے پاس رکھ لے۔ اگر

رجعی طلاق ہے (یعنی صرف ایک بار یا دو بار صریح طلاق دی ہے) تو وہ دورانِ عدت عورت کی رضامندی کے بغیر ازخود رجوع کرسکتا ہے یعنی کہہ سکتا ہے کہ میں نے طلاق واپس لے لی۔ اور اگر بائنہ طلاق ہے (مثلاً شوہر نے کہا کہ میں نے تجھ کو اپنے نکاح سے آزاد کردیا یا نکاح ختم کردیا وغیرہ) تو عورت کی رضامندی سے دوران عدت بھی اس سے نکاح ثانی کرسکتا ہے مگر کسی دوسرے شخص کو اختیار نہیں کہ عدت میں مطلقہ عورت سے نکاح کرے۔

آگے اللہ نے فرمایا: اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ یعنی طلاق دینے والا مرد اپنی عورت کو اسی صورت میں واپس لے جب مقصد اصلاح ہو اور اگر یہ مقصد ہو کہ چند دن رکھ کر پھر طلاق دی جائے یا کوئی نقصان پہنچایا جائے تو یہ ظلم ہے۔

[257] یعنی عورتوں کے حقوق شوہروں پہ ہیں اور شوہروں کے عورتوں پہ یعنی میاں بیوی دونوں کے حقوق وفرائض شریعت میں مقرر ومعین ہیں، جن سے کتب حدیث وفقہ بھری ہوئی ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک بیان کرتے ہیں۔

میاں بیوی کے ایک دوسرے پہ بعض اہم حقوق کا بیان:

عورت کا حق شوہر پہ یہ ہے کہ شوہر اس کے کھانے پینے لباس اور رہائش کا بندوبست کرے۔ اللہ فرماتا ہے: وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ رِزْقُھُنَّ وَ کِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ''جن کے لیے بچے جنے جاتے ہیں (یعنی شوہر) ان پہ ان کی بیویوں کا کھانا پینا اور لباس بھلائی کے ساتھ لازم ہے۔'' (بقرہ، ۲۳۳) دوسری جگہ فرمایا گیا: اَسْکِنُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ سَکَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِکُمْ ''جہاں تم ٹھہرتے ہو وہاں اپنی گنجائش کے مطابق اپنی بیویوں کو بھی ٹھہراؤ۔'' (طلاق،۶)

تو جیسا کھانا پینا، رہنا سہنا مرد کا ہے ویسا ہی وہ اپنی بیوی کو بھی مہیا کرے، اس سے زیادہ اس پہ لازم نہیں ہے۔ اسی طرح عورت کا حق ہے کہ اس کا شوہر اس سے محبت کرے، اس کے جسمانی تقاضوں کا خیال رکھے اور اس کے لیے جائز نہیں کہ چار ماہ سے زائد اس سے دور رہے اور اگر میاں بیوی میں اختلاف ہوجائے تو مرد اسے طلاق دینے میں جلد بازی نہ کرے بلکہ حتی الامکان صبر رکھے۔ اللہ فرماتا ہے: فَاِنْ کَرِھْتُمُوْھُنَّ فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰہُ فِیْہِ خَیْرًا کَثِیْرًا ''اگر تم اپنی بیویوں کو ناپسند رکھتے ہو تو ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند رکھو اور اللہ نے اس میں بہت سی بھلائی رکھی ہو۔'' (نساء،۱۹) یہ تو عورت کا حق شوہر پہ ہے۔

اب شوہر کا حق بیوی پہ یہ ہے کہ بیوی اس کے گھر میں رہ کر اس کے گھر، اس کی ناموس اور اسکی اولاد کی حفاظت کرے، ہر جائز حکم میں اس کی اطاعت کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ ''تو نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی اطاعت کریں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے (اس کے گھر، ناموس، مال اور اولاد کی) یوں حفاظت کریں جیسے اللہ نے حفاظت کا حکم دیا ہے۔'' (نساء، ۳۴) جس شخص کو اسکا شوہر پسند نہیں رکھتا کہ وہ اس کے گھر آئے اور وہاں بیٹھے اسے اس کی بیوی داخلہ کی اجازت نہ دے۔ بیوی کو چاہیے کہ شوہر کی اولاد کی نیک تربیت کرے، شوہر کے لیے کھانا پکائے، اس کے لباس کا خیال رکھے اور جب وہ اسے مجامعت کے لیے بلائے تو انکار

کرے۔ شوہر کا حق ہے کہ بیوی کو پابندی شرع کا حکم دے، اسے نماز روزہ بجالانے اور شرعی لباس پہننے کا حکم دے اور خلاف شرع امور سے روکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ''خود کو نار جہنم سے بچاؤ اور اپنے اہل خانہ کو بھی۔'' (تحریم، ۶)

اگر بیوی خلافِ شرع امور سے نہ رکے تو شوہر اس سے ترک کلام کرے۔ اگر اس سے اصلاح نہ ہو تو اسکا بستر اپنے سے الگ کردے پھر بھی اگر باز نہ آئے تو اسے ہلکا پھلکا مارے، اس طرح نہ مارے کہ نشان پڑ جائیں یعنی سخت مار نہ مارے۔ اللہ فرماتا ہے: وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ''جن عورتوں (بیویوں) کی نافرمانی کا تمہیں ڈر ہو انہیں تم سمجھاؤ، ان کا بستر الگ کردو، اور انہیں مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرلیں تو ان پہ زیادتی کا کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔'' (نساء، ۳۴)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ یعنی شوہر اور بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق لازم ہونے کا یہ معنی نہیں کہ دونوں کا درجہ مساوی ہے، نہیں بلکہ شوہر کو بیوی پر فضیلت اور فوقیت ہے۔ کیونکہ وہ گھر کا سربراہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔'' (نساء: ۳۴) گویا گھر بھی ایک چھوٹی حکومت ہے جس میں شوہر سربراہ ہے۔ بیوی اس کی وزیر ہے اور بچے رعایا۔ سربراہ کو اپنے وزیر سے مشاورت کیساتھ حکومت خانہ کو چلانا چاہیے۔ البتہ وزیر کو وزیر ہی رہنا چاہیے، سربراہ بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

اسلام عادلانہ عائلی نظام قائم کرتا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ میں عادلانہ خانگی نظام متعارف کرایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جس طرح عورت پہ اس کے شوہر کے حقوق ہیں اسی طرح شوہر پہ عورت کے بھی حقوق ہیں۔ اسلام سے قبل عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت بھیڑ بکری سے زیادہ نہ تھی۔ اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا۔ یورپ میں انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک عورت کو ایک جانور سے زیادہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ انقلاب فرانس کے بعد عورت کو آزادی ملی اور اسے اس قدر آزدی دے دی گئی کہ شوہر کی گردن بیوی کے ہاتھ میں چلی گئی۔ وہ جب چاہے شوہر کو لات مار کر گھر سے نکال سکتی ہے مگر اسلام دین فطرت ہے۔ اس کی نظر میں عورت گھر کی ملکہ ہے، وہ بھیڑ بکری ہے نہ شترِ بے مہار۔ بلکہ وہ ایک ذمہ دار انسان ہے۔

عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی:

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ سے واضح ہوگیا کہ گھر میں شوہر ہی سربراہ ہے۔ اب گھروں سے شہر بنتے ہیں اور شہروں سے ملک۔ جب ایک گھر میں عورت سربراہ نہیں بن سکتی تو پورے ملک کی سربراہ کیسے بن سکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ

کے عہدِ ظاہری میں اہل ایران نے عورت کو سربراہِ مملکت بنایا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: لن یُفلِحَ قومٌ ولّوا امرَھم امرأۃً، "وہ قوم فلاح نہ پائے گی جنہوں نے عورت کو سربراہ مملکت بنا دیا۔"
(بخاری کتاب المغازی باب ۸۲، ترمذی کتاب الفتن باب ۷۵، نسائی انتساب القضاۃ باب ۸)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط وَلَا يَحِلُّ
(رجعی) طلاق دو ہی مرتبہ ہے پھر بھلائی کے ساتھ روک لینا ہے یا نیکی کے ساتھ چھوڑ دینا [259] اور تمہارے لئے
لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ
جائز نہیں کہ تم نے بیویوں کو جو کچھ دیا تھا اس میں سے کچھ واپس لو مگر یہ کہ میاں بیوی کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں
اللّٰهِ ط فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ لا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا
قائم نہ رکھ سکیں گے، پھر اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر اس بارے میں کوئی گناہ
افْتَدَتْ بِهٖ ط تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ج وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
نہیں کہ عورت اس (طلاق) کا فدیہ دیدے [260] یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کرے
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾
تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ [261]

طلاق رجعی اور خلع کا بیان

[259] حضرت ہشام بن عروہ رضی اللہ عنہما اپنے والد حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ (دور جاہلیت میں) مرد کو اختیار تھا کہ عورت کو طلاق دے کر عدت کے اختتام سے قبل رجوع کر لے اور ایسا وہ ہزار بار کر سکتا تھا۔ (یوں عورت کو ایک طرح سے عرصۂ دراز تک سولی پہ لٹکا دیا جاتا تھا) جب اسلام آیا تو ایک شخص نے بیوی کو طلاق دی اور عدت ختم ہونے سے قبل رجوع کر لیا پھر طلاق دیدی اور کہا واللہ میں تجھ سے ہمیشہ ایسا ہی کرتا رہوں گا تب یہ آیت اتری: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ط (درمنثور) یعنی اللہ نے فرمایا کہ طلاق دو ہی مرتبہ ہے معنی یہ ہے کہ دو ہی مرتبہ طلاق دے کر اسے واپس لیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر تیسری طلاق دی تو پھر نکاح ختم ہو

جائے گا جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔ گویا اسلام نے عورت پر ہونے والے اس ظلم کا خاتمہ کر دیا کہ اسے بار بار طلاق دیتے اور رجوع کرتے رہو۔ یوں فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ کا مطلب یہ ہے کہ ایک یا دو طلاق کے بعد یا تو عورت کو بھلائی کے ساتھ رکھ لو یعنی نئی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز کر دو یا اسے بھلائی کے ساتھ آزاد کر دو، اس طرح کہ اس پہ الزام تراشی نہ کرو کہ وہ بدچلن تھی بدکردار تھی وغیرہ وغیرہ۔

اسلام کا عورت پہ احسان:

معلوم ہوا کہ اسلام نے حقوقِ خواتین کا تحفظ کیا ہے اسلام سے قبل عورت ظلم کی چکی میں پس رہی تھی، جاہلیت میں رجعی طلاق کی کوئی حد نہ تھی۔ لوگ بار بار طلاق دے کر رجوع کرتے رہتے۔ اسلام نے اس کی دو طلاق کے ساتھ حد بندی کر کے عورت کو ہمیشہ کے لیے ظلم کی چکی میں پسنے سے بچا لیا پھر اسلام کو عورتوں کے حقوق کا غاصب کہنے والوں کو شرم آنی چاہیے۔ یہ لوگ قرآن کریم کو پڑھتے ہی نہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو تعصب کی نظر سے، نہ کہ ہدایت لینے کی نظر سے

جائز کاموں میں سب سے بری چیز طلاق ہے:

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا الطلاق اثنان بلکہ فرمایا الطلاق مرتان کہ رجعی طلاق دو ہی مرتبہ ہے یعنی دو طلاقیں بھی اکٹھی نہ دو بلکہ دو مرتبہ میں دو۔ پہلے ایک ہی طلاق دو اور کوشش کرو کہ اسی سے معاملہ درست ہو جائے اور دوسری طلاق کی نوبت ہی نہ آئے اور اگر ایک طلاق سے معاملہ نہ سدھرے تو دوسری طلاق دو۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں طلاق ناپسندیدہ چیز ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ابغض الحلال الی اللہ عزوجل الطلاق، ''حلال کاموں میں سے اللہ کے ہاں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔'' (ابوداود، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی)

[260] طلاق کی صورت میں مرد کو عورت سے وہ حق مہر اور زیورات واپس لینا جائز نہیں جو اس نے شادی کے موقع پر اسے دیئے تھے۔ ہاں ایک صورت میں حق مہر وغیرہ واپس لیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ اے مسلمانو یا اے خاندان والو اگر تمہیں ڈر ہے کہ میاں بیوی کے باہمی شدید اختلاف کے باعث نکاح کا چلنا مشکل ہے اور خطرہ ہے کہ وہ اللہ کی حدود پامال کریں گے کہ شوہر بیوی کے حقوق نہیں دے گا اور وہ اس کی اطاعت نہیں کرے گی، ایسے میں اگر عورت خلع کرنا چاہے تو جائز ہے۔ وہ یہ کہ عورت حق مہر یا زیورات واپس کر کے کہے کہ اسے اس کے عوض طلاق دیدی جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک عورت کا نکاح کسی سیاہ رنگ اور چھوٹے قد والے شخص سے کر دیا گیا اور حق مہر میں ایک باغ عورت کو ملا۔ جب عورت نے اپنا شوہر پہلی بار دیکھا تو اسے سخت ناپسند آیا۔ شوہر نے

کہا اگر وہ میرا باغ مجھے واپس لوٹا دے تو میں اسے آزاد کر دوں گا۔ نبی ﷺ نے عورت سے پوچھا۔ اس نے کہا میں باغ سے زیادہ بھی دینے کو تیار ہوں۔ چنانچہ باغ واپس دلوا کر دونوں میں تفریق کر دی گئی۔ (ابن جریر)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خلع کو طلاق بائن قرار دیا ہے۔ (یعنی حلالہ کے بغیر میاں بیوی دوبارہ نکاح قائم کر سکتے ہیں) (درمنثور بروایت بیہقی) اور خلع کے لیے میاں بیوی دونوں کی رضا مندی ضروری ہے۔ کوئی ایک فریق بھی راضی نہ ہو تو خلع نہیں ہو سکتا۔ خلع کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور جب وہ مطالبہ کرے تو دو صورتیں ہیں۔ اگر شوہر اس کی بات مان لے اور جتنے مال کی ادائیگی پہ دونوں کا اتفاق ہو جائے اس کے مطابق مرد اس کو طلاق دیدے تو بہتر ہے۔ اگر مرد خلع دینے پہ تیار نہ ہو تو عورت کو عدالت میں جانے کا حق ہے۔

[261] یعنی یہ طلاق اور خلع کے احکام اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں۔ ان سے تجاوز مت کرو جو شخص ایسا کرے وہ ظالم ہے اگر مرد اپنی بیوی کو اس قدر تنگ کرے کہ وہ مجبور ہو کر خلع پر آمادہ ہو تو وہ مرد ظالم ہے اور اگر عورت اپنے شوہر سے بلا عذر خلع لینا چاہے تو یہ اس کی زیادتی ہے۔

طلاق کی صورت میں عورت سے زیورات کا واپس لینا ظلم ہے:

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ سے پتہ چلا کہ شادی پر مرد کے گھر والے عورت کو جو زیورات دیتے ہیں وہ طلاق کے وقت اس سے واپس لینا جائز نہیں، وہ اسی کے ہیں اور انکی زکوٰۃ بھی اسی پہ واجب ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو اور پہلی بیوی کو تم نے مال و دولت کا انبار دیا ہو تو بھی اس سے کچھ واپس نہ لو۔'' (النساء، ٢٠) مگر بہت سے جہلاء عورتوں کو طلاق دے کر ان سے سب کچھ چھین لیتے ہیں یہ ظلم عظیم ہے۔ عورت اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہے۔

اگر میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے تو نکاح کا ختم کر دینا ہی بہتر ہے:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ سے واضح سبق مل رہا ہے کہ جو والدین اور خاندان والے اپنے بچوں کو محض خاندان کی بقاء کے لیے بچوں کی باہمی ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کے باوجود نکاح میں بندھے رہنے پر مجبور کرتے ہیں وہ اپنے بچوں پر صریح ظلم کرتے ہیں۔ گویا وہ اپنے بہنوں بھائیوں کی خوشنودی کیلیے اپنے بچوں کو سولی پہ لٹکا دیتے ہیں۔ یا وہ اپنے بچوں کو محض گڈے گڈیاں سمجھتے ہیں، جیسے چھوٹے بچے گڈی گڈے کی شادی کا کھیل کرتے ہیں، اسی طرح بعض لوگ بھی گڈی گڈے کی شادی کا کھیل کرتے ہیں انہیں یہ احساس نہیں کہ جن بچوں کی انہوں نے باہم شادی کی ہے وہ انسان ہیں۔ ان کے بھی جذبات واحساسات ہیں اگر ان کا احساس نہ کیا جائے تو

اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔

دراصل حد اعتدال سے گزرنا کسی بھی معاملہ میں باعث فتنہ ہے۔ بچوں کو بھی چاہیے کہ شادی کر کے خود کو والدین سے قطعی آزاد نہ سمجھیں بلکہ ان کی رائے کا احترام کریں اور والدین کو بھی جاننا چاہیے کہ جب ایک بچہ بالغ عاقل ہو گیا ہے تو وہ ایک مکمل بااختیار انسان ہے۔ اس کے اپنے جذبات ہیں اور میاں بیوی کے دلوں کو باہم ملانے والا اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ ان کے دل باہم نہیں ملائے تو انہیں زبردستی کوئی نہیں ملا سکتا۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ
پھر اگر وہ بیوی کو (تیسری بار) طلاق دیدے تو اس کے بعد وہ عورت اس کیلئے حلال نہیں جب تک وہ اس کے سوا دوسرے شوہر سے مباشرت
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ
نہ کرے [262] پھر اگر وہ اسے طلاق دیدے تو دونوں کے باہم رجوع میں حرج نہیں اگر وہ سمجھیں کہ حدود اللہ قائم رکھ سکتے ہیں
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾
اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں وہ علم والے لوگوں پر واضح کرتا ہے۔ [263]

تیسری طلاق کے بعد حلالہ کا بیان

[262] یعنی اگر شوہر نے دو طلاقوں کے بعد فوراً تیسری طلاق بھی دیدی (جیسا کہ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ میں فاء برائے تعقیب مع الوصل بتا رہی ہے) یا کچھ عرصہ کے بعد تیسری طلاق دیدی تو اب وہ عورت اس شخص کے لیے حلال نہ رہی۔ سوا اس کے کہ وہ عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح اور مجامعت کرے پھر وہ اسے طلاق دیدے۔ تب وہ عدت گزار کر پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے، اسی کو حلالہ کہتے ہیں۔

حضرت رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیں۔ اس عورت نے عدت کے بعد عبدالرحمان بن زبیر قرظی سے نکاح کر لیا۔ پھر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی: عبدالرحمن کے پاس تو اس پلو جیسی چیز ہے۔ (یعنی وہ ہم بستری پر قادر نہیں ہے) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہو؟ لا، حتی تذوقی عُسیلته ویذوق عُسیلتكِ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک تم اس کا (عبدالرحمن کا) شہد نہ چکھو اور وہ تمہارا شہد نہ چکھے۔ (یعنی وہ تم سے باقاعدہ ہم بستری نہ کرے)۔ (بخاری جلد دوم کتاب الطلاق صفحہ ۷۹۱ مطبوعہ کراچی)

اس حدیث صحیح سے صاف معلوم ہوا کہ تین طلاقوں کی صورت میں جب تک دوسرا شوہر عورت سے باقاعدہ ہم

بستری نہ کرے وہ صرف لفظی نکاح اور طلاق کی کارروائی پوری کر کے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی، اسی کو حلالہ کہتے ہیں اور اس آیت میں حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ (جب تک وہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے) کے الفاظ بھی بتا رہے ہیں کہ نکاح سے مباشرت (ہم بستری) مراد ہے کیونکہ زوج (شوہر) سے نکاح کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ شوہر سے مباشرت مراد ہے اور نکاح بمعنی مباشرت کی مثال قرآن میں یہ بھی ہے حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ جب بچے نکاح (مباشرت) کی عمر کو پہنچ جائیں۔ (نساء،٦) خلاصہ یہ ہے کہ شوہر ثانی جب تک بیوی سے باقاعدہ مباشرت اور دخول نہ کرے تب تک وہ پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔

ایک مجلس میں تین طلاقیں تین ہی شمار کی جائیں گی:

فَاِنْ طَلَّقَهَا میں فاء برائے تعقیب مع الوصل ہے۔ یعنی اگر شوہر نے دو طلاقوں کے فوراً بعد بالوصل اسی مجلس میں ایک اور طلاق دیدی تو عورت اپنے شوہر پر حلال نہ رہی جب تک کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔ اسی لیے چاروں ائمہ فقہ کا اس پہ اجماع ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں تین ہی ہیں پھر یہاں کثیر احادیث اس مفہوم پر دال ہیں۔ مثلاً

حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

أُخبِر رسولُ الله ﷺ عن رجل طلّق امرأته ثلاثا جميعا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا کہ فلاں شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں۔

فقام غضبانا ثم قال ایُلعَبُ بکتاب الله وانا بین اظهرکم؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غصے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا: کیا اللہ کی کتاب سے کھیلا جانے لگا ہے اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟

(نسائی شریف کتاب الطلاق باب ٦ حدیث ٣٤٣٠)

اگر تین طلاقیں اکٹھی دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے جیسا کہ آج اہل حدیث مکتب فکر کے لوگوں کا خیال ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس قدر غضبناک ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایک طلاق تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی دی ہے۔ آپ کے غضبناک ہونے کا یہی معنی ہے کہ تین طلاقیں تین ہی ہیں اور یوں کسی کا ایک لحظہ میں نکاح کو مکمل ختم کر دینا حضور کے لیے باعث رنج و غم ٹھہرا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ عویمر بن اشقر عجلانی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے لعان کیا:

فطلّقها ثلاث تطلیقات عند رسول الله ﷺ فانفذه رسول الله ﷺ وکان ما صُنع عند النبی ﷺ سنة

پھر انہوں نے بیوی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے تین طلاقیں دیدیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں جاری کر دیا، تو جو

کچھ نبی اکرم ﷺ کے سامنے کیا جائے (اور اگر حضور سرور کائنات ﷺ اسے نافذ کر دیں) تو وہ سنت بن جاتا ہے۔
(ابوداود کتاب الطلاق باب ۲۷ حدیث ۲۲۵۰)

یہ حدیث اپنے مفہوم میں کس قدر واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں دی گئیں تو آپ نے انہیں نافذ کر دیا۔ یہ حدیث بخاری کتاب الطلاق باب ۴ اور مسلم کتاب اللعان حدیث ا میں بھی موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دیدوں تو کیا میرے لیے رجوع کا حق ہے؟ فرمایا نہیں وہ تجھ سے جدا ہو جائے گی اور یہ گناہ ہوگا۔
(دارقطنی جلد چہارم صفحہ ۱۹ کتاب الطلاق مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت سلمہ بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

ان حفص بن المغیرۃ طلق امرأته فاطمة بنت قیس علی عهد رسول الله ﷺ ثلاث تطلیقات فی کلمة واحدة فابانها منه النبی ﷺ ولم یبلغنا ان النبی ﷺ عاب ذالك علیه

حضرت حفص بن مغیرہ رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو ایک ساتھ تین طلاقیں دیدیں۔ نبی ﷺ نے اس عورت کو ان سے جدا کر دیا۔ راوی کہتا ہے البتہ یہ ہمیں نہیں پہنچا کہ آپ نے اس کو برا بھی جانا یا نہیں۔
(دارقطنی جلد چہارم صفحہ ۹ کتاب الطلاق)

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیں، اس کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں اکٹھی دیدی ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

ثلاث تحرّم علیك امرأتك وسائرهن وزر اتخذت آیات الله هزوا، ''تین طلاقیں ہی تجھ پر تیری بیوی کو حرام قرار دیتی ہیں اور باقی سب بوجھ ہیں اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔'' (دارقطنی جلد ۴ صفحہ ۹)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ فتویٰ کس قدر واضح ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں اور وہ عورت کو اس کے شوہر پہ حرام کر دیتی ہیں۔

ایک آدمی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے پاس آیا کہنے لگا میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیدی ہیں، انہوں نے پوچھا: تو پھر تجھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا فتویٰ دیا ہے؟ اس نے کہا: قیل لی انها قد بانت منّی مجھے یہی فتویٰ دیا گیا کہ میری بیوی مجھ سے جدا ہوگئی ہے (نکاح ختم ہوگیا ہے) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: صدقوا انہوں نے سچ کہا ہے (واقعی تیری بیوی کا تجھ سے نکاح ختم ہوگیا ہے۔) (موطاء امام مالک کتاب الطلاق حدیث ۲ صفحہ ۳۹۶)

گویا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سمیت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہی فتویٰ ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقیں تین ہی ہیں اور ان سے نکاح ختم ہو جاتا ہے۔

ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک قرار دینے پر ابن تیمیہ کے دلائل کا جواب:

علامہ ابن تیمیہ اور ان کے ہم مشرب لوگ ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق ہی جانتے ہیں اور یہ غلط نظریہ ابن تیمیہ ہی کی ایجاد ہے یعنی اگر کوئی شخص اکٹھی تین طلاقیں دیدے تو ان کے نزدیک وہ ایک طلاق ہے۔ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں اس موضوع پہ طویل گفتگو کی ہے جو تین امور کے گرد گھومتی ہے، ہم ان تینوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

اول:

ابن تیمیہ کا اصرار ہے دور رسالت مآب ﷺ میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی شخص نے بیک وقت تین طلاقیں دی ہوں اور رسول اللہ ﷺ نے تینوں ہی نافذ کر دی ہوں۔ ان کے بقول ایسا کوئی واقعہ کسی صحیح حدیث میں ثابت نہیں مگر ابن تیمیہ کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے کیونکہ ابھی ہم نسائی شریف سے حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نقل کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین طلاق دینے والے شخص پہ سخت غصہ فرمایا، گویا اسے تین طلاق سمجھا تو اسقدر غضبناک ہوئے۔ اگر ایک ہی جانتے تو غضبناک ہونے کا کیا معنی بنتا ہے۔ پھر ابھی ہم ابوداود شریف سے حدیث نقل کر آئے ہیں کہ حضرت عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے تین طلاقیں دیں تو آپ نے تینوں کو نافذ کر دیا اور یہ سب احادیث صحیحہ ہیں۔ اسی لیے چاروں ائمہ فقہ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے ایک مجلس میں تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیا ہے۔

اور صحابہ کرام بھی اکٹھی تین طلاقوں کو تین ہی جانتے تھے۔ چنانچہ ابراہیم نے علقمہ سے روایت کیا کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا، کہنے لگا میں نے اپنی بیوی کو ننانویں طلاقیں دی ہیں۔ آپ نے فرمایا:

ثلاث تبینها منك وسائرها عدوان، ”تین طلاقیں تیری بیوی کو جدا کر دیتی ہیں اور باقی سب ظلم وزیادتی ہے۔“ امام ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے، ورجاله رجال الصحیح اس کے تمام راوی بخاری کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد جلد ۴ صفحہ ۳۴۱ کتاب الطلاق باب فیمن طلق اکثر من ثلاث)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدی ہیں آپ نے فرمایا:

قد حرمت علیك امرأتك لا تحل لك حتی تنكح زوجا غیرہ ”تیری بیوی تجھ پر حرام ہوگئی ہے اور تیرے لیے حلال نہیں ہوسکتی جب تک کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے۔“

(کتاب الآثار صفحہ ۱۰۵ باب من طلق ثلاثا مطبوعہ دائرۃ القرآن کراچی)

اس روایت کے پہلے راوی امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے راوی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تیسرے راوی عبدالرحمان بن ابی حسین رحمۃ اللہ علیہ چوتھے راوی عارف باللہ حضرت عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ اور پانچویں راوی جلیل القدر تابعی

عطاء بن ابی رباح رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان تمام رواۃ کی ثقاہت پہ گفتگو کی ضرورت ہی نہیں تو پھر ابن تیمیہ کے اس دعویٰ کی کیا حقیقت ہے کہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کے تین ہونے پر کوئی صحیح حدیث نہیں۔

ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک کرنے پہ دوسری دلیل کا رد

ابن تیمیہ نے مسلم کی اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ طاوس کہتے ہیں ابو الصہباء نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کیا آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہاں ایسا ہی تھا مگر جب دور عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں لوگوں نے متواتر تین طلاقیں دینا شروع کر دیں تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ تین طلاقیں تین ہی ہونگی (مسلم کتاب الطلاق) معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تین طلاقیں ایک ہی جانی جاتی تھیں، لہٰذا اسی پہ عمل ہونا چاہیے۔

اس روایت سے ابن تیمیہ اور موجودہ اہل حدیث کا استدلال درست نہیں ہے اس روایت کو مردود اور نا قابل حجت قرار دیا گیا ہے۔ امام ابن ترکمانی الجوہر النقی میں فرماتے ہیں: طاوس کا یہ قول ابو صہباء کی روایت پہ مبنی ہے اور اس شخص سے صرف مسلم نے روایت لی ہے، بخاری نے نہیں لی کیونکہ اس شخص پہ کلام کیا گیا ہے۔ امام ذہبی کاشف میں فرماتے ہیں: امام نسائی نے کہا کہ ابو صہباء ضعیف ہے، اسی لیے امام بخاری نے یہ حدیث ترک کی ہے اور ابو صہباء کی وجہ سے ترک کی ہے اور صاحب استذکار نے کہا کہ یہ روایت محض وہم اور غلط ہے۔ اس پہ کوئی عالم اعتبار نہیں رکھتا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابو صہباء حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے موالی (قریبی ساتھیوں) میں سے نہیں تھا مگر طاوس کہتا ہے کہ اس نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ سوال کیا، حالانکہ جو بات ابو صہباء نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کی ہے وہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتی۔ (الجوہر النقی فی ذیل سنن البیہقی جلد ۷ صفحہ ۳۳۷ مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

اس روایت کا وہم اور غلط ہونا اس لیے بھی واضح ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس حلال کو حرام قرار دیں جس کی حلت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کی حلت پہ متفق تھے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک حلال کو حرام قرار دیا اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے (معاذ اللہ) مداہنت و چاپلوسی سے کام لیتے ہوئے خاموشی سادھ لی تو پھر کس صحابی کا دین قابل اعتبار رہے گا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جرأتِ ایمانی کا عالم تو یہ ہے کہ روایات کے مطابق ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خطبہ کہہ رہے ہیں اور ایک صحابی اٹھ کر کہتے ہیں کہ آپ نے بیت المال سے دو چادریں کیوں لی ہیں جبکہ باقی سب لوگوں کو ایک ایک چادر ملی ہے؟ کیونکہ ایک چادر سے آپ کا لباس نہیں بن سکتا تھا۔ تب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے اٹھ کر کہتے ہیں کہ میں نے اپنی چادر والد صاحب کو دی تھے۔

اگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب اس قول کو درست مان لیا جائے تو اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ

بعض لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے عہد نبوی اور عہد صدیقی میں تین طلاقوں کو ایک طلاق بنا لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے باوجود ہم رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ اس روایت میں ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق بنانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ مطلقاً تین طلاقوں کو ایک طلاق بنانے کا ذکر ہے اور یہ ایک مغالطہ ہی ہوسکتا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کے اس مغالطہ کو دور کر دیا اور اعلان کر دیا کہ تین طلاقیں قابل رجوع نہیں ہوتیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے آپ نے اپنے دور میں حرمت متعہ کا بھرپور اعلان کیا اور کہا کہ میں اسے حرام قرار دیتا ہوں تو شیعہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ شائد متعہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام نہیں کیا تھا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حرام قرار دیا۔ اسی طرح ابن تیمیہ نے غلط سمجھ لیا کہ عہد نبوی میں حکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تین طلاقوں کو ایک سمجھا جاتا تھا۔

پھر یہی حدیث بتا رہی ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا ایک طلاق نہیں ہے بلکہ یہ تین طلاقیں ہی ہیں تو کسی صحابی رسول رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت نہیں کی معلوم ہوا کہ اس بات پہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجماع کر لیا کہ اکٹھی تین طلاقیں تین ہی ہوتی ہیں تو جس بات پہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو جائے اس کی مخالفت گمراہی نہیں تو اور کیا ہے۔

اسی لیے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ

"تم پہ لازم ہے کہ میری سنت کو اور خلفاء رشدین مہدیین کی سنت کو اختیار کرو، اسے مضبوطی سے تھام لو اور اس میں اپنی داڑھیں گاڑ دو" (سنن ابوداود کتاب السنہ باب ۵ حدیث ۴۶۰۷) یہ حدیث ترمذی و ابن ماجہ میں بھی ہے تو اہل حدیث علماء کو اجماع صحابہ اور سنت خلفاء راشدین کی مخالفت کرتے ہوئے خدا کا خوف محسوس ہونا چاہیے۔

ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک کرنے پہ تیسری دلیل کا رد

علامہ ابن تیمیہ اور اس کے ہم مشرب لوگ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے کے لیے مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ میں مروی اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طلاق کو ایک طلاق قرار دیا اور انہیں رجوع کا حق دیدیا۔

یہ استدلال بھی درست نہیں ہے کیونکہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ابوداود، ترمذی اور ابن ماجہ میں بھی ہے جس میں یہ ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا:

یا رسول اللہ انی طلقت امرأتی البتة میں نے اپنی بیوی کو طلاق البتہ دی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ اس سے تم نے کیا مراد لیا تھا۔ انہوں نے کہا: اردت واحدة، میں نے ایک طلاق مراد لی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم قسم اٹھاتے ہو کہ تم نے ایک ہی طلاق مراد لی تھی؟ انہوں نے کہا میں قسم اٹھاتا ہوں ما اردت الا واحدة میں نے

ایک طلاق سے زیادہ مراد نہیں لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: فھو ما اردت، تو پھر جو تو نے مراد لیا وہی ہے۔

(سنن ابی داود کتاب الطلاق باب فی البتۃ حدیث ۲۲۰۶، جامع الترمذی کتاب الطلاق باب ماجاء فی طلاق البتۃ حدیث ۱۱۷۷، ابن ماجہ کتاب الطلاق باب طلاق البتۃ حدیث ۵۱۲۰)

تو ابن تیمیہ اور اسکے ساتھیوں کا عجیب طریقہ ہے کہ وہ صحاح کی اس روایت کو چھوڑ کر مسند احمد کی روایت کو اس پہ کس اصول کے تحت ترجیح دیتے ہیں؟

پھر امام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے التلخیص الحبیر جلد ۳ صفحہ ۲۱۳ مطبوعہ مصر میں مسند احمد والی حدیث کو مضطرب قرار دیا ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے العلل المتناھیۃ جلد ۲ صفحہ ۱۵۱ مطبوعہ فیصل آباد میں اس کے راوی ابن سحاق اور داود کو ضعیف کہا ہے اور امام ابو بکر بن احمد جصاص نے احکام القرآن جلد اول صفحہ ۳۸۸ مطبوعہ لاہور میں کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے اور امام ابن ھمام فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۳۳۱ فرماتے ہیں:

اما حدیث رکانۃ فمنکر والاصح ما رواہ ابو داود والترمذی وابن ماجۃ حدیث رکانہ منکر ہے اور صحیح وہی ہے جو ابوداود، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس کے باوجود اسے صحاح کی روایت پہ ترجیح دینا سینہ زوری کے سوا کیا ہے۔

بلکہ ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ کی مروی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ سے پوچھنا کہ تم نے طلاق البتۃ سے کیا مراد لیا ہے اور ان کا کہنا کہ میں نے ایک ہی طلاق مراد لی تھی اور پھر رسول اللہ ﷺ کا ان سے اس پہ قسم لینا صاف بتا رہا ہے کہ اگر وہ کہتے کہ میں نے تین طلاقیں مراد لی تھیں تو حضور ﷺ تین طلاقیں ہی نافذ فرماتے۔ اگر اکٹھی تین طلاقیں واقع ہی نہیں ہوتیں تو رسول اللہ ﷺ کا حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ سے قسم لینے کا کیا معنی باقی رہتا ہے۔ یہ خود ایک دلیل ہے کہ ایک مجلس میں اکٹھے تین طلاقیں دینا تین ہی ہوتا ہے اور اسی پہ تمام صحابہ، تابعین اور فقہاء کا اجماع ہے۔

اس لیے امام ابن ھمام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بیک وقت تین طلاقوں کے تین ہی ہونے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے اور کسی سے اس کی مخالفت مروی نہیں ہے تو حق آجانے کے بعد ضلالت ہی باقی رہ جاتی ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر کسی حاکم نے یہ حکم کیا کہ ایک زبان کے ساتھ اکٹھی تین طلاقیں دینا ایک طلاق ہے تو اسکا حکم نافذ نہ ہوگا۔

(فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۳۳۰ کتاب الطلاق مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ)

میں نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے جبکہ میرے والد گرامی شیخ الحدیث محقق اسلام فاتح رافضیت علامہ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۴۱۸ھ نے شرح موطا امام محمد جلد دوم کتاب الطلاق، مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور میں اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پہ خوب روشنی ڈالی ہے اور ابن تیمیہ کی ایک ایک دلیل کو لے کر اس کے نہایت مدلل اور ٹھوس جوابات لکھ دیے ہیں تو مزید تفصیل کے لیے وہیں دیکھیں۔

حلالہ کی شرعی حیثیت:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ط سے معلوم ہوا حلالہ یہ ہے کہ تین طلاقوں کے بعد عورت پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوسکتی جب تک وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح ومباشرت نہ کرے پھر وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دے۔ تب وہ پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے۔ جب یہ چیز نص قرآن نے بتادی تو اس کا منکر کافر ہے تاہم حلالہ کو لوگوں نے جس طرح لے لیا ہے یہ غلط طریقہ ہے۔ حلالہ اس صورت میں جائز ہے کہ دوسرا شوہر کسی پیشگی شرط اور دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے طلاق دے۔ اگر طلاق کی پیشگی شرط پر حلالہ کیا جائے تو کرنے والا اور کروانے والا دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلالہ کرنے اور کروانے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔ (ابن ماجہ کتاب النکاح صفحہ ۱۳۹)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ حلالہ کرنے اور کروانے والے دونوں پر لعنت فرماتا ہے۔ (ابن ماجہ عن عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ حوالہ مذکورہ) اور یہ لعنت اسی صورت میں ہے جب حلالہ میں طلاق کی پیشگی شرط رکھی جائے۔ ہاں اگر حلالہ کرنے والا اپنی خوشی سے طلاق دیدے تاکہ دودل آپس میں مل جائیں اوران کے بچے برباد ہونے سے بچ جائیں تو یقیناً یہ کارثواب ہے۔ تاہم اگر پیشگی شرط کے ساتھ حلالہ کیا گیا تو عورت پہلے شوہر کے لیے بہرصورت حلال ہوگئی۔ اگرچہ گناہ ہوا۔

چنانچہ ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کہ حلالہ کرنے اور کروانے والا دونوں پہ لعنت ہے، کے تحت فرماتے ہیں:

وقالوا ولو نويا اشتراط التحليل ولم يقولاه يكون الرجل ماجورا لقصد الاصلاح۔ فقہاء فرماتے ہیں: اگر حلالہ کرنے اور کروانے والے دونوں افراد نے طلاق کا شرط ہونا صرف نیت میں رکھا مگر زبان نے یہ شرط بیان نہ کی تو ایسا شخص ثواب پاتا ہے، کیونکہ اس کا مقصود اصلاح ہے۔

(مرقات شرح مشکوۃ جلد ۶ صفحہ ۲۹۸ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان)

اگر عورت بغیر اذن ولی اپنی مرضی سے شادی کرلے تو نکاح منعقد ہے:

حتی تنکح زوجا غیرہ میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عورت کے ازخود نکاح کرنے سے اس کا نکاح ہوجاتا ہے، اور جو اولاد ہوگی وہ ثابت النسب ہے اور اپنے والدین کی جائز وارث، اگرچہ ایسا کرنا اس کے لیے بہتر نہیں، اور اگر عورت ادنیٰ خاندان میں شادی کرلے تو اس کے والدین بذریعہ عدالت نکاح کو فسخ کرواسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حنابلہ اور شوافع کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر عورت کا اپنی مرضی سے نکاح کرلینا باطل ہے، وہ ان احادیث سے دلیل لاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس عورت نے ولی کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے۔''

مگر احناف نے ان احادیث کو اس معنی پہ محمول کیا ہے کہ یہ نکاح ناقص اور خلاف سنت ہے، کیونکہ قرآن کا حکم حدیث پہ غالب ہے، قرآن نے حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ کہہ کر نص فرمادی ہے کہ عورت اپنا نکاح خود کرسکتی ہے، اور عقل سلیم بھی کہتی ہے کہ عورت کو اپنے نکاح کا خود اختیار ہونا چاہیے، کیونکہ جب ایک انسان عاقل بالغ ہوگیا تو وہ ایک خودمختار فرد ہے، اسے اپنے اپنے وجود کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور عورت خواہ کنواری ہو یا ثیبہ۔

پھر یہ بھی یادرہے کہ شوافع اور حنابلہ کنواری عورت کا ولی کے بغیر نکاح درست نہیں مانتے، مگر مطلقہ یا بیوہ کا نکاح بغیر ولی درست مان لیتے ہیں، اس پہ ہم کہتے ہیں کہ گویا خود ان ائمہ نے بھی ان احادیث کو ظاہر پہ محمول نہیں کیا بلکہ ان میں تخصیص کی ہے، تو بہتر یہ ہے کہ ان کی تشریح ہی ایسے کی جائے کہ تخصیص کی ضرورت ہی نہ رہے، اور وہ یہ ہے کہ باطل کو ناقص کے معنی میں لیا جائے۔

[263] یعنی جب حلالہ کی صورت میں دوسرا شوہر اپنی خوشی سے طلاق دیدے تو عورت عدت گزار کر پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے۔ بشرطیکہ دونوں یہ سمجھتے ہوں کہ وہ اللہ کی حدود یعنی ایک دوسرے کے حقوق خوش اسلوبی سے ادا کرسکیں گے اور اگر ڈر ہو کہ دوبارہ پہلے والے حالات بن جائیں گے اور بات طلاق تک ہی پہنچے گی تو دور رہنا ہی بہتر ہے۔

حلالہ کا مقصد طلاق کی حوصلہ شکنی ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ سے معلوم ہوا حلالہ کرنے والے شخص سے دباؤ کے ذریعے طلاق لینا جائز نہیں۔ وہ اپنی خوشی سے طلاق دے تو دے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ حلالہ کا مقصد ہی طلاق کا راستہ روکنا ہے، کوئی بھی شخص تین طلاق دینے سے قبل ہزار بار سوچے گا کہ اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے دوسرے شخص کے نکاح میں جاسکتی ہے۔ اگر حلالہ کا راستہ نہ کھلا ہوتا تو تین طلاق کے بعد عورت اپنے شوہر کے پاس کبھی کسی صورت واپس نہ جاسکتی تو کوئی گھر ہمیشہ کے لیے تباہ اور ان کے بچے برباد ہوجاتے، گویا اللہ تعالیٰ نے حلالہ کے ذریعہ ایک گھر کو تباہی سے بچانے کا راستہ پیدا فرمایا ہے۔ اور اگر حلالہ کے بغیر عورت کو یونہی شوہر سے دوبارہ نکاح کی اجازت دیدی جاتی تو یہ عورت پر ظلم تھا۔ مرد اپنی عورتوں کو مسلسل طلاقیں دیتے جاتے کیونکہ انہیں خبر ہوتی کہ وہ پھر نکاح کرسکتے ہیں۔ یوں نکاح وطلاق ایک کھیل بن جاتے اور عورت اس کھیل کا کھلونا ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے تین طلاقوں کی صورت میں حلالہ کو لازم کرکے عورت کو بار بار کھلونا بننے سے بچالیا ہے۔

یہ شبہ کہ طلاق کی سزا عورت کو بصورتِ حلالہ کیوں دی جائے؟

اس جگہ اگر یہ سوال کیا جائے کہ بسا اوقات مرد جذباتی ہوتا ہے، وہ جذبات میں آکر عورت کو بلاوجہ تین طلاق دیدیتا

ہے، تو ایسے میں عورت کا کیا قصور ہے کہ اسے حلالہ کی سزا دی جائے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کے قوانین پورے اسلامی معاشرہ کو برائیوں سے پاک کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں، خصوصاً عائلی قوانین کا حقیقی مقصد عورتوں کو ان مظالم سے بچانا ہے جو اسلام سے قبل ان پر روا رکھے جاتے تھے۔ یہ حلالہ ہی کا خوف ہے جو مردوں کو تین طلاقیں دینے سے روکتا ہے، یہ طلاق کی شدید حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی معاشرہ میں طلاق کی شرح یورپ وامریکہ کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے۔ گویا اگر لاکھوں کروڑوں میں سے صرف چند عوتیں حلالہ کی سزا سہہ کر باقی تمام عورتوں کا مستقبل محفوظ کر دیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ طلاق کی نوبت یک طرفہ بے اعتدالیوں کی وجہ سے نہیں آتی۔ عموماً اس میں زوجین دونوں کی رسہ کشی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر بعض مرد جذباتی ہوتے ہیں تو عورتیں عموما ہوتی ہی جذباتی ہیں اور حلالہ دونوں کے لیے سزا ہے۔ جیسے یہ عورت کے لیے باعث آزار ہے یونہی مرد کے لیے باعث عار ہے تو حلالہ کا حکم ہر میاں بیوی کے لیے خدائی تنبیہ ہے کہ وہ تین طلاق کی نوبت نہ آنے دیں اس سے پہلے ہی معاملات کو سلجھالیں ورنہ حلالہ کے بغیر وہ کبھی اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی مدت (کے اختتام) کو پہنچ جائیں تو انہیں بھلائی کے ساتھ روک لو یا بھلائی کے ساتھ

سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ

آزاد کر دو اور انہیں نقصان دینے کے لئے مت روکو کہ زیادتی کرو اور جو ایسا کرے اس نے خود اپنے اوپر

ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۟ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ

ظلم کیا [264] اور اللہ کی آیات کو وجہ مذاق نہ بناؤ اور اللہ کی نعمت یاد کرو

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ

جو تم پہ ہے اور جو اس نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری، وہ تمہیں اس کے ذریعے نصیحت کرتا ہے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۳۱ ع

اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ [265]

ع ۲۹ ۱۲ الثلثة

[264] حضرت سدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص ثابت بن یسار انصاری نے اپنی بیوی کو طلاق دی جب مدت ختم

ہونے میں دو تین دن رہ گئے تو اس نے طلاق واپس لے لی اس کے بعد پھر طلاق دیدی۔ اس کا یہ عمل جاری رہا۔ حتیٰ کہ نو ماہ یونہی گزر گئے۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں یہ آیت اتاری: وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ۪ (درمنثور جلد اول صفحہ ۲۸۲)

یعنی اللہ نے فرمایا جب رجعی طلاق کے بعد عدت ختم ہونے کو آئے تو تم بیوی کو خواہ بھلائی کے ساتھ رکھ لو کہ آئندہ اس کے مخلص ساتھی بن کر رہو گے یا اسے بھلائی کے ساتھ آزاد کر دو اس طرح کہ اس کی عدت گزر جانے دو۔ نکاح از خود ختم ہو جائے گا۔ اور حلالہ کے بغیر دوسری بار نکاح ممکن ہوگا اور نہ ہی اس پر الزام تراشی کرو کہ وہ بدچلن تھی اس لیے ہم نے طلاق دی جیسا کہ آج کل عموماً کیا جاتا ہے۔

اگر شوہر بیوی کو خرچہ نہ دے تو وہ قاضی سے تنسیخ نکاح کروا سکتی ہے:

اس آیت میں اللہ نے فرمایا: وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ عورتوں کو اس لیے نہ روک لو کہ ان پہ زیادتی کرو اور اس سے بڑی زیادتی کیا ہے کہ مرد اپنی بیوی کو بھوکا پیاسا مارے اور بیوی کی خوراک و پوشاک کا حق جو اس پہ اللہ نے لازم کیا ہے، اسے ادا نہ کرے۔ اس بارہ میں ائمہ ثلاثہ اور متاخرین احناف کا یہی فتویٰ ہے کہ ایسی عورت بذریعہ عدالت نکاح کو فسخ کروا سکتی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے امراء عساکر کو یہ پیغام بھیجا کہ فلاں فلاں لشکری اپنی بیویوں کو مدینہ میں چھوڑ کر گئے ہیں، وہ بیویوں کے پاس لوٹ آئیں یا ان کا خرچہ بھجیں یا پھر انہیں طلاق دیدیں۔ (مصنف عبدالرزاق جلد ۷ صفحہ ۹۶ مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت)

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اذا لم یجد الرجل ما ینفق علیٰ امرأته أجبر علیٰ ان یفارقها جب آدمی اپنی بیوی پہ خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ پائے تو اسے اس بات پہ مجبور کیا جائے گا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ ایک اور قول میں وہ فرماتے ہیں: یُفَرَّقُ بینهما ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی جائے گی۔
(مصنف عبدالرزاق جلد ۷ صفحہ ۹۷)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ یعنی عورت پر ظلم کرنے کیلئے طلاق سے رجوع کرنا خود اپنے اوپر ظلم کرنا ہے کیونکہ دوسرے پر ظلم کرنے والا اپنی عاقبت برباد کرتا ہے۔

[265] حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض لوگ یونہی کسی شخص سے کہہ دیتے تھے میں نے تجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا بعد میں کہتے میں نے محض مذاق کیا تھا۔ کوئی شخص اپنے غلام سے کہتا، جاؤ میں نے تجھے آزاد کیا بعد میں کہتا میں نے تو یونہی مذاق کیا تھا۔ تب اللہ نے یہ آیت اتاری: وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۚ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ

اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ کہ اللہ کی آیات کا مذاق نہ بناؤ اور یاد رکھو کہ اللہ نے تم پر قرآن اور حکمت (یعنی حدیث) کے علوم کو اتار کر تم پر بہت بڑی نعمت ارزاں فرمائی ہے تو اس نعمت کی بے قدری نہ کرو۔

نکاح وطلاق کی اداکاری حقیقی نکاح وطلاق ہے:

وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا اپنے شان نزول کی روشنی میں بتا رہا ہے کہ لوگ نکاح کی اداکاری کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت اتار کر انہیں تنبیہ فرمائی۔ کہ دین سے یہ مذاق نہ کرو اور نکاح وطلاق کا مذاق تب ہی رک سکتا ہے جب اسے حقیقت بنا دیا جائے۔ اسی لیے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثلاثٌ جِدُّهنّ جدٌّ وهزلُهن جدٌّ، الطلاق والنكاح والرجعة تین چیزیں وہ ہیں جو خواہ سنجیدگی سے کہی جائیں یا مذاق سے وہ سنجیدہ ہی تصور کی جاتی ہیں۔ نکاح، طلاق اور رجوع۔ (ابوداؤد کتاب الطلاق باب ۹) بعض روایات میں رجوع کی جگہ عتاق ہے۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۶۸۳)

یعنی اگر کوئی مرد وعورت یا بالغ لڑکا لڑکی گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کی اداکاری کرتے ہیں تو ان کا شرعی نکاح ہو جاتا ہے۔ (بشرطیکہ عورت پہلے سے شادی شدہ نہ ہو) یہی حال طلاق کا ہے کہ اگر مذاق سے طلاق دی جائے تو وہ بھی حقیقی طلاق ہے۔ آج کل فلموں ڈراموں میں نکاح کی اداکاری ہوتی ہے۔ اس سے حقیقی نکاح ہو جاتا ہے۔ اس کی اداکاری نہ کی جائے۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو انہیں اس سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے

اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ

(ہونے والے) شوہروں سے نکاح کر لیں جب وہ بھلائی کے ساتھ آپس میں رضا مند ہوں [266] یہ نصیحت اسے

مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ

کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، یہ راستہ تمہارے لئے بہت پاکیزہ اور ستھرا ہے اور اللہ

يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔[267]

مطلقہ عورت کو نکاح ثانی سے روکنے کی برائی

[266] حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے اپنی بہن کا نکاح اپنے چچازاد بھائی سے کیا۔اس نے کچھ عرصہ بعد طلاق دیدی۔ عدت ختم ہونے کے بعد پھر دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے۔ میں نے اپنے چچازاد سے کہا۔ واللہ میں اسے دوبارہ تمہارے ساتھ نہ بیاہوں گا حالانکہ وہ دونوں ایک دوسرے سے نکاح کرنا چاہتے تھے تب یہ اتری: وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ (بخاری، ابوداؤ، ترمذی نسائی وغیرہ) معنی یہ ہے کہ اے مومنو جب تم عورتوں کو طلاق دیدو۔ یعنی تم میں سے بعض لوگ بیویوں کو طلاق دیدیں پھر ان کی عدت ختم ہو جائے اور وہ اپنے سابقہ شوہروں سے دوبارہ نکاح کرنا چاہیں یا کسی بھی مرد سے نکاح کرنا چاہیں (جو ان کا ہونے والا شوہر ہے) تو تم انہیں اس سے نہ روکو جب وہ باہم نکاح پر بھلائی کے ساتھ رضا مند ہیں تو تمہیں روکنے کی کیا ضرورت ہے، بھلائی کے ساتھ رضا مند ہونے کا یہ معنی ہے کہ وہ خلاف شرع خلوت اور میل ملاپ کے مرتکب نہ ہوں۔

کورٹ میرج شرعی نکاح ہے:

اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ میں اور اس سے قبل اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ کے الفاظ میں نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر والدین کی اجازت کے بغیر عورت کسی

مرد سے عدالت میں نکاح (Court Marrage) کر لے تو وہ شرعی نکاح ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا مذہب ہے۔ اس نکاح سے ہونے والی اولاد حلالی اور والدین کی وارث ٹھہرے گی۔ اسی طرح حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ (بقرہ: ۲۳۰) میں عورت کی طرف نکاح کی نسبت بھی عدالتی نکاح کے لئے مضبوط دلیل ہے۔ امام شافعی اور امام احمد اس حدیث سے کہ ولی کی اجازت کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہے۔ (ابوداود، ترمذی) سے استدلال کر کے اس نکاح کو منعقد نہیں مانتے مگر احناف اور حنابلہ کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ ایسا نکاح کامل اور مسنون نہیں ہے۔ مسنون طریقہ یہی ہے کہ عورت اپنے والدین یا ولی کی اجازت کے ساتھ ہی نکاح ہے۔ یہی اس کی حیا اور عفت کا تقاضا ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے حدیث میں ہے لا ایمان لمن لا امانۃ لہ جس کو امانت کا لحاظ نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں۔ (مسند احمد جلد ۳ صفحہ ۱۳۵) یعنی امانت کے بغیر ایمان کامل نہیں ہے۔ اسی طرح ولی کے بغیر نکاح کامل و مسنون نہیں ہے۔ ہاں اگر عورت اپنی مرضی سے نکاح کر لے اور جہاں وہ نکاح کرے وہ علم و فضل، مال و دولت یا حسب و نسب کے اعتبار سے لڑکی والوں کے ہم پلہ نہ ہوں تو لڑکی والے بذریعہ عدالت نکاح فسخ کر سکتے ہیں۔

بالغہ لڑکی کی مرضی کے بغیر اس کی شادی منعقد نہیں ہو سکتی:

اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ (جب مرد و عورت نکاح پہ بھلائی کے ساتھ راضی ہوں) سے معلوم ہوا نکاح میں لڑکی کی اجازت اور رضامندی لازم ہے۔ آج کل بعض لوگ اپنی لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ان کی مرضی کے بغیر جہاں چاہیں باندھ دیتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔ یہاں برطانیہ میں یہ برائی عام ہے کہ لوگ اپنی بیٹیوں کو کسی طرح ورغلا کر اپنے آبائی وطن پاکستان، انڈیا بنگلہ دیش وغیرہ لے جاتے ہیں اور وہاں زبردستی ان کا نکاح اپنے خاندان کے کسی لڑکے سے کر دیتے ہیں، بعد میں وہ لڑکیاں گھروں سے بھاگ جاتی ہیں۔ یہ سخت غلط طریقہ ہے۔ اولاد کی تربیت ہی اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ والدین کے فیصلے کو خوش دلی سے قبول کریں اور اگر ایسا نہیں ہوسکا ہے تو پھر ان پہ زبردستی نہ کریں۔

ایک صحابیہ حضرت خنساء بنت خدام رضی اللہ عنہا نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی۔ کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے باپ نے جہاں میرا نکاح کیا ہے میں اس پر راضی نہیں ہوں۔ آپ نے فرمایا تمہیں اختیار ہے کہ نکاح رکھو یا ختم کر دو اس نے کہا میں باپ کا کیا ہوا نکاح قبول کرتی ہوں مگر میں بتانا چاہتی تھی کہ نکاح کا اختیار اولیاء کے پاس نہیں۔ (شرعاً عورت اپنے نفس کی خود مالک ہے۔) (نسائی کتاب النکاح باب ۳۵ حدیث ۳۲۷۰)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لا تُنكح الثيّب حتى تُستأمر ولا تُنكح البكر حتى تُستأذن، بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اسکا حکم نہ حاصل کیا جائے اور کنواری لڑکی کا نکاح نہ کیا جائے جب تک اس کی رضامندی نہ لی جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کنواری لڑکی کی رضا کیسے حاصل کی جائے؟ فرمایا: ان تسکت، اس کی رضا یہ ہے کہ (نکاح کی اجازت مانگے جانے پہ) وہ خاموش

ہو جائے (کیونکہ کنواری لڑکی شرم کے مارے کبھی بول نہیں سکتی)۔ (بخاری کتاب النکاح باب ۴۱، مسلم کتاب النکاح حدیث ۶۴)

بیوہ یا مطلقہ عورت کو دوسری شادی سے روکنا جائز نہیں:

فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ (عورتوں کو نکاح ثانی سے مت روکو) سے معلوم ہوا اگر عورت کو طلاق ہو جائے یا اس کا شوہر مر جائے اور وہ کہیں اپنا نکاح کرنا چاہے تو اسے روکنا جائز نہیں۔ دور صحابہ میں بعض خواتین نے یکے بعد دیگرے کئی نکاح کیے اور کسی نے اس کا برا نہیں مانا۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا پہلے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں، ان کی شہادت کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آئیں پھر ان کے وصال کے بعد حضرت مولیٰ علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا۔ آج کل ہمارا جاہل معاشرہ اسے معیوب سمجھتا ہے مگر اسلام عورت کے نکاح ثانی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ بے حیائی سے محفوظ رہے۔ جو عورتیں جوانی میں بیوہ یا مطلقہ ہو جاتی ہیں اور دوسری شادی نہیں کرتیں وہ اکثر فتنوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔

[267] یعنی اگر تم اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہو تو مطلقہ (یعنی بیوہ) عورتوں کو جب وہ معروف طریقہ پر نکاح کرنا چاہیں مت روکو۔ یہی تمہارے لیے پاکیزہ طریقہ ہے ورنہ ممکن ہے عورتیں بہک کر غیر پاکیزہ طریقہ اختیار کر لیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیتوں اور خفیہ احوال کو جانتا ہے مگر تم نہیں جانتے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ

اور سگی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں یہ اس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کی مدت

الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

پوری کرنا چاہے [268] اور جس کیلئے اولاد جنی گئی (یعنی باپ) اس پر انہیں کھلانے اور پہنانے کی جائز طریقہ پر ذمہ داری ہے، [269]

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ

کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے، [270] نہ والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے نہ اس کو جس کی

بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ

اولاد ہے (یعنی باپ) اور وارث پر بھی ایسی ہی ذمہ داری ہے [271] پھر اگر والدہ اور والد دونوں باہمی

مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا

رضامندی اور مشورہ سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں [272] اور اگر تم (کسی دوسری عورت سے) اپنی اولاد کو

اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

دودھ پلانا چاہو تو تم پر کوئی اعتراض نہیں جب کہ تم بھلائی کے ساتھ وہ اجرت دے دو جو تم نے مقرر کی [273]

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٢٣٣

اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

بچوں کو دودھ پلانے کے احکام

[268] یعنی جن عورتوں نے بچے جنے ہیں انہیں چاہیے کہ انہیں مکمل دو برس اپنی چھاتیوں کا دودھ پلائیں تا کہ بچوں کی صحیح نشوونما ہو سکے۔ کیونکہ جن بچوں کو دو برس سے کم دودھ پلایا جاتا ہے۔ وہ جسمانی طور پر کمزور رہ جاتے ہیں۔ مگر یہ دو برس مکمل دودھ پلانا اس صورت میں ہے جب بچے کے والدین یہ مدت پوری کرنا چاہیں اگر کسی وجہ سے وہ اس سے کم مدت دودھ پلانا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے۔

اگر نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو اس کا نسب ثابت ہے:

اس جگہ حولین کاملین (کہ مائیں بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں) سے معلوم ہوا دودھ پلانے کی مدت دو برس ہے کیونکہ دوسری جگہ قرآن میں ہے: وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ بچے کا حمل اور اس کا دودھ چھڑانا تیس ماہ میں ہے۔ (احقاف:۱۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس سے استدلال کیا کہ تیس ماہ میں سے دودھ کے دو برس نکال دیں تو حمل کے لیے باقی چھ ماہ بچتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عورت نے نکاح کے چھ ماہ بعد بچہ جنا، آپ نے اسے سنگسار کرنا چاہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی دلیل سے انہیں روک دیا۔ (تفسیر ابن ابی حاتم جلد دوم صفحہ ۴۲۸ حدیث ۲۲۶۴) گویا اگر چھ ماہ سے پہلے بچہ پیدا ہو جائے تو اس کا نسب ثابت نہیں ہوگا۔

دو سال کے بعد رضاعت ثابت نہیں ہوتی:

جب دودھ پلانے کی مدت دو برس ہے تو اگر ایک بچے نے دو برس سے زائد عمر میں کسی عورت کا دودھ پیا تو وہ اس کی رضاعی ماں نہیں بنے گی نہ رضاعت ثابت ہے۔ یہی صاحبین کا قول ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ (مظہری) حدیث بھی ہے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا رضاع الا ما کان فی حولین** یعنی دودھ پلانا وہی معتبر ہے جو دو برسوں کے دوران ہو۔ (سنن دار قطنی جلد ۴ صفحہ ۸۴ حدیث ۴۳۱۸ مطبوعہ دار الفکر)

مائیں بچوں کو اپنا دودھ پلائیں:

وَالْوٰلِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ مائیں اپنا دودھ پلا کر بچوں کی پرورش کریں کیونکہ اپنا دودھ پلانے ہی کو رضاعت کہا جاتا ہے۔ اور چھاتی کے دودھ ہی سے کسی عورت کی کسی بچے سے نسبت رضاعت قائم ہوتی ہے۔ ڈبے کے دودھ سے نہیں۔ آج کل ماڈرن عورتیں اپنی Smartness (دبلے پن) کو برقرار رکھنے کے لیے بچوں کو اپنا دودھ پلانے کی بجائے ڈبے کا دودھ پلاتی ہیں۔ ایسی بہت سی عورتیں چھاتی کے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ماں کے دودھ میں اللہ نے بہت برکتیں رکھی ہوئی ہیں، ماں کا دودھ پینے والے بچے اکثر ماں کا ادب واحترام کرتے ہیں اور ڈبے کے دودھ میں یہ تاثیر نہیں ہے۔ البتہ اگر ماں کا دودھ کم ہو اور بچے کی بھوک نہ مٹاتا ہو تو یہ ایک عذر ہے تب ساتھ میں ڈبے کا دودھ بھی پلانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بعض طبی وجوہ کے باعث ضبط ولادت (Birth Control) جائز ہے:

حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ بچے کو پورے دو سال دودھ پلایا جائے اور اگر ایک بچے کی ولادت کے بعد دو سال سے قبل ہی عورت کو دوسرا حمل ٹھہر جائے تو عورت کا دودھ خراب ہو جاتا ہے اس کے پینے سے

بچہ بیماریوں کا شکار ہوسکتا ہے۔تو اسکا حل یہی ہے کہ ایک بچے کی ولادت کے بعد عورت دو برس تک برتھ کنٹرول (خاندانی منصوبہ بندی) کو اپنائے۔ ورنہ حکم ربانی حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ پہ عمل مشکل ہے۔اس طرح اس بچے کی بہتر نشوونما ہو گی اور وہ ایک صحت مند اور معاشرہ کے لیے مفید تر انسان بنے گا اور بیماریوں کا شکار کم ہوگا۔اور حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں عزل (برتھ کنٹرول) کرتے تھے۔(بخاری کتاب النکاح باب ۹۶)

[269] جس شخص کے لیے بچہ جنا گیا ہے۔(یعنی بچے کا باپ) وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ بچے کی ماں کو کھانے پینے اور لباس کی ضروریات مہیا کرے (اور رہائش بھی دے قرآن میں ہے: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ (طلاق،۶) یہاں جمع کا صیغہ (رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ) بولا گیا یعنی بتایا گیا کہ بیویاں خواہ چار ہوں بہرحال ان سب کی کھانے پینے اور لباس کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

باپ بچے کو ماں سے چھین کر دوسری عورت کو نہیں دے سکتا:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ سے معلوم ہوا باپ کو جائز نہیں کہ ماں سے بچہ چھیننے اور کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے، ماں ہی دودھ پلائے اور باپ اس کے حقوق دے۔ہاں اگر ماں باپ دونوں باہمی رضامندی سے کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہیں تو جائز ہے۔جیسے آگے آ رہا ہے۔وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ

بچے کی والدہ دودھ پلانے سے بلا عذر انکار نہیں کرسکتی

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت جب تک کسی کے نکاح میں ہے تو اس کا حق ہے کہ اس کے بچے کو جو اسی عورت کا بیٹا یا بیٹی ہے دودھ پلائے، اس کے لیے وہ الگ سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرسکتی، بلکہ اسے جو کچھ حق زوجیت کے طور پہ دیا جاتا ہے اس میں دودھ پلانے کا معاوضہ بھی شامل ہے، اسی لیے فرمایا گیا: وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ اور اگر عورت کو کوئی بیماری یا عذر لاحق نہیں جو دودھ پلانے سے مانع ہو تو وہ دودھ پلانے سے انکار نہیں کرسکتی۔

بچے کا نسب باپ سے ہے ماں سے نہیں:

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ماں بچے کو اس کے باپ کے لیے جنتی ہے۔اس کا مالک باپ ہی ہوتا ہے۔اسی لیے اطاعت میں باپ کا حق اولاد پہ ماں سے دوگنا ہے کیونکہ باپ ہی مالک ہے البتہ خدمت میں ماں کا حق زیادہ ہے جیسا کہ حدیث میں اس کی صراحت ہے۔لہٰذا اگر باپ ایک حکم دے اور ماں اس کے برعکس کہے تو باپ کی بات مانی جائے اور ماں کی بے ادبی نہ کی جائے۔اور اگر بیٹے کے پاس والدین کو

پیش کرنے کے لیے تحفہ یا مال ہو تو ماں کا حق زیادہ رکھے، ایسے ہی جسمانی خدمت کا معاملہ ہے۔

[270] یعنی بچے کی وجہ سے نہ تو اس کی ماں کو نقصان دیا جائے۔ مثلاً وہ دودھ پلانا چاہتی ہے مگر اسے نہ پلانے دیا جائے یا اسے نان ونفقہ سے محروم رکھا جائے اور نہ بچے کے باپ کو جس کے لیے بچہ جنا گیا ہے، نقصان دیا جائے کہ اس کی طاقت سے زیادہ اس سے نان ونفقہ مانگا جائے۔

[271] یعنی اگر بچے کا باپ اسے دودھ پیتا چھوڑ کر فوت ہو جائے یا بچہ یتیم پیدا ہو اور باپ اپنے پیچھے مال بھی نہ چھوڑ کر جائے جس سے بچے کی ماں کا نان ونفقہ اور بچے کا خرچہ پورا ہو سکے تو بچے کے دوسرے قریبی رشتہ داروں پر جو اس کے وارث ہیں، لازم ہے کہ بچے اور اس کی ماں کا خرچہ ادا کریں۔ جیسے مرنے والے کا باپ، چچا، بھائی، ماموں وغیرہ۔ کیونکہ جب وہ اپنے فوت ہونے والے عزیز کے چھوڑے ہوئے مال میں وراثت کا حق لیتے ہیں تو انہیں اس کے چھوڑے ہوئے بچوں کی کفالت بھی کرنا پڑے گی۔

اور اس میں اسی ترتیب کا لحاظ رکھا جائے گا جو وراثت میں ہے یعنی جس کا حق وراثت سب سے پہلے ہے اس پہ بچوں کی کفالت کی ذمہ داری سب سے پہلے آئے گی اور جس کا حق وراثت بعد میں ہے اس پہ یہ ذمہ داری بھی بعد میں ہے۔

یہاں وارث سے ذی رحم محرم مراد ہے۔ اس سے استدلال کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس طرح شیر خوار بچہ صغرسنی کے باعث اپنا خرچہ نہیں اٹھا سکتا تو اس کا خرچہ ان لوگوں پہ ڈالا گیا ہے جو اس کے وارث ہیں۔ اسی طرح اپاہج غریب شخص جو مال کمانے سے معذور ہے اس کا خرچہ بھی اس کے قریبی رشتہ داروں پہ لازم ہے۔

[272] یعنی بچے کے والدین اگر باہمی مشورہ سے دو سال کے عرصہ سے قبل بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو چھڑا سکتے ہیں۔

میاں بیوی کو اپنے گھر کے معاملات باہم مشاورت سے طے کرنے چاہئیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ یعنی ماں باپ دونوں باہمی رضامندی اور مشاورت سے بچے کا دودھ جب بھی چھڑانا چاہیں چھڑا دیں۔ اس میں اللہ نے یہ تعلیم ارشاد فرمائی ہے کہ اگرچہ شوہر گھر کا سربراہ ہے مگر اسے چاہیے کہ گھر میں مشاورت اور باہمی رضا کا ماحول پیدا کرے اور بیوی کو بیوی کی حیثیت دی جائے لونڈی کی نہیں۔ بلکہ دودھ کے چھڑانے کے معاملہ میں تو اس نص صریح کی وجہ سے میاں بیوی دونوں کی رضامندی لازم ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی راضی نہ ہو تو یک طرفہ طور پہ دودھ بند نہیں کیا جا سکتا یا نہیں کرایا جا سکتا۔

[273] معنی یہ ہے کہ اگر والدین باہمی رضامندی سے بچے کو ماں کی بجائے کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں مگر ضروری ہے کہ دودھ پلانے والی عورت کو جو اجرت دینا مقرر کیا ہے وہ اسے دیدو۔ اہل عرب اپنے بچوں کو کسی آیا (دائی) سے دودھ پلواتے تھے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت سیدہ حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا نے دودھ پلایا۔ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ بچہ دیہاتی ماحول میں پروان چڑھ کر صحت مند اور خالص عربی بولنے والا ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ بچے کی بہتری کے لیے دوسری عورت سے دودھ پلوانے میں حرج نہیں۔اسی طرح اگر ماں کا دودھ کسی بیماری کی وجہ سے بچے کے لیے درست نہ ہوتو دوسری عورت سے دودھ پلوانے میں حرج نہیں۔اس کی مثال یہ ہے کہ کبھی ایسے ہوتا ہے کہ ابھی بچہ دودھ پی رہا ہوتا ہے کہ عورت کو دوسرا حمل ٹھہر جاتا ہے۔اس صورت میں کبھی ماں کا دودھ بچے کے لیے مفید نہیں ہوتا بلکہ مضر ہو جاتا ہے تو پھر دوسری عورت سے دودھ پلوانے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ بچے کی صحت اور زندگی کے لیے ضروری ہے کہ دوسری عورت سے دودھ پلوایا جائے۔

اجیر ومستأجر کے لیے تقویٰ اور بھلائی کی ہدایت

اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ کہہ کر اللہ تعالیٰ نے ہمیں درس تحفظ حقوق دیا ہے کہ جب کوئی شخص اجرت پہ کسی سے کوئی کام کروائے تو اس کا معاوضہ جو اس سے طے ہوا وہ اسے بھلائی کے ساتھ ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے کہ کسی کا حق دبانا ظلم ہے اور ظلم کامیاب نہیں ہوسکتا۔اسی طرح مستاجر یعنی جس کو اجرت پہ لیا گیا ہے اس پہ بھی لازم ہے کہ اپنا کام صحیح ادا کرے، کام چوری نہ کرے کہ یہ بھی ظلم ہے۔بہت سے سرکاری ملازمین تنخواہیں پوری لیتے ہیں مگر کام کچھ نہیں کرتے صرف حاضری لگواتے ہیں بلکہ ان کی حاضری بھی کوئی دوسرا لگا دیتا ہے تو دنیا کی سرکار پکڑے یا نہ، مگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں بچ نہ سکے گا۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ

اور تم میں سے جو لوگ فوت ہوں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو بیویاں خود کو چار ماہ دس دن تک

اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ

روکے رکھیں، [274] پھر جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو اپنے بارے میں بھلائی کے ساتھ جو بھی کریں اس میں

اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

تم پر کوئی گناہ نہیں [275] اور اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے

بیوہ عورت کیلئے احکامِ عدت

[274] یعنی جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے وہ چار ماہ دس دن عدت گزارے۔اس کے بعد وہ آزاد ہے اور دوسرا نکاح کرسکتی ہے خواہ وہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ (اس سے ہم بستری کی گئی ہو یا نہ)۔جبکہ مطلقہ عورت کی طلاق اگر قبل از دخول ہو (ہم بستری سے قبل ہو) تو عدت لازم نہیں۔(اور دخول کی صورت میں تین حیض عدت ہے۔جیسا کہ پیچھے آیت

۲۲۸ میں گذر چکا ہے۔) یہ فرق اس لیے ہے کہ طلاق کی صورت میں عدت کا اصل مقصد یہ ہے کہ جانا جائے کہ عورت کو کہیں حمل تو نہیں اگر حمل ہو تو پھر عدت وضع حمل ہوتی ہے اور جب دخول ہی نہ ہوا تو عدت کی ضرورت ہی نہیں جبکہ شوہر کے فوت ہونے کی صورت میں عدت کا مقصد حمل کے معلوم کرنے کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ عورت اپنے مرحوم شوہر کی موت پہ اظہار افسوس کرتی ہے لہٰذا عدت بہر حال لازم ہے خواہ دخول ہوا ہو یا نہ۔

عدتِ وفات چار ماہ دس دن کیوں مقرر کی گئی

شوہر کی موت کی صورت میں چار ماہ اور دس دن کی عدت اس لیے مقرر کی گئی کہ عموماً بچہ ماں کے پیٹ میں آٹھ ماہ اور بیس دن رہتا ہے اور اس کا نصف چار ماہ دس دن بنتا ہے یعنی یہ مدت حمل کا نصف ہے اور کوئی عورت نصف مدت سے زیادہ اپنا حمل چھپا نہیں سکتی تو اس قدر عدت اس لیے لازم کی گئی تا کہ اگر بیوہ عورت کو حمل ہو تو ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ شوہر تو فوت ہو چکا جو اس بارہ میں بحث کر سکتا تھا جبکہ طلاق کی صورت میں عدت اس سے کم رکھی گئی یعنی تین بار حیض کا آنا کیونکہ شوہر موجود ہے جو حالات سے باخبر ہے۔

البتہ اگر شوہر کے مرنے پر بیوی حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ خواہ وضع حمل چار ماہ دس دن سے قبل ہو جائے یا بعد میں۔ اللہ فرماتا ہے: وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ ''اور حمل والی عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل رکھ دیں (بچہ جن دیں)۔'' (طلاق: ۴)

[275] یعنی اے شوہر کے گھر والو! جب شوہر کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ کی عدت ختم ہو جائے تو وہ جائز طریقہ پر اپنے بارہ میں جو فیصلہ کرے اس میں تم پر کوئی اعتراض نہیں یعنی اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے یا زیب و زینت کرے۔ تو اس کی مرضی، (ہاں اگر وہ عدت ختم ہونے سے قبل ایسا کرے تو تم اسے روک سکتے ہو اور اگر نہ روکو گے تو تم شرعاً مورد اعتراض ہو کہ تمہاری بہو غلط طریقے کیوں اپنا رہی ہے۔ مثلاً دوران عدت بناؤ سنگھار یا غیر مردوں سے میل ملاپ کیوں کرتی ہے۔)

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِیْٓ

اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اشاروں اشاروں میں (دوران عدت) عورتوں کو پیغام نکاح دو یا اسے اپنے دلوں میں

اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا

چھپاؤ، اللہ جانتا ہے کہ تم انہیں یاد کرو گے [276] مگر (اس دوران) ان سے کوئی خفیہ معاہدہ نہ کرو

اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ

سوا اس کے کہ ان سے بھلائی کی بات کہو اور نہ ہی نکاح کا پکا ارادہ کر لو جب تک تحریر (عدت)

الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ

اپنی مدت کو نہ پہنچ جائے [277] اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے تو اس سے ڈرو

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٣٥﴾ ع

اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔

ع ٣٠ ١٤

[276] اگر بیوہ عورت کو کوئی شخص پیغام نکاح دینا چاہے تو کھل کر اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ اشارے کنائے میں اسے دل کی بات بتا سکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے وہ آگے سے تلخ تر جواب دے کہ دیکھتے نہیں ہو کہ میں پہلے سے غمزدہ بیٹھی ہوں میرے سر سے شوہر کا سایہ اٹھ گیا اور مجھ پہ کوہ غم ٹوٹ پڑا ایسے میں تم مجھے پیغام نکاح دے کر مزید پریشان کر رہے ہو۔ لہٰذا صرف اشارے ہی میں بات کی جائے بلکہ فقہاء کرام کے نزدیک عدت میں بیوہ عورت کو اس کا ولی بھی اسے کسی پیغام نکاح صراحت میں نہیں پہنچا سکتا البتہ اشارے میں بات کر سکتا ہے۔ اس میں بھی وہی حکمت ملحوظ ہے جو ابھی بیان کی گئی۔ جس عورت کو طلاق مغلظہ یا بائنہ ہو اسے بھی دوران عدت میں صراحتاً پیغام نکاح نہیں دیا جا سکتا اور رجعی طلاق کی عدت میں اشارۃً بھی پیغام نکاح کا دینا جائز نہیں۔

آگے فرمایا گیا اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اس میں بھی کوئی گناہ نہیں کہ بیوہ عورت سے نکاح کی خواہش دل میں رکھی جائے کیونکہ اللہ جانتا ہے جب کوئی عورت بیوہ ہوتی ہے تو کئی لوگوں کے دلوں میں اس سے نکاح کی خواہش انگڑائی لیتی ہے لہٰذا اس خفیہ خواہش قلبی میں کوئی حرج نہیں۔ نہ ہی دبے لفظوں میں اس کے اظہار میں حرج ہے۔

[277] یعنی تم بیوہ عورت سے چوری چھپے یہ عہد نہ لو کہ عدت گزرنے کے بعد اگر تم نکاح کرو گی تو مجھ سے ہی کرو گی۔ البتہ اسے بھلائی کی بات کہہ سکتے ہو یعنی اشارے میں پیغام نکاح دینا جائز ہے۔

حدیث میں ہے کہ حضرت سیدہ سکینہ بنت حنظلہ رضی اللہ عنہا کا شوہر فوت ہو گیا۔ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ انکے پاس گئے اور انہیں کہا جبکہ وہ عدت میں تھیں کہ اے دختر حنظلہ تم جانتی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے میری قرابت کیا ہے اور میرے دادا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو اسلام میں کیا سبقت حاصل ہے، وہ کہنے لگیں آپ مجھے پیغام نکاح دے رہے ہیں جبکہ میں عدت میں ہوں اور لوگ تو آپ سے دین سیکھتے ہیں تو انہوں نے فرمایا: میں نے تو تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صرف اپنی قرابت بتائی ہے، بس پھر حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کی بیوہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ اللہ کے ہاں آپ کی کیا قدر و منزلت ہے۔ یہ آپ کی طرف سے انہیں دبے لفظوں میں پیغام نکاح تھا وہ سمجھ گئیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس وقت ہاتھ میں چٹائی پکڑی ہوئی تھی آپ کے ہاتھ میں اس کا نشان پڑ گیا۔ (مظہری جلد اول صفحہ ۱۳۳ بروایت دار قطنی)

آگے اللہ نے فرمایا: وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ یعنی جب تک بیوہ عورت کی عدت ختم نہ ہو جائے تب تک کوئی شخص اس سے نکاح کا عزم نہ کرے کیونکہ عدت میں نکاح حرام ہے۔ لہٰذا اس کا عزم بھی حرام ہے۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے دلوں میں جو خیالات گزرتے ہیں اللہ انہیں خوب جانتا ہے۔ لہٰذا اللہ سے ڈرتے رہو کہ وہ روز قیامت تمہاری نیتوں ہی کے مطابق اعمال کی جزا دے گا اور اللہ بخشنے والا ہے، بردبار ہے۔ وہ لوگوں کو گناہ کرتے دیکھتا اور پردہ پوشی فرماتا ہے۔

اللہ رب العزت کا حلم یہ بھی ہے کہ لوگ اس کے لیے اولاد مانتے ہیں اور اس کے اتارے ہوئے کلام سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ صبح و شام اسی کا دیا ہوا کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ایسا حلیم ہے کہ ان کا رزق بند نہیں فرماتا بلکہ انہیں مسلسل رزق دیے جاتا ہے۔ اگر وہ حلم سے کام نہ لیتا تو اب تک یہ دنیا تباہ ہو جاتی۔ اس میں ہمارے لیے بھی درس عمل ہے کہ جب اللہ ساری قدرتوں کے باوجود انتقام لینے میں جلدی نہیں فرماتا بلکہ حلم فرماتا ہے تو ہمیں بھی حلم سیکھنا چاہیے۔

لَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دیدو جبکہ تم نے انہیں نہ چھوا نہ ان کے لئے مہر

فَرِیْضَةً ۚۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا

مقرر کیا [278] اور انہیں کچھ برتاوا دیدو جو مالدار پر اس کی گنجائش کے مطابق ہے اور تنگ دست پر اس کی گنجائش کے مطابق، یہ برتاوا بھلائی

بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِیْنَ ۝ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ

کے ساتھ ہے جو نیکوکاروں پر لازم ہے۔ [279] اور اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو اس سے قبل کہ

تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ

انہیں چھوؤ جبکہ تم نے ان کے لئے مہر مقرر کر دیا تھا تو جو تم نے مقرر کیا تھا اس کا نصف لازم ہے [280] سوا اس کے

یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ

کہ عورتیں معاف کردیں یا وہ زیادہ دیدے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے [281] اور تمہارا معاف کرنا تقویٰ سے

لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

قریب تر ہے اور آپس میں احسان کرنا نہ بھولو بے شک اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ [282]

مباشرت سے قبل طلاق دینے کے احکام

[278] یعنی اگر تم نے کسی عورت سے محض زبانی نکاح کیا، نہ تم نے اس عورت کو ہاتھ لگایا نہ اس کے لیے حق مہر مقرر کیا پھر تمہیں اسے طلاق دینا پڑ گئی تو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نکاح کی مجلس ہی میں اختلاف پھوٹ پڑتا ہے۔ مثلاً عورت نے اپنے شوہر کو پہلے نہیں دیکھا تھا یا شوہر نے اپنی ہونے والی بیوی پہلے نہیں دیکھی تھی جب پہلی بار دیکھا تو صورت پسند نہ آئی۔

اور کبھی حق مہر کے تقرر پر مجلس نکاح میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بہتر یہ ہوتا ہے کہ نکاح ہی نہ کیا جائے لیکن اگر نکاح کر دیا جائے اور صورت حال ایسی ہو کہ ایک فریق نے دوسرے فریق کو ابتداء ہی میں دھوکہ دیا ہے تو بہتر ہے مباشرت سے قبل طلاق دیدی جائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہ معنی ہے فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا ؕ کا، ورنہ طلاق فی نفسہ

عنداللہ مکروہ تر چیز ہے۔

[279] اس صورت میں جب مباشرت نہیں ہوئی اور مہر بھی مقرر نہیں ہوا تو عورت کو متاع یعنی کچھ برتاوا دینا چاہیے کیونکہ عورت کو لفظ طلاق سے جو ذہنی صدمہ ہوا اس کی اشک شوئی ہو جائے اور یہ شرافت انسانی کے خلاف ہے کہ ایک عورت سے نکاح کیا جائے پھر اسے خالی ہاتھ لوٹایا جائے۔ کیونکہ طلاق کا لفظ ہی عورت کے لیے ایک دھبہ ہے، ایک عار ہے تو ''متاع'' اس لیے لازم کیا گیا کہ عورت کو لفظ طلاق سے جو صدمہ پہنچا اس کی کچھ اشک شوئی کی جائے۔

رخصتی اور تقرر مہر سے قبل طلاق پر متاع کا دینا واجب ہے

اور یہ متاع کا دینا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مستحب اور دوسرے تین ائمہ کے نزدیک واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَّمَتِّعُوْهُنَّ کہ عورتوں کو متاع دو اور یہ امر ہے جو وجوب کے لیے ہے۔ یہ متاع (برتاوا) کتنا ہونا چاہیے تو ہر آدمی اپنی گنجائش دیکھے مالدار آدمی اپنی حیثیت کے مطابق دے۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے نکاح کیا پھر اس کے قریب جانے اور مہر مقرر کرنے سے قبل اسے طلاق دی تو دس ہزار درہم دیئے۔ اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق دے۔ فقہ حنفی میں اس کی کم از کم حد ایک جوڑا کپڑے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ کا یہ معنی نہیں کہ بدکاروں کو چھٹی ہے، معنی یہ ہے کہ احسان کا یہی تقاضا ہے کہ یہ برتاوا دیا جائے۔

مہر کا نام لیے بغیر بھی نکاح قائم ہو جاتا ہے، مگر وہ لازم ہے

اس جگہ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً فرمایا گیا یعنی اگر تم نے عورت کو چھونے اور مہر مقرر کرنے سے قبل طلاق دیدی تو متاع دو۔ معلوم ہوا کہ اگر یوں نکاح کیا گیا کہ مہر کا ذکر ہی نہیں ہوا تو بھی نکاح ہو جاتا ہے مگر یہ طریقہ خلاف سنت ہے اور اگر اس نکاح کے بعد ہم بستری بھی ہو گئی ہو تو حق مہر واجب ہو گیا اور وہ مہر مثل کی صورت میں ادا کیا جائے گا، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے

اگر مباشرت اور تقرر مہر سے قبل شوہر فوت ہو جائے تو کیا حکم ہے

مذکورہ بالا گفتگو اس صورت میں تھی کہ مباشرت اور تقرر مہر سے قبل طلاق ہو جائے لیکن اگر مباشرت اور مہر کے تقرر سے قبل شوہر فوت ہو جائے تو متاع (برتاوا) کی بجائے مہر مثل لازم ہے۔ مہر مثل یہ ہے کہ عورت جس خاندان سے ہے اس خاندان کی دوسری عورتوں کو عموماً جو مہر دیا جاتا ہے اس کا اوسط مقرر کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا ایک شخص مہر کے تقرر اور مباشرت سے قبل مر جائے تو اس کی بیوی کو کیا دیا جائے؟ فرمایا

لها مثل صداق نسائها لا وکس ولا شطط ،وعليها العدة ولها الميراث ۔یعنی اسے اس کے خاندان کی عورتوں جیسا مہر ملے گا، نہ کم نہ زیادہ اور اس پہ عدت لازم ہے اور وہ میراث کی بھی حقدار ہے۔ایک صحابی رسول ﷺ نے سن کر کہا اے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ! حضور ﷺ نے بھی حضرت بروعہ بنت واشق رضی اللہ عنہا کے بارہ میں یہی فیصلہ کیا تھا۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے (کہ انکا اجتہاد حکم رسول کے مطابق نکلا)۔
(نسائی کتاب الطلاق جلد دوم صفحہ ١١٦)

[280] اب یہ صورت بتائی جارہی ہے کہ اگر تم بیوی کو مباشرت سے قبل طلاق دیدو جبکہ تم نے اس کے لیے حق مہر مقرر کیا تھا تو جو مقرر کیا تھا اس کا نصف دینا لازم ہے۔اگر ہزار روپے یا پونڈ ز مقرر کیا تھا تو پانچ سو لازم ہے۔یہاں مباشرت یا مس کرنے سے مراد خلوت صحیحہ ہے۔یعنی جب ایک شخص اپنی بیوی کو تنہائی میں لے جائے ، دروازہ بند کر دے اور مباشرت سے کوئی چیز مانع نہ ہو تو پورا مہر لازم ہو گیا، جو مقرر ہوا تھا وہ سارا دینا پڑے گا اور اگر خلوت صحیحہ نہیں ہوئی تو جو مہر مقرر ہوا تھا اس کا نصف دینا پڑے گا۔یہی حضرت علی، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا فتویٰ ہے۔
(تفسیر احکام القرآن للجصاص جلد دوم صفحہ ۱۴۷)

[281] یعنی اگر مباشرت سے قبل طلاق ہو جائے اور مہر مقرر ہوا تھا تو اگر چہ نصف مہر لازم ہے لیکن اگر عورت چاہے تو معاف کر سکتی ہے۔یعنی کہہ سکتی ہے کہ جب وہ اپنے شوہر کے پاس گئی ہی نہیں تو نصف مہر لینے کی کیا ضرورت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے یعنی شوہر وہ زیادہ دیدے یعنی نصف کی بجائے جتنا مہر مقرر ہوا تھا سارا دے دے۔

عفا یعفو کے معنی کی تحقیق

اس جگہ یَعْفُوْنَ اور یَعْفُوْ دوبار ہے اور دونوں میں الگ الگ معنی ہے۔اصل میں یَعْفُوْا کا معنی معاف کرنا بھی ہے۔جیسے وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اور زیادہ دینا بھی جیسے قُلِ الْعَفْوَ ؕ یعنی کہہ دو کہ جو ضرورت سے زائد ہو وہ راہ خدا میں دو (بقرہ:۲۱۹) اسی طرح حدیث میں اعفوا اللحیٰ یعنی داڑھیاں بڑھاؤ (مسلم) تو اس آیت میں اَنْ یَّعْفُوْنَ میں معاف کرنا مراد ہے اور اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ میں زیادہ دینا، یہ بھی ممکن ہے کہ یَعْفُوَا الَّذِیْ میں بھی معاف کرنا مراد ہو۔وہ اس طرح کہ اگر شوہر نے نکاح کے وقت مقرر کردہ سارا مہر دیدیا بعد میں مباشرت سے قبل طلاق دیدی تو نصف مہر واپس لینے کی بجائے معاف کردے۔

مہر عورت کا حق ہے اس کے اولیاء کا نہیں:

اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ میں کہا گیا کہ عورتیں اگر چاہیں تو مہر معاف کردیں۔ثابت ہوا مہر عورت کا حق ہے۔وہی معاف کر سکتی ہے اور اسی کو مہر کی رقم دینا چاہیے۔پاکستان ،سعودی عرب اور بعض دیگر مسلم ممالک میں کئی جگہ جہلاء و زر پرست

لوگ اپنی بیٹیوں کے بھاری حق مہر وصول کرتے اور اس سے اپنی دنیا چمکاتے اور کاروبار کرتے ہیں۔ بیٹیوں کو اس میں سے کچھ نہیں دیتے۔ دوسرے لفظوں میں انہیں بھاری رقم کے بدلے فروخت کردیتے ہیں۔ یہ گھناؤنا عمل اور سخت حرام ہے اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ جو شخص بھاری مہر دے کر لڑکی حاصل کرتا ہے اگر وہ اس سے راضی نہ ہو تو اسے طلاق دے کر اتنی ہی رقم یا اس سے زیادہ رقم کے بدلے اسے کسی دوسرے مرد سے بیاہ دیتا ہے بلکہ فروخت کردیتا ہے۔ اس ظلم کا سد باب یونہی ہوسکتا ہے کہ مہر کی رقم خود لڑکی کو دی جائے جس کا یہ حق ہے۔

نکاح کی گرہ شوہر کے ہاتھ میں ہے بیوی کے ہاتھ میں نہیں:

اَلَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ ؕ سے صاف معلوم ہوا اللہ نے نکاح کی گرہ شوہر کے ہاتھ میں رکھی ہے۔ آج کل برطانیہ میں کئی مسلمان عورتیں بھی شوہروں کو طلاق دے رہی ہیں کیونکہ انگریزوں کے قانون میں عورت بھی شوہر کو طلاق دے سکتی ہے۔ اس قانون سے جاہل مسلمان عورتیں بھی شوہروں کو طلاق دینے لگی ہیں مگر بیوی کے طلاق دینے سے طلاق نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کی گرہ شوہر کے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اللہ نے نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں اس لیے رکھی ہے کہ مرد کا حوصلہ، ارادہ اور دل عورت کی نسبت مضبوط اور قوی تر ہوتا ہے، وہ بدترین حالات میں بھی ہمت سے کام لیتا ہے اور طلاق دینے میں جلدی نہیں کرتا جبکہ عورت کمزور حوصلے کی مالک اور جذبات سے مغلوب ہوتی ہے۔ اگر اس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ دیدی جائے تو وہ چند دنوں ہی میں طلاق دیدے گی اور کوئی گھر بھی بس نہ سکے گا۔ لہٰذا عورت طلاق نہیں دے سکتی البتہ اگر اس پہ شوہر زیادتی کررہا ہو تو وہ عدالت کے ذریعہ نکاح ختم کرواسکتی ہے۔

اَلَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ ؕ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد مجاھد اور ضحاک رضی اللہ عنہما پہلے کہا کرتے تھے کہ اس سے عورت کا ولی مراد ہے مگر ان سے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے مناظرہ کیا اور آخر میں وہ دونوں حضرت سعید کی بات سے متفق ہوگئے کہ اس جگہ شوہر ہی مراد ہے۔ (درمنثور) کیونکہ نکاح کی گرہ شوہر ہی کے پاس ہے کہ جب تک چاہے قائم رکھے جب چاہے کھول دے۔ عورت کے والی کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہے، نہ اس کے پاس کوئی گرہ ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک انعقاد نکاح کے وقت ولی کے ہاتھ میں کسی حد تک گرہ ہے یعنی ولی کی اجازت کے بغیر ان کے نزدیک نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا مگر نکاح کے بعد ان کے نزدیک بھی شوہر ہی کے پاس نکاح کی ساری گرہ ہے۔

[282] یعنی مالی معاملات میں ایک دوسرے کو معاف کرنا یا حق سے زائد دے دینا ہی تقویٰ سے قریب تر ہے اور مسلمانوں کو ایک دوسرے پر فضل کرنا یعنی احسان کرنا نہیں بھولنا چاہیے۔ یاد رہے کسی کو اس کا پورا حق دیدینا عدل ہے اور حق سے زائد دینا فضل اللہ تعالیٰ نے یہاں فضل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی بارے میں حدیث ہے کہ خریدتے اور بیچتے ہوئے فضل سے کام لینے والے شخص پر اللہ تعالیٰ خصوصی رحمت فرماتا ہے۔ (بخاری کتاب البیوع)

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ

سب نمازوں پر پابندی کرو خصوصاً درمیانی نماز پر [283] اور اللہ کے حضور عاجزی سے کھڑے ہو۔ [284] پھر اگر

خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ

تم خوف میں ہو تو خواہ پیدل نماز پڑھو یا سواری پر، پھر جب تم امن میں ہو تو اللہ کو یاد کرو (نماز پڑھو) جیسے اس نے تمہیں

تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

سکھایا جو تم نہ جانتے تھے۔ [285]

حفاظت نماز کا حکم

[283] نکاح وطلاق کے مسائل کے درمیان میں حفاظت نماز کا حکم فرما کر بتایا گیا کہ معاملات دنیا میں کھو کر نماز سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ درمیانی نماز سے نماز عصر مراد ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوہ احزاب میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز عصر فوت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کفار نے ہمیں نماز عصر درمیانی نماز سے روکا ہے اللہ ان کے گھر آگ سے بھرے (مسلم کتاب المساجد) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نماز عصر درمیانی نماز ہے۔'' (ترمذی، ابواب التفسیر)

نماز عصر پر زیادہ زور دینے کی حکمت یہ ہے کہ عصر کا وقت انسان کو موت کا قریب آنا یاد دلاتا ہے کہ جیسے عصر کے وقت دن کا سورج ڈھل رہا ہوتا ہے۔ ایک دن زندگی کا سورج بھی یونہی ڈھل جائے گا۔ لہٰذا اللہ کے حضور جھکنا چاہیے۔ اسی لیے نماز عصر کی حدیث میں بہت اہمیت وارد ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جس کی نماز عصر رہ گئی گویا اس کے تمام اہل وعیال ہلاک ہو گئے اور سب مال برباد ہو گیا۔ (بخاری ومسلم) یعنی مومن کو نماز کے فوت ہو جانے کا اس قدر افسوس ہونا چاہیے جیسے اس کے گھر کو آگ لگ گئی اور اس میں اس کی ساری فیملی اور سارا مال جل کر ختم ہو گیا، نہ گھر رہا نہ مال نہ اولاد۔

اہمیتِ نماز:

اللہ تعالیٰ نے صرف نماز پڑھنے کا نہیں نماز کی حفاظت کا حکم فرمایا ہے۔ حفاظت یہ ہے کہ ایسا کام نہ کیا جائے جس

سے نماز کا اجر ضائع ہو جائے۔ جیسے رزق حرام اور ایذاء مسلمین۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے: اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے آپ کی امت پہ پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جس نے ان پہ حفاظت کی انہیں بروقت ادا کیا میں اپنے عہد کے مطابق اسے جنت میں داخل کروں گا اور جس نے ان پہ حفاظت نہ کی اس کے لیے میرا کوئی عہد نہیں ہے (ابوداود کتاب الصلوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو امین نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں، جس کا وضو نہیں اس کی کوئی نماز نہیں اور جو نماز نہیں پڑھتا اس کا کوئی دین نہیں اور اسلام میں نماز کا وہ مقام ہے جو جسم میں سر کا ہے۔ (طبرانی اوسط)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انما موضع الصلوة من الدين كموضع الرأس من الجسد ۔ اسلام میں نماز کا مقام ایسے ہے جیسے جسم میں سر ہے۔ (طبرانی اوسط)

تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ نماز سے اہم تر ہے:

نمازِ عصر کو سب نمازوں سے اہم تر بتایا گیا ہے مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نماز عصر کو چھوڑ کر بتایا کہ تعظیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درجہ ہر فرض سے بڑا فرض ہے۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ غزوۂ خیبر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز عصر پڑھ لی تھی، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ابھی پڑھنا تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گود میں سر انور رکھ کر سو گئے، حتیٰ کہ نماز قضا ہو گئی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو نہ جگایا کہ یہ ادب کے خلاف تھا مگر افسوس سے رو پڑے کہ نماز رہ گئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی اے اللہ! علی کے لیے سورج کو لوٹا دے۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کو لوٹا دیا حتیٰ کہ ٹیلوں کے سائے نکل آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز عصر ادا کی تب سورج غروب ہوا (طبرانی کبیر جلد ۲۴ صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت) امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اسے طبرانی کبیر میں سند حسن کے ساتھ روایت کیا گیا ہے (مواہب لدنیہ جلد دوم صفحہ ۵۲۸ مقصد رابع، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت) امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

مولا علی نے واری تیری نیند پر نماز ‌ اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے
صدیق بلکہ غار میں جان اپنی دے چکے ‌ اور حفظ جاں تو جان فروض غرر کی ہے
ثابت ہوا کہ جملہ فرائض فروع ہیں ‌ اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

[284] یعنی اللہ کے حضور نماز میں نہایت عاجزی وانکساری سے کھڑے ہو، کوئی ایسی حرکت نہ کرو جو رب العالمین کے دربار عالی کی عظمت اور آداب نماز کے خلاف ہو۔ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ شروع میں ہم نماز میں کلام

بھی کر لیتے تھے۔ جب یہ آیت مبارکہ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ نازل ہوئی تو ہمیں نماز میں باتیں کرنے سے روک دیا گیا۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

نماز میں قیام فرض ہے:

وَ قُوْمُوْا سے نماز میں قیام کی فرضیت معلوم ہوئی۔ یونہی يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ میں نماز میں قیام کی فرضیت بتائی گئی ہے تو جو شخص طاقت کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھے اس کی نماز نہیں ہوئی۔ فقہا کے نزدیک اگر صرف تکبیر تحریمہ (پہلی تکبیر) کے لیے کھڑا ہونا ممکن ہو تو اسی قدر کھڑا ہونا بھی فرض ہے۔

اسی طرح جو گھر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے اور اگر مسجد جائے تو تھک جائے گا اور اسے بیٹھ کر نماز پڑھنا پڑے گی تو اس پہ ضروری ہے کہ گھر میں میں کھڑے ہو کر نماز پڑھے کیونکہ قیام فرض ہے اور نماز باجماعت واجب ہے۔

نماز میں بات کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے:

یہ آیت نماز میں کلام کی مخالفت ہی کے لیے نازل ہوئی۔ لہٰذا نماز میں کسی کو سلام کہنا یا سلام کا جواب دینا حتیٰ کہ کسی کو چھینک آنے پر یرحمك الله کہنا بھی نماز کو توڑ دیتا ہے کیونکہ یہ جواب دینے کے لیے ہے اور جواب دینا بھی کلام کرنے کی ایک صورت ہے۔ اسی طرح اگر کسی سے اچھی خبر سن کر الحمد لله کہا یا بری خبر سن کر انا لله وانا الیه راجعون کہا تو بھی نماز ٹوٹ جائے گی کیونکہ یہ بھی ایک کلام ہے۔

نماز میں رفع یدین کی ممانعت:

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ بعض احادیث سے استدلال کرتے ہوئے نماز میں رکوع کے لیے جھکتے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھاتے ہیں، اس کو رفع یدین کہا جاتا ہے مگر امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے سوا کہیں ہاتھ اٹھانا مسنون نہیں۔ اور وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ کا تقاضا بھی یہی ہے کہ نماز میں بار بار ہاتھ اٹھانے کی بجائے پیکر عجز وانکسار بن کر کھڑا ہوا جائے اور جن احادیث میں رکوع میں رفع یدین مروی ہے وہ منسوخ ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل یہی ہے کہ آپ تکبیر تحریمہ کے سوا ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو کانوں تک ہاتھ اٹھاتے۔ اس کے بعد ہاتھ نہ اٹھاتے حتیٰ کہ نماز سے فارغ ہو جاتے۔
(منصف ابن ابی شیبہ جلد اول صفحہ ۲۳۶ مطبوعہ کراچی)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا لوگو کیا میں تمہیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز نہ دکھاؤں تب انہوں نے نماز پڑھی اور پہلی تکبیر کے سوا کہیں ہاتھ نہ اٹھائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ جلد اول صفحہ ۲۳۶)

حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی۔ انہوں نے پہلی تکبیر کے سوا ہاتھ

نہ اٹھائے۔(طحاوی باب التکبیر جلد اول صفحہ ۳۲۵ مطبوعہ بیروت)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔عشرہ مبشرہ جنہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔پہلی تکبیر کے سوا نماز میں کہیں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔(عمدۃ القاری جلد ۵ صفحہ ۲۷۱ مطبوعہ بیروت)

اس بارہ میں محققانہ بحث کیلئے میرے والد گرامی محقق اسلام شیخ الحدیث علامہ محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ''شرح موطاء امام محمد'' جلد اول باب افتتاح الصلوٰۃ کا مطالعہ فرمائیں۔

علاوہ ازیں اللہ رب العزت نے مجھے توفیق بخشی کہ میں نے ''اسعاف الحاجہ فی شرح سنن ابن ماجہ'' کے نام سے عربی میں ابن ماجہ کی شرح لکھی ہے جو کہ بازار میں دستیاب ہے۔اسی طرح میں سنن ابوداود کی شرح میں اسوقت کام کر رہا ہوں،ان دونوں شروح میں بھی ہمارے اور غیر مقلدین کے مابین نزاعی مسائل پہ سیر حال بحث آئی ہے جس میں رفع یدین،فاتحہ خلف امام،آمین بالجہر،سفر شرعی کی مدت،سفر میں جمع صلوٰتین ودیگر امور ہیں۔

نماز میں انہماک اور توجہ کامل چاہیے:

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۝ میں نماز میں خشوع وخضوع،انہماک اور خشیت کا ہونا لازم ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نماز میں کھڑے ہوتے تو ان پر ہیبت الٰہی طاری ہوجاتی اور دنیوی امور میں سے کوئی چیز ان کے دل میں نہ گزرتی۔(ابن جریر) کئی لوگ نماز میں اپنے جسم اور کپڑوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔حالانکہ عمل کثیر نماز کو توڑ دینا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۝ ''وہ مومنین کامیاب ہوگئے جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں۔''(مومنون،۲)صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اجلہ تابعین اور اولیاء کاملین کے حالات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کامل انہماک سے نماز پڑھتے تھے۔

معروف ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پنڈلی میں تیر لگ گیا اگر نکالتے تو درد ہوتی،انہوں نے فرمایا: جب میں نماز میں کھڑا ہوں تو تم تیر نکال لینا تو ایسے ہی کیا گیا۔نماز کے بعد کہنے لگے کیا تم نے تیر نکال لیا؟ انہوں نے کہا کب کا نکال لیا ہے،فرمایا: بخدا مجھے کچھ علم نہیں ہے۔

[285] یعنی اگر تم پر دشمن کے حملہ کا خوف ہے تو تم زمین پر کھڑے ہو کر یا جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے ہوئے جس طرح ممکن ہو نماز پڑھو۔خواہ سواری کا منہ جس طرف بھی ہو اور اسی طرح زمین پہ کھڑے بھی حالت جنگ میں نماز جائز ہے،خواہ نمازی کا منہ جدھر ہوجائے۔امام شافعی،امام احمد وامام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک گھمسان کی جنگ میں تلواروں سے لڑتے ہوئے بھی نماز جائز ہے۔مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی صورت میں نماز کو مؤخر کردینا چاہیے کیونکہ بھاگتے دوڑتے تلواریں چلاتے نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔دیکھئے! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوہ احزاب میں چار نمازیں مؤخر کردیں اور انہیں قضا کرکے پڑھا تھا،اگر بھاگتے دوڑتے نماز جائز ہوتی تو حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازوں کو قضا کیوں کرتے۔

چلتی ٹرین یا بس یا ہوائی جہاز میں سیٹ پر بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے

فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ میں فرمایا گیا کہ خوف میں خواہ پیدل یعنی زمین پہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو یا سواری پہ بیٹھ کر۔ اس سے معلوم ہوا کہ حالت مجبوری میں چلتی ٹرین یا بس میں سیٹ پہ بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، خواہ اسکا منہ جدھر بھی ہو۔ اس صورت میں رکوع وسجود کے لیے سر کا اشارہ کافی ہے۔ اس پہ مفصل بحث ہم پیچھے فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (بقرہ، ۱۱۵) کے تحت ذکر کر آئے ہیں، کیونکہ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ کہہ کر حالت جنگ میں سواری کی پیٹھ پہ بیٹھ کر نماز کا پڑھنا جائز قرار دیا گیا مگر نماز مؤخر کرنے کی اجازت نہ دی گئی۔

اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ حالت مجبوری میں بیمار سے قیام معاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بیماری کے بسبب جو شخص رکوع وسجدہ نہیں کر سکتا وہ سر کا اشارہ کر سکتا ہے۔ یہی حال اس مسافر کا ہے جس کے قبضہ میں اس کی سواری نہیں ہے۔

ہاں اگر سواری اپنے قبضہ میں ہو جیسے کوئی شخص اپنی گاڑی میں سفر کر رہا ہے جہاں چاہے اسے روک سکتا ہے، وہ گاڑی میں نماز پڑھے تو اس کی نماز نہ ہوگی کیونکہ اس کے لیے عذر نہیں ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ۙ کہ جب خوف دور ہو جائے تو اسی طرح نماز پڑھو جیسے اللہ نے تمہیں نماز پڑھنا سکھایا جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا

اور جو لوگ تم میں سے فوت ہوں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو اپنی بیویوں کے لئے وصیت کریں کہ سال تک انہیں خرچہ دیا جائے

اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ

اور گھر سے نہ نکالا جائے، [286] پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر اس میں گناہ نہیں کہ وہ اپنے بارے میں بھلائی کے ساتھ

فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ

جو بھی کریں، اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ [287] اور طلاق یافتہ عورتوں کو بھلائی کے ساتھ

بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ

برتاؤ دینا ہے جو پرہیزگاروں پر لازم ہے۔ [288] اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیات بیان کرتا ہے

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع

تاکہ تم عقل کرو۔

ع ۳۱ / ۱۵

عدت وفات کے احکام

[286] ابتداء میں یہ قانون تھا کہ مرنے والے کی بیوہ ایک سال اس کے گھر میں عدت گزارے اور وہ اس کے لیے وصیت کر کے جائے کہ اس کے مال سے اس کی بیوہ کو کتنا حصہ دیا جائے گا۔ بعد میں اسے بدل کر اس کی جگہ بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن عدت کر دی گئی۔ ابھی آیت ۲۳۴ گزری یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ اور بیوی کے حق میں شوہر کی وصیت کا حکم بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اب اسے مال میراث میں سے اللہ نے مقرر حصہ دیدیا ہے تو اسے وہی ملے گا۔ وہ یہ کہ اگر مرنے والے شوہر کی کوئی اولاد موجود ہو تو اس کی بیوی کو کل مال میں سے آٹھواں حصہ اور اگر اولاد موجود نہ ہو تو چوتھا حصہ ملے گا۔

[287] یعنی اے مرنے والے کے وارثو! تم اس کی بیوہ کو اختتام عدت سے پہلے اس کے گھر سے مت نکالو۔ البتہ اگر وہ از خود شوہر کے گھر سے چلی جائے تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ گناہ اس عورت پر ہے کہ وہ اختتام عدت سے قبل کیوں نکلی۔ پھر جب وہ نکل گئی تو بھلائی کے ساتھ اپنے بارے میں جو فیصلہ کرے تم اسے نہ روکو یعنی اگر وہ نکاح ثانی کرے اور بے

راہ روی سے بچے تو اسے اس کا حق ہے۔
یاد رہے بیوہ کو اپنے شوہر کے گھر ہی میں عدت گزارنا ضروری ہے۔ اس کا خرچہ خود اس کے ذمہ ہے۔ لہٰذا وہ کام کاج کے لیے دن کو گھر سے نکل سکتی ہے رات کو نہیں جبکہ طلاق کی عدت میں عورت کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہے تو وہ گھر سے نہیں نکل سکتی نہ دن کو نہ رات کو۔

قرآن میں نسخ ثابت ہے

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے بیوہ عورت کو ایک سال تک شوہر کے گھر میں رہنے کا حکم فرمایا اور یہ حکم منسوخ ہے۔ اس کا نسخ پیچھے آیت ۲۳۴ میں گزر چکا ہے کہ بیوہ عورت صرف چار ماہ دس دن عدت گزارے۔ مرزائی گروہ خود کو سچا بنانے کے لیے دوسرے مسلمانوں کو نسخ قرآن کے ماننے کا طعنہ دیتا ہے۔ ہم کہتے ہیں اگر یہی بات ہے تو مرزائیوں کو اب بھی بیوہ کے لیے ایک سال کی عدت لازم کرنی چاہیے اور سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۳۴ کا انکار کرنا چاہیے۔
[288] یعنی طلاق یافتہ عورت کو متاع (برتاؤ) دینا ضروری ہے۔ اس سے مراد وہ متاع نہیں جسکا ذکر پیچھے آیت ۲۳۶ میں گذرا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوران عدت عورت کا نان ونفقہ شوہر کے ذمے لازم ہے۔ خواہ وہ طلاق رجعی ہو یا طلاق بائنہ ومغلظہ، اسی لیے حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ﴿۲۴۱﴾ فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ص
کیا آپ نے وہ لوگ نہ دیکھے جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکلے
فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا قف ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی
اور وہ کئی ہزار تھے؟ تو اللہ نے ان سے کہا مر جاؤ پھر اللہ نے انہیں زندہ کیا اور اللہ لوگوں پر
النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴿۲۴۳﴾
بڑے فضل والا ہے [289] لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

جب موت سے بھاگنے والے لوگ راستے میں مار دیئے گئے

[289] دوسرے پارہ میں آغاز ہی سے احکام شرعیہ کا بیان شروع ہوا۔ جیسے تحویل قبلہ، اکل حلال، قصاص، وصیت، روزہ اور حج وغیرہ۔ یہ سلسلہ آیت نمبر ۲۰۳ تک چلا پھر جہاد کا ذکر لایا گیا کیونکہ جہاد نہ ہو تو قوم مسلم زندہ نہ رہے اور کوئی حکم شرعی نافذ نہ ہو سکے۔ پھر آیت نمبر ۲۲۱ سے احکامِ شرعیہ کا ذکر شروع ہوا جیسے نکاح، حیض، ایلاء، طلاق، عدت، حلالہ

اور بیوی بچوں کا نان ونفقہ اور مہر وغیرہ۔ اب پھر ذکر جہاد کی طرف رُخ مڑ رہا ہے۔ کیونکہ جہاد کے بغیر دین زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ دینی احکام نافذ رہ سکتے ہیں۔ اور ذکر جہاد سے قبل ایک واقعہ بتایا جارہا ہے۔ جس میں غور کرنے سے بندۂ مومن موت کے خوف سے آزاد ہوجاتا ہے اور یہ خوف ہی اسے جہاد سے روکتا ہے۔

تو فرمایا کہ بنی اسرائیل کے کئی ہزار لوگ ایک بار موت کے ڈر سے بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں راستہ میں ماردیا پھر ایک نبی کی دعا سے وہ زندہ کئے گئے اور اللہ لوگوں پر فضل فرماتا ہے۔ یہ اس کا فضل ہے کہ اس نے ان لوگوں کو پھر زندگی دی اور اس واقعہ کو دوسروں کے لیے وجہ عبرت بنایا مگر اکثر لوگ اس کے فضل پر اس کا شکر نہیں بجالاتے۔

حضرت ابو مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ شہر واسط (عراق) کے قریب بستی ''اور دان'' میں طاعون پڑا۔ امیر لوگ بھاگ گئے، غریب ٹھہرے رہے تو ان میں اکثر فوت ہوگئے۔ اگلے برس پھر طاعون پڑا تو امیر غریب سبھی بھاگ اٹھے جن کی تعداد تیس ہزار تھی، راستہ میں جب وہ ایک جگہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے ان پر بھیجے جنہوں نے پکارا: او لوگو! مرجاؤ تو وہ سب مرگئے۔

کچھ عرصہ بعد وہاں سے اللہ کے نبی حضرت حزقیل علیہ السلام گزرے۔ انہوں نے وادی میں ہزاروں انسانی کھوپڑیاں اور ہڈیاں دیکھیں تو وہ سخت متعجب ہوئے۔ انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ اگر تو چاہے تو انہیں زندہ کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اے نبی یوں ندا کیجئے۔ اے ہڈیو! اللہ کے حکم سے جمع ہوجاؤ۔ یہ ندا سنتے ہی وادی کے اوپر نیچے ہر طرف سے ہڈیاں اڑ اڑ کر آئیں اور باہم جڑنے لگیں۔ پھر ان پر گوشت کا لباس چڑھا پھر نبی اللہ نے بحکم خدا آواز دی اے مردہ جسمو! زندہ ہوجاؤ تو اللہ نے انہیں زندہ کردیا۔ وہ لوگ زندہ ہوکر گھروں کو لوٹے اور عرصہ زندہ رہے۔ اس بارہ میں ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن منذر اور حاکم نے ابو مالک، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ سے متعدد ارشادات روایت کیے ہیں۔ حاکم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ واقعہ روایت کرنے کے بعد کہا یہ حدیث شرط بخاری ومسلم پر صحیح ہے۔ (مستدرک للحاکم جلد دوم صفحہ ۳۰۹ کتاب التفسیر سورہ بقرہ مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

یاد رہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی کو وقت سے قبل بطور سزا موت دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بطور سزا وقت سے قبل ماردیا پھر نبی کی دعا سے انہیں زندہ کیا اور جتنی زندگی ان سے چھین لی گئی تھی انہیں واپس دے دی گئی۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر جانے والے ستر بنی اسرائیل کو مارا اور پھر زندہ کیا گیا۔
ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ (بقرہ،۵۶)

تدبیر سے تقدیر نہیں ٹل سکتی:

بنی اسرائیل موت سے بھاگے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں راستے میں ماردیا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:
قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ''فرمادیں کہ تم جس موت سے بھاگتے ہو وہ تمہیں مل کر

رہے گی۔'' (جمعہ، ۸)

اسی لیے میدان جنگ سے فرار جائز نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے اسے سات عظیم مہلک گناہوں میں سے شمار کیا ہے۔ اور اسی لیے طاعون والی جگہ سے بھاگنا جائز نہیں۔ بنی اسرائیل طاعون سے بھاگے تو راستے میں مار دیئے گئے۔ اسی لیے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''جب کسی جگہ طاعون آ جائے اور تم وہاں ہو تو وہاں سے بھاگو نہیں اور اگر تم وہاں نہیں ہو تو وہاں جاؤ نہیں۔'' (بخاری کتاب الطب)

انبیاء و اولیاء کی استجابت دعاء:

انبیاء کی استجابت دعا: حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے تیس ہزار بنی اسرائیل کا دوبارہ زندہ ہونا بتاتا ہے کہ اللہ کے ہاں انبیاء علیہم السلام کی کیا عظمت اور ان کی دعا کس قدر مقبول ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کا معجزہ اولیاء کی کرامت ہے۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے بنی اسرائیل کا ہڈیاں بن جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنا اپنی شکل میں اسی طرح ہے جیسے حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ کی دعا سے ایک بارات بارہ برس کے بعد دوبارہ زندہ کر دی گئی جو دجلہ میں ڈوب کر ہلاک ہو گئی تھی۔ بعض لوگ اس کرامت پہ بہت اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بارہ سال تک جو لوگ مرے رہے وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو گئے مگر یہ اعتراضات بے معنی ہیں کیونکہ جب نبی کا معجزہ ثابت ہے تو ولی کی کرامت سے کیوں انکار ہے۔

بلکہ یہاں معاملہ اللہ جل جلالہ واتم برھانہ واعظم قدرتہ کی قدرت واختیار کا ہے، جو اللہ نبی کی دعا سنتا ہے وہی اللہ ولی کی دعا بھی سنتا ہے تو جس رب نے حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعاء سے تیس ہزار مردے زندہ کر دیئے اسی رب نے غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی دعاء سے ایک بیڑی میں سوار چند افراد بھی بارہ برس کے بعد دوبارہ زندہ کر دیئے۔

طاعون سے بھاگنا جائز نہیں ہے

معلوم ہوا جو لوگ طاعون سے بچ کر بھاگے وہ راستہ میں مار دیے گئے۔ اسی طرح حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اذا وقع الطاعون بارض فلا تدخلوها واذا وقع وانتم فيها فلا تخرجوا منها۔ جب کسی جگہ طاعون پڑے تو وہاں نہ جاؤ اور اگر طاعون آ جائے اور تم وہاں ہو تو وہاں سے مت نکلو۔

(بخاری، مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ ۴۹۴)

ام المؤمنین حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جس جگہ طاعون پڑے وہاں جو آدمی صبر کے ساتھ ٹھہرا رہے اور جان لے کہ اسے وہی پہنچے گا جو اللہ نے اس کے لیے لکھا ہے تو اس کے لیے شہید کا اجر ہے۔ (بخاری کتاب الطب، باب ۳۰)

یعنی خواہ وہ اس طاعون میں فوت ہوگیا یا زندہ رہا بہرحال وہ شہیدوں میں شامل کر دیا گیا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا پہ صبر کرلیا ہے اور ایک حدیث کے مطابق طاعون سے بھاگنا ایسے گناہ عظیم ہے جیسے میدان جنگ سے بھاگنا۔
(درمنثور)

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ

اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور جان لو کہ اللہ سب سننے والا جاننے والا ہے۔ [290] کون ہے جو اللہ کو

يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ

اچھا قرض دے تو اللہ اُسے اس کے لئے کئی گنا بڑھا دے [291] اور اللہ ہی تنگ کرتا اور کشادہ کرتا ہے

وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ [292]

[290] قرآن کریم کا یہ حکم قتال تا قیامت ہے، لہٰذا اس کا منکر کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جہاد کی منسوخی کا اعلان کیا۔ وہ اپنے اشعار میں کہتا ہے۔

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال — دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دیں کا امام ہے — دیں کی تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نور خدا کا نزول ہے — اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد — منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد
یہ حکم سن کے جو بھی لڑائی کو جائے گا — وہ کافروں سے سخت ہزیمت اٹھائے گا

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ مندرجہ روحانی خزائن جلد ۱۷ صفحہ ۷۸ مطبوعہ لندن)

[291] یعنی اللہ کی راہ میں (جیسے جہاد یا دیگر نیک کاموں پر) مال خرچ کرنا ایسے ہے جیسے اللہ کو قرض دیا۔ مروی ہے کہ جب یہ آیت مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ یعنی ''اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرنے والوں کی مثال یہ ہے کہ ایک دانہ سے سات خوشے پیدا ہو جائیں اور ہر خوشہ میں سو دانے ہوں۔'' (بقرہ:۲۶۱) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے دعا کی اللھم زد امتی ''اے اللہ میری امت کو اس سے زیادہ دے۔'' تب یہ آیت اتری: فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ یعنی ''اللہ کو قرض دینے والوں کو اللہ کثیر گنا زیادہ دے گا۔'' آپ ﷺ نے

پھر دعا فرمائی، اے اللہ میری امت کو زیادہ دے۔ تب یہ آیت اتری: اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑩ (ابن حبان، بیہقی وغیرہما)

اللہ تعالیٰ کی راہ میں اچھا قرض دینا یہ بھی ہے کہ اس کی رضا میں کسی حاجت مند کو مالی قرض دیا جائے اور اس پر سود نہ رکھا جائے یا اگر مقروض واقعی مجبور ہو تو اسے مزید مہلت دی جائے۔ یہ بھی ایسے ہے جیسے اللہ کو قرض دیا یعنی اللہ تعالیٰ اس قرض دینے کا اجر عطا فرمائے گا۔ حدیث میں ہے جو کسی کو قرض دے وہ ایسے ہے جیسے اس نے اس سے دوگنا اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ (ابن ماجہ عن ابن مسعود)

[292] یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا بڑھتا ہے کیونکہ رزق کا تنگ کرنا یا کھولنا اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ تم اللہ کی راہ میں دو اللہ تمہیں دے گا۔ اس کے مزید معانی بھی ہیں جو کتب تفسیر میں مذکور ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ

کیا آپ نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی طرف نہ دیکھا؟ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد تھے جب وہ اپنے نبی سے کہنے لگے:

لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ

ہمارے لئے ایک حاکم مقرر کرو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں، [293] نبی نے کہا: کیا یہ قریب ہے

اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ

کہ اگر تم پر جہاد فرض کیا جائے تو تم جہاد نہ کرو؟ وہ کہنے لگے: ہمیں کیا عذر ہے کہ ہم

سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ

اللہ کی راہ میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں ہمارے شہروں اور بچوں سے دور کردیا گیا؟ پھر جب ان پر

الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۲۴۶

جہاد فرض کیا گیا تو انہوں نے منہ پھیر لیا [294] سوا ان میں سے چند ایک کے، اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِیُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى

اور ان سے ان کے نبی نے کہا: بیشک اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنایا ہے [295] وہ کہنے لگے:

یَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ یُؤْتَ سَعَةً

اسے کیا حق ہے کہ ہم پر حکومت کرے؟ جبکہ ہم اس کی نسبت حکومت کے زیادہ حقدار ہیں اسے تو مال کی فراوانی (بھی)

مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَیْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ

نہیں دی گئی، [296] نبی نے کہا: بے شک اسے اللہ نے تم پر برگزیدہ کیا اور علم

وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْكَهٗ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۴۷

اور جسم میں کشادگی دی ہے اور اللہ اپنی حکومت جسے چاہے دے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ [297]

قیام جہاد کیلئے طالوت کا بادشاہ مقرر کیا جانا

[293] بتایا جارہا ہے کہ بنی اسرائیل جب اپنی بداعمالی کے سبب دوسری قوموں کے محکوم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم جہاد دیا اور جہاد کے لیے ان میں ایک بادشاہ یا حاکم مقرر کیا گیا مگر جب وقت جہاد آیا تو اکثر نے بزدلی دکھائی۔ تو بزدلوں پر اللہ کی پکڑ آئی۔ پھر مٹھی بھر صابروں کو اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن پر غلبہ دیا گیا۔ اس رکوع اور اگلے رکوع میں یہی واقعہ بیان ہو رہا ہے۔

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قریباً تین صدی بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے گیارہ صدی پہلے کا ہے۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام، ان کے بعد کالب بن یوقنا علیہ السلام اور ان کے بعد حضرت حزقیل (جن کا ذکر آیت ۲۴۳ میں ابھی گزرا) کو مبعوث فرمایا گیا۔ ان انبیاء علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے بنی اسرائیل میں بھیجا گیا۔ ان کے بعد ایسا دور آیا کہ بنی اسرائیل گناہوں اور شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ تب ان کی معروف دشمن قومِ عمالقہ ان پر غالب آئی اور انہیں ان کے علاقوں سے نکال دیا اور بچوں عورتوں کو غلام بنالیا۔

تب اللہ تعالیٰ نے ان میں حضرت شموئیل علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اس وقت بنی اسرائیل میں مذہبی قیادت کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی نبی بھیجتا تھا، پھر سیاسی قیادت کے لیے وہ نبی بنی اسرائیل میں سے کسی کو حاکم و بادشاہ مقرر کرتا۔ بنی اسرائیل نے حضرت شموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے کوئی حاکم مقرر کریں تاکہ وہ اس کی زیر قیادت جہاد کر کے اپنا کھویا ہوا ملک حاصل کریں۔ حضرت شموئیل علیہ السلام نے کہا مجھے لگتا ہے کہ اگر تم پر کوئی حاکم مقرر ہوا اور تمہیں اس کے ساتھ جہاد کے لیے نکلنے کا حکم کیا گیا تو تم جہاد سے منہ پھیر لو گے۔ انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم اپنے علاقوں اور اپنی اولاد سے محروم کر دیئے گئے۔ ہم کیوں نہ لڑیں گے۔ مگر وہی ہوا جو اللہ کے پیغمبر نے اپنے علم غیب یا فراست ایمانی سے کہا تھا۔ جب ان میں سے طالوت نامی شخص کو بادشاہ مقرر کیا گیا اور بنی اسرائیل کو اس کے ساتھ جہاد کے لیے نکلنے کو کہا گیا تو یہ لوگ راستے میں منہ پھیر کر لوٹ آئے۔ اگلی آیات میں اس کی وضاحت آرہی ہے۔

حاکمِ اسلامی کا سب سے اہم فریضہ اقامت جہاد ہے:

اَبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ سے معلوم ہوا مسلمانوں کے حاکم کا یہ اہم ترین فریضہ ہے کہ جب کفار مسلمانوں پر یلغار کر رہے ہوں تو وہ راہ حق میں جہاد کیلئے نکلے تاکہ مسلمانوں کی زندگیاں کفار کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ جیسا کہ بنی اسرائیل پہ طالوت کے بطور حاکم تقرر کا یہی مقصد تھا۔ افسوس آج ہمارے نام نہاد مسلم حکمران جہاد کا لفظ زبان پر لانے والے مسلمان کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ ان کی کرسیوں کو امریکی پشت پناہی حاصل رہے۔ آہ! امت مسلمہ پر بہت کٹھن وقت آپڑا ہے۔

آج فلسطین، کشمیر، عراق، افغانستان اور پاکستان میں امریکہ، بھارت اور اسرائیل سب مل کر مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کفار بنی اسرائیل کا خون بہا رہے تھے تو اللہ نے بنی اسرائیل کو جہاد کا حکم دیا۔ آج بھی مسلمانوں کی پریشانیوں کا حل جہاد میں ہے۔ جب اہل اسلام باہم مل کر جہاد کا اعلان کریں گے تو آسمان سے فتح کے اسباب بارش کی طرح برسیں گے، جیسا کہ غزوہ بدر میں ہوا تھا۔ کم ہمت مسلم حکمران کہتے ہیں کہ ہمارے پاس جہاد کے وسائل نہیں ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اہلِ بدر کے پاس کتنے وسائل تھے؟ مومن کا اصل ہتھیار جذبۂ جہاد، اللہ تعالیٰ کی ذات پہ بھروسہ اور باہمی اتحاد ہے۔

سیاست کو تابعِ دین ہونا چاہیے:

اِبْعَثْ لَنَا مَلِكًا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں جو اللہ کا نبی ہوتا وہ ان کے لیے حاکم کا تقرر کرتا تھا۔ گویا سیاست تابع دین تھی۔ آج نیا نبی تو نہیں آ سکتا مگر علماء دین جو وارثان انبیاء کرام علیہم السلام ہیں موجود ہیں۔ ضروری ہے کہ حاکم وقت انہی کے مشورے سے مقرر کیا جائے اور وہ انہی کے بیان کردہ نظامِ شریعت کے مطابق حکومت چلائے۔ مگر آج یہ صورت حال ہے کہ اکثر ممالک اسلامیہ میں غیر اسلامی قوانین مروج ہیں اور علماء بے بس بیٹھے ہیں انکی کوئی شنوائی نہیں یعنی دین کو سیاست کے تابع کر دیا گیا ہے۔

[294] بنی اسرائیل کے الفاظ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ بتاتے ہیں کہ وہ اعلاء کلمۃ الحق کے لیے نہیں صرف اپنے علاقوں اور بچوں کی بازیابی کے لیے لڑنا چاہتے تھے۔ تاہم چونکہ اس میں بالواسطہ دین کی عظمت ہے۔ اس لیے ان کی درخواست قبول ہوئی اور انہیں طالوت کی صورت میں مضبوط ایمان اور وسیع علم والا حاکم دیدیا گیا مگر چونکہ انکے دلوں میں غلبہ دین کا جذبہ نہ تھا اس لیے وہ میدان میں ٹھہر نہ سکے۔

[295] بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کو اسباط کہتے تھے۔ جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں سے چلے۔ سبط لاوی میں عموماً انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے اور سبط یہودا میں عموماً بادشاہ آئے مگر یہ کوئی خدائی فیصلہ نہ تھا کہ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے جس پر چاہے ہو جائے۔ چنانچہ اللہ کی رحمت طالوت پر ہوئی حالانکہ وہ سبط بنیامین سے ایک غریب شخص تھا۔ حضرت شموئیل علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا اللہ نے طالوت کو تم پر حاکم بنایا ہے۔

اہل تشیع کی دلیل کا ردّ

اہلِ تشیع اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ سے دلیل پکڑتے ہیں کہ امام اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے لہٰذا اس کا منکر کافر ہے مگر یہ کیسی بھونڈی دلیل ہے۔ یہاں اللہ نے ملکاً فرمایا ہے اِمَامًا نہیں فرمایا۔ اہل تشیع کو یہ کہنا چاہیے کہ ہر بادشاہ اللہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے اور کسی بادشاہ کی بادشاہت سے انکار کفر ہے۔ سبط یہودا نے سمجھ لیا تھا

کہ بادشاہت انہی کے خاندان کا حصہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کیا کہ فرمایا وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ شیعہ بھی کہتے ہیں کہ امامت ایک مخصوص خاندان کا حق ہے۔

[296] بنی اسرائیل نے طالوت کے بطور بادشاہ تقرر پر اعتراض کرتے ہوئے کہا وہ تو ایک غریب آدمی ہے وہ کیسے ہمارا حاکم بن سکتا ہے پھر سبط یہودا کے لوگوں نے کہا بادشاہت تو ہماری نسل میں ہے۔ہم اس کے حقدار ہیں طالوت تو محکوم نسل سے ہے۔

[297] حضرت شموئیل علیہ السلام نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تم پر بادشاہ مقرر کیا ہے تو تم اس پر اعتراض کیسے کر سکتے ہو پھر طالوت کو اللہ نے جسم اور علم میں کشادگی دی ہے اور یہ چیز اس کے حاکم ہونے میں مد ہے کیونکہ علم کے بغیر حکومت نہیں کی جاسکتی اور قد آور ہونا حاکم کی شخصیت کو بارعب بناتا ہے۔

یاد رہے طالوت تورات اور شریعت موسوی کا سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا اور قد و قامت میں سب بنی اسرائیل سے بلند تر تھا۔ جب ان میں سے کوئی دراز تر شخص ہاتھ اٹھاتا تو وہ اس کے سر تک پہنچتا اور دراز قد ہونا جہاد میں بہت مؤثر ہے۔اس سے دشمن پر رعب پڑتا ہے۔اس لیے طالوت کا حاکم بنایا جانا جسمانی اور علمی دونوں اعتبار سے مناسب تر تھا۔ آگے حضرت حزقیل علیہ السلام نے فرمایا میرا اللہ اپنی حکومت جسے چاہے دے،اس کی رحمت کسی خاندانی وابستگی اور مالی حیثیت سے بالاتر ہے۔

فضیلت کا معیار نسب نہیں علم و عمل اور ایمان ہے:

طالوت علم دین میں سب سے بلند تر تھا اور علم وہی مقبول ہے جو عمل سے مزیّن ہو تو اس کے علم و عمل یعنی ایمانی و اخلاقی برتری کے باعث اسے بادشاہت دی گئی جبکہ باقی بنی اسرائیل اپنے نسب اور مال پر فخر کرتے رہ گئے۔اسی لیے فرمایا گیا:اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ (حجرات:۱۳)

اسلام میں حکومت کسی خاندان کی میراث نہیں:

بنی اسرائیل میں سے سبط یہودا نے حکومت و امارت کو اپنی نسل سے مخصوص جانا اور کہا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ مگر اللہ نے اس کا رد کرتے ہوئے فرمایا: وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ بلکہ اسی لیے کہ بنی اسرائیل میں سب سے ادنیٰ نسب سبط بنیامین متصور تھا اللہ نے اس میں سے طالوت کو حکومت دی۔ گویا کہ دوسرے لفظوں میں بتادیا کہ اسلام میں موروثی ملکویت وسلطنت کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں سے اہلِ تشیع کے عقیدۂ امامت کا بھی رد ہوا کہ وہ خلافت کو نسب کی بنیاد پر دیکھتے ہیں جبکہ اللہ فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

اللہ ورسول کے مقرر کردہ حاکم سے انکار کھلی گمراہی ہے:

طالوت کو اللہ اور اس کے رسول شموئیل علیہ السلام نے حاکم مقرر کیا۔ بنی اسرائیل نے اس پر انکار کیا تو اللہ نے اس کا رد اتارا۔ یونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو وصال سے قبل اپنے مصلّی امامت پر کھڑا کیا اور ان کی امارت میں لوگوں کو حج ادا کرنے کا حکم دیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انہیں اپنا خلیفہ مقرر کرنا ہی تھا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ان کے ہاتھ پر بیعت خلافت کرنا بھی بالواسطہ اللہ اور رسول کی طرف سے انکا تقرر ہی تھا۔ اب جو اس سے انکار کرے وہ مرضی خدا اور رسول کا ٹھکرانے والا اور مسلمانوں کے اجماعی طریقہ سے ہٹ کر چلنے والا ہے اور ایسا شخص بحکم قرآن جہنمی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ (نساء ۱۱۵)

اسی لیے حضرت مولا علی المرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں تاریخی ارشاد فرمایا جو اہل تشیع کی معتبر ترین کتاب نہج البلاغہ میں یوں مذکور ہے کہ فرمایا:

انما بایعنی القوم الذین بایعوا ابا بکر وعمر وعثمان علیٰ ما بایعوهم علیه. وانما الشوریٰ للمهاجرین والانصار فان اجتمعوا علی رجل وسمّوه اماما کذالك لله رضا، ''میری بیعت تو انہی لوگوں نے انہی شرائط پر کی ہے جنہوں نے ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم کی ان شرائط پر بیعت کی تھی۔ اور مشورہ سے امیر بنانا تو مہاجرین وانصار ہی کا حق ہے، اگر وہ کسی شخص پہ اجماع کرلیں اور اسے امام بنا دیں تو وہ اللہ کا پسندیدہ امام ہے۔'' (نہج البلاغہ خط ۶ از حضرت علی بنام امیر معاویہ صفحہ ۵۲۶ مطبوعہ دار الفکر بیروت) اس خط نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم بقول حضرت مولا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ خلیفہ وامام تھے اور اگر ان کی خلافت کو نہ مانا جائے تو بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی اپنی خلافت کی بنیاد بھی ختم ہو جاتی ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ

اور ان کے نبی نے ان سے کہا: طالوت کے بادشاہ بننے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس تابوت آجائے جس میں تمہارے رب کی

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ

طرف سے سکون قلب ہے اور وہ بقیہ چیزیں ہیں جو آلِ موسیٰ وآلِ ہارون علیہما السلام چھوڑ کر گئے، اسے فرشتے اٹھائے ہوں گے [298]

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع

بیشک اس میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے اگر تم مؤمن ہو۔[299]

جب بنی اسرائیل کو تبرکات انبیاء والا تابوت واپس دیا گیا

[298] حضرت شموئیل علیہ السلام نے فرمایا اے بنی اسرائیل طالوت کے اللہ کی طرف سے حاکم بنائے جانے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارا وہ تابوت تمہارے پاس واپس آجائے گا جس میں تمہارے لیے سامان سکون قلب ہے اور اس میں حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے متبعین کی چھوڑی ہوئی چیزیں ہیں۔ اسے فرشتے اٹھا کر واپس لائیں گے۔ روایات میں ہے کہ یہ تابوت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر اتارا۔ اس میں تمام انبیاء کرام رضی اللہ عنہم کی تصاویر تھیں۔ سب سے آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصویر تھی۔ یہ تابوت نسل درنسل انبیاء کرام رضی اللہ عنہم کے پاس رہا پھر موسیٰ علیہ السلام کو ملا۔ آپ نے اس میں تورات رکھی اور اپنی ضرورت کی چیزیں اس میں رکھتے تھے۔ (ممکن ہے اس میں مختلف حصے ہوں) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء بنی اسرائیل اسے سنبھالتے رہے جب کبھی دشمن سے لڑائی ہوتی تو وہ اسے سامنے رکھتے اور اس کی برکت سے انہیں فتح ملتی۔

حضرت ابوصالح رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے اور عصا تھا، تورات کی دو تختیاں اور من وسلویٰ کے چند ٹکڑے تھے۔ (گویا وہ بنی اسرائیل کی مجسم تاریخ تھی) حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نعلین بھی تھی۔ (تفسیر ابن ابی حاتم جلد ۲ صفحہ ۴۷۰ حدیث ۲۴۸۸)

حضرت وہب بن منبہ رضی اللہ عنہما سے امام ابن اسحاق اور امام ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ یہ تابوت حضرت یسع علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں رہا۔ جب دشمن سے جنگ ہوتی تو وہ تابوت کو اپنے آگے رکھتے اور اللہ تعالیٰ اس برکت سے انہیں فتح دیتا تھا۔ (درمنثور جلد اول صفحہ ۷۵۱)

جب بنی اسرائیل میں اعتقادی وعملی خرابیاں زیادہ ہوگئیں تو قوم عمالقہ ان پہ غالب آگئی اور وہ ان سے یہ تابوت بھی چھین کر لے گئے اور لے جا کر اسے اپنے بت کے قدموں کے نیچے رکھ دیا۔ اگلے دن وہ بت گرا پڑا تھا اور اس کے پاؤں

ٹوٹے ہوئے تھے۔ تب انہوں نے تابوت کو شہر کے ایک کونے میں پھینک دیا تو پورے شہر کو گردن توڑ بخار نے آلیا۔ انہوں نے اسے صحرا میں جا پھینکا اوراوپر گندگی ڈال دی (معاذ اللہ) اب جو وہاں سے گزرتا اسے بواسیر اور قولنج آ پکڑتا۔ آخر وہاں بنی اسرائیل میں سے ایک عورت تھی اس نے کہا اے لوگو اگر ان مصائب سے نجات چاہتے ہو تو اس تابوت کو واپس لوٹا دو، انہوں نے ایک بیل گاڑی پر اسے رکھا آگے دو بیل لگائے اور گاڑی کو بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے چار فرشتے بیل گاڑی پر مقرر کردیئے جو اسے ہانکتے لے آئے۔ اللہ فرماتا ہے: تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ جب بنی اسرائیل نے بیل گاڑی پر اپنا تابوت دیکھا تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اور وہ اللہ کی حمد بجالائے۔

(سیوطی، مظہری، بغوی وغیرہم)

[299] یعنی حضرت شموائیل علیہ السلام فرمار ہے ہیں کہ اے بنی اسرائیل تابوت کا واپس آنا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی نشانی ہے یا امتِ مسلمہ سے فرمایا جارہا ہے کہ اس واقعہ میں تمہارے لیے بڑی نشانی اور درس عبرت ہے۔

آثارِ صالحین سے برکت لینا سنت انبیاء کرام علیہم السلام ہے:

وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ کے تحت امام ابوحیان فرماتے ہیں اس میں آل موسیٰ و آل ہارون سے موسیٰ و ہارون علیہما السلام کی نسل میں آنے والے انبیاء مراد ہیں۔ (البحر المحیط جلد ۲ صفحہ ۲۶۲) یعنی انبیاء کرام علیہم السلام نے اس تابوت میں برکت کے لیے موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے کپڑے عصا اور نعلین اور دیگر تبرکات محفوظ رکھے ہوئے تھے اور جنگوں میں ان کی برکت سے فتح حاصل کرتے تھے۔ ابو صالح کہتے ہیں کہ تابوت سکینہ میں عصائے موسیٰ، عصائے ہارون، لباس موسیٰ، لباس ہارون اور تورات کی تختیاں تھیں۔ (درمنثور بروایت ابن ابی حاتم جلد اول صفحہ ۷۵۸)

اور انبیاء کرام علیہم السلام ان تبرکات کی حفاظت کرتے اور ان سے برکت لیتے تھے۔ تبرکات سے برکت حاصل کرنے کا سنت انبیاء ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ میری قمیص لے جاؤ اسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دو تو ان کی بینائی لوٹ آئے گی۔ (یوسف ۹۳) اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات سے برکت حاصل کرتے تھے۔ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک تھا ان کی بہن حضرت سیدہ اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں ہم وہ جبہ دھو کر مریضوں کو پانی پلاتے تو انہیں شفا ملتی تھی۔ (مسلم جلد اول صفحہ ۲۱۹۰ کتاب اللباس)

آل بمعنی اتباع کرنے والے بھی ہے:

آل موسیٰ و آل ہارون میں آل بمعنی متبعین ہے۔ یاد رہے! لفظ آل سے کسی کی اولاد بھی مراد ہوتی ہے۔ اور اس کے متبعین بھی۔ لہٰذا درود شریف اللھم صلی علی محمد و علیٰ آل محمد... الخ میں جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد و عترت کے لیے دعا رحمت ہے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت کے لیے دعائے رحمت بھی ہے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ

چنانچہ جب طالوت لشکر لے کر (جہاد کو) نکلا تو اس نے کہا: اللہ تمہیں ایک نہر پر آزمانے والا ہے تو جس نے

شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ

اس میں سے پیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور جس نے اسے نہ چکھا اس کا مجھ سے تعلق ہے سوا اس کے جو اس میں سے

غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ

اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے [300] تو سب نے اس سے پی لیا سوا ان میں سے چند ایک کے [301] پھر جب طالوت

آمَنُوا مَعَهُ ۙ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ

اور اس کے مؤمن ساتھیوں نے اس کے ساتھ وہ نہر عبور کر لی تو انہوں نے کہا: آج جالوت اور اس کے لشکروں سے

يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ ۙ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً

مقابلہ کی ہم میں طاقت نہیں، تو جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں انہوں نے کہا: کئی چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے

بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾

بڑے گروہوں پر غالب آجاتے ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔[302]

ایک نہر پر بنی اسرائیل کی آزمائش

[300] چنانچہ جب بنی اسرائیل حضرت طالوت کے زیر قیادت جہاد کے لیے نکلے تو انہوں نے حضرت شمویئل علیہ السلام کے بتانے سے بنی اسرائیل میں اعلان فرمایا کہ اللہ تمہیں راستے میں ایک نہر پر آزمائے گا۔ سخت پیاس کے باوجود تم نے اس سے پانی نہیں پینا ورنہ تم میرے لشکر میں نہیں رہ سکو گے لیکن جو اس میں سے کچھ نہ پیئے وہ میرے ساتھ رہ سکتا ہے، ہاں زیادہ سے زیادہ یہ اجازت ہے کہ ہاتھ سے چلو بھر لو، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ نہر اردن اور فلسطین کے درمیان ہے۔ جدید مفسرین کے مطابق یہ ۶۵ میل لمبی نہر ہے جو بحر مردہ Dead sea میں گرتی ہے (تفسیر ماجدی صفحہ ۱۰۰) اس آزمائش کا یہ مقصد تھا کہ جنگ میں وہی ٹھہر سکتا ہے جو تکلیف برداشت کرنے اور صابر رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور جس میں یہ حوصلہ نہ ہو وہ میدان جنگ میں نہ ہی جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سے بھاگ اٹھے گا اور دوسروں کے حوصلے

بھی پست کرے گا۔

[301] چنانچہ جب وہ نہر آئی تو اکثر بنی اسرائیل شدت پیاس کے سبب اس پر ٹوٹ پڑے انہیں صرف ایک چلو اٹھانے کی اجازت تھی مگر انہوں نے نہر کو منہ لگا لیا اور پیتے چلے گئے۔ وہ جس قدر پیتے ان کی پیاس بڑھتی جاتی۔ ان کے ہونٹ سیاہ ہو گئے اور ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ وہ نہر عبور ہی نہ کر سکے۔ ان کی تعداد چھہتر (۷۶۰۰۰) ہزار تھی، ان میں سے صرف چار ہزار وہ تھے جنہوں نے پانی کو مطلقاً نہ چکھا یا صرف ایک چلو پیا اور امتحان میں کامیاب ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جنہوں نے نہر میں سے ایک چلو پانی نکالا وہ ان کیلیے اتنا بابرکت ہوا کہ وہ اس سے نہ صرف وہ خود سیراب ہوئے بلکہ جانوروں اور خدام کو بھی سیراب کیا۔ یہ اس طرح ہے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جام شیر سے ستر اصحاب کو سیراب کر دیا۔

عظمتِ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

بنی اسرائیل کو نہر پر آزمایا گیا تو ان کی اکثریت ناکام ہوئی وہ پیاس کی تکلیف برداشت نہ کر سکے۔ مگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بدر واحد اور خندق و تبوک میں بھوک، پیاس، افلاس اور خوف و خطر سے آزمایا گیا۔ اور وہ ہر آزمائش میں پورے اترے۔ بدر میں وہ روزہ رکھ کر بھوکے پیاسے لڑے، احد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زخموں سے چور چور پڑے تھے، ایسے میں انہیں حکم ہوا کہ لشکر ابوسفیان کا تعاقب کرو تو وہ زخمی حالت میں تعاقب کے لیے نکل پڑے۔ تب اللہ تعالیٰ نے انکی تعریف میں یہ آیت اتاری: اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٢﴾ یعنی ”جن اہل ایمان نے اللہ ورسول کے حکم پر لبیک کہا بعد ازاں کہ انہیں شدید زخم پہنچے ہوئے تھے ان میں سے متقین و محسنین کے لیے اجر عظیم ہے۔“ (آل عمران، ۱۷۲)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوہ تبوک میں اس حالت میں مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے کہ ان میں سے بعض کے باغات میں پھل پکے ہوئے تھے اور ان کے اترنے کا وقت تھا مگر وہ پھلوں کو درختوں ہی پہ چھوڑ کر جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ پھر طویل سفر کے لیے سواریاں پوری طرح تیار نہ تھیں اور سخت گرمی کا وقت تھا، اسے قرآن پاک میں سَاعَةِ الْعُسْرَةِ (مشکل کی گھڑی) کہا گیا۔ (توبہ، ۱۱۷) اور اس لشکر کو حدیث میں جیش عسرت (تنگی والا لشکر) کہا گیا (بخاری، کتاب المغازی) راستہ میں بسا اوقات ہر مجاہد کو دن میں صرف دو کھجوریں کھانے کو دی جاتیں۔ الغرض اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قربانیوں کی مثال پوری تاریخ انبیاء میں کہیں نہیں ملتی۔

مگر افسوس انہی جانثاران مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ بُرا عقیدہ گھڑ لیا گیا کہ انہیں وصال نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلیفہ ماننے کا حکم تھا مگر انہوں نے اللہ ورسول کے حکم کو توڑ کر حضرت ابوبکر کو خلیفہ بنا لیا، یوں وہ سب اسلام سے خارج ہو گئے (معاذ اللہ) جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یوں اپنے آقا و مولیٰ کے ہر حکم پہ جان کی بازی لگائی تھی

اگر واقعی انہیں حکم رسول ﷺ ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنائیں تو کیا وہ اس سے انحراف کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں، انہیں تو نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے مصلیٰ امامت پہ کھڑے کر کے یہی حکم دیا تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنائیں، سو انہوں نے حکم رسول ﷺ کو پورا کر دکھایا۔

ہوس دنیا کی مثال:

دنیا کی مثال بنی اسرائیل کی نہر کی طرح ہے۔ جس نے اس میں سے بقدر کفایت چلو بھرا وہ دنیا سے سلامتی سے نکل گیا اور جس نے اس سے زیادہ پیا وہ پیتا ہی جائے گا اور کبھی سیراب نہ ہوگا۔ اور اللہ کی اطاعت سے دور جا پڑے گا۔

[302] جب نہر پر صرف چار ہزار بنی اسرائیل آزمائش میں کامیاب ہوئے (اور باقی چھہتر ہزار ناکام لوٹ گئے) تو حضرت طالوت انہیں لے کر آگے بڑھے۔ جب قوم عمالقہ سے آمنا سامنا ہوا تو ان چار ہزار میں سے بھی اکثر نے ہمت ہار دی۔ لشکر عمالقہ کا سردار جالوت ایک لاکھ اور دوسری روایت میں تین لاکھ جنگجو افراد کے ساتھ مقابلہ میں کھڑا تھا۔ اور وہ بہت دراز قد لوگ تھے۔ دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا۔

تب ان چار ہزار میں سے صرف تین سو تیرہ افراد ایسے تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا دن (روز حشر) یاد رکھا تھا۔ انہوں نے کہا ہمت نہ ہارو تم اگرچہ کافر قوم سے تعداد میں بہت کم ہو کہاں تین لاکھ کہاں صرف چار ہزار مگر بارہا ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے چھوٹے لشکر اپنے سے کئی گنا بڑے لشکروں پر غالب آ جاتے ہیں یعنی فتح و نصرت کا مدار کثرت تعداد نہیں اللہ کی امداد ہے۔ مگر ان چار ہزار میں سے صرف تین سو تیرہ ہی جنگ پر آمادہ ہوئے باقی سب ہمت ہار گئے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باہم کہتے تھے کہ اہل بدر کی تعداد حضرت طالوت کے ساتھیوں کے برابر تھی یعنی تین سو دس اور کچھ۔ (بخاری جلد دوم صفحہ ۵٦۴)

بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کتبِ شیعہ سے:

بلکہ اہل تشیع میں سے ملا باقر مجلسی نے بھی اہل بدر کے بارے میں لکھا ہے:

وکان المسلمون ثلاث مأة وثلاثة عشر رجلا علی عدة اصحاب طالوت الذین جاوزوا معه النهر، یعنی بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی طالوت کے ساتھیوں کے برابر جنہوں نے نہر کو پار کیا تھا۔

(بحار الانوار جلد ١٩ صفحہ ٢٠٦ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

گویا تین سو تیرہ کے سوا باقی تین ہزار چھ سو ستاسی بنی اسرائیل نے لڑائی سے منہ موڑ لیا تو جیسے بنی اسرائیل میں سے تین سو تیرہ مخلص یارانِ نبی ﷺ کے صدقے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب اور کفر کو مغلوب کیا۔ اسی طرح تین سو تیرہ اہلِ بدر کی عظیم قدر و منزلت بھی یہی ہے کہ ان کے گہرے اخلاص و ایمان کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کے لیے غلبہ

اسلام کی بنیاد رکھی۔

اسی لیے مشہور شیعہ مفسر شیخ علی بن ابراہیم قمی (جو صاحب اصول کافی محمد بن یعقوب کلینی کا شیخ ہے) لکھتا ہے کہ حضور ﷺ نے میدان بدر میں رو رو کر اللہ سے دعا مانگی:

اللھم ان تہلك ہذہ العصابة لن تُعبد ابدا،

''اے اللہ! اگر یہ مٹھی بھر مسلمانوں کی جماعت ہلاک ہوگئی تو قیامت تک پھر تیری عبادت نہ ہوگی۔''
(تفسیر قمی صفحہ ۲۴۴ مطبوعہ تہران)

گویا آج جو اللہ کی عبادت ہو رہی ہے اور قیامت تک ہوگی اس میں بقول رسول اللہ ﷺ اہل بدر کی قربانی کا اہم ترین کردار ہے۔ اس کے باوجود اہل تشیع کا صرف ابوذر، مقداد اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم کے سوا باقی تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معاذ اللہ کافر و منافق کہنا کس قدر شقاوت قلبی ہے۔

اور اہلِ بدر کی یہ شان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا:

وما يدريك لعل الله اطلع على اهل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم۔

تم کیا جانو کہ اللہ نے اہل بدر کی طرف نظرِ رحمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم جو بھی عمل کرو، بہر حال اللہ تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا ہے۔ (بخاری کتاب التفسیر سورہ ممتحنہ)

بلکہ اہل تشیع کے ہاں عظیم محقق اور مفسر قرآن شیخ فضل بن حسن طبرسی نے بھی اس حدیث کو اپنی تفسیر میں امام جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے، دیکھیے (مجمع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۵ صفحہ ۲۶۹)

پھر یہی اہل بدر تھے جنہوں نے متفقہ طور پر ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی اور مولا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم کی بیعت کر کے ان کو خلفاء مقرر کیا، اس سے اہل تشیع کو عبرت پکڑنی چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مغفور ہیں، بلکہ قیامت تک ہونے والی عبادت انہی کی مرہون منت ہے تو ان اہل بدر نے جن خلفاء کا تقرر کیا انہیں اہل تشیع کیوں نہیں مانتے۔

اہل تشیع کے ہاں نہایت معتبر کتاب ''وقعۃ الصفین'' جو نصر بن مزاحم نے لکھی ہے جو اہل تشیع کے امام منصوص امام موسیٰ اور امام رضا کے دور کا آدمی اپنی روایت کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتا ہے کہ انہوں نے جنگِ صفین میں اپنی صداقت کے ثبوت کے لیے فرمایا:

الا ان معنا من البدريين سبعين رجلا۔

سن لو کہ ستر اہل بدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمارے ساتھ ہیں۔ (وقعۃ صفین صفحہ ۲۳۶ مطبوعہ کتاب خانہ عمومی قم)

ہم کہتے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ستر بدری صحابہ کا ہونا ان کے لیے دلیلِ صداقت ہے تو سارے بدری صحابہ کا حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کی بیعت کرنا ان کے لیے کیوں دلیلِ صداقت نہیں؟

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ
اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے سامنے نکلے تو انہوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے ہمارے قدم مضبوط کر دے
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ
اور ہمیں کافر قوم پر غلبہ عطا فرما۔ [303] تو انہوں نے انہیں
دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا
اللہ کے حکم سے شکست دیدی، اور داود علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا [304] اور اللہ نے انہیں بادشاہی اور حکمت دی اور انہیں
دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ
سکھایا جو چاہا [305] اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے دفع نہ کرتا تو زمین تباہ ہو جاتی، لیکن اللہ تمام جہانوں پر
فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ
فضل فرمانے والا ہے۔ [306] یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں اور بے شک آپ
لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾
رسولوں میں سے ہیں۔ [307]

تین سو تیرہ مسلمانوں کا تین لاکھ کفار پر غالب آنا

[303] جب یہ تین سو تیرہ افراد حضرت طالوت کے ساتھ میدانِ جہاد میں اترے تو دعا کی اے ہمارے رب تین لاکھ کے سامنے تین سو تیرہ کی کیا حیثیت ہے۔ یہی نظر آتا ہے کہ ہمارا وقت شہادت آ گیا ہے تو اے اللہ! ہمیں اتنا صبر دے کہ جب دشمن کی تلواریں اور نیزے ہمارے ٹکڑے کریں تو ہماری زبان سے کوئی کلمہ بے صبری نہ نکلے۔ ہمارے قدم جمے رہیں اور تو بڑی طاقت والا ہے اگر تو چاہے تو ہم مٹھی بھر مومنوں کو لاکھوں کافروں پر بھی غالب کر سکتا ہے۔ گویا انہوں نے رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا کہہ کر تمنائے شہادت پہلے کی اور وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ کی صورت میں دعائے نصرت و فتح بعد میں۔ اور اللہ تعالیٰ ان ہی کو غالب کرتا ہے جو زندگی سے زیادہ

موت سے پیار کرتے ہیں۔

[304] تو اللہ تعالیٰ نے ان تین سو تیرہ کو تین لاکھ پر غالب کر دیا۔ ان میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی تھے جو اس وقت ابھرتے نوجوان تھے وہ اپنے والد اور بارہ بھائیوں کے ساتھ ان تین سو تیرہ میں شامل ہو کر کفار سے لڑے، حضرت سدی سے مروی ہے کہ سالار لشکر حضرت طالوت نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص آدمی جالوت کو قتل کرے میں اس سے اپنی بیٹی بیاہوں گا اور اپنے ملک میں اس کا اختیار نافذ کر دوں گا۔

یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام سالار لشکر کفار جالوت کے سامنے پہنچے۔ انہوں نے اپنی منجنیق سے تین پتھر اس پر برسائے جو اکٹھے اس کی آنکھوں کے درمیان جا کر لگے اور اس کا سر اڑا دیا۔ جالوت کے مرنے سے سارے لشکر کفار میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ فرار ہونے لگے۔ ہزاروں مارے گئے۔ ہزاروں پکڑے گئے۔ حضرت طالوت نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد علیہ السلام سے کر دیا اور اپنے ملک میں ان کی مہر جاری کر دی۔ حضرت مکحول سے مروی ہے کہ جب طالوت نے بنی اسرائیل کا زیادہ رجحان حضرت داؤد کی طرف دیکھا تو ساری حکومت ان کے سپرد کر کے خود خلوت نشینی اور ذکر و استغفار میں لگ گئے۔ آخر راہ حق میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یوں تمام بنی اسرائیل کی حکومت حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس آ گئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی اتاری، انہیں لوہا گری سکھائی اور پہاڑ اور پرندے ان کے ساتھ تسبیح کہتے تھے۔ (در منثور جلد اول صفحہ ۷۶۴)

جنگ میں کثرت دعا و ابتہال کرنی چاہیے:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ سے معلوم ہوا کہ مجاہدین کو میدان جہاد میں دعاء کا اسلحہ زیادہ استعمال کرنا چاہیے اور اپنے پروردگار کی بارگاہ سے مدد مانگنے پہ زور لگانا چاہیے۔ حضرت طالوت کے ساتھیوں نے جب اس طرح میدان جہاد کو دعاؤں سے گرم کیا تو اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ مجاہدین کو تین لاکھ کافروں پہ غالب کر دیا۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی میدان بدر میں اپنے رب کو خوب پکارا اور رو رو کر کہا یا اللہ! میں اہل ایمان کی یہ مٹھی بھر جماعت لے کر آ گیا ہوں یا اللہ! اگر یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر کبھی تیری عبادت نہ ہو گی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کو قبول فرما لیا اور بدر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدد کے لیے پانچ ہزار فرشتے نازل فرما دیے۔ مگر یہاں یہ بھی افسوس کا مقام ہے کہ آج کل ہمارے فوجی میدانِ جنگ میں بھی دعاؤں کی بجائے میوزک کے ساتھ گانے سنتے اور اسی میں مگن رہتے ہیں، پھر کامیابی کیسے ملے؟

مسلمان کا اصل ہتھیار تیغ وسنان نہیں اس کا جذبہ ایمان ہے:

تین سو تیرہ اصحاب طالوت کو اللہ تعالیٰ نے انکے جذبہ ایمان کی وجہ سے تین لاکھ کفار پہ غلبہ عطا فرمایا۔اس لیے آج مسلمانوں کو اس لیے پست ہمت نہیں ہونا چاہیے کہ انکے پاس اسلحہ کم ہے، جدید ہتھیار نہیں ہیں، فضائی جنگ کی طاقت کم ہے، آج بھی اگر مسلمانوں میں اصحاب طالوت اور اہل بدر کا جذبہ ایمان بیدار ہو جائے تو ہر میدان انہی کا ہے۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو   اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا   آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے   دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کر دے

حضرت داود علیہ السلام کا رمی احجار اور حضور ﷺ کا میدان بدر میں کنکریاں پھینکنا:

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ہر نبی کے معجزہ کی مثال عطا فرمائی ہے۔حضرت داود علیہ السلام کا یہ معجزہ تھا کہ انکے پھینکے ہوئے تین پتھروں نے کفار کے عظیم لشکر میں بھگدڑ مچادی اور وہ بھاگ اٹھے۔یونہی نبی اکرم ﷺ نے میدان بدر میں زمین سے کنکروں کی مٹھی اٹھا کر کفار کی طرف پھینکی تو کوئی کافر نہ رہا جس کی آنکھوں میں کنکر نہ پڑ گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑھ بڑھ کر کفار کو مارنے لگے، یوں آناً فاناً مسلمانوں کو فتح مل گئی۔اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ‘‘اور جب آپ نے کنکریاں پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔’’ (انفال،۱۷) امام احمد رضا خان علیہ رحمۃ الرحمان فرماتے ہیں۔

میں ترے ہاتھوں کے صدقے کیسی کنکریاں تھیں وہ   جن سے اتنے کافروں کا دفعۃً منہ پھر گیا

انبیاء کرام علیہم السلام کا کفار سے جہاد اور مرزا قادیانی کی غلامی کفار

حضرت شمویل علیہ السلام اور حضرت داود علیہ السلام نے کفار کے خلاف جہاد کیا اور یہی تاریخ انبیاء ہے کہ وہ کفار کے خلاف سینہ سپر ہوئے ہر نبی کی یہی ذمہ داری تھی کیونکہ وہ سچے انبیاء کرام تھے، اب رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی سچا نبی تو نہیں آسکتا، البتہ جھوٹے دعویداران نبوت کفار کے اشاروں پہ پیدا ہوتے ہیں اور ساری عمر اپنے آقاؤں کی غلامی کا دم بھرتے رہتے ہیں۔دورِ حاضر میں اس کی مثال مرزا غلام احمد قادیانی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اس نے ساری زندگی کفار سے جہاد کو حرام قرار دینے پر زور لگایا کیونکہ اسے اسی کام کے لیے انگریزوں نے پیدا کیا تھا۔دعا ہے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو انکے چنگل سے محفوظ رکھے۔

یہ کیسا عجیب وغریب قسم کا نبی ہے کہ زندگی بھر عیسائی کافروں کی غلامی کا دم بھرتا رہا، ان کی چاپلوسی میں نظمیں اور کتابیں لکھ لکھ کر اوراق سیاہ کرتا رہا۔جب انگریزوں کو کسی میدان میں کامیابی ملتی اور مسلمانوں کو ناکامی تو اس کی خوشی کی

کوئی انتہائی نہ ہوتی۔

چنانچہ سن ۱۹۱۸ء میں بصرہ میں برطانوی افواج غالب آئیں تو پورے عالم اسلام میں صف ماتم بچھ گئی، مگر قادیانیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ان کے خلیفہ مرزا محمود نے خطبۂ مسرت دیتے ہوئے کہا:

حضرت مسیح موعود فرماتے ہیں، میں مھدی معھود ہوں اور گورنمنٹ برطانیہ میری تلوار ہے جس کے مقابلہ میں ان علماء کی کچھ پیش نہیں جاتی۔اب غور کا مقام ہے کہ پھر احمدیوں کو اس فتح کی خوشی کیوں نہ ہو عراق ہو یا شام ہم ہر جگہ اپنی تلوار کی چمک دیکھنا چاہتے ہیں۔(اخبار الفضل قادیان جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۱۸)

گویا قادیانیوں کی دلی خواہش ہے کہ تمام اسلامی ممالک کو کفار اپنی تلواروں سے فتح کرلیں اور کہیں بھی مسلمانوں کی حکومت کا نام ونشان باقی نہ رہے کیونکہ وہ ان کو مسلمان سمجھتے ہی نہیں۔

بلکہ مرزا قادیانی کہتا تھا کہ میری دعوت کی کامیابی انگریز سلطنت کی کامیابی سے وابستہ ہے اگر اس سلطنت پہ کوئی مصیبت آئی تو میری جماعت بھی ختم ہو جائے گی۔(مجموعہ اشتہارات جلد ۳ صفحہ ۵۸۴ مطبوعہ لندن)

[305] حضرت داؤد علیہ السلام کو بادشاہت اور نبوت دونوں دی گئیں۔مروی ہے کہ جالوت نے بھی میدانِ جنگ میں کہا تھا۔اے بنی اسرائیل اگر تم مجھے ماردو تو میری سلطنت تمہاری ہے اور اگر میں تمہیں ماردوں تو تمہاری سلطنت میری ہوگی۔اس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو دشمن کی زمین بھی ہاتھ آئی، آپ نے دو برس پایۂ تخت الخلیل میں رکھا پھر یروشلم کو فتح کر کے وہاں دار السلطنت بنایا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت سے علوم دیئے۔انہیں جانوروں کی بولیاں سکھائیں، انہیں فن لوہا گری سکھایا اور انہیں خوبصورت آواز دی۔

[306] اس جملہ کے متعدد معانی و تفاسیر ہیں۔اول: اگر اللہ جہاد کے ذریعے مومنوں کے ہاتھوں کفار کا زور نہ توڑتا تو ساری زمین پہ کفر ہی چھا جاتا۔یوں وہ فساد سے بھر جاتی اور زمین کے خالق کا ذکر زمین پر منقطع ہو جاتا۔دوم: اللہ مومنوں کے طفیل کافروں سے عذاب ٹال دیتا ہے۔آج بھی زمین پر کفار کی اکثریت ہے اگر یہ نہ ہوتا کہ مومنوں کی وجہ سے کفار سے عذاب ٹالا جاتا ہے تو زمین کب سے تباہ ہو چکی ہوتی۔سوم: جرائم پیشہ لوگ برائیاں کرتے ہیں اور علماء امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے اور امراء و حکام اسلامی نفاذ شریعت کے ذریعے ان کی برائیوں کو مٹاتے ہیں۔اگر یہ نہ ہو تو زمین بدکاری و بداعمالی سے بھر جائے۔

[307] یعنی اے پیارے محبوب ﷺ ہم اپنے فرشتے کے ذریعے آپ کو روزہ، حج، جہاد، احکام نکاح وطلاق، حقوق زوجین اور گزشتہ انبیاء کے واقعات حق کے ساتھ بتاتے ہیں (جو پیچھے سورہ بقرہ میں گزشتہ دو پاروں کے دوران بیان ہوئے) کیونکہ آپ رسولوں میں سے ہیں اور آپ اپنی زبان سے نہیں بولتے بلکہ ہماری زبان سے بولتے ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ

یہ جو جماعتِ انبیاء ہے ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے [308] ان میں سے کچھ سے اللہ نے کلام فرمایا

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ

اور بعض کو (دوسروں پر) کئی درجے بلندی دی [309] اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں اور مقدس روح کے ذریعے

بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ

ان کی مدد کی [310] اور اگر اللہ چاہتا تو انبیاء کے بعد جو لوگ تھے باہم لڑائی نہ کرتے بعد ازاں کہ ان کے پاس

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ

واضح نشانیاں آگئیں، مگر انہوں نے اختلاف کیا تو ان میں سے کوئی ایمان لایا اور کسی نے

كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۗ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

کفر کیا، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہے کرتا ہے۔ [311]

درجاتِ انبیاء اور افضلیتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[308] گزشتہ دو سپاروں میں حضرت آدم، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق یعقوب، موسیٰ، حزقیل، شموئیل اور داؤد علیہم السلام کا ذکر ہوا۔ اب انہی انبیاء کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ ان رسل گرامی میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت دی کیونکہ بعض کو رسالت دی گئی اور بعض کو رسالت کے ساتھ شریعت بھی۔ پھر بعض پر کئی لاکھ لوگ ایمان لائے جیسے ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام اور بعض کو چند ہزار نے مانا جیسے صالح و ہود علیہما السلام اور بعض کو صرف ایک دو افراد نے جیسے لوط علیہ السلام تو جس قدر ماننے والے زیادہ اسی قدر نبی کا درجہ زیادہ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درجہ سب انبیاء سے بہت بلند ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''روزِ قیامت سب امتوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں اسی صفیں میری امت کی ہوں گی اور چالیس صفیں باقی امتوں کی۔''

اگر کہا جائے کہ قرآن میں ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۗ ''ہم رسولوں میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے'' (بقرہ:۲۸۵) اور حدیث مبارکہ میں ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں کسی کو کسی پر فضیلت نہ دو'' (بخاری کتاب الخصومات باب ۱) پھر بعض انبیاء کو دوسروں پر فضیلت دیئے جانے کا کیا معنی ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ نفس نبوت میں کسی نبی کو دوسرے پر فضیلت نہیں یعنی نبی ہونے میں سب برابر ہیں سب کی نبوت قطعی ہے۔ اور کسی نبی کی نبوت میں شک کرنے والا یا اس نبی کی شان میں گستاخی کرنے والا کافر ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہودیوں کی طرح بعض انبیاء کو مانا جائے بعض کو نہیں۔ یہود حضرت اسحاق علیہ السلام کو نبی مانتے ہیں اور ان کے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نہیں مانتے۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کو نبی مانتے ہیں اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو نہیں مانتے۔ یا یہ معنی ہے کہ ایک نبی کی توہین کر کے دوسرے نبی کو اس پر فضیلت نہ دی جائے یعنی کسی کی تعظیم میں فرق نہ لایا جائے۔

ورنہ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

فُضِّلْتُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ، یعنی ''مجھے چھ چیزوں کے ساتھ سب انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے۔ مجھے جوامع الکلم دیئے گئے ہیں، میرے لیے مال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے، میرے لیے ساری زمین کو مسجد بنا دیا گیا اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا۔ ہر نبی کسی قوم کے لیے آیا اور مجھے سب مخلوق کا رسول بنایا گیا اور مجھ پر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا گیا۔''
(مسلم کتاب المساجد حدیث ۵)

[309] یوں تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ہر نبی سے کلام کیا۔ جیسے اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:
وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا (شوریٰ:۵۱) مگر بعض انبیاء سے اس نے خصوصی کلام فرمایا جیسے: وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (نساء:۱۶۴) تو ایسے انبیاء کا درجہ دوسرے انبیاء سے زیادہ ہے۔ اس اعتبار سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ سب انبیاء سے بلند ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صرف کلام ہوا مگر دیدار الٰہی نہ مل سکا جبکہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام کے علاوہ جلوۂ رب العالمین بھی دیا گیا۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (سورہ نجم) کے تحت اس پہ مفصل کلام آئے گا ان شاء اللہ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے کو طور پر جاتے ہیں اور محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام آ کر نیند سے بیدار کر کے لے جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرش پر کلام ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سر لامکاں کلام ہوا۔

رفع بعضھم درجات اور رفعتِ درجاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ کے تحت یہ بات شک سے وراء ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب انبیاء سے کئی درجات بلندی دی گئی۔ اس جگہ ہم صرف قرآن پاک سے آپ کی افضلیت کے چند دلائل یا آپ کی افضلیات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً

(۱) ہر نبی کسی خاص علاقہ یا قوم کے لیے آیا مگر آپ نے فرمایا: يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ''اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' (اعراف، ۱۵۸) اور اللہ فرماتا ہے: وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ''اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔'' (سبا، ۲۸)

(۲) ہر نبی ایک خاص وقت کے لیے آیا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تا قیامت رسول ہیں۔ یعنی آپ کے بعد قیامت ہی آئے گی کوئی

اور رسول نہیں آئے گا۔ یہ بات یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا سے بھی معلوم ہو رہی ہے اور فرمایا گیا: اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ① (القمر،۱) یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ تا قیامت رسول ہیں۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

بُعِثْتُ انا والساعۃُ کھاتین ''مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح اکٹھا بھیجا گیا ہے۔'' (بخاری کتاب الرقاق، مسلم کتاب الجمعہ) یعنی جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی اور رسول نہیں اسی طرح اب تا قیامت میں ہی رسول ہوں میرے اور قیامت کے درمیان کوئی اور رسول نہیں ہے۔

(۳) آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۞ کیونکہ تمام جہان آپ کی وجہ سے پیدا کیے گئے۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لولا محمد ما خلقت الدنیا ''اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں دنیا کو پیدا نہ کرتا۔'' (تاریخ دمشق بحوالہ جامع الاحادیث جلد ۴ صفحہ ۳۴۰) اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''اللہ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا: ولولاہ ما خلقتك، ''اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تمہیں پیدا نہ کرتا۔'' (طبرانی صغیر جلد ۲ صفحہ ۸۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

(۴) پہلے انبیاء کے معجزے جز وقتی تھے۔ مگر ہمارے آقا کریم ﷺ کا معجزہ قرآن لازوال ابدی معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ''اے منکرو اگر تمہیں اس کتاب میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندۂ (خاص محمد ﷺ) پر اتاری ہے تو اس جیسی ایک سورت بنا کر لاؤ۔'' (بقرہ، ۲۳) مگر قیامت تک کوئی اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکتا۔ گویا رسول اللہ ﷺ کا معجزۂ قرآن تا قیامت اپنے اعجازی جلوے دکھا رہا ہے۔

(۵) آپ ﷺ پر سلسلہ نبوت و رسالت کو ختم کر دیا گیا۔ اللہ نے فرمایا: وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب، ۴۰) یہ بھی آپ کی عظیم فضیلت ہے کیونکہ پہلے انبیاء کرام کی شرائع کو بعد والے انبیاء کی شرائع سے بدل دیا جاتا تھا۔ مگر جب خاتم النبیین ﷺ تشریف لائے تو تکمیل دین کا اعلان کر دیا گیا: اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ۔ (مائدہ، ۳)

(۶) سب انبیاء سے عالم ارواح میں آپ ﷺ کی مدد اور آپ پر ایمان لانے کا وعدہ لیا گیا۔ اللہ نے فرمایا: لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (آل عمران: ۸۱) ایسے لگتا ہے کہ اس جہان رنگ و بو میں ہمارے کریم آقا ﷺ ہی وہ رسول ہیں جن کی بعثت اصل منشائے ربانی تھا، دیگر انبیاء کرام آپ کے مددگار ہیں۔

(۷) روز حشر آپ ﷺ سب رسولوں کے گواہ بن کر آئیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہوا: وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ شَهِیْدًا ۞ (نساء ۴۱) ''اور آپ کی گواہی سے ان کی مشکل آسان ہو جائے گی۔''

(۸) آپ کو اللہ نے کوثر عطا فرمایا ہے اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ (کوثر، ۱) یعنی دنیا وآخرت کی ہر نعمت کی کثرت عطا فرمائی ہے۔

(۹) اللہ اور اسکے فرشتے آپ ﷺ پر درود بھیجتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ط (احزاب، ۵۶) یہ اعزاز کسی اور نبی کو عطا نہ فرمایا گیا۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو سب سے افضل امت قرار دیا: ارشاد ہوا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران، ۱۱۰) جب امت ساری امتوں سے افضل ہے تو بلاشبہ امت کا نبی سب انبیاء سے افضل ہے۔ یہ وہ فضائل ہیں کہ ان میں سے ہر فضیلت پر علم وتحقیق کا دریا بہایا جاسکتا ہے۔

(۱۱) اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس کے نام سے پکارا اور آپ کو اللہ نے آپ کے القاب اور صفات کے ساتھ پکارا کبھی یا ایھا الرسول فرمایا، کبھی یا ایھا النبی فرمایا اور کبھی یا ایھا المزمل فرمایا وغیرہ۔

(۱۲) اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کی بارگاہ کے آداب سکھاتا ہے۔ کبھی فرماتا ہے: لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا (بقرہ، ۱۰۴) کبھی فرماتا ہے لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (حجرات، ۲) ایسا اہتمام کسی اور نبی کے لیے نہ فرمایا گیا۔

(۱۳) آپ ﷺ کی امت کو تکمیل دین کی نعمت عطا فرمائی گئی جو اس سے قبل کسی امت کو عطا نہ فرمائی گئی۔ ارشاد ہوا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (مائدہ، ۳)

(۱۴) پہلے انبیاء میں سے جس پر کوئی اعتراض اٹھایا گیا اس کا جواب اس نبی نے خود دیا۔ کفار نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا: تم کھلی گمراہی میں ہو، انہوں نے جواب دیا: مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے (اعراف، ۶۱) حضرت ھود علیہ السلام سے کفار نے کہا: ہم تجھے پاگل دیکھتے ہیں (معاذ اللہ) انہوں نے جواب دیا مجھ میں کوئی پاگل پن نہیں ہے (اعراف، ۶۷) مگر سید المرسلین ﷺ کی شان یہ ہے کہ جب بھی کفار نے آپ پہ کوئی اعتراض کیا تو آپ کی طرف سے آپ کے رب نے جواب دیا۔ ابولہب نے کہا اے محمد تیرا ہاتھ ٹوٹے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹیں۔'' (لہب، ۱) کفار نے کہا: محمد ﷺ ابتر ہے یعنی اس کی نسل کٹ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو جواب دیا: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾ ''بیشک آپ کا دشمن ہی ابتر ہے۔'' (الکوثر، ۳) ولید بن مغیرہ نے آپ کو مجنون کہا (معاذ اللہ) اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا: مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾ یعنی آپ کب مجنون ہیں آپ پر تو اللہ کا بڑا انعام ہے پھر اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ کی دس برائیاں گنوادیں اور اس کا حرام زادہ ہونا بھی ظاہر کر دیا۔

(۱۵) روز قیامت اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾ ''عنقریب آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر مبعوث فرمائے گا۔'' (اسراء، ۷۹)

یہ تو ہمارے آقا کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی افضلیت کے چند دلائل قرآن مجید سے ہیں جبکہ حدیث مبارک میں آپ کی افضلیت پہ سینکڑوں دلائل ہیں۔اس لیے آپ ہی ورفع بعضھم درجات کے سب سے اعلیٰ مصداق ہیں۔

افضلیت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں مفسر کی لکھی ہوئی ایک فارسی نعت

انبیاء در ابتداء اند و توئی در انتہاء — انبیاء مثل زمیں اند و توئی مثل سماء

انبیاء و مرسلیں خبر مقدم آمدند — اے شہ شاہاں توئی آں را مؤخر مبتدا

حق تعالیٰ مر ترا آں رتبہً بخشیدہ است — میکند آدم دعا بوسیلۂ نامِ شما

ابرا ہیم و اسماعیل ہم آرزوئے تو کنند — پیغمبراں بہر شما دارند از حق التجاء

ختم شد برروئے تو ہر دلکشی و دلبری — روئے تو اے جان جاں درحسن دارد انتہاء

انبیاء در مسجد اقصیٰ ہمہ حاضر شدند — مقتدی بودند و تو بودی ہمہ را مقتدیٰ

طیبؔ ہمہ پیغمبراں اوصاف حق را دیدہ اند — آقائے من تو یافتی جلوۂ ذاتِ کبریا

[310] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردے زندہ کرنے،اندھوں کو بینا کرنے،کوڑھیوں کو شفا دینے اور مٹی کے پرندے بنا کر اپنی پھونک سے انہیں زندہ کردینے کی نشانیاں عطا فرمائی گئیں۔پھر روح القدس یعنی جبرائیل امین علیہ السلام کے ذریعے آپ کی مدد کی گئی۔آپ حضرت جبرائیل کی پھونک سے پیدا ہوئے۔پھر جبرائیل علیہ السلام ہمیشہ آپ کو یہود کے حملوں سے بچاتے رہے اور آخر انہیں اٹھا کر آسمان پر لے گئے اور قرب قیامت میں واپس لائیں گے۔

معجزاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا منکر کافر ہے:

وَاٰتَيۡنَا عِيۡسَى ابۡنَ مَرۡيَمَ الۡبَيِّنٰتِ اور اس کی تفسیر میں وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡىِ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ (آل عمران،۴۹) سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ظاہر ہیں مگر مرزا قادیانی نے ان سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا: حق یہ ہے آپ سے کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا۔ممکن ہے آپ نے معمولی تدبیر سے کسی شب کور کو اچھا کیا ہو مگر آپ کی بدقسمتی سے اسی زمانہ میں ایک تالاب بھی تھا جس سے بڑے بڑے نشانات ظاہر ہوتے تھے۔ممکن ہے آپ بھی اسی تالاب کی مٹی استعمال کرتے ہوں گے (ضمیمہ انجام آتھم روحانی خزائن جلد ۱۱ صفحہ ۲۹۰ مطبوعہ لندن) تو قرآن کی نصوص صریحہ کے اس دیدہ دلیرانہ انکار نے مرزا قادیانی کو دائرہ اسلام سے خارج کردیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو مومن کیوں نہ بنا دیا

[311] اب ایک سوال کا جواب دیا جارہا ہے کہ جولوگ اہلِ ایمان سے لڑائیاں کرتے ہیں جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ ان پر واضح دلائل کے ساتھ حق واضح کردیا گیا ہے ایسے لوگوں کو اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو مسلمان کرسکتا ہے،تو اللہ انہیں

توفیق اسلام کیوں نہیں دے دیتا؟ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاں اگر اللہ چاہتا تو اہل ایمان سے کوئی قوم جنگ نہ کرتی یعنی اگر اللہ چاہتا تو سب لوگ ایمان لے آتے مگر اللہ تعالیٰ نے نہ چاہا کہ سب لوگوں کو زبردستی مسلمان کر دے۔ اس لیے اس نے سب کو اختیار دے دیا کہ جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر کرے۔ لٰہذا کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا۔

یاد رہے کہ اگر اللہ رب العزت انسانوں کا یہ اختیار ختم کر دے کہ وہ کفر اور ایمان میں سے جسے چاہیں اختیار کریں اور سب انسانوں کو جبراً مومن اور صالح بنا دے تو اس سے یہ مفاسد لازم آئیں گے۔

اول: تخلیق انسانی کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ کیونکہ جبری اور جبلی عبادت تو فرشتے کر رہی رہے تھے، انسان تو اسی لیے پیدا کیا گیا تا کہ اسے ایمان وکفر اور نیکی و بدی میں سے ہر چیز کا اختیار دیا جائے پھر دیکھا جائے کہ وہ رحمان کی بات مانتا ہے یا شیطان کی۔

دوم۔ پھر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ کچھ اپنی خوشی سے ایمان لا کر اس کی رحمت کے حقدار ہوں، یوں اس کی یہ صفات الرحمان، الرحیم، الوھاب، الشکور، الحنان، المنان، البر، العدل و دیگر کا ظہور ہو اور کچھ اپنی مرضی سے ایمان نہ لائیں اور جہنم کے حقدار ٹھہریں یوں اس کی یہ صفات الجبار، القھار، المنتقم، المذل، الخافض وغیرہ کا ظہور ہو، اگر سب انسانوں کو جبراً مومن صالح بنا دیا جائے تو ان صفات الٰہیہ کا ظہور نہ ہو سکے اور دنیا کا بنانا ہی اسماء وصفات خداوندی کے لیے ہے۔

سوم۔ پھر دیکھو کہ اگر کانٹے نہ ہوں تو پھولوں کی نفاست کا احساس کیسے ہو۔ بدبو نہ ہو تو خوشبو کی عمدگی کیسے معلوم ہو۔ اندھیرا نہ ہو تو اجالے کی عظمت کیسے ظاہر ہو۔ اسی طرح اگر کفر نہ ہو تو ایمان کی عظمت کیسے معلوم ہو اور گناہ نہ ہو تو نیکی کا نیکی ہونا کیسے واضح ہو۔ تاہم اللہ تعالیٰ کسی کو زبردستی کفر یا گناہ میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ اللہ نے سب پہ ایمان اور عمل صالح کی تفصیل واضح کر دی ہے۔ اب جو بھی کفر یا گناہ میں پڑتا ہے اپنی مرضی سے پڑتا ہے۔ الغرض ان اسباب سے اللہ تعالیٰ نے سب کو ایمان وتقویٰ نہ دیا۔

چہارم۔ اگر سب انسانوں کو بالجبر مسلمان بنا دیا جائے تو بعثت انبیاء ونزول کتب کی ضرورت ہی نہ ہوتی یعنی جب کوئی کافر ہی نہ ہوتا تو دعوت اسلام کسے دی جاتی۔ جب بدی کی کوئی قوت ہی زمانے میں نہ ہوتی تو طاغوتی طاقتوں سے ٹکر لے کر قرب الٰہی کا مستحق کون بنتا اور دین کے لیے صبر و استقامت کی مثالیں کیسے قائم ہوتیں اور مجاھدین کو اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے درجۂ شہادت کیسے حاصل ہوتا، تو ضروری تھا کہ نیکی و بدی کی جنگ جاری رکھی جائے۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ

اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں دیا اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرو اس سے قبل کہ وہ دن آجائے

لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۲۵۴

جس میں نہ کوئی بیوپار ہے نہ دوستی نہ سفارش [312] اور کافر لوگ ہی ظلم کرنے والے ہیں۔

قیامت سے پہلے اس کی تیاری کا حکم

[312] جب بتایا گیا کہ دعوت انبیاء کرام علیہم السلام کے جواب میں بعض لوگ ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا تو اب ایمان والوں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ نیکیاں کما لیں کہ ان کی نیکیاں انہیں قیامت میں کام آئیں گی جبکہ کفار کی نیکیاں برباد ہیں تو فرمایا کہ اے مومنو اللہ کی راہ میں خرچ کرلو اس سے قبل کہ وہ دن آجائے جب کوئی خرید وفروخت نہ چلے گی کیونکہ قیامت میں ہر کوئی خالی ہاتھ اٹھے گا۔ وہاں دنیا کی کوئی دوستی کام نہ آئے گی۔ قرآن مجید میں ہے:
اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۶۷ یعنی ''قیامت والے دن گہرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوا پرہیز گاروں کے۔'' (زخرف، ۶۷) یعنی پرہیز گار لوگ وہاں بھی دوستی نبھائیں گے۔ معنی یہ ہے کہ دینی دوستیاں جو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہوں وہاں کام آئیں گی۔ آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہ وہاں سفارش چلے گی یعنی اللہ کے حکم کے بغیر سفارش نہ چلے گی کیونکہ ابھی آگے آیت الکرسی میں آرہا ہے: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ ''کون ہے جو اس کے حکم کے بغیر سفارش کرے۔'' (بقرہ، ۲۵۵)

اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہر نعمت خرچ کرنی چاہیے:

اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ سے معلوم ہوا جو نعمت بھی اللہ نے ہمیں دی ہے ہمیں اس میں سے کچھ حصہ اس کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے۔ خواہ وہ مال ہے، علم ہے، جسمانی صحت ہے یا اولاد ہے۔ غریبوں کو مال دو، جاہلوں کو علم سکھاؤ، بدن کے ساتھ عبادت اور جہاد کرو، اولاد میں سے کسی کو راہِ خدا کے لیے وقف کرو یعنی عالم دین بناؤ یا دین کے کاموں میں لگاؤ۔ یہ بھی معلوم ہوا ہوا کہ انفاق فی سبیل اللہ آخرت سنوارنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ آخرت سنوارنے کیلئے یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا۔ کیونکہ باقی عبادات میں اپنا فائدہ مقصود ہوتا ہے اور انفاق فی سبیل اللہ میں دوسروں کا فائدہ پیش نظر ہوتا ہے اور اللہ رب العزت کو یہ زیادہ پسند ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ دائمی زندہ ہے [313] ہر چیز کا قائم رکھنے والا ہے اُسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، [314]

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اس کے ہاں اس کے اذن کے بغیر (کسی کی)

بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ

سفارش کرے؟ [315] وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے [316] اور وہ اس کے علم میں سے

مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ

کوئی چیز نہیں گھیرتے مگر جو وہ چاہے [317] اس کی حکومت نے آسمانوں اور زمین کو گھیر رکھا ہے [318] اور اسے ان کی

حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

حفاظت نہیں تھکاتی اور وہ بلند عظمت والا ہے [319]

آیت الکرسی کی تفسیر اور فضیلت

[313] یہ آیت الکرسی ہے۔ حضرت محمد بن حنفیہ سے مروی ہے۔ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی تو دنیا کا ہر بت منہ کے بل گر پڑا۔ ہر بادشاہ اوندھے منہ گر گیا۔ ان کے سروں سے تاج گر گئے۔ شیاطین گرتے پڑتے بھاگتے ابلیس کے پاس آئے اور اسے خبر دی۔ اس نے حکم دیا کہ اس انقلاب کی وجہ تلاش کرو، شیاطین مدینہ منورہ پہنچے تو معلوم ہوا آج رات آیت الکرسی نازل ہوئی ہے۔ (تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۲۶۸)

حضرت ایفع بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن میں سب سے افضل آیت کونسی ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قرآن کی سب سے افضل آیت آیت الکرسی ہے۔

(دارمی کتاب فضائل القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۲۷)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آیت الکرسی اور سورہ بقرہ کی آخری آیات مجھے عرش کے خزانوں میں سے ملی ہیں۔'' (درمنثور بروایت ابن مردویہ جلد ۲ صفحہ ۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ہر چیز کی ایک کوھان ہوتی ہے (یعنی سب سے بلند جگہ) اور قرآن کی کوھان سورۃ البقرہ ہے، کیونکہ اس میں وہ آیت ہے جو پورے قرآن کی سردار ہے، یعنی آیت الکرسی۔'' (ترمذی کتاب فضائل القرآن، باب فضائل سورۃ البقرۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا کیا تم نے شادی کی ہے؟ اس نے کہا میرے پاس مال نہیں، آپ نے فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے ہو؟ کہنے لگا، ہاں، فرمایا یہ چوتھائی قرآن ہے، پھر فرمایا: کیا تم سُوْرَةَ کَافِرُوْنَ جانتے ہو؟ کہنے لگا ہاں، فرمایا: یہ بھی چوتھائی قرآن ہے، پھر فرمایا کیا اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ بھی تمہیں آتی ہے؟ اس نے کہا ہاں، فرمایا: یہ بھی چوتھائی قرآن ہے، پھر فرمایا: کیا تمہیں اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ آتی ہے، اس نے کہا ہاں، فرمایا یہ بھی چوتھائی قرآن ہے (گویا ان چار سورتوں کے پڑھنے میں پورے قرآن کا ثواب ہے) پھر فرمایا کیا تم آیت الکرسی جانتے ہو؟ اس نے کہا جی ہاں فرمایا: پھر جاؤ شادی کرو (اس کی برکت سے مال بھی آجائے گا۔) (مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۲۱)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ فرمایا: ''جس نے فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی وہ دوسری نماز تک اللہ کی حفاظت میں رہے گا۔'' (سنن بیہقی)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما وعائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس بھی سالن یا طعام پر آیت الکرسی پڑھی جائے اس میں برکت ہو جاتی ہے۔'' (ابن نجار)

محمد بن ضوء سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص ہر نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے اس کے اور جنت کے درمیان صرف اس کی موت کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔'' (سنن بیہقی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے صدقہ فطر کے مال (کھجوریں گندم وغیرہ) کی حفاظت پر مامور فرمایا تھا، ایک شخص آیا اور طعام میں سے کچھ نکالنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کہا میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لیکر جاؤں گا۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دیں میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور میں بہت محتاج ہوں، میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوا، آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا: مَا فَعَلَ اَسِیْرُكَ الْبَارِحَةَ اے ابوہریرہ آج رات تمہارے قیدی کا کیا بنا؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نے اپنی عیالداری اور محتاجی کا ذکر کیا تو میں نے رحم کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا اس نے تم سے جھوٹ کہا ہے، وہ ضرور دوبارہ آئے گا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور دوبارہ آئے گا تو اگلی رات میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آ گیا اور مال میں سے کچھ نکالنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا میں تجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ضرور لے کر جاؤں گا۔ اس نے پھر اپنی عیالداری اور محتاجی کا تذکرہ کیا تو مجھے رحم آ گیا، میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا: تمہارے قیدی کا کیا بنا؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نے اپنی حاجتمندی اور بال

بچوں کا رونا رویا تو میں نے اسے آزاد کر دیا۔ آپ نے فرمایا: اس نے تم سے جھوٹ کہا ہے، وہ ضرور لوٹ کر آئے گا۔ تو میں تیسری رات اس کا انتظار کرنے لگا تو وہ آ گیا اور طعام میں سے کچھ نکالنے لگا، میں نے اسے پکڑ لیا اور کہا آج میں تجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس ضرور لے جاؤں گا، یہ تیسری بار ہے تو کہہ دیتا ہے کہ میں نہیں آؤں گا پھر تو آ جاتا ہے۔ وہ کہنے لگا، مجھے چھوڑ دو میں تجھے ایسے کلمات سکھاتا ہوں جن سے اللہ تجھے نفع دیگا۔ میں نے کہا وہ کیا کلمات ہیں؟ کہنے لگا: جب تم اپنے بستر پہ سونے جاؤ تو آیۃ الکرسی پڑھ لو جو یہ ہے اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ الخ تو اللہ کی طرف سے ایک محافظ (فرشتہ) تم پر مقرر ہو جائے گا اور صبح تک کوئی شیطان تمہارے قریب نہ آ سکے گا۔ (ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا کوئی جن یا چور تمہارے قریب نہ آ سکے گا) نبی اکرم ﷺ نے سن کر فرمایا:

قَدْ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوْبٌ، اس نے تم سے سچ کہا ہے اگرچہ وہ بہت جھوٹا ہے (یعنی وہ شیطان تھا)

(بخاری کتاب الوکالۃ باب ۱۰، ترمذی کتاب ثواب القرآن باب ۳، ابن ماجہ کتاب الصدقات باب ۱۸)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آیت الکرسی آیت حفاظت ہے۔ جہاں یہ پڑھی جائے وہاں اللہ کی طرف سے حفاظت کے پہرے لگا دیے جاتے ہیں۔

الحی القیوم کا اسم اعظم ہونا:

یاد رہے! آیت الکرسی کے آغاز میں اللہ کی دو صفات اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ بیان ہوئیں۔ الحی کا معنی ہے وہ ذات جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی، اس کے سوا جو بھی زندہ ہے وہ اسی کی دی ہوئی زندگی سے زندہ ہے۔ تو حقیقت میں وہی زندہ ہے اس کے سوا ہر چیز اسی کی مرضی سے زندہ ہے۔ اور القیوم کا معنی ہے وہ ذات جو ساری کائنات کا نظام قائم کرنے والی ہے۔

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ اللہ کے اسماء حسنیٰ میں سے دو عظیم اسماء ہیں۔ حدیث مبارکہ میں انکی عظیم فضیلت وارد ہے، حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اسم اعظم کی برکت سے ہر دعا قبول ہوتی ہے اور وہ ان سورتوں میں ہے بقرہ، آل عمران اور طٰہٰ۔ حضرت ابو امامہ فرماتے ہیں میں نے غور کیا تو دیکھا کہ بقرہ میں ہے: اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ آل عمران میں ہے: الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ اور طٰہٰ میں ہے: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ ؕ (طٰہٰ ۱۱۱) تو میں نے جان لیا کہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ ہی اسم اعظم ہے۔ (طبرانی و بیہقی)

مروی ہے کہ آصف بن برخیا نے اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ کی برکت سے تخت بلقیس ایک آن میں یمن سے عراق پہنچایا تھا۔ حضور ﷺ صحابہ کو اکثر یہ دعا تعلیم فرماتے تھے: یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ، اے زندہ اور قائم رکھنے والے میں تیری رحمت کی مدد چاہتا ہوں۔

[314] جب اللہ تعالیٰ زندۂ جاوید اور تمام کائنات ارضی و سماوی کا قیوم (منتظم) ہے تو اسے اونگھ یا نیند کا آنا محال ہے۔

مروی ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کیا اللہ کو نیند آتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ! آپ دو شیشے ہاتھ میں پکڑ کر ساری رات کھڑے رہیں۔ آپ کھڑے رہے جب رات کا آخری پہر ہوا تو آپ پر نیند غالب آ گئی اور شیشے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! اگر میں سوتا ہوتا تو یہ زمین و آسمان ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ (درمنثور جلد دوم صفحہ ۱۵)

پھر اللہ کو نیند کیسے آئے۔ نیند یا اونگھ جسم کے عوارض ہیں۔ اللہ جسم سے پاک ہے۔ پھر نیند تھکاوٹ کی وجہ سے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو کوئی تھکاوٹ نہیں جو اسے نیند لائے۔ اسی لیے آیۃ الکرسی کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَا یَئُوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا ۚ کہ زمین و آسمان کی حفاظت اللہ پہ کوئی تھکاوٹ طاری نہیں کرتی۔

معلوم ہوا کہ اللہ رب العزت جسم و جسمانیات سے پاک ہے۔ اس لیے جہاں فرمایا گیا: اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی کہ رحمان نے عرش پہ استواء فرمایا تو وہ متشابہات میں سے ہے، اس کے منزل من اللہ ہونے پہ ایمان ضروری ہے۔ اسی کے بارے میں امام مالک فرماتے ہیں: استواء معلوم ہے، اس کی کیفیت مجہول ہے۔ اس پہ ایمان لازم ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔ (الاسماء والصفات للبیہقی)

[315] یہ مشرکین کا رد ہے وہ اپنے بتوں کو اللہ کے ہاں اپنا سفارشی سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے۔ ہٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ کہ اللہ کے ہاں یہ ہمارے سفارشی ہیں (یونس، ۱۸) اور ان کا گمان تھا کہ ان کے جھوٹے خدا اللہ کے ہاں ان کے زبردستی کے سفارشی ہیں یعنی اللہ کو ان کی بات ماننا پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی کسی کی شفاعت نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بت شفاعت کرنے کے اہل ہی نہیں وہ بے جان پتھر ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کوئی اذن نہیں دیا، انہیں شفیع ماننا اللہ تعالیٰ پہ بہتان باندھنا ہے اور چوتھی یہ کہ مشرکین شفاعت پانے کے حقدار نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی مقرب انسان یا فرشتے کو اذن نہ دے گا کہ وہ کسی مشرک کی شفاعت کرے کیونکہ مشرکوں کے لیے بخشش ہی نہیں ہے۔ اللہ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ ''اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کریگا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔'' (النساء ۱۱۶)

شرک کا حقیقی تصور

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ میں مشرکین کے جس عقیدہ کا رد کیا گیا ہے وہی شرک کا حقیقی مفہوم ہے جس کے رد میں قرآن کا بڑا حصہ نازل ہوا ہے یعنی مشرکین عرب سمجھتے تھے کہ ان کے جھوٹے معبود ان کو اللہ سے زبردستی چھڑا سکتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نظام قدرت انہی کے ذریعہ سے چل رہا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اکیلا سارے نظام کائنات کو نہیں چلا سکتا، لہٰذا بہت سے خدا ہونے چاہئیں۔ اسی لیے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دعوت توحید دی تو وہ کہنے لگے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ ''کیا اس نے تمام خداؤں کی جگہ ایک خدا بنالیا ہے ؟ یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے۔'' (سورہ ص، ۵)

دراصل انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھ لیا تھا اور ان کی خیالی مورتیاں بنا کر اپنے سامنے رکھ لی تھیں اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ اسی لیے فرمایا گیا

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِکَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ ''کفار نے ملائکہ کو جو اللہ کے بندے ہیں عورتیں سمجھ لیا۔'' (زخرف، ۱۹)

یعنی وہ سمجھتے تھے کہ ان کے جھوٹے خدا اللہ کی اولاد ہیں اور اللہ کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ تو چونکہ اللہ اپنے نظام کائنات کے چلانے میں ان کا محتاج ہے اس لیے اس کو ان کی شفاعت ماننا پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقیدہ کا سارے قرآن میں رد فرمایا۔ یہاں بھی فرمایا گیا کہ اللہ کے ہاں جو بھی شفاعت کرے گا اللہ کی اجازت سے کرے گا، یعنی اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر کوئی نبی، پیغمبر یا فرشتہ لب کشائی نہیں کرسکتا۔ اسی لیے فرمایا گیا: لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ''اللہ کے ہاں وہ کلام نہیں کر سکتے، سوا اس کے جسے خدائے رحمان اجازت دے۔'' (سورہ نبا، ۳۸)

یاد رہے! اللہ تعالیٰ روز قیامت حضور ﷺ کو سب سے پہلے اذن شفاعت دے گا پھر آپ کے صدقے تمام انبیاء وصدیقین اور شہداء و صالحین شفاعت کریں گے۔ گویا حضور ﷺ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ کا مصداق اول و اعظم ہیں۔

[316] یعنی اللہ تعالیٰ مخلوق کے امور دنیا سے بھی واقف ہے اور امور آخرت سے بھی۔ یا یہ معنی ہے کہ جو کام وہ کر چکے وہ بھی جانتا ہے جو آگے کریں گے وہ بھی جانتا ہے۔ اور یا یہ معنی ہے کہ وہ ان کے قبل تخلیق اور بعد الموت سب احوال کا جاننے والا ہے۔

[317] اللہ تعالیٰ ہی سرچشمہ علم ہے جس کو جو علم ملتا ہے وہ اللہ ہی کے علم کا حصہ ہے اور جتنا علم وہ چاہتا ہے کسی کو اتنا دے دیتا ہے کیونکہ وہی ہر چیز کا بنانے والا ہے، لہٰذا وہی اس کے اصل اور احوال سے بھی واقف ہے اور لوگ کسی چیز کے بارے میں اسی قدر جانتے ہیں جس قدر وہ چاہے۔

[318] امام قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کرسی سے مراد اللہ کی عظمت و جلالت ہے ورنہ حقیقت میں کوئی کرسی نہیں نہ اس پر کوئی بیٹھنے والا ہے۔ (مظہری جلد اول صفحہ ۳۵۹)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اللہ کی کرسی سے مراد اس کا علم ہے۔ (قرطبی جلد سوم صفحہ ۲۷۶) یعنی اللہ کی عظمت یا اس کے علم نے زمین و آسمان کو گھیر رکھا ہے۔ بعض احادیث میں ہے کہ روز قیامت اللہ رب العزت اپنی کرسی پر نزول فرمائے گا۔ اس کا بھی یہی معنی کیا جاسکتا ہے کہ اللہ اس دن اپنی عظمت کا خصوصی اظہار فرمائے گا۔ اور ممکن ہے

آسمان، عرش، لوح اور قلم کی طرح کرسی بھی اللہ کی ایک خاص مخلوق ہو۔ جیسا کہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''ساتوں آسمان اور زمینیں اللہ کی کرسی کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے وسیع میدان میں ایک انگوٹھی۔''
(ابن مردویہ عن ابی ذر الغفاری)

[319] اللہ رب العزت اٹھارہ ہزار عالمین کی اربوں کھربوں مخلوقات کو ان کا رزق بہم پہنچاتا ہے ان کی فریادیں سنتا اور نظام کائنات کی تدبیر فرماتا ہے اور اسے کوئی تھکاوٹ نہیں۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے [320]

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ

تو جو شیطان سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے مضبوط رسی کو تھام لیا جو ٹوٹ نہیں سکتی

لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

اور اللہ سب سننے جاننے والا ہے۔ [321]

دین میں مجبوری نہ ہونے کا معنی اور نورِ ایمان وظلمت ہائے کفر کا بیان

[320] جب اس سے قبل بیان ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت پر کچھ لوگ ایمان لائے کچھ نے کفر کیا تو اب اسی نقطہ کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ دین میں کسی کو زبردستی داخل نہیں کیا جاسکتا۔ مروی ہے کہ انصار مدینہ کے قبیلہ بنو سالم کے ایک شخص کے دو بیٹے بعثت نبوی سے قبل عیسائی ہوگئے تھے۔ ایک بار وہ مدینہ میں اپنے عیسائی ساتھیوں کے ساتھ کچھ خرید وفروخت کرنے آئے۔ ان کے باپ نے جو اسلام لے آیا تھا انہیں دیکھ لیا اس نے دونوں کو ان سے چھین لیا اور کہا واللہ میں انہیں مسلمان بنائے بغیر نہ چھوڑوں گا مگر انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا۔ یہ جھگڑا نبی اکرم ﷺ کے پاس لایا گیا۔ وہ انصاری کہنے لگا کیا میرے جگر گوشے میرے سامنے آگ میں جلیں گے؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (درمنثور)

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ بعض انصاری عورتوں کے ہاں بچے نہ ہوتے تھے۔ وہ نذر مانتی تھیں کہ اگر ان کے ہاں بچہ ہوا تو وہ اسے اہل کتاب کے ساتھ کردیں گی۔ جب اسلام آگیا۔ تو انصار کے کئی بچے اہل کتاب کے ساتھ یہودیت پر چل رہے تھے۔ انصار نے کہا ہم اپنے بچوں کو مجبور کر کے اسلام پر لائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لَآ

اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ کہہ کر اس سے منع کیا۔ (درمنثور) یعنی فرمایا کہ جب ہدایت اور گمراہی الگ الگ ہو چکے اور حق واضح ہو گیا تو پھر جس کا جی چاہے ہدایت قبول کرے جس کا جی چاہے گمراہی قبول کرے، لہٰذا کسی کو زبردستی مسلمان نہ بنایا جائے۔

اگر اعتراض کیا جائے کہ ایک حدیث میں ہے کہ مجھے اس وقت تک لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ اللہ کی توحید اور میری رسالت نہیں مان لیتے (بخاری و مسلم) اس کا معنی تو یہ ہوا کہ جہاد کے ذریعہ لوگوں کو زبردستی اسلام میں لایا جائے تو پھر دین میں زبردستی کے نہ ہونے کا کیا معنیٰ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے حدیث کا مفہوم سمجھو، اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک ساری دنیا پر اسلام نہیں آ جاتا تب تک جہاد جاری رکھا جائے۔ کیونکہ کفار اسلام کے خلاف فتنہ انگیزی سے کبھی باز نہیں آئیں گے جیسا کہ ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں، تو جب تک کفر ہے جہاد بھی رہے گا یعنی جب بھی ضرورت پڑے گی جہاد کیا جائے گا۔

ہاں حدیث کے مطابق جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے پر ساری دنیا پر اسلام ہی اسلام ہو جائے گا تو پھر جہاد کی تلوار رکھ دی جائے گی۔ اس حدیث کا یہ معنی نہیں کہ لوگوں کو جہاد کے ذریعے زبردستی مسلمان بنایا جائے اور ان سے زبردستی توحید و رسالت کا اقرار کروایا جائے۔ اور جب اقدامی جہاد کیا جاتا ہے تو اس میں بھی کفار کو زبردستی مسلمان ہونے کا نہیں کہا جاتا بلکہ انہیں یہ اختیار (آپشن) بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہنا قبول کرلیں اور اپنے عقیدہ پر قائم رہیں، اگر وہ اس آپشن کو بھی ٹھکرا دیں تو پھر ان سے جہاد کیا جاتا ہے۔ الغرض جہاد کا مطلب زمین پہ خالق کے دین کی حاکمیت کا قیام ہے، اس کا مقصد کسی کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہے۔

بعض گمراہ لوگوں نے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ کا یہ معنی سمجھ لیا ہے کہ وہ جو جرم کریں انہیں پکڑا نہ جائے کیونکہ دین میں زبردستی نہیں، مگر یہ معنی غلط ہے۔ اس کا معنی یہی ہے کہ کسی کو دین میں زبردستی داخل نہ کیا جائے مگر جو شخص اپنی رغبت کے ساتھ دین میں آ گیا اب اسے دین کے مقرر کردہ حقوق و فرائض اور حدود کا پابند رہنا ہوگا اور جہاں وہ حدود سے تجاوز کرے گا وہاں اسلامی قانون حرکت میں آئے گا تا کہ امن و امان قائم رہے۔ اگر کوئی مسلمان غیر شرعی کاروبار کرتا ہے تو اسلامی حکومت اسے پکڑے گی۔ اسی طرح اگر کوئی عورت غیر شرعی لباس پہنے گی تو حاکم اسلامی اسے روکے گا۔ اگر کوئی شخص قتل، چوری، ڈاکہ، شراب نوشی اور زنا جیسے جرائم کرے گا تو اس پہ شرعی حدود و قصاص کا اجراء ہوگا اور اسے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ کا بہانہ نہیں بنانے دیا جائے گا اور کوئی معاشرہ بھی حدود و قیود اور اخلاقی و قانونی پابندیوں کے بغیر نہیں چل سکتا۔

[321] یعنی جب کسی کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں تو جو شخص اپنی رغبت سے اسلام لے آئے اس نے مضبوط رسی کو تھام لیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مضبوط رسی سے مراد قرآن ہے۔ حضرت مجاہد کے نزدیک اس سے مراد اسلام ہے۔ یعنی یہ ایسی مضبوط رسی ہے کہ جس نے یہ پکڑلی وہ نجات پا گیا۔ اگر وہ شامت اعمال سے دوزخ میں چلا گیا تو ایمان کی رسی ایک نہ ایک دن اسے وہاں سے ضرور کھینچ لے گی اور جنت میں پہنچا دے گی۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۬ؕ وَالَّذِیْنَ

اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور جو کافر ہیں

كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ

ان کے مددگار شیاطین ہیں جو انہیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں [322]

اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۟۠

وہ دوزخ والے ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

[322] اس کا ایک معنی یہ ہے کہ جن کے نصیب میں ایمان ہے وہ خواہ کفر وشرک کی گہری تاریکیوں میں ڈوبے ہوں، اللہ تعالیٰ انہیں نور اسلام کی طرف لے ہی آتا ہے لہٰذا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کی ضرورت نہیں بس دعوت دینا ہمارا کام ہے آگے اللہ ہی کسی کو تاریکی کفر سے نکال کر نور ایمان کی طرف لانے والا ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ اللہ مومنوں کو فسق وفجور سے نکال کر نور ایمان اور روشنی تقوی کی طرف لاتا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ الخ کہ شیاطین کفار کے مددگار ہیں وہ انہیں نور ایمان سے نکال کر تاریکی ہائے کفر کی طرف لے جاتے ہیں۔ چنانچہ کئی لوگ ایمان لانے اور کچھ عرصہ مسلمانوں میں رہنے کے بعد کفر کی طرف لڑھک جاتے ہیں۔ اسی طرح شیاطین کئی لوگوں کو گمراہ کر کے انہیں گمراہ فرقوں کے جال میں پھنسا دیتے اور ان سے نور ایمان سلب کر لیتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے دیکھتے کئی لوگ قادیانی، منکر حدیث اور تحریف قرآن کے قائل ہو گئے۔ کیونکہ اللہ کا دستِ توفیق ان سے ہٹ گیا۔

اس کا یہ معنی بھی ہے کہ کفار کے سامنے جب نور ایمان واضح ہو جاتا ہے تو شیاطین انہیں اس کو قبول نہیں کرنے دیتے بلکہ انہیں کھینچ کر کفر کی تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں، وہ شیاطین جنات میں سے بھی ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ۝۵ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۠۝۶ (الناس:٦)

ظلمتیں کئی ہیں نور صرف ایک ہے

اس آیت میں نور کو صیغۂ واحد سے بار بار تعبیر کیا گیا اور ظلمت (تاریکی) کو صیغۂ جمع سے۔ کیونکہ ہدایت کا راستہ صرف ایک ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہر بات کو جان ودل سے ماننا۔ اسی کو قرآن میں صراط مستقیم کہا گیا ہے اور گمراہیوں کے راستے بے شمار ہیں۔

وقف لازم

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ ۘ اِذۡ قَالَ

کیا آپ نے اس شخص کی طرف نہ دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے ان کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا اس لئے کہ اللہ نے اسے حکومت دی تھی [323]

اِبۡرٰہٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَ یُمِیۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ

جب (اسے) ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے، اس نے کہا: میں (بھی) زندہ کرتا اور مارتا ہوں [324]

قَالَ اِبۡرٰہٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ

ابراہیم علیہ السلام نے کہا: بے شک اللہ سورج کو مشرق سے (روزانہ) لاتا ہے تو تم اسے

الۡمَغۡرِبِ فَبُہِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۵۸﴾ۚ

مغرب سے لے آؤ تو کافر مبہوت ہو گیا اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ [325]

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے مابین مناظرہ

[323] جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے بت توڑ ڈالے (یہ واقعہ سورہ انبیاء رکوع ۵ میں مذکور ہے) تو آپ کو پکڑ کر نمرود بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا وہ دعویٰ خدائی رکھتا اور لوگوں سے خود کو سجدے کرواتا تھا حالانکہ اسے اللہ نے بادشاہی دی تھی۔ اس لیے فرمایا گیا آتاہ اللہُ الْمُلْکَ۔ مگر اس نے شکر بجالانے کی بجائے تکبر میں آ کر کفر کیا اور خود دعویٰ خدائی کر ڈالا۔ آپ علیہ السلام جب اس کے دربار میں داخل ہوئے تو اسے سجدہ نہ کیا اس نے کہا تم نے مجھے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کر سکتا۔

معلوم ہوا کہ نعمت پا کر متکبر ہو جانا اللہ کے دشمنوں کا کام ہے، مومن کو جب اللہ کی طرف سے نعمت ملتی ہے تو اس کا سر اپنے رب کی بارگاہ میں عجز وانکسار کے ساتھ مزید جھک جاتا ہے، مگر یہ نعمت اللہ کے خاص بندوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔

[324] نمرود نے کہا اے ابراہیم تمہارا رب کون ہے؟ آپ نے فرمایا میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں سب کی موت وحیات ہے۔ یعنی جو بے جان نطفہ کو چلتا پھرتا، بولتا، سنتا انسان بنا دیتا ہے اور جب تک وہ نہ چاہے کسی کو موت نہیں آ سکتی۔ اور اگر وہ چاہے تو سو سالہ مردوں کو زندہ کر دے، جیسے اس نے حضرت عزیر علیہ السلام کو سو برس کے بعد زندہ کر دیا جیسا کہ اگلی آیت ۲۵۹ میں آ رہا ہے اور قیامت کے دن وہ سب انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔ نمرود نے کہا موت وحیات تو میرے قبضہ میں بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نمرود نے دو قیدی بلوائے ایک کو قتل اور دوسرے کو آزاد کر دیا اور کہا دیکھ لو میں بھی جسے چاہوں زندگی دوں جسے چاہوں ماروں، للہذا میں رب ہوں۔ (درمنثور جلد دوم صفحہ ۲۵)

اظہارِ حق کیلئے مناظرہ کرنا چاہیے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے ربوبیت باری تعالیٰ کے اثبات کیلئے مناظرہ کیا، تو یہ سنت انبیاء ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط ''کفار کے ساتھ بہتر طریقہ پر جھگڑا کرو۔'' (نحل: ۱۲۵) بہر حال مناظرہ کا مقصد احقاق حق ہونا چاہیے نہ کہ جدال برائے جدال اور مناظرہ دلائل سے ہونا چاہیے نہ کہ جنگ وجدال سے۔ مگر آج کل کے مناظرے مجادلے ہیں۔ دو جاہل پہلوان بھی جب باہم کشتی کرتے ہیں تو جو پہلوان گر پڑتا ہے وہ اپنی ہار مان لیتا ہے، مگر مناظروں میں پڑھے لکھے لوگ اپنی اپنی بات پہ ڈٹ جاتے ہیں اور باہم گالی گلوچ اور مار کٹائی کرنے لگتے ہیں۔ عموماً مناظرے دنگا فساد پہ جا کر ختم ہوتے ہیں، یہ افسوسناک مقام ہے۔

زندگی وموت اللہ کے قبضہ میں ہے:

رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وہ عظیم درس ہدایت ہے جو مجاہدین کو میدان جہاد میں ثابت قدم رکھتا بلکہ میدان جہاد میں اتارتا ہے اور یہی درس اہل حق کو جابر بادشاہوں کے سامنے جذبہ حق گوئی دیتا ہے۔ جب ایک بندۂ مومن کے دل میں یہ بات راسخ ہوجاتی ہے کہ اس کی زندگی وموت اللہ کے قبضہ میں ہے تو پھر وہ بڑی سے بڑی طاغوتی قوت سے بھی ٹکرا جاتا ہے۔

یہی جذبہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو عطا فرمایا اور انہوں نے وقت کے بڑے بڑے فرعونوں، نمرودوں اور شدّادوں کے سامنے کھڑے ہوکر بلاخوف وخطر اعلاء کلمۃ الحق کا فریضہ سرانجام دیا اور اسی جذبہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انبیاء کا ساتھ دینے پر تیار کیا۔ انہوں نے اپنے خاندان، اپنے معاشرہ اور اپنے دور کی سیاسی طاقتوں سے ٹکر لیکر انبیاء کرام علیہم السلام کا ساتھ دیا، اگر وہ زندگی وموت کو اللہ کے اختیار میں نہ جانتے تو کبھی دین کے لیے جان کی بازی لگانے پہ تیار نہ ہوتے۔ اسی طرح شہدائے کرام نے بھی اسی جذبہ کے ساتھ میدان جہاد میں قدم رکھا اور مومن کے دل میں جب یہ جذبہ راسخ ہوجاتا ہے، تو دنیا کی کوئی طاقت اسے راہ حق سے ہٹا نہیں سکتی۔

اور چونکہ زندگی وموت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اس لیے حکم ہوا کہ جس علاقہ میں طاعون پھیل جائے وہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے اور جو لوگ بھاگے تھے اللہ نے انہیں راستہ ہی میں مار دیا تھا۔ جیسا کہ دوسرے سپارہ کے آخر میں واقعہ گزر چکا ہے، یعنی سورہ بقرہ، آیت ۲۴۳۔ مگر یہ درس صبر کسی کسی کو ملتا ہے۔ عموماً لوگ گمراہ ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان میں ۱۹۰۵ میں طاعون پھیلا، مرزا قادیانی نے اس وقت کہہ دیا کہ جو میری جماعت میں آجائے گا طاعون سے محفوظ رہے گا۔ حالانکہ یہ محض جھوٹ اور فریب تھا کیونکہ خود قادیان میں مرزا کی جماعت میں طاعون پھیلا ہوا تھا، مگر اس وقت جہلاء کی ایک بڑی تعداد قادیانی جماعت میں چلی گئی اور مرزا قادیانی اپنی کمینگی ظاہر کرتے ہوئے لکھتا تھا، خدا کرے یہ طاعون

دس برس مزید رہے۔ (حقیقۃ الوحی مندرجہ روحانی خزائن جلد ۲۲ صفحہ ۵۷۰)

[325] حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب نمرود کی حماقت دیکھی کہ اس نے ایک قیدی کو آزاد کر کے سمجھا کہ اس نے اسے زندہ کیا ہے حالانکہ مزہ تو یہ تھا کہ جس کو اس نے قتل کیا تھا اسے زندہ کر کے دکھاتا، تو آپ نے اس احمق شخص سے تکرار بڑھانے کی بجائے اسے دوسری دلیل پیش کر دی کہ میرا رب تو روزانہ سورج کو مشرق سے نکال کر مغرب میں ڈبوتا ہے۔ اے نمرود اگر تم بھی ربوبیت کے دعویدار ہو تو آج سورج کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ یہ سن کر وہ مبہوت رہ گیا مگر ایمان نہ لایا اور جو شخص حق واضح ہو جانے کے باوجود باطل پر اڑ جائے ایسے ظالموں کے دلوں پر بطور سزا مہر لگا دی جاتی ہے اور انہیں کبھی ہدایت نہیں ملتی۔

نمرود مردود کا تعارف اور اس کا انجام:

مروی ہے کہ نمرود حام بن نوح کی اولاد میں سے تھا۔ اس کا پایہ تخت بابل (عراق) میں تھا۔ اس نے ساری روئے زمین پر جو اس وقت دریافت ہو چکی تھی، حکومت کی۔ اس نے چار سو برس حکومت کی اور طویل عمر پائی۔ اس وقت انسانوں کی عمریں آج کی نسبت بہت لمبی ہوتی تھیں۔ پھر جب اس نے دعویٰ خدائی کیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ اس نے آپ کی دعوت ٹھکرا دی بلکہ آپ کو آگ میں ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے گلزار بنا دیا۔ تب آپ ہجرت کر کے فلسطین چلے گئے اور اللہ تعالیٰ نے نمرود کے دماغ میں مچھر داخل کر دیا جو اس میں کئی برس رہا نمرود کے سر پر جوتا مارا جاتا تو مچھر حرکت بند کر دیتا۔ اور تھوڑی دیر بعد پھر پھڑ پھڑ کرنے لگتا جس سے نمرود کو اذیت ہوتی اور پھر جوتا مارا جاتا آخر ایک دن ایسا زور کا جوتا لگا کہ دماغ پھٹ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے نوکروں کے ہاتھوں جوتے مروا مروا کر ذلت کی موت مارا۔ (درمنثور جلد ۲ صفحہ ۲۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَاۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ

یا اس شخص کی طرح جو بستی پر سے گزرا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی۔

هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَاۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗؕ قَالَ كَمْ

اس نے کہا: اللہ اس بستی کو اس کی موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ [326] تو اللہ نے اسے سو برس کیلئے موت دیدی پھر اسے اٹھایا تو پوچھا

لَبِثْتَؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ

تم یہاں کتنا عرصہ رہے؟ اس نے کہا: میں یہاں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرا ہوں، اللہ نے فرمایا: نہیں بلکہ تم سو برس

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ

ٹھہرے ہو [327] تو تم اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ باسی نہیں ہوا اور اپنے گدھے کو دیکھو

وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا

اور ہم تمہیں لوگوں کے لئے نشانی بنا دیں گے اور تم ہڈیوں کو دیکھو ہم کیسے انہیں اٹھاتے پھر انہیں گوشت

لَحْمًاؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

پہناتے ہیں [328] پھر جب اس پر یہ واضح ہو گیا تو اس نے کہا: میں جان گیا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ [329]

حضرت عزیر علیہ السلام کو سو برس کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا

[326] گزشتہ آیت میں بیان ہوا کہ موت وحیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے: رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ تو اب اس کی مثال دی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ایک زندہ شخص کو سو برس تک مار دے پھر اسے زندہ کر کے طویل عرصہ تک دنیا میں رکھے پھر اسے موت دے۔ اس کی مثال حضرت عزیز علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

جب بادشاہ بخت نصر بابلی نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تمام بنی اسرائیل کو قیدی بنا کر فلسطین سے بابل بھیج دیا گیا۔ (یہ ۵٦۵ قبل مسیح کا واقعہ ہے) تو عزیر علیہ السلام بھی انہی قیدیوں میں تھے مگر وہ کسی طرح قید سے نکل کر اپنے وطن پہنچے تو شہر بیت المقدس کی بربادی دیکھ کر خون کے آنسوؤں سے رو دیئے، کیونکہ سارے شہر کی چھتیں گری ہوئی تھیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا۔ تب حضرت عزیر علیہ السلام نے بہت حسرت و دردمندی

کے ساتھ کہا اے اللہ تو اس شہر کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟ آپ گدھے پر سوار تھے۔ اسے چرنے کے لیے چھوڑ کر آپ ایک جگہ سو گئے۔ آپ کے پاس انجیر کے دانے بطور کھانا اور انگوروں کا نچوڑ بطور مشروب تھا، وہ آپ کے پاس پڑا رہا اور آپ پر سو برس کے لیے موت طاری کر دی گئی۔

حضرت ابن عباس، قتادہ، ضحاک اور عکرمہ و دیگر کے نزدیک جس شخص کا یہ واقعہ بتایا جا رہا ہے وہ حضرت عزیر علیہ السلام ہی ہیں (تفسیر قرطبی جلد ۳ صفحہ ۲۸۹) بلکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے بھی اس سے عزیر علیہ السلام ہی کو مراد لیا ہے۔
(حاکم، ابن منذر، ابن ابی حاتم وغیرہ)

[327] ان سو برسوں کے دوران آپ کا جسم ہر تغیر سے محفوظ رہا۔ لباس تک خراب نہ ہوا اور آپ کا جسم لوگوں کی نظر سے دور رہا۔ اس دوران جب آپ کو فوت ہوئے ستر برس گزر رے تو اللہ نے بخت نصر کو شاہان فارس میں سے ایک بادشاہ کے ہاتھ پر ہلاک کیا اور بنی اسرائیل آزاد ہو کر بابل (عراق) سے واپس فلسطین آ گئے اور بیت المقدس کو دوبارہ آباد کیا اور تیس برس تک اسے مزید پر رونق بناتے رہے۔ سو برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو پھر زندہ کر دیا۔

اللہ رب العزت کے ایک فرشتہ نے انہیں خواب اجل سے اٹھا کر ان سے پوچھا آپ یہاں کتنا عرصہ سوتے رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، کیونکہ جب آپ سوئے تھے تو صبح کا وقت تھا۔ جب اٹھے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ فرشتہ نے کہا نہیں آپ یہاں سو برس سوتے رہے ہیں۔

حضرت عزیر علیہ السلام کو وقت سے پہلے موت دیے جانے کا معنی:

حضرت عزیر علیہ السلام کا سو برس کے بعد زندہ ہونا اس معنی میں ہے کہ اللہ نے انہیں وقت سے قبل موت دیدی پھر سو برس کے بعد اٹھایا تا کہ ان کی عمر کا جو حصہ رہ گیا تھا اسے پورا کر لیں اور پھر ہمیشہ کے لیے فوت ہو جائیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طور پر جانے والے ستر بنی اسرائیل کے سرداروں کو ایک دفعہ مار کر پھر زندہ کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ''تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے، پھر اللہ نے تمہیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا۔'' (بقرہ، ۵۵،۵۶) اور حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے ہزاروں لوگ موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے گئے چنانچہ فرمایا گیا فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ط ''اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ، پھر اللہ نے ان کو دوبارہ زندہ کر دیا۔'' (بقرہ، ۲۴۳) تا کہ اپنی وہ زندگی پوری کریں جو ان سے بطور سزا چھین لی گئی تھی۔ حضرت عزیر علیہ السلام کو ایک بار وقت سے قبل اس لیے موت دی گئی تا کہ آپ کو لوگوں کے لیے نشانی بنایا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس طرح مردوں کو روز قیامت پھر اٹھائے گا۔

لیکن جو شخص اپنی طبعی زندگی پوری کر لیتا ہے اسے دوبارہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ط اور فرمایا گیا۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴿۹۵﴾ یعنی ''جس بستی کو ہم ہلاک کر دیں اس پہ حرام ہے کہ وہ واپس لوٹے، وہ کبھی واپس دنیا میں نہیں آئیں گے۔'' (سورہ انبیاء: ۹۵)

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴿۱۰۰﴾ ''اور ان (مرنے والوں) کے پیچھے برزخ ہے تا آنکہ جب وہ اٹھائے جائیں گے۔'' (سوہ مومنون، ۱۰۰)

ان آیات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ جو شخص اپنی طبعی زندگی گزار کر فوت ہوجاتا ہے وہ دوبارہ واپس دنیا میں نہیں آسکتا۔ اس میں اہل تشیع کے عقیدۂ رجعت کا رد بلیغ بھی ہے۔ ان آیات کی روشنی میں ہم اس پہ مفصل بحث کریں گے ان شاء اللہ العزیز۔

[328] اس جگہ وہابی لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام اس سو برس کی وفات کے دوران دنیا سے بے خبر تھے۔ جب ہی تو انہوں نے اٹھنے کے بعد کہا میں ایک دن یا اس کا کچھ حصہ یہاں ٹھہرا ہوں اگر انہیں اپنے احوال کی یا دنیا کے احوال کی خبر ہوتی تو یہ بات تو نہ کہتے، لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ مردے نہ تو سنتے ہیں اور نہ ہی انبیاء و اولیاء کے مزارات پہ جا کر ان سے کوئی دعا کروانی چاہیے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دنیا سے قصداً بے خبر رکھا تا کہ آپ کو اپنی قدرت کا جلوہ دکھائے کہ کیسے ان پہ سو سال گذر گئے اور ان کے بدن میں کچھ تغیر نہ آیا اور کیسے اللہ تعالیٰ نے اُجڑے ہوئے شہر بیت المقدس کو آباد کر دیا، ورنہ مرنے والے دنیا کے احوال سے بے خبر نہیں ہوتے کہ یہ کہا جائے کہ انبیاء و اولیاء کے مزارات پر حاضری دینا اور ان سے دعائے خیر کی التجا کرنا بیکار ہے۔

حیاتِ برزخی کا ثبوت

مرنے والے باخبر ہوتے ہیں۔ انبیاء و اولیاء کی تو شان ہی بہت بلند ہے، کفار بھی مرنے کے بعد دنیا سے بے خبر نہیں ہوتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے روز ابو جہل، عتبہ، شیبہ اور دیگر مقتولان بدر کی لاشوں پر کھڑے ہو کر ان سے کہا کیا تم نے اللہ کا وعدہ عذاب پالیا؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ سنتے ہیں؟ فرمایا:

مَا اَنْتُمْ بِاَسْمَعَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لَّا يُجِيْبُوْنَ، تمہارے ہی جتنا سنتے ہیں مگر جواب نہیں دے سکتے۔

(بخاری کتاب الجنائز باب ۸۶، مسلم کتاب الجنۃ حدیث ۷۶)

پھر قرآن پاک فرماتا ہے: مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ ''اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان رسولوں سے پوچھیے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا۔'' (زخرف ۴۵) اگر انبیاء کرام علیہم السلام کو دنیا سے یا اپنے احوال سے کچھ خبر ہی نہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھنے کا حکم کیوں فرما رہا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ اَحَدٍ یُّسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰہُ عَلٰی رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّہُ السَّلَامَ۔ جب بھی کوئی شخص مجھ پہ سلام بھیجتا ہے تو اللہ رب العزت میری توجہ اس کی طرف پھیرتا ہے، چنانچہ میں اس کو سلام کا جواب دیتا ہوں۔
(ابوداود باب زیارۃ القبور)

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّہْ ۚ یعنی حضرت عزیر علیہ السلام کے سو برس کے بعد اٹھنے کے بعد فرشتے نے ان سے کہا آپ اللہ کی ایک نشانی دیکھنا چاہتے تھے کہ شہر بیت المقدس کیسے دوبارہ آباد ہوگا، آپ اللہ کی کئی نشانیاں مزید ملاحظہ کریں۔

دیکھیں کہ آپ سو برس سوئے رہے آپ کے جسم میں کوئی تبدیلی نہ آئی، نہ ناخن بڑھے نہ بال لمبے ہوئے حالانکہ صرف ایک مہینہ حجامت نہ کی جائے تو انسان کی حالت بگڑ جاتی ہے۔ جبکہ یہاں ایک پوری صدی گزر چکی ہے، بلکہ آپ کے جسم سے لگنے والا لباس بھی خراب نہ ہوا۔ بلکہ یہاں تو یہ حال ہے کہ آپ کے پاس پڑا ہوا کھانا پانی بھی سو برس میں خراب نہ ہوا۔ انجیر کے دانوں کی نرمی اور انگوروں کے نچوڑ کا ذائقہ ابھی تک نہیں بدلا۔ حالانکہ پانی کا گلاس ایک دو دن میں بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے اور کوئی پھل چند دن سے زیادہ اپنی حالت پہ قائم نہیں رہ سکتا، ضرور وہ سوکھ سڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔ تو اس سے بڑا نشان قدرت کیا ہوسکتا ہے آپ پوچھتے ہیں کہ یہ بستی دوبارہ کیسے آباد ہوگی۔ جو رب یہ طاقتیں رکھتا ہے کہ سو برس تک کھانا نہ خراب ہونے دے وہ بستی کیوں نہیں بسا سکتا؟۔

پھر فرمایا اے عزیر (علیہ السلام) آپ اپنا گدھا دیکھیں کدھر ہے۔ آپ نے اسے دیکھا کہیں نہ ملا، ایک جگہ اس کی ہڈیاں ملیں آپ کو بتایا گیا یہ آپ کا گدھا ہے تب آپ کو مزید وثوق آیا کہ واقعی سو برس گزر گئے ہیں۔ کیونکہ ایک دن یا آدھے دن میں تو گدھے کی یہ حالت نہیں ہوسکتی۔ اللہ نے فرمایا اے عزیر (علیہ السلام) آپ دیکھتے رہیے ہم آپ کے سامنے گدھے کی ہڈیاں اٹھائیں گے اور ان پر گوشت چڑھا کر اسے زندہ کردیں گے۔ چنانچہ مروی ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے گدھا زندہ ہوگیا۔ (روح البیان جلد اول صفحہ ۴۱۴)

[329] جب حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے گدھے کو زندہ ہوتے دیکھا تو کہا مجھے علم الیقین ہوگیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مروی ہے کہ حضرت عزیر علیہ السلام جب زندہ ہو کر آئے تو بیت المقدس کو پہلے سے زیادہ آباد دیکھ کر حیران رہ گئے۔ آپ اندازے کے ساتھ اپنے محلے میں پہنچے تو کسی نے آپ کو نہ پہچانا البتہ ایک بہت بوڑھی عورت نے جو ایک سو بیس سال کی تھی آپ کو پہچانا اور آپ کے بیٹے سے آپ کا تعارف کروایا جس کی عمر ایک سو اٹھارہ برس تھی۔ اور آپ کے پوتے نوے برس کے ہو چکے تھے جبکہ آپ کی اپنی عمر اس وقت صرف چالیس برس تھی۔

جب عزیر علیہ السلام سو برس کے بعد زندہ ہو کر اپنے گھر آئے:

مروی ہے کہ جب آپ اپنے گھر پہنچے تو وہاں ایک اندھی بڑھیا بیٹھی تھی وہ آپ کی لونڈی تھی۔ آپ نے پوچھا کیا یہ

عزیر کا گھر ہے؟ وہ رو پڑی، کہنے لگی آج عرصۂ دراز کے بعد کسی نے عزیر کا نام کیسے لے لیا اسے تو گم ہوئے سو برس گزر گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا میں ہی عزیر ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے سو برس کے لیے موت دیدی تھی۔ وہ کہنے لگی عزیر علیہ السلام تو مستجاب الدعوات تھے ان کی دعا سے مریض اچھے ہوجاتے تھے۔ اگر آپ عزیر ہیں تو دعا کریں اللہ تعالیٰ میری بینائی لوٹا دے تاکہ میں آپ کو دیکھ کر پہچان سکوں۔ آپ نے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی لوٹا دی اور اسکے پاؤں کھول دیے اور وہ اپنے پاؤں پہ کھڑی ہوگئی، وہ آپ کو دیکھ کر پکار اٹھی کہ واللہ آپ عزیر ہی ہیں۔ پھر وہ آپ کو لیکر نبی اسرائیل کے محلہ میں آئی، وہاں آپ کا بیٹا ایک مجلس میں موجود تھا جو ایک سو اٹھارہ برس کا ہو چکا تھا۔ بڑھیا نے اسے بتایا کہ میں تمہاری فلاں لونڈی ہوں۔ یہ عزیر علیہ السلام ہیں جو سو برس کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر آئے ہیں اور ان کی دعا سے اللہ نے میری بینائی لوٹا دی اور میرے پاؤں بیماری کی زنجیر سے کھول دیے ہیں۔ آپ کے بیٹے نے کہا میرے والد کے کندھوں کے درمیان ایک سیاہ نشان تھا، آپ نے کندھے ننگے کیے تو وہ نشان وہاں موجود تھا۔ لوگوں نے کہا اے عزیر علیہ السلام بخت نصر نے تورات کے سارے نسخے جلوا دئے تھے، آپ ہمیں تورات پھر سے لکھ دیں۔ (درمنثور جلد ۲ صفحہ ۲۹ مطبوعہ دارالفکر بیوت)

گویا حضرت عزیر علیہ السلام کو اس لیے بھی سو سال تک کیلیے موت کی نیند سلایا گیا کہ ظالم بادشاہ بخت نصر نے تورات کے تمام نسخے جلا دیئے تھے۔ آپ نے دوبارہ اٹھ کر پوری کتاب تورات اپنے حافظے سے پھر لکھی۔ کیونکہ آپ کے سوا کوئی تورات کا حافظ نہ تھا۔ آپ کے ذریعے تورات دوبارہ دنیا میں آئی اور لوگوں نے اسے جانا۔

کئی چیزیں لوگوں کی نگاہوں سے محفوظ رکھی جاتی ہیں:

حضرت عزیر علیہ السلام کا جسم سو برس تک لوگوں کی نگاہ سے غائب رہا۔ نہ وہاں کوئی پرندہ پہنچا نہ وہاں کوئی درندہ پہنچ سکا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرعون کی لاش کئی ہزار برس لوگوں سے پوشیدہ رکھی۔ دجال بھی حدیث کے مطابق زندہ موجود ہے اور ایک جزیرہ میں بند ہے اور لوگ اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ بعض صحابہ کو وہ دکھایا گیا۔ (مسلم کتاب الفتن حدیث ۱۱۹) لہٰذا ان چیزوں کا ہونا ممکن ہے، اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ جو باتیں احادیث صحیحہ میں آجائیں ان پہ ایمان لانا ضروری ہے۔

قرآن محفوظ ترین کتاب ہے:

تورات کا کوئی حافظ نہ تھا۔ حضرت عزیر کو سو برس بعد اس لیے اٹھایا گیا تاکہ آپ تورات کو پھر زندہ کریں کیونکہ ابھی اس کی ضرورت تھی مگر قرآن دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اس کا ایک حافظ نہیں لاکھوں کروڑوں حفاظ ہیں۔ لہٰذا اس کی بقا کے لیے کسی کو زندہ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ خود زندۂ جاوید کتاب ہے بلکہ قرآن کے زندہ جاوید رہنے سے اسلام زندہ ہے اور امتِ مسلمہ زندہ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا یاد کرنا آسان کر دیا ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ

گدھے کی سواری سنت انبیاء ہے:

حضرت عزیر علیہ السلام گدھے پر سفر کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی گدھے پر سواری فرمائی بلکہ آپ کو خیبر میں یعفور نامی گدھا غنیمت میں ملا تھا جس نے عرض کیا کہ اس کی نسل کے گدھے انبیاء کی سواری بنتے رہے اور وہ اپنی نسل کا آخری گدھا ہے اور آپ انبیاء میں آخری نبی ہیں۔ تو آپ نے اسے اپنی سواری کے لیے رکھ لیا۔ (مواہب لدنیہ جلد دوم صفحہ ۵۵۴) معلوم ہوا کہ گدھا بھی آپ کی شان ختم نبوت کو جانتا اور مانتا ہے، اگر انسان اسے نہ مانے تو وہ گدھوں سے بدتر ہے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ

انبیاء کرام علیہم السلام زندہ ہیں اور انکے اجسام قبروں میں محفوظ ہیں:

حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم میں سو برس تک تغیر نہ آیا اور یہی حال انبیاء کا قبور میں ہے۔ حدیث میں ہے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنّ اللّٰہَ حرّم عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَأْکُلَ اَجْسَادَ الانبیاءِ فنبیُّ اللّٰہِ حیٌّ یُرزَقُ، ''اللہ نے زمین پر انبیاء کے اجسام کا کھانا حرام کیا ہے تو اللہ کا ہر نبی زندہ ہے۔ اسے رزق دیا جاتا ہے۔'' (ابن ماجہ کتاب الجنائز حدیث ۱۶۳۷) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا (مسلم) جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام صرف روحانی طور پہ زندہ نہیں بلکہ جسمانی طور پہ زندہ ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب مجھے دکھا تو مردے کیسے زندہ کرتا ہے، فرمایا: کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا؟

قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ

عرض کیا: کیوں نہیں؟ لیکن اس لئے تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے [330] اللہ نے فرمایا تو چار پرندے لو انہیں کاٹ کر اپنے پاس رکھ لو

فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

پھر ان میں سے ایک ایک جزء ہر پہاڑ پر رکھ دو پھر انہیں اپنی طرف بلاؤ تو وہ تمہارے پاس

یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع

دوڑتے آئیں گے اور جان لو کہ اللہ غالب ہے حکمت والا ہے [331]

ع ۳۵

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پر چار پرندے ذبح کے بعد زندہ کیے گئے

[330] جب یہ بات چلی کہ زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں ہے تو اس کی ایک اور مثال دی جا رہی ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ساحل سمندر پر ایک حبشی مرد کی لاش دیکھی جسے سمندر کے جانور باہر نکل کر کھا رہے تھے اور خشکی کے درندے اور ہوا میں اڑنے والے جانور بھی اسے نوچ رہے تھے۔ آپ نے دعا کی اے اللہ جب اس لاش کے اجزاء بری بحری اور ہوائی جانوروں کے پیٹوں میں چلے گئے تو اسے دوبارہ کیسے اٹھایا جائے گا۔ اے اللہ تو مجھے دکھا دے تو مردے کیسے زندہ کرے گا؟ (ابن تفسیر ابی حاتم جلد ۲ صفحہ ۵۵۷ مطبوعہ مکہ مکرمہ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیم کیا تمہارا اس پر ایمان نہیں کہ میں مردے زندہ کر سکتا ہوں؟ عرض کیا ایمان تو ہے مگر آنکھوں سے دیکھ کر ایمانی کیفیت ہی کچھ اور ہو جاتی ہے۔ گویا ابراہیم علیہ السلام کو اس بات میں کوئی شک نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، بس وہ مزید پختگی ایمان کے لیے کسی مردہ کو زندہ ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔

نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ کا معنی

اور وہ جو حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ ابراهيمَ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ (بخاری، مسلم) یعنی جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا اے اللہ تو مجھے دکھلا کہ تو مردے کیسے زندہ کرے گا تو ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے لائق ہیں، تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ شک ہوا

آیا اللہ ان کی دعا پر ابھی مردہ زندہ کر کے دکھا دے گا یا نہیں دکھائے گا۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات میں شک تھا کہ اللہ مردے زندہ کر سکتا ہے یا نہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان مبنی بر عجز ہے۔ امام اسماعیل بن یحییٰ مزنی نے یہی معنی پسند کیا ہے۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ کی صفت احیاء اموات میں کیسے شک ہو سکتا ہے جبکہ وہ خود دربار نمرود میں کہتے ہیں رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ یعنی میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور یہاں بھی آپ نے کہا: بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ کیوں نہیں میں ایمان رکھتا ہوں کہ اے اللہ تو ہی مردوں کو اٹھانے والا ہے مگر میں صرف اطمینان قلبی چاہتا ہوں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے بارے میں یہ ارشاد محض تواضع وانکسار پر محمول ہے ورنہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کیا شک ہو سکتا ہے۔

[331] اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور آپ کو حکم دیا کہ آپ چار پرندے لے لیں۔ انہیں ذبح کر کے قیمہ کریں پھر وہ قیمہ چار پہاڑوں پر رکھ دیں پھر ہر پرندے کا نام لے کر پکاریں تو سب پرندے اڑ کر آپ کے پاس آجائیں گے۔ حسن تابعی کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مرغ، مور، کبوتر اور کوا چار پرندے لیے۔ ان کا قیمہ بنا کر اسے چار پہاڑوں پر رکھا۔ پھر پکارا اے کٹ جانے والی ہڈیو اور بکھر جانے والے گوشت اور ٹکڑے ہو جانے والی رگو بحکم الٰہی اکٹھی ہو کر آجاؤ تو ہر ہڈی دوسری ہڈی کی طرف اُڑی اور گوشت گوشت کی طرف لپکا اور پرندے زندہ ہو کر آپ کے پاس آ گئے۔ (تفسیر ابن ابی حاتم عن ابن عباس رضی اللہ عنہما جلد دوم صفحہ ۵۱۳)

عظمتِ مصطفیٰ واصحابِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی صفت احیاء اموات کو مانتے تھے۔ مگر جب آپ نے مردہ پرندوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا تو آپ کے ایمان میں کئی گنا طاقت آ گئی۔ اسی لیے آپ نے فرمایا: وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ کیونکہ آنکھوں سے دیکھ کر جو قوت ایمانی حاصل ہوتی ہے وہ محض سننے سے نہیں مل سکتی۔ اس سے عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پتہ چلا کہ سب انبیاء کرام علیہم السلام نے اللہ کی گواہی اللہ کی وحی سن کر دی۔ آپ نے اللہ کی گواہی اللہ کو دیکھ کر کر دی۔ اس سے عظمت صحابہ بھی معلوم ہوئی کہ ساری امت نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر سن کر آپ کا کلمہ پڑھا صحابہ نے آپ کو دیکھ کر کلمہ پڑھا، لہٰذا جو ایمانی کیفیت اور ایمانی جذبہ صحابہ میں پیدا ہوا وہ بعد والی امت میں پیدا نہ ہو سکا۔ آج مسلمانوں کے قبضہ میں جو ممالک ہیں وہ سارا علاقہ اکثر وبیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کا فتح کیا ہوا ہے اور یہ سب فیض تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیکھنے اور آپ کی صحبت پانے کا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے: شنیدہ کے بود مانند دیدہ، یعنی سنا ہوا دیکھے ہوئے کی طرح کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر جو لوگ آج اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالیاں دیتے ہیں وہ کس قدر بھٹکے ہوئے ہیں۔

حیات ابدی کے لیے چار قلبی برائیوں کا خاتمہ ضروری ہے:

صوفیاء فرماتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار پرندے ذبح کیے۔ مرغ، مور، کبوتر اور کوا۔ مرغ میں شہوت، مور میں خود آرائی۔ کبوتر میں اونچی اڑان کا کبر اور کوے میں کمینگی زیادہ ہے۔ کوا اکثر بچوں کے ہاتھوں سے چیزیں لے اڑتا ہے۔ تو ان کا ذبح کرنا ان صفات کے خاتمے کی طرف اشارہ ہے۔ جو انہیں ختم کرے وہ حیات جاودانی پالیتا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ
ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں اس دانہ کی طرح ہے جس نے
سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ
سات خوشے اگائے ہر خوشہ میں سو دانہ ہے [332] اور اللہ جس کے لیے چاہے دونا کر دے
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾
اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔[333]

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا عظیم ثواب

[332] گزشتہ سے پیوستہ رکوع کے آغاز میں کہا گیا کہ قیامت آنے سے قبل اللہ کی راہ میں خرچ کرلو۔ پھر اس بات پر زور دیا گیا کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ حضرت عزیر وابراہیم علیہما السلام کے واقعات لائے گئے۔ اس لیے کہ جو اس بات پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے ہماری بساط حیات الٹ سکتا ہے وہ اس کی راہ میں خرچ کرنے کی فکر رکھتا ہے۔ تو اب اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا اجر بتایا جارہا ہے کہ یہ ایسے ہے جیسے زمین میں ایک دانہ بویا جائے تو اس سے سات خوشے اگیں۔ ہر خوشے میں ایک سو دانے ہوں، یعنی ایک دانہ کے بدلے سات سو دانے مل گئے۔ یونہی دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہاں ایک روپیہ، پونڈ، ڈالر یا ریال خرچ کرو تو آخرت میں سات سو پالو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نکیل دار اونٹنی راہ خدا میں خرچ کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے فرمایا: ''تم روز قیامت سات سو نکیل دار اونٹنیاں حاصل کرو گے۔'' (مسلم کتاب الامارۃ، نسائی کتاب الجہاد)

امام قرطبی فرماتے ہیں یہ آیت حضرت عثمان غنی اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کے حق میں اتری۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک کے لیے اسلحہ اور زادِ سفر کی خاطر صحابہ کو مال جمع کرنے کیلئے کہا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار درہم پیش کیے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے سارے لشکر کے زاد سفر کی ذمہ داری اٹھائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کردار

کی تعریف میں یہ آیت اتاری۔ (قرطبی جلد سوم صفحہ ۳۰۳)

صدقہ کرنے کو زمین میں دانہ بونے سے کیوں تشبیہ دی گئی:

صدقہ دینے کو زمین میں دانہ بونے سے تشبیہ اس لیے دی گئی کہ دانہ خاک میں ڈالنے والا بظاہر مال برباد کرتا ہے مگر اسے بدلہ ملنے کی امید ہوتی ہے یہی حال صدقہ کرنے والے کا ہے بظاہر وہ اپنا مال یوں ہی اڑا رہا ہے مگر وہ جانتا ہے کہ اس کے بدلے اسے آخرت میں اجرِ عظیم ملے گا۔ پھر دانہ بو کر اس سے پھل ملنے کی اللہ سے دعا کی جاتی ہے، یونہی صدقہ دے کر اجر کے لیے اللہ سے دعا کرنا چاہیے پھر جیسا اچھا دانہ، اچھی زمین اور اچھی آبیاری ہو ویسا اچھا پھل آتا ہے۔ اسی طرح جس قدر ستھرا مال جتنے اچھے مصرف پر جتنے اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے اتنا اجر زیادہ ملتا ہے۔

شانِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ:

ان کے حق میں اس آیت کا نزول ان کی عظمت کا پتہ دیتا ہے۔ تبوک پر جانے والے لشکر کا خرچہ اٹھانے پر آپ کو صاحب جیشِ عسرت کہا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے اللہ میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی اس سے راضی ہو جا اور آپ ان کے لیے ساری رات دعا کرتے رہے۔ (تفسیر قرطبی جلد سوم صفحہ ۳۰۶) بلکہ غزوہ تبوک پہ آپ کے اس عظیم انفاق کا تذکرہ شیعہ مؤرخین کو بھی کرنا پڑا ہے۔

چنانچہ مرزا محمد رفیع مشہدی لکھتا ہے:

عثمان بن عفان بروایتے سیصد شتر با ساز و برگ و ہزار مثقال زر سرخ حاضر ساخت پیغمبر فرمود: اَللّٰھُمَّ اَرْضِ عَنْ عُثْمَانَ فَاِنِّیْ عَنْہُ رَاضٍ، یعنی ایک روایت میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے تین سو اونٹ مع زادِ سفر اور ہزار مثقال سرخ سونا حاضر خدمت کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے اللہ عثمان سے راضی ہو جا میں اس سے راضی ہوں (ناسخ التواریخ جلد ۳ صفحہ ۱۸۴ حالات پیغمبر مطبوعہ کتابفروشی اسلامیہ ایران) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے راضی ہیں اور ان کے لیے رضاء الٰہی کی دعا کر رہے ہیں اور اسے شیعہ مورخ بیان کر رہا ہے تو پھر اہل تشیع کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ناراض رہنا چہ معنی دارد؟

[333] یعنی راہ خدا میں مال خرچ کرنے پر اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی کے لیے سات سو کو دوگنا کر کے چودہ سو کا ثواب دے بلکہ اللہ اس میں بھی وسعت فرمانے والا ہے بلکہ اللہ رب العزت بسا اوقات راہ میں خرچ کرنے والوں کو ذرے کے بدلے پہاڑوں جتنا ثواب بھی دیتا ہے۔ حدیث نبوی ہے کہ جہاد کے لیے مال خرچ کرنے والے بعض لوگوں کو ایک درہم کے بدلے سات لاکھ درہم کا ثواب دیا جاتا ہے۔ (ابن ماجہ عن عمران بن حصین رضی اللہ عنہ)

دراصل اس میں یہ بنیاد ہے کہ کوئی کتنے اخلاص کی ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، یا اس وقت اس مال کی دین

کو یا حاجتمندوں کو کتنی ضرورت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اخلاص ساری امت سے زیادہ ہے اس لیے انکا ثواب بھی ساری امت سے زیادہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے صحابہ کو برا مت کہو کہ اگر تم احد پہاڑ کے برابر سونا راہ خدا میں خرچ کرو تو وہ میرے کسی صحابی کے ایک مد (قریبا چار سیر) جو خرچ کرنے کے برابر نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کے نصف کے برابر بھی نہیں ہوسکتا۔'' (بخاری کتاب فضائل اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا
جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے اموال خرچ کرتے ہیں پھر اپنے خرچ کے بعد احسان جتلانے
مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
اور تکلیف دینے کی بات نہیں کرتے، [334] ان کیلئے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمزدہ
يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ
ہوں گے۔ [335] اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف دی جائے
وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝
اور اللہ بے پرواہ بردبار ہے۔ [336]

[334] کسی غریب حاجت مند کو کچھ دے کر اسے جتلانا یا اس سے مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرنا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہی راہ خدا میں خرچ کرنے والے ہیں، انہی کو اللہ کی طرف سے اجر ملے گا۔ ابن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''اگر تم نے کسی سے بھلائی کی ہے اور اس کو تمہارے سلام بھیجنے سے اسے تمہارا احسان کرنا یاد آئے تو مت سلام بھیجو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ اس کے لیے باعث اذیت ہو۔''

[335] یعنی اخلاص والے صدقہ کا عظیم اجر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو ایک کھجور صدقہ دے اللہ تعالیٰ اسے بڑھاتا رہتا ہے تا آنکہ وہ پہاڑ کے برابر بن جاتا ہے۔'' (بخاری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا عظیم ثواب

[336] یعنی اگر تم کسی کو صدقہ نہیں دینا چاہتے تو نہ دو، معذرت کرلو۔ مگر یہ نہ کرو کہ صدقہ دینے کے بعد اسے جتلاؤ یا اس

غریب کی عزتِ نفس مجروح کرو۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ بھلی بات کہہ کر مانگنے والے کو ٹال دو مثلاً کہہ دو کہ بھائی معاف کرو، مقصد یہ ہے کہ کسی غریب حاجت مند کا دل نہ دکھاؤ اور اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے، یعنی اگر تم کسی غریب کا دل دکھاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تمہارا مال تم سے لے کر کسی غریب کو دے سکتا ہے وہ بردبار ہے اس کے حلم پر مغرور نہ ہوا جائے۔

تو مشو مغرور از حلمِ خدا   دیر گیرد سخت گیرد مرترا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ
اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلانے اور تکلیف دینے کے سبب ضائع نہ کرو [337] اس شخص کی طرح
يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتا [338] اس کی مثال
صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى
اس پتھر کی طرح ہے جس پر مٹی ہے اس پر بارش آئی تو اسے بے غبار کر کے چھوڑ دیا وہ اپنی کمائی
شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶۴
میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔[339]

[337] یعنی صدقہ دینے کے بعد اسے جتلانا یا لوگوں کو اپنے صدقہ کے بارے میں آگاہ کر کے غریب کی عزت نفس کو مجروح کرنا جیسے آج کل بعض دنیا پرست شہرت پسند لوگ کسی غریب شخص کو چیک یا کوئی چیز دیتے ہوئے تصویر بنا کر اسے اخبار میں چھپواتے اور یوں غریبوں کی غربت کا تماشا بناتے ہیں۔ اس سے صدقہ کا ثواب ہرگز نہیں ملتا۔ الٹا غضب الٰہی جوش میں آتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ''احسان جتلانے والا، والدین کا نافرمان، شراب نوش، جادوگری کرنے والا اور نجومی یہ لوگ جنت میں نہ جائیں گے۔'' (مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ ۱۳۴)

[338] اسی طرح اس شخص کا صدقہ بھی باطل ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی بجائے لوگوں کے دکھانے کو صدقہ دیتا ہے اور وہ اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔ یعنی وہ منافق یا کافر ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کو سنوارنے کی فکر ہرگز نہیں صرف دنیا ہی میں شہرت چاہتا ہے کہ اسے بڑا سخی کہا جائے۔

دکھاوے کے صدقہ کی برائی

نبی ﷺ نے فرمایا روز قیامت سب سے پہلے ایک قاری قرآن، ایک مجاہد اور ایک مالدار کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ قاری سے فرمائے گا: کیا میں نے تمہیں وہ قرآن نہ دیا تھا جو میں نے اپنے رسول ﷺ پہ نازل کیا تھا؟ وہ کہے گا ہاں ضرور دیا تھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، پھر تم نے اس کے بدلے میں کیا کیا؟ قاری کہے گا اے اللہ میں نے قرآن پڑھا اور پڑھایا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم جھوٹ کہتے ہو تم نے یہ اس لیے کیا تا کہ تجھے قاری کہا جائے، تو وہ کہہ دیا گیا، پھر اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ مجاھد کو بلائے گا۔ مجاہد کہے گا اے اللہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور جان دیدی۔ اللہ فرمائے گا تم جھوٹ کہتے ہو یہ تم نے اس لیے کیا کہ تمہیں بہادر کہا جائے، تب اسے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اور مالدار شخص کو بلایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا، کیا میں نے تم کو دنیا میں مالی کشائش نہیں دی تھی؟ وہ کہے گا: ہاں ضرور دی تھی، اللہ فرمائے گا پھر تم نے اس کے بدلہ میں کیا کیا؟ مالدار کہے گا اے اللہ میں نے تیری رضا کے لیے ہر نیک کام میں مال خرچ کیا۔ اللہ فرمائے گا تم جھوٹ کہتے ہو یہ تم نے اس لیے کیا کہ تمہیں سخی کہا جائے۔ اس کے بعد حکم ہوگا کہ اس کو منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے جہنم میں پھینک دیا جائے۔ (مسلم کتاب الامارۃ باب ۱۵۲)

[339] صدقہ کر کے احسان جتلانے اور دکھاوا کرنے والے شخص کے صدقات کس طرح ضائع ہوجاتے ہیں اس کی مثال اللہ تعالیٰ یہ دے رہا ہے کہ جیسے کسی پتھر پر گرد وغبار کی تہہ جمی ہو، پتھر کا اصل رنگ اس میں چھپا ہو۔ اس پر زور کی بارش برسے تو مٹی اتر جائے اور پتھر کا اصل رنگ سامنے آجائے۔ یونہی دکھاوے کا صدقہ کرنے والوں کے صدقات پتھر پر لگی ہوئی مٹی کی طرح ہیں جو بارش برسنے کے بعد ٹھہر نہیں سکتی۔ فوراً بہہ جاتی ہے۔

دکھاوے کا صدقہ بھی موت، قبر اور حشر کے احوال کی بارش کے بعد بہہ جائے گا اور ریا کاروں اور احسان جتلانے والوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں بچے گا۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ جیسے بارش سے پتھر کا اصل رنگ سامنے آ گیا۔ ریا کاروں نے اپنے چہرے پر انسان دوستی، دریا دلی اور سخاوت کا جو جھوٹا غازہ مل رکھا تھا وہ احوال آخرت کی بارش سے اتر جائے گا اور ان کی اصل مکروہ شکل سامنے آجائے گی۔

کیونکہ روزِ قیامت انسان کی نیت کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ اس دن کئی نیکیاں گناہ بن جائیں گی اور کئی گناہ نیکیاں بن جائیں گے۔ جس نے فساد ڈالنے کے لیے سچ بولا جیسے غیبت تو وہ جہنم کا حق دار ہوگا اور جس نے اصلاح کے لیے یعنی صلح کرانے کے لیے جھوٹ بولا وہ جنت کا سزاوار ہوگا۔

حدیث کے مطابق سب سے افضل صدقہ یہ ہے کہ انسان علم کو پھیلانے میں مصروف ہو، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ اَنْ يَتَعَلَّمَ الْمَرْءُ الْمُسْلِمُ عِلْماً اَوْ يُعَلِّمَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ۔ سب سے افضل صدقہ یہ ہے کہ مسلمان آدمی علم سیکھے یا اپنے مسلمان بھائی کو سکھائے (ابن ماجہ مقدمہ باب ۲۰)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے اموال اللہ کی رضا حاصل کرنے اور اپنے نفسوں کی (دین پر) مضبوطی کے لئے

اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ج

خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو کچھ اونچائی پر ہے اس پر بارش آئی تو وہ اپنا پھل دوگنا لایا [340]

فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵ اَيَوَدُّ

اور اگر اسے بارش نہ آئے تو کچھ چھڑکاؤ ہی کافی ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔ [341] کیا تم میں سے

اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

کوئی چاہتا ہے کہ اس کے پاس کھجور اور انگوروں کا باغ ہو جس کے نیچے نہریں

الْاَنْهٰرُ لا لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ لا وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ صلے

بہتی ہوں اس کے لئے اس میں ہر طرح کے پھل ہوں اور اسے بڑھاپا آ پہنچے اور اس کی کمزور (کمسن) اولاد ہو

فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

پھر اس باغ کو بگولا آلے جس میں آگ ہو تو وہ باغ جل جائے؟ [342] اس طرح اللہ تمہارے لئے نشانیاں بیان کرتا ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۶۶ ع

تاکہ تم فکر کرو۔

[340] جبکہ رضاء الٰہی اور اپنے دلوں کو نیکی پر مضبوط کرنے کی خاطر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والوں کی مثال یوں ہے جیسے ایک شخص نے کسی قدر اونچی جگہ باغ لگایا جہاں باغ کو ہوا اور دھوپ خوب میسر آئی اور نشیب میں نہ ہونے کی وجہ سے وہاں زائد پانی جمع نہ ہوسکا کہ باغ کو نقصان دے بلکہ زائد پانی نے ساتھ والے باغات کو سیراب کر دیا۔ جب اس باغ پر موسلا دھار بارش ہوئی تو اس کا پھل دوگنا ہوگیا بلکہ اگر اس پر ہلکی بارش ہو تو اس کیلیے وہ بھی کافی ہوجاتی ہے کیونکہ

محل وقوع کی خوبی اس کی ہر کمی پوری کر دیتی ہے۔ یہی حال رضاء الٰہی کے لیے صدقہ کا ہے، وہ تھوڑا بھی ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں مالی صدقات پیش کرنے کی فضیلت:

صدقہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے قرب کے حصول کا ذریعہ ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات سے فرمایا: اَوَّلُکُنَّ بِیْ لُحُوْقاً اَطْوَلُکُنَّ یَدًا، تم میں سے جس کا ہاتھ لمبا ہے وہ میرے بعد مجھے سب سے پہلے آکر ملے گی۔ ازواج مطہرات نے اپنے ہاتھ ناپے تو حضرت سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ سب سے لمبا نکلا، مگر ان میں سے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا سب سے پہلے وصال ہوا، کیونکہ وہ سب سے زیادہ صدقہ دینے والی تھیں۔ (بخاری کتاب الزکوۃ، مسلم کتاب فضائل الصحابہ) یعنی ہاتھ کے لمبا ہونے سے یہ مراد تھا کہ جو راہ خدا میں زیادہ خرچ کرنیوالی ہے۔

حدیث پاک میں ہے کہ ایک شخص کہیں سفر کر رہا تھا۔ اس نے آسمان میں بدلی دیکھی، اس میں سے پانی برسا، پانی نے زمین میں راستہ بنالیا اور بدلی سے آواز آئی۔ اے پانی چل اور فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر، پانی چلتا ہوا ایک باغ میں داخل ہو گیا۔ وہ شخص یہ منظر دیکھتا رہا، پھر اس نے باغ کے مالک سے جا کر پوچھا، تمہارا کونسا نیک عمل ہے جس کے سبب میں نے بادل میں سے تمہارا نام سنا اور اللہ نے خصوصی بدلی بھیج کر تمہارے باغ کو سیراب کیا؟ اس نے کہا میں اپنے باغ کا پھل اتار کر اس کے تین حصے کر دیتا ہوں ایک حصہ راہِ خدا میں خرچ کر دیتا ہوں، ایک گھر والوں کے لیے رکھ لیتا ہوں اور ایک حصہ واپس باغ پہ لگا دیتا ہوں۔ (مسلم کتاب الزکوۃ)

[341] جب ہمارے دل میں یہ بات آجائے کہ اللہ ہمارے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے تو ہمارے اعمال میں خود ہی اخلاص آجائے گا اور احسان جتلانے کا مرض دور ہو جائے گا۔

[342] صدقہ کے بعد احسان جتلانے اور دکھلاوا کرنے والے کا صدقہ کیسے برباد ہو جاتا ہے اس کی ایک اور مثال اللہ نے یہ بیان فرمائی کہ ایک شخص نے کھجوروں اور انگوروں کا باغ لگایا اور اس کے ساتھ نہریں چلائیں جو اسے ہمہ وقت سیراب کریں یعنی بہت سرمایہ لگایا اور اس میں دوسرے پھلوں کے درخت لگائے پھر اسے بڑھاپے نے آلیا۔ اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں گویا اس بڑھاپے میں یہی باغ اس کی امیدوں کا سہارا اور اس کے کمسن بچوں کا مستقبل ہے۔ وہ ڈرتا ہے اگر یہ باغ اجڑ جائے تو اس کی اور اس کے بچوں کی زندگی برباد ہے۔ ایسے میں اس باغ پر اعصار یعنی آگ بگولا آیا جس نے سارا باغ جلا کر رکھ دیا، کیا ایسے شخص کی حسرت و درماندگی کا کوئی ٹھکانہ ہے؟ یہی حال اس آدمی کا ہے جس نے بہت صدقات وخیرات کیے اور سمجھا کہ اس نے نیکیوں کا بڑا باغ لگالیا ہے پھر اس نے احسان جتلایا اور دکھاوا کیا اور جنہیں صدقہ دیا تھا انہیں کسی طرح اذیت دی تو اس آگ بگولے نے اس کے صدقات کا باغ جلا کر رکھ دیا۔ امام قرطبی کے مطابق آگ بگولا جنات کا ایک گروہ ہوتا ہے جو مل کر اوپر چڑھتے ہیں ایسے میں گرد و غبار کا طوفان گولائی کی

صورت میں اوپر چڑھتا دکھائی دیتا ہے کبھی اس میں آگ بھی نظر آتی ہے (اور یہ آگ کبھی چیزوں کو جلا بھی دیتی ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا

اے ایمان والو! (اللہ کی راہ میں) ان پاک چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم نے کمائیں اور ان میں سے جو ہم نے تمہارے لئے

لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ

زمین سے نکالیں [343] اور اس میں سے گھٹیا چیز دینے کا ارادہ نہ کرو کہ اسی میں سے خرچ کرو گے جبکہ تم خود اسے (اپنے لئے)

بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷

نہ لو گے سوا اس کے کہ اس میں چشم پوشی کرو اور جان لو کہ اللہ بے پرواہ لائق حمد ہے۔ [344]

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمہیں اپنی طرف سے

مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۸ۙ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ

بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے اور اللہ وسعت والا علم والا ہے۔ [345] وہ جسے چاہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت

الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۶۹

دی گئی یقیناً اسے بہت سی بھلائی مل گئی [346] اور نصیحت تو عقل والے ہی پکڑتے ہیں۔ [347]

زکوٰۃ اور عشر کی فرضیت

[343] گزشتہ رکوع میں اللہ رب العزت کی راہ میں اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے پر زور دیا گیا۔ اب اس کا بنیادی تقاضا زکوٰۃ وعشر کی ادائیگی بتایا جا رہا ہے کہ اے مومنو تم جو حلال پاک مال کماتے ہو اس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو (اور شریعت نے اس کا اڑھائی فی صد حصہ مقرر کیا ہے۔ اسے زکوٰۃ کہتے ہیں) اور جو چیزیں ہم نے تمہیں زمین سے نکال کر دیں ان میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو (اور اس میں شریعت نے دس فیصد حصہ مقرر کیا ہے۔ اسے عشر کہتے ہیں جس کا معنی ہی دسواں حصہ ہے۔)

زکوٰۃ وعشر کے چند احکام:

یاد رہے کہ زکوٰۃ ہر مسلمان عاقل بالغ صاحب نصاب پر فرض ہے۔ ساڑھے سات تولہ سونا یا باون تولہ چاندی یا ان میں سے کسی ایک کی قیمت کے برابر جس کے پاس ضروریات زندگی اور قرض سے زائد مال ہو اس پر زکوٰۃ ہے۔ جو سامان برائے فروخت گودام یا دکان میں ہو اس پر زکوٰۃ لازم ہے۔ ذاتی استعمال کی اشیاء پر زکوٰۃ لازم نہیں۔ جو چیز حصول مال کا ذریعہ ہو اس پر زکوٰۃ نہیں، جیسے کسی نے مکان یا گاڑیاں کرائے پہ دینے کے لیے رکھی ہوں تو ان کی اپنی مالیت پہ کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔ البتہ ان سے جو مالی نفع حاصل ہو اس پہ زکوٰۃ ہے۔ لوگ جانور پالتے ہیں ان جانوروں پر زکوٰۃ لازم ہے۔ پھر بکریوں میں زکوٰۃ کا الگ نصاب ہے، گائیوں میں الگ ہے اور اونٹوں میں الگ، تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

اسی طرح جو زمین بارش سے سیراب ہو اس کی پیداوار میں دسواں حصہ اور جسے قیمت دے کر سیراب کیا جائے اس کی پیداوار میں بیسواں حصہ لازم ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس زمین کو آسمان یا چشموں سے سیراب کیا جائے وہ نہری زمین ہے اس میں پیداوار کا دسواں حصہ لازم ہے اور جس کو مشکیزوں سے پلایا جائے اس میں دسویں حصہ کا آدھا (بیسواں حصہ) لازم ہے۔'' (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ۵۵)

وجوب عشر کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ کا اختلاف

یاد رہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر پیداوار میں عشر لازم ہے خواہ وہ گندم چاول جیسی تا دیر رہنے والی چیزیں ہوں یا پھلوں سبزیوں جیسی جلد خراب ہونے والی اور خواہ پیداوار بہت تھوڑی ہو یا بہت زیادہ۔ حتیٰ کہ اگر دس دانے پیدا ہوں تو ایک دانہ عشر میں دینا لازم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مطلقاً فرمایا:

وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۪ کہ ہم نے تمہارے لیے زمین میں سے جو کچھ پیدا کیا اس میں سے خرچ کرو، تو اس میں ہر پیداوار آ گئی خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اور خواہ وہ تا دیر باقی رہنے والی ہو جیسے گندم وغیرہ یا جلد خراب ہو جانے والی جیسے سبزیاں، مگر باقی ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سبزیوں اور پھلوں میں عشر نہیں ہے۔ وہ ان احادیث سے دلیل لاتے ہیں جن کا مضمون یہ ہے کہ سبزیوں میں کوئی صدقہ نہیں ہے، مگر یہ ضعیف احادیث ہیں۔ امام ترمذی فرماتے ہیں:

لَايَصِحُّ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فِيْ هٰذَا الْبَابِ شَيْءٌ، اس باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحت کے ساتھ کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ (ترمذی کتاب الزکوٰۃ)

جبکہ ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک پانچ وسق سے کم کسی پیداوار میں عشر نہیں ہے۔

وہ اس حدیث سے دلیل لاتے ہیں جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں ہے۔'' (بخاری ومسلم)

مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال اب بھی قرآن کریم کے عموم سے ہے اور ان احادیث صحیحہ کے عموم سے ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جسے آسمان یا چشموں نے سیراب کیا اس میں دسواں حصہ لازم ہے اور جسے مشکیزوں سے پلایا گیا اسمیں دسویں حصہ کا آدھا حصہ۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ۵۵)

اس حدیث میں بھی مطلقاً ہر پیداوار میں عشر بتایا گیا ہے۔ رہی یہ حدیث کہ پانچ وسق سے کم میں صدقہ نہیں ہے تو اس سے مراد مال تجارت ہے، یعنی فروخت کے لیے خریدی گئی کسی خوردنی چیز میں پانچ وسق سے کم تر میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ پانچ وسق گندم وغیرہ کی قیمت اس زمانہ میں زکوٰۃ کے نصاب دوسو درہم کے قریب ہی بنتی تھی۔ ایک وسق ساٹھ صاع ہے اور ایک صاع قریباً چار کلو کا ہوتا ہے۔

راہ خدا میں گھٹیا مال دینے کی برائی

[344] یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں گھٹیا اور ردی مال دینے کا قصد نہ کرو۔ اگر بلا ارادہ بعض ردی مال زکوٰۃ وغیرہ میں دیدیا جائے تو پکڑ نہیں ہوگی، مگر ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ راہ خدا میں قصداً ایسا مال دیا جائے کہ اگر خود تمہیں لینا پڑے تو نہ لو سوا اس کے کہ مجبوراً چشم پوشی کر کے رکھ لو۔ اور جان رکھو کہ اللہ بے نیاز ہے، یعنی اسے تمہارے گھٹیا مال کی ضرورت نہیں۔ وہ تو تمہاری نیت دیکھتا ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحاب صُفہ کے لیے کھانے کا انتظام نہ تھا۔ ہم انصار لوگ اپنے کھجوروں کے باغات میں سے درختوں کے کچھ خوشے مسجد میں لا کر دیوار سے لٹکا دیتے۔ جب اصحاب صفہ کو بھوک لگتی تو ان خوشوں سے کھجوریں اتار کر کھا لیتے۔ بعض لوگ خراب خوشے لا کر لٹکا دیتے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ اتاری: وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لائے آپ نے مسجد میں لٹکے ہوئے خراب خوشوں کو اپنے عصا مبارک سے جھنجھوڑ کر فرمایا یہ ردی خوشے لانے والوں کو جنت میں ایسے ہی پھل ملیں گے۔ (ابوداؤد، نسائی)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اچھا مال دینا چاہیے جو آدمی کو اپنے لیے ناپسند نہ ہو۔ قرآن میں ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ تم ہرگز نیکی نہیں پاسکتے جب تک وہ خرچ نہ کرو جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ (آل عمران: ۹۲) ہم نے دیکھا ہے کہ پاکستان کے دینی مدارس میں لوگ صدقہ کے بکرے دیجاتے ہیں، وہ نہایت کمزور ونحیف اور کچے سے گوشت والے ہوتے ہیں۔ جس کو پکانے کے باوجود اس میں سے ایک ناپسندیدہ مہک سی نہیں جاتی اور غریب دینی طلبہ کو وہی گوشت کھانا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ان آیات سے عبرت پکڑنی چاہیے۔

[345] یعنی شیطان تمہیں یہ خوف دلاتا ہے کہ اگر تم نے راہ خدا میں خرچ کیا یا عمدہ مال دیا تو تمہاری فلاں حاجت رہ جائے گی یا تمہارا ہاتھ تنگ ہو جائے گا تو شیطان تمہیں بے حیائی کا درس دیتا ہے۔ اس بے حیائی سے یہ چیزیں مراد ہیں: بخل، حرص، حق سے مایوسی، اللہ کے وعدوں میں شک، اس کی نعمتوں کا کفران، خالق کو چھوڑ کر مخلوق پہ بھروسہ، ترک قناعت اور حب دنیا۔ جبکہ اللہ تمہیں وعدہ دیتا ہے کہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے تمہیں اگلے جہان میں بخشش اور اس جہان میں وسعت رزق سے نوازا جائے گا۔

[346] صدقات وخیرات کے ذکر میں علم وحکمت کا بیان لایا گیا تا کہ یہ سبق ملے کہ دولتِ علم وحکمت کا راہِ حق میں لٹانا مالی صدقات کے لٹانے سے اہم تر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہاں حکمت سے علمِ قرآن مراد ہے۔ ابن زید کے نزدیک اس سے دین کی سمجھ مراد ہے۔ ربیع بن انس اس سے خشیتِ الٰہی مراد لیتے ہیں۔ امام اسماعیل حقی فرماتے ہیں کہ حکمت وہ نور ہے جو اللہ کی طرف سے دل میں روشن ہوتا ہے۔ یہ دلائل و براہین سے نہیں آتا، اس کا ثمرہ اتباع رسول ہے ۔تاہم یہ سارے اقوال باہم قریب تر ہیں۔

[347] یعنی مال اور علم وحکمت کا نیک ثمرہ عقل سلیم والوں ہی کو ملتا ہے۔ مَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا سے پتہ چلا اہل علم کو مالداروں کی چاپلوسی نہیں کرنی چاہیے ان کے پاس موجود دولت علم وحکمت دنیوی مال و دولت سے کہیں قیمتی اور اعلیٰ ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب یہ شعر کیا خوب ہے۔

رَضِيۡنَا قِسۡمَةَ الۡجَبَّارِ فِيۡنَا لَنَا عِلۡمٌ وَ لِلۡجُهَّالِ مَالُ

فَاِنَّ الۡمَالَ يَفۡنِىۡ عَنۡ قَرِيۡبٍ وَ اِنَّ الۡعِلۡمَ بَاقٍ لَا يَزَالُ

یعنی ہم خدائے جبار کی اس تقسیم پر بہت خوش ہیں کہ ہمارے لیے علم ہے اور جہلاء کے لیے مال۔ بے شک مال عنقریب ختم ہو جائے گا اور بے شک علم باقی ہے اسے زوال نہیں، لہٰذا علماء کو نہیں چاہیے کہ وہ دولت مندوں کو دیکھ کر احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں یا وہ دولت والوں کی چاپلوسی کریں۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا
اور تم (راہ خدا میں) جو خرچ کرو یا کوئی نذر مانو تو اللہ اسے جانتا ہے اور ظالموں کا
لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۞ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ
کوئی مددگار نہیں۔ [348] اگر تم صدقات کو ظاہر کرو تو وہ کیا ہی خوب ہے اور اگر
تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ
انہیں چھپاؤ اور (چھپ کر) فقراء کو دو تو وہ تمہارے لئے بہت اچھا ہے [349] اور اللہ تمہارے گناہ مٹا دے گا
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۞
اور اللہ تمہارے اعمال سے خبردار ہے۔[350]

[348] یعنی راہ خدا میں تم جو خرچ کرو یا اللہ تعالیٰ کے لیے نذر مانو تو اللہ کو معلوم ہے وہ اس کی جزا دے گا۔ضروری نہیں کہ تم لوگوں کو مطلع کرو کہ تم نے یہ خرچ کیا ہے۔نذر کا معنی یہ ہے کہ آدمی کہے اے اللہ اگر میرا یہ مقصد بر آئے تو میں تیری راہ میں اتنا مال دوں گا، اتنے روزے رکھوں گا یا اتنے نوافل پڑھوں گا یا کوئی شخص مطلقاً اللہ کی رضا کے لیے کسی عبادت کو خود پہ لازم کر لے تو یہی نذر ہے۔ایسا کہنے سے وہ مال، روزے یا نوافل واجب ہو جاتے ہیں۔یاد رہے کہ نذر صرف اللہ رب العزت کے لیے ہے غیر خدا کے لیے نذر حرام ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے آداب

[349] گزشتہ رکوع میں وضاحت کی گئی کہ دکھلاوے سے صدقہ خیرات برباد ہو جاتے ہیں اب بتایا جا رہا ہے کہ دکھلاوے سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔فرمایا کہ اپنی نیت ٹھیک کر لو۔کیونکہ نیت کے مطابق ہی آخرت میں جزا و سزا ہو گی ،اگر تم اس نیت سے صدقہ ظاہر کر کے لوگوں کو دکھا کر دو کہ دوسروں کو بھی رغبت ہو تو یہ بھی خوب ہے بلکہ تمہیں دیکھ کر دوسرے لوگوں نے جو صدقات دیے ان کا ثواب بھی تمہیں حاصل ہوا۔حدیث پاک میں ہے: اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ، یعنی نیکی کی طرف راہنمائی کرنے والا اسی طرح ہے جیسے نیکی کرنے والا۔اور اگر تم چھپا کر حاجت مندوں کو خیرات دو تا کہ تمہارے دل میں دکھاوا نہ آئے اور حاجتمند کی عزت بھی رہ جائے تو یہ اس سے بھی بہتر ہے۔الغرض اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔

[350] یعنی راہِ خدا میں صدقہ وخیرات سے گناہ مٹائے جاتے ہیں۔ کیونکہ جو اللہ کی مخلوق پر رحم کرے اللہ اس پر رحم فرماتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے ایک فاحشہ عورت نے پیاسے کتے کو پانی پلایا اور اس کی جان بچالی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بخشش فرمادی۔ (مسلم) جب کتے سے بھلائی کرنے کا یہ اجر ہے تو انسانوں سے بھلائی کا کیا مقام ہوگا۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ

(اے سننے والے!) تجھ پر ان کی ہدایت لازم نہیں مگر اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے [351] اور تم جو بھلائی خرچ کرو

خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ

وہ تمہارے اپنے ہی فائدہ کے لئے ہے اور تم جو بھی خرچ کروگے وہ اللہ کی رضا ہی کے لئے ہوگا [352] اور تم جو بھلائی خرچ کرو

خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ

وہ تمہیں واپس لوٹائی جائے گی اور تم پر کچھ زیادتی نہ ہوگی۔ [353] ان حاجتمندوں کے لئے (خرچ کرو) جو اللہ کی راہ میں

سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ

روکے گئے ہیں وہ زمین میں (بغرض تجارت) چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے، ناواقف آدمی انہیں ان کی قناعت کے سبب

اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ

مالدار سمجھتا ہے [354] آپ انہیں ان کے چہروں (کی بھوک) سے پہچانتے ہیں، وہ پیچھے پڑ کر لوگوں سے نہیں مانگتے

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ ع

اور تم جو بھلائی خرچ کرو تو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ [355]

[351] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار صحابہ کے رشتہ دار غریب یہود تھے۔ وہ انہیں صدقہ نہیں دیتے تھے کہ پہلے وہ مسلمان ہوں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مبارکہ اتاری: لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ (تفسیر ابن جریر جلد ۳ صفحہ ۶۳) یعنی اللہ نے فرمایا اے سننے والے مومن تمہارے ذمہ کفار کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہے۔ وہ تو اللہ جسے چاہے ہدایت دے لہٰذا غیر مسلم غربا کو صدقہ دینے سے ہاتھ نہ کھینچو بلکہ انہیں نوازو تاکہ وہ مسلمانوں کی اعلیٰ ظرفی سے متاثر ہوکر اسلام لائیں۔

کفار کو نفلی صدقات کا دینا جائز ہے:

یاد رہے زکوٰۃ اور اس جیسے دیگر صدقات واجبہ کفار کو دینا جائز نہیں ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''زکوٰۃ غنی مسلمانوں سے لی جائے اور غریب مسلمانوں کو دی جائے۔'' (بخاری کتاب الزکوٰۃ) جبکہ دیگر صدقات و خیرات جو نفل ہوں اس آیت کے مطابق کفار کو دینا جائز ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پہلے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اپنے دین والوں کے علاوہ کسی پہ صدقہ نہ کرو۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰهُمۡ یعنی ان کو ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ تب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تصدّقوا علی اهل الادیان کلها، تمام اہل ادیان پر صدقہ کرو۔ (مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الزکوۃ جلد ۳ صفحہ ۷۴ مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میری والدہ مکی دور میں میرے پاس آئی وہ مجھ سے کچھ رغبت رکھتی تھی، (مالی مدد چاہتی تھی) میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اصِلُها، کیا میں اس کی مدد کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں کرو۔ (احکام القرآن للجصاص جلد دوم جلد ۲ صفحہ ۱۷۰)

اسلام رواداری کا مذہب ہے:

اسلام تمام نسلِ انسانی کی فلاح، اخوت اور محبت و پیار کا مذہب ہے اور مسلم و غیر مسلم سب پر شفقت کرنا اور انہیں نوازنا سکھاتا ہے۔ لہٰذا اسے دہشت گردی اور انتہاء پسندی کا طعنہ دینا سراسر کذب و افتراء اور الزم تراشی ہے۔ دراصل یہود و نصاریٰ نے عراق، افغانستان، پاکستان اور فلسطین و کشمیر میں مسلمانوں کی جو خونریزی شروع کر رکھی ہے، اس پہ پردہ ڈالنے کے لیے وہ مسلمانوں کو دہشت گردی کا طعنہ دیتے ہیں۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں۔ صحابہ نے غریب یہود کو صدقہ دینے سے ہاتھ کھینچا تا کہ وہ مجبور ہو کر اسلام لائیں تو اللہ نے لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰهُمۡ کہہ کر ایسا کرنے سے روک دیا۔ اسی لیے فرمایا گیا: لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ

یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کا اعلیٰ اخلاق ہی کفار کے لیے اعلیٰ تبلیغ ہے۔ کفار کو نفلی صدقات دے کر انہیں گرویدۂ اسلام کرنے کی رغبت دی گئی گویا زبانی تبلیغ کے ساتھ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کر کے عملی تبلیغ سے غیر مسلموں کو زیادہ متاثر کیا جا سکتا ہے۔

اس میں ان مسلمانوں کے لیے خوبصورت درس عمل ہے جو یورپین ممالک، امریکہ اور کنیڈا وغیرہ میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے حسن خلق اور اپنے مالی انفاق کے ذریعہ اپنے غیر مسلم پڑوسیوں اور دوستوں میں اسلام کی روشنی پھیلا سکتے ہیں۔

آج کہا جاتا ہے کہ اسلام کو تلوار کے ذریعہ زبردستی پھیلایا گیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ہاں اسلام تلوار سے پھیلا ہے، مگر وہ لوہے کی تلوار سے نہیں پھیلا بلکہ حسن اخلاق کی تلوار سے پھیلا ہے، علمار بانیین اور اولیا کاملین کے پاس اخلاق مصطفیٰ ﷺ کی تلوار تھی جس نے لاکھوں انسانوں کے دل فتح کیے، جہاد کی تلوار مسلمانوں نے ہمیشہ اس وقت ہی اٹھائی جب اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ

اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے جو تم سے نہ لڑیں نہ تمہیں تمہارے علاقوں سے نکالیں، منع نہیں کرتا کہ تم ان سے بھلائی کرو۔ (الممتحنہ، ۸)

[352] یعنی تم راہ خدا میں جو خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے ہی بھلے کے لیے ہے تو پھر گھٹیا مال دینے کا کیا معنی۔ گھٹیا مال دو گے تو اجر بھی ویسا ہی ملے گا۔ یونہی اس پر احسان جتلانا بھی بے معنی ہے بھلا اپنا فائدہ کر کے کسی پر احسان کیا معنی۔ مگر یہ گفتگو اسی صورت میں ہے جب تم اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرو۔ اگر مقصد یہ نہ ہو تو پھر اس گفتگو کا موقع نہیں۔

[353] اے مومنو تم راہ خدا میں جو بھی خرچ کرو خواہ وہ مال ہو یا کوئی اور نعمت، روز قیامت اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا کوئی کمی نہ چھوڑی جائے گی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ (توبہ، ۱۲۰)

[354] یعنی اے مسلمانو تمہارے صدقات کے زیادہ مستحق وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ کی راہ میں حصول علم دین یا جہاد کے لیے روک لیا گیا ہے، وہ کوئی کاروبار نہیں کر سکتے کیونکہ انہوں نے خود کو دین کے لیے وقف کر رکھا ہے۔

اصحابِ صفہ کی فضیلت اور ان کا تعارف:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت اصحابِ صفہ کے حق میں اتری۔ مدینہ طیبہ میں ان کا کوئی گھر یا قبیلہ نہ تھا۔ (درمنثور)

بعض روایات کے مطابق یہ ان مجاہدین کے لیے اتری جو جہاد کے لیے نکلے ہوں اور یوں وہ تجارت سے معذور ہو گئے ہوں۔ مگر ان دونوں اقوال میں تضاد نہیں کیونکہ اصحاب صفہ یا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدین یہ سب لوگ اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں۔ ان کے پاس تجارت کے لیے وقت نہیں۔ اصحاب صفہ نے خود کو تعلیم دین کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ دور دراز علاقوں سے آکر حصول تعلیم دین کے لیے مسجدِ نبوی میں قیام پذیر تھے۔ وہ حضور ﷺ سے قرآن وحدیث سیکھتے اور غزوات میں اگلی صفوں میں کھڑے ہو کر لڑتے۔

یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے۔ ان کے حجرات مبارکہ میں پانی بھرتے اور رسول اللہ ﷺ سے قرآن کریم حفظ کرتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر بے سروسامان تھے مگر ان کے سینے عشق

الٰہی، محبت رسول اور جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔

گویا یہ حضور ﷺ کی کل وقتی اسلامی فوج تھی۔ ابو ہریرہ، عمار بن یاسر، صہیب رومی، سلمان فارسی، بلال حبشی، ابو ذر غفاری، حاطب بن ابی بلتعہ اور دیگر مہاجرین رضی اللہ عنہم ان میں شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کے حال سے ناواقف آدمی انہیں مالدار سمجھتا ہے کیونکہ وہ کسی سے مانگتے نہیں۔ اپنی بھوک اپنے اندر دبائے پھرتے ہیں، مگر اے سننے والے تو ان کے زرد چہرے دیکھ کر پہچان سکتا ہے کہ بھوک نے ان کی کیا حالت کر دی ہے۔

ان لوگوں کے اخلاص کی گواہی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمائی، کیونکہ ان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ الله، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ کی راہ میں روکا گیا ہے۔

معلوم ہوا ان کا رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر مسجد نبوی میں قیام پذیر ہونا اور دین سیکھنا کسی دنیوی مقصد کے لیے نہ تھا۔ یہ لوگ محض اور محض اللہ کی رضا کے لیے اپنا گھر بار، اپنا خاندان اور اپنی دنیا کے تمام معاملات کو چھوڑ کر غریب الوطنی اور سفر کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے حصول تعلیم کے سفر کی اسلام میں بنیاد رکھی، لہٰذا جتنے لوگ تا قیامت ایسا سفر اختیار کریں گے ان کے اجر و ثواب میں اہل صفہ کا حصہ شامل رہے گا، کما لا یخفی علی عاقل فاهم

ابو نعیم نے حلیہ میں فضالہ بن عبید سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھاتے تو کئی لوگ دورانِ قیام گر پڑتے تھے، بھوک کی وجہ سے اور وہ اہل صفہ تھے (درمنثور جلد ۲ صفحہ ۸۹)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملت اسلامیہ کی اٹھان ظاہری مالی اسباب کے لحاظ سے کیسی تنگی کی حالت میں اٹھائی گئی، نبی اکرم ﷺ کے پاس ان ستر افراد کے سوا کوئی مستقل فوج نہ تھی جو ہمہ وقت لڑائی کے لیے تیار رہے اور ان ستر افراد کے پاس بھی کوئی اسلحہ و سامان ضرب کی کثرت نہ تھی۔ بس یہ مسافرین پہ مشتمل ایک جماعت تھی مگر ان کی قوت ایمانی نے بڑی بڑی سلطنتوں کے برج الٹ کر رکھ دیے۔ اسی لیے علامہ اقبال رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

[355] حضرت فضالہ بن سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نماز پڑھاتے اور بعض اصحاب صفہ بھوک کی وجہ سے زمین پر گر پڑتے تھے حتیٰ کہ بعض دیہاتی انہیں پاگل سمجھتے۔ (درمنثور عن حلیۃ الاولیاء)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ لوگ کسی کے پیچھے پڑ کر نہیں مانگتے یعنی اول تو مانگتے ہی نہیں۔ مانگیں بھی تو پیشہ ور بھکاریوں کی طرح پیچھے نہیں پڑتے بس اشاروں کی زبان سے مانگ لیتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں میں نے ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک آیت جس میں کھانا کھلانے کا حکم تھا، کی تفسیر پوچھی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے ساتھ لے جائیں اور کچھ کھلا دیں۔ (بخاری)

بھیک مانگنے کی مذمت:

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط سے پیشہ ور بھکاریوں کی برائی معلوم ہوئی، جو پیچھے پڑ کر مانگتے ہیں اور کچھ لیے بغیر جان نہیں چھوڑتے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ایک آدمی (بلاضرورت) مانگتا رہتا ہے حتیٰ کہ روزِ قیامت وہ یوں اٹھے گا کہ اس کے منہ پر گوشت کا ایک ذرہ نہ ہوگا۔ (بخاری کتاب الزکوٰۃ عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما)

ابن حبان نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''ایک شخص میرے پاس آتا ہے، مجھ سے (بلاضرورت) مانگتا ہے، میں اسے دیدیتا ہوں، وہ چلا جاتا ہے اور اس نے اپنے برتن میں (جہنم کی) آگ سے سوا کچھ نہیں بھرا ہوتا۔ (درمنثور جلد ۲ صفحہ ۹۸)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من سئل الناس اموالھم تکثّرًا فانما یسئل جمرا فلیستقل او لیستکثر۔ ''جس نے مال اندوزی کے لیے لوگوں سے مانگا وہ انگارے ہی جمع کرتا ہے تھوڑے کر لے یا زیادہ۔'' (مسلم کتاب الزکوٰۃ حدیث ۱۰۵)

پیشہ ور بھکاریوں کو کچھ دینا گناہ ہے

معلوم ہوا پیشہ ور بھکاریوں کو کچھ نہیں دینا چاہیے۔ انہیں کچھ دینا ان کے جرم میں مددگار بننے کے مترادف ہے، اور گناہ میں مدد کرنے والا بھی ویسا ہی گناہگار قرار پاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ط ''جو شخص برے کام میں مدد کرے اس پر اس سے بوجھ آئے گا۔'' (نساء، ۸۵) اور یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص محنت مزدوری کر کے دن کی روزی کما سکتا ہے اس کے لیے مانگنا حرام ہے اور ایسے شخص کو کچھ دینا بھی حرام ہے۔ (درمختار)

حرمین شریفین میں لوگوں کو لوٹنے والے بھکاری

کچھ عرصہ ہوا میں عمرہ شریف پہ گیا۔ ایک باشرع شخص کعبۃ اللہ کے سامنے میرے پاس آیا اس نے احرام پہن رکھا تھا، کہنے لگا میں دوبئی سے آیا ہوں میرا جیب کٹ گیا ہے، میری مدد کریں۔ ہم نے اسے قریباً پچاس ریال دیدیے، وہ کافی زیادہ مانگ رہا تھا۔ دوسرے دن پھر ہم کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھے تھے، وہی شخص پھر آ گیا۔ اس نے وہی کہانی سنانا شروع کر دی۔ میرے بیٹے نے اسے پہچان لیا اور کہا تم تو کل بھی یہی کہانی سنا رہے تھے تو اس نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام اپنی مدد آپ کے تحت جینا سکھاتا ہے۔ یعنی اس آیت سے یہ درس ملا کہ کسی سے مانگنے کی بجائے مومن کو اپنے ہاتھ سے کما کر کھانا چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو مجھے ضمانت دے کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگے گا میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں ضمانت دیتا

ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ راوی کہتا ہے اس کے بعد اگر حضرت ثوبان کا عصا ان کی سواری سے گر پڑتا تو وہ خود اتر کر اٹھاتے کسی سے اس کے تھمانے کا سوال نہ کرتے۔'' (ابن ماجہ کتاب الزکوٰۃ)

دورِ حاضر کے دینی مدارس اس آیت کا بہترین مصداق ہیں:

الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ کی عملی تفسیر دورِ نبوی میں اصحابِ صفہ تھے اور دورِ حاضر میں دینی مدارس کے طلباء ہیں۔ یہ ہماری زکوٰۃ وعشر فطرانہ اور دیگر نفلی صدقات کا بہترین مصرف ہیں۔ ان کی خدمت کرنے میں انفاق فی سبیل اللہ کے علاوہ خدمت قرآن، اشاعت اسلام اور ترویج علم دین کا ثواب بھی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں مسجد نبوی بنائی وہاں اس کے ساتھ ایک دینی مدرسہ بھی بنایا، جس میں اصحاب صفہ زیر تعلیم تھے۔ جو عرب کے مختلف علاقوں سے دین سیکھنے کے لیے اس مدرسہ میں آ کر ٹھہرے ہوئے تھے اور تعلیم حاصل کر رہے تھے جیسا کہ آج دینی مدارس میں ملک کے مختلف حصوں سے آ کر غریب لوگ ٹھہرتے اور دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

آج برصغیر ہندوپاک میں اسلام کی ترویج واشاعت میں ان دینی مدارس کا بہت اہم کردار ہے۔ یہ مبلغین اسلام کی چھاؤنیاں ہیں، جہاں سے علمائے اسلام، مبلغین دین، حفاظ وقرآئے قرآن تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ اور دنیا کے کونے کونے میں علم دین کا نور پھیلانے کے لیے مصروف عمل ہو جاتے ہیں۔ آج لاکھوں مسجدوں میں علماء وائمہ تبلیغِ دین کا کام کر رہے ہیں۔ یہ علماء مدارسِ دینیہ سے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ مدارس نہ ہوں تو مسجدوں کا نظام کیسے چلے اور اقامت صلوٰۃ کا نظام کیسے قائم ہو۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ

جو لوگ اپنے اموال (راہِ خدا میں) رات دن خفیہ و اعلانیہ خرچ کرتے ہیں ان کے لئے ان کے

اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

رب کے ہاں ان کا اجر ہے ان پر کچھ خوف نہیں نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ [356]

وقف منزل

[356] یعنی مسلمان کو چاہیے کہ وہ راہ خدا میں خرچ کرنے کو ہر وقت مستعد رہیں۔ دن ہو یا رات خواہ خفیہ خرچ کرنا پڑے یا علانیہ اور وہ جو خرچ کریں ان کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے اور یہی وہ اللہ کے دوست ہیں جن پر دنیا میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں اور روز قیامت چونکہ ان کے لیے جنت منتظر ہے لہٰذا وہاں انہیں غم نہ ہوگا کیونکہ وہ غم کی جگہ نہیں ہے بلکہ وہ مقام مسرت ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ

جولوگ سود کھاتے ہیں وہ (روزِ قیامت) کھڑے نہ ہوسکیں گے مگر اس آدمی کی طرح جسے جن بھوت نے چھوکر خبطی کردیا ہے [357]

مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ

یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے کہا: خرید وفروخت بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ

قرار دیا ہے [358] تو جس کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ باز آگیا تو وہ جو سود پہلے کما چکا وہ اسی کا ہے

وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو (سود کی طرف) پھر لوٹا تو یہ لوگ دوزخ والے ہیں جو اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ [359]

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

اللہ سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی کافر گناہگار کو پسند نہیں فرماتا۔ [360]

حرمت سود اور سود کا اخروی عذاب اور دنیوی وبال

[357] گزشتہ دو رکوعات میں صدقہ کے فضائل و مسائل بتائے گئے ہیں اور عربی محاورہ ہے: تُعْرَفُ الْاَشْيَآءُ بِاَضْدَادِهَا ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ روشنی کی قدر اندھیرے سے معلوم ہوتی ہے اور خوشبو کا مفہوم بدبو کے سامنے آنے ہی سے واضح ہوسکتا ہے۔ اس لیے صدقہ کے بعد سود کا ذکر لایا گیا کہ یہ صدقہ کی ضد ہے۔ صدقہ یہ ہے کہ حاجت مندوں کو اپنی طرف سے کچھ دو اور بدلے میں کچھ نہ لو اور سود یہ ہے کہ حاجت مندوں سے ان کی متاع حیات چھین لو اور بدلے میں کچھ نہ دو۔ اسی لیے فرمایا گیا يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ

تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سود خور لوگ روز قیامت دیوانوں کی طرح کھڑے ہوں گے جیسے کسی پر جنات کا سایہ ہو اور وہ دیوانہ ہو کر جھولتا پھرے۔ یہی معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (درمنثور جلد دوم صفحہ ۱۰۲) یونہی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سود کھانے والا قیامت کے دن دیوانے کی صورت میں اٹھے گا کبھی دائیں گرے گا کبھی بائیں، پھر آپ نے یہی آیت مبارکہ پڑھی: لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ الخ'' (درمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۰۲) گویا اللہ تعالیٰ سود خوروں کو روز قیامت سب کے سامنے رسوا کرے گا وہ دنیا میں مال

حرام کے پیچھے پاگل ہو گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں قیامت میں حقیقی پاگل بنا دے گا اور سیدھے کھڑے ہونے کی بجائے دیوانوں کی طرح جھولتے پھریں گے۔

جنات کے چھونے سے انسان کو بیماریاں لگ سکتی ہیں:

اَلَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ سے پتہ چلا جنات کا سایہ کسی انسان پہ ہو جانا جس سے اسے دیوانگی ہو جائے ممکن ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ امت کی تعلیم کے لیے یہ دعا فرماتے تھے: وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ یَّتَخَبَّطَنِیَ الشَّیْطَانُ ''اے اللہ میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان مجھے دیوانہ کر دے۔'' (ابوداؤد باب الوتر) خون استحاضہ کے بارے میں آپ نے فرمایا: هٰذِهٖ رَكْضَةٌ مِنْ رَكَضَاتِ الشَّیْطَانِ ''یہ شیطان کے انگشت چھونے کی وارداتوں سے ایک واردات ہے (یعنی شیطان عورت کے رحم میں انگشت چبھو کر خون جاری کر دیتا ہے)۔'' (ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب ۱۱۹ حدیث ۲۸۷) یہ حدیث بھی بتا رہی ہے کہ شیطان انسانوں کو چھو کر ان میں بیماریاں اور تغیرات پیدا کر سکتا ہے۔

بعض معاصر اردو مفسر کہتے ہیں کہ شیطان کے چھونے سے انسان میں کوئی جسمانی تغیر نہیں آ سکتا اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی اور روح انسان پہ غالب آ جائے اور اس میں تصرف کرے، اگر ایسا ممکن ہو تو کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرنے کے بعد کہہ سکتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھ پہ اس وقت کسی روح کا اثر تھا، اس نے مجھ سے یہ قتل کروا دیا۔ مگر یہ دلیل کمزور ہے۔ جب ایک شخص کسی کو قتل یا زخمی کرے گا تو وہی قصاص کا ذمہ دار ہوگا، خواہ اس سے وہ حرکت کسی شیطان کے چھونے سے صادر ہوئی ہو۔ اس پہ یہ حدیث مبارکہ دال ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لَا یُشِیْرُ اَحَدُكُمْ عَلٰی اَخِیْهِ بِالسَّلَاحِ فَاِنَّهٗ لَا یَدْرِیْ لَعَلَّ الشَّیْطَانَ یَنْزِعُ فِیْ یَدِهٖ فَیَقَعُ فِیْ حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ ''تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی پہ اسلحہ نہ اٹھائے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ ممکن ہے شیطان اس کے ہاتھ کو ہلا دے اور یوں وہ جہنم میں جا پڑے۔'' (بخاری کتاب الفتن باب ۷ حدیث ۷۰۷۲) تو جو شیطان انسان کے ہاتھ پہ تصرف کر سکتا ہے وہ اس کے سارے جسم پہ بھی تصرف کر سکتا ہے مگر حدیث کے مطابق ایسی صورت میں انسان ہی ذمہ دار ہوگا۔

صالحین کے چھونے سے برکت ہو سکتی ہے:

جب شیطان کے ہاتھ لگانے سے دیوانگی اور بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں تو اللہ کے نیک بندوں کے چھونے سے شفا بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ میں مادر زاد اندھے کو بینا کر سکتا، کوڑھی کو شفا دے سکتا اور مردوں کو اللہ کے حکم سے زندہ کر سکتا ہوں (آل عمران، ۴۹) اسی طرح قرآن کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام کے کرتے (قمیص) سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو بینائی مل گئی۔ (سورہ یوسف، ۹۶)

[358] یہ قیامت کی ذلت سود خوروں کے نصیب میں اس لیے آئی کہ انہوں نے سود کو بیع (خرید و فروخت) پر قیاس

کر کے جائز کہا اور حرام کو حلال قرار دیا۔ یعنی انہوں نے کہا کہ جیسے بیع میں انسان مثلاً ایک چیز سو روپے میں خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دیتا ہے یونہی سود میں انسان اصل قرض کے ساتھ کچھ زائد رقم وصول کرتا ہے۔ مثلاً سو روپے دے کر ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے، لہٰذا بیع اور سود ایک جیسے ہیں۔

سود کو بیع پر قیاس کر کے اسے جائز قرار دینے کا رد:

حالانکہ یہ قیاس غلط ہے۔ بیع میں انسان اپنی محنت و وقت کا بدلہ اور آرام وسکون کی قربانی کا عوض حاصل کرتا ہے، تب جا کر ایک گاہک اسے اصل رقم سے کچھ زائد دیتا ہے اور جانتا ہے کہ میں اسے اس کی محنت کے عوض اصل قیمت سے کچھ زائد دے رہا ہوں۔ جبکہ سود میں بلاعوض زائد مال لیا جاتا ہے اور قرض دینے والے کو کسی محنت یا وقت کی قربانی نہیں دینا پڑتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا۔ پھر ہر بیع حلال نہیں کہ اس پہ قیاس کر کے سود کو جائز کہا جائے۔ ہر وہ بیع حرام ہے جس میں ایک فریق ناروا شرط عائد کر دے، مثلاً ایک شخص مکان بیچ دے اور قیمت وصول کر لے اور پھر یہ شرط بھی لگائے کہ مزید ایک برس میں اس میں رہوں گا، تو یہ بیع ناجائز ہے۔ اس بیع کو توڑ دیا ناروا شرط ختم کرو، جب مفاد پرستی کی شرط سے بیع حرام ہو جاتی ہے تو سود سراپا مفاد پرستی ہے وہ کیسے حلال ہو سکتا ہے۔

بیع اور سود کی محض شکل کا بعض وجوہ سے باہم ملنا دونوں کے حلال ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ دنبہ اور خنزیر دونوں کی چار ٹانگیں، دو آنکھیں دو کان اور ایک منہ ہے تو کیا دونوں حلال ہو گئے؟ ہرگز نہیں دنبہ حلال ہے خنزیر حرام۔ کیونکہ خنزیر میں جو خباثتیں ہیں وہ دنبے میں نہیں۔ خنزیر بے حیا جانور ہے، نر نر کو استعمال کرتا ہے اور جو قومیں خنزیر کھائیں ان میں بھی یہی چیز (لواطت) آ جاتی ہے۔ آج انگریزوں کا حال ہمارے سامنے ہے انہوں نے لواطت قانوناً جائز کر دی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خنزیر کو حرام رکھا۔ یہی حال سود کا ہے وہ بظاہر شکل میں بیع کی طرح ہے مگر اس میں مخفی لالچ، خودغرضی اور انسان کشی جیسے خبائث ہیں جو اسے حرام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اسلامی معاشرہ میں لالچ، خودغرضی اور انسان کشی جیسی قباحتیں پیدا ہوں۔

سود میں یہ قباحتیں ہیں:

اول:

سود خودغرضی کا نام ہے۔ مثلاً ایک آدمی ہزار روپے کسی کو سود پہ دیتا ہے کہ بدلے میں وہ اسے گیارہ سو دیگا اور اگر تاخیر کرے گا تو سودی رقم بڑھتی جائے گی اور بسا اوقات سود بڑھتے بڑھتے اصل رقم سے زیادہ ہو جاتا ہے یعنی ایک ہزار کے اکیس سو بھی بن سکتے ہیں۔ جس نے قرض لیا اسے کاروبار میں نفع ہو یا نقصان قرض دینے والے سود خور بینک یا انسان کو اس سے کوئی واسطہ نہیں، اس نے اپنے بڑے پیٹ کو سود کے مال سے بھرنا ہے۔ یہ خودغرضی اور یہ لالچ اللہ تعالیٰ کے

ہاں حرام اور اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے اس لیے سود کو حرام کیا گیا۔

دوم:

سود ظلم ہے۔ دیکھیے اگر ایک شخص کسی کو ہزار روپے کی گائے دو ہزار روپے میں بیچتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تم سے دوگنی قیمت اس لیے وصول کر رہا ہوں کہ تمہارے ہاں یہ گائے بچے دیگی، جنہیں تم بیچ کر منافع کماؤ گے اور میں اس منافع میں سے اپنا حصہ لے رہا ہوں، تو ایسا کرنا صریح ظلم ہے کیونکہ یہ کچھ یقین نہیں کہ گائے کوئی بچہ جنے گی یا نہیں ایسے ہی سود خور انسان بھی لوگوں کو قرض دے کر اس فرضی منافع میں سے اپنا حصہ مقرر کر لیتا ہے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوا اور اس کا پیدا ہونا حتمی بھی نہیں ہے، تو کیا یہ ظلم نہیں؟

سوم:

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے انہیں چاہیے کہ غرباء کو صدقہ یا قرض حسنہ دے کر انکی مدد کریں یا انہیں مضاربت (یعنی نفع و نقصان میں شراکت) کی بنیاد پہ مال دیں، یہ غرباء کے ساتھ احسان ہے۔ جبکہ لالچی سود خور انسان غرباء کو سود پہ قرضے دے کر ان سے سود کھاتا رہتا ہے اور قرض کی اصل رقم ان بیچاروں کے سر پہ کھڑی ہی رہتی ہے، اس سے بڑی انسان کشی اور غرباء کا معاشی قتل کیا ہو سکتا ہے؟

چہارم:

سود نفرت کے بیج بوتا ہے کیونکہ یہ صریح ظلم ہے۔ یہ محبتیں کاٹتا ہے، گویا یہ خرابیوں کی جڑ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کی پریشانی میں اخلاقی اور مالی مدد کریں۔ سود کے مزید قبائح کتب تفسیر میں لکھے ہیں۔ وہاں دیکھیں۔

حرمت سود پہ چند اہم سوالات کے جوابات:

سوال اول:

دولت کو کرائے پہ دینے میں کیا حرج ہے؟ کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنی دوکان، مکان، زمین اور گاڑی وغیرہ کو کرایہ پر دیتے ہیں، ایسے ہی اگر ایک آدمی اپنی دولت کو کرایہ پر دیتا ہے تاکہ لوگ اس کی دولت سے نفع اٹھائیں اور واپس کر دیں اور ساتھ میں اسے بطور سود کرایہ دیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دوکان، مکان، یا زمین وغیرہ کا نفع یقینی ہے جو آدمی مکان کرایہ پر لے گا وہ اس میں رہائش رکھے گا، گرمی سردی سے بچے گا وغیرہ۔ مگر دولت کا نفع یقینی نہیں۔ جو آدمی قرض اٹھا کر کاروبار کرتا ہے اسے کچھ یقین نہیں کہ اسے کاروبار میں نفع ہوگا یا نقصان، ہو سکتا ہے نفع کی بجائے شدید نقصان ہو جائے۔ اس نے قرض اٹھا کر جو مال خریدا ممکن ہے وہ نہ بکے یا لوگ خرید تو لیں مگر قیمت دبا لیں یا مال ضائع ہو جائے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سود کو مکان وغیرہ کے کرایہ پر قیاس کر کے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا، لہٰذا مقروض سے صرف اصل قرض ہی واپس لیا جائے یا اسے نفع و نقصان

میں شریک کرلیا جائے۔

سوال دوم:

آٹھ دس فیصد معین نفع کوئی سود نہیں ہے، یعنی بعض جہلاء کہتے ہیں کہ آج کل بینکوں والے ایک سو کے بدلے ایک سو سات یا ایک سو آٹھ واپس لیتے ہیں، یہ تو کچھ زیادہ نہیں ہے۔ سود تو یہ ہے کہ ڈبل یا ڈیڑھ گنا وغیرہ رقم واپس لی جائے، یعنی ایک سو کے بدلے دو سو یا ڈیڑھ سو لیا جائے۔ مگر یہ بالکل فضول بات ہے۔ جب بھی نفع مقرر کردیا جائے کہ اتنا ضرور لینا ہے خواہ قرض لینے والے کو نفع ہو یا نہ۔ تو یہی سود ہے، خواہ وہ ایک فی صد ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ لالچ اور خودغرضی کا طریقہ ہے۔ ممکن ہے اس بیچارے کو ایک فی صد بھی نفع نہ ہو بلکہ بہت سا نقصان ہو جائے۔ اس کے جواز کی یہی صورت ہے کہ قرض دینے والا نفع و نقصان دونوں میں ساتھی بنے، یہی انسانیت ہے۔

سوال سوم:

آج سود کے بغیر کوئی چارہ نہیں، یعنی کہا جاتا ہے کہ آج ساری دولت کفار کے پاس ہے۔ امریکہ و یورپین ممالک غریب ملکوں کو سود پہ قرضے دیتے ہیں تو آگے انہیں بھی اپنے لوگوں کو سود پہ قرضے دینا پڑتے ہیں۔ یوں مسلمان مجبور ہیں ، کہ سود نہ لیں دیں تو کدھر جائیں؟ مگر یہ عذر لنگ اور باعثِ ننگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اکثر عرب مسلم ممالک کو تیل کی دولت سے مالا مال کیا ہے انہیں چاہیے کہ اپنی دولت امریکہ و یورپ کے بینکوں میں رکھنے کی بجائے اپنے مسلم بینک یا عرب بینک بنائیں، وہاں اپنی دولت رکھیں اور غریب مسلم ممالک کو بلا سود قرضے دیں تاکہ تمام مسلم ممالک سود کی لعنت سے آزاد ہو سکیں۔

سوال چہارم:

بینکوں کا تجارتی سود جائز ہے، یہ دور نبوی میں نہیں ہوتا تھا۔ یا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زمانہ نبوی میں تجارتی سود نہیں ہوتا تھا، یعنی قرض لے کر کاروبار کرنے کا تصور اس وقت نہیں تھا۔ بس بیمار لوگ اپنے کھانے پینے یا بیماری کے علاج وغیرہ کے لیے سود پہ قرض لیا کرتے تھے اور اسی کو قرآن نے حرام کہا ہے۔ رہا وہ سودی قرض جو امیر لوگ کاروبار کے لیے لیتے ہیں یہ دور نبوی میں تھا ہی نہیں۔

مگر یہ بھی قطعی غلط بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تجارتی سود نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں بھی مروّج تھا اور اسی کی حرمت پہ اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات نازل فرمائیں۔ چنانچہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب کوئی شخص وقت پہ قرض واپس نہ کرسکتا تو وہ قرض خواہ سے کہتا مجھے مزید مہلت دیدو میں تمہارے لیے مال میں اضافہ کردیتا ہوں (مثلاً میں ایک ہزار کی بجائے گیارہ سو دوں گا) انہیں کہا جاتا کہ یہ تو سود ہے، تو وہ کہتے: یہ تو اسی طرح ہے جیسے ہم بیع میں نفع لیتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے مال کا نفع لیتے ہیں، (قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا م) تو اللہ تعالیٰ نے اس کی حرمت پہ یہ

آیت اتاری اور فرمایا: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط (تفسیر ابن ابی حاتم جلد ۲ صفحہ ۵۴۵، حدیث ۲۸۹۱ مطبوعہ مکہ مکرمہ)

امام ابن جریر نے یہی حدیث حضرت مجاہد سے روایت کی ہے (جامع البیان جلد ۳ صفحہ ۶۷ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) اور حضرت سدی سے مروی ہے کہ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ اور بنی مغیرہ کے ایک آدمی کے درمیان تجارتی شراکت تھی، وہ دونوں بنی ثقیف کے لوگوں کو سود پہ قرضے دیتے تھے، تب اسلام آ گیا اور ان کے پاس بہت سا سودی مال جمع تھا۔ تب اللہ نے یہ آیت اتاری: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا

(تفسیر ابن ابی حاتم جلد ۲ صفحہ ۵۴۸ حدیث ۲۹۱۳)

ان صریح روایات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ اہل عرب دور نبوی میں تجارتی سود سے متعارف نہ تھے۔ لہٰذا بینکوں کا تجارتی سود بھی حرام ہے بلکہ اسی کے بارے میں آیات حرمت سود کو نازل فرمایا گیا۔ پھر یہ کس کو معلوم نہیں ہے کہ دور نبوی میں اہل مکہ کی اکثریت تجارت پیشہ تھی، وہ شام و یمن سے مال خرید کر لاتے اور بازار عکاظ وذو المجاز میں فروخت کیا کرتے تھے۔ اسی بارے میں رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۞ الخ کی آیات اتریں، یعنی وہ سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام جاتے تھے، ایسے میں انکا سودی قرضوں پہ کاروبار کرنا عین قرین قیاس ہے۔

کاروباری سود کی حرمت اس لیے بھی ہے کہ مثلاً ایک آدمی یا ایک بینک بہت سے لوگوں سے رقمیں سود پہ جمع کر کے ایک کاروبار میں لگاتا ہے۔ اب اگر وہ ناکام ہوا تو سب کی رقمیں ڈوب گئیں اور سب کا نقصان ہو گیا۔ اگر وہ کامیاب ہوا تو وہ دولت کے پر لگا کر ہواؤں میں اڑنے گا اور دوسرے لوگ زمین پہ کھڑے اس کا منہ دیکھ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں۔ اسے چاہیے کہ مضاربت کی شکل میں سب کو نفع و نقصان میں شریک کرے۔ الغرض سودی نظام خود غرضی کا نظام ہے، جس میں انسانی ہمدردی کے جذبات کچل دیے جاتے ہیں۔

[359] یعنی جب حرمتِ سود کا حکم اتر آیا۔ اب جو شخص اسے سن کر آئندہ سود کھانے سے باز آ گیا تو اس نے جو پہلے سود کھالیا اس پر کوئی پکڑ نہیں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کے آئندہ عمل کو دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا جو آئندہ بھی سود کھائے اور وہی بات کہے کہ بیع اور سود دونوں ایک جیسے ہیں تو ایسے لوگ کافر اور دوزخی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

[360] اللہ تعالیٰ سود کو یوں مٹاتا ہے کہ سود خوروں کو ایک طرف سے فائدہ تو دوسری طرف سے نقصان ہو جاتا ہے یا بیماری و پریشانی آ گھیرتی ہے جس سے سکون برباد ہو جاتا ہے اور دولت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ نعمت وہ ہوتی ہے جو انسان کو سکون دے جو پہلا سکون بھی چھین لے وہ نعمت نہیں نقمت و زحمت ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگ بینکوں سے سودی قرض لے کر لمبے چوڑے کاروبار شروع کرتے ہیں چند دن دولت کی ریل پیل نظر آتی ہے پھر کاروبار بیٹھ جاتا ہے اور بینک والے فیکٹری یا کارخانہ واپس چھین لیتے ہیں اور جتنا مال سودی اقساط میں قبل ازیں دیا وہ سب برباد جاتا ہے یوں وہ پہلے سے بھی تنگ دست ہو جاتے ہیں۔

یہ حال تو سودی قرض لینے والوں کا ہے۔ یونہی سودی قرض دینے والے کئی بینک اور افراد بھی دیوالیہ ہو جاتے ہیں

کیونکہ لوگ ان سے لاکھوں کروڑوں کے قرضے لے کر بینک کرپسی شو کر دیتے اور قرضے معاف کروا لیتے ہیں۔ یعنی بتا دیتے ہیں کہ ان کا کاروبار ٹھپ ہو گیا ہے لہٰذا وہ قرض واپس نہیں کر سکتے، یوں بینک کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔ یورپ و امریکہ میں بھی ایسا ہوتا رہتا ہے۔

اور یہ کہنا غلط ہے کہ یورپ و امریکہ کی معیشت سود پہ مبنی ہونے کی وجہ سے ترقی کر رہی ہے۔ نہیں بلکہ وہاں لوٹ گھسوٹ کی گرم بازاری نہیں ہے اور دولت چند افراد کے ہاتھ میں جمع نہیں ہوگئی، بلکہ سب کو کاروبار کے یکساں مواقع میسر ہیں ان بنیادوں پہ ان کی معیشت ترقی کر رہی ہے۔ جبکہ سود ان کے لیے بھی پریشانی کا باعث ہے۔ وہاں بھی سود کے خلاف آوازیں اٹھتی رہتی ہیں اور وہاں بھی کئی سوسائٹیاں بن رہی ہیں جو بلا سود قرضے مہیا کر رہی ہیں۔

جبکہ اللہ تعالیٰ صدقات سے رزق بڑھاتا ہے اور خود صدقہ کا ثواب اللہ کے ہاں بڑھتا رہتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے ایک کھجور صدقہ کی اللہ اسے بڑھاتا رہتا ہے جیسے تم اپنے چھوٹے جانور کو پال پوس کر جوان کرتے ہو حتیٰ کہ وہ (صدقہ بڑھ کر) احد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔'' (بخاری کتاب الزکوٰۃ، مسلم کتاب الزکوٰۃ)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ

بے شک جو لوگ ایمان لائیں اور اچھے اعمال کریں اور نماز قائم رکھیں اور زکوۃ دیں

لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰۤاَيُّهَا

ان کے لئے ان کے رب کے ہاں ان کا اجر ہے ان پر کچھ خوف نہیں اور نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔ [361] اے

الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مؤمن ہو [362]

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

اگر تم ایسا نہ کرو تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ [363] اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لئے

رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

تمہارے اصل اموال ہیں نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ [364]

[361] یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ احکامِ حلت وحرمت پر صدقِ دل سے ایمان لائیں پھر ان پر دل

وجان سے عمل کریں اور دنیوی نفع ونقصان کو بالائے طاق رکھ کر اخروی نفع پر نظر رکھیں تو اللہ ان کا اجر ضائع نہیں فرماتا۔ انہیں دنیا میں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں کیونکہ وہ خود کو دنیوی نفع نقصان سے برتر کر لیتے ہیں۔لہٰذا کسی کا خوف بھی نہیں رکھتے اور آخرت میں وہ غمزدہ نہ ہونگے بلکہ نعمتوں سے سرفراز کیے جائیں گے۔

[362] حضرت مقاتل سے مروی ہے کہ بنوثقیف نے بنومغیرہ کو بہت سا مال سود پر دے رکھا تھا۔جب یہ لوگ فتح مکہ کے موقع پر اسلام لے آئے تو بنومغیرہ پر بہت سا سود چڑھا ہوا تھا۔انہوں نے یہ ماجرا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اٹھایا۔تب یہ آیت مبارکہ اتری (تفسیر ابن ابی حاتم جلد ۲ صفحہ ۵۴۹ حدیث ۲۹۱۵) یعنی اللہ نے فرمایا اے مومنو جب تم ایمان لے آئے تو اللہ سے ڈرو اور اب جاہلیت کا جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نزولِ قرآن کے وقت تجارتی سود رائج تھا۔یہ اہم نکتہ ہے۔

[363] یعنی اے وہ لوگو جو دعویٰ ایمان کے باوجود سود کو بیع کی طرح جائز کہنے سے باز نہیں آتے ہو۔تمہیں اللہ وارننگ دے رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔یعنی جب تم اللہ کے مقرر کردہ نظام سے بغاوت کرتے ہو تو پھر تم سے دشمنوں اور باغیوں والا سلوک کیا جائے گا۔معلوم ہوا جو لوگ مسلمان ہو کر سود سے باز نہ آئیں ان سے باقاعدہ جنگ کی جائے گی۔یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کو اپنے ذکر کے ساتھ اپنے حبیب ﷺ کا ذکر پسند ہے۔اس لیے فرمایا: فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ ورنہ معنی کے اعتبار سے فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ کافی ہے مگر اللہ کو پسند ہے کہ اس کے نام کے ساتھ اس کے حبیب کا نام لیا جائے۔

ربا الفضل اور ربا النسیئہ میں فرق:

یاد رہے سود کی دو قسمیں ہیں ایک ربا الفضل ہے یعنی زیادتی کے ساتھ کسی چیز کا تبادلہ کرنا مثلاً ایک سیر گندم کے بدلے ڈیڑھ سیر گندم لینا۔اس میں فقہ حنفی کے مطابق قانون یہ ہے کہ ایک ہی جنس کی چیز جب ناپ یا تول کر ادلے بدلے میں دی جائے تو اس میں زیادتی حرام ہے اور اگر جنس مختلف ہو جیسے چاول دے کر گندم خریدنا تو اس میں کمی بیشی جائز ہے لہٰذا ایک کلو گندم کے بدلے دو کلو چاول خریدنا جائز ہے۔اس طرح اگر وہ ناپ تول والی چیز نہ ہو تو اس میں بھی کمی بیشی جائز ہے، جیسے ایک بڑی کار کے بدلے دو چھوٹی کاریں خریدنا۔دوسری قسم ربا النسیئۃ ہے یعنی کسی کو قرض دینا اور مقررمدت کے بعد اسے زیادتی کے ساتھ وصول کرنا، یعنی یہ طے کر لینا کہ میں تمہیں یہ رقم اسی شرط پر دے رہا ہوں، اگر تم اسے مثلاً سال کے اندر اندر واپس کر دو تو اس پہ کوئی اضافی مال نہیں دینا پڑے گا، جتنا قرض لیا ہے وہی واپس دے دو اور اگر سال میں یہ رقم واپس نہ کی تو پھر ہر سال اس پہ اتنی اضافی رقم دینا پڑے گی اور اصل قرض وہیں برقرار رہے گا جب تک اصل قرض نہیں لوٹاؤ گے ہر سال اتنا مال اضافی طور پہ دیتے رہو گے، یہی آج کل بنکوں کا مروّج سود ہے۔
یہ دونوں قسمیں حرام ہیں اور ان پر اصرار اللہ اور اس کے رسول سے جنگ ہے۔سود کتنا بڑا گناہ ہے؟ دیکھیے حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''سود کا ایک درہم لینا اللہ کے ہاں ستر بار زنا سے بدتر گنا ہے۔'' (بیہقی عن ابن عباس) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سود میں تہتر گناہ ہیں سب سے کم تر یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے۔'' (حاکم عن ابن مسعود) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سود کھانے، کھلانے، لکھنے اور اس پر گواہ بننے والے سب پر اللہ کی لعنت ہے۔'' (مسلم عن جابر)

کیا کرنسی نوٹوں کو باہم کمی بیشی سے بیچنا جائز ہے؟

یہاں بعض لوگ دھوکہ میں پڑ گئے۔ انہوں نے کہا جب احناف کے نزدیک ناپ تول (کیل ووزن) میں نہ آنے والی چیزوں کو باہم کمی بیشی کے ساتھ بیچنا جائز ہے، جیسے ایک کار کے بدلے دو کاریں، ایک مکان کے بدلے دو مکان وغیرہ، تو کرنسی نوٹوں میں کمی بیشی سے خرید وفروخت کرنا کیوں جائز نہیں۔ کیونکہ نوٹ بھی ناپ تول میں آنے والی چیز نہیں ہے، لہٰذا ایک سو کے نوٹ کے بدلے دو سو کے نوٹ لینا جائز ہے۔ مگر یہ استدلال قطعی غلط ہے۔ اس طرح تو سود کا دروازہ چوپٹ کھل گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ کرنسی نوٹ ایک نقدی ہے یعنی اشیاء کی خرید وفروخت میں تبادلہ کا ایک ذریعہ اور نقدی میں کمی بیشی مطلقاً حرام ہے خواہ وہ کیلی وزنی ہو یا نہ ہو، یعنی ناپ تول میں آئے یا نہ آئے۔

چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا تبیعوا الدینار بالدینارین ولا الدرھم بالدرھمین، ''یعنی ایک دینار کو دو دیناروں سے اور ایک درہم کو دو درہموں سے مت بیچو۔'' (مسلم کتاب المساقات حدیث ۷۸، موطا امام مالک کتاب البیوع باب ۳۲) اب درہم ودینار کیل ووزن میں نہیں لائے جاتے بلکہ گننے میں لائے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں تفاضل (کمی بیشی سے بیچنا) حرام ہے، یہی حال کرنسی نوٹوں کا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نوٹ بظاہر صرف کاغذ کا ٹکڑا ہے، مگر اصل میں یہ کسی ملک میں موجود سونے چاندی کے ذخائر کی رسید ہے۔ اسی لیے اگر نوٹ پرانا ہو جائے تو اسے بینک سے تبدیل کروایا جاسکتا ہے۔ اگر یہ بذات خود مال ہوتا تو اسے بدلا نہ جاسکتا، اس کا بدلا جانا اس کے رسید ہونے کی دلیل ہے۔ لہٰذا نوٹ اصل میں سونا یا چاندی ہے اور سونے چاندی کی طرح اس میں بھی تفاضل حرام ہے۔

انعامی بانڈز میں ملنے والی اضافی رقم سود نہیں ہے:

آج کل یہ طریق کار مروج ہے کہ بینکوں کی طرف سے انعامی بانڈز چھاپے جاتے ہیں۔ جن کی قیمت پانچ سو، ہزار، پانچ ہزار، دس ہزار یا اس سے بھی زائد ہوتی ہے۔ وہ بھی ایک طرح سے کرنسی کے نوٹ ہی ہوتے ہیں اور ان کے مخصوص نمبرز ہوتے ہیں۔ آپ جب چاہیں ان نوٹوں کو بینک سے کیش کرواسکتے ہیں، آپ نے جتنے میں بانڈز خریدے تھے آپ کو اتنی ہی رقم واپس مل جاتی ہے۔ اس سے قبل بعض بینک اس میں سے کچھ رقم کاٹ لیتے تھے جو نا جائز تھا مگر اب کچھ نہیں کاٹا جاتا بلکہ پوری قیمت جب چاہو واپس لے لو۔ البتہ ہر ماہ ان بانڈز کے نمبروں میں قرعہ اندازی ہوتی ہے اور

جونمبرز قرعہ اندازی میں نکل آئیں ان کے حاملین کو بینک کی طرف سے کچھ اضافی رقم دیدی جاتی ہے۔ اس میں بینک کا یہ فائدہ ہے کہ اس طرح اسے زیادہ سے زیادہ پیسہ مل جاتا ہے جسے وہ کاروبار میں لگا کر نفع کماتا ہے اور اس نفع میں سے کچھ حصہ بذریعہ قرعہ ان لوگوں کو دیدیا جاتا ہے جنہوں نے بانڈز خریدے تھے۔ بعض علماء نے انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے، وہ ان پہ ملنے والی اضافی رقم کو جو بذریعہ قرعہ اندازی ملتی ہے سود کی ایک قسم سمجھتے ہیں۔

مگر تحقیق یہ ہے کہ اس انعامی اضافی رقم کو سود سمجھنا غلط ہے۔ کیونکہ ابھی ہم نے بیان کیا کہ سود کی دو قسمیں ہیں، ربا الفضل اور ربا النسیئہ، اور یہ انعامی رقم ان دونوں میں سے کسی قسم میں بھی نہیں آتی۔ ربا الفضل میں ایک شخص کسی کیلی یا وزنی چیز کو اضافہ کی شرط کے ساتھ بیچتا ہے اور ربا النسیئہ میں یہ طے ہوتا ہے کہ مقروض جتنا عرصہ قرض نہیں لوٹائے گا اس پہ اضافہ پڑتا رہے گا۔ جبکہ انعامی بانڈز کا خریدار بینک سے ہرگز یہ طے نہیں کرتا کہ میں جب یہ بانڈز واپس بیچوں گا تو اس پہ اتنا اضافہ ضرور لوں گا، نہ بینک یہ مقرر کرتا ہے کہ ہم اتنے عرصہ کے بعد اتنا اضافہ ضرور دیں گے۔ البتہ وہ بعض خریداروں کو بطور انعام کچھ اضافی رقم دیدیتے ہیں۔

بلکہ یہ احسان میں داخل ہے جو عدل سے ایک درجہ بلند ہے۔ عدل یہ ہے کہ جس سے جتنا لیا اسے اتنا ہی لوٹا دیا۔ اور احسان یہ ہے کہ جتنا لیا اسے اپنی طرف سے اس سے زائد لوٹایا۔ اللہ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ''اللہ عدل اور احسان کا حکم فرماتا ہے۔'' (نحل، ۹۰) یعنی عدل تو ہر کسی پہ اللہ کی طرف سے لازم ہے اور احسان وہ ہے جو بندہ اپنی طرف سے کسی کو اس کے حق سے زائد دیدے۔ مزدور کو اس کی پوری مزدوری دینا عدل ہے اور مزدوری سے زائد دیدینا احسان ہے۔ اسی طرح قرض خواہ کو اس کا پورا قرض لوٹانا عدل ہے اور بغیر پیشگی مقرر کیے بطور انعام کچھ اضافی رقم دیدینا احسان ہے۔ ہاں اگر پہلے سے طے شدہ ہو کہ اتنا اضافہ ضرور دیا جائے گا تو وہ سود ہے۔ کئی احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرض یا ادھار لیا، مگر جب واپس کیا تو بطور انعام حق سے زیادہ دیدیا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ نے قرض لیا، وہ فرماتے ہیں: كان لى عليه دين فقضانى وزادنى، حضور ﷺ پہ میرا قرض تھا وہ آپ نے مجھے دیا اور اس پہ زیادہ عطا فرما دیا۔ (بخاری کتاب الھبہ باب ۲۳)

حضرت زید بن سعنہ رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ نے ادھار پہ کھجوریں لیں۔ جب وہ رقم لینے آئے تو آپ نے انہیں طے شدہ رقم سے زیادہ عطا فرمایا تو وہ آپ کے حسن خلق سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے (پہلے وہ یہودی تھے۔)

(مواھب لدنیہ بحوالہ طبرانی، حاکم، ابن حبان جلد ۲ صفحہ ۳۴۳ مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت)

اسلام سود کا نعم البدل کیا پیش کرتا ہے

اول۔ زکوۃ کے ذریعہ مستحقین کی مدد۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے زکوۃ وصدقات کے ذریعہ غرباء کی مدد کا حکم فرمایا ہے، یعنی اللہ نے نادار لوگوں سے سود کے بہانے مال ہتھیانے کی بجائے زکوۃ وصدقات کے ذریعہ ان کو مال دینے

کا راستہ دکھایا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ اللہ تعالیٰ سود کو مٹا دیتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے (بقرہ، ۲۷۶)

اگر مالدار لوگ صحیح طریقہ سے اپنی زکوۃ دیں تو دنیا میں کوئی غریب نہ رہے اور ایک وقت آئے کہ کوئی زکوۃ لینے والا نہ ہو اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایسے ماحول کی پیش گوئی بھی حدیث میں وارد ہے۔

دوم۔ قرض حسن کے ذریعہ مدد۔ قرآن میں قرض حسن دینے کی بہت تعریف فرمائی ہے اور حدیث میں بھی اس کا ذکر ہے۔ اصل میں مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ ایسے فنڈ قائم کرتے، جن سے چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کرنے والوں کو بلاسود قرضے فراہم کیے جاتے اور رقم کی واپس ادائیگی کا کوئی مضبوط طریقہ وضع کیا جاتا۔ تاکہ اہل اسلام سود کی لعنت میں مبتلا ہونے سے بچ سکیں مگر افسوس اس بارہ میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ آج بھی مقامی سطح پہ کسی خاص شیخ و مرشد کے مریدین میں ایسے فنڈز قائم ہوتے ہیں، جو باہم اپنے حلقہ کے لوگوں کو بلاسود قرضے دیتے ہیں۔

سوم۔ مضاربت اور مشارکت۔ چند آدمی تھوڑا تھوڑا سرمایہ جمع کر کے ایک بڑی کمپنی تشکیل دیں اور منافع باہم تقسیم کریں۔

[364] یعنی اے مومنو ایمان لانے کے بعد اگر تم گزشتہ گناہوں سے توبہ کا راستہ اپناؤ تو پھر تمہارے لیے یہی جائز ہے کہ جس قدر مال تم نے کسی کو بطور قرض دیا ہے وہی واپس لو ساتھ میں سود نہ لو نہ تم کسی پر زیادتی کرو کہ اصلی مال سے زائد لو نہ کوئی تم پر زیادتی کرے کہ اصل مال سے کم دے۔ جتنا دیا اتنا لے لو۔ معلوم ہوا مسلمان نہ ظلم کرتا ہے نہ ظلم سہتا ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ

اور اگر کوئی تنگ دست ہے تو اسے آسانی آنے تک مہلت دی جائے اور اگر تم صدقہ کرو تو تمہارے لئے بہتر ہے

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى

اگر تم جانو۔ [365] اور اس دن سے ڈرو جس میں تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا پھر ہر جان کو

كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

مکمل دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور لوگوں پر کچھ زیادتی نہ کی جائے گی [366]

[365] اگر تم نے کسی کو قرض دیا ہے اور وہ مالی مجبوریوں کے باعث بروقت قرض لوٹانے سے عاجز ہے تو اسے مہلت دو تاآنکہ وہ محنت مزدوری کر کے یا گھر کے غیر ضروری اثاثے یا زیور بیچ کر تمہارا قرض چکائے۔ اس کے لیے تمہیں عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔ اور اگر تم دیکھو کہ وہ کنگال ہو گیا ہے تو اسے مزید پریشان کرنے کی بجائے قرض معاف کر کے اسے صدقہ کر دو تو یہ تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہے۔

مقروض پہ نرمی کرنے کا ثواب

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک شخص لوگوں کو قرض دیتا تھا۔ اس نے اپنے نوکر سے کہہ رکھا تھا کہ اگر کوئی مقروض تنگ دست ہو تو اس سے درگزر کرو، شائد اللہ ہم سے درگزر فرمائے۔ جب وہ (مرنے کے بعد) اللہ تعالیٰ سے ملا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر کر دیا۔ (بخاری کتاب احادیث الانبیاء)

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگوں میں سے ایک شخص کا حساب ہوا تو اس کے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی نہ تھی۔ البتہ وہ لوگوں سے کاروبار کرتا تھا، وہ اپنے غلاموں سے کہتا: تنگ دست سے تجاوز کرو۔ اللہ نے فرمایا: ہم زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اپنے بندے سے تجاوز کریں، اے فرشتو تم بھی اس سے تجاوز کرو۔ (ترمذی کتاب البیوع)

نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مقروض سے درگزر کرنے والا روز قیامت عرش الٰہی کے سایہ میں ہوگا۔'' (مسند احمد عن ابی قتادہ)

[366] آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس دن تم اللہ کے پاس لوٹائے جاؤ گے اس دن کی سختی اور باز پرس سے ڈرو لہٰذا آج ہی سود سے باز آ جاؤ۔ اس دن ہر جان کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

اے ایمان والو! جب تم ایک مقرر مدت کے لئے ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو [367]

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۖ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا

اور چاہئے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف سے لکھے، اور لکھنے والے کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہئے

عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

جیسا کہ اسے اللہ نے لکھنا سکھایا تو اسے لکھنا چاہئے [368] اور وہ شخص لکھوائے جس پر حق آتا ہے

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا

اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور اس میں سے کچھ نہ چھپائے، [369] پھر اگر وہ شخص جس پر حق آتا ہے بے عقل

اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا

یا کمزور ہو یا وہ خود نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے [370] اور تم اپنے

شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ

مردوں میں سے دو مرد گواہ بناؤ، [371] پھر اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں، ایسے گواہ

مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

جو تمہیں (ایمان وعمل کے اعتبار سے) پسندیدہ ہوں، اگر دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے [372]

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا

اور گواہ گواہی دینے سے انکار نہ کریں جب بھی انہیں بلایا جائے [373] اور اس میں سستی نہ کرو کہ ادھار کی مقرر مدت لکھو خواہ وہ چھوٹا ہو

اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا

یا بڑا، یہ اللہ کے ہاں زیادہ انصاف اور مضبوط گواہی والا طریقہ ہے اور اس میں زیادہ توقع ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، [374]

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

ہاں اگر سودا دست بدست تجارت ہو جس کا لین دین تم آپس میں کرتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں [376]

اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ

اور جب تم باہم خرید و فروخت کیا کرو تو گواہ بنا لیا کرو [376] اور لکھنے والے اور گواہ کو نقصان نہ دیا جائے [377]

وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ

اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے گناہ کی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے اور اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

ہر چیز کو جانتا ہے [378]

قرآن کریم میں نازل ہونے والی سب سے آخری آیت:

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت: وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿﴾ نبی کریم ﷺ کے وصال سے صرف نو دن قبل نازل ہوئی اس کے بعد کوئی آیت نہ اتری اور آپ وصال فرما گئے۔ [illegible] ابن عباس، ضحاک، عکرمہ، عطیہ اور سدی رحمہم اللہ کے نزدیک بھی یہ آیت نزول میں سب سے آخری ہے۔ (ابن جریر)

قرض یا ادھار کے لکھنے کا حکم

[367] جب سود کی بحث ختم ہوئی جو کہ ناجائز ادھار ہے تو اب جائز ادھار کے آداب بتائے جا رہے ہیں۔ یہ قرآن پاک کی سب سے طویل آیت ہے۔ اس کا شان نزول یہ ہے کہ اہل مدینہ اکثر زراعت پیشہ تھے۔ یہاں لوگ بیع سلم کرتے تھے۔ یعنی رقم پہلے لے لیتا اور پھل یا غلہ کا ادھار کر لیتا کہ جب درختوں سے پھل اترے گا یا اناج پیدا ہوگا دے دیا جائے گا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا یہ بیع درست ہے تاہم اس میں مدت اور مال کا تعین ضرور کرو۔ (درمنثور) گویا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا اے مومنو جب تم ادھار کا معاملہ کرو خواہ اس طرح کہ رقم ابھی لے لو اور مال کا ادھار کرو۔ (جیسے بیع سلم ہے) یا مال ابھی دے دو اور رقم کا ادھار کرو۔ بہر حال اسے لکھ لو کہ اتنی مدت کے لیے ادھار ہے اور کس

نوعیت کا کس قدر مال دیا جائے گا۔لکھنا اس لیے بہتر ہے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ پیدا ہو، تاہم یہ حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں۔اگر باہم اعتماد ہو تو صرف زبانی گفتگو ہی کافی ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ یعنی اگر تمہیں آپس میں ایک دوسرے پر بھروسہ ہے تو لکھنا ضروری نہیں بس جو امانت ہے اسے ادا کر دو۔

ادھار کے لکھ لینے میں بہت فوائد ہیں

(۱) کیونکہ جس چیز کا مطالبہ متاخر ہے اس میں کبھی نسیان بھی آ جاتا ہے۔اس طرح ممکن ہے کسی کا حق کلی یا جزوی طور پر ضائع ہو جائے یا جھگڑے کی صورت پیدا ہو جائے۔ایک آدمی کسی سے سو روپے ادھار لیتا ہے ممکن ہے اسے بعد میں ایسی پریشانیاں آئیں کہ اسے یاد ہی نہ رہے کہ اس نے سو روپے ادھار لیے تھے، ایسے میں اگر لکھا ہوا ہو تو حق دار کا حق ضائع نہیں ہوگا۔انسان بھول ہی سے بنا ہے لفظ انسان نسیان سے مشتق ہے، یعنی لفظ انسان کا معنیٰ ہے بھولنے والا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب یہ آیت اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے سب سے پہلے (بھول جانے کی وجہ سے) انکار کیا وہ حضرت آدم علیہ السلام تھے۔انہوں نے روز میثاق حضرت داؤد علیہ السلام کو بہت نورانی دیکھا تو کہا یا اللہ میری عمر میں سے ان کو چالیس برس دیدے۔اللہ تعالیٰ نے ان کو دے دیئے اور اس پہ تحریر بنا کر فرشتوں کو دیدی۔پھر جب آدم علیہ السلام کے پاس فرشتۂ موت آیا تو انہوں نے کہا یا اللہ میری عمر میں سے چالیس برس ابھی رہتے ہیں، اللہ نے فرمایا: وہ تم نے اپنے بیٹے داود کو دیدیے تھے، آدم علیہ السلام نے کہا مجھے تو یاد نہیں۔تب اللہ تعالیٰ نے وہ تحریر ان کے سامنے رکھی، تو انہیں یاد آیا۔پھر اللہ نے آدم علیہ السلام کی عمر بھی پوری کردی (یعنی ایک ہزار برس) اور داود علیہ السلام کی عمر میں چالیس برس کا اضافہ بھی کر دیا اور ان کی عمر سو برس کر دی (پہلے ساٹھ برس تھی) (مسند احمد بن حنبل جلد اول صفحہ ۲۰)

(۲) اگر ادھار دیتے وقت اسے لکھ لیا جائے تو ادھار لینے والے کو ادائیگی کی زیادہ فکر ہوگی، ورنہ وہ بھی سست روی کا شکار ہو جائے گا۔تحریر انسان کو بار بار یاد دہانی کراتی رہتی ہے۔

(۳) اگر ادھار لکھا ہو تو دینے والا اپنے حق سے زیادہ مانگ نہیں سکتا، ورنہ ممکن ہے وہ زیادہ مانگے اور قرض لینے والا تھوڑا بتائے۔یوں ان کا باہم جھگڑا بن جائے اور ایسا ہم نے دیکھا ہے۔

بیع سلم کے احکام

ابھی پیچھے گزرا کہ یہ آیت بیع سلم کے بارے میں نازل ہوئی۔بیع سلم یہ ہے کہ قیمت پہلے ادا کر دی جائے اور مال

ایک مدت کے بعد وصول کیا جائے۔ اس میں شرط ضروری ہے کہ مال کی جنس، قسم، صفت اور مقدار مقرر کر دی جائے۔ مثلاً اگر گندم ہے تو کونسی گندم، کیسی گندم اور کتنی گندم اور یہ بھی طے کیا جائے کہ کب مال دیا جائے گا۔

بیع سلم ان چیزوں میں جائز ہے جن کی صفت اور مقدار مقرر کی جا سکتی ہے، جیسے ناپ تول اور گنتی میں آنے والی چیزیں، مثلاً گندم، چاول، کپڑا، پتھر وغیرہ، لہٰذا جانور، چمڑا اور ہیرے جواہر میں بیع سلم جائز نہیں ہے۔

یہ ضروری ہے کہ ساری قیمت پیشگی ادا کر دی جائے، اگر قیمت میں بھی ادھار اور مال میں بھی تو یہ ادھار کے بدلے ادھار ہوا۔

[368] کاتب کو متعاقدین (ادھار دینے والا اور لینے والا دونوں) کے درمیان ادھار کا معاملہ عدل کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ جس میں کسی ایک فریق کو نقصان نہ ہو۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ کسی تیسرے آدمی سے لکھوانا چاہیے تاکہ وہ غیر جانبداری سے لکھ سکے۔ اگرچہ متعاقدین خود بھی لکھ سکتے ہیں اور جب کاتب کو بلایا جائے کہ فلاں دو آدمیوں کے درمیان ادھار کا معاملہ لکھنا ہے تو اسے انکار نہیں کرنا چاہیے جب اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنا سکھایا ہے تو اسے چاہیے کہ اس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچائے۔

مگر یہ تب ہے کہ وہ فارغ ہو اور اس کے سوا کوئی لکھنے والا نہ ہو۔ اگر وہ فارغ نہ ہو یا کوئی اور بھی لکھ سکتا ہو تو وہ انکار کر سکتا ہے۔ معلوم ہوا اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا اللہ کے ہاں عظیم نیکی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم اگر تیرے علم سے اللہ کسی کو فائدہ پہنچائے تو یہ تیرے لیے سرخ اونٹوں کے حصول سے کہیں بہتر ہے۔'' (اور یہاں صرف علم شرعی مراد نہیں، ہر وہ علم مراد ہے جو لوگوں کو نفع دے)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''جس سے علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے اسے چھپایا تو روز قیامت اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔'' (ابوداود کتاب العلم)

[369] یعنی جس نے ادھار لیا ہے اسے کاتب کو لکھوانا چاہیے کہ اس نے کتنا ادھار لیا اور کب واپس کرے گا، گویا وہ لکھوا کر اقرار کر رہا ہے کہ اس پر اتنا حق لازم ہے۔ اگر ادھار دینے والا لکھوائے تو احتمال ہے کہ وہ سختی سے کام لے۔ لہٰذا ادھار لینے والا انصاف سے لکھوائے اور کوئی چیز نہ چھپائے جو حق ہو وہ پورا ظاہر کرے ورنہ بددیانتی جھوٹ، فریب، کتمان حق اور فساد فی الارض جیسے عظیم گناہوں کا بوجھ اس کے سر آئے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈرے اس کی پکڑ سخت ہے۔

یاد رہے جو کتابت کروائے گا کاتب کا خرچہ بھی وہی ادا کرے گا۔

[370] اگر ادھار لینے والا اپنی عقلی کمزوری کے سبب نہیں لکھوا سکتا مثلاً وہ بچہ یا مجنون ہے (اس کی صورت یہ بن سکتی ہے کہ بچے کی شادی کی گئی اس پر حق مہر لازم آیا یا بچے اور مجنون کے لیے کوئی چیز ادھار پہ خریدی گئی) یا ایسے عوارض لاحق ہیں کہ ادھار لینے والا وقتی طور پر لکھوانے کے قابل نہیں مثلاً بیمار ہے یا جیل میں ہے تو ان تمام صورتوں میں اس کا ولی انصاف سے لکھوائے یعنی ایسا نہ کرے کہ اپنے نفع کی کوئی بات اس میں ڈال دے جو ادھار لینے والے کو مشکل میں مبتلا کرے۔

مالی معاملات میں شرعی شہادت قائم کرنے کا بیان

[371] یعنی اے مسلمانو جب تم ایک دوسرے سے ادھار پر لین دین کرو تو لکھنے کے علاوہ دو مرد بطور گواہ بھی مقرر کر لو تا کہ خدانخواستہ اگر جھگڑے کی صورت بنے تو وہ گواہی دے کر جھگڑا ختم کریں۔ اسی طرح جب بھی ایک شخص دوسرے آدمی سے کوئی اہم معاہدہ کرے خواہ وہ خرید و فروخت ہو یا کرایہ داری یا ملازمت اختیار کرنا، تو اس پر دو گواہ بنا لینا بہتر ہے اسی لیے باب نکاح میں دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہے ورنہ نکاح منعقد نہیں ہوتا۔

[372] اگر کسی معاملہ میں دو مرد گواہ نہ مل سکیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنیں، یعنی اگر گواہی کے لیے دو مرد میسر ہوں تو انہی کو گواہ بنایا جائے، کسی عورت کو یہ تکلیف نہ دی جائے۔ البتہ اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنیں، یعنی بہر حال ایک مرد کو گواہی میں ضرور شامل رکھیں اور دوسرے مرد کی جگہ دو عورتیں شامل کر لیں۔

عورت کی گواہی مرد کے مقابلہ میں آدھی کیوں رکھی گئی ہے؟

اس جگہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورت کو اسقدر کم درجہ کیوں قرار دیا گیا ہے کہ اول تو اس کو گواہی میں شامل ہی نہیں کیا گیا اور اگر کیا بھی گیا تو ساتھ میں ایک مرد کا ہونا لازم رکھا گیا اور بامر مجبوری دوسرے مرد کی کمی کو دو عورتوں سے پورا کیا گیا، کیا عورت اتنی ہی گئی گزری ہے؟ اس کے جواب میں ہم چند نکات قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ جن سے اس اعتراض کا شافی جواب سامنے آجائے گا۔

اول:

عورت کو گواہی میں کم تر حصہ دیا جانا اس لیے نہیں کہ وہ مرد کے مقابلہ میں کم درجہ رکھتی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ چیز اس کی پردہ داری اور شرم وحیا کے خلاف ہے عورت کو عدالت میں لیجانا اور مردوں کے سامنے کھڑا کرنا، اسے شمع محفل بنانا اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنانا اسے اسلام ناپسند رکھتا ہے۔

دوم:

عورت کو گواہیوں میں الجھانا اس کی خانگی ذمہ داریوں کے خلاف ہے۔ عورت اگر گواہیوں کے لیے عدالت کے چکر

لگانے لگے تو گھر کی ذمہ داروں کو کون سنبھالے گا؟ گواہی دینے کے لیے بسا اوقات ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر بھی کرنا پڑتا ہے، اگر وہ ان کاموں میں الجھ جائے تو بچوں کی کفالت کون کرے گا؟ اس لیے شریعت نے عورت کو اس معاملہ میں کم سے کم رول دیا ہے، یہ کام مردوں ہی کے لیے مناسب ہیں۔

سوم:

کسی کے خلاف گواہی دینا بڑے حوصلہ اور ہمت کی بات ہے۔ جس نے جرم کیا ہے اس کے خلاف گواہی دینے والا بھی اس کی شر کا نشانہ بن سکتا ہے اور عورت میں اس حوصلہ کی کمی ہے۔ اس کے لیے مردانہ ہمت وحوصلہ اور مضبوط اعصاب درکار ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ عورت اپنی فطرت کے لحاظ سے کمزور عقل کی مالک ہے۔ اس کا حوصلہ، تدبر، حلم اور فہم مرد کے مقابلہ میں کم ہے۔

عورت کے عقلی طور پر کمزور ہونے کے دلائل

(۱) سائنسی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عورت کے دماغی خلیے مرد کے مقابلہ میں آدھے ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ناگہانی آفت کے آنے پر مرد حوصلہ نہیں ہارتا اور عورت رونے چلانے لگتی ہے، اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اس کا عقل جواب دے جاتا ہے کہ اب وہ کیا کرے کدھر جائے۔

(۲) یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورتیں مردوں کی نسبت زیادہ توہم پرست ہیں۔ جھوٹے پیروں فقیروں نجومیوں اور عاملوں کے ڈیرے عموماً عورتوں کی توہم پرستی ہی سے آباد ہیں۔ بہت سی پڑھی لکھی عورتیں بھی وہم پرستی میں پڑ جاتی ہیں۔

(۳) پھر یہ بھی عورت کی کم عقلی ہی کی دلیل ہے کہ وہ بہت جلد دل دے بیٹھتی ہے۔ بدکردار لوگ اسے جلد پہلا پھسلا لیتے ہیں۔ پختہ عمر کی عورتیں جو کئی بچوں کی مائیں ہوتی ہیں، انکے بہک جانے اور بچوں کو چھوڑ کر کسی مرد کے ساتھ بھاگ جانے کے واقعات بھی اخباروں میں آتے رہتے ہیں اسی لیے عورت کو کسی محرم کے بغیر اجنبی مرد کے ساتھ خلوت میں بیٹھنے یا سفر کرنے کی شریعت میں اجازت نہیں دی گئی۔ یہ عورت کے نقصانِ عقل ہی کی وجہ سے ہے، تو اس سبب سے شریعت نے عورت کو گواہی کے میدان میں کم آنے دیا ہے۔ اور اگر وہ آئے تو اس کے ساتھ دوسری عورت ہونی چاہیے تا کہ اگر وہ اپنی کم حوصلگی اور نقصانِ عقل کی وجہ سے بہکنے یا بھولنے لگے تو اسے دوسری عورت یاد دلائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ یعنی اگر وہ بھولے تو ایک عورت دوسری کو یاد دلائے۔

(۴) اور یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جھگڑے میں عورت صحیح طرح بول نہیں سکتی، بلکہ شدت جذبات سے رونے لگتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ⑱ کہ عورت جھگڑے میں صاف بات نہیں کر سکتی۔ (زخرف، ۱۸) اس لیے اس کی گواہی مرد سے آدھی رکھی گئی ہے۔

(۵) اس جگہ یہ حدیث بھی یاد رکھی جائے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز

عید کے لیے نکلے، تو عورتوں کے مجمع کی طرف گئے۔ آپ نے عورتوں سے فرمایا: اے عورتو صدقہ کیا کرو، میں جہنم میں تمہیں مردوں سے زیادہ دیکھتا ہوں۔ عورتوں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ اس کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا: تم زیادہ لعنت کرنے والی ہو، شوہر کی ناشکری کرتی ہو اور تم اپنے عقل و دین کے نقصان کے باوجود سمجھ دار مرد کی مت ماردیتی ہو۔ عورتوں نے کہا: یارسول اللہ ﷺ! ہمارا عقل اور دین کیسے ناقص ہے؟ فرمایا: کیا تمہاری گواہی مرد کے مقابلہ میں آدھی نہیں ہے؟ کہنے لگیں ہاں یارسول اللہ ﷺ فرمایا یہ تمہارے عقل کا ناقص ہونا ہے، پھر فرمایا: کیا حالتِ حیض تم نماز روزہ چھوڑ نہیں دیتیں؟ یہ تمہارے دین کا ناقص ہونا ہے۔

چہارم:

کئی امور میں صرف عورت ہی کی گواہی مانی جاتی ہے، وہاں مرد گواہی نہیں دے سکتا۔ جیسے بچے کی ولادت میں مدد دینے والی عورت کی گواہی کہ فلاں بچہ کس عورت کے ہاں کس وقت پیدا ہوا اور ایسے وہ امور جن پہ کوئی عورت ہی مطلع ہوسکتی ہے، ان میں عورت ہی کی گواہی پہ سب امور کا مدار ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ شریعت نے عورت کو گواہی کے باب میں مطلقاً کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

پنجم:

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تقویٰ، حسن عمل اور اُخروی جزا کے اعتبار سے عورت مرد کے برابر ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ جو بھی اچھا عمل کرے، چاہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی دیتے ہیں۔ (نحل، ۹۷)

لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں عورت مرد سے کم تر درجہ کی مخلوق ہے۔ البتہ اسلام نے فطرت کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بعض انتظامی امور میں عورت ہی کی بہتری اور اس کی عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے اسے کئی ذمہ داریوں سے دور رکھا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ یعنی جن دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے وہ ایمان و حسنِ عمل کے اعتبار سے پسندیدہ ہونے چاہئیں یعنی بدکردار یا مشکوک لوگوں کو گواہ نہ بنایا جائے کہ جن پر جانبداری کی تہمت آسکے۔ اسی لیے غلام کی گواہی آقا کے حق میں، بیوی کی شوہر کے حق میں، والدین کی اولاد کے حق میں اور اولاد کی گواہی والدین کے حق میں قابل قبول نہیں۔

آگے فرمایا گیا: اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ یعنی دو عورتیں گواہی میں اس لیے رکھی گئیں کہ اگر ایک عورت اپنے نقصانِ عقل یا گھبراہٹ کے سبب کوئی بات کہنا بھول جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔

گواہی کے سلسلہ میں چند قرآنی احکام

اس آیت سے گواہی کے بارے میں درج ذیل احکام ثابت ہوتے ہیں

(۱) فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ سے معلوم ہوا گواہی میں ایک مرد کا ہونا بہر حال ضروری ہے چار عورتیں دو مردوں کی جگہ گواہی نہیں دے سکتیں۔

(۲) یہ بھی معلوم ہوا کہ بچہ گواہی نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے بالغ مرد کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر بچوں ہی کا معاملہ ہو جیسے کلاس میں بچے لڑ پڑتے ہیں تو وہاں بچوں کی گواہی مقبول ہے اسی طرح رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۚ (یعنی اگر دو مرد گواہ میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہی دیں) سے معلوم ہوا کہ اگر گواہی کے لیے دو مرد میسر ہوں تو انہی کو لیا جائے گا کسی عورت کو اس میں داخل کرنا جائز نہیں اور یہ عورت کی شرم وحیا اور اسکی کم حوصلگی کی وجہ سے ہے۔ جیسا کہ ہم گزشتہ سطور میں اس بات کی خوب اچھی طرح وضاحت کر چکے ہیں۔

(۳) یہ بھی ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے معاملات میں کسی کافر کی گواہی قبول نہیں، کیونکہ یہ آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا سے شروع کی گئی اور فرمایا گیا: وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ یعنی اے مسلمانوں تم اپنے لوگوں میں سے مطلب یہ کہ مسلمانوں میں سے گواہ قائم کرو۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ کسی کافر کو مسلمانوں کے معاملات میں داخل کرنا جائز نہیں ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں پہ کوئی (قانونی) اختیار نہیں عطا فرمائے گا (۱۴۱) یعنی کافروں کو یہ اختیار نہیں دے گا کہ مومنوں پہ اپنی تسلط جمائیں اور گواہ کو مشہود علیہ پہ ایک تسلط حاصل ہوتا ہے۔ کما ھو ظاھر

(۴) بدکردار شخص کی گواہی قبول نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ، یعنی گواہ وہ ہوں جو تمہیں پسند ہیں اور ہماری پسندیدگی وہی معتبر ہے جو رضائے الٰہی کے تابع ہو۔ اسی لیے حد قذف لگانے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ تم کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ (نور، ۴)

اسی لیے معاملہ کی نزاکت کے مطابق قاضی اسلام کو چاہیے کہ گواہوں کے بارے میں خفیہ معلومات حاصل کرے کہ وہ کیسے لوگ ہیں، خصوصاً حدود وقصاص میں، حدود وقصاص کے سوا دیگر معاملات میں قاضی ظاہری قرائن پہ گواہی قبول کر سکتا ہے۔

[373] یعنی جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں تا کہ صاحب حق کو حق مل سکے اور مظلوم کی داد

رسی ہو۔ اور آگے آ رہا ہے۔ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۚ کہ کاتب اور گواہ کو نقصان نہ دیا جائے یعنی انہیں آنے جانے اور وقت دینے کا معاوضہ دیا جائے۔

[374] یعنی ادھار کا معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اسے لکھنے میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔ بسا اوقات معمولی جھگڑا بڑا فتنہ اٹھا دیتا ہے۔ یہ بات اللہ کے ہاں انصاف سے قریب تر اور تمہارے دلوں کو شکوک سے پاک رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

[375] یعنی جہاں معاملہ نقد کا ہو، مال بھی حاضر ہو اور قیمت بھی حاضر، تو وہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ لکھنے کی ضرورت ادھار ہی میں ہے، البتہ نقد معاملہ میں بھی لکھنا بہتر ہے۔

[376] جب تم ادھار معاملہ کرو تو اس میں بہر حال لکھنے کے علاوہ گواہ بھی بنا لو۔

[377] وَلَا يُضَآرَّ مبنی بر فاعل بھی ہو سکتا ہے اور مبنی بر مفعول بھی۔ عموماً اسے مبنی بر مفعول (فعل مجہول) سمجھا جاتا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ کاتب اور گواہ کو نقصان نہ دیا جائے یعنی انہیں لکھنے اور گواہی کے لیے عدالت میں آنے جانے اور ان کے وقت کا معاوضہ دیا جائے اور اگر وہ فارغ نہ ہوں تو انہیں بے جا تنگ نہ کیا جائے اور مبنی بر فاعل (فعل معروف) ہونے کی صورت میں یہ معنی ہے کہ کاتب اور گواہ نقصان نہ دیں یعنی جائز حق سے زیادہ وصول نہ کریں۔ معلوم ہوا مومن کسی کو نقصان دیتا ہے نہ نقصان اٹھاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اَلْمُسْلِمُ لَا يَظْلِمُ و لَا يُظْلَمُ عَلَيْهِ۔ مسلمان نہ ظلم کرتا ہے نہ ظلم سہتا ہے۔

[378] اگر تم ایسا کرو کہ کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچاؤ یا وہ تمہیں نقصان دیں یا تم غلط گواہی سے کسی کا حق مارو تو اس کا گناہ تم پر پڑے گا۔ یعنی اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے یکدم پڑتی اور ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اللہ تمہیں دین سکھاتا ہے وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے لہٰذا تم اپنے قوانین نہ بناؤ بلکہ اس کے قوانین اپناؤ۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ

اور اگر تم سفر پر ہو اور کاتب نہ پاؤ تو کوئی چیز رہن رکھو جو قبضہ میں دے دی جائے [379] پھر اگر تم ایک دوسرے پر

بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا

اطمینان رکھتے ہو تو جس کو امین بنایا گیا وہ امانت واپس کر دے (تب رہن کی ضرورت نہیں) اور وہ اللہ سے ڈرے جو اس

الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝٢٨٣ ع

کا رب ہے [380] اور گواہی مت چھپاؤ اور جو اسے چھپائے تو اس کا دل مجرم ہے اور اللہ تمہارے اعمال کا جاننے والا ہے۔ [381]

[379] اگر تمہیں سفر میں کوئی چیز ادھار لینا یا قرض حاصل کرنا پڑے اور وہاں کوئی کاتب میسر نہ ہو (کہ ادھار یا قرض

دینے والا مطمئن ہو کر دے سکے) تو تم اپنی طرف سے کوئی چیز اس کے پاس رہن (گروی) رکھ دو جب تم قرض دو گے تو اپنی مرہون چیز واپس لے لو گے۔ سفر میں رہن رکھنے کی صورت بطور مثال بیان کی گئی ورنہ رہن تو گھر میں رہتے ہوئے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ یعنی جب بھی قرض دیا جائے یا ادھار پہ سودا دیا جائے تو بطور رہن یعنی بطورِ ضمانت کوئی چیز قرض یا ادھار دینے والے کے پاس رکھی جا سکتی ہے، خواہ یہ معاملہ سفر میں ہو یا گھر میں ہو۔

[380] یہ ادھار لینے پر کتابت، گواہی اور رہن جیسے حفاظتی انتظامات اس وقت ہیں جب باہمی عدم معرفت کے سبب بھروسہ نہ ہو، لیکن اگر تم ایک دوسرے کے جانے والے با اعتماد ساتھی ہو تو ان چیزوں کا ہونا کچھ ضروری نہیں۔ اور دیکھا گیا ہے کہ قریبی اعزاء اور گہرے دوستوں کے مابین ایسے تکلفات پسند نہیں کیے جاتے بلکہ ان کا تذکرہ بد اعتمادی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ ایسی صورت ہی ضروری ہے کہ جسے امین سمجھ کر قرض یا ادھار دیا گیا وہ مقررہ وقت پر امانت واپس کر دے اور اللہ سے ڈرتا رہے یہ نہ سوچے کہ جب نہ کتابت ہے نہ گواہی تو رقم دبالی جائے۔ معلوم ہوا اللہ کا خوف ہی بندے کو گناہ سے باز رکھ سکتا ہے۔ یہ سب سے اہم تر چیز ہے۔

[381] اے مسلمانو! گواہی نہ چھپاؤ کہ اس کا چھپانا قلبی مجرم کا کام ہے۔ عموماً لوگ اپنے قریبی رشتہ داروں کے خلاف گواہی نہیں دیتے۔ خواہ وہ کسی کا حق مارلیں بلکہ بعض تو ان کے حق میں جھوٹی گواہی دینے سے بھی باز نہیں آتے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ مومنو! اللہ کی رضا کے لیے انصاف کے ساتھ گواہ بنو خواہ وہ خود تمہارے خلاف معاملہ ہو یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف۔ (نساء ۱۳۵) یاد رہے حقوق العباد میں جب گواہی کے لیے بلایا جائے اور علم ہو کہ گواہی نہ دینے سے کسی کا حق ضائع ہو جائے گا تو گواہی دینا واجب ہے جبکہ حقوق اللہ میں اگر فساد ختم کرنا مقصد ہو تو گواہی دینا چاہیے ورنہ ستر پوشی بہتر ہے اور اگر گواہی نہ دینے سے فساد پھیلے تو گواہی لازمی ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اللہ ہی کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے [382] اور اگر تم اپنے دلوں کی بات ظاہر کرو

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

یا اسے چھپاؤ تو بہر حال اللہ تم سے اس کا حساب لے گا [383] پھر جسے چاہے بخشے گا اور جسے چاہے عذاب دے گا

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[384]

حسابِ آخرت اور نجات اخروی کا بیان

[382] یعنی ہر چیز اپنی پیدائش اور ملکیت کے اعتبار سے اللہ ہی سے متعلق ہے اور زمین وآسمان کا ذکر بطور مثال ہے ورنہ اللہ رب العزت کی کائنات اس سے کہیں وسیع تر ہے۔

[383] اے مومنو! تم اپنے دلوں کے بھید ظاہر کرو یا چھپا کر رکھو اللہ اس کا ضرور حساب لے گا۔ اگر سوال کیا جائے کہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے ''دلوں میں جو خیالات آتے ہیں وہ میری امت کیلئے معاف کر دیئے گئے جب تک وہ زبان یا عمل میں نہ آجائیں ان پر پکڑ نہیں۔'' (مسلم عن ابی ہریرہ) تو پھر یہ کیوں کہا گیا کہ تم اپنے دلوں کے بھید چھپاؤ یا ظاہر کرو۔ ان کا حساب ضرور ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا یہ معنی ہے روزِ قیامت ہر عمل کی جزا نیت کے مطابق ملے گی خواہ وہ نیت ظاہر کی جائے یا نہ کی جائے، لہٰذا اگر اچھا عمل بُری نیت سے کیا جائے تو عذاب ملے گا جیسے دکھاوے کی نیکیاں اور اگر برا عمل اچھی نیت سے کیا جائے تو ثواب ملے گا جیسے صلح کرانے کو جھوٹ بولنا۔ جبکہ اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ صرف دل کے ارادہ یعنی گناہ پر پکڑ نہیں جب تک گناہ عملاً نہ کیا ہو۔ لہٰذا دونوں مضامین ہی الگ الگ ہیں ان کا باہم کوئی تعلق نہیں۔

[384] اللہ رب العزت نیت کے مطابق ہر عمل کا فیصلہ تو ضرور فرمائے گا مگر جب کسی مومن کے لیے اس کے بعض گناہوں کے سبب دوزخ واجب ہو جائے گی تو اسے لازماً دوزخ میں ہی نہیں ڈالا جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے چاہے تو بخش دے چاہے تو عذاب دے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مجبور نہیں مختار ہے۔ حدیث مبارکہ میں ہے ایک فاحشہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے بخش دیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی۔ (بخاری)

حضور سرور کونین ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل میں دو آدمی باہم بھائی بنے ہوئے تھے۔ ایک بہت گناہگار دوسرا بہت عبادت گزار تھا۔ عبادت گزار دوسرے کو جب بھی گناہوں سے روکتا تو وہ کہتا میرا معاملہ میرے رب پر چھوڑ دو۔

ایک دن عبادت گزار نے کہا اللہ تمہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کی روحیں قبض کر لیں پھر عبادت گزار سے کہا کیا تم میری قدرت پر غالب ہو؟ پھر گناہگار سے فرمایا تم میری رحمت سے جنت میں چلے جاؤ اور عبادت گزار کے لیے فرمایا فرشتو اسے جہنم میں پھینک دو۔ (ابوداؤد کتاب الادب باب ۴۳) اس جگہ فَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ سے معلوم ہوا کسی گناہ کو معمولی نہ جانا جائے نہ جانے کون سا گناہ جہنم لے جائے اور کسی نیکی کو معمولی نہ سمجھا جائے کیا خبر کون سی نیکی جنت لے جائے۔

اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
رسول (ﷺ) اس کلام پر ایمان لائے جو ان پر ان کے رب کی طرف سے اتارا گیا اور سب اہل ایمان بھی ایمان لائے [385]
وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوۡا
ہر مومن اللہ پر، اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان رکھتا ہے، ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے [386] اور وہ کہتے ہیں:
سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۖ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ۝
ہم نے سنا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! تیری بخشش چاہیے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے [387]

رسول اللہ ﷺ اور امت کا ایمان اور ان کی مقبول دعائیں

[385] یہ سورہ بقرہ کی آخری دو آیات (نمبر ۲۸۵ اور ۲۸۶) اپنے اندر عظیم فضیلت رکھتی ہیں۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''یہ دو آیات مجھے عرش کے نیچے اللہ کے خزانے میں سے دی گئی ہیں۔ مجھ سے قبل کسی نبی کو نہ دی گئیں۔'' (احمد، نسائی، طبرانی، ابن مردویہ، بیہقی) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ''دو آیات مجھے عرش کے خزانے میں سے دی گئی ہیں تم انہیں سیکھو اور اپنے بچوں اور عورتوں کو سکھاؤ یہ دعا بھی ہیں قرآن بھی ہیں۔'' (حاکم وبیہقی) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جس گھر میں یہ دو آیات پڑھی جائیں وہاں کوئی شیطان (جن، سایہ وغیرہ) قریب نہیں آ سکتا'' (مسند احمد جلد ۴ صفحہ ۲۷۴) ایک حدیث میں ہے کہ ان آیات کا پڑھنا رات بھر قیام کے برابر ہے۔ (درمنثور)

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اس وحی پر کامل ایمان لائے ہیں جو ان پر ان کے رب کی طرف سے اتاری گئی اور اہل ایمان یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد والے سب مسلمان جو دامن رسول سے وابستہ ہوئے ہیں وہ بھی اس وحی پر کامل ایمان لائے ہیں۔

نبی کو اپنی وحی میں تردد نہیں ہوسکتا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ سے معلوم ہوا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول پر اللہ کی وحی اترے اور اسے اس کی منزل من اللہ ہونے کا علم نہ ہو۔ لہٰذا پہلی وحی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ کا ورقہ بن نوفل کے پاس جانا اس لیے نہ تھا کہ آپ جانتے نہ تھے کہ آپ پر کیا نازل ہوا یا آپ سے کیا واقعہ ہوا بلکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنی تسلی کے لیے آپ کو ورقہ کے پاس لے گئیں اور آپ ان کی دلداری کے لیے ساتھ گئے۔ ورنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پہلی وحی کے بارے میں فرمایا: فَلَمْ يَمُرَّ عَلٰى حَجَرٍ وَلَا شَجَرٍ اِلَّا وَهُوَ يَقُوْلُ السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، کہ آپ جس شجر و حجر کے پاس سے گزرتے وہ کہتا: اے اللہ کے رسول آپ پر سلام ہو۔ (دلائل النبوۃ جلد اول صفحہ ۲۸۴ حدیث ۱۶۵ مطبوعہ المکتبۃ العربیہ حلب شام)

مرزا قادیانی کی ذلت:

یہاں سے مرزا قادیانی کے جھوٹ کا بھی پتہ چلا، کیونکہ سچے نبی کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ اس پر جو وحی نازل ہو اسے اس کا مکمل علم اور اس پر ایمان ہوتا ہے۔ جبکہ مرزا قادیانی بیس برس تک کہتا رہا وہ نبی نہیں ہے بلکہ وہ حضور ﷺ کے بعد مدعی نبوت پہ لعنت بھیجتا تھا، پھر ۱۹۰۱ء میں اس نے کہا اس سے بھول ہوئی۔ اللہ تو اسے عرصہ دراز سے نبی کہہ رہا تھا وہی نہ سمجھ سکا لہٰذا اب سے وہ کہتا ہے کہ وہ نبی و رسول ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵۳ مندرجہ روحانی خزائن جلد ۲۲ مطبوعہ لندن) گویا جھوٹے نبی کی حالت ہی اس کا جھوٹ ظاہر کر رہی ہے۔

[386] آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الخ، یعنی سب اہل ایمان اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور چونکہ وہ اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ہم کسی رسول میں تفریق نہیں کرتے یعنی کسی رسول کی رسالت سے انکار یا اس کی بے ادبی نہیں کرتے۔ یعنی ہم یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں ہیں جنھوں نے بعض رسولوں کو مانا اور بعض سے انکار کیا چنانچہ انہوں نے سید المرسلین امام النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کو نہ مانا۔ علاوہ ازیں حضرت سلیمان علیہ السلام کو نبی کی بجائے جادوگر قرار دیا اور حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نبوت سے انکار کیا۔ بلکہ ہم ہر نبی کی نبوت کو مانتے اور اس سے انکار کو کفر قرار دیتے ہیں۔

اہل تشیع کے عقیدۂ امامت کا صریح بطلان:

اہل تشیع سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر نبوت و رسالت کے ختم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ امامت جاری کر دیا تاکہ خلق خدا کی ہدایت ہو سکے اور امام بھی ایک نبی کی طرح اللہ کی طرف سے مقرر و منصوص ہوتا ہے اور اس کی امامت کا منکر اسی طرح کافر ہے جیسے تمام انبیاء و مرسلین کی نبوت و رسالت کا منکر کافر ہے اور اس کام کے لیے اللہ نے

اولادِ رسول ﷺ میں سے بارہ امام مقرر فرمائے۔ پہلے امام حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حسنین کریمین، زین العابدین، باقر، جعفر، کاظم، رضا، تقی، نقی، حسن عسکری، اور مھدی رحمۃ اللہ علیہ امام ہیں۔ اسی لیے چونکہ رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی بجائے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر کے انہیں خلیفۃ الرسول ﷺ تسلیم کیا تھا تو اہل تشیع کے نزدیک تمام صحابہ کرام بشمول ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم کافر و مرتد ہو گئے (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کیونکہ انہوں نے اللہ کے مقرر کردہ امام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت سے انکار کیا تھا۔

مگر ہم کہتے ہیں اگر رسولوں کا سلسلہ ختم ہو جانے کے بعد اماموں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے اور اماموں پہ اسی طرح ایمان لانا ضروری ہے جیسے رسولوں پہ ایمان لانا ضروری ہے تو اس آیت میں اللہ نے رسولوں کے بعد اماموں کا ذکر کیوں نہ کیا اور یہ کیوں نہ فرمایا: كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَ الْاَئِمَّةِ کہ مومنین وہ ہیں جو اللہ پہ، اس کے فرشتوں پہ، اسکی کتابوں پہ، اس کے رسولوں پہ اور اس کے اماموں پہ ایمان رکھتے ہیں؟ حیرت ہے کہ انبیاء و رسل جو ہدایت دے کر چلے گئے ہیں ان پہ ایمان لانے کا حکم تو اللہ تعالی فرما رہا ہے اور جن اماموں سے ابھی امت کا واسطہ پڑنے والا تھا اللہ نے ان پہ ایمان لانے کا ذکر ہی چھوڑ دیا؟ کس قدر گمراہی و شقاوتِ قلبی ہے کہ اہل تشیع نے اپنی طرف سے عقیدہ امامت کو گھڑا اور اس کی بنیاد پہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بشمول خلفاء راشدین کو کافر و مرتد قرار دیا۔

چنانچہ اہل تشیع امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ جھوٹی اور بدبودار روایت لاتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

كَانَ النَّاسُ اَهْلَ الرِّدَّةِ بَعْدَ النَّبِيِّ ﷺ اِلَّا ثَلَاثَةٌ الْمِقْدَادُ وَ اَبُوْذَرٍّ وَ سَلْمَانُ الْفَارِسِيُّ وَ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ دَارَتْ عَلَيْهِمُ الرَّحَاءُ وَ اَبُوْ اَنْ يُّبَايِعُوْا حَتّٰى جَاءُوْا بِاَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ مُكْرَهًا فَبَايَعَ. یعنی رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام لوگ مرتد ہو گئے۔ سوائے مقداد، ابو ذر غفاری اور سلمان فارسی کے، کیونکہ ان تینوں نے (ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی) بیعت سے انکار کر دیا تھا، تا آنکہ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے زبردستی بیعت نہ لے لی گئی۔ (تفسیر عیاشی مصنفہ محمد بن مسعود عیاشی جلد اول صفحہ ۱۹۹ مطبوعہ المکتبۃ الاسلامیہ تہران ایران)

یعنی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے زبردستی بیعت لے لی گئی تو ان تینوں نے بھی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی مگر بادلِ ناخواستہ، اس لیے یہ تینوں تو مسلمان ہی رہے باقی سب صحابہ کرام کافر ہو گئے کیونکہ انہوں نے خوش دلی سے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مان لیا تھا، لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

[387] یعنی نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد آنے والے اہل ایمان کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم نے تیرے ہر حکم کے آگے سر اطاعت خم کر دیا ہے۔ ہمیں تیری بخشش چاہیے کیونکہ ہم نے تیرے ہی پاس واپس جانا ہے۔ یہ حضور ﷺ کی پہلی دعا ہے جو یہاں بیان کی گئی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ

اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا[388] ہر جان کیلئے وہ نیکی ہے جو اس نے کمائی اور اس پر وہ گناہ ہے

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا

جو اس نے کمایا[389] اے ہمارے رب! ہم پر گرفت نہ فرما اگر ہم بھول جائیں یا خطاء کریں[390] اور اے ہمارے رب ہم پر

حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ

ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پہ ڈالا[391] اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہم میں طاقت نہیں [392]

وَاعْفُ عَنَّا ۥ وقفة وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وقفة وَارْحَمْنَا ۥ وقفة اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى

اور ہمیں معاف فرما، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحمت فرما تو ہمارا کارساز ہے، پس ہمیں کافر قوم کے مقابلہ میں

الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

مدد عطا فرما۔[393]

[388] یعنی اللہ رب العزت کسی شخص کو ایسی بات کا مکلف نہیں فرماتا جو اس کی طاقت سے باہر ہو، کیونکہ ایسا کرنا اس کی شانِ رحمت کے خلاف ہے۔ وہ تو اپنے بندوں پہ سو ماؤں سے بڑھ کر رحیم ہے۔ اسی لیے مریض کو بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی گئی۔ وضو نہ کر سکنے کی صورت میں تیمم کی اور مسافر و مریض کو روزہ چھوڑنے اور بعد میں اس کی قضا کرنے کی سہولت دی گئی۔ اسی طرح مجبوری میں کئی احکام بدل جاتے ہیں۔ اگر روزے میں شدید پیاس لگ جائے جو جان لیوا ہو تو روزہ کو توڑنا جائز ہے۔ کفارہ لازم نہیں صرف قضا کافی ہے۔ ہاتھ پاؤں زخمی ہوں تو وضو میں انہیں دھونے کی بجائے پٹی پر مسح کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ سب لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ کے جلوے ہیں۔ الغرض یہ آیت کثیر شرعی مسائل کی اصل ہے۔

کیا بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ نجاست آلود حصۂ جسم کو کاٹ دیا کریں؟

یہاں اس مغالطہ کا ازالہ ضروری ہے جو سمجھ لیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ ان کے جسم کے جس حصہ کو پیشاب پاخانہ لگ جائے اسے کاٹ دیں، یہ غلط ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کو صرف نجاست زدہ کپڑے کے کاٹنے کا حکم دیا گیا تھا، کیونکہ جسم کا کاٹنا انسان کی طاقت سے باہر ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو اس کا مکلف نہیں بناتا۔ بلکہ یہ بھی سوچنے کی بات ہے

کہ پیشاب تو عموماً قضائے حاجت کے وقت اعضاء تناسل کو لگ ہی جاتا ہے، تو کیا سب بنی اسرائیل کے یہ اعضاء کٹے ہوئے تھے؟ یہ ناقابل فہم بات ہے۔

اور حدیث بخاری میں بھی صرف کپڑے کے کاٹنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اِنَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کَانَ اِذَا اَصَابَ ثَوْبَ اَحَدِھِمْ قَرَضَہٗ، بیشک بنی اسرائیل کا معاملہ یہ تھا کہ جب ان میں کسی کا کپڑا آلودہ ہوتا تو وہ اسے (شرعاً) کاٹ ڈالتا۔ (بخاری شریف کتاب الوضو باب البول عند سباطۃ قوم حدیث ۲۲۶)

معلوم ہوا کہ صرف کپڑے کے کاٹنے ہی کا حکم تھا، البتہ مسلم کی حدیث میں کپڑے کی بجائے جلد کا لفظ ہے (مسلم کتاب الطہارۃ حدیث ۴۷)، اور یہ راوی کا وہم ہو سکتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جلد سے مراد وہ چمڑا ہے جو بنی اسرائیل بطور لباس پہنا کرتے تھے۔ (عمدۃ القاری شرح بخاری جلد ۳ صفحہ ۲۰۶ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

[389] انسان جو کرے گا وہی بھرے گا نیک عمل کا نتیجہ نیک اور برے عمل کا برا۔ بعض لوگ اس آیت سے ایصالِ ثواب کی نفی ثابت کرتے ہیں مگر یہ غلط استدلال ہے اس آیت میں صرف یہ بتایا گیا کہ ثواب وعذاب کی بنیاد انسان کا عمل ہے، اچھے عمل کا اچھا انجام ہے اور برے کا برا۔ جبکہ ایصال ثواب کا اس سے کوئی تعلق نہیں وہ اپنی جگہ برحق ہے۔ اگر کسی زندہ شخص کا کوئی عمل کسی مردہ کو فائدہ نہیں دے سکتا تو پھر نماز جنازہ کیوں جاری کی گئی وہ بھی تو زندوں کا عمل ہے جو مردوں کو فائدہ دیتا ہے۔ ایصال ثواب کے اثبات پر ہم تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ (بقرہ: ۱۳۴) کے تحت متعدد احادیث اور دیگر دلائل لکھ آئے ہیں وہاں دیکھیں۔ اور وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ (سورہ نجم، ۳۹) کے تحت مفصل گفتگو آرہی ہے۔ وہاں دیکھیں۔

[390] نسیان اور خطاء میں یہ فرق ہے کہ نسیان میں ارادہ شامل ہوتا ہے مگر جو کام کیا اس کی حرمت یاد نہیں ہوتی جیسے روزے دار کا بھول کر کھالینا۔ اور خطاء وہ گناہ ہے جو بے ارادہ ہو جائے جیسے قتلِ خطاء کہ شکار کو فائر کیا جس سے انسان مر گیا۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ اصل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی دوسری دعا ہے جو یہاں قرآن میں نقل کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور آپ کی امت سے خطاء ونسیان کو معاف فرما دیا۔

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی رَفَعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَاءَ وَالنِّسْیَانَ وَمَآ اُکْرِھُوْا عَلَیْہِ۔ ''اللہ نے میری امت سے خطاء اور نسیان اور جو کام کسی سے جبراً کروایا جائے، کو معاف فرما دیا ہے۔'' (ابن ماجہ)

معنی یہ ہے کہ روز قیامت خطاء ونسیان پر اللہ تعالیٰ پکڑ نہیں فرمائے گا۔ رہا دنیا کا معاملہ تو یہاں بعض امور میں نسیان معاف ہے بعض میں نہیں۔ ہر معاملہ کے اپنے دلائل ہیں۔ طلاق وعتاق میں نسیان معاف نہیں، حج میں کی جانے والی غلطیوں میں نسیان معاف نہیں، جبکہ روزہ میں نسیان معاف ہے۔ قتلِ خطاء میں قصاص کا حکم نرم کر کے دیت لازم کی

گئی۔ یہ اس لیے ہے کہ اگر دنیا میں بھی ہر نسیان معاف ہوتا تو لوگ نسیان کے بہانے شریعت کو مذاق بنا لیتے بلکہ اس بہانے ایک دوسرے کا خون بہانے لگتے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خطاء ونسیان کا معاف ہونا اس آخری امت کی خصوصیات میں سے ہے، یہ انعام پہلی امتوں کو عطا نہ فرمایا گیا۔

[391] یہ حضور ﷺ اور اہل ایمان کی تیسری دعا ہے کہ اے اللہ ہم پر پہلے لوگوں جیسے بوجھ نہ ڈال۔ بنی اسرائیل پر ان کی بداعمالیوں کے سبب سخت احکام نافذ کیے گئے۔ اگر ان کے کپڑوں پر پیشاب لگ جاتا تو وہ حصہ انہیں کاٹنا پڑتا۔ ان پر پچیس فی صد زکوٰۃ اور سال میں دو ماہ روزے مقرر کیے گئے۔ پہلی امتوں پر ان کی بداعمالیوں پر سخت ترین عذاب آئے۔ بعض کو بندر وخنزیر بنایا گیا۔ بعض پر پتھروں کی برسات ہوئی اور بعض کو زمین میں دھنسا دیا گیا۔ اسی طرح پہلے لوگ گناہ کرتے تو ان کے دروازوں پہ لکھ دیا جاتا۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دعا کی اے اللہ ہم پر اس طرح کی سختیاں نہ کی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی قبول فرمائی۔ چنانچہ امت محمدیہ کو نرم احکام دیئے گئے، ان سے وہ عذاب جو پہلی امتوں پر آتے تھے موقوف کر دیئے گئے اور ان کے گناہوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔

[392] یہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی چوتھی دعا ہے کہ اے اللہ جو مشقت ہم برداشت نہیں کر سکتے وہ ہم پر نہ ڈالی جائے یعنی دنیا میں ناقابل برداشت تکالیف ومصائب سے اور آخرت میں قبر وحشر اور قیامت کے ناقابل برداشت عذابوں سے بچایا جائے۔ یہ دعا بھی قبول ہوئی۔ لہٰذا امت محمدیہ ایسی سختیوں سے محفوظ ہے۔ معلوم ہوا حضور ﷺ کی سب دعائیں قبول ہوئیں۔

اجابت نے بڑھ کر گلے سے لگایا — بڑھی ناز سے جب دعاء محمد
جناب محمد برائے الٰہی — جناب الٰہی برائے محمد (ﷺ)

یہ بھی معلوم ہوا کہ امت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کے بہت عظیم احسانات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جو دعائیں یہاں نقل فرمائی ہیں ان کے صدقے تاقیامت امت محمدیہ پر رحمت الٰہی کے خزانے لٹ رہے ہیں۔

[393] یہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پانچویں چھٹی اور ساتویں دعائیں ہیں۔ وَاعْفُ عَنَّا یہ ہے کہ دنیا میں گناہوں پہ پکڑ نہ کی جائے۔ وَاغْفِرْ لَنَا یہ کہ آخرت کی پکڑ سے محفوظ رکھا جائے اور وَارْحَمْنَا یہ کہ جنت میں بلند درجات دیئے جائیں۔ جب گزشتہ تمام دعائیں قبول ہوئیں تو ان شاء اللہ یہ دعا بھی مقبول ہے۔ حضور ﷺ کا یہ دعائیں فرمانا تعلیم امت کے لیے ہے، بلکہ یہ دعائیں امت ہی کے لیے ہیں، ورنہ آپ تو گناہوں سے معصوم ہیں۔ آخر میں فرمایا اے اللہ تو ہمارا کارساز ہے۔ ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔ یہ آٹھویں اور آخری دعا ہے۔ یہ دعا بھی قبول ہوئی۔ امت محمدیہ بارہ صدیوں تک کفار پر غالب رہی۔ پھر ہماری ایمانی کمزوری کے سبب ضعف آیا جو عارضی وقت ہے اور جلد

ختم ہو جائے گا عنقریب پھر اہل ایمان کو غلبہ ملنے والا ہے۔ ان شاء اللہ۔ ارشاد رسول ﷺ ہے۔ اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْا وَلَایُعْلٰی عَلَیہ یعنی اسلام غالب آتا ہے اسے (ہمیشہ) مغلوب نہیں رکھا جاسکتا۔ (بخاری کتاب الجنائز) علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

نئے سورج کے ابھرنے کی افق تابی ہے رنگ سورج کا تو دیکھ کہ عنابی ہے

اس جگہ اَلْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ﴿۲۸۶﴾ سے معلوم ہوا سب کفار ایک ہی قوم ہیں خواہ وہ کسی رنگ، نسل، علاقہ یا مذہب سے متعلق ہوں۔ اسلام کے مقابلہ میں وہ متحد ہیں۔ اسی لیے حدیث میں ہے: اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ گفتگو کا اختتام دعا پر کیا جائے۔ سورہ بقرہ قرآنِ پاک کی سب سے طویل سورت ہے اس میں عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، حقوق اور تاریخ انبیاء سب کے ذکر کے بعد دعا پر سورت کا اختتام کیا گیا۔

سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کی بہت فضیلت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی رات سورہ بقرہ کی آخری دو آیات پڑھ لیں وہ اس کے لیے کافی ہو جائیں گی۔''

(بخاری کتاب فضائل القرآن حدیث ۵۰۰۹، مسلم کتاب صلوۃ المسافرین حدیث ۲۵۵، ترمذی کتاب ثواب القرآن باب ۴، ابن ماجہ کتاب اقامۃ الصلوات باب ۱۸۳)

ان دو آیات کے کافی ہونے کا ایک معنی یہ ہے کہ ان کی برکت سے اس رات وہ شخص کسی شیطانی حملے یا کسی آفت سے محفوظ رہے گا۔ دوسرا معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر وہ شخص اس رات تہجد کے لیے ارادہ کے باوجود نہ جاگ سکا تو ان دو آیات کا پڑھنا اسے تہجد کی طرف سے بھی کافی ہوگا۔ الغرض ان دو آیات کی عظیم فضیلت ہے، ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ ''جس گھر میں تین رات تک یہ دو آیات پڑھی جائیں وہاں سے شیطان بھاگ جائے گا۔'' (درمنثور)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ تفسیر برھان القرآن کا پہلا حصہ یعنی سورہ بقرہ کی تفسیر آج ۲۱ ذی قعدہ ۱۴۲۷ھ مطابق ۱۵ دسمبر ۲۰۰۶ء بروز جمعۃ المبارک نماز مغرب سے قبل اختتام پذیر ہوئی۔

وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہٖ خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ